انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

مدیر

پروفیسر آل احمد سرور

شیعہ تھیں۔ انھوں نے گھر میں امام باڑہ تعمیر کرایا اور عزاداری کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ جوش لکھتے ہیں — "
"ہمارے امام باڑے میں رات کے نو بجے تک دادی کی قیادت میں ماتم ہوتا تھا۔"
جب ضریح اُٹھائی جاتی تھی تو سنّی حضرات کی طرف سے اس کے مقابل "جھنڈا" نکالا جاتا تھا اور اکثر
کے درمیان کشیدگی کا باعث ہوتا تھا۔ جوش نے حواشی میں لکھا ہے

" اس فعل کو اس بنا پر جھنڈا کہا جاتا تھا کہ " چار سو جھنڈا گڑا ہے چار یار پاک کا"
سے اس کا آغاز ہوتا تھا۔ اور یہ شوشہ چھوڑا تھا فرنگی نے — تاکہ شیعہ سنّی لڑتے رہیں۔
حکومت نے دہلی کے ایک شیعہ مولوی مقبول حسین کو تبرہ بازی اور دوسری طرف لکھنؤ
کے ایک سنّی مولوی عبدالشکور کو "جھنڈا بازی" پر مامور کر دیا تھا —— اور اس
غداری کے سلسلے میں گھر بیٹھے وظیفے کھاتے تھے —"

جوش کی شخصیت کی تعمیر میں لکھنؤ کی تہذیبی فضا نے کتنا زیادہ حصہ لیا ہے اس کا اندازہ مصنف کے
اس بیان سے ہوسکتا ہے جو سوانح میں شامل ہے ،

" وہ جھلملاتی ترچھی کلاہیں — وہ چوڑی دار پاجامے۔ شانوں پر وہ ریشمی رومال۔
آڑی ترچھی مانگیں — ساقی اور ساقنوں کے ہاتھوں میں وہ خوشبودار تمباکو کے
حقے — وہ لپٹے ہوئے ہار۔ وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ۔ بالاخانوں کے چھجوں
سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی — کوٹھے والیوں میں کوئی گوری کوئی چمپئی ،
سانولی — کسی کی ناک میں نتھ ، کسی کی ناک میں تنکا —"

" لکھنؤ کے وہ رؤسا ، ادبا ، شرفا ، اور شعرا ، جو میرے باپ کے پاس آتے تھے۔
اللہ اللہ وہ ان کے لچکیلے سلام۔ وہ ان کی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز —
وہ ان کی تہذیب میں ڈوبی وضع قطع — وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش وہ
مسائل علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ — اثنائے غزل خوانی
میں وہ حسب مفہوم شعر ، ان کی آنکھوں کا رنگ — وہ ان کا انکسار کے سانچے میں
ڈھلا ہوا وقار —— انھیں بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر کے میں نے
شائستگی سیکھی — ادب اور زبان میں نظر پیدا کی — اور یہ جو ذراسی شدبد
مجھے ادب اور زبان پر حاصل ہے یہ انھیں کی صحبت کا اثر ہے "

سوانح میں جوش نے اکثر مقام پر اپنے علم و فن کے تجسس کا اظہار کیا ہے۔ اس کی ایک مثال

شمارہ (۱) ۱۹۷۱ء

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

حرمت الاکرام



یہ تشنگی کی آگ، یہ آسودگی کا زہر
پیتا ہے کس خوشی سے زمانہ خوشی کا زہر!

وہ بدگمانیاں ہیں کہ خود سے بھی خوش نہیں
خوابوں میں کون گھول گیا آگہی کا زہر؟

مدہوشیٔ حیات نہ سمجھی کہ جام میں
غم کا سرور کتنا ہے، کتنا خوشی کا زہر؟

تا صبح آزماتی ہے تشنہ لبوں کا ظرف
وہ رات جس کے جام میں ہو چاندنی کا زہر

اک تیرا غم تھا مٹ نہ سکیں جس کی تلخیاں
تھا ورنہ خوشگوار بہت زندگی کا زہر

شکوہ نہیں، یہ سادہ دلی کا ہے تجربہ
ہوتا ہے دشمنی سے سوا دوستی کا زہر

تارو! یہ رات مجھ سے گزاری نہ جائے گی
دل میں مرے اتار دو اپنی ہنسی کا زہر

اے گردشِ حیات! نہ لے مجھ سے انتقام
کیا کم عدوئے جاں ہے مری سادگی کا زہر

حرمت دو آتشہ ہے بلا کی، سرشتِ دل
منزل رسی کی پیاس ہے اور گمرہی کا زہر

قیمت سالانہ بارہ روپے

قیمت فی پرچہ تین روپے

کتابت عبدالرشید ڈبائیوی

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین نے لیتھو کلر پرنٹرز علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع

اردو ادب

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور نظم جدید	سیفی پریمی	۵
۲	قواعد ہندی ریختہ	محمد انصار اللہ	۳۷
۳	مغل مصور فرخ بیگ	کبیر احمد جائسی	۵۳
۴	وضع اصطلاحات کی چند نادرست اصطلاحیں	عصمت جاوید	۷۳
۵	لیزر اور ڈی ٹارسے (قسط اول)	ڈاکٹر نعیم احمد	۸۷
۶	پیامِ یار اور کلام امیر مینائی	سید فضل المتین	۱۱۵
	منظومات		
	غزل	عباس علی اُمید	۴۱

URDU ADAB

(QUARTERLY)

Editor

PROF. A. A. SUROOR

ANJUMAN-E TARAQQI-E URDU (HIND),
ALIGARH.

غزل	سید حرمت الاکرام	۱۴۲
گم گشتگی (نظم)	یوسف جمال	۱۴۳
غزل	آفتاب شمسی	۱۴۴

...کٹر سیفی پریمی

مولانا اسماعیل میرٹھی اور نظمِ جدید

مولانا کی جدید شاعری اور اس کے عناصر

کسی شاعر کے کلام کی پرکھ اور اس کے شاعرانہ مرتبہ کے تعین کے بارے میں معاصرین کی رائے نہایت معتبر اور اہم حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں معمار اعظم کا درجہ رکھتے ہیں وہ مولانا اسماعیل میرٹھی کے ہم عصر تھے۔ مولانا اسماعیل کے کلیات کا پہلا اڈیشن ان کی زندگی میں سنہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس سلسلے میں اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

"میں نے دیوان کے اکثر حصے دیکھے اور بہت پسند آئے۔ مولوی صاحب کا کلام ہم لوگوں کی تعریف سے مستغنی ہے" (۲۱ جنوری ۱۹۱۱ء)

ہفت رنگ مولانا اسماعیل کی جدید شاعری ہفت رنگ کی شان رکھتی ہے یعنی ان کی شاعری تاریخی، قومی یا سماجی، اخلاقی، علمی، نیچرل، تصوف اور دیہی زندگی کے عناصر سے مرکب ہے۔ ان میں جدید علمی، نیچرل اور دیہی زندگی کے تین الگ الگ اور ایسے آئینے ہیں جن کے جلووں کی تابناکی ان کو اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے اس کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کر لیا گیا تھا۔ مثلاً علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۲ جون ۱۹۱۱ء میں ہمیں یہ تحریر ملتی ہے:

"مصنف نے اپنی نظموں میں جا بجا جدید علمی خیالات کو بہت عمدگی کے ساتھ باندھا ہے"

اودھ اخبار لکھنؤ ۶ فروری ۱۹۱۱ء میں یہ اعتراف کیا گیا ہے:

"کلیات اسماعیل" مولانا کے ہر صنف ـــــ کے نیچرل، اخلاقی اور پند آموز کلام سے مالا مال ہے۔"

برہان دہلی ـ فروری ۱۹۴۷ء میں کہا گیا ہے:

وہ نثر سے زیادہ نظم میں ایک مخصوص طرز کے موجد تھے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو نظم میں

نیچرل شاعری کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ایجاد کا سہرا انہی کے سر ہے۔"
حضرت علامہ نیاز فتحپوری نے رسالہ نگار ستمبر ۱۹۳۹ء میں اظہار خیال کیا۔
"ان کی نظمیں دبستانی حیثیت رکھتی ہیں ...... یہ اور حالی پہلے شخص تھے جو اردو کے قدیم رنگ کو بدل کر اسے مغربی انداز پر لے گئے"
مولانا اسماعیل میرٹھی کے کلام میں ایک وصف کی طرف کم حضرات کی نگاہ پہنچی۔ جس طرح پریم چند نے شہروں سے نکل کر دیہات کی زندگی کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا۔ مولانا اسماعیل نے اپنی شاعری میں دیہی زندگی کے عنصر کو شامل کیا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اسماعیل میرٹھی کی اس خصوصیت کا یوں ذکر کیا ہے۔
"اسماعیل، اردو کا رجحان دیہی شاعری کی طرف پھیرنا چاہتے تھے۔ کئی عمدہ نظمیں اس سلسلے میں کہی ہیں مثلاً برسات، گرمی کا موسم، صبح کی آمد" [۱]
مولانا اسماعیل میرٹھی کے اندر اردو نظم گو شاعر کی تلاش سے پہلے ہمیں ان محرکات و عوامل پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔ جس نے پیچھا کیا "غزل" کی محفل سے "نظم" کی وسیع دنیا میں پہنچا دیا۔
اسماعیل میرٹھی، اردو انحطاطی دور کے بلند و برتر شاعر ہیں یعنی انیسویں صدی کی وہ اکائی جس کو قدیم کا بھرپور اور ریختہ کا ارتقائی عالم کہہ لیجئے۔
آزادی ہند کی پہلی ناکام تحریک سے پندرہ سولہ برس قبل اور انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد سے تقریباً چالیس پہلے کا دور اصلاً انتشار کا دور تھا۔ مغل حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ برٹش سامراج ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم گاڑ چکا تھا۔ راجہ اور نواب الگ الگ اپنا اقتدار جمار ہے تھے مگر برطانوی سنگینوں کی چھاؤں تلے ایک طرف اضمحلال تھا اور دوسری طرف مغربی تعلیم و تمدن کے اثرات سے ذہنوں میں سیاسی بیداری کی روشنی آنے لگی تھی۔ یعنی ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک اصل میں قومی افتخار کی محرک ثابت ہوئی۔ جاگیرداروں اور نئے نوابوں اور رجواڑوں کے دربار میں رومانی تصوریت کی روح کارفرما تھی۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی کے دلدادہ تھے، لیکن تجارت بڑھ رہی تھی، اونچے درمیانی طبقے اور متوسط طبقے میں مغربی ادب اور سیاست راہ پا رہی تھی پھر بھی اس بظاہر عظمت کے باوجود مولانا کا دور اصلاً بے اطمینانی کا دور تھا۔ ایک عبوری دور تھا۔
مذہب میں ایک مسلم کش نظریات کے خلاف طوفان اٹھ چکا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا کی جانب سے منظم محاربہ جاری تھا۔ ادھر شاہ ولی اللہ کی تحریک اور دیوبند تحریک ذہنوں کو متاثر کر چکی تھیں اردو میں

---

[۱] اعجاز حسین، نئے ادبی رجحانات، الہ آباد، ۱۹۴۲ء — ص ۵۷

قرآن کا ترجمہ ہوا۔ نئے خیالات شہر اور ایسے قصبوں میں پہنچ رہے تھے جنھوں نے ایک اصلاحی تحریک کا روپ لے لیا تھا۔ بغاوت صرف مذہب یا سامراج کے خلاف نہ تھی بلکہ جاگیرداری نظام ۔ (FEUDAL ARISTO - OCRACY) کے خلاف بھی تھی۔

مزدور طبقے میں بھی بے چینی کے آثار تھے اور آزادی کی علامات جھلک رہی تھیں جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا تھا۔ اقتصادی بے اطمینانی کے بعد ایک علانیہ بغاوت کا ذہن بنتا جا رہا تھا جو جاگیرداری نظام کی جڑوں اور سامراج کی بنیادوں کو خالی کر رہا تھا ۔

مولانا میرٹھی کا دور اگرچہ سامراجی دور تھا مگر نشاۃ ثانیہ اور اصلاح او رآزادی کے نقوش ابھرنے لگے تھے ۔ مولانا اسماعیل کا ذہن بذات خود دورِ قدیم کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ دورِ مستقبل کا پیغمبر نہیں ہے اس لئے کہ ان کی پیدائش، پرورش، اور تعلیم و تربیت انحطاطی دور میں ہوئی اور اُسی ماحول میں ان کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کی تکمیل ہوئی اور یہ وہ دنیا تھی جس میں خود فراموشی ہی ایک حاوی وضع تھی اور غالب انداز تھا۔ لیکن مذہب، سماج اور تعلیم میں سرسید، راجہ رام موہن رائے اور صوفیوں نے اصلاحات کا فرض ادا کیا تھا اور انسان دوستی کا اثر پھیل رہا تھا جس کے پیدا کردہ حسن کے تیز احساس، زندگی میں خوشی اور آزاد سیکولر اسپرٹ، جو اردو ادب میں ظاہر ہونے لگے تھے ۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کو اس سے متاثر ہوئے بغیر چارہ نہ تھا۔

مختصر یہ کہ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمارا ادب ایک مخصوص دور کا نمائندہ ہے جس سے نیا اور سماجی رجحانات نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر چند اس میں سیاسی بے مائیگی کا عنصر غالب ہے لیکن نتیجہ کے طور پر اس دور میں خالص حب الوطنی اور معاشرتی اصلاح کی آواز بھی سنائی پڑتی ہے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی نے شاعری میں ایک نئی روح پیدا کی۔ عقلیت اور اصلیت کے امتزاج سے شعر کی تخلیق کی۔ نیچرل شاعری کو جنم دیا۔ اجتماعی احساس کو مواد بنا کر اردو کا عملی میدان بڑھایا۔ اپنی آمادہ میں اخلاقی اور اصلاحی عنصر پیدا کیا گم شدہ ماضی کی یاد، اتحاد ملکی، قومی بہبود اور حب الوطنی کے جذبات نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مختصر طور پر کہا جائے گا کہ ان کی نظموں میں ہفت رنگ کی کیفیت ملتی ہے

اسماعیل میرٹھی کی نظم نگاری کو تین شقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔

(۱) طبع زاد نظمیں
(۲) انگریزی سے ماخوذ نظمیں
(۳) انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے

مولانا اسماعیل میرٹھی کو نظموں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع اپنی ملازمت کے سلسلے میں ملا تھا۔ وہ میرٹھ

ں انسپکٹر کے دفتر میں ملازم تھے وہیں تعلق میرٹھی بھی تھے وہ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کی اصلاح کرتے تھے او
دانھوں نے بھی ترجمے کئے ہیں۔ اس نے مولانا اسماعیل میرٹھی کی ان نظموں کو پہلے دیکھنا چاہئے جو انگریزی نظموں ک
رجمے ہیں۔

مولانا اسماعیل کی پنتالیس (۴۵) نظموں کا ایک مجموعہ ۱۸۸۰ء میں "ریزۂ جواہر" کے نام سے چھپا
ں کتاب میں چھ نظمیں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی شامل تھیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں اور تاریخ تخلیق بھی در
لی جاتی ہے۔

۱۔ کیڑا ۱۸۶۷ء
۲۔ ایک قانع مفلس ۱۸۶۷ء
۳۔ موت کی گھڑی ۱۸۶۷ء
۴۔ فادر ولیم ۱۸۶۷ء
۵۔ حُبّ وطن ۱۸۶۸ء
۶۔ انسان کی خام خیالی ۱۸۶۸ء

کیڑا اس نظم میں پندرہ شعر ہیں۔ نیچرل شاعری سے تعلق رکھنے والی، معنی کے اعتبار سے اخلاقی درس کی نمائندہ ہے۔ اس میں مور کی خوبصورتی اور کیڑے کی زندگی کے حسن کا موازنہ کر کے انسان کو ہمدردی کا سبق دیا ہے۔ نیز یہ کہ انسان کی طرح کیڑوں کی زندگی میں بھی حسن ہے اور وہ قابل قدر ہے۔

مولانا اسماعیل کے مشاہدے، فن، تخیل اور اظہار کی خوبیاں اس نظم کو پڑھ کر ہی واضح ہو سکتی ہیں۔ اس لئے نظم درج کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ شاعر نے ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ نظم پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

کیڑا

تم اس کیڑے کو دیکھو تو لگاتار — تمھاری راہ میں ہے گرم رفتار
چلا کترا کے کیا کیا پیچ و خم سے — جھجھکتا ہے یہ آواز قدم سے
کسی سوراخ میں دن کاٹتا ہے — سویرے اُٹھ کے شبنم چاٹتا ہے
کرو چشم حقیقت بیں سے تمیز — کہ سمجھو ہو جسے تم سخت ناچیز
اُسے قدرت نے زریں پر دیئے ہیں — کچھ اک سبزی و سرخی بھی لئے ہیں
تمھیں لگتی ہے اچھی مور کی دُم — کہ خوش ہوتے ہو اُس کو دیکھ کر تم

جو دیکھو ناچ اس کا دور ہی سے	تو اس پر لوٹ ہو جاتے ہو جی سے
مگر کیڑے کو بھی سمجھو نہ ہیٹا	یہ ماتا خاک مٹی میں ہے لیٹا
نہ بے پروائی سے چلئے جھپٹ کر	قدم رکھیئے ذرا کیڑے سے ہٹ کر
کہ ہے دونوں سے دانا سیکھ سکتا	نمونے دو ہیں، کاریگر ہے یکتا
ہے دونوں ہی میں یکساں دستکاری	کسے ہلکی کہیں اور کس کو بھاری!
ہے ان دونوں کو اس کا لطف حاصل	کہ بخشا ہے برابر عیش کامل
اگر ہے توب صورت مور پیارا	تو کیڑا بے گنہ کیوں جائے مارا
بظاہر کچھ نہیں اس کی حقیقت	مگر جب اس کی کرتے ہو بُری گت

تو ہے ننھی سی جان اس کی تڑپتی
ہے تم جیسا ہی اک جاں دار وہ بھی

پہلے شعر کے مصرع اول میں "لگاتار" کا لفظ نہایت جاندار ہے۔ یہ عمل مشاہدہ کا شاہد بھی ہے اور قاری کو ایک دعوت بھی۔ دوسرا اور تیسرا شعر محاکات کے عمدہ نمونے ہیں معنی پہ غور کیجیئے تو زبردست مشاہدہ کی قوت کا پتہ چلتا ہے۔

صنعتِ کردگار میں کمی بیشی کے فیصلہ کا اظہار مولانا کے مشرب میں جائز نہیں اس لئے الفاظ کے انتخاب میں نفسِ مضمون کی اہمیت کو سامنے رکھا ہے۔ محتاط ہو کر شعر کہے ہیں۔ "مور اور کیڑے" میں فیضِ قدرت نے امتیاز نہیں برتا اس کا اظہار مولانا نے بڑی صناعی کے ساتھ کیا ہے۔

ہے اِن دونوں کو اس کا لطف حاصل کہ بخشا ہے برابر عیش کامل!

'عیش کامل' کا اشارہ نہایت بلیغ ہے۔ زبان کے حسن اور دلکشی کا یہ عالم ہے کہ مرکزی خیال کا اثر نظم کی روانی کے ساتھ بڑھتا چلا گیا ہے۔ بعض الفاظ کا استعمال ایسا ہی چونکا دیتا ہے مثلاً 'ہیٹا'، 'جھپٹ کر'، 'ہٹ کر'، 'بھاری'، 'مارا'، 'گت' یہ الفاظ اپنی موسیقی، رنگ اور معنی کے لحاظ سے نظر انداز کرنے کے قابل سمجھے جائیں گے لیکن اس نظم میں مولانا نے ان کا استعمال اس قدرت سے کیا ہے کہ ان کا بدل ممکن نہیں۔ مصرعوں کی ترتیب میں اُن کا حسن، آواز، رنگ اور معنی مل کر ایک خوش رنگ و خوشگوار فضا پیدا کر دیتے ہیں اور مفہوم میں تاثیر کا جوہر نکھر جاتا ہے۔

ایک قانع مفلس

اس نظم میں سولہ (۱۶) شعر ہیں۔ مرکزی خیال یہ ہے کہ زردار کو سچی خوشی میسّر نہیں آتی اور مفلس کو اس کی قناعت بہترین دولت ہے۔ وہ قدرت کے مناظر

سے لطف اندوز ہوتا ہے ۔ اس نظم کو پند آموز بنانے کے لئے دو کردار نظم ہوئے ہیں ۔ ایک کردار شاعر کی ذات ہے اور مولانا نے زردار کا کردار مقامیت کے رنگ میں پیش کیا ہے یعنی اس کا نام "کلن" تجویز کیا ہے ۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے ۔

سو ہزار ایکڑ ہے کلن کی زمیں ! ملک میری ایک بھی ایکڑ نہیں
ہے محل اس کا نہایت شاندار اور ہمارا جھونپڑا ہے تنگ و تار
ان گنت ہے اس کی نقدی اور مال ایک پائی کے لئے میں پائمال

تیسرے شعر کے مصرعہ ثانی سے مولانا نے "مفلسی" کا معنوی تصور پیش کردیا ہے غالباً ان کے سامنے انگریزی کا لفظ PENILESS رہا ہوگا ۔ دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں "ہمارا" جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے ۔ باقی اشعار میں واحد متکلم ہے ۔ بظاہر یہ تضاد کہا جائے گا لیکن مولانا معنی کو ترجیح دیتے تھے اور زبان کو ایک ذریعہ سمجھتے تھے چنانچہ یہاں "ہمارا جھونپڑا" لکھ کر شاعر کی طرف سے غریب طبقہ کی اجتماعی زندگی کو پیش کیا ہے ۔ مولانا نے آزادی کو نعمت اور مادیت کو بندِ حسن قرار دیا ہے اس طرح زردار کی اقدار زندگی کو کمتر درجہ کا ثابت کیا ہے ۔

وہ ہے قیدی پائے بند ملک و مال اور میں آزاد ہوں مثلِ خیال

دولت کے بعض معائب کا ذکر کرنے کے بعد زردار کی محرومیٔ قسمت کا بیان کرتے ہیں ۔

لطفِ قدرت کا نہیں اس کو نصیب یہ بہارِ بے خزاں بھی ہے عجیب
یہ بیاباں ، یہ سمندر یہ ہوا گو نخی ہے انہیں قدرت کی نوا
کان سے کلن کی یہ سکن دور ہے وہ تو دولت کے نشہ میں چور ہے

موت کی گھڑی

اس میں انیس (۱۹) شعر ہیں ۔ یہ نظم مولانا کی دوسری نظموں سے الگ نظر آتی ہے ۔ اس کے مصرعے کچھ ڈھیلے ڈھالے اور تکلف و آورد کے غماز ہیں ۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی وہ شان نظر نہیں آتی جو مولانا کی خصوصیت ہے ۔

نظم کے پہلے حصہ میں عزیزوں ، دوستوں اور شریک حیات کی رفاقت اور عیش سامانیوں کا اظہار کیا ہے مگر اس سے یگانگی ، خلوص ، محبت کی رچی بسی فضا پیدا نہیں ہوتی ۔ اس کے بعد موت کی دسترس کا بیان ہے اس میں بھی وہ ہیبت اور بھیانک پن نہیں ملتا جو زندگی کے رشتوں کو کاٹنے سے پیدا ہوتا ہے تاثیر کی جگہ ایک سیدھی سادی بلکہ بے مزہ پندِ آموزی ملتی ہے ۔

فادر ولیم

یہ نظم چوبیس (۲۴) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک نوجوان اور ایک بزرگ کی گفتگو "زندگی اور موت" پر سوال و جواب کی صورت میں نظم کی گئی ہے ۔

نوجوان کے سوالوں کی بنیاد اصلاً یہ شعر ہیں ۔

چند موئے سفید باقی ہیں ! — کہ نمایاں ہے جن میں براقی
لیک ویسے ہی تندرست ہو تم — خوب چاق و دلیر و چست ہو تم

نوجوان کو حیرت ہے کہ اس بزرگ نے جوانی کا دور محتاط رہ کر گزارا پھر بھی بڑھاپا آگیا لیکن اس کے باوجود وہ بزرگ مطمئن ہے اگرچہ وہ موت کو برابر یاد رکھتا ہے ۔ نوجوانوں کا استفسار ہے۔

ظاہر اسقدر مسن ہو تم — مگر اس پر بھی مطمئن ہو تم

بزرگ نے ان اشعار میں جواب دیا ہے ۔

کیونکہ ایام نوجوانی میں — موسم عیش و کامرانی میں
میں نے اپنے خدا کو رکھا یاد — نہ کیا اس سے نفس کو آزاد
وہی اب میرا دستگیر ہوا — لطف یزداں عصائے پیر ہوا

حبّ وطن

اس نظم میں اٹھارہ (۱۸) شعر ہیں۔ حب وطن کا اعجاز ایک تمثیل کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے ۔ ملک اسپین میں ایک طوطی کو کسی نے خرید لیا اور ملک ملا میں اُسے لاکر ایک قفس میں رکھا۔ طوطی اس ماحول سے بیزار رہی۔ اُسے وطن کی یاد ستاتی رہی۔ اس کا چہچہانا چھوٹ گیا اور پروں کا رنگ بدل گیا۔ آخر کار ایک مرتبہ اسپین سے ایک شخص آیا۔ اس نے طوطی سے اسپین کی زبان میں کلام کیا۔ ہموطن کی صورت، وطن کی زبان، لب و لہجہ سے طوطی میں نئی روح بیدار ہوگئی۔ وہ چہچہانے لگی اور وطن کی محبت میں پھڑک پھڑک کر جان دیدی۔ نظم کے شروع میں دونوں ملکوں کی طبعی حالت کا فرق دکھایا ہے۔ آب و ہوا کا اختلاف بتایا ہے۔ قدرتی مناظر میں تفرق کا بیان ہے پھر پردیس میں طوطی کی زندگی کے نقوش پیش کئے ہیں ۔

اس دیارِ غریب میں آکر — سرد خطے میں پرورش پاکر
رہی شکّر شکن وہ خوش گفتار — باعثِ طولِ عمر آخر کار
اس کے زریں اہمر دیں پر و بال — بھورے بھورے سے ہوگئے فی الحال
عاقبت ایسی صم و بکم بنی — چہچہے وہ، نہ وہ شکر شکنی
اسی اثنا میں ایک مرد غریب — آیا اسپین سے ملا کے قریب

اُس نے طوطی سے جا کلام کیا | حرفِ اسپین میں سلام کیا
دیا اُس نے اُسی زباں میں جواب | اور کنجِ قفس میں ہو بیتاب
کیا ہی سرِ رپیچھا کے ہوئی | آخر آخر پھڑک پھڑک کے موئی

اس میں فارسی ترکیبوں کا استعمال زیادہ ہے۔ عربی "صم و بکم" بھی بوجھل ہے۔

انسان کی خام خیالی اس نظم میں اکیس (۲۱) شعر ہیں۔ اس میں "سچی خوشی" کا معیار پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں دوسری مخلوقات کا ذکر کرکے ثابت کیا ہے کہ انسان کے علاوہ سب فطری طور پر زندگی گزارتے ہیں مگر

انسان بخلافِ حکمِ قدرت | کرتا ہے خیالِ ترکِ فطرت

اس کے بعد سلسلہ وار اشعار میں سچی خوشی کی کسوٹی بیان کی ہے۔

ہو دل کو خوشی نہیں یہ ممکن | جب تک کہ نہ ہو صفائے باطن
یا نفس کہ تابعِ خرد ہو | حاصل تب راحتِ ابد ہو
یا وہ دلِ صاف و فیاض | ہو خود غرضی سے جس کو اعراض
یا صبر کہ خندہ زن ہو اکثر | مجبوریٔ بختِ نارسا پر
شاکر قسمت ہی پر رہے وہ | قدرت کو اُلاہنا نہ دے وہ
یا عقل کہ ہو سلیم دیکھو | اندوہ سے ہو نہ چیں بہ ابرو
یہ رمز کہ ہو چکے ہویدا | ہے اصل خوشی انھیں میں پیدا

آخر کے دو شعروں میں غیر حقیقی خوشی کو بیہودگی قرار دیا ہے اور سچی خوشی کا جو احوال بیان کیا ہے اس پر ان کا اعتقاد ہے اس کے خلاف دلائلِ افلاطون بھی اس اصول کی صحت کو نہیں بدل سکتے۔

جو لوگ ہیں عقل سے گزرتے | بیہودہ خوشی پہ ہیں وہ مرتے
گر ہو دے خلاف اس کے مضمون | باطل ہیں دلائلِ فلاطون

طبع زاد نظمیں

اخلاقی مولانا کی بیشتر نظموں سے "مثنویات" کے تحت بحث کی جا چکی ہے۔ مولانا کی اخلاقی نظمیں بھی خاص اہم ہیں۔ ان کا مقصد پند آموزی ہے لیکن پیرایۂ بیان ندرت لئے ہوئے ہے۔ یہ نظمیں، اخلاقی نقطۂ نظر کے باوجود کسی زاہدِ خشک کا فرمان نہیں ہیں دوزخ کے عذاب سے ڈرا کر یا زندگی

میں زہر ناکی گھل جانے کا خطرہ پیش کر کے اخلاقِ انسانی کی درستی کا فریضہ ادا نہیں کیا ہے ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اخلاقی اقدار میں شاعر کا جذبۂ عقیدت شامل ہے وہ اپنے مغرب کے عقائد اور کردار کی پسندیدگی کا اظہار کرتے میں مخلص ہیں۔ مولانا نے اخلاقی تعلیم کو زندگی کے مشاہدے اور تجربے کے ساتھ پیش کیا ہے مولانا نظام الدین بدایونی نے کہا تھا۔

"کتاب (کلیات) کے اخلاقی مضامین اس کو مہذب نفاست پسند طبیعتوں کے مطالعہ کے قابل بناتے ہیں[۵]"

اس ضمن میں ان کی نظم "نورِ عرفاں" قابلِ ذکر ہے اس میں عبد و معبود کا رشتہ یاد دلا کر افرادِ قوم کو غمِ روزگار سے نجات دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

لوگو سنو کوچ کی ساعت قریب ہے — جو جمع کرلے توشہ وہی خوش نصیب ہے
افسوس اس سمجھ پہ عجب پُر غرور ہو — موت آرہی ہے تم ابھی غفلت میں چور ہو
چھوٹے بھی اور بڑے بھی جو تم سے تھے چل بسے — کیا سمجھے ہو رہیں گے تمہارے محل بسے
قرآں سنو، تو ہو تمہیں اس بات پر عبور — اللہ کی طرف ہمیں جانا ہے بالضرور

حیا مولانا اسماعیل نے حیا کو وسیع معنوں استعمال کیا ہے انسانی کردار کا یہ قابلِ قدر وصف ہے وہ اس کو پاسبانِ آبرو اور نیکیوں کی قوت قرار دیتے ہیں۔ عصمت و پاکدامنی اسی کرداری وصف پر ناز کر سکتی ہے۔ چند اشعار میں "حیا" کی قدرت اور انسانی افعال میں اس کے عمل دخل کا بیان دیکھئے۔

گر نہ ہوتا درمیاں تیرا حجاب — فعلِ بد سے کون کرتا اجتناب
خواہشوں کو جو نہ دیتی تو لگام — آدمی، حیوان بن جاتے تمام
جب خطا کرتی ہے دل میں شور و شر — تو ہی بن جاتی ہے واں سینہ سپر

ان شعروں میں سفلی جذبات کے محرکات پر پابندی عائد کرنے والا جذبہ "حیا" کو سمجھا گیا ہے انسان کے اندر بے پناہ جوش اور جذبہ کے زور کو اعتدال پر لانے والی چیز حیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مولانا کے نزدیک تہذیب و تمدن کا نکھار حیا سے وابستہ ہے۔

مولانا نے حیا کو صرف خواہشوں کی نفی کا ذریعہ نہیں سمجھا ہے بلکہ حیا کو "عزتِ نفس" کی ایک شکل بتایا ہے ان کا تجربہ یہ ہے کہ حیا کا جوہر نادار طبقہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے مفلسوں کا ذکر کیا ہے۔

مفلسوں کی ہے تو ہی پشت و پناہ — تو سجھاتی ہے عرق ریزی کی راہ
گو تہی دستی کے ہو جائیں شکار — ہے مگر تجھ کو گدائی ننگ و عار
ہے ترے نزدیک مرجانا پسند — پر نہیں ہے ہاتھ پھیلانا پسند

---

۵ ۔ ... [illegible] ... ذو القعدہ ... ۱۹۱۱ء

شیعہ تفضیلی انھوں نے گھر میں امام باڑہ تعمیر کرایا اور عزاداری کی بنیاد ڈالی. چنانچہ جوش لکھتے ہیں ۔ "
ہمارے امام باڑے میں رات کے نو بجے تک دادی کی قیادت میں ماتم ہوتا تھا ۔"
جب ضریح اٹھائی جاتی تھی تو سنی حضرات کی طرف سے اس کے مقابل "جھنڈا" نکالا جاتا تھا اور اکثر
کے درمیان کشیدگی کا باعث ہوتا تھا۔ جوش نے حواشی میں لکھا ہے

" اس فعل کو اس بنا پر جھنڈا کہا جاتا تھا کہ " چار سو جھنڈا گڑا ہے چار یار پاک کا"
سے اس کا آغاز ہوتا تھا۔ اور یہ شوشہ چھوڑا تھا فرنگی نے ۔ تاکہ شیعہ سنی لڑتے رہیں ۔
حکومت نے دہلی کے ایک شیعہ مولوی مقبول حسین کو تبرہ بازی اور دوسری طرف لکھنؤ
کے ایک سنی مولوی عبدالشکور کو "جھنڈا بازی" پر مامور کر دیا تھا ـــــ اور اس
غداری کے سلسلے میں گھر بیٹھے وظیفے کھاتے تھے ـــ "

جوش کی شخصیت کی تعمیر میں لکھنؤ کی تہذیبی فضا نے کتنا زیادہ حصہ لیا ہے اس کا اندازہ مصنف کے
بیان سے ہو سکتا ہے جو سوانح میں شامل ہے ۔

" وہ جھلاتی ترچھی کلاہیں ـــ وہ چوڑی دار پاجامے ۔ شانوں پر وہ ریشمی رومال۔
آڑی ترچھی مانگیں ـــ ساقی اور ساقنوں کے ہاتھوں میں وہ خوشبودار تمباکو کے
حقے ـــ وہ لپٹے ہوئے ہار۔ وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ ۔ بالاخانوں کے چھجوں
سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی ـــ کوٹھے والیوں میں کوئی گوری کوئی چمپئی ،
سانولی ـــ کسی کی ناک میں نتھ ، کسی کی ناک میں تنکا ـــ "

" لکھنؤ کے وہ رؤسا ، ادبا ، شرفا اور شعرا جو میرے باپ کے پاس آتے تھے ۔
اللہ اللہ وہ ان کے لچکیلے سلام ۔ وہ ان کی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز ۔
وہ ان کی تہذیب میں ڈوبی وضع قطع ـــ وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش وہ
مسائل علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ ـــ اثنائے غزل خوانی
ں وہ حسب مفہوم شعر ، ان کی آنکھوں کا رنگ ـــ وہ ان کا انکسار کے سانچے میں
ڈھلا ہوا وقار ـــــ انھیں بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر کے میں نے
کی سیکھی ۔ ادب اور زبان میں نظر پیدا کی ۔ اور یہ جو ذرا سی شد بد
ادب اور زبان پر حاصل ہے یہ انھیں کی صحبت کا اثر ہے ۔"

میں جوش نے اکثر مقام پر اپنے علم و فن کے عجز کا اظہار کیا ہے ۔ اس کی ایک مثال

زندگی کے رموز سمجھانے اور اعلیٰ اوصاف اپنی ذات میں پیدا کرنے کا طریق بہت قدیم ہے اور اردو زبان و ادب میں روزمرہ، محاورات، تشبیہات و استعارات اور علامات متعین کرنے میں جانوروں کی زندگی اور خصوصاً ان کے خیر و شر کے اوصاف سے بہت مدد لی گئی ہے اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے چند استعارات کافی ہیں۔ مثلاً شیر کی بہادری، گیدڑ کی بزدلی، لومڑی کی چالاکی، گھوڑے کی وفاداری، طوطے کی بے مروتی، اونٹ کا حلم، بلبل کی فریاد یا ہزار داستانی وغیرہ چنانچہ مولانا نے بھی ان روایات سے کام لیا ہے۔ ان کی دو نظمیں "اونٹ اور شیر" اسی قسم کی ہیں۔

(۱) اونٹ

لق و دق صحرا اور چلچلاتی دھوپ میں سامان سے لدے ہوئے اونٹ کا حال سفر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

چند ہفتے جبکہ جاتے ہیں گزر
اور تھکا دیتا ہے راکب کو سفر

اونٹ گھبراتا نہیں تو بار سے
دیکھتا ہے اس کی جانب پیار سے

گویا کہتا ہے کہ اے میرے سوار
ایک دن تو اور بھی ہمت نہ ہار

ہاں نہ بیدل ہو نہ رستے میں ٹھٹک
صاف سرچشمہ ہے آگے، دھر لپک

مجھکو آتی ہے ہوا سے بوئے آب
ناامیدی سے نہ کر تو اضطراب

اونٹ تو کرتا ہے اس کی رہبری
یوں بنا دیتا ہے راکب کو جری

آخر شب منزل پہ پہنچاتا ہے تو
اور سوکھے خار و خس کھاتا ہے تو

صبر سے کرتا ہے طے راہ دراز
سچ کہا ہے تو ہے "خشکی کا جہاز"

الغرض تو ہے حلیم و خوش خصال
تربیت میں چھوٹے بچوں کی مثال

(۲) شیر

شیر کو جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے ۔ مولانا نے اسی وصف سے نظم کا آغاز کیا ہے۔

اے شیر تیرے تن پہ ہے طاقت کا پوستیں
شاہی کے حق میں کوئی بھی ساجھی ترا نہیں

چند قطعوں میں بزدلی اور غلامی کی نفی ہے ۔ اور خوف کو کالعدم دکھاتے ہوئے شیر کی حیات در راستہ میں اس کا اڑ جانا دکھایا ہے۔

تیرا حریف کون ہے جو تو ہٹے پیچھے
جھپکے نہ تیری آنکھ، نہ گردن تری لچے

حق نے عطا کیا ہے تجھے زور بے خلل
فولاد کی رگیں ہیں، تو ہے دل ترا اٹل!

اس کے بعد شیر کے جلال کا عالم دکھایا ہے اور ان شعروں میں وہی رعب کی فضا ہے:

غرّا کے شیر کرتا ہے جب جوش اور خروش　　　جنگل تمام ہوتا ہے سنسان اور خموش

پہچانتے ہیں جانور آواز شیر کی　　　وہ ہولناک ہے کہ دہلتا ہے سب کا جی

جاتی ہے ان کے پاؤں تلے کی زمیں نکل　　　ہیں بھاگتے کہ گویا تعاقب میں ہے اجل

آخر شعر ہے:

اے شیر تو ہے شاہ ترا تخت ہے کچھار

ہے کس کو تیرے ملک میں دعوائے گیرودار

قرض

مولانا نے سماج میں بہتر معاشرت کا رنگ بھرنے کے لئے ہماری اقتصادی زندگی پر بھی نظر کی ہے۔ قرض ایک لعنت ہے۔ ایک تو یہ کہ قرض لینے سے خودداری، عزت نفس، آن بان وغیرہ خوبیاں رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہیں۔ انسان میں کمتری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تملق و خوشامد، کذب اور مطلب پرستی کے گھٹیا جذبات نشو و نما پاتے ہیں۔ سیرت کی تباہی کے ساتھ اقتصادی بدحالی بڑھتی ہے مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ اور اخلاقی زوال انسان کو سماج میں ناقابل توجہ بنا دیتا ہے۔

چند شعر دیکھئے۔

دیکھو یہ قرض، وعدہ خلافی نہ دے سکھا　　　ہو جاؤ گے جہان میں بے اعتبار تم

جب تک وبال جان نہ جانو گے قرض کو　　　ہرگز نہ بن سکو گے کفایت شعار تم

گو ڈیڑھ سا ہو ارطے کوڑیوں کے مول　　　زنہار بھول کر بھی نہ لینا ادھار تم

مقروض ہو گئے تو پیادہ سے ہو بتر

مانا کہ رکھتے ہو فرس راہوار تم

مولانا اسماعیل میرٹھی کی بعض نظموں کا ماخذ انگریزی نظمیں ہیں۔ یہاں صرف دو نظموں کا ذکر کیا جاتا ہے اسلئے کہ ان نظموں کا مواد اخلاقی پند و نصیحت پر مشتمل ہے۔

ایک کتّا اور اسکی پرچھائیں

اس نظم میں مولانا نے انسانی سیرت کے دو رُخ پیش کئے ہیں۔ جو زندگی کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتے۔ ایک توہم، دوسرے حرص۔ ان دونوں کی تباہ کاری ایک تمثیل میں پیش کی گئی ہے تاکہ نظم کے اخلاقی سبق سے متاثر ہو کر انسان اپنا جائزہ لے۔ توہم پرستی اور حرص سے اپنے ذہن اور نیت کو پاک رکھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

منہ میں ٹکڑا لئے ہوئے کتا ایک دریا کو تیر کر اُترا
پانی آئینہ سا رہا تھا چمک نظر آتی تھی تہہ کی مٹی تک
اپنی پرچھائیں پر کیا جو غور اس نے سمجھا کہ ہے یہ کتا اور
منہ میں ٹکڑا دبا رہا ہے یہ گہرے پانی میں جا رہا ہے یہ
حرص نے ایسا بے قرار کیا جھٹ سے غرّا کے اُس پہ وار کیا
واں نہ ٹکڑا، نہ اور کتا تھا وہم تھا، وہم کے سوا کیا تھا
یونہی جتنے ہیں لالچی ناداں کر کے لالچ اٹھاتے ہیں نقصان
باندھتے ہیں کہاں کہاں کے خیال اور کھو بیٹھتے ہیں اپنا مال

تم ہوس میں سڑی نہ بن جاؤ
جو ملے اس کو کام میں لاؤ!

ایک گھوڑا اور اس کا سایہ

اس نظم میں انسان کی توہم پرستی کی طرف اشارہ کیا ہے انسان کی یہ کمزوری دکھائی ہے کہ وہ اپنے معائب اور خامیوں پر نظر نہیں رکھتا "سارے جہاں کی تنقیص کرتا ہے" "سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر"۔ اس مصرع کی تفسیر یہ پوری نظم ہے۔ نظم مختصر ہے اس لئے پوری نظم درج ہے۔

ایک گھوڑا تھا نہایت عیب دار اپنے سایہ سے بدکتا بار بار
اُس سے مالک نے خفا ہو کر کہا سُن تو احمق! جس سے تو ہے ڈر رہا
جسم کا تیرے ہی تو سایہ ہے وہ! کچھ درندہ ہے نہ چوپایہ ہے وہ
جسم رکھتا ہے نہ اُس کی جان ہے تو بڑا ڈرپوک اور ناداں ہے
یوں دیا گھوڑے نے مالک کو جواب سچ کہا یہ آپ نے لیکن جناب
آدمی سے بڑھ کے میں وہمی نہیں ان ہیولی باتوں کا ہے جس کو نقش
بھوت کا قصہ، کہانی کے سوا کچھ نشاں گھر میں نہ جنگل میں پتا
بھوت سے ڈرتا بھی کوئی بات ہے کیا ہی وہمی آدمی کی ذات ہے
سایہ تو آنکھوں سے آتا ہے نظر کیا عجب ہے جو ہوا مجھ پر اثر

اپنے دکھ کا کیجئے اوّل علاج
دوسرا کالو حقیقہ : پیچھے مزاج

نیچرل نظمیں

مولانا اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں نیچرل نظموں کی ایک مخصوص اہمیت ہے۔ مثنویات میں ان کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ مثلاً

۱۔ مثنوی آبِ زلال (۲) بارش کا پہلا قطرہ (۳) مثنوی بادِ مراد (۴) مناقشہ ہوا و آفتاب (۵) کوہِ ہمالہ (۶) کچھوا اور خرگوش (۷) دو مکھیاں ۔

۸۔ عجیب چڑیا (۹) کوّا (۱۰) دال کی فریاد (۱۱) دال اور چپاتی ۔

ان کے علاوہ اور بھی موضوعات پر گفتگو ہو چکی ہے۔

مولانا کی نظموں میں نیچرل شاعری کے تحت جتنی نظمیں ہیں۔ ان میں مقامی رنگ ہے۔ علامات، تشبیہات، استعارات اور الفاظ کی فضا وہی ہے جہاں کا ذکر کیا گیا ہے۔

ایک گنوار اور قوسِ قزح

اس نظم میں مولانا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ فطرت کے حسن سے لطف اندوزی کے لئے شعور اور حس کی ضرورت ہے

دوسرے یہ کہ بے پڑھے لکھے لوگوں میں مظاہرِ فطرت کے بارے میں توہمات داخل ہو گئے ہیں اور یہ توہمات، اساطیر کی راہ سے داخل ہوئے ہیں۔ مثلاً دھنک کے سلسلے میں ایک افسانہ تراشا گیا تھا کہ اس میں سونے کا ایک پیالہ ہے۔ یہ کہانی گاؤں کے لوگوں میں پھیل گئی چنانچہ ایک گلہ کا نگہبان دہقان "قوس قزح" کو دیکھ کر اس میں پیالۂ زر کا جویا ہوتا ہے اور ذہن اس طرف رجوع ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ فکرِ معاش سے بے پروا ہونے کا خیال کرنے لگا

سوچا کہ تو جام اور تو جم ‍ ‍ ‍ ‍ چھوڑ و بز و گوسفند کا غم

اس خیال نے اس کو عمل پر اکسایا۔

بیہودہ گنوار اس گماں پر ‍ ‍ ‍ ‍ سیدھا گیا تیر سا کماں پر
دن گھٹنے لگا قدم بڑھایا ‍ ‍ ‍ ‍ امید کہ اب خزانہ پایا
جتنی کوشش زیادہ تر کی ‍ ‍ ‍ ‍ اتنی ہی کماں پرے کو سرکی
پنہاں ہوئی قوس آخرِ کار ‍ ‍ ‍ ‍ اور ظلمتِ شب ہوئی نمودار

ناکام پھرا وہ سادہ دہقاں
حسرت زدہ، غم زدہ، پریشاں

شفق

شفق پر بہت سی نظمیں شعرا کے یہاں ملیں گی لیکن مولانا کے مشاہدے، احساس کے ساتھ ان کا اسلوب
بیان ان کی نظم کو ایک نئی چیز بنا دیتا ہے مولانا نے صرف تاثرات پیش نہیں کئے ہیں بلکہ نظم میں انکا سائنسی
نقطۂ نظر بھی جھلکتا ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے کہ شاعر کسی موضوع کی طرف کس نقطۂ نظر سے متوجہ ہوا ہے۔ پہلی
پڑھ کر قاری کو محسوس ہوگا کہ شام کے وقت ہماری آنکھیں فضا میں جس سُرخی کی گھلاوٹ کو دیکھتی ہیں اور ہم بیساختہ
منظر کی داد دینے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ مولانا نے اپنے الفاظ سے وہ رنگ بھرے ہیں اور معنی کا وہ حسن
پیدا کیا ہے کہ نظم پڑھتے ہوئے ذہن پر شام کی لہلہاہٹ چھا جاتی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجئے:۔

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار
ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ جنھیں دیکھ کر عقل ہوتی ہے دنگ

نیا رنگ ہے اور نیا روپ ہے ہر اک روپ میں یہ وہی دھوپ ہے
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ
ذرا دیر میں رنگ بدلنے لگی بنفشی و نارنجی و چمپئی
یہ کیا بھید ہے کیا کرامات ہے ہر اک رنگ میں اک نئی بات ہے
یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے باڑ بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ
فلک نیلگوں اس میں سرخی کی لاگ ہرے بن میں گویا لگا دی ہے آگ

اب آثار ظاہر ہوئے رات کے
کہ پردے چھُٹے لال بانات کے

نظم میں سائنسی شعور کی جھلک ہے۔ آخری اشعار میں محاکاتی انداز اپنے عروج پر ملتا ہے
غروب کے مختلف رنگوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔

مولانا کی فطری نظموں میں صرف نیچر کی بہار اور رنگینی کا سماں ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کے
کسی تجربہ یا اپنے مخصوص رجحان کو ضرور پیش کرتے ہیں۔ مثلاً "رات" پیش پا افتادہ موضوع ہے
اس میں انھوں نے انسان کے مختلف طبقوں کی راحت، کاروبار اور درختوں کا ذکر کیا ہے لیکن ایک شعر
بھی سرمایہ دار طبقہ کی شب گزاری کے لطف و عیش کے متعلق نہیں کہا۔ آخر شعر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ فطرت کا
خزانہ اور اس کی فیاضی غریبوں کے لئے ہے اس کے ایک شعر میں نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے یعنی تبدیلی سے
زندگی میں رونق ہے

نہ ہوتی رات تو دن کی پہچان کیا اٹھائے مزا دن کا انسان کیا

اس نظم میں رات کو کائنات پر بھی سکوت کا عالم ملتا ہے۔

درختوں کے پتے بھی چپ ہو گئے　　ہوا تھم گئی، پیڑ بھی سو گئے

اور آخر میں فیضانِ فطرت کا شاہد یہ شعر ہے:۔

کہاں ہیں یہ بادشہ کو نصیب　　کہ جس بے غمی سے ہیں سوتے غریب

برسات یہ مختصر نظم ہے مولانا نے آسمان پر گھٹا چھانے اور پھیلنے کا سماں اور فضا میں بارش سے پہلے جو ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ سب کو دو شعروں میں پیش کر دیا ہے۔

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا　　ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا

گھٹا کے جو آنے کی آہٹ ہوئی!　　ہوا میں بھی اک سنسناہٹ ہوئی

بارش ہونے پر جہاں آب و گل کا رنگ نکھرتا ہے اس کا بیان دیکھئے:

ہر اک پیڑ کا اک نیا ڈھنگ ہے　　ہر اک پھول کا اک نیا رنگ ہے

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا　　کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا　　وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا

ہزاروں پھدکنے لگے جانور

نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

دیہی نظمیں

مولانا کی شاعری کا یہ رجحان کہ انھوں نے زندگی کو اپنے مشاہدے اور احساس کا مرکز بنایا۔ ان کو اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ مولانا کے یہاں کھیتوں اور چھوٹی چھوٹی آبادیوں، ان کی سادگی، رونق، راحت کا ذکر، شام کو چراغوں کی روشنی صبح کو پرندوں کی آوازیں جھونپڑی، کچے مکان، چراگاہوں میں چرتے ہوئے مویشی اور کتے وغیرہ کا حال ملتا ہے۔

گرمی کا موسم مولانا کی ایک نظم ہے۔ بظاہر اس کو نیچرل شاعری کے ضمن میں آنا چاہیے، لیکن گرمی کے موسم سے جس شدت نے اثر قبول کیا ہے وہ دیہات میں بسنے والا ہے۔ شہروں میں موسم کی تبدیلی خارجی صورت میں نظر آتی ہے لیکن پورے ماحول اور انسانی جسم و ذہن پر موسم کا اثر صاف طور سے دیہات سے متعلق ہو جاتا ہے:۔

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ
بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا ہوا پیروں تلے پوشیدہ سایہ
چلی لو اور تڑاقے کی پڑی دھوپ لپٹ ہے آگ کی گویا کڑی دھوپ
زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے کوئی شعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے
در و دیوار ہیں گرمی سے تپتے بنی آدم ہیں مچھلی سے تڑپتے
پرندے اُڑ کے ہیں پانی پہ گرتے چرندے بھی ہیں گھبرائے سے پھرتے
درندے چھپ گئے ہیں جھاڑیوں میں مگر ڈوبے پڑے ہیں کھاڑیوں میں
نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی ! زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی
نہ پنکھا ہے نہ ٹٹی ہے نہ کمرہ ذرا سی جھونپڑی محنت کا ثمرہ

امیروں کو مبارک ہو حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

مولانا کی شاعری میں مزدور اور کسان دونوں طبقوں کی زندگی ملے گی۔ اس دور میں اُن طبقوں کو قابلِ توجہ سمجھنا شعور کی بیداری کا بیّن ثبوت ہے۔ انھیں مزدور کی زندگی جو جھونپڑی میں گزر رہی تھی اس کی تمام تلخ کامیوں کا احساس تھا۔ ان کے علم و مشاہدے نے یہ آگہی دی تھی کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے کسان ہی زمین کا مالک ہے اس کی محنت پر تہذیب و تمدن کی رونق اور ارتقا کا دارومدار ہے وہ کسان کو "اَن داتا" سمجھتے تھے۔

کاشتکاری

اپنی اس نظم میں کسان کی زندگی دکھائی ہے کسان کو طریقِ زراعت سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اس کی پیداوار اور پیداوار کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ کسان کے ساتھ بیل کا ذکر لازمی ہے۔ بیل کے اندر جفاکشی، سرگرم عمل، ناشتہ نہاری سے بے نیاز، رات کو جہاں چاہا آرام کر لیا۔ دن میں تکان دور کرنے کو زمیں پر کہیں بیٹھ گیا صبر و محنت، خوشی سے زندگی گزارنا۔ یہ سب باتیں بیل نے انسان کو سبق دیا ہے۔ کاشتکاری کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے اگر پوری نظم لکھی جائے تب بھی وہ مولانا کے اس شعر کی جامعیت کا جواب نہیں ہو سکتی:

کیمیا شغل کاشتکاری ہے
گنجِ زر خاک سے اُگلوایا !

عمل کا جذبہ پیدا کرنے کو اس سے بہترین دلیل ذہن کو مطمئن کرنے والی اور کیا ہوگی

نہیں حاصل یہ دسترس نہ سہی
بیج بونا تو اختیاری ہے

کسان کو بیک وقت دو باتوں کی تلقین ہے ایک مادیت ... متعلق کام میں تندہی اور ریاض اور دوسری طرف اخلاقی فرض کی بجاآوری۔ کسان کی کاہلی نہ صرف پیداوار کو کم کر دے گی جس سے کسان کی اقتصادی زبوں حالی یقینی ہے اور پورے ملک پر اور قوم پر پیداوار کی کمی اثر انداز ہو گی۔ اس کے علاوہ پیداوار کی کمی کاہلی کے سبب سے ہونا اصلاً کسان کا ذاتی فعل نہیں رہا بلکہ جماعت کا فرد ہو کر اس نے فرض سے کوتاہی برتی اور یہ فرض کی غفلت اصلاً گناہ کی حد میں آجاتی ہے

مولانا نے کسان اور بیل کی عملی زندگی کا بیان کر کے انسان کو مخاطب کیا ہے۔ آخری دو شعر اس نظم کا مرکزی خیال پیش کرتے ہیں۔

دیکھ چوپائے سے نہ بازی ہار　　　تیری ہمت اگر کراری ہے
کچھ نہ کچھ کام کر اگر تجھ کو　　　ادمیت کی پاسداری ہے

ہماری گائے

زبان کی سادگی اور موضوع کے عام ہونے سے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اس نظم کو بچوں کے ادب میں شمار کرنا چاہئے لیکن اس مقام پر اگر ہم ذہن کو بلند کر کے سوچیں تو یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ مولانا کے یہاں یہ موضوع عام کی زد میں نہیں ہے بلکہ اس میں ایک تخصیص ہے۔ تخصیص کے یہ معنی نہیں کہ موضوع، عام زندگی سے الگ ہے بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ مولانا کے کسی معاصر نے اس طرف توجہ نہیں کی اس لئے یہ موضوع مولانا کا خاص موضوع ہو کر رہ گیا ہے۔

دوسرے انداز میں سوچئے تو دیہی زندگی میں مزدور، کسان، دستکار، گھریلو دھندے چلانے والے، سب کے لئے گائے نہایت اہم ہے اس کے بچھڑے ہی کسان کی اصل دولت ہیں۔ جن کے باعث وہ پورے ملک کو غذا فراہم کرتا ہے۔ گائے کے دودھ سے بچے، جوان، بوڑھے سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ اسلئے بھی گائے قابل احترام ہے۔

اگر آج کے حالات میں "گائے" پر لکھا جائے تو وہ قومی یکجہتی کا ایک نشان ہو گا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے اُس دور میں گائے پر توجہ کی اس طرح قومی اتحاد، جذبۂ خیر سگالی اور اقتصادیات کے لئے اپنے فکر و فن سے بڑا کام لیا۔

اس نظم میں دیہی زندگی سے علامات لے کر خیال کا تسلسل بڑی عمدگی سے قائم رکھا ہے۔ خیال کا ارتقاء بتدریج اور ذہن کو متاثر کرنے والا ہے پوری نظم پڑھ کر اندازہ ہو گا کہ مولانا نے گائے کی پرورش، دودھ، غذا، روزانہ کا معمول، بچہ کو چاٹ کر اظہار محبت وغیرہ جملہ افعال و اوصاف کا تذکرہ اس طرح کیا ہے گویا اس پر نظم کہنے کے لئے مولانا نے مستقل طور پر ایک مدت معینہ تک تفصیلات کا جائزہ لیا ہے۔

گائے کی معصومیت اور سراپا کا حسن ایک ہی شعر میں نظم کر دیا ہے۔ اور اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

گائے کو دی کیا اچھی صورت خوبی کی ہے گویا مورت

اب پوری نظم میں جزئیات کی خوبیاں ملاحظہ فرمایئے:

ہماری گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی!
اُس مالک کو کیوں نہ پکاریں جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اس نے سبزہ بنایا سبزہ کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں دودھ بنی اب گائے کے تھن میں
سبحان اللہ، دودھ ہے کیسا تازہ، گرم، سفید اور میٹھا
دودھ میں بھیگی روٹی میری اُس کے کرم نے بخشی سیری
دودھ، دہی اور مٹھا مسکا دے نہ خدا تو کس کے بس کا
گائے کو دی کیا اچھی صورت خوبی کی ہے گویا مورت
دانہ، دُنکا، بھوسی، چوکر کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر
کھا کر تنکے اور ٹھٹیرے دودھ ہے دیتی شام سویرے
کیا ہی غریب اور کیسی پیاری صبح ہوئی جنگل کو سدھاری
سبزہ سے میدان ہرا ہے جھیل میں پانی صاف بھرا ہے
پانی موجیں مار رہا ہے چرواہا چمکار رہا ہے!
پانی پی کر، چارہ چر کر شام کو آئی اپنے گھر پر
دوری میں جو دن ہے کاٹا بچہ کو کس پیار سے چاٹا
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت دودھ ہے دیتی کھا کے بنسپت
بچھڑے اس کے بیل بنائے جو کھیتی کے کام میں آئے

رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ایسی گائے بنائی

مولانا نے موضوع میں "ہماری" کا لفظ لکھا ہے جو اضافیت کے لئے جمع کا صیغہ ہے۔ میری گائے نہیں لکھا۔ "ہماری گئے" لکھا ہے۔ جس سے تعمیم پیدا ہوتی ہے اس طرح مولانا کا یہ مصرع لیجئے۔
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت"۔ اس میں بھی میرے نہیں لکھا ہمارے لکھا جو جمع کا صیغہ بھی ہے اور عمومیت کا عکاس بھی۔ پھر معنوی اعتبار سے دیکھئے گا کہ گائے کو "نعمت" کہہ دینے کے بعد صفت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہا۔

مولانا اسماعیل میرٹھی قدیم دور کی تعلیم و تربیت کے باوجود ذہن کے اعتبار سے نئے انسان تھے وہ جدید علوم وفنون سے لگاؤ رکھتے تھے اپنی شاعری کے ذریعہ ان کی تبلیغ کی اور انھوں نے بیباکی کے ساتھ سرسید کی علمی تحریک کا ساتھ دیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد قوم کی لیڈر شپ دانشوروں کے ہاتھ میں آگئی تھی لیکن مسلمانوں میں متوازی طور پر علما کی آواز کی اثر انداز ہوتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دربار سے رسوخ ختم ہونے پر علما نے قوم پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی تھی۔ بہر حال خالص تعلیمی مسئلہ میں سرسید اور ان کے رفقا کی کوشش تھی کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کر کے اپنی اقتصادی اور سماجی بنیادوں کو مضبوط کریں اور ملک میں ایک معزز شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کریں ان کے ذہنوں میں نئی تہذیب کا اُجالا ہو، تاکہ وہ پچھڑے پن کا شکار ہو کر کمتری کے جذبہ میں مبتلا نہ رہیں لیکن بعض علماء اور تنگ ذہن افراد نے مخالفت کی۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کو ملازمت کے ذریعہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مغربی علوم وفنون کا سیکھنا بہت ضروری ہے

ان کی نظم "مسلمان اور انگریزی تعلیم" اس دور کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک دن تھا بحکم سرکاری	گئے اسکول جابجا کھولے
نہ تو کچھ فیس تھی نہ داخلہ تھا	مفت تعلیم تھی اُسے جو لے
ہم مسلمان سب اکڑ بیٹھے	پہلے فتوی جواز کا ہو لے
منہ زبانی بھی اور لکھ کر بھی	پوچھ گچھ کی تو "مولوی" بولے
ایسی تعلیم سے تو بہتر ہے	آدمی نوکری کہیں ڈھولے
ان کو تنقیص دین کی سوجھی	تھے تعصب کے آنکھ میں پھولے
وہم و وسواس کے رہے چلتے	سالہا سال توپ اور گولے
انتظام امور دنیا کو	کیا سمجھتے یہ جنتی بھولے

جس کو ہو کچھ بھی فہم سے بہرہ اپنے شربت میں زہر یوں گھولے
رہ گیا بے خبر، تو بات کو پھر کون میزانِ عقل میں تولے
رہے علم معاش میں کورے شہر، قصبے، محلے اور ٹولے
ہیں ہمارے جو اور ہمسائے گویا بیٹھے ہی تھے وہ منہ کھولے
خوانِ یغما پہ جا کے ٹوٹ پڑے بھر لئے ٹھونس ٹھونس کر جھولے
لگی ہلدی نہ پھٹکری اور مفت خوب موتی معاش کے رولے
ملکوں کی پلٹ گئی کایا ! آفتوں کے بدل گئے چولے
کہا سید نے قوم سے ناداں تو بھی اٹھ بیٹھ، ہاتھ منہ دھولے
پیچھے امید جمع خرمن کر پہلے کھیتوں میں بیج تو بو لے
تب ہوئی کچھ جھجھک ہماری دور اور ہم نے بھی بال و پر کھولے
مگر اس قیمیِ کی گرانی سے متواتر لگے وہ ہچکولے
حوصلہ کا نکل گیا بھرکس ! اور بہت سے کے ہو گئے ہولے

الغرض وہ مثل ہوئی اپنی
سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے

اس نظم میں مولانا نے بیت میں اپنی دوسری نظموں سے الگ راہ اختیار کی ہے۔ مطلع نہیں ہے دوسرے مصرعوں میں صرف قافیہ کی پابندی ہے۔ اس نظم سے صاف ظاہر ہے کہ وہ "مولوی" کو تنگ نظر، کم فہم، رہبر نیچر اور علم معاش سے بیگانہ، ایک جذباتی کردار کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ مولانا کے یہاں مسلمانوں کا وجود ایک قوم کی حیثیت رکھتا تھا لیکن وہ قوم ایسی تھی کہ سر سید کے جگانے پر بیدار اس وقت ہوئی جب بہتر موقع ضائع ہو چکے تھے۔

مولانا کا ذہن مغربی تعلیم وفن کے علاوہ سائنس کی ایجادات سے بھی متاثر تھا ان کی نظموں میں جدید سائنس کے نقطۂ نظر کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ اُن کا ہم نے اشارہ بھی کیا ہے لیکن مولانا کے ذہن کی نمائندہ نظم "ریل گاڑی" ہے۔ مولانا کے معاصرین نے اور خصوصاً آزاد و حالی نے فطری مناظر میں اپنے موضوعِ نظم تلاش کئے ہیں۔ سماج سے بھی موضوعات لے گئے ہیں لیکن نظم جدید کے تصور سے موضوع کی اتنی ہم آہنگی کوئی پیدا نہ کر سکا۔

"ریل گاڑی" کے آخری دو شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔

اس لئے اس کو بچوں کے ادب میں شامل کرنا چاہئے تھا لیکن موضوع کی سائنسی اہمیت کی وجہ سے اس پر یہاں نظر ڈالی جاتی ہے

اس نظم میں مولانا نے "ریل" کی صورت میں سائنس کا پورے ملک میں فیضان، سماج میں اسکی برکتیں، تجارت کی سہولت، صنعت و حرفت کا فروغ، ملک ملک کے انسانوں کا ملاپ، اور دنیا کی شہ کو مولانا نے ایک علامت یعنی "ریل" سے وابستہ کر کے دکھایا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ، مقتضائے حال، روزمرہ، محاورہ کے ساتھ محاکاتی پہلو کے عمدہ نمونے اس نظم میں پائے جاتے ہیں۔ مولانا کے اس موضوع کا ترقی پسند شاعروں نے اثر قبول کیا۔ اسرار الحق مجاز کی نظم "ریل" اسی تاثر کا نتیجہ ہے وہ مقبول بھی ہے اور مولانا کے انداز کی تفصیل بھی ـــ چند شعر مولانا کے ملاحظہ فرمائیے۔

حیواں ہے وہ نہ انساں، جن ہے نہ وہ پری ہے
سینہ میں اس کے ہر دم اک آگ سی بھری ہے

کھاتی کے آگ پانی، چنگھاڑ مارتی ہے
سر سے دھواں اڑا کر، غصہ اتارتی ہے

وہ گھورتی گرجتی، بھرتی ہے اک سپاٹا
ہفتوں کی منزلوں کو گھنٹوں میں اس نے کاٹا

آتی ہے شور کرتی، جاتی ہے غل مچاتی
وہ اپنے خادموں کو ہے دور سے جگاتی

پردیسیوں کو جھٹ پٹ پہنچا گئی وطن میں
ڈالی ہے جان اس نے سوداگری کے تن میں

برکت سے اس کی بے پر، پردار بن گئے ہیں
ملک اس کے دم قدم سے گلزار بن گئے ہیں

ہم کہہ چکے مفصل جو کچھ ہے کام اس کا
جب جانتیں تم بتادو، بن سوچے نام اس کا

جی ہاں سمجھ گیا میں، پہلے ہی میں نے تاڑی
وہ دیکھو آگرہ سے آئی ہے ریل گاڑی

تصوف و معرفت

مولانا اسماعیل میرٹھی کی پرورش اور تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اس لئے ان کا طبعی رجحان زہد و قناعت کی طرف زیادہ تھا کسب معاش کو وہ ضروری سمجھتے تھے لیکن روح کی غذا پر زیادہ زور دیتا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں وہ مولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدوں میں شامل ہو گئے تھے ان کے فیضان سے مولانا اسماعیل کی طبیعت پر تصوف کا رنگ گہرا ہوتا گیا ان کو اپنے پیر و مرشد سے بے پناہ عقیدت تھی وہ خود بھی ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے اس کے علاوہ تصوف کے بارے میں اپنے شیخ کے ارشادات سے بہت زیادہ واقفیت بہم پہنچائی۔ مولانا اسماعیل کے پیر بھائیوں میں ڈپٹی نجم الدین، مولوی گل حسن، قاضی فتح محمد لدھیانوی، نواب محمد ابراہیم عرف نواب پہلوان دہلوی، شیخ احسان اللہ جھجر، حافظ ظہور محمد انصاری مدنی، میر غالب حسین بریلوی، وغیرہ شامل ہیں۔ بعض پیر بھائی مولانا میرٹھی سے تصوف و معرفت کے متعلق نظمیں کہنے کی فرمائش کیا کرتے تھے انھوں نے اپنے شیخ کے حضور "نذرِ عقیدت" میں والہانہ اور جذبۂ خلوص و نیازمندی کا اظہار کیا ہے۔ شیخ کے وصال پر طویل نظمیں لکھی ہیں نظم میں شیخ کے اوصاف اور فیضان کا رقت آمیز انداز میں بیان کیا ہے۔

مسائل تصوف اور نکات معرفت کی تبلیغ کے لئے بھی نظمیں کہی ہیں بعض کا ذکر "مثنویات" کے تحت ہو چکا ہے مثلاً صنائع الٰہی، خدا کی صنعت، حمدِ باری تعالیٰ، مناجات رحمۃ اللعالمین، مثنوی فی العقائد، شمع تہستی، شمع ہدایت وغیرہ۔ ان کے علاوہ نظم کی صورت میں مختلف ہیئتوں کے ساتھ بھی تصوف کے موضوع پر مواد ملتا ہے۔ مثلاً صفتِ شیخ، میرا خدا میرے ساتھ ہے، ہفت ورود محمود، تماشائے خیالی، علیک السلام، اے شفیع البرایا، تو ہی ظہور کون و مکان، زمانہ تن پرستی میں گوارا، نہیں معلوم کیا واجب ہے، السلام اے شاہ، یاد الٰہی، ساقی خمخانہ وغیرہ نظمیں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ان نظموں میں 'میرا خدا میرے ساتھ ہے' مخمس کی صورت میں ہے۔ پانچواں مصرع مستقل ہے یعنی "کیوں کہ میرا خدا ہے میرے ساتھ" باقی چار مصرعوں میں کہیں قافیہ اور کہیں قافیہ و ردیف دونوں کی پابندی ہے "ہفت ورودِ محمود" سید غوث علی شاہ کے وصال سے متعلق ہے بہت طویل ہے۔

اس میں تقریباً ایک سو تیس (۱۳۰) اشعار ہیں۔ اس میں جس ہیئت سے کام لیا گیا ہے وہ دوسری نظموں میں مستعمل نہیں کی گئی۔

یہ نظم ترجیع بند میں ہے۔

مختلف ہیئتوں کا استعمال

مولانا نے مثنوی کی ہیئت کے علاوہ اور دوسری ہیئتوں سے بھی کام لیا ہے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔
مثلاً "مثلث" میں دو نظمیں درج ہیں

(۱) اب آرام کرو ۔

(۲) خدا حافظ، خدا حافظ کوئن کا

پہلی نظم میں جھٹپٹے کا سماں، سورج کا چھپنا، پرندوں، چرندوں کا اپنے آشیانوں میں اور تھان میں پہنچنا وغیرہ مختلف دن بھر کے کاروبار کا ذکر کیا ہے، لیکن اس مشاہدے میں گھر میں پالی ہوئی مرغیوں کا تذکرہ بتا ہے عموماً شعرا اپنے ماحول کی ضروری اشیا کو بھی غیر اہم سمجھ کر اپنی شاعری میں جگہ نہیں دیتے۔ مولانا کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کی نظر سے معمولی چیزیں بھی نہیں بچ پاتیں ۔ وہ ان میں بھی قدر کی چیز تلاش کر لیتے ہیں۔ مثلاً

یہ جو کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں ڈھونڈتی ہیں اپنے ڈربے کا نشاں

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

اس نظم کی فضا میں مولانا نے فطری مناظر کو بھی آرام کا خواہاں پایا ہے

آب و ہوا کے تیز جھونکے رک گئے سو گئے پیڑ اور پتے جھک گئے

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا!

دوسری نظم جلسہ سالگرہ ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ میں پڑھی گئی ۔ مولانا نے یہ نظم شیخ نظام الدین بیرسٹر خان بہادر حافظ عبد الکریم سی۔ آئی ۔ ای ۔ رئیس لال کورتی کو لکھ دی تھی اور انھوں نے ہی جلسہ میں پڑھی تھی۔ آخری بند میں نظام الدین کا نام درج ہے

نظم میں سادگی ہے، روانی ہے ۔ مبالغہ نہیں ہے۔ پہلے دو بند اور آخری بند درج کئے جاتے ہیں۔

خوشی کا مشغلہ ہو رات دن کا شمار افزوں ہو اُس کے سال و سن کا
خدا حافظ، خدا حافظ، کوئن کا

ہے امن اُس کی شہنشاہی میں ہر جا سکھی ہیں آج راجا اور پرجا
خدا حافظ، خدا حافظ، کوئن کا

آخری بند:

نظام الدین کی ہے التجا یہ! نکلتی ہے ترے دل سے دعا یہ
خدا حافظ، خدا حافظ، کوئن کا!

اور انصاف اور خوش اقبالی کی بڑی دھوم دھام تھی ۔
مولانا اسمٰعیل نے "مربع" کی ہیئت میں صرف دو نظموں پر ہی قناعت کی ہے ۔

۱۔ اچھا زمانہ آنے والا ہے ۔
۲۔ بچپن میں خدا کی یاد ۔

یہ نظم موضوع کے اعتبار سے ہی قابل قدر نہیں ہے بلکہ پوری نظم میں رجائیت کی جلوہ سامانی ہے اس میں آٹھ بند ہیں انکا مطالعہ کرکے قاری کو یہ محسوس ہوگا کہ یہ نظم مولانا کے دور کی چیز نہیں ہے بلکہ ہمارے زمانہ کی تخلیق ہے اس نظم کو مستقبل کا پیغام اور مولانا کی بشارت کہنا چاہئے ۔

مولانا نے ایک خوش آئند اور بہتر سماج کی بشارت دی ہے ان کی یہ نظم ملکی حیثیت کی نہیں ہے بلکہ نظام عالم سے متعلق ہے ۔ وہ مستقبل کے بارے میں اپنا تجربہ اور ذہن رسا کا نتیجہ یوں پیش کرتے ہیں کہ اب اس زمین پر اسلحہ کا استعمال طاقت کے مظاہرے اور ملک گیری کی ہوس کے واسطے نہ ہوگا بلکہ اسلحہ سے "سچائی" کی حمایت کی جائے گی ۔ تلوار کی جگہ نظم یہ کام کرے گا حق و باطل کا فیصلہ جیت ہار کا نتیجہ دماغ کے اندر نظریہ کی جنگ سے پیدا ہوگا ۔ اسلحہ ایک ذریعہ کے طور پر استعمال ہوں گے اصل غلبہ اور اقتدار "زبان قلم" یعنی قانون و دستور کو حاصل ہوگا ۔ سماج کی تقسیم طبقاتی طور پر نہ ہوگی، طبقاتی بنا پر سماج میں ذلت و عزت کا تصور نہ ہوگا ۔ بلکہ سیرت کے اوصاف کی قدر ہوگی ۔ انفرادی شخصیت کی خوبیاں سماج میں عظمت کا باعث بنیں گی ۔ عظیم کارناموں کی بنا پر عظیم شخصیت کو تسلیم کیا جائے گا ۔ نخوت تفاخر، برتری، شیخت، ادنیٰ اعلیٰ وغیرہ انسانی کمزوریاں قابل اعتنا نہیں رہیں گی ۔ جنگ بازی کو انسانیت کا دشمن سمجھا جائے گا ۔ تعصب، نفرت، عقیدے کے پردے میں رقابت کا جذبہ اور اس قبیل کے تمام اخلاقی معائب ختم ہو جائیں گے ۔ مذہب کی روح کو انسان پسند کرے گا جس سے بہتر معاشرہ ترتیب پا سکے اور سماج میں شادابی، خیر، برکت اور رونق پیدا کرنے کو اتحاد ناگزیر ہے ۔ عوام کے تعاون اور اتحاد سے بڑے مشکل کام آسان ہو سکتے ہیں ۔

بچپن میں خدا کی یاد

اس نظم میں بچے کو بھی خدا کی قدرت کا معترف دکھایا گیا ہے وہ روز خدا کا نام سنتا ہے نفسیاتی طور پر اس کے کان ایک لفظ سے آشنا ہو چکے ہیں اور ذہن میں ایک تصور جم گیا ہے ۔ پہاڑ، میدان، دریا، پھول، پتے، درخت اور ساری دنیا کے چاند تاروں کو دیکھ کر بچہ بھی خدا کی کاریگری کو مانتا ہے اور خدا کو مہربان سمجھتا ہے ۔
مولانا اسمٰعیل نے مخمس کی صورت میں پانچ نظمیں لکھی ہیں ۔

۱۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے (۲۰ جولائی ۱۸۸۷ء)
۲۔ صبح کی آمد ۔
۳۔ کوشش کئے جاؤ ۔
۴۔ چھوٹی چیونٹی
۵۔ خدا قیصر الہند کو سلامت رکھے ۔

ان میں "صبح کی آمد" طویل نظم ہے لیکن خیال و بیان کے اعتبار سے بہت عمدہ نظم ہے اس میں عمل کی تلقین ہے۔ ساری کائنات جاگ اٹھی ہے اور اس کی بیداری میں انسان کو بیداری کا سبق پیش کیا ہے۔ ایک بند سے اس کے حسن تلقین حسن عمل کا اندازہ ہو جائے گا۔

ہر اک باغ کو اس نے مہکا دیا ہے نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے
چمن سرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

کوشش کئے جاؤ اس نظم میں پند آموزی ہے حوصلہ افزائی کا عنصر غالب ہے۔ یہی شاعر کے خیال کا سہارا الفاظ ہی ہیں ایک بند میں شاعر نے مشاہدے کے سہارے تمثیل پیش کر کے اثر پیدا کی شان پیدا کی ہے

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
رہو گے اگر تم یونہیں مستقل تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل
کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

اس نظم کا مرکزی خیال جس کو پوری نظم کی جان سمجھئے۔ شاعر نے ایک مصرع میں معجز نما انداز میں پیش کر دیا ہے ـــــ "طلب میں جیو، جستجو میں مرو" مولانا کی نظم "چھوٹی چیونٹی" موضوع کے اعتبار سے نئی نہیں ہے۔ اس میں مشاہدہ کی گہرائی بھی نہیں ہے کسی تمثیل کے ذریعہ اس کو زیادہ موثر بھی نہیں بنایا گیا ہے لیکن اس میں ایک خوبی ضرور ہے۔ صرف چیونٹی کی زندگی کا پیش نہیں کیا ہے بلکہ اس کے عمل کی بنیاد راست خیالی اور عاقبت اندیشی پر رکھی ہے۔ موسیت کے ساتھ یہ بند قابل توجہ ہے۔

کبھی کام تو نے ادھورا نہ چھوڑا کبھی تو نے تکلیف سے منہ نہ موڑا
بہت کام تو نے کیا تھوڑا تھوڑا ذخیرہ یہ جاڑے کی خاطر ہے جوڑا
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں

مسدس کی ہیئت کو حالی نے اس خوبی اور سلیقہ سے برتا کہ وہ شعراء مابعد کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گیا ہے لیکن مولانا نے اس ہیئت کو اس سطح پر استعمال نہیں کیا جو ان کی نظموں میں ایک انفرادی حیثیت پیدا کرنے کا سبب قرار پاتی۔ چند نظمیں مسدس میں ملتی ہیں۔

۱۔ ماں کی مامتا　　۲۔ میدان کارزار (روس اور ترکی جنگ)

۳۔ حسیاتِ غم (مرثیہ: سید اقبال احمد ہمشیرزادہ مصنف اقبال کا انتقال ۲۲ سال کی عمر میں ۱۹۰۲ء میں ہوا۔

۴۔ انسان (دو بند)　　۵۔ محنت کرو (دو بند)

۶۔ نفسِ سرکش (ایک بند)

"ماں کی مامتا" میں کفالت اور تربیت کے فرائض کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے اس نظم میں جزئیات کا حیرت انگیز احاطہ کیا گیا ہے۔ بیان کا انداز اتنا مانوس ہے کہ ماں کی شخصیت قابلِ قدر اور بچے کی شخصیت سے پیار ہو جانا یقینی امر ہے۔

سید المرسلین کی شان میں "ہفت درود محمود" کو ترجیع بند کا لباس دیا گیا ہے۔ اس میں آٹھ بند ہیں ایک بند میں حالی کے مسدس کی ردیف اور قافیہ "پانے والا" "کھانے والا" کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن مولانا اسماعیل نے جس بحر کا انتخاب کیا ہے وہ مترنم نہیں ہے۔ اس لئے مذکورہ قافیہ اور ردیف کی پابندی نے وہ ترنم کی فضا پیدا نہیں کی جو حالی کے یہاں اس قسم کے مصاریع میں ملتی ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

مثلاً مولانا اسماعیل کے مصاریع کو دیکھئے۔

وہ علم و حکمت سکھانے والا　　پیامِ حق کا وہ لانے والا

"جذباتِ الم" سید غوث علی شاہ کی شان میں ہے اس میں سات بند ہیں اس کے بیان میں رقت ہے۔ صداقت پھوٹی پڑتی ہے۔ نہایت شدید جذباتِ عقیدت و محبت کا اظہار ہے۔

مثمن

"آثارِ سلف" (مشتمل کیفیت قلعہ اکبرآباد)

یہ مولانا کی طویل ترین نظم ہے اس میں ستر (۷۰) بند ہیں۔ مولانا نے اپنے معاصرین شعراء کی روش سے ہٹ کر اس نظم کے لئے مسدس کی بجائے "مثمن" کی ہیئت پسند کی ہے ایک خیال یہ ہے کہ حالی نے اپنی نظم مسدس کی مقبولیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے مولانا اسماعیل نے اس طرف توجہ نہیں کی اور مثمن میں عہد رفتہ کی داستانِ عظمت و جلال پیش کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن ہمارا خیال

یہ ہے کہ "برج مثمن کے مشاہدے نے مولانا کے ذہن کو اس طرف مائل کیا اور انھوں نے اپنے موضوع کے لئے "مثمن" کی ہیئت کو پسند کیا۔

یہ نظم متنوع موضوعات کے لحاظ سے مولانا اسماعیل کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ یہ نظم "قلعہ اکبرآباد" سے متعلق ہے۔ مولانا نے آگرہ میں بہ سلسلۂ ملازمت طویل مدت گزاری۔ قلعہ اکبر آباد کو دیکھ کر ان کے ذہن میں جو تاثرات مترتب ہوئے اصل مقصود انھیں کا بیان ہے لیکن ان تاثرات نے شاعر کے ذہن میں ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانوں کو ایک آئینہ کی صورت میں رکھدیا ہے۔

جہاں دور اکبری کا ذکر ہوا ہے وہاں ہندوستان کی قدیم تاریخ اور دولت ایران کی پرانی تاریخ کے اشارات بھی ملتے ہیں۔ بکرم، بھوج، اردشیر، کسریٰ، سکندر، جمشید وغیرہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ علم وفن کی داستان کے ورق کھلتے ہیں تو فیضی و ابوالفضل کے تذکرے میں بوعلی سینا، فلاطون اور مامون کے اوصاف جھلکنے لگتے ہیں۔ سیاست کی بات نکلتی ہے تو غوز وغزنین کی سرگزشت اور سمرقند و بخارا کی دلفریبی تک پہنچ جاتی ہے۔ علماء کی مجلس کا نقشہ سامنے آتا ہے تو فارابی، طوسی، رازی اور غزالی کی دستار فضیلت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ قلعہ اکبرآباد کی مخاطبت میں مغلیہ تاجداروں کے عروج کی تصویر بھی ہے اور آخری مغلوں کے زوال کا نقشہ بھی۔ جس کے ضمن میں جاٹوں کی سرافرازی اور انگریزوں کے رایت اقبال کی بلندی کا بیان مطلب ہے

ان متنوع موضوعات سے مولانا اسماعیل میرٹھی کی علمیت ثابت ہوتی ہے اور نظم کی خوبی کا جواز بھی ملتا ہے۔ اس لئے کہ متنوع موضوعات سے نظم کے مفہوم کو عظمت ملی ہے لیکن موضوعات کی وسعت ہی اس نظم میں سب کچھ نہیں ہے۔ مولانا اسماعیل نے اپنے اسلوب سے اس نظم کو شاعرانہ حسن عطا کردیا ہے۔ ہرچند نظم کا حسن پوری اکائی میں ایک آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ الگ الگ ٹکڑے کے حسن کو پیش کرنے سے حسن تمام کی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی لیکن مجبوری یہ ہے کہ ستر بندی کی طویل نظم قاری کے سامنے پیش کرنا دشوار ہے۔ اس لئے چند مخصوص بند پیش کئے جاتے ہیں۔ آئینے کے ٹوٹے ہوئے ہر جز میں بھی آئینہ کی صفت باقی رہتی ہے اور اصلی صورت نظر آجاتی ہے اسی طرح الگ الگ ہر بند میں پوری نظم کے حسن کا جلوہ نظر آسکتا اور اس سے قاری کا ذہن پوری نظم کے حسن کا اندازہ کرسکیگا۔ ابتدائی بند میں ترکیب، تشبیہہ اور خیال کی لطافت محسوس کرنے کی چیز ہے۔

یارب یہ ہی محل گشتہ کا دھواں ہے ۔۔۔ یا گلشن برباد کی یہ فصل خزاں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے ۔۔۔ یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے

یاں دورِ گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے — باقی عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

اُڑتا تھا یہاں پرچم جسم جاہی اکبر

بجتا تھا یہاں کوس شہنشاہی اکبر

دو بندوں میں قلعہ کے باہر کا منظر، آب جمن اور خندق کا ذکر کرتے ہوئے قلعہ کے در و محراب اور اس کے تعمیری حسن کا بیان ہے۔ چوتھے اور پانچویں بند میں "قصر معلّیٰ" اور سلاطین مغلیہ کے عظمت و جلال کا فسانہ نہایت روانی اور تاثیر کے ساتھ ملتا ہے۔

اکبر سا کبھی مخزن تدبیر یہاں تھا — یا منطقۂ دورِ جہاں گیر یہاں تھا

یا شاہ جہاں مرجع توقیر یہاں تھا — یا مجمع ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا

القصہ کبھی عالم تصویر یہاں تھا — دنیا سے سوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا

بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر

تھے جشن ملوکانہ اسی قصر کے اندر

یہ قصرِ معلّیٰ کہ جہاں عام تھا دربار — آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار

اور سقف زر اندود ہے مانند چمن زار — اور فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار

اب بانگ نقیب اس میں نہ چاؤش کی للکار — سرہنگ کمربستہ نہ وہ مجمع حضار

کہتا ہے کبھی مرکز اقبال تھا میں بھی

ہاں قبلہ گہ عظمت و اجلال تھا میں بھی

دربار خاص میں بخشی، دربان، خدام، اعیانِ سلطنت، فتوح ممالک، اورنگ سیہ رنگ (تخت جہاں گیر) خان و خواتین وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے اور "برج مثمن" کی کیفیت کے ساتھ کارِ جہاں کی بے ثباتی کا نقشہ قابل دید ہے

وہ رنگ محل برج مثمن کا وہ انداز — صنعت میں ہے بے مثل تو رفعت میں سرافراز

یاں مطرب خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز — گہ ہند کی ٹھمری تھی کبھی نغمۂ شیراز

اب کون ہے بتلائے جو کیفیت آغاز — زنہار کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز

جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ برج منور

اب ان کا مقابر میں تہ خاک ہے بستر

اُس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب — فوارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب

وہ جام بلوریں ہیں نہ وہ گوہر نایاب — وہ چلمنِ زرتار نہ وہ بستر کمخواب
ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب — یہ معرضِ خدّام تھا وہ موقفِ حجّاب
وہ بزم نہ وہ دورد نہ وہ جام نہ ساقی
ہاں طاق و رواق اور در و بام ہیں باقی

تعمیری حسن کی وحدت میں رنگِ کثرت کا اظہار مولانا اسماعیل نے جس قدرت اور علامتوں کے سہارے کیا ہے وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ لفظ و معنی کا یہ ربط اتنے لطیف اور کیفیت سے لبریز انداز میں دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔

مستور سراپردۂ عصمت میں تھے جو گل — سو دودۂ ترک اور مغل ہی سے نہ تھے گل
کچھ خیری فرغانہ تھے کچھ لالۂ کابل — پھر مولسری ہند کی ان میں گئی مل جل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامّل — تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمل
سیّاحِ جہاندیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالاتِ مرکّب کی ہے تصویر

اس کے بعد والے بندوں میں سماجی حالت اور درباری رسموں کا تذکرہ ہے۔ درشن جھروکہ، تُلادان، زنجیرِ عدل، نورجہاں اور ممتاز محل کا حُسن اور ذہانت رانی، جودھابائی کی ثروت و حشمت، ان کے محلوں کا عالم، سب چیزوں کے اشارے ہیں۔ اس کے بعد مولانا اسماعیل نے مسجد کی روداد بیان کی ہے اس میں عظمتِ رفتہ کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں اور حسنِ تعمیر کی جھلک ملتی ہے۔ شعریت، رومانیت، صداقت، رمز و ایما کا حسین ترین امتزاج ملتا ہے۔

وہ مسجدِ زیبا کہ ہے اس بزم کی دلہن — خوبی میں یگانہ ہے وہ لے سادہ و پُرفن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن — موتی سے ہیں دالان تو ہے دودھ سا آنگن
کافور کا تودہ ہے کہ الماس کا معدن — یا فجر کا مطلع ہے کہ خود روز ہے روشن
بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
یا ظل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس
ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے — سانچے میں عمارت کے مگر ڈھال دیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے — مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے

گو شمع نہ فانوس نہ بتی نہ دیا ہے — ہاں چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے
چلئے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظارہ کی دو مجھ کو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی — اس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی میں نشانی
کچھ شوکت ماضی کی کہی اس نے کہانی — کچھ حالتِ موجودہ بایں سحر بیانی
ان حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی — قوّارہ کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی
تسبیح نہ تہلیل نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشہ تنہائی ہے اور قفلِ گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا — مجمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا
پڑھا جاتا تھا شب و روز یہاں کلمہ خدا کا — ہوتا تھا اذان خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عز و علا کا — جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا ہوا کا
ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکین

"مسجد" کے ان بندوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمارا ذہن اقبال کی "مسجد قرطبہ" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور یہ گمان گزرتا ہے کہ اقبال کے ذہن کا مسجدِ قرطبہ سے متاثر ہونا اور اظہارِ خیال کرنا ممکن ہے اسی مثمن کے مطالعہ کا نتیجہ ہو۔ اس لئے کہ اس نظم کا تفصیلی پس منظر اور تنوعِ موضوعات دیکھنے کے بعد اقبال کے یہاں بجز اسلوب بیان کے کوئی ندرت یا اضافہ نہیں ملتا۔ مولانا اسماعیل میرٹھی نے اسلاف کے اوصاف سیرت پر خصوصی توجہ کی ہے۔

وہ عیش کے مملوک تھے نے بندۂ راحت — گلگشتِ چمن دار تھی گویا انہیں عزت
برداشت جفا کرتے تھے سہتے تھے صعوبت — اوروں کے بھروسے پہ نہ کرتے تھے معیشت
دنیا کے کسی کام میں ہیٹی نہ تھی ہمت — بے غیرتی زنہار نہ تھی ان کی جبلت
ہمت میں تھے شاہین تو جرأت میں تھے شہباز
عزت کی بلندی پہ کیا کرتے تھے پرواز

اس بند میں "شاہین و شہباز" کی علامتیں مستعمل ہوئی ہیں۔ یہ مولانا اسماعیل کی اختراعِ ذہن ہے۔ تصوف کی راہ سے انھوں نے ان علامتوں کو اپنایا ہے۔ اقبال نے یہ علامتیں مولانا اسماعیل سے

مستعار لی ہیں اور ان کو اپنا بنا لیا ہے۔ اقبال کے یہاں خودی کا فلسفہ شاہین و شہباز کی مدد سے مرتب ہوا ہے اور انھیں علامتوں سے ابلاغ میں مدد لی گئی ہے۔

مولانا اسماعیل نے عظمتِ دیرینہ کے ساتھ قوم کے اخلاقی زوال کو بھی پیش کیا ہے۔

ہم چاہتے ہیں عیش بھی اور ناموری بھی — دولت بھی ہمیں چاہیئے اور بے ہنری بھی
اعزاز بھی مطلوب ہے بیہودہ سری بھی — آوارگی منظور ہے اور راہبری بھی
مقصود ترقی بھی ہے مگر جامہ دری بھی — گر پستیٔ ہمت ہے تو عالی نظری بھی

یہ بات تو ہوگی نہ ہوئی ہے کبھی آگے
پھرتے ہیں محالات کے پیچھے یونہیں سگے

بیشتر بندوں میں مولانا اسماعیل نے قوم کے ادنیٰ کردار کا ماتم کیا ہے انھوں نے اپنے زمانہ کا تاریخی اور سماجی نقشہ دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ اب برطانوی اقتدار کو ہٹا کر ہندوستانیوں کی حکومت کا خواب دیکھنا تضیعِ اوقات ہے اس لئے انھوں نے مثبت رائے قائم کی اور مثبت مشورہ دیا۔

یہ جنگ نہیں توپ کی یا تیغ و تبر کی — اس جنگ میں کچھ جان کی جوکھوں ہے نہ زر کی
یہ جنگ ہے اخلاق کی اور علم و ہنر کی — یہ جنگ ہے تحصیل عمل اور نظر کی
اس جنگ میں آسودگی ہے نوعِ بشر کی — آزادی ہے ملکوں کی تو آبادی ہے گھر کی

یہ جنگ نہیں وضعِ مروت کے منافی !
اس جنگ سے مافات کی ممکن ہے تلافی

یہ گویا مسلمانوں کے مستقبل کو شاندار بنانے کا ایک نیا عہدنامہ، ایک بشارت تھی اس نظم کے آخری بند ویسے نہیں بند ایسے ہیں جن میں قوم کی فاقہ مستی اور علماء کی روشِ تکفیر کا تذکرہ کیا ہے ان کی شمولیت سے نظم کے تسلسل میں ہول پڑ گیا ہے۔ یہ بند بعد میں دستیاب ہوئے ہیں اس لئے مناسب مقام پر درج نہ ہو سکے۔

مولانا اسماعیل نے آخر میں نوجوانوں کو عظمتِ کردار کی تلقین کی ہے۔ اور علم کی شمع سے اپنی زندگی روشن کرنے اور مستقبل کو منور بنانے کا پیغام دیا ہے۔ اس نظم کو "کلیاتِ اسماعیل" کا شاہکار کا درجہ دیا جا سکتا ہے

(باقی آئندہ) ....

محمد انصار اللہ

قواعدِ ہندی ریختہ

مقدمہ

زبان اردو کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی ؟ یہ سوال عرصے سے محققین کے زیر بحث چلا آتا ہے۔ آزاد دہلی نژاد نے اس کی اصل برج بھاشا کو ضرور قرار دیا تھا لیکن وہ اس زبان کو چلا دینا دہلویوں کا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اس نظریہ سے اختلاف کیا اور یہ کہا

" اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔" (پنجاب میں اردو ص ۱۹)

پروفیسر موصوف نے نہایت محنت و کاوش سے قدیم اردو کے کئی نمونے پیش کئے اور پنجاب میں اردو کی ایک مسلسل ادبی تاریخ پیش کر دی۔ پروفیسر موصوف کا یہ کارنامہ وہ ہے جس پر بہر حال فخر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ " اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں "۔ دہلی میں اردو کی قدامت ثابت کرنے کیلئے بعد کے محققین نے اردو کے سارے قدیم سرمائے کا از سر نو جائزہ لیا لیکن "دہلویت" کو اردو کی اصل ثابت کرنا مقصود رہا ہے اس لئے انکا بھی افراط و تفریط میں مبتلا ہو جانا قدرتی تھا۔ اب یہ نظریہ کہ اردو من حیث المجموع زبان دہلوی ہی کی ارتقائی صورت ہے۔ بڑی حد تک مشکوک ہو چلا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے حال ہی میں ایک رسالہ شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بہ دلائل یہ بات ثابت کی ہے کہ :

" زبان دہلوی یا کھڑی بولی یا اردو اور دکنی جدید ہند آریائی زبانوں میں داخل ہیں اور دو علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں۔" (ص ۵۵)

اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار مناسب ہے کہ دکن کے محققین نے جب دکنی اردو کا جائزہ لیا تو انھوں نے اس بات کا بھی لحاظ کیا کہ مثال کے طور پر اسی علاقے کے ادیبوں کو پیش کریں، اس قسم کا التزام بعض شمالی

ہند کے محققین نہیں کر سکے اور یہی فی الواقع مسئلہ کے الجھ جانے کا سبب ہے۔ پروفیسر شیرانی نے جو پنجاب میں اردو نے قدیم کی روایت ثابت کرنا چاہتے تھے۔ تصنیف دتین سے زائد ایسے شعراء کے کلام کو سند کے طور پر پیش کیا ہے جن کا پنجاب سے بظاہر کوئی تعلق نہیں یا اگر ہے تو محض ضمنی ان میں اہم تر نام یہ ہیں:

۱۔ امیر خسرو (مولد پٹیالی ضلع ایٹہ)
۲۔ کبیر داس (بنارس کے رہنے والے تھے — پنجاب میں اردو ص ۱۴۴)
۳۔ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری (بہار جا کر مدتوں ..... رہے — ایضاً ص ۱۴۲)
۴۔ قطبن مصنف مرگاوتی (جس کا سرپرست علاء الدین حسین شاہ والی بنگالہ تھا۔ ایضاً ص ۱۸۶)
۵۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی[1] (مصنف "سرود در پردۂ پوربی" — ایضاً ص ۱۸۸)
۶۔ شیخ عثمان مصنف چتراولی (غازی پور کے رہنے والے تھے — ایضاً ص ۲۰۲)

بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ نتائج کے استنباط میں بھی لغزشیں ملتی ہیں چنانچہ خواجہ مسعود سعد کے کلام سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے لکھا ہے:

"فارسی زبان میں بارہ ماسہ کی صنف کی نشوونما کا رواج نہیں ہے اور نہ سنسکرت میں ایسی نظمیں موجود ہیں، ادھر اردو، پنجابی اور ہندی میں اب سے بیس سال قبل تک بارہ ماسوں کا بہ کثرت رواج تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ خواجہ نے دوازدہ ماہہ لکھنے میں..... پنجابی کی تقلید کی ہے یا بارہ ماسہ خود ان کی ایجاد ہے، ہندی میں سب سے قدیم بارہ ماسہ ہے جو کبیر سے منسوب ہے۔"
(پنجاب میں اردو ص ۶۵، ص ۶۶)

اس اقتباس پر غور کریں تو درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلا بارہ ماسہ کبیر نے لکھا جو دیار مشرق کا رہنے والا تھا اور جسے اپنے علاقے کی بولی پر ناز تھا [ماخذ کی ایک نظم میں بھی جو ... کی ہے بارہ ماسہ ملتا ہے تو قیاس ہے کہ اودھی میں اس سے پہلے بھی بارہ ماسے لکھے گئے ہوں گے]
۲۔ فارسی میں نہ ہونے کے باوجود خواجہ نے فارسی میں دوازدہ ماہہ لکھا۔ اس علاقے کی شاعری نے فارسی کے شاعر کو اس حد تک متاثر کیا کہ اپنے یہاں کی ایک صنف نظم اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔
۳۔ اس کا اثر اس حد تک فارسی پر تھا تو اردو شعر و ادب کو اس نے جتنا متاثر کیا ہوگا اس کا صرف

---

[1] قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں ہے، ان کے دادا شیخ صفی الدین حنفی قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی میں توطن گزیں تھے خود انہوں نے اپنی عمر کے ابتدائی ۳۶ سال وہیں گذارے (معاصر ۱۱ ص ۱۴۱)

قیاس کیا جا سکتا ہے۔

چہ اب کبیر سے منسوب اس بارہ ماسہ پر شک کا اظہار کیا جا چکا ہے (اردو مثنوی شمالی ہند ص۵۶، ص۱۵۷)
ن پروفیسر شیرانی اس کی صحت کو تسلیم کرتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے کبیر کے دیس کی زبان کی اہمیت
ا غور نہیں کیا۔

زبان دہلوی کے مؤیدین بھی اپنے دعوی کے اثبات کے لئے "دیار مشرق" کے ان اہل قلم کے کلام
سند میں پیش کیا ہے جن کا ذکر پروفیسر شیرانی کے یہاں ملتا ہے۔ انھوں نے ہندی کی راساؤں' سے بھی مدد لیکر
اردو کا تسکینڈا "ڈول" اور "پٹ" متعین کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ
دکی چنداں' ملک محمد جائسی کی پدماوت اور اکھراوت اور تلسی داس کی رامائن کو کیوں نظر انداز کیا؟ (شیرانی کی طر
کہا جا سکتا ہے کہ وہ پنجاب کو اردو کا مخزن اور منبع سمجھتے تھے اور یہ دونوں وہاں سے بہت دور تھے) مگر
ے، نامدیو، کبیر، چندر بردائی وغیرہ بھی اردو کے شاعر نہیں تھے۔ پدماوت اور رامائن نے جس حد تک
ی ادب کو متاثر کیا ہے اس کے بیان کی احتیاج نہیں، اردو کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان دو
سے پورے طور پر محفوظ ہے۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ زبان دہلوی کی اہمیت ثابت کرنے والوں
ے یہاں استدلال کی کمزوری کا بار بار احساس ہوتا ہے مثلاً ان کے شعر پر افضل کی "بکٹ کہانی" سے جو
شکی گئی ہے اس میں ہے:

"افضل کا تعلق .... پانی پت سے تھا جو ہریانی علاقے میں واقع ہے لیکن افضل کی زبان
ہریانی کے اس قدر بھی لسانی اثرات نہیں رکھتی جس قدر کہ اس عہد کے دکنی مصنفین کی زبان
میں پائے جاتے ہیں۔" (ص۲۲)

"اگر افضل .. از سکان دیار مشرق ہوتے تو ملک محمد جائسی کی طرح وہ اپنا بارہ ماسہ
اودھی میں لکھتے نہ کہ کھڑی بولی میں۔" (ص۱۳۰)

"قطع نظر اس کے کہ شاعر کس علاقے کا رہنے والا ہے وہاں کی بولی کیا ہے وہ بلا دریغ
برج بھاشا اور اس کی روایت شعر کا پابند ہو کر لکھتا تھا۔ اس لئے افضل کے بارہ ماسہ
کی زبان کا تعلق پانی پت سے نہیں ہے بلکہ اس اردو سے ہے جو آگرہ کے بازاروں میں بولی
جاتی تھی۔" (ص۲۳)

ن تین اقتباسوں میں تین باتیں کہی گئی ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف۔ اس کتاب کی لسانی
صوصیات بیان کرتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں یہ ہیں:

"افعال کی بعض شکلوں میں برج بھاشا اور اودھی کے اثرات نمایاں ہیں" (ص ۲۴)
"خالق باری میں 'یا' سے مرکب ماضی کی مثالیں ملتی ہیں ... جو ہریانی، دکنی اور کھڑی کی خصوصیت ہے بارہ ماسہ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔" (ص ۲۵)

اس کے باوجود فیصلہ یہی صادر کیا گیا ہے کہ بارہ ماسہ کی زبان کھڑی بولی پر مبنی ہے اور "اودھی کے اثرات نمایاں" ہونے کے باوجود اس پر غور تک نہیں کیا گیا۔ اسی کتاب میں دو مصرعے یہ ہیں

ع بھئی ہوں دیکھ کر اس کو دوانی
ع پیا کی باٹ دیکھن ہوں، گموا ری

ان سے متعلق حاشیہ پر لکھا ہے۔ "ہوں (برج) = میں" (ص ۶۴)

حالانکہ "بھئی ہوں دیوانی" = ہوی ہوں دیوانی = دیوانی ہوی ہوں
اور دیکھن ہوں گی = دیکھن گیی ہوں = دیکھنے گئی ہوں

صاف ظاہر ہے کہ دونوں مصرعوں میں "ہوں" ضمیر نہیں ہے۔ استدلال کیا انداز قابل قبول نہیں ہو سکتا اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ استدلال کرنے والا اپنے خیالات میں کس حد تک الجھا ہوا ہے

پروفیسر اختر اورینوی نے "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" میں لکھا ہے۔

"حق یہ ہے کہ جب اردو زبان بہار میں بالیدہ ہو گئی تو وہ از خود اسی صوبہ کی مٹی سے رس اور جس لے کر، اسی کے پانی سے سیراب اور اسی کی ہوا سے شاداب ہو کر پھولنے پھلنے لگی اور اس ادب کی خوشبو ملک کی فضا میں پھیلی" (ص ۱۸۵)

اگر یہ صحیح ہے کہ دکنی اردو دکن سے، پنجابی اردو پنجاب سے، بہاری اردو بہار سے، اور دہلوی اردو دہلی سے نکل اور سر ایک کی بجائے خود ایک مربوط و مسلسل تاریخ ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہندوستان کی مختلف بولیاں مشترک اور یکساں حالات میں ترقی کی منزلیں طے کرتی رہیں اور انھیں مقامی نسبت سے موسوم کیا جاتا رہا یہاں تک کہ یہ مشترک خصوصیات اس حد تک ابھر آئیں کہ ان کی بنیاد پر ان سب کو ایک زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اسی مربوط زبان کو اردوئے معلّٰی یا اردو کہا گیا۔ مناسب یہ ہے کہ اس طور پر بھی اس مسئلہ پر غور کر لیا جائے۔

زبان و ادب کے مورخ کے لئے قدیم ترین متون سے مواد حاصل ہوتا ہے اور قدیم متون سے کما حقہ فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب ان کی ... صحیح اصولوں پر تدوین کر لی جائے۔ اردو کے ابتدائی نمونوں میں شیخ فریدالدین گنج شکر سے منسوب جملے بھی ہیں جو پروفیسر شیرانی نے سید محمد بن سید مبارک کرمانی

متوفی ۸۰۳ھ کی تصنیف سیر الاولیا سے نقل کئے ہیں۔ (پنجاب میں اردو ص ۲۵۱) ان جملوں کو مسلمات کا درجہ حاصل ہے لیکن اس سلسلے میں اس نکتہ پر بھی نگاہ رکھنی ضروری ہے کہ کاتب متن میں کس حد تک تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہو سکتا ہے۔

"بکٹ کہانی کے ایک سے زائد نسخے موجود ہیں اور یہ تمام شمالی تا دکن مختلف علاقوں اور کاتبوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے ایک ہی لفظ کی مختلف بولیوں (دکنی، برج بھاشا، کھڑی، ہریانی) کے زیر اثر مختلف شکلیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً نسخہ نمبر ۹ میں (جس کا کاتب ضلع میرٹھ کا رہنے والا ہے) موں کو میں، سیں سوں کو سے، چھانڈ چھاڈ کو چھاڑ، گرے کو گلے وغیرہ لکھا گیا ہے اس کے برعکس دکن میں لکھے ہوئے نسخے نمبر ۷ میں بعض تحریفات دکنی اردو کے تلفظ اور قواعد کے مطابق کر لی گئی ہیں۔" (بکٹ کہانی مقدمہ ص ۲۹)

یعنی زمانی اور مکانی دونوں اثرات متن کی تبدیلی میں اہمیت رکھتے ہیں، صوفیائے کرام سے منسوب اردو کے قدیم ترین فقروں کی صحت پر اعتماد کرتے ہوئے تصرفات کے تمام تر امکانات پر بھی نگاہ کر لینی ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان فقروں میں ایک ایک حرف کی اساسی اہمیت ہے اور راوی کا تصرف بھی بڑے دور رس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

"شیخ نے جواب میں فرمایا 'پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے' آخری فقرہ میں 'کا' اور 'ہوتا ہے' ایسے الفاظ ہیں جو اس جملہ کو پنجابی اور برج سے مختلف کر دیتے ہیں۔" (پنجاب میں اردو ص ۲۲)

اگر بالفرض "ہوتا ہے" کے مقام پر فی الاصل "ہوت ہے" ہوتا تو بحث کا رخ بالکل بدل جاتا۔

اردو میں قدیم متون کی تحقیق و تنقیش کا چلن ابھی تک عام نہیں ہو سکا بلکہ اب کچھ عرصہ سے حالات اور بدلنے لگے ہیں، اب زیادہ توجہ اس پہلو پر ہوتی ہے کہ جو مخطوطہ ہمیں دستیاب ہو گیا ہے اسے زیادہ سے زیادہ مستند اور اہم ثابت کیا جائے۔ متن کی تحقیق و تصدیق کا کام ثانوی بلکہ ضمنی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ صورت حال زیادہ افسوس ناک ہے۔

مخطوطات کی صحیح قرأت کا مسئلہ بھی نازک سے نازک تر ہوتا جاتا ہے۔ اعراب کا نہ بنایا جانا بجائے خود بڑی دقتوں کا سبب تھا۔ مَلک، مُلک، مِلک، مَلَک میں امتیاز کرنے کے لئے بجز سیاق و سباق پر اعتماد کے کوئی صورت نہیں ہے لیکن اردو کا مسئلہ اس سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے اندازہ ہوگا

کریو = ک مفتوح، را ساکن، ی بہ واو مجہول کشیدہ (زبان دہلوی) = تو کر دیکھیو، تو کرد۔

کریو = ک مفتوح، را ساکن، ی بہ واو مجہول کشیدہ (پوربی) = تم کروگے، استفہامیہ

کریت = ک مفتوح ، را مکسور و یائے مجہول کشیدہ ، واو ساکن (پوربی) = تم نے کیا ،
یعنی تاوقتیکہ یہ متعین نہ ہو کہ عبارت کس بولی کے زیر اثر ہے نہ صحیح املا ممکن ہے ، نہ تلفظ اور نہ صحیح معنی
رسائی - یہ وہ صورت ہے جس کی طرف عموماً خود اردو والوں نے بھی کم تر توجہ کی ہے -

اردو نے تحریر میں بھی فارسی کی اتباع کی ہے - انشاء اللہ خاں نے صحیح لکھا ہے :

" بنائے ریختہ کہ عبارت ازیں زبانست ، در شعر و کتابت ہم مطلقاً بر تقلید فارسی و فارسی گویان است "

(دستور الفصاحت ، مقدمہ ص ۱۱)

لیکن اردو میں تمام ہندوستانی اصوات کو ظاہر کرنے کے لئے فارسی کے حروف تہجی کافی نہیں .
اس لئے بعض نئے حروف وضع کئے گئے - پروفیسر شیرانی نے اردو رسم الخط کے سلسلے میں لکھا ہے

" فارسی خط زمانہ قدیم سے ہندی اصوات اور ہندی السنہ کے لکھنے کے لئے استعمال
کیا جا رہا ہے - ابتدا میں خط نسخ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لئے مخصوص
تھا ، چنانچہ پشتو ، سندھی اور پنجابی آج بھی نسخ میں لکھی جاتی ہیں - عالمگیر کے بعد شمالی ہند میں
نستعلیق رائج ہو گیا - خاص ہندی اصوات کے لئے علیحدہ علیحدہ علامات مقرر کی گئی ہیں .
اور مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے لکھی جاتی ہیں مثلاً ٹ ، ڈ ، ڑ پر پہلے تین تین نقاط ،
بعد میں چار نقاط لگائے جانے لگے ، گجرات میں بارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں ان پر ضرب
کی علامت (×) لگائی جاتی تھی اور الف ممدودہ دو الف کی شکل میں لکھا جاتا تھا ، نویں صدی
ہجری میں گاف کے نیچے تین نقطے لگائے جاتے تھے بعد میں اوپر لگانے لگے ، ہائے مخلوط التلفظ کا
استعمال بھی دیرینہ ہے ، اردو کا آخری الف لاحقہ بہ تقلید فارسی (ہ) کی شکل میں لکھا جاتا تھا "

(پنجاب میں اردو ص ۲۷)

صحیح یہ ہے کہ اردو میں رسم خط کے ارتقا کے متعلق باقاعدہ تحقیق کا سلسلہ ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہے
بیشتر باتیں جو کہی گئی ہیں محض قیاسی ہیں . مثال کے طور پر نویں صدی ہجری کا اردو تحریر کا کوئی مستند نمونہ کم از کم
راقم کی اطلاع کے مطابق ہنوز دریافت نہیں ہوا ہے پھر اس لئے اس زمانے میں گ کے نیچے اگر تین نقطے لگائے جاتے
تھے تو یہ فارسی کی بات ہو گی - اردو تحریر سے متعلق راقم کی معلومات حسب ذیل ہیں :

۱- الف ممدودہ کی جگہ دو الف ، جن میں ایک مختصر اور دوسرا نسبتاً بڑا ہو ، بنانے کا انداز قدیم ہے لیکن
تیرھویں صدی ہجری کے ربع ثانی تک میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں ؛

۲- ہندی کے حروف ٹ ، ڈ ، ڑ کے مقام پر ت ، د ، ر لکھتے تھے - یہ سلسلہ بارھویں صدی ہجری کے

ربع ثالث تک جاری رہا۔ اردو کے قدیم شعرا بالعموم وہ جو دہلی کے رہنے والے تھے۔ فارسی سے زیادہ قریب ہونے کے سبب ان حروف کا تلفظ بھی ت، د، ر کی طرح کرتے تھے چنانچہ ان کے کلام میں قوافی شاہد ہیں۔ پورب کے شعرا جن میں قیاساً اکثریت ان کی ہوگی جو مقامی بولیوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ہندی کی آوازوں کے ادا کرنے پر قادر ہوں گے۔ ان کے یہاں ت، د، ر اور ٹ، ڈ، ڑ کے تلفظ میں فرق کیا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ بعید نہیں کہ ابتداً سندھی اور پنجابی کے زیر اثر ان حروف پر اردو میں بھی چار نقطے بنانے کا سلسلہ شروع ہوا ہو [::] کچھ عرصے کے بعد تحریر میں سہولت کے لئے دو دو نقطے ملا کر لکھے جانے لگے [ـتـ] پھر اوپر کے نقطے مل کر مختصر خط کی صورت اختیار کر گئے [ـتـ] رفتہ رفتہ یہ مختصر خط اور مختصر ہو کر ایک نقطہ کی صورت اختیار کر گیا۔ پروفیسر شیرانی نے اسی تصور کو "تین نقطے" کہا ہے۔ بعض اوقات صرف دو نقطے بھی بنائے گئے ہیں [قصہ مہر افروز، پیش نامہ ۷] بتایا گیا ہے کہ بعض مقامات پر ان حروف کے نیچے ایک نقطہ بنانے کا رواج بھی رہا ہے۔ البتہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مطبوعات میں ان حروف پر مختصر "ط" بنائی گئی ہے۔ اس صورت کو دیار مشرق میں جلد قبول عام حاصل ہوا۔ چنانچہ احمد علی یکتا نے لکھا ہے:

"مخصص و ممیز حروف ثلثۂ ہندی در رسم خط صورت طاری خطی است کہ بر سر ہر یک در کتابت مقرر می نگارند تا ثقیلہ بفوقانی و مہملتین بہ ڈال و ڑای ہندی مشابہ نہ شوند و قاری را بغلط نیفگنند"

(دستور الفصاحت، مقدمہ ص ۱۱)

بنارس میں تیرھویں صدی ہجری کے ربع ثانی میں ہی نقطے حذف ہو کر صرف مختصر "ط" بنائی جانے لگی تھی [ٹ] لیکن اودھ کے علاقے میں دو نقطوں پر مختصر ط بنانے کا سلسلہ اس صدی کے عشرۂ سوم تک جاری رہا، دہلی میں غالب آخر عمر تک ٹ پر چار نقطے ہی بناتے رہے۔

۴۔ فارسی اور عربی میں ہائے مخلوط کا کوئی جداگانہ تصور نہیں ہے۔ عربی میں ہائے ہوز کو بالعموم (ھ) اور فارسی میں (ہ) کی شکل میں لکھتے ہیں [جدید فارسی میں دو چشمی ھ کا رواج عام ہے] اردو میں کہیں عربی کا تتبع کیا گیا اور کہیں فارسی کا اور کہیں مخلوط صورت بھی رہی۔ اردو کے قدیم دہلوی شعرا کے یہاں ہائے مخلوط کا تصور نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ بعض ایسے مقامات پر بھی انھوں نے ہائے ہوز کو حذف کیا ہے جہاں یہ مخلوط نہیں ہوتا مثلاً وہاں کو واں، یہاں کو یاں، بہت بعد تک نظم کرتے رہے۔

کبیر، جائسی، قطبن اور عثمان وغیرہ جنھوں نے مقامی بولیوں میں فکر شعر کی تھی۔ مقامی آوازوں کو ادا کرنے پر اغلب ہے کہ پوری قدرت رکھتے تھے، ان کے زیر اثر علاقے کے شعرا میں بھی ان آوازوں کا جلد تر فروغ پانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اردو میں ہائے مخلوط کے ساتھ مرکب آوازوں سے متعلق واضح تصور سب سے پہلے تیرھویں صدی ہجری کے وسط

ہیں اودھ کے علاقے میں ملتا ہے [دیکھو نفس اللغۃ میں 'پہنچا' کے املا سے متعلق بحث وغیرہ] اس صدی ہشتم کے خاتمے تک ایسے مرکب حروف قطعی طور پر وضع کئے جا چکے تھے (دیکھو تلخیص معلی) اور ان کو اردو مستقل حروف تہجی میں شمار کیا جانے لگا تھا۔ اردو والوں کا امتیاز اس بارے میں یہ ہے کہ انھوں نے ہائے مخا مرکب کر کے کم از کم تین ایسے حروف زائد وضع کئے جو ہندی میں اب بھی نہیں ہیں یعنی لھ [ل + ھ] [م + ھ] اور نھ [ن + ھ] دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں یہ حروف بھی بعد میں رائج ہو۔

۴ - فارسی میں نون غنہ کا جداگانہ تصور نہیں ہے، نون منقوطہ سے نون غیر منقوطہ کو ممیز کر کے اسے [نون] ایک الگ حرف کی حیثیت دینا بھی اردو والوں کا کارنامہ ہے۔ تلامذۂ ناسخ نے اس سلسلے میں کچھ وضع کئے لیکن ان حروف سے متعلق کئی مسائل اب بھی حل طلب ہیں۔

۵ - فارسی میں ی اور ے میں بھی امتیاز نہیں کیا جاتا، اردو والوں نے ان دونوں کو بھی الگ ا حرف کی حیثیت دی، یائے معروف اور یائے مجہول کے استعمال سے متعلق اصول تو بہت پہلے سے وضع جانے لگے تھے لیکن حروف تہجی میں ان کا الگ الگ شمار تیرہویں صدی ہجری کے عشرۂ سوم کے سے ہوا۔ ان حروف سے متعلق بھی بعض مسائل اب بھی بحث طلب ہیں۔

حروف تہجی کے وضع کر لینے کے بعد تحریر کے قواعد کے انضباط کا مسئلہ درپیش ہوا۔ پروفیسر شیرانی کا یہ فرمانا قدر صحیح ہے کہ اردو کا آخری الف لاحقہ بہ تقلید فارسی 'ہ' کی شکل میں جاتا تھا۔ بالکل ابتدائی دور میں میرا خیال ہے کہ مشرق میں املا تلفظ کے مطابق ہوتا تھا اور یہ سلسلہ غالباً بہت بعد تک قائم رہا۔ یہ خیال اس بنا پر ہے کہ یہ علاقہ کے زیر اثر زیادہ رہا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ "میرزایان ہند" کے اثر سے اردو کے قدیم دہلوی شعرا نے املا کو عربی فارسی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہو، تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں اودھ میں نقشہ کو نقشا، طوبیٰ کو طو معلّی کو معلا لکھا جاتا تھا اور خالص ہندی اصولوں پر جمع بھی بناتے تھے۔ چنانچہ توبہ کی جمع "توبے" بھی نظم کی گئی۔ دہلی میں غالب آخر عمر تک نقشہ کو نقشا لکھتے رہے ہیں۔

اردو میں تشدید کے لئے اصول متعین نہ تھے، اس سلسلے کی پہلی بحث تیرہویں صدی ہجری کے عشرۂ ششم ملتی ہے:

" در الفاظ ہندی ہر گاہ دو حرف از یک جنس در دو کلمہ بہم آیند نوعیکہ آخر کلمہ اول و اول کلمہ آخر حرف متجانس باشد مانند، ماننا و چھاننا، اوس سے، اس سے لہٰذا چنیں جا بیک حرف اکتفا کردہ تشدید دادن خطاست و اگر دو حرف یک جنس در یک کلمہ بود بر یک اکتفا کنند چنانکہ بلّی و لٹّو "

(نفس اللغۃ، دیباچہ ص ۲۰)

لیکن اس اصول پر عمل کچھ عرصے کے بعد سے عام ہوا۔

افعال میں مختلف صیغوں اور حالتوں میں متعلق علامتیں اگرچہ متعین ہو چکی تھیں لیکن ان کے لکھنے کے اصول مقرر نہیں تھے۔ لکھنؤ میں تیرہویں صدی ہجری کے عشرہ ہفتم تک ہنستے کو ہنس تے، پینا کو پی نا۔ سنتا کو سن تا لکھنے کی مثالیں ملتی ہیں، دہلی میں اس زمانے تک پڑھنا کو پڑھ نا لکھا جاتا رہا ہے البتہ بنارس میں اس سے کچھ پہلے ان علامتوں کو فعل اصلی سے ملا کر لکھا جانے لگا تھا۔

تحریر میں بے اعتدالیاں ہر زمانے میں کم و بیش ملتی ہی ہیں اور راغلب ہے کہ ملتی رہیں گی چنانچہ تیرہویں صدی ہجری کے آخر تک بھی حروف منقوط پر مقررہ تعداد میں نقطے لگانے کا التزام نہ تھا اسی طرح کاف پر کبھی دو اور گاف پر صرف ایک مرکز بھی بناتے تھے، فارسی کے زیر اثر یائے مجہول کے مقام پر یائے معروف اور برعکس بھی بناتے تھے۔

زمانۂ حال میں اردو کے قدیم متون کی تدوین کا کام بیشتر ان بزرگوں نے شروع کیا جو فارسی یا عربی کے عالم تھے۔ ان زبانوں میں تدوین کے جو مسائل ہو سکتے ہیں ان سے یہ صاحبان بخوبی واقف تھے اور ظاہر ہے کہ ان کے اس علم و فضل سے اردو کو بڑی حد تک فائدہ پہنچا لیکن یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ زبان اردو شروع سے "ریختہ" کہلائی اور علمی اعتبار سے اسے کم مایہ خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کم مایہ زبان کے اپنے بھی کچھ معاملات و مسائل ہو سکتے ہیں۔ یہ بات ان فضلا کے لئے غالباً بہت اہم نہ تھی، چنانچہ قدیم متون کی تدوین ہوئی ان سے نتائج کا استنباط بطور مجموعی اردو کے معاملات و مسائل پر کماحقہٗ توجہ نہیں کی گئی، مثال کے طور پر پروفیسر نذیر احمد نے جن کی محققانہ حیثیت مسلم ہے، فیروز بیدری کا "پرت نامہ" اپنے عالمانہ تعارف کے ساتھ شائع کیا [دیکھو اردو ادب علی گڈھ جون ۱۹۷۰ء]

اس کا پہلا شعر یہ ہے :-

تھُیں قطب اقطاب جگ پیر ہے		تھُیں غوث اعظم جہانگیر ہے[1]

یہ لفظ "تھُیں" اسی طور پر اس متن میں بار بار آیا ہے اور ہر موقع پر ہائے دوچشمی ہی سے لکھا ہے۔ کہا جا چکا کہ فارسی میں ہائے دوچشمی کی وہ حیثیت نہیں ہے جو اردو میں ہے۔ اردو میں یہ یائے مخلوط ہے اور حرف "ت" کے بعد آنے کی صورت میں اس سے مخلوط ہو کر "تھ" بناتی ہے۔ اس طرح اردو کے نقطۂ نظر سے "تھُیں" میں دو قباحتیں ہیں۔

---

[1] صحیح تلفظ تئیں [= ت + ہیں = تو + ہیں = توں + ہی] پورب میں اب بھی اسی طرح بولتے ہیں، تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اسی علاقے کے رہنے والے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض علمائے لسانیات نے لفظ "توں" کو "تو" کا بدل قرار دیا ہے [مقدمہ افزود دلبر" پیش نامہ ۲۵ ص ۲۶] حالانکہ صحیح یہ ہے کہ "توں" بجائے "آپ" کے بولتے ہیں، اور تو کے مقام پر "تیں" آتا ہے۔ چنانچہ متصرہ جات "فزود دلبر" میں یہ ضمائر استعمال ہوئے ہیں

۱۔ یائے حطی سے ماقبل مضمہ ہونے کی صورت میں تلفظ کیونکر ہو؟
۲۔ "تحقیں" کا اگر کوئی تلفظ کر لیا جائے تو مصرعہ ناموزوں ہو جائے گا جہاں "فعو" کے وزن پر کوئی لفظ درکار ہے۔

ان نکتوں پر اردو میں قدیم متون کی تدوین کرنے والوں نے کم تر توجہ کی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اوسط اردو داں کے لئے اس طور پر شائع کردہ قدیم متون کی قرأت بجائے خود ایک مسئلہ بن کر رہ گئی۔ اسی نظم کا ایک شعر ہے

محی الدیں توں دین تجھ تے جیا — تو اسلام کوں زور سر تے دیا

پہلے مصرعہ میں "محی دین" ہو تو وہ موزوں ہوں، عوام کی زبان پر اب بھی یہ لفظ "مُحَدّین" کر کے جاری ہے۔ علاوہ اس کے "محی دین" میں نون منقوطہ چاہئے، نہ کہ نون غنہ

سسی شاہ حسن عیب کی بات جب — کیے شکر حق کا بہوت دھات جب

یہ شعر اگر اس طرح پڑھا جائے تو بہتر ہو

سنے شہ حسن عیب کی بات جب — کیے شکر حق کا بہوت دھات جب

مصرعہ اولی میں سسی کی جگہ "سنے" بہ یائے مجہول اور مصرعہ ثانی میں بہوت بہ ہائے غیر مخلوط چاہئے۔

نظر توں کریتو مواجیو اٹھے

"کریتو" فی الاصل "کرے تو" ہے۔

یہ محض چند مثالیں سرسری طور پر پیش کی گئی ہیں، قدیم متون کی جدید اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے جدید املا سے واقفیت رکھنے والا اسے پڑھ سکے لیکن یہ مقصد[1] جیسا کہ ظاہر ہے مذکورہ صورت میں پورا نہیں ہوتا۔ ان مثالوں سے متن کی تدوین میں اردو کے مزاج و معاملات سے صرف نظر کرنے کے نتیجہ میں جس نوعیت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے۔ اب چند مثالیں نتائج کے استنباط میں لغزشوں کی پیش کی جاتی ہیں۔ پروفیسر شیرانی صاحب نے اردو کو پنجابی پر مبنی ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) "لوک = لوگ، پنجابی میں کاف ہے اور اردو میں گاف، لیکن اردو ئے قدیم میں کاف ہی تھا چنانچہ شاہ برہان الدین متوفی سنہ ۹۹۰ھ

---

[1] بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ قدیم ادبیات میں تلفظ ہی نہیں شعری اوزان وغیرہ بھی اب سے نہایت مختلف تھے۔ اور اسی لئے ان کے لکھنے والوں کا مطالعہ نہایت عجیب و غریب اور وقت طلب ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جتنا مشکل ہے اس سے زیادہ اسے مشکل بنا دیا گیا ہے کیونکہ اگر جدید املا کو ملحوظ رکھا جاتا تو شاید اس کو آسان تر بنایا جانا بھی ممکن تھا۔

سے
بے ہودیں لوگ عوام سبھی رشد بے قیام "
(پنجاب میں اردو صفحہ ۱۲۴)

عرض کیا جاچکا کہ تیرہویں صدی ہجری کے اواخر تک دلّی گ کا ایک مرکز بنا ناعام تھا۔ اس نکتہ سے پروفیسر موصوف یقینی طور پر ناواقف نہیں تھے، اس کے باوجود یہ دعوی کہ اردوئے قدیم میں لوگ " میں کاف ہی تھا ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ غالب کے شعر میں " گرہ نیم باز " صحیح نہیں " گرہ نیم باز " چاہئے۔

(۲) " گھیو" پنجابی میں گھی کو کہتے ہیں، پرانی اردو میں یہ لفظ بھی آتا تھا۔ میر جعفر زٹلی عہد عالمگیر و شاہ عالم کے مصنف ہیں، ان کے ہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ سے

ترے گھیو کو، سمجھائے راکھے جیو کو جیسا پیسا پیو کو، یہ نوکری کا حلہ ہے "
(ایضاً صفحہ ۱۲۱)

یہ لفظ " گھیو " ہے ممکن ہے پنجابی میں بھی یہی صورت ہو لیکن پوربی کا قاعدہ ہے کہ اکثر اسمائے صحیحہ کے آخر میں حرف واو کا اضافہ کرتے ہیں چنانچہ گھی کو گھیو، جی کو جیو، پی کو پیو بولتے ہیں۔ اسی طرح " رکھنا " کی جگہ " راکھنا " اور " سمجھا کر " کے مقام پر " سمجھائے " بھی اس علاقہ میں اب بھی بولا جاتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ پورب کے ساکنوں " کی بول چال کی طرف ہمارے محققین نے کبھی توجہ نہیں کی

(۳) " ہنسنا پنجابی میں یہ تخفیف نون غنہ آتا ہے یعنی ہسنا، اہل دکن بھی ہسنا بولتے ہیں محمد امین دکنی سے

سو تب یعقوب کے یوں دل میں آیا یوسف کو نیند بھیتر کن ہسایا " (ایضاً صفحہ ۱۲۱)

کہا جاچکا کہ قدیم مخطوطات میں نقطوں کے بنانے کا التزام کم ہوتا تھا۔ بخوبی ممکن ہے کہ اس موقع پر بھی نقطہ کا حذف اسی طور پر ہوا ہو۔ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض لوگ الفاظ کے تلفظ میں کبھی نون غنہ کا اضافہ کرتے ہیں اور کبھی برعکس بھی تلفظ کرتے ہیں مثلاً ملّاں = مُلّا (دیکٹ کہانی) مُنھ = منہ، نانچ = ناچ، تلیں = تلے، نہی = نہیں (قصہ مہر افروز و دلبر)

یہ بات اہل دکن کے ساتھ خاص ہے اور نہ اہل پنجاب کے ساتھ۔

زبان اردو نے کم و بیش سبھی مقامی بولیوں سے کسی نہ کسی طرح فیض اٹھایا ہے۔ اس کی اصل اور اس کے قواعد کے متعلق تحقیق کرنے سے پہلے مناسب یہ ہے کہ کم و بیش متعلق مقامی بولیوں کے بارے میں ضروری مواد فراہم کیا جائے تاوقتیکہ مقامی بولیوں کے لغات اور قواعد سے متعلق ضروری معلومات حاصل نہ ہو جائیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اردو نے کونسی بات ان میں سے کس سے حاصل کی۔ " دیار مشرق " کی بول چال کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے اس لئے کہ اردو کے

بیشتر قدیم نمونے اسی علاقے کے لوگوں سے منسوب ہیں۔ خوش قسمتی سے حال ہی میں عزیز محترم مہر الٰہی صاحب کی عنایت سے مجھے ایک رسالہ "زبان ریختہ ہندی کی صرف و نحو میں" دستیاب ہوا ہے۔ یہ رسالہ بنارس کے ایک ہندو بزرگ نے اپنے اخلاف میں سے ایک کیلئے لکھوایا ہے۔ یوں اس رسالہ کے ذریعہ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں بنارس کی زبان کی قواعد پہلی مرتبہ دریافت ہوئی ہے۔ اس موضوع سے متعلق اس سے پہلے ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔

رسالہ کا سائز ۶ × ۹ انچ ہے، پہلے صفحہ پر جیسے سرورق کہیں کتاب کا نام اس طرح لکھا ہے:

"قاعدہ ہندی ریختہ"

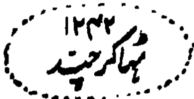
اگلے صفحہ سے رسالہ شروع ہو کر صفحہ ۷۰ پر مکمل ہوا ہے۔ ہر صفحہ پر معمولاً گیارہ سطریں ہیں۔ لیکن کسی کسی صفحہ پر بارہ اور تیرہ سطریں بھی ہیں۔ تحریر بہت واضح، خوشخط، خط نستعلیق میں ہے، کاغذ سفید، موٹا لیکن کسی وجہ سے اب اس پر روشنائی پھیلتی ہے، اوراق کرم خوردہ لیکن خوش قسمتی سے عبارت بہت کم مجروح ہوئی ہے۔ حاشیہ کے اضافے البتہ جزو بندی کے سلسلے کی تراش میں مجروح ہو گئے ہیں۔

رسالہ "بسملہ" سے شروع ہوتا ہے، اس کے دونوں طرف "محمد ابو الحسن" کی مہر لگی ہوئی ہے جس کا طول ایک، اور عرض ۰.۸ سنٹی میٹر ہے۔ ختم کتاب پر یہ عبارت مرقوم ہے:



"مالک کتاب مجلد ہذا ٹھاکر چند خلف بہت لعل
حصہ دار (کذا) موضع مادھوپور، پرگنہ مونگیر
کہ جناب (بھائی ؟) رام کرن سنگھ صاحب حقیقی
(اور ؟ رکھا (سے ؟) ام در مقام بنارس نویسانیده بودند
مہر"

لفظ "مہر" کے نیچے لیکن دونوں طرف ٹھاکر چند کی مہر ثبت ہے جس کی شکل بیضاوی ہے، طول ۱.۲ اور عرض ۰.۸ سنٹی میٹر ہے۔ اس کے بعد ایک بعد ایک اور ورق ہے جس پر "بسملہ" سے شروع کر کے غیر متعلق فارسی عبارت لکھی ہے۔ یہ عبارت دوسرے صفحے پر تمام ہوتی ہے۔ اس کے نیچے "تمام شد" لکھا ہے اور اس کے نیچے پھر محمد ابو الحسن کی دو مہریں ثبت ہیں۔



مہروں میں ٹھاکر چند کی مہر اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہی شخص کتاب کا مالک بھی ہے۔ خاتمہ کی مذکورہ عبارت میں ماضی کا صیغہ اس حقیقت پر دال ہے کہ کتابت اور غالباً نظر ثانی بھی اس سے پہلے کی جا چکی تھی اس لئے کتاب کا زمانۂ تالیف ۱۲۴۲ھ سے پہلے کا یقینی ہے۔

کتاب میں اضافہ، ترمیم اور اصلاح بہ کثرت کی گئی ہے مثال کے طور پر صفحہ ۳۵ کی سطر ۶ سے صفحہ ۳۷ کی سطر ... تک کی پوری عبارت قلمزد کر دی گئی ہے۔ اسی طور پر دوسرے صفحات پر بھی عبارتیں کاٹ دی گئی ہیں۔ حسب ضرورت عبارتیں اضافہ بھی کی گئی ہیں چنانچہ صفحہ ۶ پر درج ذیل عبارت حاشیہ پر اضافہ کی گئی ہے:

"جب ان کے بعد حروف معنوی ...... جیسا موجب برابر وغیرہ"

افسوس یہ ہے کہ جلد بندی کے وقت اس عبارت کے اکثر الفاظ مجروح ہو گئے ہیں۔ صفحہ ۷۴ پر "مستقبل مذکر مثبت" اور "مستقبل مونث مثبت" کی گردان لکھتے ہوئے کاتب نے خلط ملط کر دی ہے۔ نظر ثانی میں "مونث" کی مثالوں کو گھیر کر حاشیہ پر یہ لکھا گیا ہے:

"لفظیں صحیح ہیں۔ مونث کے صیغہ احاطہ میں"

ترمیم اور اصلاح کی صورتوں کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ مصنف نے یہ کتاب خود لکھی نہیں ہے بلکہ لکھوائی ہے لکھنے والے نے مسودہ صاف کرنے کے بعد مصنف کے سامنے رکھا اور اس وقت مصنف نے اسے بغور دیکھ کر اس کی درستی کر دی۔ یہ کتاب اغلب ہے کہ اپنے اخلاف کی تدریس اور ہدایت کے لئے لکھی گئی تھی اور غالباً اس کی عام طور پر اشاعت کا ارادہ نہ تھا اس لئے "سبب تالیف" وغیرہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

مخطوطہ کا انداز کتابت قدیم ہے اور اس میں اس زمانے کی تحریر کی کم و بیش سبھی خصوصیات پائی جاتی ہیں بعض جو زیادہ قابل ذکر معلوم ہوئیں یہ ہیں:

(۱) حاشیہ پر ایک جگہ الف ممدودہ کے مقام پر دو الف بنائے گئے ہیں یعنی: "اارنا" (= آرنا)

(۲) بعض مقامات پر فتحہ کی جگہ مد کی جیسی صورت بنائی ہے مثلاً "اور" کو "آور" لکھا ہے، ممکن ہے یہ کاتب کا سہو ہو لیکن اس کا امکان بھی ہے کہ یہ املا تلفظ کے مطابق ہو، پورب کے بعض لوگ اور کا تلفظ "آور" [الف کشیدہ، واو مضموم، را ساکن] بھی کرتے ہیں۔

(۳) ایک سے زاید لفظوں کو ملا کر لکھنا قدیم تحریر میں عام بات تھی لیکن اس نسخے میں بعض صورتیں توجہ طلب ہیں۔

مثلاً:- ایسیی = اے + سِ + اِی = ایس + ای = ایسے ہی

ایسہی = اے + سِ + ہی = ایسے ہی — پورب کے لوگ ایسے کو "ایس" بھی بولتے ہیں۔

سنتہی = سُن + تِ + ہی = سنتے ہی

ہوییں = ہُ + ئیں = ہوئیں = ہوویں

سنیوالا = سُنے والا = سننے والا

(۴) تشدید کے مقام پر حرف کو مکرر لکھا ہے مثلاً "النناس" = النّاس — لیکن یہ صورت ہر جگہ نہیں ہے

(۵) "ہی" کے ہائے ہوز کو لفظ ماقبل کے آخری حرف سے ملا کر لکھا ہے۔ مثلاً "ایکہی" ـــ اس لفظ کا تلفظ دو طرح ہو سکتا ہے یعنی ایکھی = ایکی ـــ اور غالباً اسی قیاس پر تلفظ کا تاسخ نے بعض اور لفظ بھی وضع کئے ہیں مثلاً آپی [آپ + ہی] اوری [اور + ہی] وغیرہ، دوسرا لفظ [سے + کت + ہی] بہ کاف تازی ہوگا، اکثر یورپ کے لوگوں کی زبانوں سے ایسا سننے میں آیا۔

(۶) ضمہ کے مقام پر واو، اور کسرہ کے محل پر "یا" اس نسخے میں بھی لکھا ہے۔

(۷) ٹ، ڈ، ڑ پر عموماً مختصر ط بنائی ہے۔ البتہ کہیں کہیں صرف دو نقطے اور بعض مقامات دو نقطوں پر مختصر ط بھی بنائی ہے۔ ڑ پر کہیں تین نقطے اور کہیں صرف ایک نقطہ بھی بنایا ہے۔ اور کہیں کہیں صرف "ر" بھی لکھی ہے۔

(۸) اوراق پر اعداد شمار تحریر نہیں ہیں۔ البتہ رواج زمانہ کے مطابق ہر ورق کے خاتمہ پر ترک کا التزام کیا ہے۔

کسی زبان کی قواعد اسی زمانے میں مرتب کی جاتی ہے۔ جب وہ کتابی زبان کا درجہ حاصل کر لے، مصنف کے پیش نظر اس "ہندی ریختہ" کی کون کون سی تصانیف تھیں اب ان کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ سودا، یقین اور جرأت کے کلام سے اس نے مثالیں پیش کی ہیں، بعض اشعار اور بھی نقل کئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے سوا شعرا کے ہوں۔ نثر کی مثالوں میں ایک جملہ چار مختلف مقامات پر نقل ہوا ہے:

"سیاحوں کے سامنے شراب کے پیالے ساقیوں نے رکھے" [۵۱]

ممکن ہے کہ یہ جملہ کسی نثری تصنیف سے ماخوذ ہو لیکن اس بابت یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ بہرحال اسماء، ضمائر اور افعال کی اس نے جس طرح گردان کی ہے وہ محاورۂ اہل دہلی کے برخلاف اور روز مرۂ ساکنانِ مشرق کے مطابق ہے۔ مثال کے طور پر ماضی قریب مذکر مؤنث کی گردان یہ ہے:

میں مارا ہوں، ہم مارے ہیں، تو مارا ہے، تم مارے ہو، وہ مارا ہے، وے مارے ہیں، کہیں کہیں صیغہ جمع غائب میں فعل کی یہ صورت بھی لکھی ہے:

---

[۵۱] اسی طرح مثال کے طور پر ایک جملہ یہ ملتا ہے "رنڈی مرد ہو گئی" ـــ "قصۂ مہر افروز و دلبر" کی ایک حکایت میں جو عیسوی خاں بہادر نے نقل کی ہے اس قسم کے جملے ملتے ہیں "وہ رنڈی جو مرد ہو گئی ہے" اور "رنڈی ہے تو مرد ہو جا" وغیرہ۔ ممکن ہے کہ مصنف نے اسی حکایت کے پیش نظر وہ جملہ وضع کیا ہو۔

" وے ماریاں ہیں ، وے مارتی تھیاں "

یہ ہریانی بولی ہے اور اس کے ذکر کا سبب غالباً یہ ہے کہ مصنف نے سودا اور یقین وغیرہ قدیم شعرائے دہلی کے کلام کو پیش نظر رکھا تھا اور ان کے کلام میں فعل کی یہ صورت قائل و کہہ تک ملتی ہے۔ کہا جا چکا کہ اس کتاب میں اسماء، افعال اور ضمائر کا جس طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ دہلی کی زبان نہیں ہے لیکن مصنف اسکو بھی "ہندی ریختہ" کہتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ہندی ریختہ دہلی کے ریختہ سے مختلف ہونے کے باوجود بہر طور اردو ہے اس میں اور زبان دہلوی میں وہی فرق ہے جو دکنی اور زبان دہلوی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو زبان و ادب کے مورخ اور ناقد کے لئے اس زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت شمالی ہند کی اردو کے قدیم متون کے مطالعہ کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ بعض مقامات پر عبارت کی قرأت میں دقت پیش آئی ہے۔ اور کچھ لفظ مشکوک رہ گئے ہیں، اس کوتاہی کا افسوس ہے۔ فقط

ماخذ

۱۔ پنجاب میں اردو از پروفیسر محمود شیرانی
۲۔ دکن کی ابتدا از ڈاکٹر آمنہ خاتون
۳۔ اردو مثنوی، شمالی ہند میں از ڈاکٹر گیان چند
۴۔ بکٹ کہانی مرتبہ پروفیسر نور الحسن ہاشمی، پروفیسر مسعود حسین خاں مطبوعہ ۱۹۷۰ء
۵۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا از پروفیسر اختر اورینوی
۶۔ دستور الفصاحت مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی
۷۔ نفس اللغۃ از میر علی اوسط رشک مطبوعہ نیر پریس لکھنؤ
۸۔ تلخیص معلی از کلب حسین خاں نادر مشمولہ اردو ادب علی گڑھ
۹۔ قصہ مہر افروز و دلبر مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں

ے زبان کے ارتقا کے سلسلہ میں دو نکات قابل لحاظ ہیں (۱) دار الحکومت دہلی سے جب بھی بغاوت کی صورت ہوئی دکنیوں اور پوربیوں میں اتحاد کا مظاہرہ ہوا ہے۔ اس لئے پورب کی بول چال اور دکنی کی خصوصیات میں اکثر کا مشترک ہونا زیادہ قرین قیاس ہے (۲) حکومت کی زبان فارسی تھی مقامی بولی (اردو) کی قدیم ترین تصانیف اغلب ہے کہ دار الحکومت دہلی سے دور کسی مقام پر وجود میں آئی ہوں گی۔ امید ہے اہل حضرات اس طور پر

ادبی حلقہ

شرائط رکنیت :-

۱- حلقہ کی رکنیت کی فیس سالانہ ۲۴ روپے یکمشت یا بارہ کی ایک اور گیارہ گیارہ کی دو قسطیں - اس طرح کل تین سہ ماہی قسطوں میں -

۲- حلقہ ممبروں کو ہر سال پچیس روپے کی کتابیں اور انجمن کا "ہفتہ وار اخبار ہماری زبان" قیمتی پانچ روپے اور سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" قیمتی بارہ روپے کل بیالیس روپے کی مطبوعات پیش کرے گا -

۳- ارکان کو بقدر پچیس روپے انجمن کی مطبوعات میں سے اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے کا حق ہوگا -

۴- ۲۴ روپے کے عوض بیالیس روپے کی مطبوعات مندرجہ بالا صورت میں دی جائیں گی - اس کے علاوہ اگر کوئی رکن انجمن کی دوسری کتابیں خریدے گا تو اُن پر پچیس فیصدی کمیشن دیا جائے گا -

(مزید تفصیلات کے لیے دفتر سے خط و کتابت کریں)

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

ڈاکٹر نذیر احمد
مترجم: کبیر احمد جائسی

مغل مصوّر فرخ بیگ

مسٹر رابرٹ اسکلٹن (ROBERT SKELTON) نے مغل مصور فرخ بیگ کے عنوان سے "آرٹ اورینٹلس" (ART ORIENTALIS) کے دوسرے شمارہ میں ایک مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے فرخ بیگ سے منسوب ۱۹ تصویریں بھی شائع کروائی ہیں۔ صاحب موصوف نے کوشش کی ہے کہ منتشر تاریخی مواد کی مدد سے اس کی سوانح حیات مرتب کریں اور اس سلسلہ میں یہ بھی غور کیا جائے وہ ان تصویروں کے عمیق مطالعے پر کریں جو اس کے نام سے منسوب مختلف کتاب خانوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ مسٹر اسکلٹن کا مقالہ، ان کی اپنے موضوع پر غیر معمولی دسترس اور قوت توجیہہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس وصف کے باوجود وہ کچھ ان تاریخی غلطیوں کی تصحیح نہیں کر سکے ہیں جو کسی نہ کسی سبب سے تاریخ میں در آئی ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں میرا مقصد یہ ہے کہ صاحب موصوف کے اخذ کردہ نتائج کا جائزہ لوں اور ان کے مقالے کی غلطیوں کی نشاندہی کروں۔

مسٹر اسکلٹن نے اس مصور کا تعلق شیراز سے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قائم کیا ہے۔

۱۔ ابراہیم عادل شاہ دوم فرمانروائے بیجاپور (۹۸۸ ، ۱۰۳۷ھ) کا درباری مصور فرخ حسین اس مغل مصور فرخ بیگ سے مماثل ہے

۲۔ دربار بیجاپور کا مصور فرخ حسین شیراز کا رہنے والا تھا۔ اس بات سے صاحب موصوف نے دوبارہ یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فرخ بیگ، مولانا درویش حسین کا لڑکا تھا اور جب فرخ بیگ کا ایک نوجوان دوست ظہوری جس سے خراسان کے دوران قیام میں اس کی شناسائی ہوئی تھی اور جب ظہوری شیراز گیا تو وہ مولانا درویش حسین ہی کا مہمان ہوا۔ اس سلسلہ میں صاحب موصوف کا اصل بیان نقل کر دینا

---

[1] ص: ۲۹۳ - ۱۱۱ [2] یہ بیان ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور ڈاکٹر موتی چند کے بیانات سے ماخوذ ہے

مناسب ہوگا۔

"بیجاپور کی بہت سی بہترین تصویریں جن پر مغل مصوری کے اثرات ملتے ہیں، فرخ بیگ سے منسوب کی جا سکتی ہیں جو ایک ماہر مغل مصور تھا۔ ہمیں علم ہے کہ مصوری کے ایک ماہر استاد فرخ حسین کا تذکرہ ظہوری نے کیا ہے جو اس وقت بیجاپور میں مصروف کار تھا اور وہ بھی فرخ بیگ ہی کی طرح ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ ابراہیم دوم کے عہد کے بیجاپور اسکول کے بارے میں جو مواد ہماری دسترس میں ہے اس کی قلت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ اس عہد میں دو یا تین قدر اول کے حامل مصور مصروف کار تھے، اور اگر دو اشخاص فرخ کے نام سے موسوم ہوں تو یہ ایک غیر معمولی مطابقت ہوگی۔ اب اگر ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ دونوں فرخ ایک ہی شخص تھے تو دوسرے نام (فرخ بیگ) کی توجیہہ اس طرح ممکن ہے کہ بیگ کے لفظ کا اضافہ یقیناً ایک منگولی کے نام میں اس وقت ہوا ہوگا جب وہ سرگرم مغل دربار میں آیا ہوگا، اس کے علاوہ اس کے تخلص اور پورے نام کا علم اس کے سابق دوست سے متوقع ہے جو اس کے خاندان کے بارے میں کچھ علم رکھتا ہو۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ فرخ حسین شیرازی معروف بہ فرخ بیگ غالباً شیرازی عالم اور خطاط مولانا درویش حسین کا فرزند تھا جو اپنی جوانی کے زمانے میں ابراہیم میرزا کے پاس کام کے لئے شیراز سے خراسان گیا اور وہاں اسکی نوجوان شاعر ظہوری سے ملاقات اور دوستی ہوئی۔ جب شاعر ظہوری نے شیراز کا سفر کیا تو وہ قدرتی طور پر اپنے دوست کے والد کے پاس مقیم ہوا اور اس کے بعد جیسا کہ ہم کو علم ہے وہ ظہوری عازم دکن ہوا" (ص ۱۱، ۲۴۰۲)

اس کے علاوہ ان کا بیان ہے کہ

"بلاشبہ اس مصور نے اپنی ابتدائی زندگی اپنے والد مولانا درویش حسین کی زیر نگرانی شیراز میں گذاری۔ اور وہیں اس نے اپنی ابتدائی تعلیم اور فن مصوری سے ابتدائی روشناسی حاصل کی۔ اس کے بعد غالباً اپنی عمر کے ابتدائی تیرہویں سال سے لے کر انیسویں سال کی عمر تک میں وہ خراسان کے مشہور خطے مشہد گیا جہاں ممکن ہے اس نے جامی کے مصور مخطوطے کی تکمیل میں حصہ لیا ہو جو اس وقت پایۂ تکمیل کو پہونچا تھا جب کہ اس کی عمر صرف انیس سال کی تھی یہ عہد اس کی زندگی کا بہترین تخلیقی عہد رہا ہوگا اور صاحبان علم مثلاً ظہوری وغیرہ کی معیت کی وجہ سے ہم اس کی اس تعلیم کا تصور کر سکتے ہیں جس کی بنا پر آگے چل کر وہ مولانا کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔"
(ص ۴۴-۴۳ کالم ۲)

اس سلسلے میں میری رائے مندرجہ ذیل ہے ۔

وہ تصویریں، طلاکاریاں اور تصویر چربے جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ بیجاپور میں تخلیق کی گئیں ان کے بارے میں اس دعوے کی دلیل صرف یہی ہے کہ ان کا طرز و انداز، ماہیت اور خصوصیت بیجاپوری اسکول کے انداز سے ملتے جلتے ہیں۔ ان تمام تصویروں، طلاکاریوں اور تصویر چربوں پر یہ بات کہیں درج نہیں ہے کہ ان کی تخلیق سرزمین بیجاپور کی رہین منت ہے۔ چونکہ ان تصویروں میں دکنی مصوری کا انداز ملتا ہے اور بیجاپور ایک مستقل مصوری کے اسکول کا خالق مانا جاتا ہے اور اسی اثنائے سخن میں اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ بیجاپور کے دربار میں فرخ حسین نام کا ایک مصور بھی تھا، اسی بنا پر فاضل مقالہ نگار یہ فرض کر لیتے ہیں کہ فرخ بیگ واقعی بیجاپور میں مقیم رہا تھا

ابراہیم عادل شاہ دوم کا درباری مصور فرخ حسین، جس کا تذکرہ ظہوری نے سہ نثر کے تیسرے حصہ میں، ابراہیم عادل شاہ دوم کے سات ممتاز درباریوں میں کیا ہے فارسی الاصل تصور کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اپنے مقالے "A FEW HINDU MINIATURE PAINTERS OF 17TH and 18TH CENTURIES" مطبوعہ اسلامک کلچر حیدرآباد ۱۹۳۳ء میں اس مصور کا تعلق شیراز سے مندرجہ بالا سہ نثر کی عبارت کی روشنی میں قائم کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر موتی چند نے ڈاکٹر چغتائی کے بیان کی تائید کی ہے۔ مسٹر اسکلٹن نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے اور انھوں نے مغل مصور فرخ بیگ کو بیجاپور کے مصور فرخ حسین سے ملا دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس کے شیرازی ہونے اور شیراز کے مشہور نقاش و مصور مولانا درویش حسین کے لڑکے ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اب ہم کو ان کے اس خیال کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے۔

---

[۱] جلد ۸ ص ۳۹ MARG VOL. V Book 1.P. 26 مسٹر اسکلٹن نے باڈلین لائبریری میں محفوظ "ابراہیم عادل خاں کے لڑکے کی تصویر" پر درج شدہ اس عبارت "عمل فرخ" کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیجاپور کے دربار میں فرخ بیگ نام کا ایک مصور موجود تھا لیکن اسی کے بعد انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تصویر اٹھارویں صدی کی ہے۔ اس طرح اس کا انتساب روایتی بنیاد پر ہے یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ مغل عہد کے مورخین ہمیشہ عادل شاہیوں کا تذکرہ عادل خاں کے نام سے کرتے تھے جبکہ کوئی بیجاپوری مصور ان بادشاہوں کو خاں کے لقب سے ملقب کرنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہی بات اس چیز کا ایک ثبوت ہو سکتی ہے کہ اس مصور کا تعلق مغل عہد کے ہندوستان سے تھا لیکن ایک مغل مصور کا عادل شاہی سلطانوں کی تصویر بناتا ایک غیر معمولی بات ہے

سہ نثرِ ظہوری کے تمام مخطوطات اور مطبوعہ نسخوں میں مصور کا نام فرخ حسین درج ہے اور اس کے وطن کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ہے اور چونکہ سہ نثر میں اس مصور کا ذکر صرف ایک جگہ آیا ہے اور کسی دوسری موجود و معلوم کتاب میں اس مصور کا ذکر نہیں ملتا اسلئے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی اور ڈاکٹر موتی چند نے شیراز کو فرخ حسین کا ظنی مولد قرار دینے میں غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اب یہ بات بلا کسی شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ ہم کو فرخ حسین کے مولد کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے اور وہ یقیناً شیرازی الاصل نہیں تھا۔ ان حالات میں مسٹر رابرٹ اسکلٹن نے فرخ حسین کے مولد کے بارے میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ غلط قرار پاتا ہے اور پھر اسی طرح تمام متاخر آرا قدرتی طور پر شاہدِ عادل کے منصب پر قائم نہیں ہو سکتیں۔ مسٹر اسکلٹن کی اور غلطیاں تو قابل درگذر ہیں مگر ایک غلطی ناقابل معافی ہے میں نے اپنے مقالے فرخ حسین شیرازی مطبوعہ اسلامک کلچر[1] میں ڈاکٹر موتی چند کے غلط اخذ کردہ نتیجہ کا حوالہ دیا ہے اور مسٹر اسکلٹن نے اس مقالہ کا ذکر اپنے مقالے کی صدائے بازگشت کے طور پر کیا ہے[2] لیکن انہوں نے اسکی تکلیف گوارا نہیں کی کہ مولانا فرخ حسین کے مولد کے سلسلہ میں جو نزاع ہے اس کا ذکر کر دیں۔ اگر انہوں نے اس مسئلہ کا ہوش مندی سے جائزہ لیا ہوتا تو وہ یقیناً ڈاکٹر موتی چند کے بے دلیل دعوے کو رد کر دیتے اور ان حالات کے تحت وہ مجبور ہو جاتے کہ اپنے خیالات پر نظر ثانی کریں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ ان خطوط میں بنیادی تبدیلی کریں جن کی اساس پر وہ مذکورہ مصور کی سوانح مرتب کر رہے تھے۔ بہر حال ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی اور ڈاکٹر موتی چند کی رائیں بے بنیاد ہیں اور اسی طرح مسٹر اسکلٹن کا اخذ کردہ نتیجہ غلط اور بے ربط ہے۔

مسٹر رابرٹ اسکلٹن نے مولانا فرخ حسین اور فرخ بیگ کو مماثل قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے ایسا کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں بیان کی ہے یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ دو اشخاص جن کے نام یکساں ہوں صرف اس معمولی سی وجہ سے مماثل قرار نہیں دیئے جا سکتے کہ ان کے نام ایک سے ہیں۔ یہ تعجب خیز بات ہے کہ ان دونوں مصوروں کے ناموں میں فرق کے باوجود (ایک کا نام مولانا فرخ حسین ہے اور دوسرے کا نام فرخ بیگ) دونوں کو ایک ہی شخص سمجھا گیا ہے یہ خیال کہ ظہوری مذکورہ مصور کے خانوادہ سے واقف تھا اور اس نے اس کا پورا نام تحریر کیا ہے اور اس کے نام میں لفظ 'بیگ' کا اضافہ سرگرم مغل دربار میں مصروف کار ہونے کے بعد کا ہے، صحیح نہیں ہے۔ یہ خیال کتنا مضحکہ خیز ہے کہ اکبر کے دربار میں وہ فرخ بیگ کے نام سے معروف تھا اور بیجاپور کے دربار میں مولانا فرخ حسین کے نام سے اور پھر جب وہ

---

[1] جلد ۴۳ ص ۳۳ [2] ص ۴۰۴ کالم ۲

جہانگیر کے دربار میں آتا ہے تو وہ فرخ بیگ بن جاتا ہے۔

مسٹر رابرٹ اسکلٹن نے فرخ بیگ کے دو تصویرچوں کے مجموں کا حوالہ دیا ہے جو ان کے نزدیک اس کی ابتدائی مشق کی یادگار ہیں۔ ان میں سے ایک مجموعہ جو سات ایرانی طرز کے تصویرچوں پر مشتمل ہے خمسہ امیر خسرو کے ایک مختصر مخطوطہ سے متعلق ہے جس کی کتابت ۹۶۰ھ میں ہرات میں ہوئی تھی۔ یہ تصویرچے نادر العصر فرخ بیگ کی جنبش قلم کا نتیجہ ہیں۔ مسٹر اسکلٹن کو شبہ ہے کہ ان تصویرچوں کا مصور وہ نہیں ہو سکتا۔ اس شبہ کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ ان تصویرچوں کا پس منظر سرسری ہے اور جن مناظر کے نقشے کھینچے گئے ہیں ان میں انتہائی سادگیٔ خیال ہے لیکن اس بیان میں اسلئے تناقض ہے کہ وہ اس مصور کے لقب "بیگ" کے بارے میں کچھ نہیں کہتے جو اس کے مغل دربار میں آنے سے کم سے کم چند سال پہلے ہی سے اس کے نام کے ساتھ مندرج ہے۔ اس سے پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ انہی کے بیان کے مطابق یہ لقب اس نے مغل دربار میں آکر ۹۹۳ھ میں اختیار کیا تھا۔ اگر اس کے ہندوستان آنے سے قبل ہی سے بیگ کا لفظ اس کے نام کا ایک جزو تھا تو پھر ان کو نادر العصر فرخ بیگ کو ایک دوسرا مصور ماننا چاہئے تھا اس کے علاوہ اپنے اخذ کردہ نتیجہ کو بالائے طاق رکھ کر ایک مصور کو دوسرے مصور سے جدا قرار دینے کی کوئی کوشش اساشابے نتیجہ ہو جاتی ہے۔

اس کے تصویرچوں کا دوسرا مجموعہ جامی کے ہفت اورنگ میں پایا جاتا ہے جو فریر گیلری، واشنگٹن میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ مشہد میں ۹۶۳ھ اور ۹۷۳ھ کے درمیان ابراہیم مرزا کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس کتاب کے تصویرچوں کا مقابلہ جب اکبر نامہ کی ان تصویروں سے کیا جاتا ہے جو سورت میں اکبر کے آنے کے وقت کی تصویریں ہیں تو فوراً ان میں ایک ایسی مماثلت کا احساس ہوتا ہے جو شاید ہی کبھی اتفاقاً وجود پذیر ہوں خصوصاً کوئی شخص کسی ایسے ایرانی تصویرچہ کی نشاندہی نہیں کر سکتا جس میں فرخ کے تصویرچہ سے ایسی ہو بہو مماثلت موجود ہو۔ حقیقت واقعہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ فرخ بیگ کی مصورانہ زندگی کا ابتدائی پہلا سال خراسان میں بسر ہوا تھا۔

اس بات کا علم نہیں ہے کہ آیا ان تصویروں پر مصور کا صریحی نام درج ہے یا نہیں؟ لیکن یہ بات تعجب خیز ہے کہ ایسے اہم نکتہ سے سرسری طور سے گذر جایا جائے کیونکہ اگر ان تصویروں پر مصور کا نام فرخ بیگ درج ہے تو پھر خود مسٹر رابرٹ اسکلٹن کا یہ نظریہ کہ اس کے نام میں لفظ بیگ کا اضافہ مغل دربار سے منسلک ہونے

۱؎ ص ۳۶۵ کالم ۲ ۲؎ ص ۳۶۶

کے بعد ہوا تھا، باطل ہو جاتا ہے۔ بہرحال میں یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر ان تصویروں پر مصور کا نام درج ہے تب تو اس کا نام ضرور فرخ بیگ ہوگا نہ کہ فرخ حسین۔ اسطرح مسٹر رابرٹ اسکلٹن کا وہ نظریہ جو لفظ بیگ کے اضافہ کے بارے میں انہوں نے پیش کیا ہے تحقیق کے امتحان میں سامنے نہیں آسکتا۔

قبل اس کے کہ ہم فرخ کی زندگی کے اس عہد سے بحث کریں جو اس نے خراسان میں بسر کیے تھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اہم نکتہ کی نشاندہی کر دیں۔ ابوالفضل نے اکبرنامہ میں اس مصور کا جس انداز سے تذکرہ کیا اس سے اس نظریہ کو تقویت پہونچتی ہے کہ اس کے نام میں لفظ بیگ ہندوستان آنے سے قبل ہی سے موجود تھا۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں

"بیست و پنجم آذر .... در قصبہ راول پنڈی بسعادت کورنش سربلندی یافت۔ ... سپنیس فریدون خان علی محمد اسپ و شاہ بیگ و گدا بیگ و تاش بیگ قوچین و تختہ بیگ و قاسم پروانہ و مظفر کوکہ و جانش بہادر و تاتار بیگ و غیور بیگ و الغ بیگ و نور محمد خواجہ خضری و دوست محمد برنائی و خاکی گلہ بان اتالیق و قاسم کوکہ و خواجہ یاقوت و اتم بہادر و خویشم بہادر و حیدر علی عرب و قاضی عزت اللہ فرخ بیگ مصور و دیگر بہادران و کم جوانان در خور منزلت خلعت و اسپ و نوازشہای جداگانہ بخشش شد و گوناگون عواطف شہنشاہی در گرفت"

چونکہ اکبرنامہ میں مختلف وقوعات تاریخ وار مندرج ہیں اور فرخ بیگ مصور کا نام سنہ ۹۹۳ھ کے واقعات کے ضمن میں درج ہے۔ اسلئے یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب و معقول ہوگا کہ اس مصور کا لقب "بیگ" مغل دربار میں آنے سے پہلے ہی سے اس کے نام میں شامل تھا اور اس کے نام کا ایک جزو تھا جس کو اس نے اپنی ابتدائی زندگی ہی میں اختیار کر لیا تھا۔

ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے میرا خیال یہ ہے کہ مولانا فرخ حسین کو فرخ بیگ کا مماثل قرار دینے میں مسٹر رابرٹ اسکلٹن کا موقف درست نہیں ہے اور جب معقول شہادت کی بنا پر یہ بات ثابت ہو چکی کہ یہ دونوں افراد دو الگ الگ مصور تھے اور نہ وہ فرخ حسین کا تعلق شیراز ہی سے کیوں نہ ہو (موجودہ معلوم مواد کی بنیاد پر بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیال ایک مفروضہ ہے) اس وقت بھی یہ بات اساساً غلط ہوگی کہ فرخ بیگ کا تعلق شیراز سے قائم کیا جائے اور اگر مفروضہ کے طور پر فرخ بیگ کا تعلق شیراز سے قائم کیا جائے تب بھی یہ بات قابل تعجب ہوگی کہ اس کو مولانا درویش حسین کا شاگرد قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی شخص کوئی بات کہہ سکتا ہے تو وہ صرف اتنی ہے کہ موخر الذکر ایک ماہر نقاش خط تھا

جو شیراز کا رہنے والا تھا۔ فرخ بیگ بھی ایک ماہر نقاش و مصور تھا جس کا تعلق اس شہر سے قائم کر دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات اس چیز کی بنیاد نہیں بن سکتی کہ دونوں کے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ قائم کیا جائے۔

یہ بات نامناسب نہ ہوگی اگر ہم اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کا جائزہ لیتے چلیں۔ عالم آرائے عباسی میں مولانا درویش حسین کا ایک مصور کی حیثیت سے چار جگہوں پر تذکرہ ہوا ہے جس کے شاگردوں میں خواجہ علاء الدین منصور، مرزا احمد، مرزا محمد حسین شیرازی اور دیگر افراد شامل ہیں۔ عالم آرائے عباسی کے مصنف نے فرخ بیگ کا بھی دو صفحے کے بعد ہی غالباً ایک مصور کی حیثیت سے ذکر کیا ہے لیکن اس نے مولانا درویش حسین اور فرخ بیگ کے رشتے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ عالم آرائے عباسی کا یہ بیان اس نظریہ کو باطل قرار دینے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے کہ مولانا درویش حسین اور فرخ بیگ میں باپ بیٹے کا رشتہ تھا

اب ہم کو فرخ بیگ کی زندگی کے اس دور کا جائزہ لینا چاہیئے جو اس نے خراسان میں گزارا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وہ تصویریں جو ہیرات اور رنگ کے اس نسخہ میں ملتے ہیں جس کو ابراہیم مرزا کے لئے لکھا گیا تھا۔ ان تصویروں پر فرخ بیگ کا نام درج نہیں ہے۔ مسٹر اسکلٹن نے اصول فن (Technique)، و دیگر خصوصیات کی مماثلت کی بنا پر ان تصویروں کو فرخ بیگ سے منسوب کیا ہے۔ بہر حال ہم کو اس عہد کے ایک ایسے مصور کا علم ہے جس کا نام فرخ بیگ تھا اس سلسلہ میں عالم آرائے عباسی کی ایک عبارت نقل کی جاتی ہے جس میں اس کے مصنف نے شاہ طہماسپ (۹۳۰-۹۸۴ھ) کے عہد کے مصوروں کے حالات لکھے ہیں۔

"سیاوش بیگ۔ آنحضرت آثار قابلیت از اطوار او مشاہدہ فرمودہ او را منصب نقاشی داوند، شاگرد استاد علی مصور بود، چوں بقدر مہارتی در آن علم یافتہ نزاکت قلمش خاطر نشان اشرف گردید بنفس نفیس متوجہ تعلیم او گشتہ از شاگردی آنحضرت بر حسب، احسن صورگم تصویر یافتہ ..... ترقی عظیم کرد، دقیقہ کار و مصور بیقرینہ بود... در زمان اسماعیل میرزا از اصحاب کتابخانہ شد و در زمان نواب سکندر شان، او و برادرش فرخ بیگ در سلک معتقدان شاہزادہ جوان بخت کامگار سلطان میرزا منتظم بودند و در زمان اعلیٰ اقتضا مدتہا ملازمت اشرف نمودہ در رکاب مقدس آں حضرت بسکر عمر شان نابود گشت"

حمزہ میرزا کے چچا زاد بھائی ابراہیم میرزا علماء وفضلاء کا کشادہ دل مربی تھا۔ علماء فضلاء اور مصوروں کی ایک کثیر تعداد اس سے منسلک تھی۔ عالم آرائے عباسی کا مصنف اس کی قابل تمجید خوبی

کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"سلطان ابراہیم میرزا از مستعدان روزگار با انواع فضل و کمال آراستہ و بفنون ہنروری پیراستہ بود، خط نستعلیق را بسیار خوب می نوشت، مصور نازک قلم بود، و در علم موسیقی و تعلم ادوار امر آمد روزگار، شاگرد مولانا قاسم قانونی بود و ساز را خوب می نواخت ..... در خراسان اکثر اوقات بشعراء و ارباب نظم و بلاغت صحبت می داشت و جاہی تخلص میکرد و غزل ہائے عاشقانہ از و درمیان است .... کتابخانۂ عالی ہم رسانیدہ از خطوط استادان و خوشنویسان ماتقدم و تصویر مصوران عدیم المثال زرین قلم و سائر تحف در سرکار او بود چنین خانہ اش رشک نگارخانۂ چین و خطا می نمود۔ حرم محترمش بعد از واقعۂ میرزا اکثر آنہا را بجہت آنکہ بدست اسماعیل میرزا در نیاید در آب ریختہ چینیہا را خمرد کردہ بقیہ را آتش زد۔"

اس بیان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ فرخ بیگ کا ایسے ہنرور مربی کے لئے مصروف کار ہونا کوئی خلاف معمول بات نہ تھی اور اسی طور پر یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہفت اورنگ کے مخطوطے میں جو تصویریں ہیں وہ فرخ بیگ برادر سیاوش بیگ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں وہ مصور جو مغل دربار سے منسلک تھا اس کو اس مصور کا مماثل نہیں قرار دیا جا سکتا جو خراسان میں ابراہیم میرزا سے منسلک تھا اس کی ایک معمولی سی وجہ تو یہ کہ فرخ بیگ اور اس کے بھائی سیاوش بیگ کی موت اسوقت ہوئی جب کہ وہ لوگ ایران میں شاہ عباس کی جاگیر میں تھے اور انہوں نے کبھی ہندوستان کا رخ نہیں کیا تھا۔ اسیطرح ہم آئین اکبری کے مولانا محمد سیاوش کو جو چہرہ لوح و خطاطی کا ماہر تھا، عالم آرائے عباسی کے سیاوش بیگ کا مماثل قرار نہیں دے سکتے ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم مسٹر رابرٹ اسکلٹن کے مندرجہ ذیل بیان سے متفق نہیں ہو پاتے۔

"ایسی مشابہتیں بہت کم ہی اتفاقیہ ہو سکتی ہیں خصوصاً کوئی بھی شخص کسی بھی ایسے ایرانی تصویر چہ کی نشاندہی نہیں کر سکتا جو فرخ کے تصویر چہ سے اس قدر مشابہت رکھتا ہو۔ ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرخ بیگ کی مصورانہ زندگی کا پہلا سال خراسان میں بسر ہوا۔ اگر ایسا ہے تو اس کے کابل میں آنے کی تاریخ غالباً ۹۸۴ھ قرار دی جا سکتی ہے جبکہ اس کے خراسانی مربی ابراہیم مرزا کا قتل ہوا تھا۔"

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے فرخ بیگ، حمزہ مرزا سے اس کی زندگی کی آخری سانس (۹۹۵ھ) تک منسلک رہا اور اس کی موت کے بعد مدت دراز تک شاہ عباس کے دربار میں اسکا رہنا یقینی طور پر

ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے بدیہی طور پر اس کو اس کا موقع نہ ملا ہوگا کہ وہ کابل میں آکر مرزا محمد حکیم کے دربار میں چاکری کرے اور کچھ عرصہ تک اس کے دربار سے منسلک رہ کر آخر میں ۹۹۳ھ میں وارد ہندوستان ہو۔ (یعنی شاہ عباس کی تخت نشینی سے دو سال قبل) دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرخ بیگ جو ۹۹۴ھ سے پہلے ابراہیم مرزا کی چاکری میں تھا اُس کا اپنے اُس ہم نام سے کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا ہے جو ۹۹۳ھ میں اکبر کے دربار میں آیا تھا۔

ایک مغل مصور کی حیثیت سے فرخ بیگ کا ابراہیم میرزا سے منسلک ہونا مشتبہ ہے۔ اسیطرح بیجاپور کے دربار میں اس کی موجودگی اور مولانا درویش حسین تعین ہویت (IDENTIFICATION) بھی غلط ہے۔ مسٹر اسکلٹن کا نظریہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

۱۔ دونوں فرخ بیگ اور مولانا فرخ حسین ہم عصر تھے۔

۲۔ ظہوری نے مولانا فرخ حسین کا تذکرہ کیا ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایران میں اُن دونوں کے درمیان دوستی تھی۔

۳۔ ظہوری نے اپنی زندگی کا اچھا خاصہ حصہ شیراز میں مولانا درویش حسین کی صحبت میں بسر کیا تھا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ دو ہم عصروں کی آپس میں ملاقات بھی ہو اور جبکہ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ فرخ بیگ اور فرخ حسین دو الگ الگ افراد تھے تو پھر کوئی دوسرا نظریہ قائم کرنا اور مولانا درویش حسین کو فرخ بیگ کا والد قرار دینا فضول ہے۔

آئیے اب ہم فرخ بیگ کی زندگی کا ایک دوسرے نقطۂ نظر سے جائزہ لیں۔ ظہوری نے خراسان[۱] میں ۹۸۰ھ تک قیام کیا تھا اس کے بعد وہ یزد اور پھر وہاں سے ۹۸۸ھ کے لگ بھگ شیراز گیا تھا۔ جبکہ مسٹر اسکلٹن کے قول کے مطابق فرخ بیگ ۹۸۳ھ کے لگ بھگ خراسان جاکر ابراہیم میرزا سے منسلک ہوا تھا۔ ظہوری ابراہیم میرزا کے دربار سے منسلک نہیں تھا جس کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ اس نے غالباً[۲] ابراہیم مرزا کی تخت نشینی سے نو سال پہلے ہی خیرباد کہہ دیا تھا اس کے علاوہ اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ کلیات ظہوری کی ضخیم جلد میں کسی بھی ایک سطر میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

۱۔ Zahuri, life and works P. 47

۲۔ مآثر رحیمی نے جو ظہوری کی زندگی کے بارے میں معتبر اور مفصل حالات فراہم کرتی ہے مذکورہ میرزا اور ظہوری کے تعلق پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے حالانکہ اسی کتاب میں خواجہ ثنائی اور ابراہیم میرزا کے تعلقات کا حال تفصیل سے درج ہے (جلد ۳، ص ۳۵۸) جب ہم خراسان میں ظہوری زندگی اور ظہوری کے تعلقات کی تردید کرتے ہیں تو مآثر رحیمی کا بیان میزان ثبوت کے پلڑے کو ہمارے ہی طرف جھکاتا ہے۔

اس لئے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ ظہوری ۹۷۳ھ اور ۹۷۵ھ کے درمیان فرخ بیگ سے خراسان میں نہ مل سکا ہوگا

قصہ مختصر یہ کہ ہر شخص یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ فرخ بیگ کی زندگی کی وہ کڑیاں جن کو مسٹر اسکلٹن نے مرتب کیا ہے مربوط نہیں ہیں انہوں نے حالات کی جو تصویر کشی کی ہے وہ نہ تو فرخ بیگ برادر سیاوخش بیگ کے حالات کی تصویر ہے اور نہ ہی مغل مصور فرخ بیگ کے حالات کی ۔

آئین اکبری میں ایک ماہر مصور و نقاش فرخ قلماق کا ذکر ملتا ہے جس کی بنا پر لوگوں نے یہ قیاس کیا ہے کہ فرخ بیگ منگول النسب تھا لیکن اس باب میں مسٹر اسکلٹن کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں رکھتے ایک موقع پر ان کا بیان ہے کہ فرخ بیگ وہ شخص نہیں ہے جس کا ذکر ابوالفضل نے اس موقع پر کیا ہے کیونکہ اس مقام کے متن میں کافی اختلاف ہے ۔ دوسری طرف اس کا ترکی خطاب "بیگ" اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اس کی شہ رگ میں وسط ایشیا کا خون رواں دواں تھا ایک دوسرے موقع پر مسٹر اسکلٹن کا بیان ہے کہ سرگرم مغل دربار میں آنے پر ایک منگول النسب فرد کے نام میں بآسانی لفظ بیگ کا اضافہ کیا گیا ہوگا ۔ یہ غیر مربوط و منتشر بیان مقالہ نگار کی اس ناکامی کا نتیجہ ہے جو ان کو اکبر نامہ کے فرخ بیگ اور آئینِ اکبری کے فرخ قلماق کو متحد کرنے میں ہوئی ہے ۔

پہلی بار فرخ بیگ کی شخصیت کا ذکر ہم کو اکبر نامہ میں اس مقام پر ملتا ہے جہاں ابوالفضل نے اس کے وارد ہندوستان ہونے کا ذکر کیا ہے ۔ اس موقع پر ابوالفضل نے فرخ بیگ کے علاوہ ان دیگر افراد کا ذکر کیا ہے جو بادشاہ (اکبر) کے سوتیلے بھائی محمد حکیم کی موت کے بعد کابل کو خیرباد کہہ کر ۹۹۳ھ میں اکبر کے دربار میں آئے تھے ۔

اس بیان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ فرخ بیگ ۹۹۳ھ سے پہلے ہندوستان نہیں آیا تھا لیکن مسٹر اسکلٹن کو اس بیان کی قطعیت پر اس قدر شبہ ہے کہ وہ اپنے مقالہ میں ایک جگہ یہ تک لکھ دیتے ہیں۔ کرپالی کی تصنیف صفات العاشقین کا ایک مخطوطہ جو سعیدیہ لائبریری حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے ، اس کے آخری صفحہ پر ایک عبارت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی تخت نشینی کے پچیسویں سال کی پچیس ویں محرم کو یہ نسخہ فرخ بیگ سے حاصل کیا گیا تھا ۔ اگر جیسا کہ یقینی معلوم ہوتا ہے جس شخص کا اس مخطوطہ میں ذکر کیا گیا ہے وہ واقعی مصور فرخ بیگ ہی ہے تو ہم اس بات کا معقول طور پر قیاس کر سکتے ہیں کہ یا تو وہ مذکورہ سال میں اکبر کے حدود سلطنت میں مقیم تھا یا کم سے کم وہ ایک ایسے کتابوں کے شوقین حکمران کا رفیق تھا جو اکبر کے حدود سلطنت میں مقیم تھا۔ اس ترقیمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا مصور اکبر نامہ میں ابوالفضل کے درج کردہ سنہ سے چھ سال قبل ہی

ہندوستان آیا تھا۔

مسٹر اسکلٹن کا یہ بیان یقیناً ایک جرأت مندانہ بیان ہے لیکن یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ ابوالفضل کے واضح بیان کے باوجود کوئی اور بیان دیا جائے۔ صاحب موصوف کے بیان کی بنیاد یہ ہے کہ انھوں نے مصور فرخ بیگ کو مذکورہ مصوّر مخطوطے کے خریدار مرزا فرخ بیگ کا مماثل قرار دیا ہے۔ اس طرح کے اخذ نتائج بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ایک ہی نام کے دو اشخاص کا ایک زمانہ میں وجود ہونا قابل تصور نہیں رہ جاتا۔ اس موقع پر فاضل مقالہ نگار نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ مذکورہ دونوں اشخاص کے ناموں میں تصنیف فرق کے باوجود یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے مصور کی یہ عادت تھی کہ جب وہ اپنا نام لکھتا تو فرخ بیگ لکھا کرتا تھا لیکن صفات العاشقین میں جس شخص کا نام درج ہے وہ میرزا فرخ بیگ ہے اور ان دونوں کو فاضل مقالہ نگار نے ایک ہی شخص تصور کر لیا ہے۔

مسٹر رابرٹ اسکلٹن کی یہ کوشش کہ جو چیزیں واضح طور پر ثابت ہو چکی ہیں ان کے بارے میں شبہ پیدا کیا جائے اختلافات سے بھری ہوئی ہے۔ ناصر الدین شاہ[۱] کے البم میں جو گولستان پیلس لائبریری میں محفوظ ہے، ایک نوجوان شہزادہ کی تصویر ملتی ہے جس پر جہانگیر کے ہاتھ کی ایک تحریر بھی ہے اس تحریر میں جہانگیر نے مصور کا نام بھی درج کیا ہے جو حسب ذیل ہے

(۹) ۱۰۱ اعمل فرخ بیگ حسترہ جہانگیر اکبر شاہ

یہ تحریر یقینی طور جہانگیر کی ہے کیونکہ یہ تحریر ان تمام تحریروں سے مشابہ ہے جو جہانگیر کے نام سے منسوب ہیں۔ مصوری سے جہانگیر کے اس مخصوص شغف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جس کا اس نے اپنی تزک میں بار بار ذکر کیا ہے، اس انتساب کو اور بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے یقینی نکات کے باوجود مسٹر اسکلٹن کا یہ بیان متناقض اور حیرت انگیز ہے[۲]

تاہم جب اس تصویر کا فرخ بیگ کی دیگر معلوم تصاویر سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو اس میں خیال اور اسلوب کا بین فرق ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ اس تصویر کا نچلا حاشیہ والا حصہ کاٹ دیا گیا ہے اس لئے اس تصویر کے عالم وجود میں آنے کا ممکن سنہ ۱۰۰۱ ہجری سے لے کر ۱۰۴۹ ہجری تک قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن تصویر کے اسلوب و انداز کو مدِ نظر رکھتے ہونے میں اس کا زمانہ ۱۰۲۴ ہجری سے ۱۰۳۷ ہجری تک قرار دینا پسند کروں گا جو جہانگیر کا سنہ وفات بھی ہے

---

[۱] ص ۳۰۳ [۲] ص ۲۰۴ ۱۰ = ۲۰۰

جہانگیر کی زندگی کے اختتام کے وقت کی تاریخ جبکہ شراب اور افیون کی زیادتی استعمال کی وجہ سے اس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی میری اس بات کی تصدیق کرے گی کہ اس نے اس تصویر کو فرخ بیگ سے منسوب کرنے میں غلطی کی ہے۔" (ص ۴۱-۴۲)

فرخ بیگ کی زندگی کا سب سے الجھا ہوا پہلو اس کا ورود بیجاپور ہے۔ جبکہ وہ ایک قلیل مدت کے لئے عادل شاہی دربار میں آیا اور پھر وہاں سے جہانگیر کے دربار میں واپس چلا گیا۔ مسٹر رابرٹ اسکلٹن کے نزدیک فرخ بیگ کے بیجاپور جانے کے دو سبب رہے ہوں گے

۱۔ ابراہیم عادل شاہ کا مصوروں سے شغف اور دربار عادل شاہی میں ظہوری کی کارفرمائیاں یقیناً فرخ بیگ کے علم میں رہی ہوں گی جو یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے جوہر کی پوری پوری قدر نہیں ہو رہی ہے۔

۲۔ چونکہ وہ ایک عالم (مولانا) کا فرزند تھا اور خود بھی مولانا کے لقب سے ملقب تھا اس لئے یہ ناممکن نہیں ہے کہ اکبر کی ملحدانہ اور مسلمان علماء سے متعصبانہ روش کی بنا پر اس نے یہ کوشش کی ہو کہ جہاں پر اس کے قدیم دوست کی اتنی پذیرائی ہوئی ہو اور جہاں کشادہ ذہنی سے اس کی پذیرائی ممکن ہو وہاں چلا جائے۔[1]

قبل اس کے کہ ہم تفصیل میں جائیں ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ فرخ بیگ کے قیام بیجاپور کے سلسلہ میں مسٹر سکلٹن کے نظریہ کی بنیاد کس نکتہ پر ہے۔ صاحب موصوف کی رائے یہ ہے کہ

۱۔ اگرچہ ہم کو کسی بیجاپوری مواد کے ذریعہ فرخ بیگ کے قیام دکن کے بارے میں کوئی راست علم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے شواہد موجود ہیں جو اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ وہ کئی سالوں تک بیجاپور میں مقیم اور مصروف کار تھا۔ (ص ۴۰-۴۳)

۲۔ ہم کو علم ہے کہ ایک ماہر مصور فرخ حسین کا تذکرہ ظہوری نے کیا ہے۔ جو اس وقت بیجاپور کے دربار سے منسلک تھا اور مذکورہ فرخ حسین بھی فرخ بیگ ہی کی طرح ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ مواد کی قلت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ وہاں پر دو یا تین قدر اول کے حامل مصور رہے ہوں گے اور اگر دو مصوروں کا نام فرخ تھا تو یہ ایک تعجب انگیز ہم زمانیت ہوگی۔ ان دونوں ناموں کے آخری جزو کا فرق اس بات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بیان کیا جا سکتا ہے کہ لفظ بیگ کا اضافہ ایک منگول النسب فرد کے نام میں اس وقت ہوا ہوگا جبکہ وہ سرگرم

---

[1] ص ۴۰۵ کالم ۱۰۔ جہاں ایسی ہی رائے اور بھی دی گئی ہے۔

مغل دربار میں نیا نیا وارد ہوا ہوگا۔

لیکن، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے فرخ حسین اور فرخ بیگ دو الگ الگ اشخاص تھے اور یہ کہہ کر انکے ناموں کے فرق کو ختم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے نام میں لفظ بیگ کا اضافہ مغل دربار میں آنے کے بعد ہوا ہوگا۔ اس کے علاوہ ہم کو اس کا بھی علم ہے کہ اس کے ورود ہندوستان سے قبل ہی لفظ بیگ اس کے نام کا ایک جزو تھا۔ (اور بقول مقالہ نگار) جب تک وہ بیجاپور میں رہا یہ لفظ اس کے نام سے خارج رہا) اور پھر مغل دربار میں آنے کے بعد ہی لفظ دوبارہ اس کے نام کا ایک جزو ہو گیا۔ کسی بھی نام میں اس قسم کی تبدیلی ناقابل تصور و یقین ہے۔

اب ہم چند الفاظ میں ان اسباب پر تنقیدی محاکمہ کریں گے جو فرخ بیگ کے ورود بیجاپور کے سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار نے لکھے ہیں۔ میرے خیال میں دارالسلطنت کو خیرباد کہہ کر، ایک صوبائی راجدھانی بیجاپور میں صرف اس عذر سے جانا کہ وہاں مصور کی زیادہ قدر ہوگی ایسا سبب نہیں ہے جو شاہ عادل کے منصب پر فائز ہو سکے۔ ابراہیم عادل شاہ، اکبر سے زیادہ کشادہ ذہن مربی فن نہیں ہو سکتا تھا۔ صاحب موصوف کا دوسرا بیان بالکل بے محل ہے۔ کیونکہ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ فرخ بیگ مولانا کے لقب سے کبھی بھی ملقب نہیں تھا اور یہی بات اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ وہ اور مولانا فرخ حسین دو الگ الگ شخصیتوں کے مالک تھے۔ دوئم یہ کہ مولانا کا لقب اس زمانہ میں اتنا عام تھا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص بھی اس لقب سے ملقب ہو وہ اتنا پرہیزگار اور مذہبی شخص بھی ہو کہ اکبر کی ملحدانہ پالیسی سے ناپسند ہو۔ سوئم یہ کہ جب اس نے مغل دربار کو اسکی ملحدانہ روش کی وجہ سے چھوڑا تھا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے ایک ایسے بادشاہ کے پاس جانا کیوں روا رکھا۔ جو کسی بھی حیثیت سے وہ کچھ ثابت نہیں ہو سکتا تھا جس کی امید ایک راسخ العقیدہ مسلمان ایک پابند مذہب سربراہ ریاست سے رکھتا ہے۔ برہمن درباریوں کے اثرات اور خود ابراہیم عادل شاہ کے نقطہ نظر کی تبدیلی نے اس کو اسی راہ کا راہی بنایا جس پر اکبر گامزن تھا اور فی الحقیقت ایک زمانہ میں ابراہیم عادل شاہ نے اکبر کی پیروی کا اقرار بھی کیا ہے۔ چہارم یہ کہ فرخ بیگ مغل دربار میں ۹۹۳ھ میں، دین الٰہی کے عالم وجود میں آنے کے گیارہ بارہ سال بعد آیا اور تقریباً پندرہ سال تک مغل دربار سے منسلک رہا، اس عرصے کے گذر جانے کے بعد اس کو یہ خیال آیا کہ اسے یہ دربار چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر جانا چاہئے جہاں کا ماحول زیادہ مذہبی ہو۔ فرخ بیگ کے ممکنہ سنہ ورود بیجاپور سے ۵ سال قبل ظہوری بیجاپور پہنچ چکا تھا۔

ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے فرخ بیگ کے ورود بیجاپور اور اس کے وہاں قیام کے بارے میں مسٹر رابرٹ اسکلٹن کے نظریہ سے متفق ہونا مشکل ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اس نظریہ کو بھی قبول نہیں

کر سکتا کہ "۱۶۰۵ء میں جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد سے مغل دربار کی فضا تبدیل ہونے لگی تھی اور وہ دونوں اسباب ختم ہو چکے تھے جن کی بنا پر فرخ بیگ نے مغل دربار کو خیرباد کہا تھا" یا "شاہی تصویر خانہ کی صفائی (Weeding) اور جہانگیر کے زیر عاطفت اپنے جوہر کو نمایاں کرنے کے وسیع موقع نے اس دربار میں فرخ کی واپسی کی راہ کھول دی تھی"۔ یہاں پر پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر یہ بات فرخ کے علم میں تھی کہ اب دربار کی فضا میں زبردست تبدیلی ہو چکی ہے تو وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کے چار سال بعد تک فرخ کو اس دربار میں واپس آنے سے روکے رکھا؟

۱۶۰۳ء میں میر جمال الدین حسین انجو بیجاپور بھیجا گیا تھا، مسٹر اسکلٹن کا نظریہ یہ ہے کہ فرخ بیگ بھی میر انجو کی ہمراہی میں تھا۔ ان کا بیان ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"۱۶۰۳ء میں ماہ اسفندرمز کی انتیسویں تاریخ کو میر جمال الدین حسین انجو بیجاپور بھیجا گیا۔ میر جمال الدین کی شخصیت اس طرح کی تھی کہ فرخ بیگ نے اس کی معیت قبول کی ہوگی کیونکہ میر مذکورہ نہ صرف ایک زبردست عالم تھا بلکہ وہ اس شیراز کے مشہور خاندان انجو کا ایک فرد تھا جس میں فرخ بیگ پیدا ہوا تھا۔ یہ وفد بیجاپور میں مارچ ۱۶۰۴ء میں آیا اور اس طرح فرخ اپنے قدیمی دوست شاعر ظہوری سے دوبارہ ملا۔ اس نے دکن کے دربار میں جو تصویریں بنائیں ان میں سے ایک ابتدائی تصویر "ایک سینری میں فقراء" یقیناً رہی ہوگی بہرحال اس کے بعد وہ جلد ہی اپنے نئے ماحول سے گھل مل گیا اور ۱۶۰۴ء میں اسد بیگ کے اس وفد کے آنے کے بعد جو میر جمال الدین حسین انجو کو واپس بلانے کے لئے آیا تھا۔ مصور کو ایک ہاتھی چنچل کی تصویر بنانے کا حکم دیا گیا جس کو اسد بیگ تحفہ کے طور پر اکبر کے دربار میں لے جانے والا تھا"

(ص ۵۰۴ کالم ۱-۲)

صاحب موصوف کا یہ بیان تین کتابوں "آئینِ اکبری"، "اکبر نامہ"، اور "واقعاتِ اسد بیگ" سے ماخوذ ہے[1]

---

[1] فرخ بیگ کا نام آئینِ اکبری سے، میر جمال الدین حسین انجو کے وفد کو بھیجنے والا حصہ اکبر نامہ و واقعات اسد بیگ اور اسد بیگ کا نام واقعات اسد بیگ سے ماخوذ ہے۔ اس متفرق مواد کو مقالہ نگار نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اسی وجہ سے انہو مذکورہ بالا مواد میں اپنی طرف سے اضافے کرنے پڑے ہیں۔ اس مقالہ میں خط کشیدہ جملے ان ہی کے اضافہ کردہ ہیں۔

لیکن ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کے بھی مصنف نے مصور کا نام نہیں لیا ہے اور اس بات کا بھی ذکر نہیں ہے کہ اس نے کون کون سی تصویریں بنائی تھیں۔ میر انجو کی ہمراہی نہیں فرخ بیگ کے جانے کی مفروضہ حکایت کی بنیاد صرف یہی ہے کہ وہ دونوں شیرازی تھے لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، فرخ بیگ کا شیراز سے تعلق قائم کرنا غلط ہے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جب تک ان اسباب کا پتہ نہ چل جائے جن کی بنا پر میر جمال الدین انجو اور اسد کے ہمراہیوں کی فہرست میں سے مصور کا نام کیوں خارج کر دیا گیا ہے (مطابق اکبر نامہ و واقعات اسد بیگ) کوئی بھی شخص مسٹر اسکلٹن کے نظریہ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔

دربار دکن سے دربار جہانگیری میں فرخ کے آنے کا سنہ مسٹر اسکلٹن نے ۱۶۰۹ء قرار دیا ہے لیکن ایک جگہ انھوں نے ۱۶۰۶ء کو اسکی واپسی کا ایک تخمینی سنہ[1] قرار دیا ہے۔ پہلے سنہ کو اس کی واپسی کا سنہ قرار دینے کی وجہ توزک جہانگیری[2] کی وہ عبارت ہے جو جہانگیر کی تخت نشینی کے چوتھے سال کی ۲۲ رمضان ۱۰۱۸ھ کے تحت ہے۔

"دوہزار روپیہ بفرخ بیگ مصور کہ از بی بدلان عصر است لطف نمودم"

لیکن مندرجہ بالا عبارت کا محتاط مطالعہ اس بات کو واضح طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ (اس وقت) فرخ بیگ جہانگیر کے دربار میں کوئی نووارد نہیں تھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس دربار سے ایک عرصہ منسلک تھا۔ اس لئے کہ اس سلسلہ میں بھی مسٹر اسکلٹن کا نظریہ قبول نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک ان کے تجویز کردہ دوسرے سنہ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سہ نثر ظہوری کا وہ حصہ جس میں مولانا فرخ حسین کا ذکر ہے ۱۶۰۵ء ۱۰۱۴ھ میں لکھا گیا تھا جبکہ ظہوری کی عمر ستر سال کی تھی۔ بقول صاحب میخانہ ظہوری کی وفات ۱۶۱۶ء ۱۰۲۵ھ میں بعمر اکیاسی سال ہوئی تھی اس قول کے مطابق ۹۴۴ھ کو اس کی تخمینی تاریخ پیدائش اور ۱۰۱۴ھ کو سہ نثر کی تاریخ تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ قیاس کرنا درست نہ ہوگا کہ ایک ایسا شخص جو ایسے جلیل القدر مرتبہ پر فائز ہو کہ بادشاہ کے سات ممتاز درباریوں میں ۱۰۱۴ھ ہی میں گنا جائے بغیر کسی معقول سبب کے اسی زمانے میں اس دربار کو خیرباد کہے اس سلسلہ میں میرا نظریہ یہ ہے کہ دربار بیجاپور کے مولانا فرخ حسین کا مصور فرخ بیگ سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ بنارس کے ذخیرۂ بابو سیتارام ساہو میں ایک

---

[1] س س ۳۰ .ہ ۲ ص ۷۶

ہاتھی اور اس کے سوار کی ایک تصویر ہے۔ ڈاکٹر موتی چند[1] نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ تصویر یقینی طور پر جنوری ۱۶۰۴ء میں بیجاپور میں اس وقت بنائی گئی تھی جبکہ وہ ہاتھی جس کا نام چنچل تھا اسد بیگ کے وفد کے ہمراہ اکبر کے دربار میں ایک تحفہ کے طور پر پیش ہونے جا رہا تھا[2]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسم چنچل واقعات اسد بیگ سے ماخوذ ہے لیکن اس ہاتھی کو ذخیرۂ بنارس کی تصویر کے ہاتھی کا مماثل قرار دینا ڈاکٹر موتی چند کی اپنی اختراع ہے۔ مسٹر اسکلٹن ڈاکٹر موتی چند کی اس رائے سے متفق ہوتے ہوئے انہوں نے ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ تصویر فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ہے۔

"اس وزنی دیو اور اس کے دو سواروں کی تصویر دیکھ کر اول اول فرخ بیگ کا ہاتھ پہچاننا خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، اس تصویر کی سبزی ہمارے شبہ کا ازالہ کر دے گی۔ اس کا ہر پیڑ فرخ کی دوسری تصویروں کے پیڑوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے"

صاحب موصوف کے اس بیان کا انحصار صرف اس مفروضہ پر ہے کہ فرخ بیگ دربار بیجاپور میں موجود تھا، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں یہ مفروضہ قطعی بے بنیاد ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاہی تصویر خانہ (اسٹوڈیو) میں مصروف کار رہنے کے علاوہ، فرخ دیگر خدمات بھی انجام دیتا رہا تھا۔ ۹۹۹ھ میں شاہ ایران کے خلاف مرزاؤں کی بغاوت نے اکبر کو اس بات پر اکسایا کہ وہ شاہ ایران کی مدد کے لئے اپنی ایک فوج بھیجے ابو الفضل نے اس فوج میں شامل افراد کے ناموں پر مشتمل جو فہرست درج کی ہے اس میں فرخ بیگ کا بھی نام شامل ہے۔ مسٹر اسکلٹن اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس فہرست میں جس فرخ کا تذکرہ ہے وہ وہی مصور فرخ بیگ ہے جو ہمارا موضوعِ بحث ہے ان کے اس اخذ نتیجہ میں بہت کچھ صداقت ہے لیکن انہوں نے جس نکتہ پر اپنے اخذ نتیجہ کی بنیاد رکھی ہے اس سے متفق ہونا مشکل ہے۔ وہ نکتہ حسب ذیل ہے

"ایک ادھیڑ عمر کے مصور کے لئے یہ خدمت کچھ عجیب سی معلوم ہو گی لیکن اس بات کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے کہ ہم اس بات میں شبہ کریں کہ زیر بحث شخص وہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہم کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ۱۵۸۶ء میں اکبر نے اپنے ایک چہیتے درباری بیربل کو کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے مقرر کیا تھا، حالانکہ، جیسا کہ واقعات ثابت کریں گے کسی شاعر، مسخرہ اور مصور کو اس خدمت کے لئے مناسب و موزوں قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

---

[1] اسلامک کلچر جلد ۲۰ نمبر ۱، ص ۴۴۳

[2] Potdar commemoration vol. PP. 19 and 194

اس کے بعد ابوالفضل کے ایک بیان سے ثابت کیا گیا ہے کہ فوج اور فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں جو
افراد کام کرتے تھے ان کا تبادلہ ایک شعبہ سے دوسرے شعبہ میں ہوتا تھا، لیکن یہ اخذِ نتیجہ صد فی صد درست قرار
نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ابوالفضل کی اصل عبارت میں یہ درج ہے کہ احدی، منصب دار اور سپاہی بھی کتابخانہ
میں ملازم تھے لیکن یہ بات اس چیز کو ثابت نہیں کرتی کہ کتاب خانہ کا عملہ فوج میں بھی ملازم تھا۔

اگرچہ یہ بات خلافِ قانون نہیں ہے کہ ایک مصور فوج میں ملازم ہو لیکن یہ بات بہرحال معمول کے
مطابق نہیں ہے اور ایک غیر معمولی بات کی اثبات کے لئے ایک مناسب و موزوں ثبوت درکار ہوتا
ہے۔ اس لئے مسٹر اسکلٹن کو اپنے نظریہ کے اثبات کے لئے کچھ مناسب ثبوت بھی فراہم کرنا چاہئے تھا،
جو فرخ بیگ معرکہ آرائی کے لئے بھیجا گیا تھا اس کو صاحب موصوف صرف نام کی مماثلت کی بنا پر مصور فرخ
بیگ کا مماثل قرار دیتے ہیں۔ ناموں کی مماثلت کی بنا پر ان کا یہ فیصلہ مغالطہ سے خالی نہیں ہے۔ لیکن
حقیقت یہی ہے کہ جو فرخ بیگ فوجی حملہ کے لئے بھیجا گیا تھا وہ وہی فرخ بیگ تھا جو سنہ ۹۹۳ھ میں، مرزا
حکیم کی موت کے بعد، مرزا حکیم کے لڑکے اور فوج کے ساتھ زابل سے مغل دربار میں آیا تھا۔ میرے
دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ سنہ ۹۹۳ھ میں جو گروہ کابل سے آیا تھا اس کے آٹھ سے زیادہ افراد مذکورہ
معرکہ آرائی کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں جن ناموں کی صراحت کی گئی ہے وہ یہ ہیں:
شاہ بیگ، جاناش بیگ، الغ بیگ، نور محمد، خواجہ خضری، خاکی گگ بان، قاسم کوکہ، فرخ بیگ

غالباً ان نوواردوں کا تقرر حملۂ قندھار کے لئے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر کیا گیا تھا۔

۱۔ وہ لوگ بہادر، چالاک اور تجربہ کار جنگجو تھے۔

۲۔ وہ لوگ قندھار کے بارے میں متفکر تھے۔ جو فوج معرکہ آرائی کے لئے منتخب ہوئی تھی اس کا
تذکرہ اکبر نامہ میں اس طرح ہے۔

"بخاطر ہمایوں رسید کہ گزیدہ لشکری بدان سو فرستادہ شود الخ"

اس عبارت سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ فرخ بیگ وغیرہ کا اس جگہ پر تقرر ان کے سابقہ
تجربات اور شجاعانہ افعال و اعمال کی بنا پر ہوا تھا۔

اس سلسلہ میں میں ان نتائج پر پہونچا ہوں۔

۱۔ مغل مصور فرخ بیگ مندرجہ ذیل افراد سے بالکل الگ ایک دوسری شخصیت کا حامل فرد ہے
(۱) مولانا فرخ حسین جو دربارِ بیجاپور سے منسلک تھا
(ب) فرخ قلماق جو دربارِ اکبری سے منسلک تھا۔

(ج) فرخ بیگ برادر سیاوش بیگ جو شاہ عباس کے دربار سے منسلک تھا۔
(د) مرزا فرخ بیگ جس نے اکبر کے لئے ایک مخطوطہ حاصل کیا تھا۔
(۲) مغل مصور فرخ بیگ کی زندگی کے مندرجہ ذیل حقائق کا ہم کو یقینی علم ہے اس کے علاوہ اس کی زندگی کے جو واقعات لکھے گئے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے درست نہیں ہیں۔
(ا) سنہ ۹۹۳ھ تک وہ کابل میں مرزا حکیم کے ساتھ تھا۔
(ب) سنہ ۹۹۳ھ میں وہ اکبر کو نذر عقیدت پیش کرنے کے لئے راول پنڈی آیا۔
(ج) سنہ ۹۹۶ھ میں وہ ایک فوجی مہم میں قندھار بھیجا گیا
(د) سنہ ۱۰۰۰ھ کے لگ بھگ اس نے اکبر نامہ کا ایک مخطوطہ تیار کیا۔
(ہ) سنہ ۱۰۱۵ھ میں وہ جہانگیر کے دربار سے منسلک تھا۔
آخر میں میں ان چند تاریخی اور سوانحی غلطیوں کا ذکر کروں گا جو مقالہ زیر بحث میں ملتی ہیں۔
۱۔ مسٹر اسکلٹن دیباچۂ نوان علیل کو کتاب نورس کا تیسرا دیباچہ تصور کرتے ہیں (ص ۹۰ کالم ۱) یہ دیباچہ، کتاب نورس کا دیباچہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک مجموعۂ اشعار ہے جو ظہوری اور ملک نے ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں مرتب کیا تھا۔ میں نے اس نکتہ کی وضاحت اپنے ایک مقالہ مطبوعہ Proceedings of All India oriental conference 16th session میں بخوبی کر دی ہے۔
۲۔ ترشیز کو ظہوری کا مولد قرار دیا گیا ہے۔ اس لفظ کی صحیح قرات ترشیز ہے نہ کہ ترشیز اس کے علاوہ ظہوری کا مولد قائن یا تربت ہے۔ ترشیز نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر کی مکمل وضاحت میرے مقالے مطبوعہ معارف اعظم گڑھ مئی سنہ ۱۹۴۷ء اور میری کتاب Zahuri life and works میں موجود ہے
۳۔ ظہوری کے سلسلہ میں یہ بیان کیا گیا کہ اس نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ شاہ عباس کے دربار میں بھی گذارا تھا لیکن قدر دانی کی کمی نے اس کو ہندوستان آنے پر مجبور کیا (سنہ ۱۵۸۰ء) ظہوری کے ہندوستان آنے کی تاریخ یعنی سنہ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء بالکل صحیح ہے لیکن شاہ عباس سنہ ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء سے قبل تخت نشین نہیں ہوا تھا اس لئے ظہوری کو شاہ عباس کی تخت نشینی سے سات سال قبل ہی سے اس کے دربار سے منسلک قرار دینا فضول بات ہے۔ مسٹر اسکلٹن کا یہ بیان عبدالغنی کی کتاب A History of The language and literature at The Moughal court Vol III سے ماخوذ ہے۔ جہاں یہ جملہ ملتا ہے۔

"کسی زمانہ میں ظہوری ایران کے بادشاہ شاہ عباس کے دربار میں بھی تھا جس کو اس نے مناسب قدر دانی اور سرپرستی کی امید میں خیرباد کہا تھا۔"

مسٹر عبدالغنی نے یہ نتیجہ مندرجہ ذیل اشعار کی بنا پر نکالا ہے جو ایک ترکیب بند میں ملتے ہیں۔ (غلطی سے اس ترکیب بند کو ترجیع بند کہا گیا ہے۔)

دل بغربت گرفت از جانم   برہان زین کدو تسنانم

ہندو شکر بطوطی ارزانی   بلبلِ گلبنِ خرسانم

خود اکنوں اگر چہ می پوشم   چون نہ تشریف نست عریانم

یہ اشعار اور اس ترکیب بند کا آخری بند اس بات کا واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ ان کا خالق ہندوستان میں مقیم ہے اور شاہ ایران کی خدمت میں اپنی نذر عقیدت پیش کر رہا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

عصمت جاوید

وضع اصطلاحات کی چند نادرست لسانی اصطلاحیں

پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی کی مایہ ناز تصنیف وضع اصطلاحات اردو کے لسانیاتی ادب میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب میں اصطلاح سازی کے وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر عمل کرتے سے اردو زبان نہ صرف اپنا دامن مالا مال کر سکتی ہے بلکہ روز بروز تیزی سے بڑھتے ہوئے علمی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش چل سکتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ اور امریکہ نے صرف دو صدی سے کم عرصے میں سائنسی ترقی کا جو شاندار ریکارڈ قائم کیا ہے اس سے افریشیائی قومیں الاماشاء اللہ بمراحل دور ہیں۔ چونکہ کسی قوم کی زبان اسکی علمی ترقیوں کی بڑھتی ہوئی تیز رفتاری کے ساتھ اگر چلتی نہیں تو شعوری طور پر چلائی جاتی ہے اس لئے زبان جہاں ایک قوم کی ثقافتی و معاشرتی حالات کی نمائندگی کرتی ہے وہاں اس کی علمی سطح کی مظہر بھی ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہمیں اس بات کے ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ یورپی زبانیں خصوصاً جرمن فرانسیسی اور انگریزی (اس میں روسی بھی شامل کر لیجئے) ایشیائی زبانوں کے مقابلہ میں علمی اعتبار سے کافی بلند ہیں اور اگر ایشیا والوں کو علمی دوڑ میں حصہ لینا ہے تو اپنی اپنی زبانوں کی علمی سطح بلند سے بلند تر کرنے کے لئے یورپ کی ان ترقی یافتہ زبانوں کی تقلید ضروری ہی نہیں، لابدی ہے۔ اردو زبان پر بھی اس کلیے کا اطلاق ہوتا ہے یوں تو یورپ کی ترقی یافتہ زبانیں بھی روز افزوں علمی تقاضوں کے پیش نظر آج بھی اصطلاح سازی کے مسئلے سے دوچار ہیں لیکن انہوں نے اس مسئلے کا حل لاطینی اور یونانی مادوں اور لاحقوں میں تلاش کر لیا ہے اور آئے دن علم کے مختلف شعبوں میں نئی نئی اصطلاحوں کی تخلیق یورپی اقوام کی زبانیں اور ان کی علمی ترقیوں کی رفتار تیز سے تیز تر کرنے میں مدد ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن ایشیائی زبانیں اور اس لحاظ سے اردو بھی وضع اصطلاحات سے زیادہ ترجمۂ اصطلاحات کے مسئلے سے دوچار ہے۔ اسی لئے وضع اصطلاحات میں جہاں نئی نئی اصطلاحات گھڑنے کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے وہیں یورپی زبانوں خصوصاً انگریزی کی علمی اصطلاحات کے ترجمے کے گر بھی بتائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں فاضل مصنف نے

اردو کے لسانی مزاج سے مبسوط بحث کی ہے اور اصطلاح سازی کے سلسلے میں بجا طور پر حتی بالمقدور عربی کی ․․․ گری سے اجتناب کی تلقین کی ہے کیونکہ سامی خاندان السنہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر عربی نئے نئے مرکبات کی تخلیق میں بہت دور تک ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس ضمن میں انہوں نے فارسی سے استفادہ کرتے اور ہندی۔ فارسی مرکبات کے وضع کرنے پر زور دیا ہے۔ اس اصول کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس مضمون میں ہم اصطلاح سازی کے ان اصولوں سے بحث نہیں کریں گے بلکہ ان لسانی اصطلاحوں کی صحت یا عدم صحت سے متعلق اپنی رائے پیش کرنا چاہتے ہیں جنہیں سلیم پانی پتی نے اس کتاب میں استعمال کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیم پانی پتی سابقوں اور لاحقوں کا لسانی تصور نہیں رکھتے تھے۔ سابقے لاحقے (AFFIXES) دو قسم کے ہوتے ہیں انصرافی (INFLECTIONAL) اور اشتقاقی (DERIVATIONAL) چونکہ سنسکرت خاندان السنہ میں انصرافی اور اشتقاقی لاحقے زیادہ بامحل ہوتے ہیں اس لئے ہم انصرافی اور اشتقاقی لاحقوں کا ذکر قدرے تفصیل سے کریں گے۔ لاحقے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) انصرافی اور (۲) اشتقاقی۔ خارجی تصریفی (EXTERNALLY INFLECTIONAL) زبان جیسے سنسکرت اور لاطینی میں انصرافی اور اشتقاقی دونوں قسم کے لاحقے مستعمل ہیں۔ اس کے برخلاف داخلی تصریفی (INTERNALLY INFLECTIONAL) زبانوں جیسے سامی اور حامی خاندان کی زبانوں میں ریشہ ساز ترکیبیے (STEM FORMATIVES) جنہیں "حروف زائد" کہا جاتا ہے استعمال ہوتے ہیں۔

انصرافی اور اشتقاقی لاحقے کا فرق ظاہر کرنے کے لئے ہم یہاں ایک مثال دیں گے۔ ایک لفظ "کتاب" ہے اس کی جمع ہے "کتابیں"۔ لفظ "کتابیں" کتاب + یں سے مرکب ہے۔ اس لفظ میں 'یں' اسم 'کتاب' کی تعداد کا اظہار کر رہا ہے۔ اس کی تصریف (Paradigm) ہوگی۔ ایک کتاب: دو کتابیں: کچھ کتابیں: کئی کتابیں۔ پہلا ان جملوں میں:-

(۱) تمہیں کتابوں نے کیا دیا

(۲) آجکل کتابوں کو کوئی نہیں پوچھتا

(۳) مجھے کتابوں کا شوق نہیں

(۴) کتابوں سے علم حاصل ہوتا ہے

(۵) کتابوں میں کیا رکھا ہے!

مذکورہ بالا تمام جملوں میں لفظ 'کتابوں' (کتاب + وں) باقاعدگی سے استعمال ہوا ہے اور حروف جار (یا حروف ربط) 'نے'، 'کو'، 'کا'، 'سے'، 'میں' لفظ '+وں' کے بعد آئے ہیں اور اس طرح اسم 'کتابیں' کی مختلف حالتوں (CASES) کا اظہار کر رہے ہیں پہلے جملہ میں کتابوں (نے) حالت فاعلی' دوسری میں کتابوں (کو) حالت مفعولی، تیسرے جملے میں کتابوں کا (کا) حالت اضافی، چوتھے جملے میں کتابوں (سے 'بمعنی' کے ذریعے) حالت آلی اور پانچویں میں کتابوں (میں) حالت ظرفی میں ہے۔ اسی طرح ایک اور حالت 'حالت ندائی' ہے جیسے 'اے کتابو' 'کتابو' میں 'و' غیر مغنونہ ہے۔ چونکہ اردو نیم تصریفی۔ نیم تحلیلی زبان ہے۔ اس لئے اس کی حالتیں بھی درمیانی درجے (INTERGRADATION) میں نیم تصریفی نیم تحلیلی ہیں۔ مذکورہ بالا تمام جملوں میں لفظ 'کتابیں' کی شکل 'کتابوں' بن گئی ہے۔ یعنی 'یں' لاحقہ 'وں' اور 'و' بن گیا ہے۔ اسے عام طور پر غیر مستقیم (oblique) حالت یا CRUDE FORM (خام شکل) بھی کہتے ہیں۔ اردو میں اسے "محرّف" کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ یہ لاحقے جو اسما کی تعداد اور حروف جار کی مدد سے حالتیں بتلاتے ہیں "بندھے روپ" (BOUND FORMS) ہیں جنہیں 'تشکیلیہ' (MORPHEME) کہا جاتا ہے۔ 'تشکیلیہ' وہ چھوٹی سے چھوٹی اکائی ہے جس کا قواعد میں مناسب مقام ہوتا ہے۔ بعض تشکیلیوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی بامعنی اکائی ہوتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا مثال 'کتاب' ہی کو لیجئے۔ یہ عربی منفصل مادہ ک۔ ت۔ ب میں ریشہ ساز ترکیبئے (STEM FORMATIVES) کے اضافے سے بنا ہے اور فارسی تصرف کے زیر اثر غیر منون ہو کر اردو میں آیا ہے اور اردو میں ریشے (STEM) کے بجائے مادے (ROOT) کا حکم رکھتا ہے۔ اگر ہم اس لفظ کی قطع برید کریں تو ک + تاب، کتا + ب، کت + آب جیسے ٹکڑے ہاتھ لگتے ہیں جن میں ہر ٹکڑا بے معنی ہے۔ اگرچہ ک + تاب میں تاب بامعنی ہے لیکن دوسرے محلات استعمال میں جیسے (شب تاب، پیچ و تاب وغیرہ میں) لیکن مذکورہ لفظ میں ٹکڑا بے معنی ہے اسلئے ہم کہہ سکتے کہ لفظ 'کتاب' ایک چھوٹی سے چھوٹی بامعنی اکائی ہے اور اسی لئے تشکیلیہ ہے۔ اب لفظ 'کتابیں' دیکھئے۔ یہ کتاب + یں سے مرکب ہے۔ چونکہ لاحقہ 'یں' قواعدی وظیفہ ادا کر رہا ہے یعنی کتاب کی تعداد بتا رہا ہے اس لئے اسے بھی تشکیلیہ کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا مثالوں میں 'یں'، 'وں' اور 'و'، انصرافی لاحقے ہیں۔ انہیں انصرافی تشکیلیہ بھی کہا جاتا ہے۔ وہ لاحقے جو انصرافی نہیں ہوتے اشتقاقی کہلاتے ہیں۔

ایک اور لفظ لیجئے 'کتابی' (جیسے کتابی چہرہ، کتابی علم) چونکہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور ہم لفظ کتاب سے واقف ہیں اس لئے لفظ 'کتابی' کو 'کتاب' اور 'ی' میں بآسانی اور صحیح طور پر توڑ سکتے ہیں لہٰذا ہمیں ی کا لاحقہ ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ 'کتابی' دو تشکیلیوں سے مرکب ہے۔ لیکن اس میں 'ی' انصرافی لاحقہ نہیں بلکہ اشتقاقی لاحقہ ہے۔ کیونکہ یہ لاحقہ مذکورہ بالا لاحقوں 'یں'، 'وں' اور 'و' سے مختلف ہے اس لاحقہ کو گردانا نہیں جا سکتا۔ یہ صفت کا اظہار کرنے والا لاحقہ ہے اور اردو میں الف الآخر صفات کو چھوڑ کر

[مثال، اچھا لڑکا : اچھے لڑکے] دیگر صفات میں انصرافی لاحقے متصل نہیں کئے جاتے ۔ لفظ "کتاب" معصمتہ ہے۔ کتابی' صفت ہے ۔ ہم 'کتابی چہرہ ۔ کتابی چہرے' کہتے ہیں۔ چہرہ (اس لفظ میں ہائے غیر ملفوظ صرف تحریرہ (grapheme) ہے ۔ ورنہ اصل میں یہ 'ہا' صوتیہ (Morpheme) (ا) کا قائم مقام ہے) چہرے بن گیا لیکن 'کتابی' ہی رہا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں مصمتہ الاخر مذکر الفاظ شکل جمع میں بھی وہی رہتے ہیں جو شکل واحد میں ہوتے ہیں جیسے 'ایک بیل ۔ دو بیل' ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'بیل' میں بصورت جمع صفر تشکیلیہ ہے۔ انگریزی میں صفر تشکیلیہ کی علامت ہے تاکہ وہ انگریزی حروف (o) سے خلط ملط نہ ہو جائے ۔ ہم اردو میں صفر تشکیلیے کے لئے صفر (٥) استعمال کر سکتے ہیں ۔ یعنی فقرہ 'ایک بیل' میں صرف ایک تشکیلیہ ہے لیکن فقرہ 'دو بیل' میں دو تشکیلیے ہیں (بیل + ٥ اور لسانی اعتبار سے یہ دو الگ الگ الفاظ ہیں ۔ بظاہر یہ فضول سی بات معلوم ہوتی ہے کہ صفر تشکیلیے کا ذکر کیا جائے لیکن یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ بیل مذکورہ بالا دونوں فقروں میں الگ الگ الفاظ ہیں اور تصریف کو باقاعدہ ظاہر کرنے کے لئے بھی یہ مصنوعی طریقہ ضروری ہے ۔ صفر تشکیلیہ سنسکرت قواعد نویسوں کی دین ہے ۔ اب ایک دوسری مثال لیجئے 'چوری' اس میں 'چور + ی' دو تشکیلیے ہیں ۔ اس کی جمع 'چوریاں' ہے جس میں دو لاحقے (ی + اں) اور تین تشکیلیے چور + ی + اں ہیں ۔ آخری لاحقہ 'اں' انصرافی ہے اور لاحقہ ماقبل 'ی' اشتقاقی ہے ۔ انصرافی لاحقہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تنہا آتا ہے ۔ اس کے برخلاف اشتقاقی لاحقے ایک سے زائد بھی ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً لفظ 'پرہیزگاری' میں دو اشتقاقی لاحقے 'گار + ی' آئے ہیں ۔ اگر ہم لفظ 'پرہیزگاریاں' کہیں تو انصرافی لاحقہ 'اں' کے بعد کوئی اور لاحقہ جوڑا نہیں جا سکتا ۔ انصرافی لاحقے الفاظ کی بیرونی پرت ہوتے ہیں اور ان کی تصریف باقاعدہ ہوتی ہے لیکن اشتقاقی لاحقے مختلف النوع اور بے شمار ہوتے ہیں ۔ ساخت کے اعتبار سے انصرافی لاحقوں والے الفاظ 'مرکز خارجی' (EXOCENTRIC) اور اشتقاقی لاحقوں والے الفاظ 'مرکز داخلی' (ENDOCENTRIC) ہوتے ہیں ۔ 'مرکز خارجی' کی اصطلاح دراصل منفی ہے یعنی جو ساخت 'مرکز داخلی' نہیں ہوتی 'مرکز خارجی' کہلاتی ہے جب دو آزاد تشکیلیے ایک فقرے میں شمولی حیثیت (INCLUDED POSITION) میں ہوں اور وہ بلا واسطہ[1]

---

[1] جملوں کو مختلف حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے ۔ جن دو حصوں میں معنوی ربط ہوتا ہے چاہے وہ جملہ میں ایک دوسرے سے دور ہی کیوں نہ ہوں ب ع کہلاتے ہیں ۔ مثلاً "وہ بوڑھا آدمی جو کل راستے میں ملا تھا اپنے بیٹے کے پاس چلا گیا" اس جملے میں وہ بوڑھا آدمی ، راستے میں ، اپنے بیٹے کے پاس ، چلا گیا ، جو کل ملا تھا وغیرہ ب ع ہیں ۔ چونکہ ب ع کو جملے کی مختلف سطحوں پر الگ کیا جا سکتا ہے وہ بوڑھا آدمی چلا گیا اور وہ بوڑھا آدمی اپنے بیٹے کے پاس چلا گیا بھی ب ۔ ع ہیں

عنصر ترکیبی (IMMEDIATE CONSTITUENT) جسے مختصراً I C کہتے ہیں اور ہم ب ع لکھیں گے) اور ایک شکل (ذعی (FORM CLASS) سے تعلق رکھیں تو ان کی ساخت کو 'مرکز داخلی' ساخت کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک جملہ ہے "وہ بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے ہے" اس جملے میں 'بھڑکیلا' اور 'لباس' ب۔ع ہیں اور 'بھڑکیلا' (صفت) لباس (اسم) کو متصف کرتا ہے اس لئے 'بھڑکیلا لباس' ہم 'مرکز داخلی' ساخت کہیں گے۔ 'بھڑکیلا' کی جگہ کوئی دوسری صفت مثلاً اچھا (لباس) نفیس (لباس) کیسا (لباس) کتنا اچھا لباس) وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں اور جملے کی ساخت میں کوئی فرق نہیں آئے گا لیکن ہم کسی جملہ میں جہاں لفظ 'کتابیں' استعمال کریں گے اس کی جگہ 'کتاب' اور 'کتابوں' نہیں لکھ سکتے۔ یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میز پر ایک کتابیں رکھی ہے۔ یا ایک⊕ کتابوں میں یہ شعر ہے۔ یا دو کتاب رکھی ہیں۔ اس کے قسم کا کوئی اور لفظ مثلاً لفظ کاپی اس کی جگہ رکھیں تو بھی جملہ غلط ہوگا۔ مثلاً میز پر ایک کاپیاں رکھی ہے یا ایک⊕ کاپیوں میں یہ شعر ہے یا دو⊕ کاپی رکھی ہیں۔

سلیم پانی پتی نے وضع اصطلاحات میں اشتقاقی اور انصرافی لاحقوں کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ بظاہر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اصطلاح سازی میں انصرافی لاحقے کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ ان کا وظیفہ عام طور پر قواعدی ہوتا ہے [استثنا: آنکھوں دیکھا، کانوں سنا] اور اشتقاقی لاحقے کسی مادے یا ریشے کے معنی میں حذف و اضافہ کرکے نئے نئے الفاظ بناتے ہیں اور ان کا وظیفہ لغوی (LEXICAL) ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ مولوی صاحب نے اشتقاقی لاحقوں کی مثالوں کی فہرست میں انصرافی لاحقے بھی شامل کر دیئے ہیں۔ اس لئے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ وہ لاحقوں کی قسموں سے واقف نہیں تھے۔ مثلاً انہوں نے اشتقاقی لاحقوں کی فہرست میں یہ انصرافی لاحقے درج کئے ہیں۔

اں = (علامت جمع۔ ان اسماء کے لئے جن کے آخر میں ی ہو) جیسے کرسیاں، گھوڑیاں، وغیرہ صفحہ ۶۵ [۲]

و[۳] = (علامت جمع بحالت ندا) اے لڑکو، اے لڑکیو صفحہ ۱۳۵ [۴]

واں = (ترتیب اعداد کے اظہار کے لئے) پانچواں = آٹھواں وغیرہ صفحہ ۱۳۶ [۴]

وں[۳] = علامت جمع مردوں، لڑکیوں وغیرہ (یہ علامت جمع اس وقت لگائی جاتی ہے جبکہ جمع کے بعد حروف مغیرہ میں میں سے کوئی حرف لایا جائے) صفحہ ۱۳۵ [۵]

---

[۱] ⊕ اس علامت کا مطلب یہ ہے جملہ قواعد کے لحاظ سے غلط یا نامعلوم ہے [۲] وضع اصطلاحات انجمن ترقی اردو پاکستان ایڈیشن سن ندارد [۳] چونکہ 'و' ایک علیحدہ نیم مصوتہ ہے اسلئے یہاں 'و' ' لکھنا صحیح ہے۔ اسی طرح 'وں' کی جگہ 'وں' لکھنا مناسب ہے چونکہ لفظ کے شروع میں 'ی' بھی نیم مصوتہ ہوتا ہے اس لئے 'یں' کی جگہ 'یں' لکھنا چاہیے + ان علامات کے لئے دیکھئے اردو صوتیات کا خاکہ از ڈاکٹر مسعود حسین خاں مطبوعہ اردو سے متعلق لسانیات نمبر شمارہ ۴۔ ۵

ون ۱۱ = اعداد کے ساتھ اس بات کے اظہار کے لئے کہ وہ اعداد بے کم و کاست مراد لئے گئے ہیں، پانچوں
یں ۱۲ = علامت جمع مونث اسمار کے لئے جن کے آخر میں ی نہ ہو جیسے گھٹائیں، میزیں ص۱۴۵
اس کے علاوہ مولوی صاحب نے اصطلاحات سابقوں اور لاحقوں کے استعمال میں بھی غلط مبحث کیا۔
اور اس غلط استعمال کو ڈاکٹر عبدالحق جیسے عالم نے بھی اپنی قواعد اردو میں روا رکھا ہے (دیکھئے ص۱۴۱ قواعد اردو
۱۹۳۶ء اورنگ آباد ایڈیشن) اس لئے اس غلطی کی طرف اشارہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ سلیم پانی پتی نے سبقلا
(Affixes) کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "تیسرا اصول جو آریائی زبانوں میں مشترک اور یکساں طور
پایا جاتا ہے یہ ہے کہ لفظ کے شروع یا آخر میں ایک جز بڑھا دیا جاتا ہے اور اس طرح ایک نیا لفظ بنجاتا
جو جز لفظ کے شروع میں بڑھایا جاتا ہے اس کو پری فکس (Prefix) یعنی سابقہ کہتے ہیں۔ اور
لفظ کے آخر میں بڑھایا جاتا ہے اس کو (Suffix) یعنی لاحقہ کہتے ہیں۔ یہ جز جو مستقل الفاظ کے شروع ا
آخر میں بڑھائے جاتے ہیں ان کے معنوں میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں" یہ تعریف ناکافی ہے۔ یہ بتانا
ضروری ہے کہ یہ جز بندھے روپ (Bound forms) ہوتے ہیں اور اکثر صورتوں میں آزادانہ حیثیت
میں بے معنی ہوتے ہیں۔ چونکہ مولوی صاحب سبقلاحوں کی اس بنیادی خصوصیت سے ناواقف تھے اس
انہوں نے، جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں بتائیں گے، ایسے الفاظ کو بھی لاحقے قرار دیا ہے جو لاحقے نہیں ہیں
فارسی کے مندرجہ ذیل سبقلاحوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ صرف بندھے روپ میں آتے
ہیں۔ اور زبان میں ان کی مستقل حیثیت نہیں مثلاً کد (کدخدا، کدبانو) خر (خرگوش، خرمہرہ)؛ د
(دلفتن؛ دا گزاردن)، فرا (فراگرفتن)؛ ور (تاجور، سخنور) وار (امیدوار، سوگوار) اور (مزدور، دستو
گنجور)؛ سار (کوہسار، خاکسار) زار (گلزار، کارزار)؛ بار (رودبار، جویبار)؛ ستان (گلستان
شبستان، سنبلستان)؛ لاخ (سنگلاخ، دیولاخ)؛ کدہ (آتشکدہ، میکدہ)؛ گار (کردگار، طلبگار)
گر (زرگر، ستمگر)؛ وند (خداوند)؛ مند (خردمند، ہوشمند)؛ گون (گلگوں، نیلگوں)؛ گونہ (گلگونہ
این (نگارین، زریں)؛ وش (پریوش، حوروش)؛ گیں (غمگیں، اندوہگیں)؛ ناک (دردناک، خطرناک
بان (نگہبان، نگہبان)؛ دان (نمکدان، گلدان)؛ وا (پیشوا)؛ من (نشیمن، خرمن)؛ ای (بلندی، سفیدی)
آ (گرما، سرما)؛ آئی (جدائی، رہائی)؛ فام (سفیدفام، سیہ فام)؛ گاہ (درگاہ، بارگاہ)؛ اک
(پوشاک، خوراک)؛ اِش (زیبائش، آرائش)؛ آر (گرفتار، خریدار)
ظاہر ہے کہ اوپر کی مثالوں میں جو صوتیے یا مجموعہ صوتیات ہیں وہ مستقل الفاظ کے ساتھ بندھے
روپ میں ہیں اور ان کی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں ہے۔ آزادانہ حیثیت میں بے معنی ہونے کے

---

۱ حاشیہ نمبر ۱ پچھلے صفحہ پر نمبر ۲ سے ملاحظہ فرمائیے۔

باوجود ان میں اکثر سبقلاحے مستقل الفاظ سے بندھ کر خاص مفہوم پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً فام رنگ ظاہر کرنے کے لئے کدہ، ستان، گاہ، بار، زار اظہار مکان کے لئے، وند، مند، بان، اور وغیرہ 'دارندہ' کے معنوں میں اور 'گر' بنانے والے' کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے ان کی اس حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا کہ یہ الفاظ تنہا مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ الفاظ آج فارسی میں نہ تو مفرد الفاظ کی حیثیت سے تنہا مستقل ہیں اور نہ ان کی اصل کا پتہ لگایا جاسکا ہے۔ ان میں کچھ کا سلسلہ فارسی باستانی اور اوستائی تک ضرور پہنچتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے سخندان فارس میں سنسکرت اور فارسی کے کچھ مشترکہ سبقلاحوں مثلاً [بان (فارسی)؛ وان سنسکرت جیسے جہانبان، مہربان، فارسی: (عنوان، گنوان سنسکرت]؛ وند (فارسی)؛ ونت (سنسکرت، جیسے خداوند فارسی: بلونت، دھنونت سنسکرت] [ہم (فارسی)؛ سم (سنسکرت) جیسے ہم عصر فارسی [1] سم کالین سنسکرت] [ستان (فارسی)؛ ستھان سنسکرت] وغیرہ کی مثالیں دی ہیں۔ اگرچہ موخر الذکر لاحقہ 'ستھان' سنسکرت میں مفرد لفظ کی حیثیت سے بامعنی ہے لیکن فارسی جدید میں نہیں۔ بلاشبہ فارسی میں بھی کچھ سبقلاحے مستقل حیثیت رکھتے ہیں مثلاً حرف جار یا حرف استثنائی (جو ہندوستانی فارسی میں بے یائے مجہول ہے)، 'نا' جو حرف نفی 'نہ' میں اشباع کا نتیجہ ہے اور 'ہم' جو بطور صلہ فعل بھی مستعمل ہے۔ چونکہ بعض سبقلاحے مثلاً انگریزی میں FULL اور ABLE اور فارسی کے مذکورہ حروف آج بھی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بنا پر انیسویں صدی اور اس صدی کے کچھ ماہرین لسانیات کا یہ قیاس ہے کہ سبقلاحے کسی زمانے میں بامعنی الفاظ رہے ہوں گے جو مرور ایام سے مسخ ہو گئے ہیں۔ لیکن اس صدی کے کچھ ماہرین لسانیات اس قیاس کو صحیح نہیں سمجھتے مثلاً یسپرسن کہتا ہے "یہ صحیح ہے کہ کچھ اشتقاقی اجزا ابتدا میں آزاد تھے۔ پھر بھی اگر ہم ان کی تعداد کا مقابلہ ان سبقلاحوں سے کریں جن کی اصل کا یا تو سراغ نہیں لگایا جاسکا یا جن کے متعلق اس قسم کا کوئی قیاس ہی تجویز کیا گیا ہے تو ہمیں اول الذکر نہایت ہی کم تناسب میں ملیں گے۔ سویٹ نے اپنی گرامر میں انگریزی لاحقوں کی جو فہرست پیش کی ہے ان میں سے صرف گیارہ کی اصلیت کا پتہ لگا ہے اور چوہتر (۷۴) ابھی تک مجہول الاصل ہیں۔

برگھمن (BRUGHANA) نے (BERGLE(CHENDE RAMMATIC) جلد دوم میں جو بیشمار لاحقوں کی فہرست دی ہے اس کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ان میں بڑی تعداد ایسے لاحقوں کی ہے جن کا سراغ الفاظ تک لگانا جیسا کہ ہم نے لاحقہ HOOD کا لگایا ہے 'ناممکن ہے" بلوم

[1] مثال از راقم

نیلڈ کی بھی یہی رائے ہے۔ بہرحال ہمیں اس سے یہاں بحث نہیں کہ یہ مجموعہ صوتیات کسی زمانے میں، تھے یا ابتدا ہی سے انہیں متعین کنندوں (Determinatives) کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے اور یہ کہ کی بنیاد پر مستقل الفاظ بھی بطور متعین کنندہ استعمال ہونے لگے۔ حقیقت کچھ بھی ہو ہمیں تو یہاں اس ناقابل؟ حقیقت سے غرض ہے کہ آج سیتلاحقے مستقل الفاظ نہیں ہیں۔ سلیم پانی نے سیتلاسوں کی اس بنیادی خصوصیت نظرانداز کر دیا اور سیتلاحی الفاظ کی جو طویل فہرست وضع اصطلاحات میں درج کی ہے اس میں وہ مرکبات توصیفی بھی شامل کر لئے ہیں جن کا ایک رکن فارسی کے کسی نہ کسی فعل کا امر ہے۔ چونکہ یہ ارکان مرکبات کے آخر میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسلئے موصوف نے انہیں لاحقے قرار دیا ہے جو کسی طرح درست نہیں۔

ان ردیف تمام ارکان کو جو فعل کا امر ہوتے ہیں لاحقہ تصور کرنے میں کئی قباحتیں ہیں مثلاً الفاظ کے جوڑے دیکھئے ۱۔ ریاضی داں : نمکداں ۲۔ گھربار : رودبار پہلے جوڑے میں دونوں الفاظ 'داں' اور دوسرے جوڑے میں 'بار' استعمال ہوا ہے پہلے جوڑے کے جزو اول میں 'داں' دانستن کا امر ہے اور اس کے معنی ہیں 'دیا جاننے والا' یہ داں دانم، دانیم، دانی، دانید، داند اور دانند کی شکل میں گردانا جاتا ہے اور مضارع ہے اس کے برخلاف جزو ثانی یعنی نمکداں میں لاحقہ 'داں' ظرفی تو ہے لیکن ان معنوں میں وہ تنہا فارسی یا اردو میں مستعمل نہیں۔ اسی طرح گھربار میں بار باریدن کا امر ہے اس کے برخلاف رودبار میں بار اظہار کثرت و مکاں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ان مثالوں میں ریاضی داں اور گھربار مرکبات توصیفی ہیں جو نحوی مرکبات (اس اصطلاح کی تشریح آئندہ صفحات میں کی گئی ہے) کے ذیل آتے ہیں۔ اس کے برعکس نمکداں اور رودبار مرکبات نہیں بلکہ مشتقات (secondary words) ہیں جو داں اور بار بند سے روپ میں آئے ہیں۔ فارسی اور عربی رسوم خط کی طرح اردو رسم خط کی یہ خوبی ہے کہ اس کے حروف ہجا میں چند حروف ایسے بھی ہیں مثلاً 'د'، 'ذ'، 'ر'، 'ز'، 'و' جو حروف ماقبل سے متصل ہو سکتے لیکن حروف مابعد سے کسی صورت نہیں جڑ سکتے۔ اسلئے اگر کسی علمی ضرورت سے ہم انہیں جوڑنا چاہیں تو جوڑ نہیں سکتے۔ اصولی طور پر مرکبات کی طرح مشتقات کے بند سے روپوں کو ملا کر لکھنا چاہئے لیکن مذکورہ بالا حروف ایسا کرنے نہیں دیتے۔ مثلاً 'خردمند' میں ہوشمند کی طرح دال اور میم متصل نہیں ہو سکتے۔ یہی حال امیدوار اور زرگر کا ہے جو سوگوار، بزرگوار اور ستمگر کی طرح ملا کر نہیں لکھے جا سکتے۔ بہرحال چونکہ یہ املائی نقص ہے اس لئے زبان پر جو بنیادی طور پر تقریر ہے۔ اس کا کوئی اثر تو نہیں ہوتا لیکن اس سے یہ غلط فہمی ضرور ہوتی ہے کہ سیتلاحقے بند سے روپ نہیں ہیں اور اس غلط فہمی

ا؎ یہ دونوں الفاظ فارسی اردو میں اعلان نون کے ساتھ بھی مستعمل ہیں ۔ ح

یا غالباً نافہمی کی بنا پر وہ اصطلاحیں جو جوڑ کر لکھی جا سکتی ہیں وہ بھی نہیں لکھے جاتے مثلاً پری وش جیسے پریوش اور بے خبر جیسے بیخبر لکھنا چاہیے۔

مرکبات توصیفی کے رکن ثانی کو لاحقہ قرار دینے میں جو التباس ہے اس کا انکشاف مندرجہ ذیل مثال سے بھی ہو سکتا ہے۔ اردو کا ایک مرکب توصیفی جو بطور اسم فاعل مستعمل ہے "گھڑی ساز" ہے جو انگریزی لفظ WATCH MAKER کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں مرکبات اسم فاعل ہیں۔ 'میکر' "ساز" کا قائم مقام ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ 'ساز' کی طرح 'میکر' فعل کا امر نہیں ہے بلکہ اس میں اسم فاعل بنانے والا اشتقاقی لاحقہ (ER -) جڑا ہوا ہے اور اس طرح پورا مرکب اسم فاعل بن گیا ہے۔ مرکب کی انگریزی مثال میں 'میکر' لاحقہ نہیں ہے بالکل اسی طرح اردو مرکب کا رکن ثانی 'ساز' بھی لاحقہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ وہی وظیفہ ادا کر رہا ہے جو لفظ 'میکر' اشتقاقی لاحقہ (ER -) کی مدد سے انجام دے رہا ہے۔ ترکیب سازی کا یہ رجحان فارسی میں عام ہے جس کی وجہ سے یہ زبان مرکبات سے مالا مال ہے۔ چونکہ یہ مرکبات از خود واضع بھی ہو سکتے ہیں اس لئے شاعر اور ادیب بڑی آزادی سے اس نوع کے مرکبات گھڑ سکتے ہیں اور گھڑتے آئے ہیں لیکن لاحقوں کی مدد سے نئے مشتقات گھڑنے میں اتنی آزادی حاصل نہیں۔ ہم ایسے الفاظ کے لئے جن سے اسماء فاعل بنتے ہیں 'امر ترکیبی' (واحد: امر ترکیبی) یا صرف 'ترکیبیے' FORMATIVE کی اصطلاح تجویز کرتے ہیں۔

چونکہ مولوی صاحب لاحقے اور ترکیبیے کا فرق نہیں جانتے تھے اسلئے انہوں نے حقیقی لاحقوں کے ساتھ مندرجہ ذیل ترکیبیوں کو بھی لاحقے قرار دیا ہے۔ افراز، افروز، افزا، افشار، افشاں، افگن، آگاہ، آلود، آما (امر آمودن = بھرنا سے)؛ آموز، آمیز، انداز، اندوز، اندیش، انگار، انگیز؛ آور، آویز؛ بار (باریدن = برسنا سے)؛ باز؛ باش (بودن = ہونا سے)؛ باف، بخش؛ بر، برد، برار (برآوردن سے)، بردار، بند؛ بوس، بیز؛ بیں، پا (پائیدن = ٹھہرنا سے)؛ پاش؛ پرداز، پرس؛ پرست؛ پرور؛ پز، پسند (پسندیدن سے)، پوش، آرا؛ آرام (آرامیدن سے)؛ آزار، آزما؛ آسا؛ آشام؛ آشوب (آشفتن = پریشان کرنا)؛ آفریں (آفریدن سے)؛ پیچ (پیچیدن سے)؛ پیرا؛ پیما، تاب، تراش؛ جوش (جوشیدن سے)؛ جُستن؛ چیں؛ خار (خاریدن سے)؛ خراش؛ خرام، خند؛ خواب، خوار؛ خواں؛ خواہ؛ خور؛ خیز؛ دار، داں، در (دریدن سے)؛ دو، دوز، دہ؛ راں، ربا، رس، رساں، رنج (رنجیدن سے)؛ رو (رفتن سے)؛ رو (روئیدن سے)؛ روب؛ ریز؛ زا؛ زن؛

سا، ساز (ساختن سے)؛ ستا؛ ستاں؛ سرا؛ سگال؛ سنج؛ سوز، شکن، شگا (شگافتن سے)؛ شمار، شناس، طراز، طلب (طلبیدن سے)؛ فراز، فرسا، فرما، فروش، فریب، فزا، فشار، فشاں، فگن، فہم (فہمیدن سے)، کار (کاشتن سے) کاو کا، کش، کشں (کشتن سے) کشا، کن، کن (کندن سے)؛ کوب، کوش، گداز، گرد (گردیا گرداں (گردانیدن سے) گزار، گریز، گزیں، گسار، گستر، گو، گوار (گواریدن سے)؛ مال (مالیدن سے)؛ ماں، (ماندن سے)؛ نشیں، نگار (نگاشتن سے)؛ نما، نواز؛ نورد؛ نویس اور یاب

حقیقت میں مذکورہ بالا اواخر ترکیبی یا ترکیبئے ہیں انھیں لاحقے قرار دینا غلط ہے۔ ستم تو مولوی صاحب نے سبقلاحوں کے ساتھ ساتھ "نیم سابقوں" اور نیم لاحقوں" کی اصطلاحیں گھڑ ہیں" فرماتے ہیں اردو زبان میں جو مرکبات کثرت کے ساتھ مستعمل ہیں۔ ان کے بہت سے ابتدائی او رآخری اجزا ایسے ہیں جو اکثر آتے ہیں اور ان سے بہت سے الفاظ مرکب ہوتے ہیں یا مرکب ہو کی قابلیت رکھتے ہیں۔ یہ اجزا مستقل الفاظ ہیں یا مستقل الفاظ سے حروف علت وغیرہ گرا کر بنا گئے ہیں۔ مرکبات سے علیحدہ جن معنوں میں ان کا استعمال اردو یا فارسی میں ہوتا ہے تقریباً انہ معنوں کو وہ مرکبات میں بھی ظاہر کرتے ہیں ایسے الفاظ کو ہم سابقے اور لاحقے تو نہیں کہہ سکتے۔ البتہ ہم ا نیم سابقے اور نیم لاحقے کہہ سکتے ہیں"

مولوی صاحب نے نیم سابقوں کی جو مثالیں دی ہیں ان میں کچھ یہ ہیں؛ آب (آبجوش، آبکا آب دان)؛ آتش، (آتش پرست)؛ افسردہ دل؛ باد (باد بان)؛ بالا (بالادست)؛ (بدمزاج)؛ نیم لاحقوں کی کچھ مثالیں یہ ہیں۔ آب (تیزاب)، آشنا (زود آشنا)؛ اندام (گل پیکر (پری پیکر)، تن (سیمتن)

مندرجہ بالا الفاظ کو جو مستقل اور آزادانہ حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ خود مولوی صاحب ذکر کیا ہے نیم سابقے یا نیم لاحقے کہنا کسی طرح درست نہیں۔ چونکہ سبقلاحوں سے بندھے روا تصور وابستہ ہے اسلئے نیم سابقے یا نیم لاحقے کہنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ بندھے رو مجہول الاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اور بھی زیادہ نا قابل تشریح (INEXPLICABLE) ہوں گے جیسا کہ ابتدائی سبقلاحے[1] (Primary Affixes) ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ با مثالوں میں ابتدائی سبقلاحے تو کیا اچھے خاصے مستقل الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسلئے ایسے الفاظ

[1] اگر کسی ابتدائی لفظ (PRIMARY WORD) کے آخر میں ایسے الفاظ ہوں جو ثانوی الفاظ

(اگلے صفحہ پر)

نیم سابقوں اور نیم لاحقوں کی اصطلاح گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے - ہم ایسے الفاظ کے لئے مرکب رکن (COMPOUND MEMBER) کی اصطلاح تجویز کریں گے - بلوم فیلڈ نے اس قسم کے الفاظ کیلئے یہی انگریزی اصطلاح استعمال کی ہے. جن الفاظ کو مولوی صاحب نے نیم سابقہ کہا ہے وہ مرکب رکن اول (FIRST COMPOUND MEMBER) ہیں اور اور نیم لاحقے ہیں - "مرکب رکن دوم" (SECOND COMPOUND MEMBERS) اگر لفظ رکن سے ذہن (SYLLABLE) کی طرف جاتا ہو تو رکن کی جگہ لفظ "عضو" استعمال کیا جا سکتا ہے. تعجب ہے کہ مولوی صاحب نے خود اپنی وضع کردہ اصطلاحوں کے استعمال پر بھی باقاعدگی سے عمل نہیں کیا ہے - مثلاً انہوں نے جہاں نیم سابقوں (دراصل مرکب ارکان اول) کی مثالوں کے تحت ارکانِ اول کو جو صفات ہیں مثلاً بد (مزاج)، بیش (بیش قیمت) وغیرہ کو نیم سابقے قرار دیا ہے لیکن سابقوں کے تحت مندرجہ ذیل صفات کو نیم سابقوں کے بجائے سابقے نام دیا ہے جیسے شاہراہ ؛ شش پہلو ؛ صد برگ ؛ فو- ؛ ہزار پا ؛ ہفت اقلیم ؛ خوش اسلوب وغیرہ - ظاہر ہے کہ اگر "بدمزاج" میں "بد" نیم سابقہ ہے تو "خوش اسلوب" میں بھی انہیں کی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق نیم سابقہ ہی ہونا چاہئے - کیونکہ دونوں صفات ہیں اور مستقل الفاظ اصطلاح کے اس غلط (INCONSISTENT) استعمال سے قطع نظر ہم مذکورہ بالا قسم کے اسماء و صفات کو "مرکب ارکانِ اول" کہنے پر ہی زور دیں گے -

مولوی صاحب نے وضع اصطلاحات میں مرکبات کی قسموں سے سیر حاصل بحث کی ہے لیکن یہ بحث کئی حیثیتوں سے ناکافی ہے - مثلاً اس کتاب میں اردو، فارسی، اور اردو- فارسی مرکبات کا صوتیاتی تشکیلیاتی اور معنوی لحاظ سے الگ الگ باب میں تجزیہ نہیں کیا گیا ہے جو نہایت ضروری ہے اس کی غالباً یہ وجہ ہے کہ مولوی صاحب کا مقصد مرکبات کے تجزئے سے صرف اس قدر تھا کہ اردو کے لسانی مزاج کو سمجھ کر نئے نئے مرکبات ڈھالے جائیں بہر حال ہم مرکبات کے سلسلہ میں صرف اتنا کہیں گے کہ انہوں نے جو JUXTAPOSITION COMOUND سلسل -anal) کا ترجمہ "مرکب امتزاجی" (SYNTACTICAL COMPOUND) کا

یا مشتقات کے لاحقوں سے ہم صوت (یا ہم لفظ) ہوں اور ابتدائی الفاظ کو توڑنے سے دونوں آزاد نہیں بلکہ بندھے روپ یا ٹکڑے ہوں تو بعد میں آنے والے اس قسم کے الفاظ کو ابتدائی لاحقہ (PRIMARY SUFFIXES) کہتے ہیں مثلاً الفاظ کے یہ جوڑے لیجئے -
(۱) سوار، شوار (۲) امیدوار، سوگوار، بزرگوار - نمبر ۲، کو توڑنے سے امید + وار ، سوگ + وار اور بزرگ + وار ٹکڑے ملتے ہیں، یہ ثانوی الفاظ SECONDARY WORDS یا مشتقات ہیں جن میں وار اشتقاقی لاحقہ ہے لیکن نمبر ۱

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مرکب ارتباطی کیا ہے وہ ہمارے خیال میں صحیح نہیں کیونکہ "امتزاجی" اور "ارتباطی" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امتزاج میں ارتباط کا مفہوم شامل نہیں ہے جو غلط ہے ہماری رائے میں ان اصطلاحات کا ترجمہ "ہم پہلو" (جکسٹا پوزیشنل) اور نحوی (سنٹکٹکل) مرکب اصلیت کے زیادہ قریب ہے اس کے علاوہ، جکسٹاپوزیشنل کمپونڈ کی یہ تعریف جو مولوی صاحب نے کی ہے کہ ان میں "دو یا دو سے زیادہ لفظ پاس پاس رکھ دیئے جاتے ہیں اور ان کے درمیان بظاہر کوئی رشتہ یا ربط گرامر کے لحاظ سے نہیں ہوتا" ناکافی بلکہ گمراہ کن (misleading) ہے۔ بجائے گرامر، نحو، کے لحاظ سے کہنا ضروری تھا اور دو سے زیادہ لفظ کے ساتھ ساتھ "بظاہر" کی شرط بھی غیر ضروری ہے اس غلطی کا شکار شوکت سبزواری بھی ہو گئے۔ مثلاً "اردو قواعد کی ترتیب نو" میں لکھتے ہیں "عربی میں مرکب کی دو قسمیں ہیں۔ امتزاجی اور غیر امتزاجی یا ارتباطی۔ امتزاجی کے اجزا میں قواعد کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ارتباطی کے اجزا میں قواعدی رشتے ہوتے ہیں۔" اول تو امتزاجی اور غیر امتزاجی مرکبات عربی نہیں بلکہ سنسکرت خاندانِ السنہ کی خصوصیت ہے لیکن فکر ثانی پر جب سبزواری صاحب کو اس غلطی کا احساس ہوا کہ امتزاجی کے اجزا میں بھی قواعد کا رشتہ ہوتا ہے تو اپنے ہی بیان کی تردید میں یہ بھی لکھا "یہ تقسیم غلط بھی ہے اس لئے کہ اردو میں کوئی مرکب ایسا نہیں جن کے اجزا قواعدی رشتے میں منسلک نہ ہوں۔ مرکب کے اجزا میں یہ رشتہ ضروری ہے۔ دو لفظ ایک دوسرے کے پہلو میں ہوں تو ان میں اضافت کا رشتہ ہو گا جیسے بن کیلا (بن کا کیلا)، جنم پترا (جنم کا پترا)..." ظاہر ہے کہ شوکت صاحب نے سلیم پانی پتی کی "ناکافی" تعریف کو "کافی" سمجھ کر بجائے اس کے کہ مولوی صاحب کی تعریف کے نقص کی طرف اشارہ کرتے۔ غلط مقدمات سے یہ غلط استنباط کیا کہ مرکبات کی یہ تقسیم ہی غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود انہوں نے جکسٹاپوزیشنل اور سنٹکٹکل کمپونڈ کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بلوم فیلڈ اپنی مایہ ناز تصنیف "لنگویجز" میں لکھتا ہے۔ "مرکبات کی درجہ بندی کے دو طریقوں میں سے ایک کا تعلق ارکان کے رشتہ سے ہے ایک طرف تو نحوی مرکبات ہیں جن کے ارکان میں باہم وہی قواعدی رشتہ ہوتا

کو توڑنے سے س + وار اور دش + وار ٹکڑے ہاتھ لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ س اور ش آزاد تشکیلیے نہیں ہیں جیسے نمبر (۲) میں امید، سوگ اور رنگ ہیں۔ سوار میں س کا سلسلہ فارسی باستانی سے ملتا ہے۔ سوار دراصل اسوار تھا اور اس میں اَس وہی ہے جو سنسکرت میں [illegible] اور فارسی اسلامی میں اسپ ہے۔
اسی طرح دشوار میں دش کا سلسلہ بھی فارسی باستانی، اوستا اور پہلوی سے ملتا ہے جن میں یہ لفظ "برے اور بدصورت" کے معنوں میں مستعمل تھا اس کی دوسری شکل دژ ہے۔ سنسکرت میں یہ لفظ بطور سابقہ برے کے معنوں میں استعمال
ہوتا [illegible]

جو فقرے (PHRASE) ہیں انہی الفاظ کا۔ چنانچہ انگریزی میں مرکبات (BLACK bird) اور (WHITE CAP) میں صفت جمع اسم والی ساخت ہے۔ جو ان فقروں (BLACK BIRD سیاہ پرندہ) اور (WHITE CAP سفید ٹوپی) میں ہے۔ دوسری طرف (DOOR KNOB) جیسے وہ غیر نحوی مرکبات ہیں جن کے جزو میں وہ رشتہ نہیں جس کی متوازی مثال ان کی زبان کی نحو میں ملتی ہو کیونکہ انگریزی میں 'DOOR KNOB' سے مشتمل کوئی فقرہ مستعمل نہیں"۔ اس تشریح سے صاف واضح ہے کہ 'ہم پہلو' مرکب میں صرف گرامر نہیں بلکہ اس کی ایک ذیلی قسم "نحو" کے لحاظ سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ 'بن کریلا' میں بن اور کریلا دونوں اسم ہیں اور چونکہ ان دو اسما کو پاس پاس رکھنے سے کوئی جملہ یا فقرہ نہیں بنتا جیسے کہ عربی کی اس مثال میں (احمدٌ رجلٌ : احمد آدمی ہے) اس لئے یہ مرکب ہم پہلو یا غیر نحوی ہے۔ وہ مرکبات جن کی اسی زبان میں جن میں یہ مرکبات ہیں، فقرہ میں متوازی مثال ملے تو وہ نحوی مرکبات کہلاتے ہیں۔ مثلاً مرکب "لم ٹنگو" سے متوازی فقرہ بنے گا "لمبی ٹانگ والا" اس لئے یہ نحوی مرکب ہے۔ لیکن چونکہ "لم ٹنگو" کے لم کو 'لمبی' اور 'ٹنگو' کو 'ٹانگ والا' میں تبدیل کیا گیا ہے۔ اسلئے اسے 'نیم نحوی مرکبات' کہیں گے۔ اردو میں نیم نحوی مرکبات کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان کی نحوی ساخت کے پیش نظر بلوم فیلڈ نے نحوی مرکبات کی ذیلی قسمیں کی ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ نحوی ساخت کے لحاظ سے نحوی مرکبات کے ارکان کی متوازی مثالیں فقروں میں "صفت اور اسم" فعل اور اسم، فعل اور صلہ فعل' اور حالیہ تمام اور صلہ فعل کے اجتماع میں ملتی ہیں۔

مولوی صاحب نے وضع اصطلاحات میں نحوی مرکبات کے تحت جو مثالیں دی ہیں بعض یہ مثالیں محل نظر ہیں۔ چھوٹا منہ۔ بڑی بات۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات الگ الگ دو فقرے ہیں مرکبات نہیں۔ چھوٹا منہ ایسا ہی ہے جیسا چوڑا منہ، گورا منہ، کالا منہ۔ اسی طرح بڑی بات کی طرح "اچھی بات۔ کڑوی بات" یہ سب فقرے ہیں مرکبات نہیں۔ البتہ چھوٹا منہ بڑی بات کو (جو ضرب المثل ہے) ایک فقرہ تصور کیا جائے تاکہ چھوٹا منہ اور بڑی بات شمولی حیثیت اختیار کرلیں تو صرف اسی صورت میں یہ دونوں فقرے نحوی مرکبات کہلا سکتے ہیں۔ مولوی صاحب کو چاہئے تھا کہ غلط فہمی کے امکان سے بچنے کے لئے اس کی وضاحت کر دیتے کیونکہ وضع اصطلاحات انجمن ترقی اردو پاکستان کا جو ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے اس کے صفحہ ۲۱ پر غالباً کاتب نے چھوٹا منہ کے ختمے کی علامت لگائی ہے۔ جس طرح اس نے اور دوسرے مرکبات کے بعد یہ علامت استعمال کی ہے مثلاً لم قدا۔ لم ٹنگو۔ ننگ پیرا۔ اندھیر نگری۔ چھوٹا منہ بڑی بات"۔ چونکہ وضع اصطلاحات اکثر یونیورسٹیوں میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی درسیات میں معاون کتاب کی حیثیت سے رکھی جاتی ہے اس لئے ہماری گذارش ہے کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ان نادرست اصطلاحوں میں جن کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ تصحیح فرمالیں۔

انجمن کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ باپو کے قدموں میں (مکمل)	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱۵ر۰۰
۲۔ بائبل دیدہ	خلیب الرحمن	۳ر۵۰
۳۔ تذکرہ گلشن سخن	مسعود حسن رضوی	۶ر۰۰
۴۔ چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	۱ر۵۰
۵ اردو کی ابتدائی نشو و نما	عبدالحق	۱ر۰۲
۶۔ سخن مختصر (نیا مجموعۂ کلام)	معین احسن جذبی	۲ر۰۰
۷۔ سیر الملاک	حکیم احمد	ر۰۰
۸۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	ر۰۰
۹ فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	ر۰۰
۱۰۔ یادگار نظر	جگر بریلوی	ر۵۰
۱۱ تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	ر۰۰
۱۲۔ خواب شیریں	جے کرشن چودھری	ر۰۰
۱۳۔ کچھ زر کی بابت	ابو سالم	ر۵۰
۱۴۔ فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحاق صدیقی	ر۵۰
۱۵۔ مشترکہ زبان	مہاتما گاندھی	ر۵۰
۱۶۔ مذہب اور دھرم	″	ر۵۰
۱۷۔ مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	۶ر۰۰
۱۸۔ نسیم مغرب	اے۔ سی بہار	۲ر۵۰
۱۹۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	۷ر۰۰

مہتمم مطبوعات

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

مترجم ڈاکٹر نعیم احمد
مصنف نامعلوم

لیزارو ڈی ٹارمے

(سولھویں صدی کا ایک ہسپانوی ناول)

مقدمہ

لیزارو ڈی ٹارمے ۱۵۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ پہلا پکارسیک ناول ہے۔ پکارسیک ہسپانوی لفظ پکارو
سے نکلا ہے جس کا مطلب دغاباز یا نکما عیار ہوتا ہے۔ یہ لفظ اسی قسم کے ایک ناول گزمن ڈی الفرچے (جو
۱۵۹۹ء شائع ہوا تھا) کے ہیرو کی صفت بیان کرنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے ہیرو کا لفظ استعمال
کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پکارسیک ہیرو کچھ بھی ہو سکتے ہیں مگر وہ ہیرو نہیں ہیں۔ لیزاریلو ایک مجرم ہے
جسے حالات نے ایسا بنا دیا ہے۔ پکارو عام طور پر ایک خشک مزاج نوجوان ہوتا ہے جو بڑی مصیبتیں اٹھا کر
جوان پڑھتا ہے اور دوسروں سے وہی ظالمانہ برتاؤ کرنا چاہتا ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کا
مقصد دوسروں کو فریب دینا ہوتا ہے۔ انہیں دھوکا دینا اور ان کے ساتھ بے رحمی کی چالیں چلنا ہوتا ہے اور حقیقت
یہ ہے کہ بے رحمی ان ناولوں کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اس سے ایک ایسی دنیا کا تصور سامنے آتا ہے
جہاں کا قانون "خود غرضی" ہے۔ پکارو کا مقصد عزت حاصل کرنا ہوتا ہے جس کا مطلب روپیہ ہے۔ اس میں
کوئی شک نہیں کہ وہ دنیا بھر میں بہترین قسم کی ٹیپ ٹاپ کرنے کی کوشش کرتا ہے — ہسپانوی
داتیا ایسے ہی ہوتے ہیں

اپنی آوارہ گردی کے دوران جو اسے کئی شہروں بلکہ کئی ملکوں میں لے جاتی ہے۔ پکارو مختلف النوع
لوگوں سے ملتا ہے اور ان کے خلاف اپنی عقل استعمال کرتا ہے۔ اس طرح مصنف ہم عصر سماج کی
تصویر کھینچ دیتا ہے۔ واقعات مصنف کی اپنی زندگی سے ماخوذ ہو سکتے ہیں — بعض معاملوں میں واقعی
ایسا ہے — اور شاید یہی وجہ ہے جو کہانی عام طور پر اتنی دلنشین ہے

لیزاریلو کی اہمیت کا ایک سبب تو یہی ہے کہ یہ پہلا پکارسیک ناول ہے جو اس وقت کی مروجہ
ادبی طرز یعنی بانکوں کے ناول سے بالکل مختلف ہے۔ بانکوں کے ناول میں ایک اصلی ہیرو ہوتا تھا۔ ایک

بہت مکمل شریف بہادر انسان جو ایک غیر حقیقی دنیا میں رہتا تھا، کبھی کوئی گھٹیا خیال اس کے ذہن میں نہیں آتا تھا اور وہ وحشتناک حد تک دشوار حالات میں بعید از قیاس (اور ناممکن) بہادری کے کارنامے انجام دیتا تھا۔ ان ناولوں کے اسلوب بیان میں لفاظی ہے، جملے لمبے اور ڈھیلے ہیں اور جان بوجھ کر فرسودہ زبان استعمال کی گئی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پڑھے بہت جاتے تھے پچاس سال بعد سروانتیس نے ڈون کیخوٹے لکھی تو ان ناولوں کو طنز کا بڑا اچھا نشانہ پایا۔

۱۵۵۴ء میں ہی لیزاریلو کی تین اشاعتیں ملتی ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل بھی اس کی اشاعت ہوئی ہوگی۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی اتنی مقبول ہوئی کہ ۱۵۵۵ء میں لیزاریلو کے مزید کارنامے کے نام سے ایک اور سلسلہ شائع ہوا۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۵۶۰ء میں چھپا اور پھر انگریزی، جرمن، لاطینی اور ڈچ زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ انگریزی میں پہلا ترجمہ انگلیسی کے ڈیوڈ رولینڈ نے کیا تھا جو ۱۵۸۶ء میں لندن میں چھپا۔ اس کتاب کو مذہبی عدالت نے ۱۵۵۹ء میں ممنوع قرار دیدیا تھا لیکن ۱۵۷۳ء میں اس کی ایک بدلی ہوئی شکل چھپی جس میں سے پادریوں پر نسبتاً زیادہ شدید تنقید کے علاوہ گناہ بخشنے والے کی کہانی اور آرڈر آف مرسی کے راہب کا تذکرہ حذف کر دیا گیا تھا

لیزاریلو کے مصنف کا نام معلوم نہیں اور اسے کئی اشخاص سے منسوب کیا جاتا ہے۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا مصنف ہرفن مولا ڈیگو ہرٹاڈو ڈی مینڈوزا تھا جو ایک طنز نگار، شاعر اور انسان شناس تھا۔ لیکن کئی حریفانہ دعوے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دعویٰ مشہور والدیس بھائیوں کے حلقے کے ایک رکن سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دعویٰ کلیسائیت دشمنی کی مفروضہ ایراسمین (ERASMIAN) نوعیت کی بنا پر کیا گیا تھا لیکن ایراسمین خیالات کے مستند ہسپانوی عالم مارسل بٹیلون نے اس کی نفی کر دی ہے ایک یہ نظریہ بھی تھا کہ اس کا مصنف یہودیوں کی اولاد میں سے کوئی تو مذہب رہا ہوگا جس نے جلاوطنی یا سوختگی سے بچنے کیلئے بادل ناخواستہ عیسائیت قبول کرلی ہوگی لیکن اب اس دعوے کو بھی ٹھیک نہیں سمجھا جاتا۔

اس کتاب میں ایک چھوٹے لڑکے کی کہانی ہے جس کا باپ چوری کے باعث جلاوطنی کی سزا پانے کے بعد ایک جنگ میں کام آجاتا ہے اور جس کی ماں اس کا خرچ برداشت کرنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے اُسے ایک اندھے فقیر کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس اندھے کی خدمت میں وہ بھوک، گرم و سرد برداشت کرتا اور خود اپنے مفاد کا خیال رکھنا سیکھتا ہے۔ کتاب میں ایک مقام پر وہ اپنے اس آقا کے احسان کا اعتراف کرتا ہے جس کے ظلم کی وجہ سے اس کو مناسب بدلہ لینے کے بعد اسے چھوڑنا پڑا تھا۔ اگر اس کے دوسرے مالک کو شامل نہ کیا جائے۔ وہ پادری جس کے گھر میں لڑکے کی چالاکی ہی اسے زندہ رکھتی ہے۔ تو پھر

لڑکے کا واحد استاد ہی اندھا ہے۔ جلد ہی وہ ایک تہی دست شریف آدمی سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اور پھر جو کچھ اس نے سیکھا ہے اس کا اسے صحیح معنوں میں استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس شریف آدمی کے آخرت پرستانہ غرور کی وجہ سے اس بیچارے لڑکے کو اور بھی زیادہ غریبی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور خود اسے سہارا ملنے کی بجائے اس کو بھیک مانگ کر اپنے مالک کا بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مصنف اس رمزیہ پیرائے سے خوب کام لیتا ہے کہ آدمی کو اپنی آنکھ کا شہتیر تو دکھائی نہیں دیتا مگر دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آجاتا ہے۔ وہ شریف آدمی کہتا ہے کہ "وہ اپنے وقار کی خاطر جو تکلیفیں اٹھا رہا ہے" خدا کی راہ میں بھی نہیں اٹھائے گا، لیکن اسے یہ سجھائی نہیں دیتا کہ وہ ذرا سے فرق سے ایک بھک منگا ہے۔ مصنف ساتھ ہی ساتھ روایتی ہسپانوی مشغلے "کوئیڈر بین" پر بھی طنز کرتا ہے: نقشہ جمانا، دنیا میں ظاہری ٹیپ ٹاپ کی خوب کوشش کرنا۔ کوئی بھی شخص جس نے ہسپانیہ کا سفر کیا ہوگا اس نے یہ ضرور دیکھا ہوگا کہ غریب لوگ کتنا نفیس لباس پہنتے ہیں اور کس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں۔

اس کے بعد جو واقعہ آتا ہے اس کا بمشکل ہی ذکر ملتا ہے لیکن اس سے لیزارو کے کردار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اسے ایک مستقل نوکری ملتی ہے لیکن جوں ہی وہ کچھ روپیہ بچا لیتا ہے اسے چھوڑ کر تن آسانی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ گو اسے "کبھی موقعہ نہیں ملا" لیکن ہم اس سے ہرگز بہت زیادہ ہمدردی نہیں کر سکتے — یہ اس کے کردار کا ایک ایسا نقص ہے جو اسے سچا پکارو بنا دیتا ہے۔ مابعد ناولوں کے پکارو بعض اوقات ذی عزت گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجرمانہ زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو کم از کم اپنی خامیوں کا احساس ضرور کر لیتے ہیں۔ لیزارو اپنی خامیوں کا قطعاً احساس نہیں کرتا۔ یہ مصنف کا انوکھا طنز ہے جو ناول کے آخری باب میں جہاں لیزارو پادری کی داشتہ سے شادی کر لیتا ہے جس کی وجہ سے اسے ڈھنڈورچی کے منصب کے لئے ترجیح دی جاتی ہے یکدفعتاً اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے (اندھے نے پیش گوئی کی تھی کہ اس کا رسیوں اور رنفیر ڈیل سے بڑا واسطہ پڑے گا۔) ڈھنڈورچی کی حیثیت میں وہ سزائے موت پانے والے مجرموں کے ساتھ ان کے جرائم کا اعلان کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک انتقامی تنقید ہوتی ہے لیکن اب لیزارو خود ایک فرسانتی دوجیقیت وہ محض فرسانتی سے کچھ زیادہ ہی ہے "ایک بڑے با مروت آدمی سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہے۔ وہ ایسا آدمی ہے جسے ہسپانوی میں "کیبرون" کہتے ہیں — وہ جو نہ صرف اپنی بیوی کو حرام کاری کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس سے خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے اس میں لیزارو کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسے جاننے کی کوشش نہ کرے اور وہ اپنے تنبیہہ کرنے والے دوستوں سے جو برتاؤ کرتا ہے، اس کو بڑی جانکدستی سے

بیان کیا گیا ہے۔ رحری ناول کے دھاگوں میں گرہ بنا ہوا ہے۔ یہ لیزارو ہی تھا جس نے پہلے باب میں اپنے بھائی پر نکتہ چینی کی تھی " دنیا میں کتنے لوگ ہوں گے جو دوسروں سے اس لئے ڈر کر بھاگتے ہیں کیونکہ انہیں خود اپنا چہرہ نظر نہیں آتا۔ ؟

اگرچہ ناول کی ساخت میں سب کے اختتام میں خاص طور پر عجلت کی کارفرمائی نظر آتی ہے لیکن یہ ناہمواری کہانی کے لاتعلق ضمنی قصوں اور لطیف اور شستہ اسلوبِ بیان کی وجہ سے بعض جگہ دب گئی ہے۔ اس میں صرف بیس ہزار الفاظ ہیں اور ہر لفظ کا اپنا ایک مقام ہے۔ اس کے بیانات معنی خیز اور مختصر ہیں اور زبان اگرچہ سادہ ہے لیکن عامیانہ نہیں ہے۔ یہ ایسی فنکارکی جس بڑی مہارت سے پردہ ڈال دیا گیا ہے

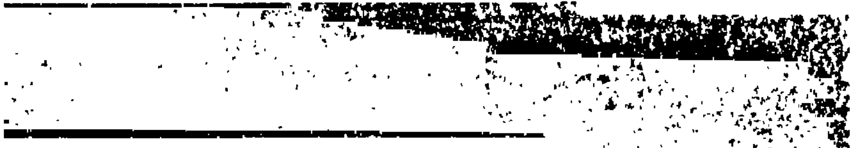
کیا لیزار وا اپنے عہد کے ہسپانیہ کی سچی تصویر ہے ؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف نے اپنے نمونے تاثر پذیری کے لئے منتخب کئے ہوں گے۔ لیکن تمام راہب، گناہ بخشنے والے اور دوسرے لوگ ایک ہی وضع کے نمونہ رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ بعض واقعات روایتی کہانیوں اور دوسرے ادبی ماخذوں سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ لیزارو کا اپنا نام ایک روایتی غریب لڑکے کا نام ہے وہ خشک مزاج اور مکار کلیسائی (اندھا بھی ایک معنی میں کلیسائی ہے کیونکہ اس کی دعائیں خاص طور پر مجرب سمجھی جاتی تھیں) اس زمانے کے ادب کا جانا پہچانا استعارہ تھا اور یہ ابھی تک عوام کے تخیل میں موجود ہے۔ کلیسا دشمنی یہ ماننے پر تیار نہیں ہوتی کہ کوئی کلیسائی سچ مچ اپنا عہد نبھا سکتا ہے۔ دوسری طرف ایسی مقبول کتاب میں کسی نہ کسی حد تک کچھ حقیقی واقعات بھی ضرور شامل ہوں گے اور تاریخ سے مصنف کے بہت سے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے ہمیں معلوم ہے کہ امریکی چاندی کی بڑے پیمانے پر درآمد کی وجہ سے کساد بازاری کا دورہ دورہ ہوگیا تھا اور کمائے بغیر زندگی گذارنا اتنا آسان ہوگیا تھا کہ نکموں اور آوارہ گردوں کے جم غفیر لگ گئے تھے۔ علاقائی قحط جیسا کہ تیسرے باب میں دکھایا گیا ہے، ایک ایسے ملک میں جہاں خشک سالی ہوتی رہتی ہے، عام بات تھی اور اور اس کی شہادت موجود ہے کہ خانقاہوں میں خوب کھانا بانٹا جاتا تھا۔ ظاہرداری، سماجی مرتبے اور خالص نسل (مسلم یا یہودی آباو اجداد کی کوئی شہادت موجود نہیں) کا خیال اس عہد کے ادب اور غیر ملکی شارحین کی تالیفات میں بڑی حد تک موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہسپانوی بڑے خود پسند ہوتے ہیں۔

URDU ADAB

(QUARTERLY)

Editor

PROF. A. A. SUROOR



بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ جن لوگوں کو اپنے اعلیٰ خاندان پر فخر ہے انہیں معلوم ہو جائے کہ اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے کیونکہ ان کی تو تقدیر نے یاوری کی —— ان سے زیادہ قابلِ عزت وہ لوگ ہیں جنہوں نے مصیبتیں اٹھائیں لیکن آخرکار اپنی لگن اور مشقت سے کامیابی حاصل کرلی۔

پہلا باب

بہرحال جناب والا کو سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میرا نام لیزارو ڈی ٹورمے ولد ٹومے گونزالے ولد انٹونا پیراز ہے۔ میرے والد سلامنکا کے قریب تیجارس نامی گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ میں سچ مچ دریائے ٹورمے میں پیدا ہوا تھا اس لئے یہ میرا لقب پڑ گیا۔ یہ قصہ یوں ہے کہ میرے والد مرحوم اس دریا کے کنارے ایک پن چکی کے نگراں تھے۔ وہ پندرہ سال سے اسی جگہ کام کر رہے تھے۔ ایک رات میری والدہ وہاں پہنچیں تو وہ پورے دنوں تھیں۔ میں اسی رات پیدا ہوا۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں دریا میں پیدا ہوا تھا۔ جب میں آٹھ برس کا تھا تو میرے والد ان لوگوں کے بوروں میں سے اناج چراتے ہوئے پکڑے گئے جو وہاں اپنا غلہ پسوانے آتے تھے۔ انہیں گرفتار کرلیا گیا تو انہوں نے اقبالِ جرم کرلیا اور انہیں سزا ہو گئی۔ مجھے خدا سے امید ہے کہ اس نے انہیں جنت میں بھیجا ہوگا کیونکہ انجیل میں ایسے لوگوں کے بخشے جانے کی بشارت دی گئی ہے۔ اس وقت مسلمانوں پر فوج کشی کی جا رہی تھی۔ میرے والد بھی اس میں شریک ہو گئے۔ وہ اپنی سزا کے ایک حصے کے مطابق گھر سے دور رہ رہے تھے اور ایک رئیس کے خچربان ہو گئے تھے جو اس مہم میں شامل تھا۔ انہوں نے اپنے آقا کے ساتھ ایک وفادار نوکر کی طرح جان دیدی۔

جب میری والدہ کا شوہر اور محافظ نہ رہا تو انہوں نے باعزت لوگوں سے ملنے جلنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ وہ شہر چلی آئیں اور کرایہ کا مکان لے کر رہنے لگیں۔ انہوں نے طالب علموں کا کھانا پکانا اور کمینڈیڈر ڈی لا مگڈالینا کے اصطبل کے ملازموں کے کپڑے دھونے شروع کر دئے۔ اسی لئے وہ اصطبل کے پھیرے لگاتیں۔ آخر ان میں اور ایک حبشی میں جو گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا، شناسائی بڑھنے لگی۔ وہ کبھی کبھی ہمارے گھر آتا اور صبح کو رخصت ہوتا۔ بعض اوقات وہ انڈے خریدنے کے بہانے دن میں ہمارے گھر کے دروازے پر آتا اور پھر اندر گھس آتا۔ جب اس نے پہلے پہل آنا شروع کیا تو میں ڈرتا تھا کیونکہ مجھے اس کا رنگ اور اس کی وضع قطع اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن جوں ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ جب بھی آتا ہے ہم اچھا کھانا کھاتے ہیں تو میں اسے پسند کرنے لگا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ڈبل روٹی، گوشت کے پارچے اور جاڑے میں ہمیں گرم رکھنے کے لئے ایندھن لے کر آتا۔ چنانچہ اس کی آمد اور ہمارے ساتھ قیام کا سلسلہ جاری رہا۔ اور میری والدہ نے مجھے ایک ننھا بھائی، ایک بہت خوبصورت حبشی منا دیا۔ میں اسے گود میں اچھال اچھال اس کا

بدن گرم رکھتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میرا سوتیلا باپ شیشے سے کھیل رہا تھا۔ اس نے جو یہ دیکھا کہ میرا اور والدہ کا رنگ تو سفید ہے لیکن وہ کالا ہے تو وہ ڈر گیا اور دوڑتا ہوا والدہ کے پاس گیا۔ اس نے حبشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"ممی! بھوت!"

وہ ہنسنے لگا اور بولا:

"تیری ماں فاحشہ ہے!"

اگرچہ میں اس وقت لڑکا تھا لیکن میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی بات پر بہت غور کیا اور خود پوچھا:
"دنیا میں کتنے لوگ ہوں گے جو دوسروں سے اس لئے ڈر کر بھاگتے ہیں کیونکہ انہیں خود اپنا چہرہ نظر نہیں آتا؟"

یہ ہماری بد نصیبی تھی کہ میری والدہ اور زیدی (یہ اس حبشی کا نام تھا) کے تعلقات کی بات اس کے آقا کے داروغہ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ زیدی جانوروں کی خوراک میں سے آدھی جئی چرا لیتا تھا۔

اس سے بھوسہ، ایندھن، کھریرہ، پیٹیں بند اور گھوڑوں کی چادریں اور کمبل کھو گئے تھے جب اس کے پاس کچھ نہ بچا تو اس نے نعل اڑا لئے۔ وہ ہر چیز میری والدہ کو لاکر دیتا تاکہ وہ اسے فروخت کرکے میرے چھوٹے بھائی کی پرورش کر سکیں۔ یہ دیکھ کر کہ محبت ایک مجبور غلام کو کیا کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہمیں اس پر حیران نہیں ہونا چاہئے کہ ایک پادری اپنی مذہبی جماعت کو اور ایک راہب اپنی خانقاہ کو اپنی خاتون عقیدت مندوں اور دوسرے لوگوں کے لئے لوٹتا ہے۔ اس کے خلاف جو شبہات تھے نہ صرف ان کا ثبوت مل گیا بلکہ بعض مزید باتیں بھی معلوم ہو گئیں کیونکہ ان لوگوں نے ڈرا دھمکا کر مجھے بیان دینے پر مجبور کر دیا ۔ میں لڑکا ہی تو تھا اس لئے ڈر گیا اور انہیں سب کچھ بتا دیا بلکہ میں نے یہ تک قبول کیا کہ اماں کے کہنے پر میں نے کچھ نعل لوہار کے ہاتھ بیچے تھے۔ میرے سوتیلے باپ بیچارے کو کوڑے لگائے گئے اور اس کے زخموں پر گرم چربی مل گئی۔ عدالت نے میری والدہ کو صرف سو چابکوں کی عمومی سزا نہ دی بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ اب وہ کبھی مذکورہ کمنڈیڈر کے مکان کے قریب نہ جائیں اور زیدی کی پٹائی کے بعد بھی اسے اپنے مکان میں داخل نہ ہونے دیں

بیچاری اماں نے معاملات کو اور زیادہ بگڑنے سے بچانے کے لئے عدالت کے فیصلہ پر عمل کرنے کی کوشش کی اور خطرہ سے بچنے اور لوگوں کی یاد، گوئی سے دو رہنے کے لئے انہوں نے سولانا کی سرائے میں مسافروں کی

خدمت کا کام سنبھال لیا۔ وہاں پر انہیں ہمہ وقت کام کرنا پڑتا لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح ہم بھائیوں کو پال پوس کر بڑا کر ہی لیا۔ میرا چھوٹا بھائی باتیں کرنے لگا اور میں اس قابل ہو گیا کہ مسافروں کے لئے موم بتیاں اور جو کچھ وہ مجھ سے منگاتے، لانے لگا۔

اسی زمانے میں ایک نابینا آدمی سرائے میں ٹھہرنے کے لئے آیا۔ اس نے سوچا کہ اسے راستے پر سے چلانے کے لئے میں ٹھیک قسم کا لڑکا ثابت ہوں گا۔ اس لئے اس نے میری والدہ سے مجھے اپنے لے چلنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے اس کی نگرانی میں دے دیتی ہیں اور چونکہ میں ایک ایسے باپ کا لڑکا ہوں جس نے لس گیلوس کی جنگ میں اپنے مذہب کی برتری کی خاطر جان دی تھی اس لئے میں کم از کم باپ سے کمتر تو ثابت نہیں ہوں گا۔ انہوں نے اس سے التجا کی کہ وہ میری یتیمی کی وجہ سے مجھ سے اچھا برتاؤ اور میرا خیال رکھے۔ اس نے یہ وعدہ کیا اور کہا کہ وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح لیجا رہا ہے، کسی لڑکے کی طرح غرض میں اپنے نئے آقا کی خدمت اور رہنمائی کرنے لگا۔

ہم نے چند روز سلامانکا میں قیام کیا لیکن وہاں کی آمدنی سے وہ مطمئن نہ ہوا اور اس نے کہیں اور کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے رخصت ہونے سے قبل میں اپنی ماں کے پاس گیا اور ہم دونوں لپٹ کر خوب روئے۔ اس نے دعا دی اور کہا :

"مجھے معلوم ہے کہ میں دوبارہ کبھی تمہیں نہ دیکھ سکوں گی۔ تم اچھے بننے کی کوشش کرنا۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں نے مقدور بھر تمہاری اچھی طرح پرورش کی ہے اور تمہیں ایک اچھے مالک کے حوالے کر دیا ہے۔ اب تمہیں خود اپنا خیال رکھنا چاہیئے۔"

میں اپنے مالک کے پاس واپس آیا جو بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم سلامانکا سے نکل کر پہنچے۔ وہاں پتھر کا ایک جانور بنا ہوا ہے جو بیل سا معلوم ہوتا ہے۔ اس نابینا نے مجھے اس کے قریب جانے کو کہا اور بولا :

"لیزارو اپنا کان بیل سے لگاؤ، تمہیں اس کے اندر ایک زوردار آواز سنائی دے گی۔"

میں اتنا بھولا تھا کہ میں نے اس کی بات مان لی۔ جب اس نے یہ محسوس کیا کہ میرا سر پتھر کے مقابل ہے تو اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے زور سے گھونسہ رسید کیا۔ میرا سر اس بیل سے اتنے زور سے ٹکرایا کہ تین دن تک دکھتا رہا۔

"بیوقوف ننھے طفیلی! تجھے یہ سمجھنا پڑے گا کہ ایک اندھے کے لڑکے کو بہت ہوشیار ہونا چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ بڑی خوشی میں کھی کھی کرنے لگا۔ اس لمحے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں جاگ گیا ہوں اور میری آ

کھل گئی ہیں۔ میں خود سے بولا "یہ جو کچھ کہہ رہا ہے درست ہے مجھے ہوشیار ہو جانا چاہئے کیونکہ اب اپنا سہارا میں خود ہوں اور مجھے خود اپنا خیال رکھنا ہے"۔

ہم نے سفر شروع کیا۔ اس نے چند ہی روز میں مجھے چوروں کی بولی سکھا دی اور میری تیزی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "میں تمہیں امیر تو نہیں بنا سکتا لیکن روزی کمانا سکھا سکتا ہوں"۔

یہ بات درست تھی کیونکہ خدا کے بعد اس نے ہی مجھے زندگی دی۔ اگرچہ وہ نابینا تھا لیکن اس نے مجھ پر چیزوں کی اصلیت ظاہر کر دی اور مجھے زندگی کی حقیقت کو سمجھنا سکھایا۔

مجھے جناب والا کو یہ معمولی باتیں بتانے میں مزا آ رہا ہے کیونکہ اس طرح میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ عوام میں سے کسی کا اعلیٰ درجہ کو پہنچنا کتنی عمدہ بات ہوتی ہے اور اگر کوئی اونچے مرتبے سے گر جائے تو وہ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔

بہرحال میں جناب والا کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں اس نابینا سے زیادہ عیار اور چالاک شخص شاید کبھی بھی پیدا نہ ہوا ہوگا۔ وہ اپنے پیشے میں بڑا شاطر تھا۔ اسے ہزاروں دعائیں زبانی یاد تھیں اور وہ انہیں دھیمے، نرم اور سریلے انداز میں اس طرح دہراتا کہ گرجا گھر میں ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ وہ خاکساری اور پارسائی کی وضع بنائے رکھتا اور بڑا باوقار معلوم ہوتا۔ وہ نہ تو اشتلے کرتا، نہ منہ بناتا اور نہ ہی دوسروں کی طرح آنکھیں چلاتا۔ اس کے علاوہ اسے لوگوں سے پیسہ نکلوانے کے بے شمار طریقے آتے تھے وہ بہت سی چیزوں کی دعائیں جانتا تھا، اُن عورتوں کے لئے جن کے اولاد نہ ہوتی، حاملہ عورتوں کے لئے، ان عورتوں کے لئے جن کے ازدواجی تعلقات ناخوشگوار ہوں تاکہ ان کے شوہر ان سے محبت کرنے لگیں۔ وہ حاملہ عورتوں کو یہ بھی بتا دیتا کہ ان کے لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ طبی معاملات میں اس کا یہ دعویٰ تھا کہ دانت کے درد، اور بے ہوشی کے دوروں کے بارے میں اسے جو واقفیت حاصل ہے گالن کو اس کی نصف بھی نہیں تھی اور پھر یہ کہ اگر کوئی اس سے اپنی کسی بھی بیماری کا ذکر کرتا تو وہ فوراً یہ کہتا :

'یہ کرو، وہ کرو، یہ بوٹی ابال لو، فلاں جڑ لے آؤ۔'

اسی لئے سب لوگ اسے گھیرے رہتے۔ عورتیں خاص طور پر اس کی گرویدہ تھیں اور وہ اس کی ہر بات پر یقین کر لیتیں۔ اس نے ان ترکیبوں سے خوب روپیہ پیدا کیا۔ وہ ایک مہینے میں اتنا کما لیتا جتنا عموماً سو نابینا ایک سال میں کما پاتے ہیں لیکن جناب والا کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس طرح روپیہ جمع ہونے کے باوجود بھی میں نے پوری دنیا میں اس سے زیادہ خسیس یا کنجوس نہیں دیکھا۔ اس نے مجھے بھوک سے ادھ موا کر دیا تھا کیونکہ وہ مجھے میری ضرورت کی آدھی خوراک بھی نہیں دیتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر میں اپنی تمام چالاکی اور چالبازیاں

سے کام نہ لیتا تو کئی بار فاقے سے مرگیا ہوتا ۔ اس کے تمام تجربے اور عیاری کے باوجود میں اسے دھوکا دیدیتا ہمیشہ یا کم از کم تقریباً ہمیشہ ہر معاملہ میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا

شک نہیں کہ مجھے ایسا کرنے کے لئے بڑی لطافت لڑائی پڑتی ۔ اگرچہ مجھے اچھی طرح کہانی کہنا نہیں آتا مگر پھر بھی چند واقعات آپ کو سناتا ہوں

وہ روٹی اور دوسری ہر چیز کر ج کے ایک تھیلے میں رکھتا تھا ۔ جس کے منہ پر دھات کا چھلہ چڑھا رہتا ۔ وہ مقفل رکھتا ۔ وہ جب بھی کوئی چیز اس میں رکھتا یا نکالتا تو اتنا چوکس رہتا اور ہر چیز اتنی ہوشیاری سے گنتا کہ خیال میں کوئی اس میں سے ایک بھورا بھی نہیں چرا سکتا تھا ۔ وہ مجھے روٹی کا جو حقیر سا ٹکڑا دیتا اسے میں لقموں میں نگل جاتا اور جب وہ تھیلے کو مقفل کر کے یہ سوچ کر کہ میں تو کسی اور کام میں لگا ہوا ہوں آرام لگا تو میں تھیلے کو ادھیڑ کر اس میں سے کچھ نکال لیتا اور اسے پھر سی دیتا ۔ چنانچہ مجھے نہ صرف میرا احتیاط سے جانچا روٹی کا ٹکڑا بلکہ گوشت بھری آنت اور خشک نمکین گوشت بھی مل جاتا ۔ میں اس طرح سے اس کے بز کا بدلہ لیتا ۔

میں جو کچھ بھی اڑا تا یا چراتا اسے نصف بلنک (ہسپانوی سکہ) میں بدل لیتا ۔ جب بھی لوگ اس سے کراتے اور اسے بلنک دیتے تو میں اسے جھپٹ کر منہ میں دبا لیتا اور اس کو ایک نصف بلنک پکڑا دیتا وہ خواہ کتنی بھی پھرتی سے ہاتھ بڑھاتا میں اس کا ہاتھ پھیلنے سے پہلے ہی نذر کو آدھا کر چکا ہوتا تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سکے کو چھوتے ہی پہچان لیتا کہ یہ پورا بلنک نہیں ہے اور بڑی ناگواری سے شکایت کرتا ۔:

یہ سو کیا رہا ہے ۔ تم جب سے میرے ساتھ آئے ہو مجھے صرف نصف بلنک ملتے ہیں جبکہ اس سے پہلے بلنک اور کبھی کبھی آدھا بھی مل جاتے تھے ! اس میں یقیناً تمہارا قصور ہے !

اس کی ہدایت تھی کہ اگر دعا کرانے والا پیسے دیکر چلا جائے تو میں اس کی آستین کھینچ دوں اس کے بعد وہ مختصر کر دیتا اور کبھی کبھی تو آدھی پڑھتا پھر وہ دوبارہ آواز لگنے لگتا ۔

' کوئی دعا کرالو !'

کھانے کے دوران وہ اپنے پاس شراب کی صراحی رکھ لیتا ۔ میں اکثر بڑی پھرتی سے کچھ چسکیاں لگا کر کو اس کی جگہ اس طرح واپس رکھ دیتا کہ اسے کوئی آواز سنائی نہ دیتی ۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا کیونکہ اسے یہ محسوس ہوگیا کہ شراب کی تھوڑی مقدار غائب ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد شراب صرف خود پینے کے مقصد سے وہ صراحی کو مسلسل پکڑے رہتا ۔ لیکن میرے پاس شراب کھینچنے کے لئے مقناطیس سے بھی بہتر ایک چیز تھی ۔ میں رو ئی نلکی صراحی میں ڈال کر اس وقت تک شراب سڑکتا رہتا جب تک وہ اسے ختم نہ کر دیتا لیکن وہ صراحی پکڑے رہتا

تھا کہ میرے خیال میں اس نے میرے سٹر کنے کی آواز سن لی۔ اس کے بعد اس نے اپنا منصوبہ بدل دیا اور صراحی کو اپنی ٹانگوں کے بیچ میں ہاتھ سے ڈھکے رکھا رہتا اور بڑے اطمینان سے شراب پیتا۔ مجھے شراب کی لت پڑ گئی تھی۔ اور پیاس سے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ مگر مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ اب نلکی سے کام نہیں چل سکتا۔ چنانچہ میں نے کسی نہ طرح صراحی کے پیندے میں سوراخ کر دیا جس سے شراب کی پتلی سی دھار ٹپکتی رہتی۔ پھر میں نے اس سوراخ کو موم کی ہلکی سی ڈاٹ سے بند کر دیا۔ جب ہم کھانا کھاتے تو میں سردی کا بہانہ کر کے اپنا جسم گرم کرنے کے لئے اس نابینا کی ٹانگوں میں رینگ جاتا۔ ہم بہت دھیمی آگ جلاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ گرمی سے موم پگھل جاتا اور شراب کا فوارہ میرے منہ میں چھوٹنے لگتا۔ آپ یقین کیجئے کہ جو شراب میرے منہ میں پہنچے سے بچی اس سے ایک چیونٹی کی پیاس بھی نہیں بجھ سکتی تھی۔ جب اس بیچارے نابینا نے شراب پینی چاہی تو صراحی میں کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ اس پر وہ اچھل پڑا، زور زور سے کوسنے اور رسے وضیا کو گالیاں دینے لگا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔؟

میں نے کہا " تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ میں شراب پی گیا، ابا تمہارا یہ تو مطلب نہیں ہے نا ؟ تمہیں خبر ہے کہ تم نے صراحی کو ہاتھ سے چھوڑا تک نہیں "

وہ صراحی پر مسلسل ہاتھ گھماتا رہا۔ آخر اسے میری چالبازی کا پتہ چل گیا لیکن اس منافق شیطان نے مجھ سے ایک لفظ نہ کہا اور میں اس خوش فہمی رہا کہ میری چال کامیاب ہوگئی۔ دوسرے دن میں معمول کے بڑے مزے سے چسکیاں لے رہا تھا اور مجھے اس کا شائبہ تک نہ تھا کہ میرے سر پر خطرہ منڈلا رہا ہے یا یہ کہ وہ نابینا میری حرکت سے واقف ہوگیا ہے۔ میں ان مزید ارقطروں کے انتظار میں آسمان کی طرف منہ اٹھائے اپنے معمول کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے لذت دوبالا کرنے کے لئے آنکھیں بند کر لی تھیں اس بے رحم بڈھے نے یہ سوچ کر کہ اب وہ بدلہ لے سکتا ہے عین اس عالم میں اس صراحی کو جو میری مسرت کا سرچشمہ تھی اور اب دکھ کا باعث بننے والی تھی سر سے اونچا کر کے اپنی پوری قوت سے سیدھا میرے منہ پر دے پٹخا۔ بیچارے بیسز ارو کو یہ امید نہیں تھی۔ وہ تو آرام سے لیٹا ہوا مزے لے رہا تھا۔ مجھے بالکل ایسا معلوم ہوا کہ جیسے چھت اور اس کے اوپر کی عمارت مجھ پر آپڑی۔ اس اندھے کی ہلکی سی تھپکی اتنی زوردار تھی کہ میرے حواس خراب ہوگئے، صراحی کے ریزے میرے چہرے میں دھنس گئے اور تمام چہرا زخمی ہو گیا میرے سارے دانت ٹوٹ گئے تھے، اسی لئے اب میرے منہ میں ایک بھی دانت باقی نہیں ہے۔

اس وقت میرے دل میں اس ظالم اندھے بڈھے کے لئے نفرت پیدا ہوگئی۔ اگرچہ اس نے میرے لئے بڑی لے دے کی، بڑی شفقت ظاہر کی اور میرے زخموں کی مرہم پٹی کی لیکن مجھے بہت آسانی سے

یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اس اذیت ناک سزا کا لطف لے رہا تھا۔ اس نے صراحی کے زخموں کو شراب سے صاف کیا اور ہنستے ہوئے کہا:

"لیزارو کیا خیال ہے تمہارا؟ جس شراب نے تمہیں ایذا پہنچائی ہے وہی تمہیں دوبارہ صحت بخش رہی ہے!"

اُس نے ظرافت کے کچھ اور بھی تیر چلائے جو مجھے ذرا بھی پسند نہ آئے۔ جب میں اس ٹوٹ پھوٹ سے سنبھل گیا اور زخموں کے نشان مٹ چلے تو خیال آیا کہ یہ ظالم اندھا بڈھا تو کچھ تھپکیوں میں میرا خاتمہ ہی کر دے گا۔ اس لئے میں نے اس سے پہلے ہی اُس سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن میں نے یہ کام فوراً ہی نہیں کیونکہ میں اپنے بچ نکلنے کا یقین کر لینا چاہتا تھا۔ میں واقعتاً اپنا غصہ تھوک کر اسے صراحی سے ایسی زبردست چوٹ پہنچانے پر معاف بھی کر دینا چاہتا تھا لیکن اس واقعے کے بعد وہ مجھ سے ایسی بے رحمی سے پیش آتا کہ میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ مجھے لاتیں رسید کرتا تھوڑے سے دور دھکیلتا رہتا اور بغیر کسی وجہ کے مارتا کوئی اس سے پوچھتا کہ وہ مجھ سے ایسا برا برتاؤ کیوں کرتا ہے تو وہ شراب کی صراحی کا قصہ لے بیٹھتا اور کہتا:

"کیا آپ کے خیال میں میرا یہ لڑکا ننھا معصوم فرشتہ ہے؟۔ خیر میری داستان سنئے اور دیکھئے شیطان بھی ایسی عیارانہ چال سوچ سکتا تھا؟"

لوگ یہ قصہ سنکر صلیب کا نشان بناتے اور کہتے

"کون سوچ سکتا ہے کہ اتنا چھوٹا لڑکا اس حد تک برا ہو سکتا ہے؟"

اور پھر وہ اس بڈھے کی انتقامی حرکت پر قہقہہ لگا کر کہتے:

"ٹھیک ہے مارو اسے سزا دو۔ یہ تمہارا فرض ہے اور اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب لوگ یہ بات کہتے تو اس کے ذہن میں اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا بھی نہیں تھا میں بھی اسے تا بچو اور راستوں پر چلاتا تاکہ اس کے پیر سوج جائیں اور وہ گر پڑے۔ اگر راستے میں کنکر ہو تو میں اسے کنکروں پر چلاتا اور اگر کیچڑ ہوتی تو اسے سب سے بدتر اور گہرے حصے میں سے گزارتا مجھے اس راہبری کرنی ہوتی تھی اس لئے میں کبھی بھیگ جاتا لیکن ایک محاورے میں ذرا سی تبدیلی کر کے یوں کہا جا کہ مجھے اس کی نابینا آنکھوں کی بدشگونی کے لئے اپنی ناک کاٹنے میں مزا آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی چھڑی کا ایک سرا گردن میں ڈالے رہتا تھا جو اسی وجہ سے چھل گئی تھی اور زخمی ہو گئی تھی۔ میں قسمیں کھاتا کہ میں کسی بغض کی وجہ سے اسے ان خراب راستوں پر نہیں چلاتا مگر وہ اتنا تیز تھا کہ میرا بالکل یقین نہ کرتا اور میرے بہانے کچھ کام نہ آتے

اب میں اس اندھے بڈھے کی چالاکی پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لئے جاں بجا اس کی خدمت میں اس کی معیت میں پیش آئے واقعات میں سے ایک ایسا واقعہ بیان کرتا ہوں جو اس کی تیزی کی بڑی اچھی مثال ہے۔ جب ہم سالامانکا سے چلے تو اس کا ٹولیڈو جانے کا ارادہ تھا کیونکہ اس کے بیان کے مطابق وہاں کے لوگ سخی تو نہیں مگر خوش حال ضرور تھے۔ اس نے اس محاورے پر عمل کیا کہ ایک سنگدل بھی دست سے زیادہ ہی دے سکتا ہے۔ راستے میں ہم بہترین قصبوں میں سے گزرے۔ جب اس کو کہیں خوش آمدید کہا جاتا اور اچھی چیزیں ملتیں تو وہ قیام کرتا ورنہ تیسرے دن روانہ ہو جاتا۔ ایک جگہ پہنچے جو المورکس کہلاتی تھی۔ وہاں لوگ انگوروں کی فصل کاٹ رہے تھے۔ ایک آدمی نے اسے انگور کے خوشوں کی خیرات کی۔ کیونکہ ٹوکریاں اکثر گرتی رہتی ہیں اور سال کے اس عرصہ میں انگور بہت پکے ہوتے ہیں اس لئے خوشے اس کے ہاتھوں میں جھڑنے لگے۔ اگر وہ انہیں تھیلے میں رکھتا تو ان کا عرق ہر چیز کو خراب کر دیتا۔ اس لئے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم لوگ دعوت اڑائیں — صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ انگور ڈھو نہیں سکتا تھا بلکہ اس لئے بھی وہ دن بھر مجھے لاتیں۔ رسید کرنے اور دھکے دینے کی وجہ سے اب میری خاطر کرنا چاہتا تھا۔ ہم ایک احاطہ دار میدان میں بیٹھ گئے تو وہ بولا :

'میں تمہارے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ میری تجویز ہے کہ ہم ان انگوروں کو مل بانٹ کر کھائیں۔ تم میرے برابر کا حصہ لے سکتے ہو۔ ہم انہیں اس طرح بانٹیں کہ ایک انگور تم کھاؤ اور پھر ایک میں کھاؤں لیکن تم وعدہ کرو کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ دانہ نہیں کھاؤ گے۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا اور ہم برابر برابر کھا لیں گے۔'

اس معاہدہ کے بعد ہم نے کھانا شروع کیا لیکن دوسری ہی بار اس حرامی بڈھے نے اپنا ارادہ بدل دیا اور یہ سوچ کر کہ شاید میں بھی ایک وقت دو انگور کھا رہا ہوں اس نے خود ایسا کرنا شروع کر دیا۔ میں نے جو یہ دیکھا کہ اس نے رفتار تیز کر دی تو میں اس سے پیچھے چلنے کے بجائے آگے نکل گیا۔ ایک وقت دو سے تین ہو گئے۔ جلد ہی میں انہیں جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا اپنے منہ میں بھر رہا تھا۔ جب خوشہ ختم کر دیا گیا تو وہ کچھ دیر تک ڈنٹھل لئے بیٹھا رہا۔ پھر سر کو جھٹک کر بولا :

'لیزارو تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ خدا کی قسم تم نے ایک وقت تین انگور کھائے ہیں۔'

'میں نے یہ نہیں کیا، تمہیں خود معلوم ہے' میں بولا 'لیکن تم کس وجہ سے یہ بات کہہ رہے ہو؟'

اس چالباز بڈھے نے جواب دیا :

'تمہیں خبر ہے کہ میں نے تمہیں ایک وقت تین انگور کھاتے کیسے پکڑا؟ کیونکہ میرے ایک وقت دو انگور کھانے پر تم نے کچھ نہیں کہا۔'

میں چپ رہا۔ مگر دل ہی دل میں ہنسا اور بہت حیران ہوا۔

ہم چلتے چلتے ایک سرائے میں پہنچے۔ دروازے کے باہر دیوار میں خچر باندھنے کے لئے بہت سی میخیں ٹھکی ہوئی تھیں تاکہ خچر بان ان سے اپنے جانور باندھ سکیں۔ اندھا ادھر ادھر ٹٹول رہا تھا تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ ہاں یہ وہی سرائے ہے جہاں کی مالکن اسے روزانہ فضیلت بندر ابہ کی دعا پڑھنے پر کچھ نہ کچھ دیا کرتی تھی۔ اس نے ایک میخ کو پکڑ لیا اور بولا:

' اے شیطانی چیز! تو اپنی دانست سے کہیں زیادہ بری ہے۔ کتنے لوگ تجھے کسی دوسرے کے سر میں ٹھونک دینا چاہتے ہیں مگر کس قدر تھوڑے سے لوگ تجھے پانا یا تیرا نام بھی سننا گوارا کرتے ہیں۔

' ابا تم کیا کہہ رہے ہو'؟

' لونڈے تو چیکارہ ' کبھی یہ چیز جو میرے سر میں سمائی ہوئی ہے تجھے ناوا جب روزی بہم پہنچائیگی'

'میں وہ نہیں کھاؤں گا'' میں بولا ' اور یہ مجھے کچھ نہیں دے گی'۔

'یہ حقیقت ہے اور اگر تو زندہ بچ گیا تو تجھے اس بات کا مطلب معلوم ہوگا'۔

ہم سرائے میں داخل ہوئے۔ وہاں مجھے وہ کچھ بھگتنا پڑا کہ اے کاش ہم کبھی اس جگہ نہ پہنچے ہوتے۔

وہ سرائے کے مالک کی بیویوں، شراب خانے کی عورتوں، مٹھائی بیچنے والیوں، طوائفوں غرض ہر قسم کی عورتوں کے لئے دعا پڑھتا تھا۔ لیکن میں نے اسے کبھی کسی آدمی کے لئے دعا پڑھتے نہیں دیکھا۔

میں اس بیان کا سلسلہ جاری رکھنا نہیں چاہتا اس لئے بہت سی باتیں جو مجھے اپنے اس پہلے مالک کے ساتھ پیش آئی تھیں اور اب بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں، چھوڑے دیتا ہوں۔ میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ کس واقعہ نے مجھے اس کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کیا؟

ہم اس وقت اسکالونا میں تھے جو اسی نام کے ایک ڈیوک سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے مجھے قیمہ بھری آنت تلنے کے لئے دی۔ جب میں نے اسے تیار کر لیا اور اس نے اس کی چکنی چربی چکھ لی تو بٹوے سے ایک مرویدی نکال کر مجھ سے شراب لانے کو کہا۔ شیطان جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو چوری پر اکساتا ہے اسی نے حرص کو مجسم میرے سامنے رکھ دیا۔ آگ کے قریب ایک ملیا، چپلا اور گلا ہوا شلجم پڑا ہوا تھا جو کسی نے اس لئے وہاں پھینک دیا تھا۔ کیونکہ وہ کڑھائی میں ڈالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں وہاں اکیلے تھے اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ اس لذیذ آنت میں سے مجھے صرف اس کی مزیدار خوشبو ہی

ملنے والی تھی۔ اس لیے میں نے نتائج کو فراموش کر دیا اور اس کے غصہ کا خوف دل سے نکال باہر کیا۔ وہ بڈھا بٹوے میں سکہ ٹٹول رہا تھا کہ میں نے آنت کے بجائے کڑھائی میں شلجم رکھ دیا۔ میرے مالک نے مجھے شراب کے لئے پیسے دئے اور کڑھائی آگ پر گھمانے لگا

میں شراب لینے چلا گیا اور اس قیمہ بھری آنت کو پلک جھپکتے میں نگل گیا۔ جب میں واپس لوٹا تو وہ تلی ہوئی ڈبل روٹی میں شلجم رکھے اس کا سینڈوچ بنائے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں میں دبا کر اٹھایا تھا اسلئے اس حقیقت سے بے خبر تھا جیسے ہی اس نے لقمہ بھرا تو گرم لذیذ قیمے کے بجائے اس کو دھچکہ لگا اور ٹھنڈا شلجم منہ میں پہنچ گیا وہ اچھل پڑا اور بولا۔

"لیزارو یہ کیا ماجرا ہے"؟

"تم مجھ پر کیوں بگڑ رہے ہو؟ کہیں تمہارا یہ مطلب تو نہیں کہ یہ میری غلطی ہے؟ کیا میں شراب لینے نہیں گیا ہوا تھا؟ کوئی یہاں آیا ہو گا اور اسی نے تمہیں فریب دیا ہے"

"نہیں، نہیں! میں نے کڑھائی ہاتھ سے نہیں چھوڑی۔ یہ ناممکن ہے"

میں نے بے تحاشا قسمیں کھائیں کہ اس حرکت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا میں اس بڈھے شیطان سے کوئی چیز پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرا سر تھام کر مجھے سونگھنے کے لئے جھکا۔ اسے سراغرساں کتے کی طرح مہک آئی ہو گی کیونکہ خوب اچھی طرح اطمینان کرنے کے لئے اس نے بڑے غصہ میں مجھے کس کے پکڑا، میرا زبردستی منہ کھول دیا اور میرے حلق میں اپنی ناک گھسیڑ دی۔ اس کی ناک جو لمبی اور نوک دار تھی اس وقت غصے میں اور بھی لمبی ہو کر میرے ٹینٹوے کو چھو رہی تھی۔ کچھ تو میرے خوف اور کچھ اس وجہ سے کہ اس تھوڑی سی دیر میں وہ قیمہ ہضم نہیں ہوا اور پھر یہ کہ اس لمبی چوڑی ناک کی وجہ سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ غرض یہ کہ میری حرکت اور لالچ ظاہر ہو گیا اور میرے مالک کو اس کا مال واپس مل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ناک میرے منہ سے باہر نکالتا میرے پیٹ میں مروڑ اٹھی اور اس کی ناک اور نیم ہضم قیمہ ساتھ ساتھ باہر نکل آئے۔

اے اللہ! کاش کہ میں اس وقت قبر میں گڑ گیا ہوتا کیونکہ مردہ تو ہو ہی گیا تھا۔ وہ بدکیش اندھا بڈھا اتنا غضب ناک ہو رہا تھا کہ اگر لوگ چیخ پکار سن کر آ نہ گئے ہوتے تو وہ یقیناً مجھے مار ہی ڈالتا۔ انہوں نے مجھے اس کے ہاتھوں میں سے گھسیٹا اور میری چند بالشت چند بال باقی بچے ہوئے تھے وہ اس کے ہاتھوں میں ہی رہ گئے۔ اس کے چہرے اور میری گردن اور حلق پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے میرے ساتھ جو ظالمانہ برتاؤ کیا تھا اسکی وجہ سے وہ اس کا مستحق بھی تھا۔

اس ظالم بڈھے نے ان تمام لوگوں سے میرے عیب بیان کرنے شروع کر دئے۔ وہ بار بار شراب کی صراحی، انگور کے خوشے اور اس تازہ واقع کا تذکرہ کرتا رہا۔ لوگ اتنے زور سے قہقہے لگا رہے تھے کہ راہ چلتے بھی اک

چل پہل میں حصہ لینے آپہنچے۔ وہ اندھا میری چال بازیاں ایسے مزاحیہ انداز میں بیان کر رہا تھا کہ میں سخت چوٹ اور تکلیف کے باوجود ہنسنے بغیر نہ رہ سکا۔

اسی عرصے میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں بڑا بزدل ہوں اور مجھے بہت شرم محسوس ہوئی۔ مجھے اس کی ناک کُتر لینی چاہئے تھی۔ آخر وہ میرے حلق میں گھسی ہوئی تھی اور مجھے یہ کر گذرنے کا کافی موقعہ ملا تھا۔ مجھے بس یہ کرنا تھا کہ دانت بھینچ لیتا اور یہ کام ہو جاتا۔ کیونکہ یہ ناک اس کی تھی اس لئے میرا پیٹ اسے قیمے سے کہیں زیادہ بہتر طور پر ہضم کر لیتا۔ اتنا یقینی ہے کہ اس بارے میں اس کی ناک کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اے کاش میں یہ کرگذرا ہوتا۔ یہ اس سے بدلہ لینے کا سب سے اچھا طریقہ تھا۔

سرائے کے مالک کی بیوی اور دوسرے مسافروں نے میرا بہت خیال کیا اور وہ لوگ اندھے کے لئے جو شراب لائے تھے اس سے انہوں نے میری گردن اور حلق کے زخم صاف کئے۔ اس اندھے نے یہ دیکھ کر مزاحیہ جملوں کی باڑ مارنا شروع کر دی:

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس لڑکے کی صفائی پر ایک سال میں اتنی رقم اٹھ جاتی ہے جتنی کہ دو برس میں میری خوراک پر خرچ ہوتی ہے۔ لیزارو میں تو یہ کہتا ہوں کہ تمہیں اپنے باپ سے زیادہ شراب کا شکر گذار ہونا چاہئے کیونکہ اس نے تمہیں صرف ایک بار پیدا کیا تھا جبکہ شراب نے تمہیں سیکڑوں مرتبہ زندگی بخشی ہے!۔

پھر وہ لوگوں کو بتاتا رہا کہ اس نے کتنی دفعہ میرا سر پھوڑا اور چہرا مسل ڈالا تھا اور پھر زخموں کو شراب سے صاف کیا تھا۔

"میں تمہیں بتائے دیتا ہوں"، وہ پھر بولا: کہ اگر اس دنیا میں کسی بھی شخص کے لئے شراب نیک فال ہو سکتی ہے تو وہ تم ہو"!

جو لوگ میرے زخم دھو رہے تھے انہیں ان باتوں میں بڑا مزا آرہا تھا لیکن مجھے ان میں کوئی ظرافت نظر نہ آرہی تھی مگر اس بڈھے کی پیش گوئی پوری ہوئی اور جب سے اب تک مجھے کئی بار اس کا خیال آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں پیش گوئی کرنے کی صلاحیت تھی اور میں نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا اس پر مجھے افسوس ہے اگرچہ اس کی ان معنی میں پوری طرح تلافی ہو گئی کہ اس نے اس دن مجھ سے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل ٹھیک نکلا۔ اگر جناب والا نے اس کا مطالعہ جاری رکھا تو انہیں یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

اگلے روز ہم مانگنے نکلے۔ گذشتہ تمام دن بارش ہوتی رہی تھی اور اب پھر بارش شروع ہو گئی تھی اس لئے وہ بھیگنے سے بچنے کے لئے چھتوں کے نیچے نیچے چلتا رہا۔ جب رات ہونے لگی اور بارش میں کمی کے آثار نظر

آئے تو وہ بولا:

'لیزا رد بارش رکتی نظر نہیں آتی ۔ جتنا اندھیرا ہوتا جائے گا اتنا ہی معاملہ بگڑتا جائے گا ۔ دوسرے دالبچی صرائے واپس پہنچنے کے لئے ہمیں ایک کھلے ہوئے نالے کو پار کرنا تھا جو بارش کی وجہ سے او چوڑا ہو گیا تھا۔

میں نے کہا:

' دیکھو! آبا نالہ چوڑا ہے لیکن مجھے ذرا پرے ایک تنگ جگہ نظر آرہی ہے جسے ہم پیر گیلے بغیر کود کر پار کر سکتے ہیں ۔'

اس نے سوچا یہ تو اچھا خیال ہے اور کہنے لگا:

تم ٹھیک کہتے ہو ۔ میں تمہیں اسی لئے پسند کرتا ہوں ۔ مجھے اس تنگ جگہ لے چلو کیونکہ مجھے سرد میں پانی اچھا نہیں لگتا اور میں گیلے پیر گوارا نہیں کر سکتا۔'

سب معاملہ ٹھیک ہو گیا تو میں اسے چھجے سے نکال کر سیدھا بڑے چوک میں ستون یا ایک پتھر کے کھمبے قریب لے آیا جس پر مکانوں کی توسیعی چھتیں ٹکی ہوئی تھیں اور بولا:

' ابا یہ کھائی کا سب سے تنگ حصہ ہے ۔'

چونکہ اس وقت گھمسان کی بارش ہو رہی تھی اور وہ بیچارہ مصیبت زدہ بچہ اجا رہا تھا اور پھر ہم جلدی میں بھی تھے! مگر ان سب باتوں سے زیادہ یہ کہ خدا نے (میرے بدلہ لینے کے لئے) اس لمحے اس حواس گم کر دئے تھے، اس نے میرا یقین کر لیا اور کہا:

' مجھے سیدھا کھڑا کر دو اور کود جاؤ ۔'

میں نے اسے ستون کے بالمقابل کھڑا کر دیا، چھلانگ لگائی اور حملے سے بچنے کی کوشش کرنے والا کی اچک کر اسی ستون کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور چلایا:

'تم جتنے زور سے کود سکتے ہو کود و ۔ بس یہاں پہونچ جاؤ گے۔'

میں یہ بات کہہ بھی نہ پایا تھا کہ اس نے اور زیادہ زور لگانے کے لئے ایک قدم پیچھے ہٹ بکر کی طرح اکڑ کر پوری قوت سے خود کو دھکیل بھی ڈالا ۔ اس کا سر ستون سے کدو کی طرح ٹکرایا اور وہ مردہ حالت میں پھٹے ہوئے سر کے ساتھ زمین پر گر پڑا ۔

' ارے! تم نے چیز تو سونگھ لیا تھا لیکن تمہیں ستون کا پتہ نہ چلا؟ واہ واہ ،' میں نے اس پر فقرہ کر میں اسے لوگوں کی بھیڑ میں چھوڑ کر جو وہاں جمع ہو گئی تھی، شہر کے دروازے کی طرف بھاگا ۔ بات یہ

سے پہلے ہی میں تو رجوس پہنچ چکا تھا۔ مجھے کبھی یہ معلوم نہ ہوا کہ اس پہ کیا گذری اور نہ ہی میں نے جاننے کی زحمت گوارا کی

دوسرا باب

میں اس شہر میں خود کو غیر محفوظ سمجھتا تھا اس لئے اگلے دن مقید اپہونچ گیا۔ وہاں میں اپنے گ پادشاہ میں ایک پادری کے ہتھے چڑھ گیا۔ میں اس سے پیسے مانگنے گیا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا تم عشائے ربانی کی نماز کے موقع پہ پادری کی مدد کرنے کا طریقہ معلوم ہے؟ میں نے اس کا ہاں میں جواب دیا کیونکہ اس اندھے نے حالانکہ اس کا برتاؤ خراب تھا مجھے سینکڑوں باتیں سکھا دی تھیں۔
چنانچہ اس پادری نے مجھے نوکر رکھ لیا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا! میں نے یہ بات اس وجہ سے کہی کہ اس آدمی کے مقابلے میں وہ اندھا سکندر اعظم کی مانند دریا دل تھا حالانکہ میں یہ بتا چکا ہوں کہ وہ مجسم خست تھا۔ میں بس یہ کہہ سکتا کہ دنیا بھر کی کنجوسی اس ایک مقدس نیک ذات میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ یہ خیال ہے کہ مجھے اس کا علم نہیں کہ آیا یہ اس کی فطرت تھی یا یہ انداز اس نے پادری کا چغہ پہنتے وقت اختیار کیا تھا؟
اس کے پاس ایک پرانا صندوق تھا جو بڑی مضبوطی سے مقفل رہتا۔ وہ چابی کو اپنی ٹوپی کے فیتے میں باندھ رکھتا۔ جب وہ گرجا گھر سے سوغات کا چڑھاوا لاتا تو صندوق کھول کر اسے اس میں ڈال، تالا لگا، چابی پھر اپنے کمربند پر باندھ لیتا۔ گھر میں کسی بھی جگہ ایک ٹکڑا تک کھانے کو نہیں تھا۔ آخر کچھ نہ کچھ تو ہوا ہی کرتا ہے ۔۔۔ باورچی خانے میں گوشت کا کوئی پارچہ، نعمت خانے کے طاق میں پنیر کا ٹکڑا یا کسی ٹوکری میں کھانے کے بچے ہوئے روٹی کے چند ٹکڑے۔ میں نے سوچا اگر میں انہیں کھا نہ سکتا تو کم از کم ان کا نظارہ ہی تھوڑی بہت تسلی تو کر دیتا۔ وہاں تو صرف بلند میں کچھ پیاز کی ڈلیاں لٹکی ہوئی تھیں اور وہ بھی مکان کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں مقفل تھیں۔ جب میں اگر پیاز کی ڈلی لانے کے لئے کمرے کی چابی مانگتا تو اگر اس وقت کوئی بیٹھا ہوتا تو وہ بڑی سستی سے چابی کھول کر دیتا اور کہتا:
'لو اور اسے فوراً لوٹا دو مگر زیادہ لالچ نہ کرنا'
وہ یہ بات ایسے کہتا جیسے وہ چابی ویلنسیا کے پھلوں اور سبزیوں کے تمام بھنڈار کھول سکتی تھی۔ جیسے اس کمرے میں کھونٹی پر لٹکی ہوئی گنتی کی پیاز کے سوا دنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔ اگر میں غلطی سے اپنے راتب سے زیادہ کھا جاتا تو میری شامت آ جاتی۔ انجام کار یہ کہ میں بھوک سے مرنے لگا۔ اگرچہ وہ مجھ سے خست کرتا مگر اپنے حق میں بڑا فیاض تھا۔ وہ روزانہ پانچ بلانک کا گوشت دونوں وقت کھا جاتا۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں

کہ وہ شوربے میں سے مجھے بھی حصہ دیتا تھا لیکن بوٹی کی تو میں بس ہمیشہ آس ہی لگائے رہا! مجھے صرف روٹی کا ایک ٹکڑا ملتا اور میں خدا سے دعا مانگتا کہ اس سے میری آدھی بھوک ہی مٹ جائے۔ اس علاقے میں لوگ دوشنبہ کو بھیڑ کی سری کھاتے ہیں۔ وہ مجھ سے تین مرویدی کی سری منگواتا، اسے اُبال کر آنکھیں، دہان، گردن، بھیجہ اور جبڑوں کا گوشت کھا جاتا اور چھوڑی ہوئی ہڈیاں مجھے دیکر کہتا:

'لو۔ انہیں کھاؤ اور مزے کرو۔ دنیا تمہارا کھاجا ہے۔ تم تو پاپائے روم سے بھی زیادہ عیش کرتے ہو۔'

'مجھے امید ہے ایک دن خدا تمہارا بھی ایسا حال کردے گا' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا۔

اس کے ساتھ تین ہی ہفتے گذارنے کے بعد میں بھوک سے اتنا لاغر ہو گیا کہ ٹانگوں کے بل کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یہ بخوبی معلوم ہو گیا کہ اگر خدا اور میری عقل سلیم نے میری مدد نہ کی تو میں قبر میں پہنچ جاؤں گا۔ میں اپنی کوئی چال کام میں نہ لا سکتا تھا کیونکہ اسے زک پہنچانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اگر میں کوشش بھی کرتا تو وہ اس اندھے کی طرح نہیں تھا جو میں اس کے اندھے پن سے فائدہ اٹھاتا (اگر وہ ستون سے ٹکرا کر مر گیا ہو تو اللہ اسے بخشے) اگرچہ وہ عیار تھا مگر اسے میری حرکتوں کا پتہ نہ چلتا کیونکہ وہ بصارت کی بیش قیمت نعمت سے محروم تھا۔ لیکن وہ شخص! — وہ تو سیاہ گوش کی طرح تیز تھا۔ جب ہم چڑھاوے کی جگہ ہوتے تو وہ چندے کے ڈبے میں گرنے والا ہر سکہ گنتا جاتا وہ ایک نظر لوگوں پر اور دوسری میرے ہاتھوں پر رکھتا۔ اس کی آنکھیں پارے کی ننھی گیندوں کی طرح رقص کرتی رہتیں۔ وہ اندازہ لگا لیتا کہ کل کتنے بلانک جمع ہوئے ہیں اور جب چندہ ختم ہو جاتا تو مجھ سے ڈبہ لے قربان گاہ پر رکھ دیتا۔ میں جتنے عرصہ وہاں رہا بلکہ یوں کہئے کہ مر مر گیا، کبھی ایک سکہ بھی نہ اڑا سکا۔ اس نے کبھی ایک بلانک کی شراب بھی مجھ سے نہ منگوائی بلکہ چڑھاوے سے جو تھوڑی سی بچ جاتی اسے لاکر صندوق میں رکھ دیتا اور سارے ہفتے تک اسی سے کام چلاتا۔ اپنی اعجوبہ روزگار خست چھپانے کے لئے وہ اکثر مجھ سے کہا کرتا:

'سنو لڑکے۔ پادریوں کو کھانے پینے میں بڑا اعتدال پسند ہونا چاہئے۔ اسی لئے میں دوسروں کی طرح بے تحاشہ نہیں کھاتا۔'

وہ حرامی سفید جھوٹ بول رہا ہوتا تھا کیونکہ جب کبھی وہ برادری کی مجلسوں یا سوگ کے گھر میں دعا پڑھنے جاتا تو دوسروں کا مال بھیڑیئے کی طرح کھاتا اور شراب شعلے چلانے والوں کی طرح پیتا۔ جب کبھی مجھے کسی کی تدفین کا خیال آتا ہے — اُف خدا مجھے معاف کرے! میں اس وقت کے سوا کبھی نسلِ انسانی کا دشمن نہیں رہا۔ وہ بھی اس لئے کیونکہ اس وقت ہم خوب کھاتے اور میں تو تدفین کی ضیافت میں حلق تک ٹھونس لیتا۔ میں یہ امید لگاتا بلکہ خدا سے دعا کرتا کہ وہ روزانہ کسی نہ کسی بچے کو مار ڈالے۔ جب ہم بیماروں کے لئے مقدس نشانیاں اور مقدس تیل لیکر جاتے، اور پادری حاضرین سے دعا کے لئے کہتا تو آپ یقین کیجئے کہ میں کسی سے پیچھے نہ رہتا اور پورے خلوص اور نیک نیتی سے خدا سے

سے صحت بخشنے کی بجائے یہ دعا کرتا کہ وہ اس بیمار کو دنیا سے اٹھا لے۔ اگر کسی کو افاقہ ہو جاتا (اللہ مجھے معاف کرے) تو میں اسے بار بار کوستا اور اگر کوئی مر جاتا تو اسے دعا دیتا۔ پادری کے ساتھ میرے قیام کے دوران رہا چھ ماہ کی مدت میں صرف بیس آدمی مرے اور مجھے یقین ہے کہ یہ میں تھا جس نے انہیں مار ڈالا یا مردہ میری درخواست پر مرے۔ چونکہ خدا کو میری آہستہ آہستہ اور اذیت ناک موت منظور آرہی تھی اسلئے میرے خیال میں اس نے مجھے زندہ رکھنے کے لئے انہیں بخوشی مار ڈالا۔ لیکن اس سے مجھے کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوا میں تدفین کے دن مزا کر لیتا مگر پیٹ بھرنے کی لذت سے واقف ہونے کے بعد تدفین سے خالی دنوں میں بھوک کی بھوک برداشت کرنا اور زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا اس لئے موت کے علاوہ نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور بعض اوقات میں دوسروں کے لئے ہی نہیں خود اپنے لئے بھی یہ دعا مانگتا۔ لیکن موت نہ آئی نہیں، ہاں سر پر منڈلاتی رہی۔

میں اکثر اس کنجوس مالک کو چھوڑنے کی سوچتا۔ لیکن میں دو باتوں کی وجہ سے باز رہا۔ ایک تو یہ کہ مجھے اپنی ٹانگوں پر بھروسہ نہیں تھا جو فاقہ کشی کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ میں اس معاملہ پر غور کرتا تو خود سے کہتا:

"مجھے دو آقا ملے ہیں۔ پہلا مجھے فاقے سے نیم مردہ رکھتا تھا مگر اس نے تو قبر میں ہی پہنچا دیا۔ اگر میں اسے چھوڑ دوں اور کوئی اس سے بھی بدتر مل گیا تو میں مر ہی جاؤں گا"۔

اسی لئے مجھے وہاں سے ہلنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہر نیا آقا پہلے آقا سے بدتر ہوگا اور اگر میں نے ایک بھی قدم آگے بڑھایا تو دنیا سے لیزارو کا نام مٹ جائے گا۔

میں اس اذیت ناک حالت میں تھا — خدا اس سے ہر نیک عیسائی کو نجات دے — تسکین کی کوئی صورت نہیں آتی تھی اور میری حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی کہ ایک دن جب وہ خسیس شہر سے باہر گیا ہوا تھا تو اتفاقاً ایک ٹھٹھیرا آ نکلا۔ میرا خیال ہے کہ خدا نے کسی فرشتے کو اس بھیس میں بھیجا تھا۔ اس نے پوچھا کیا کوئی چیز مرمت طلب ہے؟

"مجھ میں کافی چیزیں مرمت طلب ہیں لیکن اگر تم نے میری مرمت کی تو پھر تمہارا کام ٹھپ ہو جائیگا"

میں نے اتنی آہستگی سے کہا کہ وہ سن نہ سکا۔ میرے پاس مزاحیہ جملے بازی کے لئے وقت بہت کم تھا اس لئے میں نے روح القدس کی اس وقت بخشی ہوئی روشن خیالی کی بنا پر کہا:

"سنو دوست! مجھ سے اس صندوق کی چابی گم ہو گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میرا مالک میری سٹائی کر ڈالے گا۔ مجھ پر ایک مہربانی کرو۔ دیکھو تو کیا تمہارے گچھے میں سے کوئی چابی اس میں لگ سکتی ہے؟

میں تمہارا معاوضہ ادا کر دوں گا۔'

فرشتہ صفت ٹھٹھرا اس بڑے گچھے میں یکے بعد دیگرے اپنی چابیاں آزمانے لگا اور میں اپنی کمزور دعاؤں سے اس کی مدد کرنے لگا۔ جب کوئی چابی لگنے کی امید نہ رہی تو اچانک ایک چابی لگ گئی اور مجھے صندوق میں ڈبل روٹی نظر آئی جیسا کہ لوگ کہتے ہیں وہ بالکل خدا کے چہرے کی مانند تھی۔ میں نے اس سے کہا:

'میرے پاس تمہیں دینے کے لئے پیسے نہیں ہیں اس لئے ان کے بدلے ڈبل روٹی لے لو۔'

اس نے تیز ہاتھ کی ایک ڈبل روٹی جو سب سے زیادہ تازہ معلوم ہوتی تھی، لے لی اور چابی دے کر خوش خوش چلا گیا۔ مگر میں اس سے بھی زیادہ مسرور تھا۔ اس وقت میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ پادری کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ فلاں چیز غائب ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے سوچا کہ اب میں اتنا دولت مند ہوں کہ بھوک مجھ پر حملہ نہیں کر سکے گی۔ پادری لوٹ آیا اور یہ خدا کا فضل ہی تھا کہ اس کو اس بات کا علم نہ ہوا کہ کوئی فرشتہ چڑھاوے کی ڈبل روٹی لے گیا ہے۔

اگلے دن اس کے گھر سے نکلتے ہی میں نے اپنی ڈبل روٹی کی بہشت کا دروازہ کھولا، ایک روٹی پہلے ہاتھوں میں پکڑی، پھر دانتوں میں اور اس سے پہلے کہ کوئی دو دفعہ کہہ سکتا، میں نے اسے غائب کر دیا۔ مگر ہاں میں صندوق بند کرنا نہ بھولا۔ پھر میں بڑا مگن ہو کر یہ سوچتا ہوا کہ اب میں زندگی کو آسان بنانا سیکھ گیا ہوں، تیزی سے گھر کے چکر لگانے لگا۔ لیکن اذیت سے اس تھوڑے سے عرصہ کے لئے جو چھٹکارا ملا تھا، اس کا مزا لینا میری تقدیر میں نہیں تھا میں تین ہی دن بعد پھر مصیبت میں پھنس گیا اور میں نے اپنے اس قاتل کو نا وقت صندوق پر جھکے بار بار ڈبل روٹیاں اُلٹتے پلٹتے اور گنتے دیکھا۔

میں معصوم بنا رہا لیکن خاموشی سے بڑے خلوص دل سے یہ دعا مانگی:

'سینٹ جان، میری خاطر اسے اندھا کر دو۔'

کافی دیر تک دن اور ڈبل روٹیاں اپنی انگلیوں پر جوڑنے گننے کے بعد وہ بولا:

'اگر میں نے اس صندوق کو اتنی حفاظت سے نہ رکھا ہوتا تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ کسی نے اس میں سے ڈبل روٹی چرا لی ہے لیکن اپنے اطمینان کے لئے آج سے پورا حساب رکھوں گا۔ اس وقت اس میں نو عدد ڈبل روٹی اور ایک ٹکڑا باقی ہے۔'

'خدا کرے تجھے نو دھچکے لگیں،' میں نے خود سے کہا۔

اس کی باتیں مجھے تیر کی طرح لگیں۔ اور میرے پیٹ میں بھوک سے مروڑ اٹھنے لگی کیونکہ اسے معلوم ہو گیا کہ اب اسے پھر سابقہ راتب ہی ملے گا۔ وہ چلا گیا تو میں نے دل بہلاوے کے لئے صندوق کھولا۔ مقدس ڈبل روٹی دیکھ

تو میں اس کی پرستش کرنے لگا حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ مجھے مل نہیں سکتی۔ میں نے ڈبل روٹیاں گنیں کہ شاید اس حرامی سے اتفاقاً کوئی غلطی ہو گئی ہو لیکن میری منشا کے برخلاف ان کی تعداد بالکل درست تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ، یہ کر سکتا تھا کہ اس پر اپنے ہونٹ پھیرتا اور بڑی نرمی سے اس کے کچھ بھورے نوچ لیتا۔ اور اس خیال آنے سے قبل یہ کام شروع بھی کر چکا تھا۔ میں نے تمام دن ان ہی بھوروں پر کاٹا اور آج میں کل کی طرح خوش نہیں تھا۔ دو تین دن سے میرے پیٹ کو کچھ روٹی ملنے لگی تھی اسلئے اب بھوک اور بھی بڑھ گئی اور مجھے بڑی اذیت ہونے لگی۔ یہاں تک کہ صندوق کھولنے بند کرنے اور بچوں کے بقول خدا کا چہرہ دیکھنے کے علاوہ کچھ اور نہیں سوجھتا تھا۔ لیکن خدا نے جو بیکسوں کی مدد کرتا ہے مجھے اس مصیبت میں دیکھا اور خود مجھے ایک چھوٹی سی ترکیب بتائی۔ میں کچھ دیر غور کرتا رہا۔ پھر خود سے کہنے لگا:

'یہ صندوق پرانا ہے اور سوراخ گو چھوٹے ہیں مگر جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے۔ اسے یہ خیال آسکتا ہے کہ چوہے اندر گھس کر ڈبل روٹی کھا گئے ہوں گے۔ میں پوری ڈبل روٹی تو نہیں نکال سکتا کیونکہ وہ بدمعاش سمجھ جائے گا کہ کیا غائب ہو گیا۔ بلکہ یہ بات وہ برداشت کرے گا'

میں وہاں پڑے ہوئے کچھ پھٹے پرانے کپڑوں پر ڈبل روٹی رکھ کر اس کا چورا کرنے لگا۔ کچھ ڈبل روٹیاں تو میں نے پڑی رہنے دیں اور کچھ کا چورا کر ڈالا۔ پھر میں نے وہ بھورے ایسے کھائے جیسے کوئی مٹھائی کھاتا ہے تو کچھ جان میں جان آئی۔ وہ گھر آیا اور اس نے صندوق کھول کر وہ المیہ دیکھا تو اُسے لمحے بھر کو بھی شک نہ ہوا کہ نقصان چوہوں کا پہنچایا ہوا نہیں ہے کیونکہ میں نے بڑی احتیاط سے چوہوں کے کترنے کی نقل کی تھی۔ اس نے اوپر سے نیچے تک صندوق کا معائنہ کیا تو چند سوراخ نظر آئے اور وہ سمجھا کہ چوہے ان ہی میں سے گھسے ہوں گے۔ پھر مجھے آواز دی اور بولا:

'لیزارو دیکھو۔ کل رات ہماری ڈبل روٹی کا کیا حشر ہو گیا۔'

میں نے بڑے تعجب کا اظہار کیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟

'کون ہو سکتا ہے؟' وہ بولا 'چوہے! ان سے کوئی چیز نہیں بچتی'

ہم کھانا کھانے بیٹھے تو الحمدللہ اس سے مجھے اور بھی فائدہ ہوا کیونکہ اپنے حصے سے مجھے کچھ زیادہ ہی ملا۔ اس نے چھری سے وہ تمام حصے جن پر چوہوں کے دانت لگنے کا شبہ تھا کھرچ ڈالے اور کہنے لگا:

'یہ کھالو۔ چوہا غلیظ جانور نہیں ہے۔'

اس دن میں نے اپنے ہاتھوں بلکہ ناخنوں کی کاریگری کے نتیجے میں بھی تھوڑا بہت کھایا اور ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کا خیال رہے کہ میں نے تو صحیح معنوں میں کھانا شروع بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے

مجھے ایک اور دھچکہ لگا کیونکہ میں نے اسے دیوار سے کیلیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے اور بیڑیاں تلاش کرتے دیکھا۔ اس نے صندق کے سوراخ ڈھانپ کر ان میں کیلیں ٹھونک دیں

"اے میرے خدا" میں نے کہا "تیرے بندوں کو کتنے دکھ اور تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں اور آنسوؤں کی اس وادی میں مسرت کا وقفہ کتنا کم ہوتا ہے! مجھ پر رحم کر! میں نے سوچا تھا کہ میں یہ معمولی سی ترکیب بھوک مٹانے کے لئے استعمال کر لیا کروں گا اور اب خوش اور پُرامید ہو گیا تھا۔ لیکن میری بدقسمتی کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اس نے میرے خسیس آقا کو خبر کر دیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گیا۔ کنجوس ہر معاملے میں چالاک تو ہوتے ہیں۔ اب جو یہ صندوق کے سوراخ بند کر رہا ہے تو گویا میری تسکین کا دروازہ بند کر رہا ہے اور میرے رنج و محن کا در کھول رہا ہے۔

میں اس طرح خود بخود ماتم کرتا رہا اور وہ فرض شناس بڑھئی کیلوں اور لکڑی کے ٹکڑوں سے اپنا کام کرتا رہا اس نے کہنا شروع کیا "میرے ننھے چالاک کترنے والے دوستو اب تمہیں اپنا طریقہ بدلنا پڑے گا۔ کیونکہ اس گھر میں تم کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے"

اس کے باہر جاتے ہی میں یہ دیکھنے کے لئے بڑھا کہ اس نے کیا کر ڈالا۔ اس نے اس پرانے گھسیا صندوق میں مچھر کے گھسنے کے قابل بھی کوئی چھید نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اپنی اب اس بے مصرف چابی سے صندوق کھولا ان دو تین ڈبل روٹیوں پر نظر ڈالی جن پر میں اپنا عمل شروع کر چکا تھا اور جسے میرا مالک چوہوں کا کام سمجھتا تھا۔ میں نے ایک بڑے ماہر پٹے باز کی طرح انہیں محض چھوتے ہوئے کچھ بھورے نوچ لئے۔ ضرورت بڑی اچھی معلم ہوتی ہے۔ میں رات دن ہمہ وقت یہ سوچتا رہا کہ کس طرح خود کو زندہ رکھوں؟ مجھے یقین ہے کہ مصیبتوں کے ہر علاج کی تلاش میں بھوک مجھے راستہ دکھانے والی روشنی تھی۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، یہ ذہن کو تیز کر دیتی ہے جبکہ بھرا ہوا پیٹ اسے کند کر دیتا ہے۔ کچھ بھی ہو میرے معاملہ میں یہ بات درست تھی۔

ہاں تو ایک رات میں اس سوچ میں جاگ رہا تھا کہ صندوق کیسے کھولوں؟ مجھے اپنے مالک کے سونے کی آواز آ رہی تھی کیونکہ وہ سوتے میں خراٹے اور ہچکیاں لیتا تھا۔ میں بڑی خاموشی سے اٹھا۔ میں دن میں اپنے حملے کے منصوبے پر غور کر چکا تھا اور ایک چاقو جو مجھے ادھر ادھر تلاش کرنے سے ہاتھ آ گیا تھا، ایسی جگہ رکھ چکا تھا جہاں وہ مجھے بآسانی مل جائے۔ میں صندوق کے پاس گیا اور چاقو سے اس کا سب سے کمزور حصہ کاٹنے لگا اور اسے صندوق میں برمے کی طرح گھسیڑ دیا۔ صندوق بہت ہی پرانا تھا اور اس میں کوئی مزاحمت باقی نہ رہی تھی ــ یہ نرم پڑ گیا تھا اور اسے دیمک کھا چکی تھی۔ اس لئے فوراً کٹ گیا اور میں نے اس کے پہلو میں ایک بڑا سوراخ کر دیا تاکہ میری جان بچی رہے۔ اس کے بعد میں نے بڑی آہستگی سے وہ

خستہ صندوق کھولا، روٹی ٹٹولی اور مذکورہ انداز میں اسے کھرچا۔ اس سے مجھے کچھ تسکین ہوگئی۔ صندوق بند کر کے اپنے بچھو کے گٹھے پر آلیٹا اور تھوڑا بہت بڑی بری طرح سویا۔ میں نے اس کا اپنی فاقہ کشی کو الزام دیا۔ اصل وجہ یہی ہے کیونکہ اس وقت مجھے شاہ فرانس کے تفکرات بھی سونا ... سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔

اگلے دن میرے مالک نے صندوق اور ڈبل روٹی دیکھی تو وہ چوہوں کو کوسنے لگا اور بولا:

'یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔ اس گھر میں کبھی چوہے تھے ہی نہیں۔'

مجھے اس کی بات کا یقین نہ کرنے کا کوئی سبب نظر نہیں آتا کیونکہ پورے ملک میں چوہوں سے محفوظ رہنے کا حق اگر کو تھا تو وہی تھا اس لئے کہ وہ کسی ایسی جگہ نہیں پہنچتے جہاں کھانے کو نہ ہو۔ اس نے دوبارہ گھر میں کیلیں تلاش کیں سے لکڑی کے ٹکڑے نکالے اور سوراخ بند کر دیا۔ جب رات ہوئی اور وہ سوگیا تو میں اٹھا اور اس نے دن میں سوراخ بند کئے تھے ان سب کو کھول دیا۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور ہم ایک دوسرے کا اتنی تیزی سے تعاقب کر رہے کہ شاید ہماری ہی وجہ سے یہ محاورہ اختراع ہوا ہو کہ 'جب ایک سوراخ بند ہو جائے تو دوسرا کھل جا' انجام یہ ہوا کہ ہم دونوں پینیلوپ اور اس کی بُنائی کے انداز کی تقلید میں لگے ہوئے تھے کیونکہ وہ دن میں جو کر میں رات کو چاک کر دیتا۔ چند روز میں بیچارے کھانے کے صندوق کی یہ حالت ہوگئی کہ اگر آپ اس کی تعریف بیان چاہتے تو اس کے سوراخوں اور مرمتوں کی وجہ سے صندوق کے بجائے پرانی وضع کے زنجیروں کے جوشن کا جوڑ اسے

جب اس نے دیکھا کہ اس کی جاں فشانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو ایک دن کہنے لگا:

'یہ صندوق اتنا خراب اور اس کی لکڑی اتنی پرانی ہوگئی ہے کہ اس میں چوہا بڑی آسانی سے گھس سکتا ہے۔ معاملہ یونہی چلتا رہا تو ہمارے پاس ڈبل روٹی رکھنے کی جگہ نہیں رہے گی۔ تب ہم سچ مچ مشکل میں پھنس جائیں۔ کیونکہ نیا صندوق خریدنے کے لئے خواہ وہ کم استعمال ہی کیوں نہ ہو، ہمیں تین یا چار ریال خرچ کرنے پڑیں گے۔ اب تک میری کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ اس لئے اب چوہوں سے اندر گھس کر ہی جنگ کی جائے۔'

وہ ایک چوہے دان لے آیا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مانگے کا تھا۔ پھر اس نے پڑوسیوں سے پنیر مانگی اور اسے چوہے دان میں چارا لگا کر صندوق میں رکھ دیا۔ اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ اگرچہ مجھے ڈبل روٹی اتارنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی مگر پھر بھی چوہے دان سے پنیر نکال کر کھانے میں بڑا مزا آتا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ 'چوہے' اب بھی ڈبل روٹی کھا جاتے۔

جب اسے روٹی کتری ہوئی اور پنیر کھائی ہوئی ملی اور چوہا نہ پھنسا تو وہ بڑے زوروں میں کوسنے بیٹھے پڑوسیوں سے پوچھنے لگا کہ آخر وہ کونسی چیز ہو سکتی ہے جو پنیر بھی کھائے اور چوہے دان سے باہر بھی نکل سب پڑوسی اس پر متفق تھے کہ یہ چوہا تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ کم از کم ایک بار تو چوہے دان میں پھنستا۔

'مجھے یاد ہے' ایک پڑوسی بولا کہ تمہارے گھر میں ایک سانپ تھا اور یہ نقصان پہنچانے والا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ وہی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ لمبا ہوتا ہے اور چار سے تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر یہ کہ اگرچہ ہے وان کا منہ بند ہو جائے تو بھی وہ بڑی آسانی سے باہر نکل سکتا ہے کیونکہ وہ پوری طرح سے پھنس نہیں سکتا۔

سب لوگوں کو اس کی بات کا پوری طرح یقین آگیا اور میرا مالک تو بہت ہی ڈرا۔ اس کے بعد وہ کبھی ویسی گہری نیند نہ سو سکا۔ اگر اسے رات کو کٹڑی میں کیڑا رینگتا ہو ابھی سنائی دیتا تو اسے یہ گمان ہو جاتا کہ سانپ اس کے قیمتی صندوق کو کتر رہا ہے۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوتا، لکڑی اٹھا کر جو اس نے سانپ کا ذکر سن کر بستر کے قریب رکھنی شروع کر دی تھی، اسے مزا چکھانے چل پڑتا۔ وہ اپنے شور و غل سے پڑوسیوں کو اٹھا دیتا، اور میری نیند میں بھی خلل ڈال دیتا۔ وہ میرے بھوسے کے ڈھیر پر آ کر اسے اور مجھے دونوں کو الٹنے پلٹنے لگتا۔ وہ سوچتا کہ سانپ وہاں آکر بھوسے یا میرے کوٹ میں آکر دبک گیا ہے کیونکہ لوگوں نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ ایسے حشرات الارض کو رات میں سردی لگتی ہے، وہ گرم جگہوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور اکثر چور کی چارپائیوں میں گھس کر انہیں ڈس لیتے ہیں جس سے وہ تقریباً مردہ ہو جاتے ہیں۔ ساکتر میں کر کے بڑبڑاتا رہتا اور صبح وہ مجھ سے کہتا:

'بیٹے کیا رات کو تم نے کوئی آواز نہیں سنی؟ خیر میں سانپ کو ڈھونڈتا رہا اور مجھے یقین ہے کہ وہ گرمی پانے کے لئے تمہارے بستر میں گھس جاتا ہے کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ ان جانوروں کو بہت سردی لگتی ہے۔'

'اللہ میاں یہ مجھے نہ کاٹ کھائے' میں کہتا 'میں تو پہلے ہی مر جانے کی حد تک خوفزدہ ہوں۔'

یہ معاملہ اسے رات بھر اتنا مشتعل اور بیدار رکھتا کہ سانپ یا وہ جو کچھ بھی تھا اسے رات کو کترنے کی تو کیا صندوق کے قریب جانے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ لیکن دن میں جب پادری گرجا گھر یا شہر میں کسی جگہ چلا جاتا تو میں حملہ کرتا، اس نقصان کو دیکھ کر اسے محسوس ہوتا کہ وہ مجبورِ محض ہے۔ اس لئے وہ رات کو بھوت کی طرح ٹہلتا رہتا۔ میں ڈرا کہ کسی دن تلاشی میں کہیں نہ پکڑی جائے۔ میں اسے اپنے شب خوابی کے بھوسے میں چھپا کر رکھتا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا سب سے محفوظ جگہ میرا منہ ہے اور اسے سوتے وقت اس میں رکھ لیا کروں۔ اندھے کے ساتھ رہنے کی وجہ سے میرا منہ تھیلا ہو گیا تھا کیونکہ اکثر مجھے چودہ پندرہ مرویدی اور وہ بھی نصف بلنک کے سکوں میں اسے رکھنے پڑتے تھے۔ اس کے باوجود وہ میرے کھانے پینے میں رکاوٹ نہیں ڈالتے تھے۔ میرے پاس اس کے علاوہ اس ظالم سے پیچھے ایک بلنک بھی بچانے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کیونکہ میری کوئی جیب یا لباس کا کوئی پیوند ایسا نہیں تھا جس کی وہ باقاعدہ سے تلاشی نہ لیتا ہو۔ ہاں تو جیسا کہ میں کہہ رہا تھا میں چابی منہ میں رکھ اطمینان سے سو جاتا کیونکہ پھر میرے مالک نعبنیہ چھاپوں میں یہ چابی اس کے ہاتھ لگنے کا کھٹکا نہ رہتا۔ اس کے باوجود جب شامت آئی ہو تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

میری بدنصیبی یا شاید میرے گناہوں نے یہ اہتمام کیا کہ ایک رات سوتے میں میرا منہ کھل گیا اور چابی کی وضع کچھ یوں ہو گئی کہ میرا سانس اس کے سوراخ پر سے جو ایک چھوٹی نلکی جیسا تھا گذرنے لگا۔ میں زوروں سے سیٹی بجانے لگا۔ میرا مالک اب بالکل اعصاب زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے جو یہ آواز سنی تو اسے پوری طرح یقین ہو گیا کہ سانپ پھنکار مار رہا ہے۔ یہ آواز معلوم بھی ایسی ہی ہوتی ہو گی۔

وہ چھری ہاتھ میں لئے بڑی خاموشی سے اٹھا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا میرے قریب آیا تاکہ سانپ ڈر کر بھاگ نہ جائے۔ جب وہ میرے قریب آیا تو اسے یقین ہو گیا کہ سانپ بھوسے کے ڈھیر میں چھپا ہوا میرے جسم کی گرمی سے خود کو سینک رہا ہے۔ اس نے چھری کو ہوا میں بلند کیا اور یہ سوچ کر کہ سانپ نیچے چھپا ہوا ہے۔ اور وہ ایک زوردار ہاتھ میں ختم کر ڈالے گا، میری ننگی کھوپڑی پر ایسی ضرب لگائی کہ میں زخمی، خون آلود اور بیہوش پڑا رہ گیا۔

اس غیر متوقع چوٹ پر میری جو زوردار چیخ نکلی تھی اس سے اس کو اندازہ ہوا کہ اس نے مارا مجھے تھا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ قریب آ کر مجھے ہوش میں لانے کے لئے میرے کان میں چیخا چلایا۔ لیکن جب اس نے مجھے چھوا تو معلوم ہوا کہ میں تو خون میں لت پت ہو رہا تھا اور اس نے مجھے خوب زور سے مارا تھا تو وہ بھاگ کر روشنی لانے گیا۔ جب وہ پلٹا تو اس نے دیکھا کہ میں کراہ رہا تھا، چابی ابھی تک میرے منہ میں تھی اور آدھی باہر نکلی ہوئی تھی، بالکل اسی طرح جیسے کہ وہ میرے سیٹی بجانے کے دوران رہی ہو گی۔

سانپ کا شکاری چابی کا مصرف نہ سمجھ سکا۔ اس نے اسے میرے منہ سے باہر نکالا اور غور سے جانچا تو بالکل اپنی چابی جیسے دندانے نظر آئے۔ وہ فوراً اسے آزمانے گیا تو اس کے شبہات پورے ہو گئے۔ اس ظالم شکاری نے خود سے کہا ہو گا:

"میں نے اب چوہا اور سانپ پکڑ لیا، جو مجھے ستاتے اور میرا مال اڑاتے رہے۔"

اگلے دو تین دن کیا ہوتا رہا اس کا مجھے ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں کیونکہ میری حالت ویسی ہی تھی جیسی حضرت یونس کی مچھلی کے پیٹ میں۔ میں نے ابھی جو کچھ بیان کیا ہے وہ میرے مالک نے مجھے بڑی تفصیل سے بتایا تھا اور جو چاہتا وہ اسے اکثر یہ قصہ سناتا۔

میں تین دن بعد پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ میں بھوسے پر لیٹا ہوا تھا اور میرے پورے سر پر دوائیں اور مرہم لگا ہوا اور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں ڈر کر بولا:

"یہ سب کیا ہے"؟

اس ظالم پادری نے جواب دیا:

"خدا کی قسم میں نے ان چوہوں اور سانپوں کو مار ڈالا جو مجھے ستایا کرتے تھے!"
تب میں نے خود پر تھوڑی توجہ دی تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔
اسی لمحے ایک بڑھیا آئی جو تھوڑا بہت زخموں کا علاج کرنا جانتی تھی۔ پڑوسیوں نے پٹیاں کھولیں اور
پھر مرہم پٹی کی۔ جب ان لوگوں نے مجھے ہوش میں دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور بولے:
"اسے ہوش آ گیا اس لئے اب یہ ٹھیک ہے۔ اللہ تیرا شکر ہے!"
انہوں نے اس حادثے کا پھر چرچا کیا اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ انہوں نے مجھے کچھ کھانے
لیکن میں فاقے سے نیم مردہ ہو گیا تھا اس لئے مجھے تسکین نہ ہوئی۔ غرض آہستہ آہستہ میں اچھا ہو گیا اور دو دن
میں اٹھ بیٹھا اور خطرے سے باہر ہو گیا۔ لیکن میری فاقہ کشی ختم نہیں ہوئی اس لئے میرا پورا علاج نہ ہوا۔
جس دن میں بستر سے اٹھا اس کے دوسرے دن میرے مقدس آقا نے میرا ہاتھ پکڑ مجھے دروازے
سے باہر کر دیا۔ جب میں گلی میں ہو گیا تو وہ بولا:
"لیزارو آج سے تم خود اپنے مالک ہو۔ کام ڈھونڈو۔ اللہ تمہاری مدد کرے۔ کیونکہ
ایسا سرگرم عمل نوکر نہیں رکھنا چاہتا۔ میرے پاس تمہاری چالاکی کا مقابلہ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔
مجھے یقین آ گیا کہ تم میرے پاس آنے سے قبل ایک اندھے کے نوکر ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتے"
پھر اس نے صلیب کا نشان بنایا گویا مجھ پر شیطان غالب آ گیا تھا، گھر میں گھسا اور دروازہ
بند کر لیا۔

۔۔۔۔۔۔ (باقی آئندہ) ۔۔۔۔

انجمن

کے

دو نئے انتخاب

(۱)

علی جواد زیدی

(۲)

بلراج کومل

ہر انتخاب کی قیمت :- ایک روپیہ

اردو ادب

کے

پرانے فائل

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک

قیمت :- مجلد اکیس روپے فی جلد

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

سید مفضل المتین

"پیام یار" اور کلام امیر مینائی

"مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" کی روشنی میں

حرف آغاز

"میں نے "اردو ادب" شمارہ ۲۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں "پیام یار" کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"پیام یار" اردو ادب کا ایک بہت مشہور پرچہ ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ "گلدستۂ سخن" بلاشبہ ہم عصر شعراء کے سلسلہ میں ایک اہم دستاویزی مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے" (صفحہ ۲۴)

میرے یہاں "معینی کتب خانہ" میں "پیام یار" کے مندرجہ ذیل شمارے ملتے ہیں۔[1]

مئی۔ جون۔ جولائی۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر سنہ ۱۸۸۵ء

مارچ۔ اپریل۔ جون۔ جولائی۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر سنہ ۱۸۸۶ء

جنوری۔ فروری۔ مارچ سنہ ۱۸۸۷ء

اگست۔ اکتوبر سنہ ۱۸۸۸ء

جنوری۔ اگست سنہ ۱۸۸۹ء

جون۔ اگست سنہ ۱۸۹۱ء

اکتوبر۔ اگست۔ جولائی اور۔۔۔ سنہ ۱۸۹۶ء کا مشترکہ شمارہ۔

نیز دو شمارے ایسے ہیں جن کا سرورق غائب ہے اور کوئی ایسی صراحت نہیں ملتی جس کی روشنی میں ماہ و سنہ کا تعین کیا جا سکے۔

مندرجہ بالا بعض شماروں میں "امیر مینائی" کا جو طرحی کلام شائع ہوا ہے وہ اس اہمیت کا حامل ہے کہ اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ چونکہ اس طرح "امیر مینائی" کے کلام کی ابتدائی شکل سے ہی روشناسی نہیں ہوگی، بلکہ کلام میں ترمیم و اضافہ کی کیفیت بھی معلوم ہوگی اور بعض جزئیات کے تعلق سے ماہ و سنہ کا تعین

---

[1] ان شماروں کا تفصیلی تعارف "اردو ادب" شمارہ ۲۔ سنہ ۱۹۶۴ء کرا چکا ہوں۔

ما ہو سکے گا۔

اصل موضوع | "پیام یار" مئی [illegible]ء کے صفحہ (۱) پر (۱۸) اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے

ایسے ملنے یار نہ بھولے کبھی دل شاد رہے	خوب مطلع ہے یہ اللہ کرے یاد رہے۔	شعر نمبر ۱
زعفران زار میں گر دل ناشاد رہے	یہی گریہ یہی نالہ یہی فریاد رہے۔	شعر نمبر ۲
ہوں وہ مقتول مرے قتل کی ایسی ہو خوشی	رقص میں تیغ رہے وجد میں جلاد رہے۔	شعر نمبر ۳
رشک ہے بعد فنا مجھکو فلک سے تو یہ ہے	میں ستم کش نہ رہوں یہ ستم ایجاد رہے۔	شعر نمبر ۴
آنکھیں مر جانے کو کہتی ہیں وہ اب جینے کو!	کہئے وہ حکم رہے کہئے یہ ارشاد رہے۔	شعر نمبر ۵
آشیانے سے مطلب ہے نہ گلشن سے غرض	گھر الٰہی مرے صیاد کا آباد رہے۔	شعر نمبر ۶
بسملوں کی نگہ یاس بری ہوتی ہے	اک ذرا دل کو سنبھالے ہوئے جلاد رہے۔	شعر نمبر ۷
یہ کہوں گا یہ کہوں گا یہ ابھی کہتے ہو!	سامنے انکے بھی جب حضرت دل یاد رہے۔	شعر نمبر ۸
ہوں وہ غم دوست کہ رو رو کے دعا کرتا ہوں	درد کا دل نہ دکھے خاطر غم شاد رہے۔	شعر نمبر ۹
حشر میں عذر کیا کیا ہے بیتا تو رکھو	کہ مبادا تمہیں بھولے تو مجھے یاد رہے۔	شعر نمبر ۱۰
میں اگر غیر کوئی ہوں تو مجھے وہ بھولے	وہ اگر اور کوئی ہو تو مجھے یاد رہے۔	شعر نمبر ۱۱
قتل بے خنجر و شمشیر جو ہو مد نظر	اک ذرا آپ کو کھینچے ہوئے جلاد رہے۔	شعر نمبر ۱۲
طول فرقت سے مرے وصل کے سب بھول گئے	نہ وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ وہ دن یاد رہے۔	شعر نمبر ۱۳
جب کیا ہم نے گلہ اپنی پریشانی کا	زلف جاناں نے کہا ہم بھی تو برباد رہے۔	شعر نمبر ۱۴
لامکاں میں نہ ٹھکانہ نہ مکاں میں وسعت	دل سے نکلے تو کہاں جا کے یہ فریاد رہے۔	شعر نمبر ۱۵
ہجر میں ماہ سے پوچھیں نہ اجل سے ہم کو	نہ اسے یاد رہے ہم نہ اسے یاد رہے۔	شعر نمبر ۱۶
شادی و رنج زمانے میں ہیں توام بیدل	کچھ تو ہو شوخ نہ ہنسی کبھی دم فریاد رہے۔	شعر نمبر ۱۷
کیا عجب بھول گئے ہم جو کلام اپنا امیر	یاد رہنے کے جو قابل نہ ہو کیا یاد رہے۔	شعر نمبر ۱۸

اس غزل کے تمام اشعار "مراۃ الغیب" کی ان دو غزلیات میں ملتے ہیں جو صفحات ۲۶۹ - ۲۷۰ اور ۲۸۱ پر شائع ہوئی ہیں۔

"پیام یار" اور "مراۃ الغیب" کی غزلیات کا فرق یہ ہے :-

ترتیب اشعار کا فرق

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر	وہ مراۃ الغیب کی مطبوعہ پہلی غزل میں شعر نمبر
۴ ہے	۵ ہے
۵ ہے	۷ ہے
۶ ہے	۹ ہے
۷ ہے	۱۰ ہے
۸ ہے	۱۱ ہے
۹ ہے	۱۲ ہے
۱۰ ہے	۱۳ ہے
۱۱ ہے	۱۵ ہے
۱۸ ہے	۱۷ ہے

نوٹ: "پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۸ مقطع ہے اور یہی مقطع "مراۃ الغیب" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۷ کی حیثیت رکھتا ہے

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر	وہ "مراۃ الغیب" کی مطبوعہ دوسری غزل میں شعر نمبر
۱۲ ہے	۲ ہے
۱۳ ہے	۴ ہے
۱۴ ہے	۵ ہے
۱۵ ہے	۸ ہے
۱۶ ہے	۱۰ ہے
۱۷ ہے	۱۳ ہے

مصرعوں میں تبدیلی

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۲ کا پہلا مصرع اس طرح ہے

زعفراں زار میں گر دلِ ناشاد رہے

"مراۃ الغیب" کی مطبوعہ پہلی غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح ہے

زعفراں زار میں بھی گر دلِ ناشاد رہے

معلوم ہوتا ہے "پیام یار" میں "بھی" کا نہ ہونا سہوِ کاتب ہے۔

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱۰ کا پہلا مصرع اس طرح ہے

حشر میں عذر گنہ کیا ہے بتا تو رکھو

"مراۃ الغیب" کی مطبوعہ پہلی غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح پر ہے

حشر میں عذر گنہ کیا ہے جتا تو رکھو

معلوم ہوتا ہے "بتا" کی جگہ "جتا" بعد کی اصلاح ہے

اشعار کا اضافہ "مراۃ الغیب" میں مطبوعہ پہلی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں۔

پھر بہار آئی چلے سوئے چمن دیوانے
کہدو ہر باغ کے دروازے پہ فصّاد رہے

ہم جو پہنچے تو لب گور سے آئی یہ صدا
آئیے آئیے حضرت بہت آزاد رہے

اوس کی تصویر میں اس درجہ نزاکت کا ہو صرف
لوح باقی نہ قلم میں ترے بہزاد رہے

بحر ہستی میں حباب لب دریا کی طرح
ہم رہے کب کہ کہے کوئی کہ برباد رہے

نام ایسا تھا کہ میں دشت جنوں میں نہ ملا
ڈھونڈتے مجھکو مرے سایہ و ہمزاد رہے

اور مراۃ الغیب" میں مطبوعہ دوسری غزل کے مندرجہ ذیل اشعار بھی "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں۔

ایک دل ہجر میں کس کس کے یہ ناشاد رہے
قیس کا داغ کہ اس میں غم فرہاد رہے

دل اون آنکھوں کے تصور سے مرا شاد رہے
قاف پریوں سے جناں حوروں سے آباد رہے

کھینچ گئی یار کی تصویر تو اللہ رے خوشی
ہم بغل دیر تلک مانی و بہزاد رہے

ہم وہ قیدی ہیں جو لکھے وہ خط آزادی
ہے یقیں حرفوں میں شان خط جداد رہے

کون پروانہ یہاں شمع سر طور کا ہے
جلوہ افروز ترا حسن خداداد رہے

واہ رے شوق اسیری کہ دعا کرتا ہوں
منہ دم ذبح سوئے خانۂ صیاد رہے

گھل گیا غم سے اگر تن تو بنا شکل حباب
ہم ہوئے خاک سے پانی بھی تو برباد رہے

کانٹے اولجھیں نہ کہیں جامۂ آزادی میں
دامن اس ڈر سے سمیٹے ہوئے شمشاد رہے

روز جانباز لڑے شوق شہادت میں امیر
کیسے ہنگامے سر کوچۂ جلاد رہے

یکسانیت "پیام یار" میں مطبوعہ غزل کے پہلے تین اشعار کی ترتیب اور "مراۃ الغیب" میں مطبوعہ پہلی غزل سے شروع کے تین اشعار کی ترتیب یکساں ہے اور کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ملتا ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے

مصرع میں "بھی" کا جو فرق ہے وہ واضح کر چکا ہوں ۔

"پیام یار" جون ۱۸۸۶ء کے صفحات (۱) اور (۲) پر (۲۱) اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ غزل شائع ہوئی ہے

نہ سنے دردِ دل مرا نہ سنے	میں کہوں گا سنے وہ یا نہ سنے	شعر نمبر	۱
دل کی یارب وہ دلربا نہ سنے	ایسی حسرت بھری صدا نہ سنے	" "	۲
یوں وہاں چل کہ پاؤں کی آہٹ	پاسباں کیا ہے نقشِ پا نہ سنے	" "	۳
کسی نا آشنا کا کیا شکوہ	آشنا کی جب آشنا نہ سنے	" "	۴
لاکھ دل چپ ہے مرا قصہ	مگر اپنے کبھی سنا د سنے	" "	۵
جو کسی کو بُرا بھلا نہ کہے	وہ کسی سے بُرا بھلا نہ سنے	" "	۶
دل وہاں ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے	کوئی فقرہ جلا بُھنا نہ سنے	" "	۷
خواہش وصل پر وہ شوخی سے	لو بس جانے دو حیا نہ سنے	" "	۸
وائے قسمت جو سب کی سنتا ہے	وہ بھی عاشق کی التجا نہ سنے	" "	۹
دل جو کہتا ہے بے اثر ہے دوا	درد کہتا ہے چُپ! دوا نہ سنے	" "	۱۰
پھول آہستہ توڑ اے گل چیں	دیکھ ظالم کہیں صبا نہ سنے	" "	۱۱
وعدۂ وصل چپ کے چپ کے ہو	غمزہ و عشوہ و ادا نہ سنے	" "	۱۲
حال پھولوں کا جو خزاں نے کیا	کہیں بلبل وہ ماجرا نہ سنے	" "	۱۳
میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو	بُت ہی سُن لیں اگر خدا نہ سنے	" "	۱۴
در در پر دل نثار، دل پر درد	ایسے دیکھے ہیں آشنا نہ سنے	" "	۱۵
نالے میرے سُنے وہ اور تڑپے	میں سناؤں اگر تو کیا نہ سنے	" "	۱۶
بہت اے دل وفا وفا نہ پکار	کہیں وہ دشمنِ وفا نہ سنے	" "	۱۷
میں تو سنتا ہوں تو جو کہتا ہے	اے ستمگر، مگر خدا نہ سنے	" "	۱۸
رات تھوڑی سی حسرتیں بے حد	کیا کرے کیا سنے وہ کیا نہ سنے	" "	۱۹
ناز اٹھواتی ہے قضا مجھ سے	کہیں اُس شوخ کی ادا نہ سنے	" "	۲۰
جو کوئی درد آشنا ہو امیر	ادھر آئے مرا فسانہ سنے	" "	۲۱

یہ ہی غزل "صنم خانہ عشق" کے صفحات (۱۹۸) اور (۱۹۹) پر بھی درج ہے۔ فرق یہ ہے -

مصرعوں میں تبدیلی

"پیام یار" مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۷ کا پہلا مصرع اس طرح ہے ؎

دل وہاں ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے

"صنم خانہ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

دل وہاں ٹھنڈی سانسیں لیتا ہے

معلوم ہوتا ہے "بھرتا" کی جگہ "لیتا" بعد کی اصلاح ہے

"پیام یار" مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۱۲ کا دوسرا مصرع اس طرح ہے ؎

غمزۂ و عشوہ و ادا نہ سنے

اور "صنم خانہ عشق" کی مطبوعہ میں غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

غمزۂ، عشوہ، ادا، حیا نہ سنے

معلوم ہوتا ہے مصرع میں یہ تبدیلی بعد میں کی گئی ہے

یکسانیت

"پیام یار" اور "صنم خانہ عشق" میں اس غزل کے اشعار کی ترتیب و تعداد یکساں ہے -

---

"پیام یار": جولائی ۱۸۸۵ء کے صفحہ (۱) پر (۱۳) اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے

کیا میں اے پردہ نشیں قتل کا خواہاں ہوتا — شرم آتی تجھے خنجر بھی جو عریاں ہوتا — شعر نمبر ۱

رونے والا کوئی ہوتا تو کچھ آنسو پونچھتے — ابر آ کے مری خاک پہ گریاں ہوتا — ،، ،، ۲

داغ ہی دینے کو لیتا کہیں لیتا تو سہی — کوئی بے رحم ہی دل کا مرے خواہاں ہوتا — ،، ،، ۳

ہلکے زخموں نے مزہ کچھ نہ دیا خوب ہوا — مفت ان اوچھوں کا شرمندۂ احساں ہوتا — ،، ،، ۴

لطف تھا دست درازی کا یہ اے دست جنوں — بڑھ کے دامن سے ہم آغوش گریباں ہوتا — ،، ،، ۵

درد اک تھا دل بیمار کا غم خوار قدیم — اب یہ صورت ہے کہ وہ بھی نہیں پرساں ہوتا — ،، ،، ۶

رہ گئی ہائے یہ حسرت کہ نگاہیں نہ ملیں — ورنہ جو دل میں ہے آنکھوں سے نمایاں ہوتا — ،، ،، ۷

ایسے ہنگامے بہت دیکھے ہیں اس کوچے میں — حشر کیا فتنہ تھا جس میں پریشاں ہوتا — ،، ،، ۸

کہہ اٹھا اس لئے منصور انا الحق کہ وہ شوخ — خونِ ناحق سے پسِ قتل پشیماں ہوتا — شعر نمبر ۹
ایک ارمان نکلتا ہے تو سو آتے ہیں — دل عجب گھر ہے کہ ہرگز نہیں ویراں ہوتا — " " ۱۰
پی کے مے حضرتِ واعظ مرے دشمن پچھتائیں — میرے کہنے سے نہ پیتا تو پشیماں ہوتا — " " ۱۱
حیف وہی حور نہیں خلد میں تو داورِ حشر — جھونک دیتا مجھے دوزخ میں تو احساں ہوتا — " " ۱۲
کیا مزہ دیتی ہے رہ رہ کے کھٹک اس کی امیر — دل کے بدلے بھی مرے سینے میں پیکاں ہوتا — " " ۱۳

اس غزل کے تمام تر اشعار (علاوہ شعر نمبر ۷) "صنم خانۂ عشق" کی اس غزل میں ملتے ہیں جو صفحہ ۳۲ پر درج ہے۔ فرق یہ ہے۔

ترتیبِ اشعار کا فرق

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۴ ہے	"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل	شعر نمبر ۱ ہے
" " ۵ ہے	"	" ۶ ہے
" " ۶ ہے	"	" ۴ ہے
" " ۸ ہے	"	" ۱۱ ہے
" " ۹ ہے	"	" ۱۵ ہے
" " ۱۰ ہے	"	" ۱۳ ہے
" " ۱۱ ہے	"	۳ ہے

نوٹ:- "پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱۲ مقطع ہے اور یہی مقطع "صنم خانۂ عشق" غزل میں شعر نمبر ۱۶ کی حیثیت رکھتا ہے

مصرعوں میں تبدیلی:- "پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۵ کا پہلا مصرع اس طرح ہے ؎

لطف تھا دست درازی کا یہ اے دستِ جنوں

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہی مصرع اس طرح پر ہے۔ ؎

لطف تھا دست درازی کا حبیب اے وحشتِ دل

معلوم ہوتا ہے یہ تبدیلی بعد میں کی گئی ہے

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۶ کا پہلا مصرع اس طرح ہے ؎

دردِ اک تھا دلِ بیمار کا غم خوار قدیم

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

دردہی تھا دلِ بیمار کا غم خوار قدیم

معلوم ہوتا ہے "اک" کی "ہی" بعد کی اصلاح ہے۔

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱۱ کا پہلا مصرع اس طرح ہے ؎

پی کے مے حضرتِ واعظ مرے دشمن پچتائیں

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

پی کے واعظ مئے گل گوں مرے دشمن پچتائیں

معلوم ہوتا ہے یہ تبدیلی بعد میں کی گئی ہے۔

اشعار کا اضافہ

"صنم خانۂ عشق" میں مطبوعہ غزل کے مندرجہ ذیل اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں ؎

حلقۂ زلف میں وہ رخ جو جھلک دکھلاتا — جلوہ گر کفر کی آغوش میں ایماں ہوتا

دیکھتے چاہ سے تم پیار سے ہم توشبِ وصل — دل میں جو کچھ تھا سب آنکھوں سے نمایاں ہوتا

بوسہ کیا مجھکو دیا ہے کہ خریدا ہے غلام — اس سے احسان نہ کرتے وہ تو احساں ہوتا

پھوٹ پڑتی نہ اگر شیخ و برہمن میں یہاں — تو نہ کافر کوئی ہوتا نہ مسلماں ہوتا

اور "پیام یار" میں مطبوعہ غزل کا حسب ذیل شعر "صنم خانۂ عشق" میں نہیں ملتا ہے ؎

رہ گئی ہائے یہ حسرت کہ نگاہیں نہ ملیں — ورنہ جو دل میں ہے آنکھوں سے نمایاں ہوتا

یکسانیت :

"پیام یار" میں مطبوعہ غزل کے پہلے ۳ اشعار اور شعر نمبر ۱۲ کی ترتیب اور "صنم خانۂ عشق" میں مطبوعہ غزل کے شروع کے ۳ اشعار اور شعر نمبر ۱۲ کی ترتیب یکساں ہے۔

"پیام یار" - اکتوبر ۱۸۸۶ء کے صفحہ (۱) پر (۱۱) اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے۔

ضبط کرتا دلِ حزیں نہ کہیں	چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں	شعر نمبر ۱
جب تڑپتا ہے دل میں ڈرتا ہوں	چرخ پر جا پڑے زمیں نہ کہیں	" " ۲

مصرع اول	مصرع ثانی	
مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے	آج بجلی گری کہیں نہ کہیں	شعر نمبر ۲
حوریں لپٹی ہیں نزع میں مجھ سے	دیکھ پائے وہ نازنیں نہ کہیں	" " ۴
وصل کی شب نہیں نہیں کیسی	دیکھو سُن لے دلِ حزیں نہ کہیں	" " ۵
دل میں باتیں بھری تھیں کیا کیا کچھ	ہائے کچھ وقتِ واپسیں نہ کہیں	" " ۶
دل سی شے لے کے اب تو نکلے ہیں	پوچھ لے گا کوئی کہیں نہ کہیں	" " ۷
نہ تڑپ اس قدر دلِ بے تاب	سہم جائے وہ نازنیں نہ کہیں	" " ۸
میرے عیسیٰ کے دل میں چبھ جائے	نگہِ وقتِ واپسیں نہ کہیں	" " ۹
چین مُردوں کو قبر میں بھی نہیں	آسماں ہو نہ زمیں نہ کہیں	" " ۱۰
آگ ہو جائے گا وہ شوخ امیر	کھینچنا آہِ آتشیں نہ کہیں	" " ۱۱

یہی غزل مکمل طور پر "صنم خانۂ عشق" کے صفحات ۱۲۵ اور ۱۲۶ پر بھی درج ہے۔

یکسانیت

"پیامِ یار" اور "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزلیات میں بہر طور کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ملتا اور ترتیب و تعدادِ اشعار (وغیرہ) بہر لحاظ دونوں غزلیات یکساں ہیں۔

"پیامِ یار" — جنوری ۱۸۸۶ء کے صفحہ (۱) پر (۹) اشعار پر مشتمل" امیرؔ کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے۔

مصرع اول	مصرع ثانی	
بڑھے کیا ربط یارِ دل ستاں سے	نیا روز اک دل لائیں کہاں سے	شعر نمبر ۱
بگولے خاک سے اٹھتے ہیں اب تک	نہ مر کر بھی دبے ہم آسماں سے	" " ۲
حسیں سب بے وفا ہیں حضرتِ دل	وفادار آپ لائیں گے کہاں سے	" " ۳
ادھر دیکھو حیا کیسی شبِ وصل	اٹھاؤ بھی یہ پردہ درمیاں سے	" " ۴
خزاں کے آتے ہی گل چین و صیّاد	لپٹ کر خوب روئے باغباں سے	" " ۵
نکلتا ہے مرا دم ڈر بجاؤ	خدا حافظ سدھارو تم یہاں سے	" " ۶
کہاں دیر و حرم میں عشق مشرب	یہ لوگ آزاد ہیں قیدِ مکاں سے	" " ۷
خطِ سمت مٹے جبیں تک نہ اے دل	جبیں اٹھے نہ اس کے آستاں سے	" " ۸
امیرؔ اس کو نہ دردِ دل سنایا!	نہ نکلا کام کچھ دل کا زباں سے	" " ۹

اس غزل کے تمام تر اشعار "مراۃ الغیب" کی مطبوعہ اس غزل میں بھی ملتے ہیں ۔ جو صفحات ۳۲۳
اور ۳۲۴ پر درج ہے ۔ فرق یہ ہے ۔

ترتیب اشعار کا فرق

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۶ ہے	وہ "مراۃ الغیب" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۷ ہے
" " " " ۷ ہے	" " ۹ ہے
" " " " ۸ ہے	" " ۱۰ ہے
" " " " ۹ ہے	" " ۱۱ ہے

نوٹ :- "پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۹ مقطع ہے اور یہی مقطع "مراۃ الغیب" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱۱ کی حیثیت رکھتا ہے

مصرعوں میں تبدیلی

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے مطلع کا دوسرا مصرع اس طرح ہے ؎

نیاز و ناز ایک دل لائیں کہاں سے

"مراۃ الغیب کی مطبوعہ غزل میں یہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

نیاز و ناز ایک لائیں کہاں سے

غالباً "دل" کا "مراۃ الغیب" میں نہ ہونا سہو کاتب ہے

اشعار کا اضافہ

"مراۃ الغیب" میں مطبوعہ غزل کے مندرجہ ذیل اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں ۔

جواب یہ بوسۂ لب سے ہے انکار ۔۔۔ کہا تھا وصل کو پھر کس زباں سے
خیال قامت محبوب آیا ۔۔۔ میں جی اٹھا قیامت کے بیاں سے

یکسانیت

"پیام یار" اور "مراۃ الغیب" میں مطبوعہ اس غزل کے شروع کے ۵ اشعار بہر طور یکساں ہیں ۔ مطلع کے دوسرے مصرع میں جو فرق ہے وہ واضح کر چکا ہوں ۔

"پیام یار" ۔ فروری ۱۸۸۶ء کے صفحہ (۱) پر (۱۴) اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے ۔

غبار اس کے لبِ بام تک بلند ہوا	ہوائے تند کا جھونکا مجھے کمند ہوا	شعر نمبر ۱
جہاں کسی کا دُکھا دل میں دردمند ہوا	جلا میں آگ پہ نالاں اگر سپند ہوا	″ ″ ۲
کھلا ہے بابِ اجابت دعا تو کر غافل	درِ کریم سنا ہے کبھی کہ بند ہوا	″ ″ ۳
برنگِ اشکِ ندامت گرا جو آنکھ سے میں	خدا کے سامنے رتبہ مرا بلند ہوا	″ ″ ۴
گلا وہ ہے جو تری تیغ کا ہوا مقبول	جگر وہ ہے جو ترے تیر کو پسند ہوا	″ ″ ۵
کیا وفورِ معاصی نے حوصلے کو یہ پست	کبھی نہ شرم سے دستِ دعا بلند ہوا	″ ″ ۶
یہ دل مرا ہے کہ جس میں خیالِ یار ہے نقش	کبھی سنا ہے کہ عکس آئینے میں بند ہوا	″ ″ ۷
کیا قبول نہ گُل نے مرے گریباں کو	کبھی نہ خار کو دامن مرا پسند ہوا	″ ″ ۸
چھڑک کے آئے وہ زلفِ سیاہ پر افشاں	شبِ وصال ستارہ مرا بلند ہوا	″ ″ ۹
نہ پوچھ الفتِ خالِ سیاہ کا باعث	پسند اپنی ہے مجھکو بھی پسند ہوا	″ ″ ۱۰
برنگِ شمع جلایا یہ سوزِ الفت نے	کہ شعلہ آگ کا سر سے مرے بلند ہوا	″ ″ ۱۱
کھلا جو یار کا جوڑا تو دل کھنچا میرا	بڑھا جو گیسوئے جاناں مجھے کمند ہوا	″ ″ ۱۲
لکھا تھا خط میں جو حال اپنی چشمِ حیراں کا	ہزار بند لفافہ کیا نہ بند ہوا	″ ″ ۱۳

امیر پائے طلب سے توڑ کر بیٹھے
کبھی نہ ہاتھ سوئے اغنیار بلند ہوا ″ ″ ۱۴

اس غزل کے تمام تر اشعار "مراۃ الغیب" کی مطبوعہ اس غزل میں بھی ملتے ہیں صفحات ۵۸ اور ۵۹ پر درج ہے۔ فرق یہ ہے۔

ترتیب اشعار کا فرق

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۹ ہے	وہ "مراۃ الغیب" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱ ہے
″ ″ ۱۰ ہے	″ ″ ۱۱ ہے
″ ۱۱ ہے	″ ″ ۱۴ ہے
″ ″ ۱۲ ہے	″ ″ ۱۵ ہے
″ ″ ۱۳ ہے	″ ″ ۱۶ ہے
″ ″ ۱۴ ہے	″ ″ ۱۷ ہے

نوٹ:۔ "پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱۴ ہے اور یہ ہی مقطع "مراۃ الغیب" کی مطبوعہ غزل میں

شعر نمبر ۱۷ کی حیثیت رکھتا ہے

اشعار کا اضافہ "مراۃ الغیب" میں مطبوعہ غزل کے مندرجہ ذیل اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں :-

تمہاری آنکھ کی دوری نے دل ہر کھینچا نہال تاک کا ریشہ اسے کمند ہوا
کوئی حسین نظر آیا بنا میں عاشق زار جو گرم ناز ہوا میں نیاز مند ہوا
مزہ ملا سگِ جاناں کو استخواں کھا کر ہزار شکر کہ ہدیہ مرا پسند ہوا

یکسانیت

"پیام یار" اور "مراۃ الغیب" میں مطبوعہ غزلیات کے شروع کے (۸) اشعار بہر طور یکساں ہیں -

---

"پیام یار" — اگست ۱۸۸۳ء کے صفحات (۱) اور (۲) پر (۲۳) اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریدار نہیں ہوں — تو سراپا ناز ہے میں ناز بردار نہیں ہوں — شعر نمبر ۱
وصل کیسا تیرے نادیدہ خریدار نہیں ہوں — داوری قسمت کہ اسیر بھی گنہگار نہیں ہوں — " " ۲
ناتوانی سے ہے طاقت ناز اٹھانے کی کہاں — کہہ سکوں کیونکر کہ تیرے ناز بردار نہیں ہوں — " " ۳
وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر — تیغ اٹھا ہر بیگنہ میں بھی گنہگار نہیں ہوں — " " ۴
جان پر صدمہ جگر میں درد دل کا حال زار — گھر کا گھر بیمار کس کس کے پرستار نہیں ہوں — " " ۵
ہائے رے غفلت نہیں ہے آج تک اتنی خبر — کون ہے مطلوب میں کس کے طلبگار نہیں ہوں — " " ۶
حشر میں آنا کہونگا اس سے میں محرومِ وصل — پاکدامن تو ہے میں کیونکر گنہگار نہیں ہوں — " " ۷
وہ مجھے روتا ہے میں روتا ہوں انکی جان کو — دل میرے ماتم میں میں دل کے عزادار نہیں ہوں — " " ۸
صبح سے مطلب ہے گل سے کام کیا جانوں انہیں — میں تمہارے سینہ چاکوں میں دل افگار نہیں ہوں — " " ۹
دل جگر دونوں کی لاشیں ہجر میں ہیں سامنے — میں کبھی اسکے کبھی اسکے عزادار نہیں ہوں — " " ۱۰
بیگناہی کا تو دعوے انکے آگے کیا مجال — ڈرتے ڈرتے منہ سے نکلا میں گنہگار نہیں ہوں — " " ۱۱
میں کسی قالب میں ہوں خالی اسی سے ہیں — رنگ ہوں یا بو ہوں مرجھائے ہوئے یار نہیں ہوں — " " ۱۲
چھیڑ دیکھو میری میت پر جو آئے یہ کہا — تم وفادار نہیں ہو یا میں وفادار نہیں ہوں — " " ۱۳

زاہد وکافی ہے اتنی بات بخشش کے لئے　　اسکو شوقِ مغفرت ہے میں گنہگار و نہیں ہوں　　شعر نمبر ۱۴

شرم وشوخی دونوں گاہک ہیں الٰہی کیا کروں　　ایک جنس بے حقیقت دو خریدار و نہیں ہوں　　" " ۱۵

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ　　اے اسیرانِ قفس میں نو گرفتار و نہیں ہوں　　" " ۱۶

حال زار اپنا دکھا کر اس سے دل نے یہ کہا　　کیوں اسی منہ پر یہ کہتے تھے میں دلدار و نہیں ہوں　　" " ۱۷

بیگناہ ہو نہیں چلا زاہد جو اسکو ڈھونڈنے　　مغفرت بولی ادھر آ میں گنہگار و نہیں ہوں　　" " ۱۸

خال کہتا ہے دکھا کر یار کا حسنِ ملیح　　میں بھی اس سرکار کے ادنیٰ نمکخوار و نہیں ہوں　　" " ۱۹

وقت آرائش پہن کر طوق بولا وہ حسین　　اب وہ آزادی کہاں میں بھی گرفتار و نہیں ہوں　　" " ۲۰

او تجھے او نچے مجرموں کی حشر میں ہوگی پکڑ!　　کون پوچھے گا مجھے میں کن گنہگار و نہیں ہوں　　" " ۲۱

چارہ سازی کس سے چاہیں اب مریض دردِ غم　　کہتے ہیں عیسیٰ کہ میں بھی اسکے بیمار و نہیں ہوں　　" " ۲۲

پھول میں پھولو نہیں ہوں کانٹا ہوں کانٹو نہیں امیر
یار میں یار و نہیں ہوں عیار عیار و نہیں ہوں　　" " ۲۳

اس غزل کے تمام تر اشعار "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ اس غزل میں بھی ملتے ہیں ۔ جو صفحات ۱۲۴ اور ۱۲۵ پر درج ہے ۔ فرق یہ ہے ۔

ترتیب اشعار کا فرق

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر		وہ "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر	
۳	ہے	۲	ہے
۴	ہے	۷	ہے
۷	ہے	۳	ہے
۱۱	ہے	۲۰	ہے
۱۲	ہے	۱۱	ہے
۱۳	ہے	۱۲	ہے
۱۴	ہے	۱۳	ہے
۱۵	ہے	۲۵	ہے
۱۶	ہے	۱۴	ہے
۱۷	ہے	۱۵	ہے
۱۸	ہے	۱۶	ہے

〃	〃 〃 〃 〃 ۱۹ ہے	〃	〃 〃 〃 〃 ۱۶ ہے	
〃	〃 〃 〃 〃 ۲۰ ہے	〃	〃 〃 〃 〃 ۱۴ ہے	
〃	〃 〃 〃 〃 ۲۱ ہے	〃	〃 〃 〃 〃 ۱۸ ہے	
〃	〃 〃 〃 〃 ۲۲ ہے	〃	〃 〃 〃 〃 ۲۱ ہے	

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۲۳ مقطع ہے اور یہ ہی مقطع "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۲۶ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مصرعوں میں تبدیلی

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۷ کا پہلا مصرع اس طرح ہے ؎

حال زار اپنا دکھا کر اس سے دل نے یہ کہا

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

حال زار اپنا دکھا کر دل نے اس سے یوں کہا

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۱۲ کا پہلا مصرع اس طرح ہے ؎

اونچے اونچے مجرموں کی حشر میں ہوگی پکڑ

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح ہے ؎

اونچے اونچے مجرموں کی ہوگی پرسش حشر میں

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۲۲ کا دوسرا مصرع اس طرح ہے ؎

کہتے ہیں عیسیٰ کہ میں بھی اس کے بیماروں میں ہوں

اور "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

کہتے ہیں عیسیٰ کہ میں بھی ان کے بیماروں میں ہوں

اشعار کا اضافہ:۔

"صنم خانۂ عشق" میں مطبوعہ غزل کے یہ اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں۔

پوچھتا ہوں وجہ آزادی تو کہتا ہے یہ سرو ۔۔۔ میں کسی کے قد موزوں کے گرفتاروں میں ہوں

آچکا تھا رحم اس کو سن کے میری بے کسی ۔۔۔ درد ظالم بول اٹھا میں اس کے غمخواروں میں ہوں

سوز فرقت، درد دل، زخم جگر، ناسور چشم ۔۔۔ کچھ نہ پوچھو مبتلا میں کتنے آزاروں میں ہوں

یکسانیت:۔ "پیام یار" اور "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزلیات کے اشعار نمبر ۱-۲-۵-۶-

۸ - ۹ - اور ۱۰ بہر طور یکساں ہیں ۔

"پیام یار" ـــ اکتوبر ۱۸۸۸ء کے صفحات (۱) اور (۲) پر (۲۳) اشعار پر مشتمل امیر کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے :-

غضب ہے اپنے عیبوں کا خیال آئے نہ انساں کو
کیا ہے ترزم عریانی نے خم شمشیر عریاں کو

گلوں سے جا کے میں نے داغ دل اپنے ملائے تھے
نہیں شبنم پسینا آگیا ہے یہ گلستاں کو

لہو رو رو کے آنکھوں سے کچھ ایسے گل کھلائے ہیں
چمن سے دیکھنے آئے ہیں گلچیں میرے زنداں کو

اجل آئے کہیں پیری میں ہیں اس درد سے چھوٹوں
شکستہ حال اب دیکھا نہیں جاتا ہے دنداں کو

میں اوٹھتا ہوں تو کانٹے پاؤں پڑ پڑ کر یہ کہتے ہیں
ابھی بیٹھو کبھی کیوں ویران کرتے ہو بیاباں کو

جب اگلی صحبتیں یاد آتی ہیں یارانِ رفتہ کی
نکل کر گھر سے دیکھ آتا ہوں میں گورِ غریباں کو

سوا اب خاک ہونے کے کوئی حسرت نہیں باقی
کہ مٹی ہوگیا جی دیکھکر گورِ غریباں کو

قیامت سے نہ دو تشبیہ اوسکی چال کو کیونکر
اوٹھا کر راہ میں چلتے ہیں فتنے جسکے داماں کو

تڑپنا جاتا ہوں لذتِ ناوک سے اے قاتل
نہ میں سوفار کو جانوں نہ پہچانوں میں پیکاں کو

گیا میں بزمِ جاناں میں تو بولے وہ سکندر سے
اوٹھاؤ آئینے کو بیٹھے دو میرے حیراں کو

میں اوس پردہ نشیں کی جامہ زیبی کا ہوں دیوانہ
چھپائے رکھتی ہے پردے میں عصمت جسکے داماں کو

میں اک غربت زدہ باقی رہا تھا میں بھی آتا ہوں
مبارکباد ہے آئے کوئی گورِ غریباں کو

پری کو بھی اوترتے یوں نہیں دیکھا ہے شیشے میں
عجب انداز سے تو نے اوتارا دل میں پیکاں کو

نہ جانے دے نگہباں مجھکو زنداں سے نہیں پروا
مری زنجیر کے نالے تو جاتے ہیں بیاباں کو

خیالِ آسودگانِ خاک کا دل سے نہیں جاتا
لئے پھرتا ہوں اپنے ساتھ میں گورِ غریباں کو

جگر کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے تیغ ناز قاتل کی
کسی کے دل میں جا بیٹھوں یہ دھن ہے اسکے پیکاں کو

دبا رکھا ہے اسنے ایک مدت سے گلا میرا
کوئی جھٹکا تو دے اے پنجۂ وحشت گریباں کو

بہت ہی مختصر ہے وصل کی شب کچھ تو بڑھ جائے
مری خاطر سے دم بھر کھول دو زلفِ پریشاں کو

کیا تھا شام کو نالہ تڑپ کر تیرے وحشی نے
ہلایا نالے نے صبح تک دیوارِ زنداں کو

بہت ہے دور پر دستِ جنوں ناصح الگ رہنا
ترا دامن نہ پکڑے چھوڑ کر میرے گریباں کو

میں اب وحشت و مستی ہوں جو میرا دسترس ہوتا
بناتا دھجیاں قاتل کی میں واعظ کے گریباں کو

ملتا ہے یہ مہندی میں تو مہندی رنگ لاتی ہے ‏ ‏ ‏ عزیز اسواسطے رکھتے ہیں وہ خون شہیداں کو
مرے ایسی کہاں قسمت کہ پہنچوں اڑ کے پھولوں تک ‏ ‏ ‏ کبھی جا کے قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو

اس غزل کے تمام تر اشعار "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ ان دو غزلیات پر تقسیم ہو گئے ہیں۔ جو صفحات ۱۴۲ اور ۱۴۳ پر درج ہیں۔ فرق یہ ہے۔

ترتیب اشعار کا فرق :-

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۲ ہے	وہ "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل میں شعر نمبر ۳ ہے
〃 〃 〃 〃 ۳ ہے	〃 〃 〃 〃 ۵ ہے
〃 〃 〃 〃 ۴ ہے	〃 〃 〃 〃 ۶ ہے
〃 〃 〃 〃 ۵ ہے	〃 〃 〃 〃 ۷ ہے
〃 〃 〃 〃 ۶ ہے	〃 〃 〃 〃 ۸ ہے
〃 〃 〃 〃 ۷ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۲ ہے
〃 〃 〃 〃 ۸ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۳ ہے
〃 〃 〃 〃 ۹ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۴ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۰ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۵ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۱ ہے	۱۶ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۲ ہے	وہ "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ دوسری غزل میں شعر نمبر ۲ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۳ ہے	〃 〃 〃 〃 ۸ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۴ ہے	〃 〃 〃 〃 ۴ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۵ ہے	〃 〃 〃 〃 ۷ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۶ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۱ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۷ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۲ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۸ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۳ ہے
〃 〃 〃 〃 ۱۹ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۵ ہے
〃 〃 〃 〃 ۲۰ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۶ ہے
〃 〃 〃 〃 ۲۱ ہے	〃 〃 〃 〃 ۱۸ ہے

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۲۳ مقطع ہے اور یہی مقطع "صنم خانۂ عشق" کی دوسری غزل میں شعر نمبر ۱۰ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مصرعوں میں تبدیلی :-

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۳ کا پہلا مصرع اس طرح ہے

لہو رو رو کے آنکھوں سے یہ ایسے گل کھلائے ہیں

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل میں یہی مصرع اس طرح پر ہے

لہو رو رو کے ان آنکھوں سے ایسے گل کھلائے ہیں

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۸ کا پہلا مصرع اس طرح ہے

اجل آئے کہیں پیری میں، میں اس درد سے چھوٹوں

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل میں یہی مصرع اس طرح پر ہے

اجل آئے کہیں پیری میں، ہم اس درد سے چھوٹیں

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۷ کا پہلا مصرع اس طرح ہے

سو اب خاک ہو کے کوئی حسرت نہیں باقی

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل میں یہی مصرع اس طرح پر ہے

سو اب خاک ہونے کے نہیں حسرت کوئی باقی

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کا شعر نمبر ۱۲ اس طرح ہے

میں وہ بدمست وحشی ہوں جو میرا دسترس ہوتا بناتا ڈانٹ بوتل کی میں واعظ کے گریباں کو

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ دوسری غزل میں یہی شعر اس طرح پر ہے

میں وہ بدمست وحشی ہوں جو میرا دسترس چلتا بناتا بوتلوں کی ڈاٹ واعظ کے گریباں کو !

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۲۲ کا دوسرا مصرع اس طرح ہے

عزیز اسواسطے رکھتے ہیں وہ خون شہیداں کو !

اور "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ دوسری غزل میں یہی مصرع اسطرح پر ہے

پسند اس واسطے کرتے ہیں وہ خونِ شہیداں کو

اشعار کا اضافہ :۔ "صنم خانۂ عشق" میں مطبوعہ پہلی غزل کے حسب ذیل اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں:۔

جو وقت بوسہ ایذا ہو ذرا بھی لعلِ جاناں کو
گہر کی طرح پیسوں توڑ کر میں اپنے دنداں کو

اتارا دل میں آنکھیں دیکھ کر اس شاہِ خوباں کو
جگہ پہلو میں دی پریوں کے لالچ سے سلیماں کو

خدا نے حسن کو تیرے عجب تاثیر بخشی ہے
یہ نعمت دیکھنے سے سیر کر دیتی ہے مہماں کو

تسلی یادِ رخ میں جب کسی صورت نہیں ہوتی
تو بوسہ دے کے آنکھوں سے لگا لیتا ہوں قرآں کو

وہ آنکھیں تاکتی ہیں اور ملتے مژگاں کی دل ہیرا
کہ پریاں جھانکتی ہیں ان جھروکوں سے سلیماں کو

اگر یوں کھٹکے جیسے دل میں وہ مژگاں کھٹکتی ہے
مژہ کی طرح رکھ لوں آنکھ پر خارِ مغیلاں کو

عبث ترکش میں قاتل رکھے رکھے زنگ لگتا ہے
مجھے دے چیر کر پہلو میں رکھ لوں تیرے پیکاں کو

تصور قید میں ہے اے امیر اک بت کی آنکھوں کا
پری خانہ بنا رکھا ہے میں نے اپنے زنداں کو

اور "صنم خانۂ عشق" میں مطبوعہ دوسری غزل کے حسب ذیل اشعار بھی "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں:۔

کریں مجھ سے محبت میں تو کھو کا ہوں محبت کا
اٹھا رکھیں یہ منعم اپنے نعمتہائے الواں کو

میں اسے بت مصحفِ رخ کو ترے چھو کر ہوا ہرا
مسلماں رات دن بوسے دیا کرتے ہیں قرآں کو

ملاحت ناوک افگن کی جو وقت صید یاد آئی
دہانِ زخم نے جو سا مزے لے لیکے پیکاں کو

ان آنکھوں کی نظربازی میں دل کھو گیا میرا
نگاہوں میں اڑا کر لے گئیں پریاں سلیماں کو

بہارِ گل میں کام آئے ترے اے نخچۂ وحشت
لگا رکھا ہے میں نے اسلئے اپنے گریباں کو

ہوائے گل اسے کہتے ہیں اے بلبل کہ جنگل میں
لئے پھرتا ہے ہر طاؤس ساتھ اپنے گلستاں کو

یکسانیت :۔

"پیام یار" اور "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ دوسری غزل کا مطلع بہر طور یکساں ہے

"پیام یار" ۔ اگست ۱۸۸۱ء کے صفحات (۱) اور (۲) پر اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے:۔

صبا کو یہ کیا آج موج آگئی
کہ پھولوں سے تربت مری چھا گئی	شعر نمبر ۱

ادا اسکی کیا ستم ڈھا گئی
قضا کے گلے مجھکو ملوا گئی	" " ۲

جہاں سے مجھے لائی تھی میری عمر
وہیں سیر دکھلا کے پہونچا گئی	" " ۳

صدا اک یہ لیلیٰ سے آئی کہ قیس — مجھے تیری دیوانگی کھا گئی — شعر نمبر ۴

خدا جانے وہ تیغ کیا وقتِ قتل — گلے مل کے بسمل کو سمجھا گئی — 〃 〃 ۵

ستم لذتِ نیستی نے کیا — مجھے میرے ہاتھوں سے مٹوا گئی — 〃 〃 ۶

وہ بیمار ہے کس ہول میں ناتواں — تڑپ آ کے کروٹ بدلوا گئی — 〃 〃 ۷

عدم کا بھی رستہ نہ سیدھا رہا — کہ اس کی کمر آج بل کھا گئی — 〃 〃 ۸

نہ آئے اگر یارِ پیماں شکن — اجل آنے میں تو نہ کترا گئی — 〃 〃 ۹

کھلا آلکا جوڑا تو دشمن کے گھر — اندھیری مرے گھر میں کیوں چھا گئی — 〃 〃 ۱۰

قیامت ہے واعظ اسی تاک میں — ادھر تو نے پی اور ادھر آ گئی — 〃 〃 ۱۱

ہوئی وصل میں بھی نہ خلوت نصیب — جو شوخی ہٹی تو حیا آ گئی — 〃 〃 ۱۲

یہ کیوں غمزہ کرتی ہے عشاق سے — قضا کو کہاں سے ادا آ گئی — 〃 〃 ۱۳

تری طرح کیا وہ بھی ہے سوگوار — ہنسی میرے پھولوں میں کیوں آ گئی — 〃 〃 ۱۴

مرے دل کی اللہ رے ویرانگی — کہ وحشت بھی تنگ آ کے گھبرا گئی — 〃 〃 ۱۵

کہانی مرے درد کی کچھ نہ تھی — مگر ساری مجلس کو نیوا گئی — 〃 〃 ۱۶

قیامت ہیں اے یاس جھونکے ترے — مری شاخِ امید مرجھا گئی — 〃 〃 ۱۷

مرا دل تھا وہ پھول کی پنکھڑی — چمن میں جو کھلتے ہی مرجھا گئی — 〃 〃 ۱۸

نظر تم نے گھونگھٹ اٹھا کر جو کی — عروسِ بہار اور شرما گئی — 〃 〃 ۱۹

نہ تھے تیرے مرنے کے یہ دن نعیم[1] — خدا جانے کس کی نظر کھا گئی — 〃 〃 ۲۰

نئے رنگ کے کھل گئے گل امیر
طبیعت جہاں رنگ پر آ گئی — 〃 〃 ۲۱

اس غزل کے تمام تر اشعار "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ ان دو غزلیات پر تقسیم ہو گئے ہیں۔ جو صفحات ۲۵۴ - ۲۵۵ اور ۲۵۶ پر درج ہیں۔ فرق یہ ہے

---

[1] "پیامِ یار" کے حاشیہ پر تحریر ہے۔ اشارہ ہے حکیم نعیم الزماں خاں صاحب خلف اکبر جناب شیخ وجیہہ الزماں خاں صاحب کی طرف - ۱۲ "صنم خانۂ عشق" کے صفحہ ۲۵۶ کے حاشیہ پر لکھا ہے۔ "جوان مرگی حکیم محمد نعیم الزماں خاں خلف جناب شیخ محمد وحید الزماں خاں مرحوم کی طرف اشارہ ہے - ۱۲

نوٹ: ... حکیم نعیم الزماں خاں کے والد کا نام وجیہہ الزماں تھا یا کہ وحید الزماں — ؟

ترتیب اشعار کا فرق

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۸ ہے	وہ صنم خانۂ عشق کی مطبوعہ پہلی غزل میں شعر نمبر ۱۵ ہے
" " " " ۱۲ ہے	" " " " ۱۳ ہے
" " " " ۱۳ ہے	" " " " ۱۴

"پیام یار" مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۲۱ مقطع ہے اور یہ ہی مقطع "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل میں شعر نمبر ۱۷ کی حیثیت رکھتا ہے۔

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۹ ہے	وہ "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ دوسری غزل میں شعر نمبر ۵ ہے
" " " " ۱۰ ہے	" " " " ۷ ہے
" " " " ۱۱ ہے	" " " " ۸ ہے
" " " " ۱۴ ہے	" " " " ۲ ہے
" " " " ۱۵ ہے	" " " " ۱۲ ہے
" " " " ۱۶ ہے	" " " " ۶ ہے
" " " " ۱۷ ہے	" " " " ۱۱ ہے
" " " " ۱۸ ہے	" " " " ۱۴ ہے
" " " " ۱۹ ہے	" " " " ۱۳ ہے
" " " " ۲۰	" " " " ۱۵ ہے

مصرع میں تبدیلی :-

پیام یار کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۱۵ کا پہلا مصرع اس طرح ہے ؎

میرے دل کی اللہ رے ویرانگی

اور صنم خانۂ عشق کی دوسری غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

مرے دل کی اللہ رے بربادیاں

اشعار کا اضافہ :-

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں۔

مرے عشق کی وجہ ناصح نہ پوچھ ۔ طبیعت ہی تو ہے ادھر آگئی

غضب آگیا حسنِ عشاق پر ۔ جہاں کوئی بھی انھیں آگئی

ذرا اپنی مہندی سے پوچھو تو تم مرے دل میں کیوں آگ بھڑکا گئی
رہا وصل میں بھی میں محروم وصل حیا اسکو پردے میں بٹھلا گئی
بڑی بے وفا عمر رفتہ تھی ہائے مسافر کو رستے میں لٹوا گئی
بلایا تو تھا میں نے تجھکو حیا لپٹ کر ترے ساتھ کیوں آگئی

اور صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ دوسری غزل کے مندرجہ ذیل اشعار بھی "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں۔

وہ صورت تصوّر میں کیا آگئی پری آ کے تصویر کھچوا گئی
نئی چشم ساقی کو موج آگئی مری عمر کا جام چھلکا گئی
کہا جھک کے مینا نے کچھ جام سے تری بات اے دختِ رز آ گئی
پسینے میں کیوں ڈوبی تیغ یار کیا اُس نے عریاں تو شرم آگئی
چھوا رخ کو دل لے کے اس زلف نے وہ قرآں کی جھوٹی قسم کھا گئی
ادھر شرم، ادھر توبہ ٹوٹی امیر شکست آج دونوں طرف آگئی

یکسانیت :-

"پیام یار" اور صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل کے شروع کے ۷ اشعار بہر طور یکساں ہیں۔

پیام یار" — ماہ و سنہ کا پتہ نہیں! کہ صفحات (۱) اور (۲) پر (۲۱) اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے

شعر نمبر ۱
دیکھ کے اِک جھلک جو وہ روپوش ہو گئے کیا کیا خیال خواب فراموش ہو گئے " " ۲
بوسہ جو بیتے دیتے وہ روپوش ہو گئے ہم آتے آتے ہوش میں بے ہوش ہو گئے " " ۳
بیٹھے ہم اُن کے پاس تکلف اُٹھا دیا ہمدوش ہوتے ہوتے ہم آغوش ہو گئے " " ۴
یاد آ گئے مزے جو پسِ مرگ وصل کے تربت کے گوشے حوروں کی آغوش ہو گئے " " ۵
کیا جانے کیا خیال شبِ وصل بندھ گیا باتیں جو کرتے کرتے وہ خاموش ہو گئے " " ۶
ملبوس خاص حسن نے ہم عطا کیا گل کھا کے دستِ یار سے گلپوش ہو گئے " " ۷
یاں وصل و ہجر دونوں ہی میں بے خودی رہی آنے میں غش تو جانے میں وہ ہوش ہو گئے " " ۸
پھیروں ادھر کو رخ، کیا وصل یار میں پریوں سے شوخ اڑ کے مرے ہوش ہو گئے " " ۹
بوسے لئے جو دولت کی مستی میں تو کہا مے پیتے پیتے تم تو بلانوش ہو گئے " " ۱۰

دیکھا جدھر کنکھیوں سے اس مستِ ناز نے — غمزہ پکار اٹھا کہ وہ بے ہوش ہو گئے

دفتر گرا ادھر تو ادھر کاتبِ عمل — تڑپے ہم اس قدر کہ سبکدوش ہو گئے

پہنائیں اس نے کشتوں کو زخموں کی بدھیاں — جو زنگ ہو کے تیغ سے گلپوش ہو گئے

کاندھا ابھی جنازے کو دینا ہے جانِ من — کیا کاٹ کر سر آپ سبکدوش ہو گئے

عاشق موا تو سوگ تمہارے ملا کرے — تم کیوں برنگِ زلف سیہ پوش ہو گئے

سب ذوق شوق ساتھ جوانی کے چل بسے — دو چار دن وہ ولولے وہ جوش ہو گئے

رخصت ہوئے وہ آخرِ شب خاتمہ ہوا — ہم صبح سے بھی پہلے کفن پوش ہو گئے

آئی تھی کس کی شکل خیالی کہ خواب میں — بے ساختہ ہم اس سے ہم آغوش ہو گئے

جن کی جگہ سر آنکھوں پہ تھی دم نکلتے ہی — افسوس کیا وبالِ سر و دوش ہو گئے

آئینے سے لپٹ گئے بے اختیار آج — آپ اپنے عکس سے وہ ہم آغوش ہو گئے

بہکا میں مستِ شوقِ شبِ وصل تو کہا — لو تم تو بے پیے ہوئے مدہوش ہو گئے

افسردہ داغِ دل ہوئے پیری میں کیا امیر — گویا چراغِ صبح کو خاموش ہو گئے

اس غزل کے تمام تر اشعار "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ ان دو غزلیات پر تقسیم ہو گئے ہیں۔ جو صفحات ۲۷۰ اور ۲۷۱ پر درج ہیں۔ فرق یہ ہے۔

ترتیب اشعار کا فرق:۔

"پیامِ یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۳ ہے — وہ "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل میں شعر نمبر ۲ ہے

" " " " ۴ ہے — " " " " ۷ ہے

" " " " ۵ ہے — " " " " ۱۰ ہے

" " " " ۶ ہے — " " " " ۱۱ ہے

" " " " ۷ ہے — " " " " ۱۲ ہے

" " " " ۸ ہے — " " " " ۱۴ ہے

" " " " ۹ ہے — " " " " ۱۳ ہے

" " " " ۱۰ ہے — " " " " ۸ ہے

"پیامِ یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۱۱ ہے وہ "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل کا شعر نمبر ۱۶ ہے
"پیامِ یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۲۱ مقطع ہے اور یہ ہی مقطع "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل میں شعر

نیز اسی حیثیت رکھتا ہے

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر	"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ دوسری غزل کا شعر نمبر
۱۲ ہے	۲ ہے
۱۳ ہے	۳ ہے
۱۴ ہے	۵ ہے
۱۵ ہے	۶ ہے
۱۶ ہے	۷ ہے
۱۷ ہے	۹ ہے
۱۸ ہے	۱۴ ہے
۱۹ ہے	۱۵ ہے
۲۰ ہے	۱۹ ہے

اشعار کا اضافہ :-

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں۔

حرص شراب نے ہمیں بد نام کر دیا — جھٹ کر کے اس بلا کو بلا نوش ہو گئے
لذت سے آشنا جو ہوا دل فراق میں — جتنے چھپے تھے نیش وہ سب نوش ہو گئے
صحبت میں مے کشوں کی نہیں بے سبب یہ دور — ساغر بھی مست بادۂ سر جوش ہو گئے
میں ہوں وہ عندلیب ہوا جب ترانہ سنج — جتنے کھلے تھے گل ہمہ تن گوش ہو گئے
ساقی شراب اور خرابا تیوں کو دے — ہم تیری چشم مست سے مدہوش ہو گئے
ساقی سے اور جام جو مانگا ملا جواب — آنکھیں تو کہہ رہی ہیں کہ مدہوش ہو گئے
مدت سے سر امانت شمشیر یار تھا — ہم ذبح ہو کے خوب سبکدوش ہو گئے

اور "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ دوسری غزل کے مندرجہ ذیل اشعار بھی "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں:-

قاضی بھی محتسب بھی قدح نوش ہو گئے — چھپ چھپ کے دختِ رز سے ہم آغوش ہو گئے
چھپتے کہاں وہ وصل میں لیکن حجاب سے — منہ پر نقاب ڈال کے روپوش ہو گئے
مشاطہ پر چلی جو بناگوش کی سناں — سینہ سپر وہ خال بناگوش ہو گئے
لپٹا میں اٹھ کے عش سے تو بولے وہ ز بیٹے — مطلب کے وقت کیسے بجا ہوش ہو گئے
کہنے لگے جو عاشقِ قدان سے درد دل — اونچا لگے وہ سننے گراں گوش ہو گئے

اس پائے نازنین کا تو رتبہ بلند ہے — لاکھوں کے سر تصدق پاپوش ہو گئے
ان بجلیوں سے دل میں چمکتی ہیں بجلیاں — قندیل کعبہ اب وہ دُرِ گوش ہو گئے
کب تک بغل میں پالے ہوئے دل کو روئیے — خالی یونہیں ہزاروں کے آغوش ہو گئے
ایسے سمائے میری نظر میں شبِ وصال — آنکھوں کی پتلیاں وہ دُرِ گوش ہو گئے
وہ شہسوارِ حسن جو معراج کو چلا — جبریل ساتھ غاشیہ بر دوش ہو گئے
دلدار کا پتہ تھا کہاں ہجر میں امیر — ہم اپنے دل کو لیکے ہم آغوش ہو گئے

یکسانیت :-
"پیام یار" اور "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ پہلی غزل کے شروع کے ۲ اشعار بہر طور یکساں ہیں۔

"پیام یار" — ماہ سنہ کا پتہ نہیں ! کے صفحہ (۱) پر (۸) اشعار پر مشتمل "امیر" کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ہے۔

نہیں ممکن رسائی لامکاں تک — نشاں کس طرح پہنچے بے نشاں تک — شعر نمبر ۱
تری سفاکیاں پہنچیں یہاں تک — کہ ڈرتی ہے حیاتِ جاوداں تک — 〃 〃 ۲
کروں ضبطِ نفس ہمدم کہاں تک — لگی ہے آگ اک دل سے زباں تک — 〃 〃 ۳
پہنچ جائے اگر مجھ سخت جاں تک — تو مانگے موت مرگِ ناگہاں تک — 〃 〃 ۴
میں ہوں وہ ناتواں جب آہ کھینچی — تو ٹھہری سو جگہ دل سے زباں تک — 〃 〃 ۵
کڑی ہے اسقدر منزل عدم کی — کہ مر مر کر پہنچتے ہیں وہاں تک — 〃 〃 ۶
بہار آخر ہے اور میں بے پر و بال — قفس سے ڈال کے پہنچے آشیاں تک — 〃 〃 ۷
میں ہوں اس انجمن میں شمعِ تصویر — کہ سوزِ دل نہیں آتا زباں تک — 〃 〃 ۸
ہزاروں حسرتوں کا ہو گیا خون — کہاں تک پاسِ رسوائی کہاں تک — 〃 〃 ۹
مری واماندگی کہتی ہے مجھ سے — پہنچنا ہو چکا اب کارواں تک — 〃 〃 ۱۰
غش آیا ہے مجھے مسجد میں بے طے — چلو لے کر مجھے پیر مغاں تک — 〃 〃 ۱۱
ترے قربان اے بے تابیٔ دل — مجھے پہنچا دے اُسکے آستاں تک — 〃 〃 ۱۲
مکانِ یار تک قاصد نہ پہنچا — گئے کیونکر پیمبر لامکاں تک — 〃 〃 ۱۳
میں وہ دل سوختہ ہوں اس چمن میں — جلے بجلی جو آئے آشیاں تک — 〃 〃 ۱۴

نہیں کچھ تیغ و قلقل ہی کشیدہ　　خفا ہے ہم سے مرگِ ناگہاں تک　,, ,, ۱۵
نہ پائی گرد نالوں نے اثر کی　　زمیں سے خاک چھائی آسماں تک　,, ,, ۱۶
جو یوں آنے نہ دے اسکی گلی میں　　تو پہنچوں خواب بگر پاسباں تک　,, ,, ۱۷

کہاں ہم اے امیر اور کہاں داغ
یہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک　　شعر نمبر ۱۸

اس غزل کے تمام اشعار "صنم خانۂ عشق" میں مطبوعہ اس غزل میں بھی ملتے ہیں۔ جو صفحات ۱۱۰ اور ۱۱۱ پر درج ہے۔ فرق یہ ہے ۔

ترتیب اشعار کا فرق:-

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں جو شعر نمبر ۱۴ ہے	وہ "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱۵ ہے
,, ,, ,, ,, ۱۵ ہے	,, ,, ,, ,, ۱۶ ہے
,, ,, ,, ,, ۱۶ ہے	,, ,, ,, ,, ۱۷ ہے
,, ,, ,, ,, ۱۷ ہے	,, ,, ,, ,, ۱۸ ہے

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱۸ مقطع ہے اور یہ ہی مقطع "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں شعر نمبر ۱۹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مصرعوں میں تبدیلی

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۱۱ کا پہلا مصرع اسطرح ہے ؎

غش آیا ہے مجھے مسجد میں بے مئے

"صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

غش آیا زاہد و مسجد میں بے مے

"پیام یار" کی مطبوعہ غزل کے شعر نمبر ۱۳ کا پہلا مصرع اسطرح ہے ؎

گئے کیونکر پیمبر لامکاں تک

اور "صنم خانۂ عشق" کی مطبوعہ غزل میں یہ ہی مصرع اس طرح پر ہے ؎

گئے کیسے پیمبر لامکاں تک

اشعار کا اضافہ:-

"صنم خانۂ عشق" میں مطبوعہ غزل کے مندرجہ ذیل اشعار "پیام یار" میں نہیں ملتے ہیں:-

بہت ہی دور ہے وصل کا شوق نزاکت آڑے آ گئی کہاں تک
تڑپنے سے مرے تنگ آ کے بولے تسلی دے کوئی تجھکو کہاں تک

یکسانیت :-

"پیام یار" اور "صنم خانۂ عشق" میں مطبوعہ غزلیات کے اشعار نمبر ۱ تا ۱۰ اور شعر نمبر ۱۲ ہر طور یکساں ہیں۔ اشعار نمبر ۱۱ اور ۱۳ کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں۔ البتہ ان اشعار کے مصرعوں میں جو فرق ہے وہ واضح کر چکا ہوں۔

آخری بات :-

میں نے "پیام یار" کی مطبوعہ ہر غزل کے ساتھ، اشاعت پیام یار کے ماہ و سنہ کی وضاحت کردی ہے۔ علاوہ ان دو غزلیات کے جو ایسے شماروں میں شریک اشاعت ہیں جنکے ماہ سنہ اشاعت کا مجھے علم نہیں ہوسکا ہے۔ اب یہ واضح کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ "صنم خانۂ عشق" ۱۳۱۶ھ مطبوعہ سعید عام" آگرہ" اور "مرآۃ الغیب" ۱۹۰۳ء۔ بار چہارم مطبوعہ نولکشور۔ کانپور، کے نسخہ جات میرے پیشِ نظر رہے ہیں۔

اس اظہار کے بعد یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ "امیر" کی غزلیات ان کے متذکرہ دواوین میں شامل ہونے سے قبل "پیام یار" کے مختلف شماروں میں طبع ہوئیں۔ اس بات کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ یہ تمام غزلیات "پیام یار" کی دی گئی طرح میں کہی گئی ہیں

یہ بات بھی یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ "ترتیب اشعار" اور "مصرعوں میں تبدیلی" کا جو فرق ملتا ہے اور اشعار میں جو اضافہ ہوا ہے وہ "پیام یار" میں اشاعت کے بعد دواوین کی اشاعت سے قبل عمل میں آیا ہے۔

اشعار کے اضافے کے سلسلے میں یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ تمام تر اشعار امیر نے "پیام یار" ہی کے لئے کہے ہوں مگر انتخاب میں وہ اشعار رہ گئے ہوں جنہیں اضافہ کا نام دے رہا ہوں۔ جہاں تک میرے خیال کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں "اضافہ" پیام یار میں اشاعت کے بعد ہی ہوا ہے۔

۱　عباس علی امیں



چاند اترا تھا مرے گھر میں تمنا بن کر　　پھر بھی میں دیکھ نہ پایا اسے لمحہ بن کر

قصۂ دشتِ طلب چھیڑنے والوں سے کہو　　درد کی دھوپ میں تپتے رہے غنچہ بن کر

جب تبسم کی گھٹا اٹھی تو دیکھا ہم نے　　کرب نے پیار سے بوسہ لیا صہبا بن کر

ہم اندھیروں میں بھلا بیٹھے تھے سورج کو مگر　　اس نے خود ذہن کو چمکا دیا رشتہ بن کر

آسماں کی طرح میں جھک گیا قدموں پہ ترے　　پھر بھی تو دیکھتا ہے مجھ کو ثریا بن کر

جو ترے لمس سے محروم ہیں اے بادِ صبا　　کاش ٹپکوں میں انھیں غنچوں پہ قطرہ بن کر

مسکنِ روح پہ آئی ہے کچھ اس طرح بہار　　زخم کے پھول بھی کھلتے ہیں تماشہ بن کر

تو مرے شہر سے جانے کا ارادہ کر لے　　پھیل جاؤں گا میں خود ہی ترا رستہ بن کر

اب تقاضہ ہے یہ بڑھتی ہوئی ظلمت کا امیں
فن کی راہوں پہ بکھر جائیے فردا بن کر

حرمت الاکرام



غم گسارو! کوئی آئے تو پئے چارہ گری — میں ہوں اک عمر سے آشفتۂ بالغ نظری

ناز کرنوں کو ہوا، کوئی گلہ کیا ہوتا — صبح کی مانگ اس انداز سے شبنم نے بھری

جادۂ شب میں لٹے ان کے مسافر کیا کیا! — جانے کس حال میں آئے گی نسیم سحری

خفتہ چشموں کے لئے ایک سے، ظلمت ہو کہ نور — جلوۂ صبح سے جاتی ہے کہیں بے بصری!

تپشِ سینۂ لالہ کا مداوا کیا ہے — مجھ سے یہ پوچھ رہی ہے مرے اشکوں کی تری

کیا کوئی لازمۂ شوق ہے محرومی بھی! — مانگتا ہوں میں دعاؤں کے لئے بے اثری

وسعتِ کون و مکاں دل کو خوش آئے بھی تو کیا — ذوقِ نظارہ کا حاصل ہے پریشاں نظری

اک شرارے کے لئے کتنی چٹانیں توڑیں

نخلِ امید کی دیکھی نہ گئی بے ثمری

یوسف جمال

گم گشتگی

میں با چشمِ نم
گھر کی تاریک دہلیز پر بیٹھا
گھرے اندھیرے کو حسرت سے تکتا ہوں
اور سوچتا ہوں
مرے گھر کی روشن فصیلوں کو کیا ہو گیا ہے ؟
کہاں کھو گئے وہ خوشی کے اُجالے ؟
میں سرشار تھا
روشنی پا کے وہ
بیکراں شفقتوں کی جو پیغامبر تھی
مرے واسطے جو
نقیبِ سحر تھی
وہی روشنی مجھ سے ناراض ہو کر
دھوئیں کی کثیف اور کالی
فضاؤں میں گم ہو گئی ہے
میں با چشمِ نم
گھر کی تاریک دہلیز پر بیٹھا
گھرے اندھیرے کو حسرت سے تکتا ہوں
اور جیسے اک عفریت رقصاں ہے
از خاک تا آسماں
سوچتا ہوں کہ جاؤں کہاں ؟

آفتاب شمسی



دوش پر روح کے یہ جسم کا ڈھونا کیوں ہے
آدمی وقت کے ہاتھوں میں کھلونا کیوں ہے

سب کو معلوم ہے کہا جاتی ہیں آگے سمجھیں
خواب کی نفس کا [illegible] یہ ہونا کیوں ہے

نوکری، خوف اور اخبار ہیں ذہنوں پہ سوار
ہر بڑے شہر کا معمول تکونا کیوں ہے

دیر و مسجد کے کلس پیلے ہیں اور راستے دو
ایک ہی مٹی میں دو قسم کا سونا کیوں ہے

جسم کی قید میں گھبرانے لگا طائر روح
اس کے رہنے کو فقط ایک ہی کونا کیوں ہے

ہنس رہا ہوں میں بڑی دیر سے سب کے ہمراہ
یہ ہنسی سے مری لپٹا ہوا رونا کیوں ہے

سوچی سمجھی ہوئی اسکیم سے کی جاتی ہے قتل
زیست اس عہد میں بھی ڈیسڈی ہونا کیوں ہے

ایمبولینس آئی تھی کچھ پہلے گلی سے کل شام
آخر شب یہ بڑے زور کا رونا کیوں ہے

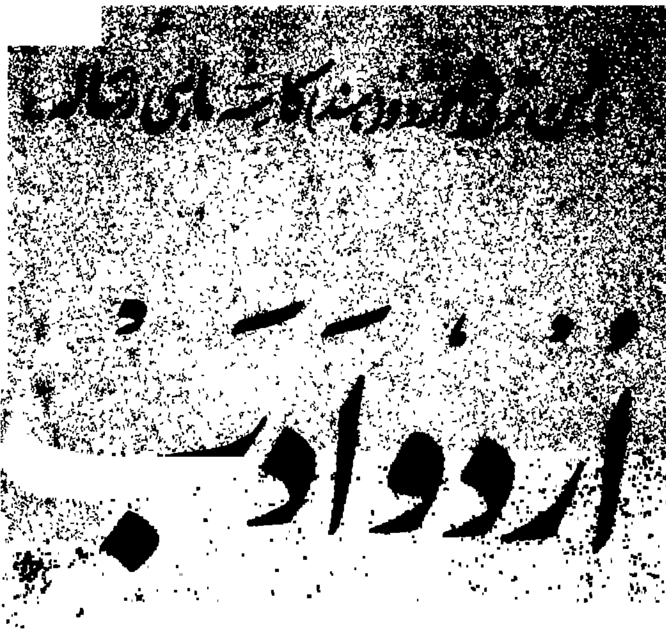
([illegible] خواہ ہوں)

URDU ADAB

(QUARTERLY)

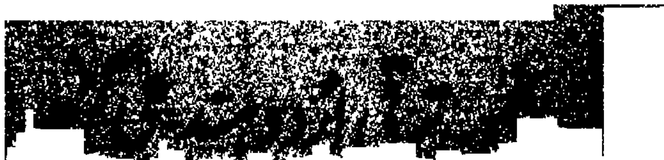
Editor

PROF. A. A. SUROOR



اڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور



۶۱۹ شمارہ (۲)

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

۱۹۷۱ء
شمارہ (۲)

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ	بارہ روپے
قیمت فی پرچہ	تین روپے

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

اردو ادب

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱ -	اردو شاعری میں جذبۂ محبوبیت	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۵
۲ -	سرسید کے نام مشاہیر کے خطوط	اصغر عباس	۴۵
۳ -	مولانا اسماعیل میرٹھی اور نظم جدید	ڈاکٹر سیفی پریمی	۷۷
۴ -	قاعدہ ہندی ریختہ	ڈاکٹر انصار اللہ	۸۵
۵ -	بیسویں صدی کے عشرۂ سوم کے راجستھانی اردو رسالے	مفتوں کوٹوی	۱۳۳

منظومات

۶۔ قبلا خاں۔ (نظم) رحم علی الہاشمی ۱۵۸

۷۔ نمائش گاہ (نظم) حرمت الاکرام ۱۵۹

ڈاکٹر سلام سندیلوی

اردو شاعری میں جذبۂ محبوبیت

کیرن ہارنی نے جذبۂ محبوبیت (A DESIRE TO BE LOVED) کو بھی نرگسیت کے دائرے میں شامل کیا ہے[۱]۔ جذبۂ محبوبیت درحقیقت خودپسندی (VANITY) کی ایک ارتقائی شکل ہے۔ اس جذبے کا تعلق خارجی شخصیت (APPEARING SELF) سے ہے۔ اس کے بارے میں الفریڈ ایڈلر نے اپنے خیالات کا تفصیل کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ خودپسند انسان خود کو ہروقت آراستہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بہت حسین اور قیمتی لباس بھی پہنتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دنیا والے اس کے لباس پر نظر ڈالیں اور اس کی تعریف کریں۔ اگر اس کی تعریف اس کی خواہش کے مطابق نہیں کی جاتی ہے تو وہ دوسروں کو حاسد اور اپنا دشمن قرار دیتا ہے[۲]۔

جذبۂ محبوبیت کا تعلق جسمانی حسن سے ہے۔ اس جذبے کے تحت ایک خودبین انسان اپنے حسن کو دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔ اس کا یہ رجحان براہِ راست یونانی نرگس سے مشابہ ہوتا ہے جو چشمہ کے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر خود اپنے حسن پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ خودبین انسان کو ہر قدم پر اپنے حسن کا احساس ہوتا ہے۔ اگر خودبین شخص جسمانی لحاظ سے واقعی خوبصورت بھی ہے تو اس کی خودبینی میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔

خودبینی اور جذبۂ محبوبی زیادہ تر اس انسان میں پیدا ہوجاتا ہے جو جسمانی لحاظ سے حسین و جمیل ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے۔ بعض اوقات بدشکل انسان بھی خود کو زیادہ سے زیادہ آراستہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بناؤ سنگار میں مصروف رہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بدشکل ہونے کے باوجود

۱۔ 1. New ways in Psycho analysis by Karen Horney P. 88

۲۔ 2. Human understanding by Alfred Adler P. 211

خود کو خوب صورت تصور کرتا ہے۔

خود بیں انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ عورتیں اس کو نازنین سمجھ کر سر و چشم پر جگہ دیں اور اس کی پرستش کریں چاہے اس میں بت و صنم کے جلوے موجود نہ ہوں۔ ایسا شخص کسی عورت کا انتخاب اس کے حسن کے بنا پر نہیں کرتا بلکہ یہ مقصد مد نظر رہتا ہے کہ اس کرایک شائق گرل گیا ہے جس سے اس کی عظمت میں اضافہ ہوگا

نرگسی انسان یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ کوئی عورت اس کے نام سے واقف ہوتے ہوئے بھی کسی دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو کیونکہ وہ خود کو سب سے زیادہ خوبصورت تصور کرتا ہے۔ اس بنا پر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ اس کی محبت میں گرفتار ہو جائیں۔

جذبۂ محبوبیت کی مثالیں شاعری میں زیادہ عام نہیں ہیں۔ خصوصاً اس قسم کی مثالوں کو عربی ادب میں تلاش کرنا فضول ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عرب لوگ جری اور بہادر ہوتے تھے اس لئے وہ خود کو محبوب قرار دینا اپنی ذلت سمجھتے ہوں گے۔ اسی بنا پر ان کے یہاں محبوبیت کی مثالیں مشکل سے ملیں گی۔

عربی شاعری کے مقابلے میں فارسی شاعری میں محبوبیت کی مثالیں کہیں کہیں ملتی ہیں۔ مثال کے لئے عرفی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ عرفی کے یہاں محبوبیت کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ بعض اشعار میں تو عرفی یونانی نرگس معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح نرگس اپنے کو حسین و جمیل سمجھتا تھا اسی طرح عرفی بھی اپنے کو معشوق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

سر بر زدہ ام با مہ کنعان زیک جیب	معشوق تماشا طلب و آئینہ گیرم
می گویم و اندیشہ ندارم ز حریفان	من زہرۂ رامش گر و من بدر منیرم

عرفی خود کو زہرۂ رامش گر اور بدر منیر تصور کرتا ہے۔ اس سے زیادہ محبوبیت کی واضح مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

طالب آملی کے یہاں بھی محبوبیت کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کے مندرجہ ذیل اشعار قابل غور ہیں۔

نگاران لاہور و خوبان دہلی	بدل کردہ پیوند پیوند جانم
یکے چہرہ سودے بہ چشم رکابم	یکے بوسہ دادے بہ زلف عنانم
فشاندے یکے در بغل یاسمینم	نہادے یکے در دہان برگ پانم
غزالان ملتان بہ نیرنگ سازی	کہ بندند از غمزہ دست و دہانم
من از حیلہ چوں نکہت گل گریزاں	کہ خود را بہ جرم ہمایوں رسانم

ان اشعار میں طالب آملی نے بتایا ہے کہ لاہور، دہلی اور ملتان کے معشوقان غمزہ فروش خود اس کے ناز و انداز برداشت کرتے تھے۔ اس کا یہ رجحان بڑی حد تک عرفی کے ناز و انداز سے ملتا ہے۔

اردو شاعری میں بھی جذبۂ محبوبیت کی کہیں کہیں جھلکیاں ملتی ہیں۔ اگرچہ اس قسم کی مثالیں اردو شاعری میں عام نہیں ہیں کیونکہ اردو شعراء نے ہمیشہ اپنی ہستی کو محبوب کے مقابلے میں ہیچ سمجھا ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی جب انھوں نے اپنی ذات کا عرفان کیا ہے تو ان کو اپنی ہستی میں بھی حسن کا جلوہ نظر آیا ہے۔ ایسی صورت میں انھوں نے جذبۂ محبوبیت کا اظہار کیا ہے۔

اردو شاعری میں جذبۂ محبوبیت کی ایک اور شکل نظر آتی ہے۔ ہم ریختی کو بھی اظہار محبوبیت تصور کر سکتے ہیں۔ ریختی ایک ایسی صنعتِ سخن ہے جس میں شاعر خود کو عورت تصور کرکے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ کسی شاعر کا خود کو عورت تصور کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اپنی ذات پر نسوانیت کا اطلاق کرتا ہے

مولوی محمد حسین آزاد نے ریختی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے[1]

"چنانچہ دلی کے فاقہ مستوں میں کم اور لکھنؤ میں قرار واقعی ترقی اس کی ہوئی قطع نظر وضع اور لباس کے جان صاحب کا دیوان اس کا نمونہ موجود ہے۔ اس صورت میں زنانہ مزاجی اور بے ہمتی اور بزدلی جو عام لوگوں میں پیدا ہوئی اس کا ایک محرک اس ایجاد کو سمجھنا چاہئے"[2]

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے بھی ریختی کی مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ "اس میں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشارے ہوتے ہیں"[2] ان کا یہ بھی قول ہے کہ قدیم عہد میں جو ریختی کہی گئی ہے اس پر بھاشا کا اثر ہے۔ اسی لئے قدیم شعراء نے عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ریختی میں فحشیات نہیں ہے۔ لیکن دورِ متوسط میں جب رنگین اور انشا نے ریختی کی طرف سے توجہ کی تو انھوں نے اس کی تخلیق لکھنؤ کے ماحول میں کی۔ اسی لئے اس میں عیاشی اور شہوت پرستی داخل ہو گئی۔

رنگین اور انشا کی ریختی کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ انھوں نے صرف عورتوں کے جذبات ہی نہیں نظم کئے بلکہ عورتوں کی زبان اور محاورات بھی ریختی میں پیش کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریختی ریختہ سے بہت دور پہنچ گئی۔

بہرحال اردو شاعری میں جذبۂ محبوبیت کی جھلکیاں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ اس رجحان کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا رجحان وہ ہے جس کی رو سے بعض شعراء نے خود کو حسین تصور کرکے اپنے کو محبوب قرار دیا ہے یا معشوقانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دوسرا رجحان ریختی کا ہے۔ ایسی صورت میں ایک شاعر نے خود کو عورت تصور کر لیا ہے اور عورتوں کے جذبات کو نمایاں کیا ہے۔ اب آئندہ کی سطور میں جذبۂ محبوبیت کے مختلف پہلو پیش کئے جاتے ہیں۔

---

[1] آبِ حیات مولوی محمد حسین آزاد ص ۳۳۳   [2] تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ ص ۲۰۴

امیر خسرو (۶۵۳ھ - ۷۲۵ھ)

امیر خسرو کی شاعری میں جذبۂ محبوبیت کی ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بعض مقام[1] پر عورت کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی مندرجہ ذیل غزل ملاحظہ فرمائیے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل، ورائے نیناں، بنائے بتیاں	کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ	سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو، بصد فریبم ببرد تسکیں	کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چوں شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر	نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روزِ وصال دلبر کہ دادما را فریب خسرو	سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مکمل طور سے خسرو کی اس غزل پر ریختی کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔ مگر انہوں نے اس غزل میں "سکھی" اور "پیا" جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جن کا تعلق خاص طور سے عورتوں کی بولی سے ہے۔ یہی وجہ ہے کچھ محققین نے اس کو ریختی کا اولین نمونہ قرار دیا ہے۔ مثلاً درگا پرشاد نادر نے خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم میں لکھا ہے کہ "بعض کے نزدیک اس کا مخترع رحیم معاصر رحمٰن دہلی ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس طریقے کے بانی بھی خسرو ہی تھے۔ اور اس کا قول شاہد خود ان کا کلام معجز بیان ہے۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں[2]

بدیع حسینی نے نادر کی ہم نوائی کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ "امیر خسرو کا ریختہ ہی حقیقت میں ریختی کا اولین نمونہ ہے[3]

دراصل امیر خسرو کی ریختی رنگین انشا اور رجان صاحب کی ریختی سے جدا ہے۔ امیر خسرو نے عورت کی طرف سے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مگر انھوں نے خود کو عورت نہیں تصور کیا ہے۔ مگر رنگین نے اپنی ریختی میں خود کو عورت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح انشا نے بھی ریختی میں خود کو عورت تصور کیا ہے اس کا عملی ثبوت بھی موجود ہے۔ جب نواب سعادت علی خاں نے روزہ رکھا تھا اور کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس وقت انشا دوپٹہ عورتوں کا اوڑھ کر نواب کی حضور میں پہنچ گئے اور ناک پر انگلی رکھ کر بولے۔

---

[1] آبِ حیات مولوی محمد حسین آزاد ص ۹۶ [2] خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم - درگا پرشاد نادر ص ۵ بحوالہ دکھن میں ریختی کا ارتقا - بدیع حسینی ص ۱۴۴ [3] دکھن میں ریختی کا ارتقا - بدیع حسینی ص ۱۴۶

میں ترے صدقے نہ رکھاسے مری پیاری روزہ بعدی رکھدے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

اسی طرح جان صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ مشاعروں میں اصرار پر عورتوں کی طرح دوپٹہ اوڑھ لیتے تھے اور عورتوں ہی کی طرح بھاؤ بتا بتا کر ریختی کے اشعار پڑھتے تھے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ امیر خسرو کی یہ غزل مکمل طور سے ریختی کے ترازو پر پوری نہیں اترتی ہے۔ اس کے باوجود ہم اتنا تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزل میں جذبۂ محبوبیت موجود ہے کیونکہ انھوں نے مرد ہو کر عورت کے جذبات پیش کئے ہیں۔

لطفی (قبل سنہ ۹۰۰ھ)

بدیع حسینی کا قول ہے کہ "موجودہ تحقیق کے بموجب دکن کا پہلا ریختی گو شاعر لطفی ہے"[1] مگر انھوں نے لطفی کا عہد متعین نہیں کیا ہے۔ انھوں نے سخاوت مرزا کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ سلطنت بہمنی کے آخری دور کا شاعر ہے اور مشتاق کا ہم عصر ہے۔ مگر ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنی تحقیق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ سلطان ابراہیم شاہ ثانی کے عہد کا شاعر ہے۔ اس بادشاہ کا دورِ حکومت ۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ رہا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے قول سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں موجود تھا۔ تاہم اس کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ بہرحال اگر ہم لطفی کو بہمنی سلطنت کے آخری دور کا شاعر تسلیم کر لیں تو ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ ۹۰۰ھ سے قبل موجود تھے۔ اس لحاظ سے وہ محمد قلی قطب شاہ سے قبل کے شاعر قرار پائیں گے۔

لطفی کی ایک غزل کا سراغ مل سکا ہے جس کو ہم ریختی تصور کر سکتے ہیں۔ اس میں جذبات کا اظہار عورت کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں عورتوں کا ایک محاورہ بھی موجود ہے۔ عورتیں زیادہ تر "آگ لگے" جھنجھلاہٹ میں بولتی ہیں۔ لطفی نے اپنی ریختی میں "آگ لاؤ" نظم کیا ہے۔

لطفی کی ریختی کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

خلوت سے سجن کے میں موم کی بتی ہوں	یک پاؤں پہ کھڑی ہوں، ملنے پرت پتی ہوں
سٹ کے ملن کاتی ہر نس جلن کوں آتی	سب قد کھڑا جلاتی، پن آہ نیئں کتی ہوں
جلتی کوں ناجلاؤ تجنے کوں آگ لاؤ	بوجوں تو پھر جلاؤ نا یک رتی رتی ہوں
میں مست ہوں سجن کی سد بدلٹی ہوں تن کی	اپ عشق کے مدن کی مغرور بولتی ہوں
رسیا چتر رسیلے، بھوگی سو شاہ محمد	مند سے سجن کی بس جاگتی رتی ہوں
لطفی ترے جلن کی پاکی کہاں ہے اس میں	جیوں پایا پنج پانڈواں کے کتنے سو دھرتی ہوں

لطفی کی یہ ریختی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں جذبۂ محبوبیت موجود تھا۔ اس لئے ہم ان کو

[1] دکن میں ریختی کا ارتقا۔ بدیع حسینی۔ ص ۵۵
۱۰۶ ، ۲

مگر کسی شاعر قرار دے سکتے ہیں۔

شہباز حسینی، وفات ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء

ڈاکٹر زور کی تحقیق کے مطابق شہباز حسینی بہمنی دور کے شاعر تھے اور خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے۔ شہباز کی بھی ایک ریختی کا سراغ ملا ہے۔ اس ریختی میں عورت کی طرف سے جذباتِ عشق کا اظہار کیا گیا ہے مگر اس ریختی میں کچھ تصوف کی بھی جھلک ہے۔ کیونکہ شہباز ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان کی ریختی کی غزل درج ذیل ہے۔

سوتے نہ دلوں خلق کو شہباز انس دن رو ئے کر
سوتے سنے پر کوں مرے مت کوئی دیکھے سٹ کر

سوناریاں سینارکیاں کے لاک لیلیٰ سارکیاں
عاشق تری دیدار کیاں مجنوں نہ شیدا ہوئے کر

پھوتاں سنگھاسن سوں کروں ہلکھا اوپر پنچھے دھروں
دن رات شہ کوں دیکھ روں دونین پتلیاں کھوئے کر

جیوبات شہ سوں نا ملوں، اس باج جیو تیں تلملاں
اپ آہ کی آگ میں جلوں انس بجاولی رو سے کر [1]

شہباز نے اس ریختی میں نسوانی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس قسم کے جذبات کا اظہار کچھ نہ کچھ شاعر کے تحت الشعور کا سراغ لگانے میں مدد دیتا ہے۔ اس ریختی کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہباز نے اپنے جذبۂ محبوبیت کو نمایاں کیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ، (دورِ حکومت ۹۸۸ھ - ۱۰۲۰ء)

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں بھی جذبۂ محبوبیت کی جھلک موجود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک سچا عاشق ہے۔ وہ اپنی پیاریوں پر جان چھڑکتا ہے اور ان پر ہر وقت فدا رہتا ہے مگر چونکہ وہ ایک بادشاہ ہے اس لئے اُس کی پیاریاں بھی اُس کی شیدائی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی محبت کا جواب پیار پاتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کو اس پر ناز ہے۔ وہ محبت کے معاملہ میں اس قدر نازاں ہے کہ بعض وقت خود کو بھی محبوب تصور کرنے لگتا ہے۔ اس کی محبوبیت کی واضح مثال اُس کی ریختی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کے کچھ اشعار "ریختی" کے عنوان سے درج کئے ہیں۔ اگرچہ اُس نے اِس صنف کو باقاعدہ اپنایا نہیں ہے مگر اُس کے کلیات میں ریختی بھی موجود ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی ریختی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے عورتوں کے جذبات کا اظہار کیا ہے

---

[1] دکن میں ریختی کا ارتقاء، بدیع حسینی - ص ۱۸۲

جس کو ہم جذبہ محبوبیت بھی کہہ سکتے ہیں۔
محمد قلی قطب شاہ کی ریختی کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

سنو ایک دو بات صاحب ہماری — سہیلیاں چتر میں ہوں بندی تمہاری
کہو بات کن سات کیتے من میں باتاں — کہ چوتا ہے تم نین تھے رنگ خماری

پیا میں ہوں سیوے کی بندی تماری — رکھو دشت منج پر کہ میں تم پہ واری
مرے نازنین ہت میں مہندی نگارے — سہیلیاں منے میں ہوں پیو کی پیاری [۱]

افضل پانی پتی (وفات ۱۰۲۵ھ) | افضل پانی پتی نے "بکٹ کہانی"[۲] لکھی ہے جس کو بارہ ماسہ بھی کہتے ہیں۔ اس میں اس نے ایک مجبور عورت کے جذبات کی عکاسی کی ہے جو اپنے شوہر یا عاشق سے جدا ہے۔ اس کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی — ہوئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی

افضل نے "سکھیو" کا لفظ اس شعر میں استعمال کیا ہے۔ ایک عورت اپنی سہیلی کو سکھی کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افضل ایک عورت کے جذبات کی تصویرکشی کر رہے ہیں۔ یہ فرقت زدہ عورت ساون کے مہینے میں اپنے دل کی کیفیت یوں بیان کرتی ہے

چڑھا ساون بجا مارو نقارا — سجن بن کون ہے ساتھی ہمارا
گھٹا کاری چہاروں اور چھائی — برہ کی فوج نے کینی چڑھائی
پپیہا پیو پیو نس دن پکارے — پکارے دادر و جھینگر جھنکارے

پھاگن کے مہینے میں اس عورت کے جذبات فراق ملاحظہ فرمائیے۔

گیا جب ماگھ پھاگن ماس آیا — سکھی ہے ہے پیا اس رت نہ آیا
ارے اودھو ستو یہ دکھ نہ ہمی سوں — کہو ٹک جائے پردیسی سجن سوں
سلونی سانوری اور سبز گوری — سبھی کھیلیں پیا اپنے سیں ہوری
پڑی ہے دھوم کہنے میں نہ آوے — حسد کی آگ تن میرا جلاوے [۲]

---

[۱] دیوان محمد قلی قطب شاہ۔ مرتبہ ڈاکٹر زور ص ۶۰ - ۶۱
[۲] بکٹ کہانی۔ افضل پانی پتی مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں

غرضیکہ افضل نے بکٹ کہانی میں عورت کے غم زدہ دل کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ افضل نے خود کو مکمل عورت تسلیم نہیں کیا ہے مگر اس کہانی کے لکھتے وقت انھوں نے کسی نہ کسی حد تک اپنی ذات پر عورت کے جذبات طاری کئے ہوں گے۔ اسی وجہ سے یہ کہانی اس قدر کامیاب ہے چونکہ افضل نے خود کو کسی نہ کسی حد تک عورت تصور کیا ہے۔ اس لئے ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان میں جذبۂ محبوبیت کا کچھ نہ کچھ عنصر موجود ہے جس کو ہم نرگسی رجحان سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

غواصی (وفات قبل ۱۰۶۰ھ) غواصی نے بھی ریختی کی طرف توجہ کی ہے۔ اس کی ریختی غزل کی ہیئت میں بھی ملتی ہے اور نظم کی صورت میں بھی۔ غواصی نے اپنی ریختی میں محبوب کے لئے پیا، پیو، ساجنا سجان، سجن، لال اور یار وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ غواصی کی ریختی کے بارے میں بدیع حسینی نے لکھا ہے

> "غواصی کی ریختی سے اس رجحان کا پتا چلتا ہے کہ بادشاہ کے حضور شاعر خود کو عورت تصور کرتا ہے" [1]

جب غواصی خود کو عورت تصور کرتا ہے تو وہ واضح طور پر اپنے جذبۂ محبوبیت کو نمایاں کرتا ہے غواصی کی ریختی کا نمونہ ہے

سجن بھو چھند سوں منج کوں رجھا گئے کر دھانی میں — رجھا بیتاب کر دل یوں سجا گئے کر نہ جانی میں
ریاں سوں ہات مت چھاتی پہ چوندھ جو بنا اوپر — نو سے چھند نکھاں کے یوں لچھاں گئے کر نہ جانی میں
غواصی شہ جتر سلطان عبداللہ بھوگی سو ا — منج ایسی نار سوں یوں پیغ لگے کر نہ جانی میں [2]

غواصی نے آخری شعر میں خود کو "نار" کہہ کر اپنی معشوقانہ ذہنیت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اس سے ہم اس کو بھی نرگسی شعرا کے زمرہ میں شمار کر سکتے ہیں۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی (۱۰۴۸ھ — ۱۰۸۳ھ) علی عادل شاہ ثانی بادشاہ کے علاوہ اپنے دور کا مستند اور عظیم شاعر بھی تھا۔ اس نے شاہی تخلص اختیار کیا۔ اس کے کلام کا مجموعہ "کلیات شاہی" کے عنوان

---

[1] دکن میں ریختی کا ارتقا۔ بدیع حسینی ص ۲۶۱

[2] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۲۶۳

شائع ہو چکا ہے۔ اس میں چار ریختیاں بھی موجود ہیں مگر ان ریختیوں میں ابتذال کا عیب نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ اس کی ان ریختی میں عورت کی طرف سے اظہار عشق کیا گیا ہے۔ شاہی کی ایک ریختی بطور نمونہ درج ذیل ہے۔

پیو سات سیج رہنا لذت اسے کتے ہیں　　اب رسج پھر رچھانا صنعت اسے کتے ہیں
میں چھاؤں ہوں پیا سنگ لاگی دبی ہوں اُم　　یک تل جدا نہ ہونا دھلت اسے کتے ہیں
چاہو پیا سنگ کئی بھانت کر مدن کے　　سنجوگ ہو رہی ہوں عشرت اسے کتے ہیں
ہوں روں رسن کری ہیں شاہی کا ناؤں لینے　　پھر پھر دو ناؤں لینا راحت اسے کتے ہیں [۱]

اس ریختی میں پیو اور پیا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عورت کی خاص زبان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس لئے اس ریختی میں نسوانی فضا پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاہی بھی جذبہ محبوبیت کا رجحان رکھتے تھے۔

ہاشمی بیجاپوری (وفات ۱۱۰۹ھ)

ہاشمی سلطان علی عادل شاہ ثانی المتخلص شاہی کے درباری شاعر تھے۔ وہ مادر زاد اندھے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ بعد میں چیچک کے مرض کی وجہ سے ان کی بینائی زائل ہو گئی تھی۔ غرضیکہ وہ ایک نابینا شاعر تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کو محل سرا کے اندر آمد و رفت کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاشمی کو محل سرا کی دوشیزاؤں سے چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کا موقع مل گیا۔ اس طرح ان میں نسوانی جذبات کو سمجھنے اور ان کو نظم کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی۔ اس کا امکان ہے کہ اسی بنا پر انھوں نے ریختی کو بہ حیثیت ایک صنف سخن اپنا لیا ہو۔

ہاشمی کی ریختی گوئی کا ایک اور بھی سبب ہو سکتا ہے۔ وہ "نازنین صورت" بھی تھے۔ اس کا ثبوت نصرتی کی ایک ہجو سے ملتا ہے جس نے ایک قصیدہ میں ہاشمی پر چوٹ کی ہے وہ کہتا ہے ؎

کھتا نازنیں صورت زنانہ شعر لیو سر گز　　کہ مشکل ہوئے نمنتے کوں سمجھنا مادہ یا نر ہے

نصرتی نے ہاشمی کو "نازنیں صورت" کہا ہے اور اس کی شاعری پر "زنانہ شعر" کا فقرہ چست کیا ہے۔ یہی نہیں وہ یہاں تک کہتا ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ وہ مادہ ہے یا نر ہے۔ یہ ساری باتیں ہاشمی کو ایک محبوب کے روپ میں پیش کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہاشمی اس قدر ریختی زدہ ہیں کہ انھوں نے مقیدے کے بجائے "مقیدی" بھی کہی ہے۔ جو قواب

---

[۱] دکن میں ریختی کا ارتقاء بدیع حسینی ص ۱۹۶

ذوالفقار علی خاں کی مدح میں ہے۔ ہاشمی کے یہاں ریختی مختلف ہیئت میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً مستزاد ریختی مخمس ریختی، مثنوی ریختی وغیرہ۔

ہاشمی کی شاعری میں ریختی بھرپور طریقے پر ابھری ہے۔ انھوں نے پہلی بار اس ریختی کو جنم دیا ہے جس کو آگے چل کر رنگین، انشا اور جان صاحب نے ترقی دی ہے۔ ہاشمی کی ریختی کا لب و لہجہ زنانہ ہے۔ اسی لئے وہ اپنی غزل کو "زنانی غزل" اور "زنانی بات" کہتے ہیں۔ انھوں نے دکنی ریختی میں پہلی بار "اوئی" کا استعمال کیا ہے۔ جو عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ چنانچہ ہاشمی کہتے ہیں۔

مرا کیا یار چنچل ہے کہتی ہے دیکھو کر جو تو   دسے ہیں ہاشمی عورت ہماری اوئی بولی کوں

چنچل کی نلٹنے کی گود جانے کی الوپ لی ہے   پچھانت نار کی تمنا "زنانی بات" آئی ہے[1]

ہاشمی نے ایک اور شعر میں عورتوں کی زبان کا استعمال کیا ہے۔

ہمارے دل کو کھٹکا ہے موہی کھٹ کھٹ ہنسا تیرا   ہوں نادان ووئی وا کی زنانی ہر غزل پڑنا

"ووئی وا" دکنی عورتوں کی زبان ہے۔ در اصل ہاشمی نے ریختی کو اپنا لیا ہے۔ اسی لئے کچھ محقق کے پورے دیوان کو ریختی تصور کرتے ہیں۔ ہاشمی نے اپنی ریختی میں مرد کے لئے پیا، پیارے، پیو، جانی، سانگاتی، سجن، لال، لالن، بالم، بیری، پیتم، خاوند، سرجن، سر دھنی اور سر کا تاج وغیرہ استعمال کیا ہے۔ وہ عورت کے لئے پیاری، دھن، بالی، بھدو اور دلبر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ریختی میں عورتوں کے نام بھی پائے جاتے ہیں مثلاً انھوں نے آقابی، اچھو بی، اچھی بی، اینا، باڑہ بھوری، بی بی، بی بی، بی بی صاحب، بیگم جاندہ، چاند صاحب، چنبیلی، خورشید، موہری، زلیخا، زہرہ، سوتا بی، شامالی، شکر، فتن، کنڈولی صاحب، لونو، ملالی، سمولی، مہر بانو، ننھی بی، ہروا اور مہربا سلطان وغیرہ کو اپنی ریختی میں جگہ دی ہے۔ ہاشمی کے یہاں زنانہ لباسوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے آنچل، آستین، انگیا، انگیا کی کٹوری، اوڑھنی، پچھوڑی، پشواز، پلو، پھرکا، تہہ بند، چادر، آفتابی چادر، مہتابی چادر، چنڑی، چولی، چیر، ساڑی، سمو سیلا، شال، شروال، شلوار، اخرق، فرغول، قصابی، کمر بند، گھونگھٹ وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کا قول ہاشمی بیجاپوری کے بارے میں ہے کہ "ریختی تکلم کا یہی موجد ہے"[2]

[1] دکن میں ریختی کا ارتقا۔ بدیع حسینی ص ۲۰۵ [2] دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی ص ۱۴۳

اگرچہ اب یہ قول درست نہیں رہا ہے کیونکہ اب سلطان کو دکن کا پہلا ریختی گو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اب بھی باقی ہے کہ اصل ریختی کی بنیاد ہاشمی بیجاپوری نے ہی رکھی ہے۔
ہاشمی کی ریختی کے اشعار کافی تعداد میں بدیع حسینی نے پیش کئے ہیں۔ یہاں چند اشعار بطور نمونہ مزید پیش کئے جاتے ہیں۔

خدا کی مہربانی کی مرے پر لی نظر بٹی ہے — سنگاتی آتے کر آنے یکایک جو جھوٹی ہے
خوشی میں سکے کو کیا بولوں پوچھیو نے ہانک ماری ہیں — ودسے آئی، دوے آئی، ووآئے کر رہی ہے

آئے کر سنگاتی سیج میں جو میں سنوں گی — سر بٹھا کے پھیتے کوں چنڑی توی چینوں گی
نہالی پروں کی ہے تپن ہوتی ہے تو ار جھولی — تازی تو ار منگوا پھر کر پلنگ ___ بنوں گی

سکھی میں خواب میں دیکھی سریجن آئے ہیں جانو — رہا کر پیار سوں مج کوں گلے سوں لائے ہیں جانو
سکھیاں کی لاج سوں اٹھ کر چلی سو میں پرکھ تے — مری شوداد کا دامن پکڑ بلائے ہیں جانو

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے ہاشمی کو بحیثیت ریختی گو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور "مجالس رنگین" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ "عورت کا عشق مرد کے ساتھ دکھاتا تھا" اس تعریف پر نظر رکھ کر ہاشمی دکنی کو ریختی گو کہنا مشکل ہے۔[1]
دراصل ہاشمی نے اپنی ریختی میں نسوانی جذبات کا اظہار کیا ہے اور نسوانی لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے۔ ایسی صورت میں اُس کو ریختی گو کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسی بنا پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہاشمی کی ریختی میں جذبۂ محبوبیت آئینہ کی طرح جھلک رہا ہے۔

ولی گجراتی (۱۰۶۰ھ - ۱۱۱۹ھ)

اگرچہ ولی نے باقاعدہ ریختی کی طرف توجہ نہیں کی مگر انکی بعض شعروں میں عورت کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ چونکہ ولی کا قیام بیجاپور میں بھی رہا ہے اس لئے اس کا امکان ہے کہ انھوں نے ہاشمی بیجاپوری سے تاثرات حاصل کئے ہوں۔
ولی کی ریختی میں زرینہ، کسوت، سنگار، سہیلی، سہاگن، گج گری کا جوڑا اور کریلا دھار

---

[1] مجالس رنگین سعادت یار خاں رنگین مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب - دیباچہ ص ۸

الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو ریختی کی فضا پیدا کرنے میں موئید ثابت ہوتے ہیں۔ ولی کی ریختی کا نمونہ درج ذیل ہے

ترے بن سیج کوں اے ساجن یو گھر اد بار کرنا کیا — اگر تو نہ ایسے سیج کوں تو یوں سنسار کرنا کیا
تمہیں ملنے سوں گر اپنے سہاگن تا کروگے بھر — تو جوڑا گجری کا اور کریلا دھار کرنا کیا

پرت کی جو کنتھا پہنے اسے گھر بار کرنا کیا — ہوئی جوگن جو گئی پی کے اسے سنسار کرنا کیا
نہیں گئی دھرم دھاری جو کے پیتم سوں سمجھا کر — کہ دکھیا کوں بجو ہی سوں اتا بیزار کرنا کیا

ولی نے ان اشعار میں ساجن، جوگن اور پیتم کے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کا تعلق عورتوں کی زبان سے ہے۔ اس لحاظ سے ولی کے یہاں بھی جذبۂ محبوبیت کی جھلک موجود ہے

تاباں (وفات درمیان ۱۱۶۱ھ و ۱۱۶۵ھ)

عبدالحئی تاباں کے یہاں بھی جذبۂ محبوبیت کی جھلک موجود ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بے حد حسین انسان تھے۔ ان کے حسن وجمال کا ذکر مختلف تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ چنانچہ میر، تاباں کی خوبصورتی کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں

"نوجوان بامزہ بود، سید نجیب الطرفین، مولد او شاہجہاں آباد است۔ بسیار خوش فکر و خوبصورت، خوش خلق و پاکیزہ سیرت، معشوق عاشق مزاج۔ تاحال در فرقۂ شعراہم چوں او شاعر خوش ظاہر از مکمن بطون عدم بہ عرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ بود" [۲]

سید فتح علی حسینی گردیزی نے بھی تاباں کے حسن وجمال کی مدح سرائی کی ہے۔ ان کا قول ہے۔

"جوانے بود خوبصورت و خوش سیرت، شمع محفل جا نہا و چراغ بزم دلہا" [۳]

قائم چاندپوری نے تاباں کے حسن کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"خانہ بر انداز محبت عمراں، میر عبدالحئی المتخلص بہ تاباں، جوانے بود در نہایت حسن وجمال ہم صحبت یاران حال۔ باوجود دلیلی منشی مجنوں را آداب محبت آموختے و بہ کمال انجمن آرائی شمع وار داغ بر جگر سوختے" [۴]

تاباں کے حسن پر مصحفی مندرجہ ذیل سطور میں روشنی ڈالتے ہیں۔

---

[۱] کلیات ولی۔ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص ۹۴ [۲] نکات الشعرا میر تقی میر ص ۱۱۴
[۳] تذکرۂ ریختہ گویاں سید فتح علی حسینی گردیزی ص ۴۱ [۴] مخزن نکات۔ قائم چاندپوری ص ۵۰

"میر عبدالحی تاباں کہ قصۂ حسن یوسفیش در چار سوئے مصر دہلی شہرت تمام دارد۔ جوانے بود شیریں شمائل، نہال قامت، رعنائیش در باغ لطافت از شیرۂ جاں ہا پرورش یافتہ و لعبتے بود حورا نژاد کہ لعبت بازی پردۂ نیلگوں آسمان دست صبر چندیں عاشق بیتاب را بیک کرشمہ دل فریبش بر تافتہ۔ طبع موزونش حسن و عشق را یکجا ساختہ و شیرینی گفتارش نمک بر زخم جگر ملیحان چند انداختہ"[1]

غرضیکہ تاباں اپنے عہد کے واقعی یوسف مصر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر دہلی کے باشندے جان چھڑکتے تھے۔ ان کے حسن کے بارے میں مولوی محمد حسین آزاد تحریر فرماتے ہیں۔

"ان کے عہد میں میر عبدالحی تاباں تخلص ایک شریف زادہ حسن و خوبی میں اس قدر شہرۂ آفاق تھا کہ خاص و عام اس کو یوسف ثانی کہتے تھے۔ گوری رنگت پر کالے کالے کپڑے بہت زیب دیتے تھے۔ اس لئے ہمیشہ سیاہ پوشش رہتا تھا"[2]

بادشاہ وقت خود اُن کے دیدار کے مشتاق تھے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں

"اس کے حسن کی یہاں تک شہرت پھیلی کہ بادشاہ کو بھی دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ معلوم ہوا کہ مکان چتلی قبر کے پھاٹک میں ہے اور وہ پچھواڑہ جو کوچۂ مذکور سے بازار لاہوری دروازہ میں کھلتا ہے، اس کے کوٹھے پر نشست ہے۔ زمانہ کی تاثیر اور وقت کے خیالات کو دیکھنا چاہیے کہ بادشاہ خود سوار ہو کر اس راہ سے نکلے۔ انھیں بھی خبر ہو گئی۔ بنے سنورے اور بازار کی طرف مونڈھا بچھا کر آ بیٹھے۔ بادشاہ جب اس مقام پر پہنچے تو اس لئے کہ ٹھہرنے کا ایک بہانہ ہو، وہاں آب حیات مانگا اور پانی پی کر دیکھتے ہوئے چلے گئے۔"[3]

مرزا مظہر جان جاناں بھی تاباں کے حسن پر شیدا تھے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مرزا صاحب بیٹھے ہیں اور ان کی صحبت میں کہ جہاں کبھی وعظ و ارشاد اور کبھی نظم و اشعار کا جلسہ رہتا تھا۔ تاباں بھی حاضر ہیں اور باادب اپنے مرشد کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ حضرت اگرچہ محفل ارشاد کے آداب سے گرمجوشی ظاہر نہ کرتے تھے مگر معلوم ہوتا تھا کہ دیکھتے ہیں اور مارے خوشی کے باغ باغ ہوئے جاتے ہیں۔ تاباں بھی مزاج داں تھے، اشعار اور لطائف نمکین کہتے۔ حضرت سن سن کر خوش ہوتے۔

---

[1] تذکرہ ہندی۔ مصحفی۔ مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۴۷ [2] آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد ص ۱۴۰
[3] آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد ص ۱۴۰

کوئی بات سب کے سامنے کہنی خلاف ادب ہوتی تو جو اہل عقیدت میں ادب کا طریقہ ہے اسی طرح دست بستہ عرض کرتے کہ کچھ اور بھی عرض کیا چاہتا ہوں۔ حضرت مسکرا کر اجازت دیتے۔ وہ کان کے پاس منہ لیجاتے اور چند کلمے چپکے چپکے ایسے گستاخانہ کہتے کہ سوا اس پیارے عزیز کے کوئی نہ کہہ سکتا جیسے بزرگوں کی محبت نے گستاخ کیا ہو۔ بس حضرت مسکرا دیتے اور فرماتے کہ درست ہے پھر اس قسم کی کچھ اور باتیں کہتے پھر آپ فرماتے کہ یہ بالکل درست ہے۔ جب تاباںؔ اپنی جگہ پر آ بیٹھتے تو حضرت خود کہتے کہ ایک بات کا تمہیں خیال نہیں رہا۔ تاباںؔ پھر کان کے پاس منہ لیجاتے اس وقت بھی تیز تر کوئی لطیفہ آپ اپنے حق میں کہتے اور اپنے پیارے عزیز کی ہم زبانی کا لطف حاصل کرتے۔[۱]

غرضیکہ تاباںؔ بے حد حسین و جمیل شخص تھے اگر وہ اپنے حسن پر ناز کرتے اور اپنے کو محبوب تصور کرتے تو بیجا نہ تھا۔ تاباںؔ نے ایک شعر میں خود کو نازک مزاج کہا ہے در اصل نازک مزاجی محبوب کی خصوصیت ہے مگر تاباں نے اس خصوصیت کو اپنی ذات سے وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں

سہے گی مری اس کی کس طرح تاباں　　میں نازک طبیعت ہوں وہ میرزا ہے

مندرجہ ذیل شعر میں تاباںؔ نے اپنی بے دماغی کا اظہار کیا ہے۔ یہ بھی ایک انداز معشوقانہ ہے۔

کہاں دماغ کہ ہر گل کے وصف کو کیجئے　　کسے غرض کہ کرے دردِ بلبلاں اظہار

بہر حال تاباںؔ کے بعض اشعار سے جذبۂ محبوبیت نمایاں ہے اور اس جذبہ کے اظہار میں وہ حق بجانب ہیں

میر یحییٰ عرف عاشق علیخاں عاشقؔ

(وفات قبل سنہ ۱۲۰۰ھ)

عاشقؔ کا وطن برہان پور تھا۔ وہ آصف جاہ اول کے ہمراہ پہلے اورنگ آباد آئے اور اس کے بعد حیدر آباد میں ہو گئے۔ انھوں نے بھی ریختی پر طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی ریختی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے دکنی زبان کے بجائے دہلی کی بیگماتی زبان اختیار کی ہے ان کی ریختی کا نمونہ درج ذیل ہے۔

جانتے ہو کوئی لوگو وہ سلونا کون ہے　　چھریوں کے دل میں جس کا شور وافغاں کون ہے

میں ترے واری دوا جا دیکھ مشکی کا سوار　　زرد چیرا کار چوبی تنگ جامہ کون ہے

---

[۱] آب حیات مولوی محمد حسین آزاد ص ۱۶۱ — ۱۶۲

اوہی چھلسا یوں دھگڑیوں کو سلاؤں سوکنوں　　پوچھتے ہیں کہ ترا عاشق علی خاں کون ہے[1]

اس ریختی میں "ددا" اور "اوہی" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کا تعلق ریختی سے ہے۔ عاشق نے ریختی کہہ کر خود کو معشوق ثابت کر دیا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں جذبۂ محبوبیت موجود ہے۔

قیس (وفات ۱۲۳۰ھ)

قیس نے بھی ریختی کی طرف توجہ کی ہے۔ وہ بھی ایک دکنی شاعر ہیں مگر انھوں نے بھی عاشق کی طرح ریختی میں دہلی کی بیگماتی زبان تکلم کی ہے۔ چونکہ قیس کا زمانہ وہی ہے جو انشا اور رنگین کا ہے اس لئے ان تینوں شعرا کی ریختی کا لب و لہجہ بہت کچھ یکساں ہے۔ قیس نے رنگین اور انشا ہی کی طرح نسوانی جذبات کا اظہار کیا ہے اور نسوانی زبان اختیار کی ہے۔ مثلاً قیس کہتے ہیں۔

کرتی ہے مری جاں پہ کیوں بہتر دوگانہ　　بس سوکھ گئے ہونٹ خدا ٹھہر دوگانا

ددا لاوے ایسا طرح دار جوتا　　جھلاپور کا کوئی دھواں دھار جوتا

کاہے کو پہنوں گی باجی میں تمہاری انگیا　　ایک سے ایک مرے پاس ہے بھاری انگیا

راتوں میں کھار ہانہ جھکولا ازار بند　　باہنی سے بن کے نکلا سنپولا ازار بند

میں کیا کروں گی لے کے تری لال لال اوڑھنی　　لادے ددا ڈوم کو جھلا جھل کی اوڑھنی

قیس نے اپنی ریختی میں عورتوں کی زبان پیش کی ہے اور اس طرح خود کو ایک عورت تصور کر لیا ہے۔ یہ ایک نرگسی رجحان ہے جو ان کے جذبۂ محبوبیت پر روشنی ڈالتا ہے۔

انشا (۱۱۶۹ھ — ۱۲۳۳ء)

انشا ایک شکیل و وجیہہ انسان تھے۔ چونکہ ان کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا اس لئے ان کی شکل و شباہت پر ان کے نسلی اثرات ثبت تھے

مولوی محمد حسین آزاد نے ان کی شکل و شباہت کے بارے میں اس موقع پر ذکر کیا ہے۔ جب وہ مرزا سلیمان شکوہ کے مکان کے قریب لب دریا اشنان کے میلے میں ایک کشمیری پنڈت کا روپ دھار کر بیٹھے تھے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ سید انشا رنگت کے گورے، بدن کے فربہ، صورت کے جامہ زیب سے تھے[2]

[1] [illegible] ۱۲۹
[2] آب حیات مولوی محمد حسین آزاد ص۔ ۲۵۹

چونکہ انشا ایک خوبصورت انسان تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بعض اشعار میں جذبۂ محبوبیت کا اظہار کیا ہے۔
مثلاً ایک مشاعرے میں انشاء نے یہ شعر پڑھا ۔

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم | میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

اس وقت انشاء کی عمر تیس سال کی تھی اور سودا کا عالم پیری تھا۔ سودا بھی مشاعرہ میں موجود تھے
انھوں نے انشا کا یہ شعر سن کر کہا " دریں چہ شک " [۱]
انشا نے اس شعر میں واضح طور پر خود کو نازنیں کہہ دیا ہے اور اس طرح جذبۂ محبوبیت کا اظہار کیا ہے
نازک مزاجی کا تعلق محبوب سے ہے مگر انشا ایک معشوق کی طرح خود کو نازک مزاج بنا کر پیش کرتے
ہیں اور کہتے ہیں

مزاج دیکھ یہ نازک کہ بیٹھ جاتا ہے | ہمارے آئینہ دل پہ رنگ نکہت گل

انشا ایک معشوق کی طرح روٹھ بھی جاتے ہیں ۔

روٹھنے میں وہ لطف ہے انشا | صبح کو روٹھے وہ تو شام کو ہم

انشا کے ان اشعار سے جذبۂ محبوبیت آشکار ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ انشا نے ریختی کے بھی کافی اشعار کہے
ہیں۔ ان اشعار سے بھی ان کے جذبۂ محبوبیت پر روشنی پڑتی ہے۔
ذیل میں ان کی ریختی کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

بن بیٹھے ہیں دولہا دولھن آتو جو ہم تم | تو لاکھ روپئے کا تو بندے سے مہر دوگانہ
اپنا جو جتاتا ہو ہمیں زور نگوڑا | صدقے اسے کر ڈالئے در گور نگوڑا
چبھتی ہے پر تو نوڑی مجھے بھاری انگیا | کوئی سادی سی مرے واسطے لا ری انگیا
تجھے کچھ شرم بھی ہے بیٹھ پرے او کمبخت | تاڑ جائیں گے ارے لوگ ارے او کمبخت
کیا کہیں بات ہم اس موئے کی مستی کی | آج تو اس نے بہت ہم سے زبردستی کی
رات بھر اپنا ترستا ہی رہا جی باجی | اب تو تو بیٹ بھی اٹھو اجی باجی باجی
صدقے آواز کے تیرے، جو پکارا میں نے | تو مجھے شان سے کچھ تو نے کہا جی باجی
ہے سلیقہ تجھے انشا کہ نظر آتی ہے | بادشہزادی ترے سامنے باجی باجی
لے لو اس کوٹھری میں میرے ڈرانے کیلئے | اک عبا اوڑھ کے بن بیٹھی ہیں حاجی باجی

---

[۱] آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد ص ۲۰۹

کر دیا تو نے خفا مجھ سے مرے انشا کو تیری یہ راج کرے شوخ مزاجی باجی

انشا نے غالباً رنگین کی تقلید میں ایک ریختی کہی ہے کیونکہ دونوں کی ریختیوں کی ردیف یکساں ہے انشا فرماتے ہیں۔

چھبتی ہے یہ نگوڑی ململ کی اوڑھنی	لاوے وہی دد ا مجھے ململ کی اوڑھنی
بن سرڑ چھنپے ہوئے تجھے کیا چاہئے بھلا	بوٹے سے قد پہ اس بڑے آنچل کی اوڑھنی
کوکا جی دیکھو میری دوگانا یہ کیا پھبی	پشواز اودی اور جھلاجھل کی اوڑھنی
اس اودی اوڑھنی کی تو گاتی نہ باندھیو	بن جائے گی یہ کوٹھری کاجل کی اوڑھنی
انشا کے سونگھنے کے لئے ان نے بھیج دی :	جالی کی کرتی اور وہی ہلکی اوڑھنی

انشا کی ریختی کا ایک قصہ مولوی محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔

" ایک دن نواب نے روزہ رکھا اور حکم دیا کوئی آنے نہ پائے۔ سید انشا کو ضروری کام تھا یہ پہنچے، پہرے دار نے کہا آج حکم نہیں، آگے آپ مالک ہیں۔ باوجود انتہائے مرحمت یہ بھی مزاج سے ہشیار رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کمر کھول، دستار سر سے بڑھا، قبا اتار ڈالی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح سے اوڑھ کر ایک ناز و انداز کے ساتھ سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جوں ہی ان کی نظر پڑی، آپ انگلی ناک پر دھر کر بولے " ؎

میں تمہارے صدقے نہ رکھا اے مری پیاری روزہ بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے۔ جو کچھ کہنا سننا تھا وہ کہا اور ہنستے کھیلتے چلے آئے۔[1] "

غرضیکہ انشا کی شاعری میں جذبۂ محبوبیت کے دونوں رجحانات ملتے ہیں اس لحاظ سے ہم ان کو ایک نرگسی شاعر قرار دے سکتے ہیں۔

رنگین (سنہ ۱۱۷۰ھ — سنہ ۱۲۵۱ھ) رنگین کی شاعری میں بھی جذبۂ محبوبیت کی جھلک موجود ہے۔ اور یہ جذبہ رنگین کے یہاں بجا طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رنگین بہت حسین و جمیل انسان تھے۔ رنگین کے بارے میں لالہ سری رام لکھتے ہیں "

" آپ وجاہت ذاتی و خاندانی کے باعث جس جمعیت میں جا بیٹھتے تھے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔"[2] ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا قول ہے کہ نہایت عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ چونکہ

---

[1] آب حیات مولوی محمد حسین آزاد ص ۲۵۵ [2] خم خانۂ جاوید جلد سوم - لالہ سری رام ص ۵۳

امیر آدمی تھے، حسین بھی تھے، لہٰذا زندگی عیش و عشرت سے پری وشوں کے جھمگٹے میں گزارتے تھے۔[1] ڈاکٹر صابری کی تحقیق کے مطابق رنگین "مختلف طوائفوں کے عشق میں گرفتار تھے"[2] رنگین نے بذات خود اپنی رنگین مزاجی کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ "مجالس رنگین" میں "مجلس چہلم" میں لکھتے ہیں۔

"در لکھنؤ بندہ را از زمرۂ طوائف حالت عشق بود۔ از پاس خاطر آں از صاحب خانہ او ملاقات داشتم۔ گاہے بہانے دیدن او می رفتم۔"[3]

رنگین نے اپنے عظیم آباد کے عشق کا بھی ذکر "مجلس پنجاہم" میں ذکر کیا ہے۔

"در عظیم آباد از طوائف زنے دل بستگی داشتم، روزے بخانہ او نشستہ بودم خواستم کہ برخیزم رفتن نہ داد، یک بار ایں مطلع خواندم۔

سو مجھ کو جو رخصت تو ابھی ہو کے پھر آؤں ‌ ‌ ‌ جا گھر کو یہ کہہ بیٹھیں صدقے ترے جاؤں

گفت کہ صلاح شعر ہمیں است کہ بروی"[4]

چونکہ رنگین حسین اور عاشق مزاج تھے، اس لئے فطری طور پر ان میں جذبۂ محبوبیت موجود تھا۔ اسی اُنھوں نے ریختی کی طرف خاص توجہ کی۔ ان کی ریختی نے بہت مقبولیت بھی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ وہ مجالس رنگین میں "مجلس پنجاہ و دوم" میں لکھتے ہیں۔

"در عظیم آباد کہ میلہ کھاٹون می شود، در آں تمام مردم وضیع و شریف و زن و مرد در باغہا رفتہ چند روزے مانند و رقص و تماشا می بینند۔ بندہ را کہ از چندیں صاحبان آنجان ربط شدہ بود باہم در سیر کھاٹون بہ باغ یار رفتہ گلگشت می نمودم۔ بہ مکانے کہ نواب شجاع قلی خاں ولد نواب منیر الدولہ نشستہ بودند۔ روبروئے اوشاں امام بخش بھانڈ کہ در شوخی رقص و خواندن آفت زمانہ بود و نقل ہائے عجیب عجیب می کرد۔ بھانڈ مذکور بہ خدمت نواب عرض نمود کہ غزل ریختہا بسیار شنیدہ اند اگر حکم شود ریختی بخوانم فرمودند کہ ریختی چہ معنی دارد؟ عرض کرد کہ رنگین نام شاعرے در شاہجہاں آباد دریں ایام ایجاد کردہ است۔ یعنی بہ زبان بیگمات غزلہا گفتہ ریختی نام نہادہ است۔"

---

[1] تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص ۲۳

[2] سعادت یار خاں رنگین۔ ڈاکٹر صابر علی خاں ص ۹۳

[3] مجالس رنگین، سعادت یار خاں رنگین ص ۴۵

[4] " " " ص ۵۳

ٹیس پڑو میں اٹھی اوہ مری جان گئی   مت ستا مجھ کو دوگانا ترے قربان گئی

اختصاصان کہ دراں تماشا ہمراہ بندہ بودند پرسیدند کہ ایں تصنیف ایشاں است گفتم بلے! یک دیوان گفتہ ام مع قصیدہ و مثنوی وغیرہ و رباعی و قطعہ و مخمس دستہ او۔ بسیار خندیدند۔ القصہ نظر قواب صاحب برما افتاد و طلبیدہ بہ تواضع پیش آمدند و نزد خود جا دادند و از بندہ فرمودند کہ ایں ریختی ایجاد ایشاں است۔ گفتم بلے! امام بخش را طلبیدہ بہ بندہ گفتند کہ کدام غزل ریختی دیگر بخوانید۔ غزل خواندم

مجھ پہ طوفان نہ لے چاہ کا چل دور دوا   جھوٹ سے منہ کا ترے جائے گا اثر نور دوا

ایں غزل تو لیساییدم۔ امام بخش عرض کرد، اعتبار نیست۔ شاید کسے دیگر باشد۔ غزل تازہ ہمیں وقت بگویید۔ فی الفور ایں غزل گفتم۔

مشکل جو آپ کی یاد آتی ہے   تو ابھی روح نکل جاتی ہے

وہ تو ہوتی نہیں ہے کم بخت   بات جو دل کو مرے بھاتی ہے

رنگین نے مجالس رنگین میں عالم نساء بیگم کا ذکر کیا ہے جن کی توجہ ریختی کی طرف تھی۔ رنگین مجلس شصت و دوم میں لکھتے ہیں۔

"بعد آں عرض کردم کہ شخصے از عالم نساء بیگم تخلص دارد، و در مزاج آں شوخی کمال است۔ از روئے چند غزل برائے اصلاح فرستادہ و چند غزل ریختی ازیں جانب طلبیدہ بود۔ بندہ ایں غزل فرستاد۔

ٹیس پڑو میں اٹھی   اوہی مری جان گئی   مت ستا مجھ کو دوگانا ترے قربان گئی

اس غزل کے جواب میں ادھر سے بھی ایک ریختی روانہ کی گئی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

کبھو کہتا ہے تو دل اور کبھی جان گئی   جھوٹی باتیں ہیں مری جاں یہ تری آن گئی

ہیجڑا ان کو ذرا چھوڑ کے مردی پکڑو   پھر یہ بولی ہے کہ اے اوہی مری جان گئی

جی میں کچھ اور نہ لے جائیو واری تیرے   تو تو شاعر ہے بڑا میں تجھے پہچان گئی

تیر کی طرح تری بات مرے جی کو لگی!   تیری رنگینی پر ان شعروں کے قربان گئی

جان بیگم کو تو بس اپنی ہی لونڈی رنگین!   صدقے ہر دم ترے واری ترے قربان گئی

۱؎ مجالس رنگین۔ سعادت یار خاں رنگین   ص ۵۴ - ۵۵

۲؎ ″   ″   ″   ″   ص ۶۹ - ۷۰

رنگین کی مندرجہ ذیل غزل ریختی کی واضح مثال ہے۔

میں تو وہ اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی — باجی مجھے اڑھ دو جھلا جھل کی اوڑھنی!
برسات اس کو کہتے ہیں جی جس بہار میں — سر پہ ہوا کے ہوتی ہے بادل کی اوڑھنی
یہ نیچی لچک کمر کو اری لوگو دوڑیو — کولے تلک جو سر سے اچی ڈھلکی اوڑھنی
بھاری بنت منگا دے کہ رنگین لگاؤں میں — سر پہ مرے ٹھہرتی نہیں ہلکی اوڑھنی[1]

رنگین نے ریختی کے اشعار بہت زیادہ تعداد میں کہے ہیں۔ ان کے چند اشعار ریختی کے اور ملاحظہ فرمایئے۔

مرے گھر میں زنا خی آئی کب — میں نگوڑی بھلا بناٸی کب

چھپ کے مل مجھ سے ڈوگانا ترے واری جاؤں — مفت میں ایسا نہ ہو میں کہیں ماری جاؤں

میری سوکن کی کہیں نکسیر بھی پھوٹی نہیں — ٹکریں لاکھوں ہی درگاہوں میں میں نے ماریں

جو ہونی تھی سو بات ہولی کہارو — چلو لے چلو میری ڈولی کہارو

آج فرصت نہیں کل رات کی ٹھہرا کے اٹھو — بات بندی سے ملاقات کی ٹھہرا کے اٹھو

صبح کو اٹھ کے جو تم گھر کو اجی جاؤ گے — یہ تو فرماؤ بھلا پھر بھی کبھی آؤ گے

غرضیکہ رنگین کی ریختی کے مطالعہ سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے دل میں جذبۂ محبوبیت انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس لحاظ سے ہم رنگین کو ترگسی شعرا کی بزم رنگین میں جگہ دے سکتے ہیں

مومن (۱۲۱۵ھ - ۱۲۶۷ھ)

مومن کے کلام میں بھی کہیں کہیں محبوبیت کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ مومن بھی ایک خوب صورت انسان تھے۔ زیادہ تر خوبصورت انسانوں کے جامہ ہستی سے محبوبیت کا شعلہ ابھرتا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے تاہم اکثر و بیشتر حالات میں خوب صورت شخص ہی خود کو محبوب تصور کرتا ہے۔ مومن بھی ایک خوب صورت انسان تھے۔ مومن کا مرزا فرحت اللہ بیگ نے " ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ " میں پیش کیا ہے۔

"حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی۔ کشیدہ قامت تھے۔ سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھنویں، پتلی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ۔ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ مسّی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخشی ڈاڑھی بھرے بھرے ڈنڈ۔ پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی انگلیاں، گھونگھریالے بال لمبے لمبے کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے۔ بدن پر

---

[1] تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب ص ۴۴

شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا لیکن اس کے نیچے کرتہ ندارد، جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے سے دکھائی دیتا تھا۔ نے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اسکے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خارپشت۔ سرخ گلبدن کا پائجامہ مہریوں سے تنگ اوپر سے ڈھیلا۔ پائجامہ کا کپڑا ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ جوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی کبھی لٹکی رہتی تھیں۔ کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پہ گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی کہ سر پر منڈ گئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے[۱]

مرزا فرحت اللہ بیگ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومن ایک حسین وجمیل انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی شاعری میں کہیں کہیں محبوبیت کی کلیاں چٹکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں۔

دیتا ہوں اپنے لب کو بھی گل برگ سے مثال بوسے جو خواب میں ترے رخسار کے لئے

مومن اپنے لب کو گل برگ سے مثال دیتے ہیں۔ اگرچہ شعراء نے محبوب کے لبوں کو پنکھڑی سے تشبیہہ دی ہے۔ میر نے محبوب کے لب کو نزاکت کے اعتبار سے گلاب کی ایک پنکھڑی تصور کیا ہے۔ مگر مومن نے خود اپنے لب کو گل برگ تصور کر لیا ہے۔

اس شعر سے واضح طور پر مومن کی محبوبیت نمایاں ہوتی ہے۔

غالب (۱۲۱۲ھ – ۱۲۸۵ھ)

غالب کی شاعری میں نرگسیت کا یہ مخصوص پہلو نظر آتا ہے۔ ان میں جذبۂ محبوبیت کی آب وتاب موجود ہے۔ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ غالب بذات خود ایک حسین وجمیل انسان تھے۔ مرزا غالب کو خود کو بھی اس کا احساس تھا جیسا کہ ان کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

مرزا غالب کو ایک محفل میں یہ معلوم ہوا کہ مرزا حاتم علی مہر بہت طرحدار آدمی ہیں، اس لئے غالب کو مرزا حاتم علی مہر کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ جب مرزا حاتم علی مہر کو یہ پتا چلا تو انھوں نے اپنا حلیہ لکھ کر غالب کو بھیجا۔ اس کے بعد غالب نے ان کو اپنا حلیہ لکھ کر روانہ کیا۔

"بھائی! تمہاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا جس زمانے میں وہ حامد علیخاں کی نوکر تھی۔ اور اس میں اور مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل جان سے پہروں اختلاط ہو کرتے تھے۔ اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے۔ بہرحال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے

---

[۱] مومن۔ مرتبہ احسان دانش وعبدالرحمٰن اصلاحی۔ ص ۳۲

کشیدہ قامت ہو تو مجھے رشک نہیں آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہیں آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔[۱]

مولانا حالی نے بھی غالب کی جسمانی ساخت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اہل دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا۔ ان سے سنا گیا ہے کہ عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے اور بڑھاپے میں بھی جب راقم نے پہلی بار ان کو دیکھا ہے حسانت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلت خوراک اور امراض دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے، اس حالت میں بھی وہ ایک قد آور توانا معلوم ہوتے تھے۔"[۲]

غالب چونکہ ایک خوب صورت انسان تھے اس لئے انھوں نے بعض اشعار میں خود کو معشوق تصور کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

زیادہ تر معشوق عاشق کو فریب دیتا ہے۔ مگر غالب اس موقع پر معشوق کو فریب دے رہے ہیں اور اس طرح معشوق فریبی سے کام لے رہے ہیں۔ یعنی غالب نے یہاں ایک معشوق کا کام انجام دیا ہے

سید احمد علی نسبت | سید احمد علی نسبت کے یہاں بھی جذبۂ محبوبیت موجود ہے۔ انھوں نے بھی ریختی کی تخلیق کی ہے۔ نسبت صاحب جان صاحب کے استادِ محترم تھے۔ چنانچہ جان صاحب نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

وہ تھے استاد تجھ کو جان صاحب ان سے کیا نسبت کیا پر نام روشن ریختی نے تیری نسبت کا

نسبت کو بھی ریختی گوئی میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے عورتوں کی خصوصیات اور ان کے جذبات کی عکاسی دلکش انداز میں کی ہے۔ ان کی ریختی کا نمونہ درج ذیل ہے۔

۱۔ عودِ ہندی۔ مرزا غالب خط نمبر ۱۰۰ ۲۔ یادگارِ غالب۔ مولانا حالی ص ۲۲۔ ۲۳

حبیب سے اس پر یہ پڑی ہے آنکھ — تب سے اتنا یہ دکھ رہی ہے آنکھ
ہر کسی سے جو بل یہ کڑتی ہے — کسی بانکے سے کیا لڑی ہے آنکھ
واہ کیا کہنا ہے ترا چھپا — تیری تو آنکھ ، نرگسی ہے آنکھ
دل ہر اک کا لبھائے لیتی ہے — تیری کیا کوئی موہنی ہے آنکھ
اے دوگانا وہ اگلی آنکھ نہیں — مجھ سے تیری یہ پھر گئی ہے آنکھ
اے دوا شور کیوں مچاتی ہے — ابھی قسمت کی تو نئی ہے آنکھ[1]

نسبت کی اس ریختی سے ان کا جذبہ محبوبیت واضح ہو جاتا ہے ۔ اس لئے ہم ان کو ایک نرگسی شاعر کہہ سکتے ہیں۔

جان صاحب (پیدائش تقریباً ۱۸۲۷ء — انتقال ۱۸۹۷ء)

جس طرح ریختہ کے میر کارواں میر تقی میر گزرے ہیں اسی طرح ریختی کے میر مغاں جان صاحب ہوئے ہیں۔ جان صاحب پر ریختی کا خاتمہ ہے ۔ انھوں نے رنگین اور انشا سے زیادہ ریختی میں نسائیت داخل کر دی ہے۔

جان صاحب کا اصل نام میر یار علی ہے وہ میر امن فرخ آباد کے بیٹے تھے اور نواب مغفور علیخاں کے شاگرد تھے ۔ ان کا وطن لکھنو تھا ۔ وہ لکھنؤ میں رستم نگر میں رہتے تھے ۔ مگر ملازمت کے سلسلے میں عمر کا آخری حصہ رامپور میں گزارا ۔ جان صاحب نے ساری عمر ریختی کی خدمت کی ۔ ریختی کے علاوہ اور کسی صنف کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا ۔

جان صاحب میانہ قد کے انسان تھے ۔ اکہرا جسم تھا پنج گوشیہ ٹوپی استعمال کرتے تھے ۔ بند دار انگرکھا پہنتے تھے جس کے نیچے کبھی کرتہ ہوتا تھا اور کبھی نہیں ہوتا تھا ۔ وہ گھیتلی جوتی پہنتے تھے ۔ مشاعروں میں اصرار پر عورتوں کا دوپٹہ اوڑھ لیتے تھے ۔ اور عورتوں ہی کی طرح بھاؤ بتا بتا کر ریختی کے اشعار پڑھتے تھے ۔

جان صاحب نے اپنی ریختی میں خالص عورتوں کے جذبات پیش کئے ہیں ۔ مثلاً عورتوں میں شرم و حیا کا مادہ بالکل فطری ہے ۔ جان صاحب نے اس خصوصیت کو اپنے ایک شعر میں واضح کیا ہے ... وہ کہتے ہیں ۔

وہ بیبیکا ڈھیلا نہ کھنکارے چپ چلے آئے — کسی کے گھر میں کوئی بے خطر نہیں آتا

اگرچہ عورت میں شرم و حیا ہوتی ہے تاہم وہ جنسی جذبات بھی رکھتی ہے ۔ اس کا اظہار بھی

---

[1] دیوان ریختی مع دیوان جان صاحب ص ۳۶ — ۳۷

جانؔ صاحب نے کیا ہے۔

نامرد ہی نہ ہو مرد سے اب تک خبر ہوا — قربان اس حیا کی موا سال بھر ہوا

عورتیں جب شوہر سے خفا ہوتی ہیں تو اپنے میکے جانا پسند کرتی ہیں۔ جان صاحب نے اس کی بھی عکاسی کی ہے

ساس نندوں کی محبت کی میں قربان گئی — جاؤں میکے مجھے منگوا دو سواری مرزا

عورتیں زیادہ تر پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ جانؔ صاحب نے عورت کی اس خصوصیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کہدی مہتاب نے جبران سے ملاقات کی بات — پیٹ کی ہلکی ہے اک دن نہ پچی رات کی بات

عورتیں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے چولھے میں تعویذ گاڑتی ہیں۔ جان صاحب عورتوں کی اس خصلت کو بھی پیش کیا ہے۔

سوت کے منہ کو لگے سات توؤں کی کالک — میرے چولھے میں اسی نے ہو اگاڑا تعویذ

جان صاحب نے اپنی ریختی میں عورتوں کے لباس کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

چھوٹا کپڑا ہے، بڑے لطف کی پرچیز یہ ہے — ساری جوڑی میں تو بندی کو خوش آئی انگیا

جان صاحب کے یہاں بعض ریختی کے اشعار ابتذال کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار پر غور فرمایئے۔

سب جھوٹ ہے میاں ان کے لئے ہو چکی خراب — سچا عمل کسی کا نہ جادو نظر پڑا

کمر کا ہو ہے جو مضبوط اور دکھائے مزا — مجھے تو آنتوں میں کوئی نظر نہیں آتا

درگور رہم کو اپنا ہی مطلب ہے سوجھتا — اے جانؔ میں تو مرتی ہوں مارے بخار کے

جان صاحب کی ریختی میں عورتوں سے مخصوص محاورات کا ذائقہ دیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں عورتوں کے محاورات کا لطف اٹھایئے۔

جس مردوئے کے پیچھے مرا گھر ہوا تباہ — برسوں کے بعد پھر وہی آنکھوں پڑا

کیا ہم کو پڑی کوئی زناخی کے گھر آیا — اچھا نہیں کرنا ہے اچی ذکر پرایا

نعالگو تو دل میں تیرے جو سو یار کی تلاش — کیوں موںڈی کاٹے رات کو تلوار کی تلاش

زندی چل، دور چھی مجھ پہ یہ بہتان نہ باندھ — میری بیری ہری دشمن ہو گرفتار کہیں

آنچ مجھ پہ تو کل اور سے مرزا اخلاص — ایسے ہرجائی سے ہو توج بکو رہا خلاص

ان اشعار میں مردوئے، ناتاجی، موئی کاٹے، رنڈی، چھی، نوج اور نگوڑے کے الفاظ آئے ہیں۔ جن کو عورتیں ہی خاص طور سے استعمال کرتی ہیں۔

جان صاحب کی لکھنؤ میں بہت قدردانی ہوئی کیونکہ وہ نوابوں اور امیروں کے یہاں ریختی سنانے جاتے تھے مگر جب لکھنؤ میں ان کی قدر کچھ کم ہوئی تو وہ دہلی چلے گئے۔ جب وہاں بھی ماحول سازگار نہ ملا تو بھوپال گئے وہاں بھی ناکام ہونے کے بعد لکھنؤ واپس آگئے۔ جب ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں غدر ہوا تو وہ لکھنؤ ترک کر کے کہیں نہیں گئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک شعر کہا ہے۔

میں سوہاگی رنڈی ہوں نہ گوروں کی ڈری ہیں | بھگدڑ میں قدم شہر سے باہر نہ نکالا

جب واجد علی شاہ کلکتے روانہ کر دئے گئے تو جان صاحب کی اور بھی بے قدری ہوگئی چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

ہم ہوئے بڑھیا، جواں جب دم ہوا اپنا کمال | قدرداں ملتا نہیں اب کوئی بگڑا بدنصیب

جان صاحب کبھی کبھی شاعروں میں تعلی سے کام لیتے تھے۔ اس لئے محمد علی خاں مسیحا اخبار نویس نے امجد علی خاں عصمت اور ہدایت کو ریختی کی مشق کرائی۔ اور جان صاحب کے مقابلے میں مشاعروں میں پڑھوانا شروع کیا۔ تنگ آکر جان صاحب نے کہا۔

شیخانی کی یہ پوتیاں آکر ہمارے پاس | چھانٹیں رموزیں بیٹھ کے دلبر ہمارے پاس
گھن آئے سکتے کوؤں کو جن گالیوں سے جی | سر کھ سنائیں سوت وہ بن کر ہمارے پاس
کیا جانیں اوپری ریختی کہنا چڑھائیں منہ | ایسی پڑی ہیں جیب میں سترہ ہمارے پاس
عصمت و ہدایت اور بے عصمت بھی مال کیا | سب آئیں زہر کھا کے یہ ہم پر ہمارے پاس

جان صاحب آخر عمر میں رامپور چلے گئے تھے، وہاں نواب کلب علیخاں نے ان کی بہت قدر کی۔ رامپور ہی میں ان کا انتقال بھی ہوا۔

جان صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار بھی ریختی کے رنگ میں ہیں اور لطف دے رہے ہیں۔

ہوتا نہیں ہے ایسا بہو بیٹیوں کا طور | چربانک دیدہ دیکھا ہے اکثر چھنال کا
کلو امی یہ مرتا ہے تف اُسکی ریش پر | قاضی کے گھر میں کیوں نہ ہو چرچا شراب کا
سوم بیٹیوں سے نیو ہوئی کھیلے جو سر! | جاں وہ مجھ سے تنکے گز کی جہ کیوں کر چلت
گرگٹ کی طرح کالا کبھی لال ہو گیا! | غصے سے مردوئے کا عجب حال ہو گیا
محبوبہ بھڑکایا تھا اس کو سوت نے | میں ہوئی جب گرم ٹھنڈا ہو گیا
چھوٹے دیور سے مرے پردا کیا | باجی صاحب ادھی تم نے کیا کیا

ہو خیر دلھن دولھا کی ماتھا مرا ٹھنکا — اچھا نہیں یہ ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا
سو کھا سا کھا گورا گورا — کملو کا گھر دالا ہوگا

آ تو نے مار مار کے کیں چور ہڈیاں — مطلب جو میں نے پوچھا عظام رمیم کا
یہ بدگماں ہے دل، اس نگوڑے نٹ کھٹ کا — لگایا میں نے جو سرمہ موئے کا دل کھٹکا !

مجھے نفرت ہے صورت سے نگوڑے جاؔن صاحب کی — وہ اس کی شکل کیا ہے اے بوا قربان کی صورت
نہ دیکھ دولھا کو ساس نندوں کے آگے گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر
نئی نویلی دلھن ہے بجی ابھی تو دو چار دن حیا کر
نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے، منا عی رنڈی کو گھر میں ڈالا
بنایا صاحب امام باڑہ خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر
نصیب سیدھا اگر ہے میرا لچکتی نکلے گی کھاٹ اس کی
وہ شکھ نہ پائے گی جس نے بھیجا ہے الٹی پٹی تمہیں پڑھا کر

جیسے بجاتے ہیں مجھے باجی تمہارے ہاتھ پاؤں — گورے گورے ننھے ننھے، پیارے پیارے ہاتھ پاؤں

ملی قسمت سے ہے اوباش جورو اوہی نائی کو — خصم کی طرح رنڈی مونڈ کھائے گی خدائی کو

لشوے بہایئے نہ مرے آکے سامنے — یہ نخرے تلے کیجئے جیروا کے سامنے

دیکھی جو اپنی چوٹی کی پرچھائیں رات کو — رسی سمجھ کے بھاگی میں اک چیخ مار کے

جاؔن صاحب کی ریختی کے اشعار واضح طور پر ان کے جذبۂ محبوبیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شاعر اس قسم کے اشعار کہنا پسند نہیں کرے گا۔ وہی شاعر ایسے اشعار کی تخلیق کرے گا جس کا مزاج محبوبیت سے ہم آہنگ ہوگا۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جان صاحب میں بدرجہ اتم جذبۂ محبوبیت موجود تھا۔ اس بنا پر ہم ان کو ایک نرگسی شاعر کہہ سکتے ہیں۔

محشؔر رامپوری

محشؔر رامپوری بھی ایک ریختی گو شاعر گزرے ہیں۔ ان کے یہاں بھی جذبۂ محبوبیت نمایاں ہے۔ ان کا اصل نام عبداللہ خاں تھا اور وطن رام پور تھا۔ ان کے ریختی پڑھنے کا انداز جاؔن

صاحب سے بھی بہتر تھا۔ جس کا اعتراف خود جان صاحب یوں کرتے ہیں۔

ڈھاتا ہے حشر پڑھنا قیامت ہے ریختی	فتنہ غضب کا آیا تھا محشر ہمارے پاس
فرزند ہے رئیس کا عبد اللہ خاں ہے نام	محفل میں ہو کے بیٹھا تھا محشر ہمارے پاس
دلی کے فاتحوں میں بھلا آدمی بنا	بیٹھا ہو کی طرح سے جھک کر ہمارے پاس

غرضیکہ محشر رامپوری کے پڑھنے کی دھوم تھی۔ مگر نساخ نے "سخن شعرا" میں لکھا ہے کہ ان میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ اوروں کے اشعار اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ ان کی ریختی کا انداز مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

مجھ کو قسمت سے میسر یار بھی الو ہوا ——— مفت میں بیٹھے بٹھائے جان کا لاگو ہوا
یہ اٹنگا اٹنگا پاجامہ ——— لوچ جیسے غریب کی ماما
کھلا ہے سینہ دوپٹہ ڈھلک کا ہوش نہیں ——— کنواری بالی ہے آنچل کو دیکھ بھال کے چل
کھسکیے یہاں سے نہ چل دیجیے ——— یہ ہتے کسی اور کو دیجیے
سر مرا ڈھالکو گے اس منہ سے زبردستی تم ——— جوتیاں کھاتے ہیں ٹانگوں کو اٹھانے والے

نازنین دہلوی

جان صاحب کے عہد میں دہلی کے مایۂ ناز ریختی گو شاعر نازنین تھے۔ ان کا اصل نام مرزا علی بیگ تھا۔ مرزا قادر بخش بہادر صابر نے تذکرہ "گلستان سخن" میں نازنین کو رنگین انشا اور جان سے بہتر ریختی گو قرار دیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ نازنین نے ان معاملات کو اس لطافت سے ادا کیا ہے کہ سامع کا جی نکل جاوے اور سننے والا کلیجہ پکڑ کے بیٹھ جاوے۔

مولوی عبد الغفور نساخ نے بھی نازنین کو ایک بہتر ریختی گو قرار دیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ "برخلاف جان صاحب کے ان کی ریختی میں کچھ کچھ شاعری کا مزہ بھی آتا ہے"۔[1]

نازنین کے ریختی کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جوان نکلا	تو اہم عورتوں میں تھا بڑا دیدا زلیخا کا
میں اپنے سر کو دھوتی بھی لوا اور یہ تماشا ہے	تو اٹھا ہے کیا ہی خوش کہ دن آیا تھا اٹھا کا
کوئی بیٹھا ہو تجھے ہے کام اپنے کام سے	اے نگوڑے آدمی سے تو تو حیواں ہو گیا
کچھ ہو نہیں سکتا ہے اور اس پہ ہے اکڑتا	بیٹھا تو نگوڑے کا کبھی سر نہیں ہوتا
ایسا کسی تحبہ نے لبھایا تھا کہ شب بھر	لیٹا تو رہا پاس پہ کوسوں ہی نہیں تھا
میری نماز کھوئی اس مردوئے نے آکر	اٹھی تھی اے دوا میں کمبخت ابھی نہا کر

[1] سخن شعرا عبد الغفور نساخ ص ۴۹۰ — ۴۹۱

اے زناخی مردوا ہے بدگماں — تو نہ کر باتیں ہمارے کان میں

رات بھر سیجا وہی بات اور وہی چوما چاٹی — اے مردوا ایسے ندیدے سے پڑا کار مجھے

فوارے کی طرح سے ذرا بھی نہ تھم سکے — تم ایک بوند پانی پہ کتنا اچھل پڑے

دس گھر تو چھٹ چکے ہیں کہاں تک کروں ستم — کس جا بٹھائے دیکھئے اب آسماں مجھے

کیا جانئے کیا کسبیوں میں شہد گھلا ہے — گھر والیوں سے خوش کوئی شوہر نہیں ہوتا

اے نازنیں رنڈی کے لئے لڑ نہ خصم سے — سر چڑھا بیسوا مرد کے بہتر نہیں ہوتا

یہ کل بگڑتی ہے رہتا نہیں حمل بھر — چھتائی میں تو آیا پہلا حمل گرا کر!

یہاں درگور ایسے مردوے کا منہ کروں کالا — کیا جب تک نہ منہ کالا ظاہر کو نہ دویا سے

دن چڑھے پر بھی دوپٹے ہی پڑا رہتا ہے — مفت نظروں میں جیٹھانی کے کیا خوار مجھے

ریختی کے سلسلے میں کچھ مخصوص الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اور جن کا ذکر ضروری ہے مثلاً "دوگانا" کا لفظ ریختی میں بہت عام ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب دو عورتوں میں محبت ہو جاتی تھی تو اس کو دوگانا کہا جاتا تھا یعنی وہ عورتیں ایک دوسرے کو دوگانا کہنے لگتی تھیں۔ لکھنؤ میں یہ ایک رسم تھی جو آج بھی قائم ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کو بادام، اخروٹ، آم یا کیلا وغیرہ دھوکا دے کر دیتی۔ اگر وہ داہنے ہاتھ میں لے لیتی تو دوسری عورت کہتی دوسو آم فراموش یا دوسو کیلے فراموش۔ اس طرح ہارنے والی عورت جیتنے والی عورت دوسو سے لے کر دو لاکھ تک اشیا دیتی تھی پھر وہ عزیزوں میں تقسیم کی جاتی تھی اس کے بعد دونوں عورتیں دوگانا بنجاتی تھیں۔

ریختی کے سلسلے میں "زناخی" کا لفظ بھی بہت عام ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ زناخ توڑ کر ہمراز بن جاتی تھی۔ یعنی مرغ یا کبوتر وغیرہ کے سینے کی ہڈی جو دو شاخہ ہوتی ہے، اس کو توڑ دیا جاتا تھا۔ اسی طرح جب ایک الائچی کے دانے دو عورتیں کھاتیں تو وہ ایک دوسرے کو الائچی کہتیں۔ دوا کا مطلب کھلائی کا ہوتا ہے ہم عمر لونڈی کو چھوچھو کہا جاتا تھا۔ جو استانی لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اس کو آتو یا آتو ن کہتے تھے۔ مختلف ریختی گو شعرا نے ان الفاظ کا استعمال اپنے اشعار میں کیا ہے۔

امیر مینائی (۱۸۲۸ء۔ ۱۹۰۰ء)

امیر مینائی کے کلام میں بھی جذبۂ محبوبیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اگرچہ امیر مینائی کوئی حسین وجمیل انسان نہیں تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ایسے اشعار کہے ہیں جن سے ان کا ناز و انداز ظاہر ہوتا ہے۔

دراصل امیر مینائی اپنے عہد کے نہایت مقبول شاعر تھے اس بنا پر ان میں خود پسندی پیدا ہو گئی تھی۔ جذبۂ محبوبیت ان کی خود پسندی کی ایک اچھلتی ہوئی موج ہے۔ یہ ان کا شاعرانہ انداز ہے۔ ان کے اس انداز سے ان کی جدت طراز طبیعت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً وہ ایک شعر میں کہتے ہیں کہ میرے عشق نے شان حسن دکھائی۔ دراصل حسن کا اظہار تو محبوب ہی کا کام ہے۔ عاشق کو اس سے کیا واسطہ۔ مگر امیر مینائی نے اس کے لئے جواز پیدا کر لیا ہے۔ ان میں حسن کی شان اسی بنا پر پیدا ہو گئی کیونکہ ان کا جسم نقاہت کی بنا پر محبوب کی کمر کی طرح ہو گیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

دکھائی میرے عشق نے شان حسن　　تن زار مو سے کمر ہو گیا

نازک مزاجی بھی محبوب کا خاصہ ہے۔ مگر امیر مینائی بھی خود کو نازک مزاج ظاہر کر رہے ہیں۔ اور اس طرح اپنے جذبۂ محبوبیت کو بے نقاب کر رہے ہیں۔

میں ہوں وہ نازک مزاج بلبل، نہیں مجھے تاب نکہت گل
دماغ کرتی ہیں کیوں پریشاں، چمن میں کلیاں چٹک چٹک کر

امیر مینائی کے یہاں جذبۂ محبوبیت ایک خوشگوار رجحان کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس رجحان سے ان کی نرگسیت بھی واضح ہوتی ہے۔

داغ ۱۸۳۱ء - ۱۹۰۵ء

داغ کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد کافی نکل سکتی ہے جن میں جذبۂ محبوبیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ داغ کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے رہا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متاخرین شعرا میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ پھر ان کو منی بائی حجاب سے عشق بھی تھا جو ان کی ناز برداری کرتی ہو گی۔ انہیں حالات میں داغ کے لہجہ میں محبوبیت کی خوشبو بس گئی ہے۔ چنانچہ داغ کہتے ہیں۔

تم نے تمام عمر جلایا ہے داغ کو　　کیا لطف ہو جو وہ بھی جلائے ذرا سی دیر

زیادہ تر محبوب عاشق کو جلاتا ہے مگر اس وقت داغ بذات خود محبوب کا رول ادا کر رہے ہیں اور معشوق کو جلانا چاہتے ہیں۔ داغ کا مندرجہ ذیل شعر بھی ملاحظہ فرمائیے۔

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا　　تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

عاشقوں کے دل میں معشوق رہتے ہیں مگر داغ نے اپنے تخلص سے فائدہ اٹھایا ہے اور اپنا مقام دل عاشق قرار دیا ہے۔

چھیڑا کبھی تمہیں ہر وقت کی یہ یاد رہے　　کبھی کیسی ہے کبھی میری طبیعت کیسی

معشوق کی سرشت میں تلون مزاجی داخل ہوتی ہے مگر داغ نے معشوق کی طرح تلون مزاجی کا اظہار کیا ہے۔

زلفِ جاناں بھی ہے دیوانی مری		اللہ اللہ رے یہ پریشانی مری

داغ کی محبوبیت کا یہ حال ہے کہ زلفِ جاناں ان کی دیوانی ہے۔ اگرچہ داغ نے اس کا جواز یہ پیدا کرلیا ہے کہ زلفِ جاناں ان کی پریشانی پر فدا ہے۔ مگر دوسرا مصرع محبوبیت کا پرتو لئے ہوئے ہے۔ بہرحال داغ کی شاعری میں جا بجا محبوبیت کے ہلکے سائے نظر آتے ہیں، جن میں دلکشی بھی موجود ہے۔

چکبست (۱۸۸۲ء - ۱۹۲۶ء)

چکبست کی شاعری میں کہیں کہیں محبوبیت کے آئینے کی جھوٹ نظر آتی ہے۔ چکبست کشمیری برہمن کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کشمیری برہمن عام طور سے خوبصورت اور وجیہہ ہوتے ہیں۔ چکبست کی بھی ظاہری شخصیت دلکش تھی۔ ان کے بارے میں نجم الدین شکیب کا قول ہے

"چکبست بڑے خوش وضع، ملنسار اور وفادار دوست تھے۔ ان کا شباب آریائی وجاہت کی تصویر تھا۔ لکھنؤ کی تراش و خراش اور نوک پلک نے ان کی جامہ زیبی میں اور بھی چار چاند لگا دئے تھے۔"[1]

چونکہ چکبست ایک خوبصورت انسان تھے، اس لئے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر ان کے یہاں محبوبیت کے اشعار کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

عاشق بھی ہوں معشوق بھی یہ طرفہ مزا ہے		دیوانہ ہوں میں جس کا وہ دیوانہ ہے میرا

اس شعر میں چکبست نے اعلانیہ کہدیا ہے کہ وہ معشوق بھی ہیں۔ چکبست کا مندرجہ ذیل شعر بھی قابل غور ہے۔

یاں صراحی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیمانہ ہے		مے جوانی ہے مری دل مرا میخانہ ہے

چکبست نے اس شعر میں اپنی جوانی کی تعریف کی ہے اور اس کو مے بتایا ہے۔ جوانی کا یہ احساس ان کو نرگسی رجحان کا حامل بنا دیتا ہے۔

ریاض خیرآبادی (۱۸۵۳ء - ۱۹۳۴ء)

ریاض خیرآبادی کی شاعری میں جذبۂ محبوبیت ایک سیلاب کی طرح امنڈتا ہوا نظر آتا ہے۔ اردو شاعری میں صحیح قسم کا جذبۂ محبوبیت صرف ریاض کے یہاں ملتا ہے۔ ریاض کے ہاتھ میں خود بینی کا جیسا آئینہ ہے، ایسا اردو کے

۱۔ نقوش شخصیت نمبر۔ مضمون نجم الدین شکیب		ص ۸۶۶

سی دوسرے شاعر کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہی آئینہ ان کے لئے اسباب خود بینی مہیا کرتا ہے جو کبھی شکست نہیں ہوتا ہے۔ ریاض کے جذبۂ محبوبیت کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ نہایت خوبصورت اور وجیہہ انسان تھے یہی نہیں بلکہ ان کو اپنے حسن و شباب پر ناز بھی تھا۔ وہ سچ مچ یونانی نرگس کی طرح اپنے کو حسین تصور کرتے تھے۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کے حسن و جمال کی تصویریں مختلف الفاظ میں کھینچی ہیں۔ ان کی شکل و شباہت کے بارے میں رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں (ریاض) بے حد حسین تھے [۱]

رئیس احمد جعفری نے ایک جگہ زیادہ تفصیل کے ساتھ ریاض کی شکل و شباہت پر روشنی ڈالی ہے۔

"کچھ چھوٹتے ہوئے علیبا ریاض کی وہ ادا تھی جو جوانی اور بڑھاپے ہر دور میں قائم رہی۔ ان کی ہر چیز میں ندرت تھی۔ وضع قطع، لباس، معاشرت، چال ڈھال کوئی چیز بھی عام لوگوں کی سی نہ تھی۔ سب میں ان کی انفرادیت جھلکتی تھی۔ رنگ گورا، قامت کشیدہ، آنکھیں بڑی بڑی آواز نہ بلند نہ پست" [۲]

رئیس احمد جعفری نے لکھا کہ جوانی میں ریاض صاحب بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے اور ڈاڑھی منڈواتے تھے۔ اس لئے وہ ایک بانکے جوان نظر آتے تھے۔ رئیس احمد جعفری نے ریاض کے بڑھاپے کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ جب رئیس احمد جعفری کے والد کا انتقال ہوا تو ریاض صاحب ان کے گھر ماتم پرسی کے طور پر گئے تھے۔ ریاض کی اس وقت کی تصویر رئیس احمد جعفری ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

"اچھا خاصا لمبا تڑنگا قد گورا رنگ۔ سفید داڑھی۔ ایک انگرکھا پہنے ہوئے بڑے بڑے پائنچوں کا پاجامہ سر پہ سپید کی جالی دار ٹوپی" [۳]

چونکہ ریاض بہت حسین و جمیل انسان تھے۔ اس لئے صنف نازک بذات خود ان کے آغوش میں چھپنے کے لئے تیار رہتی تھی۔ اور اپنے مرمریں جسم کو ان کی سپردگی میں دینے کے لئے آمادہ نظر آتی تھی۔ اس سلسلے میں رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں

"ریاض بہت حسین تھے۔ .... نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا عشق کبھی یک طرفہ نہیں رہا، اس لئے وہ اپنی محبت میں ناکام بھی کبھی نہیں ہوئے" [۴]

---

[۱] رند پارسا رئیس احمد جعفری ص ۷
[۲] " " ص ۲۲۴
[۳] " " ص ۹
[۴] " " ص ۲۳

دراصل ریاض کے عشق نے سرزمین گورکھپور میں آکر لالہ و گل کھلائے۔ یہاں کی زمین ان کے عشق کے بہت راس آئی۔ یہاں کی خاک "زمین شور" نہیں تھی جس سے "سنبل" نہ اُگے۔ اس لئے ان کا تخم عمل ضائع نہیں ہوا۔ ریاض کے والد صاحب جب گورکھپور میں سب انسپکٹر پولیس ہوکر آئے اس وقت ریاض کا عنفوانِ شباب تھا۔ اس دور کی ریاض کی ایک تصویر رئیس احمد جعفری مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"گورکھپور ریاض کے لئے صرف وہ شہر نہیں تھا جہاں وہ رہے اور طفلے کے ساتھ ان کے والد حاکمِ حکومت دے رہے تھے۔ جہاں وہ عیشِ امروز میں مصروف اور غم فردا سے بیگانہ تھے۔ جہاں دوستوں کی بزم آرائیوں اور محفل طرازیوں کی رونق بنے ہوئے تھے۔ بلکہ وہی ریاض کا گہوارۂ شباب تھا۔ یہیں ان کی جوانی نے انگڑائیاں لیں، یہیں اس نے چونک زنی سیکھی۔ یہیں عروج ارتقا کے منازل تک پہنچی۔ گورکھپور کو ریاض سے وہی نسبت تھی جو مجنوں کو نجد سے تھی۔ یہ ان کا نجد تھا۔ وہ اگر کرشن تھے تو گورکھپور ان کا متھرا تھا۔ یہاں کی گوپیوں میں وہ واقعی کرشن کنھیا نظر آتے تھے۔"[1]

ریاض کی گورکھپور کی زندگی کے بارے میں مجنوں گورکھپوری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"یوں تو ریاض عمر بھر جوان رہے اور حسن کے ساتھ دم بھر کو بیٹھے اس کو جوان بنادیا لیکن ریاض کی وہ جوانی جسکو عرف عام میں جوانی کہتے ہیں ..... واقعی دیوانی تھی۔ ان کی شاعری کا ایک ایک حرف اس کا غماز ہے۔ گورکھپور کی سرزمین ان کے ولولۂ شباب کی شاہد ہے۔ گورکھپور نے ان کی جوانی کے لئے جولانگاہ مہیا کی اور انھوں نے اپنی شاعری سے گورکھپور کو غیر فانی بنادیا۔"[2]

فراق گورکھپوری نے بھی ریاض کی مستانہ زندگی کا نقشہ کھینچا ہے

"ریاض غیر معمولی ذہانت کے آدمی تھے۔ ان پر جوانی اور زندگی ٹوٹی پڑتی تھی۔ لکھنؤ کے دور انحطاط میں لکھنؤ کی سوسائٹی کی بزم آرائیاں سمٹ کر ان کی شخصیت میں سما گئی تھیں اور وہ تمام بانکے عاشق اور ماہ پارہ عورتیں جنھوں نے کبھی لکھنؤ کو لکھنؤ بنادیا تھا سب کے سب ریاض کی زندگی کے جزو ہو گئے تھے سو برس کے لکھنؤ نے اپنے آخری لمحوں میں ریاض کے لئے

---

[1] رندِ پارسا۔ رئیس احمد جعفری ص ۲۶
[2] 〃 〃 〃 ص ۔۔

پر اپنے آپ کو صدقے کر دیا۔ لٹا دیا۔ پورا لکھنؤ سمٹ کر ریاض بن گیا ۔"

اس کے بعد فراق نے ریاض کے بارے میں ایک اور عبارت لکھی ہے ۔

" بجائے اس کے کہ حسن و عشق کی کیفیتیں ریاض پر طاری ہوں خود ریاض ان کیفیتوں پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں ۔"

ہم آ گئے ہم پا گئے ہم لے گئے ان کو　　وہ کھوئے گئے کوچۂ دشمن سے نکل کر

یہ شخص شاعر ہے یا کرشن کنہیا ۔" [1]

غرضکہ ریاض بذات خود حسین اور خوش رو تھے ۔ اس پر قیامت یہ کہ طبیعتاً شوخ و شریر تھے ۔ ریاض کی شوخی و شرارت پر مجنوں گورکھپوری اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ۔

" ریاض کی شوخ اور الھڑ طبیعت نے کبھی اس کو گوارا نہیں کیا کہ وہ معشوق کے سامنے ہار مان لیں۔ وہ معشوق سے بڑھ بڑھ کر رہتے ہیں اور بقول ہمارے دوست پروفیسر رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری کے حسن کی شوخی و شرارت اس کے عشق کی بے باکی کے سامنے حسرت و بیچارگی میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ انھوں نے اپنے کو عشق میں کبھی مجبور و مظلوم نہیں پایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوقوں نے جتنے ستم اب تک عاشقوں کی جان پر توڑے ہیں، وہ ان کا انتقام لینے کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ وہ کبھی معشوقوں کے رحم و کرم کے محتاج نہیں رہے ۔ جب جی میں آیا کہہ بیٹھے چاہے معشوق راضی رہے یا ناخوش ۔" [2]

چونکہ ریاض ایک حسین و جمیل انسان تھے ۔ اس لئے ان میں جذبۂ محبوبیت قوس قزح کی طرح انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس جذبہ کا اظہار انھوں نے مختلف اشعار میں کیا ہے ۔

لاکھوں ہی جوانوں میں ریاض ایک جوان ہے　　کمبخت حسینو ! اسے چاہو، اسے چاہو

عام طور سے عاشق محبوب کے جمال پر فریفتہ ہوتا ہے مگر ریاض خود اپنے کو جوان ظاہر کرتے ہیں ۔ اور معشوقوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ ان سے محبت کریں ۔ ریاض کا یہ شعر ان کے جذبۂ محبوبیت کی ایک واضح مثال ہے ۔

ریاض کے مندرجہ ذیل شعر سے بھی ان کی شکل و صورت پر روشنی پڑتی ہے ۔

---

[1] رند پارسا ۔ رئیس احمد جعفری　ص ۷۴

[2] 〃　〃　〃　〃　ص ۹۴-۹۵

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاضؔ پر کس نوک کا جواں ہے کس آن بان کا

ریاضؔ کو بذاتِ خود احساس ہے کہ وہ حسین ہیں، اس لئے جب کبھی محبوب رقیب کی طرف مائل ہوتا ہے تو اُن کو حیرت ہوتی ہے

کیا جانے کیوں رقیب بنا تھا گلے کا ہار ! صورت میں وہ ریاضؔ سے اچھا تو کچھ نہ تھا

ریاضؔ نے ایک شعر میں اپنے شباب کو چھلکتے ہوئے جام سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ تشبیہہ نہایت حسین اور مکمل ہے۔

یہ چھلکتا ہوا کیا جامِ شراب آتا ہے اے میں قربان ! مرا عہدِ شباب آتا ہے

مندرجہ ذیل شعر میں بھی ریاضؔ نے اپنی جوانی کی تعریف کی ہے۔

ہے ریاضؔ اک جوانِ مست خرام نہ پیئے اور جھومتا جائے

ریاضؔ نے ایک شعر میں اپنی رفتار کی بھی کی تعریف کی ہے

چلتے ہیں جب ریاضؔ تو کچھ جھومتے ہوئے جیسے پئے ہوئے کوئی مستِ شراب ہو

ریاضؔ کو پیری میں بھی جوان بننے کی خواہش ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

پی نے اگر بڑھاپے میں تھوڑی سی بھی ریاضؔ دنیا پکار اٹھے، کوئی رعنا جوان ہے

چونکہ ریاضؔ کو اپنے حسن و شباب پر ناز ہے، اس لئے انھوں نے اپنے اشعار میں معشوقانہ انداز کا بھی اظہار کیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاضؔ اک حسیں ہر وقت ہو اُن کو منانے کے لئے

ریاضؔ کے روٹھنے کا انداز اس شعر میں بھی دیکھئے۔

سب حسیں تم کو ستائیں گے ریاضؔ بات کہتے روٹھ جانا کچھ نہیں !

ریاضؔ ذرا سی بات میں روٹھ جاتے ہیں۔

ان حسینوں نے کہا کیا کہ خفا ہو بیٹھے بات کیا تھی کہ ریاضؔ آپ برا مان گئے

اب ذرا ریاضؔ کے روٹھنے اور محبوب کے منانے کا انداز بھی ملاحظہ فرمائیے۔

یہ کہہ کے کس نے گلے سے لگا لیا مجھ کو اے ریاضؔ مرا مجھ سے سرگراں کیوں ہے

اردو شاعری میں زیادہ تر محبوب روٹھ جاتا ہے اور عاشق اس کو منانے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ ریاضؔ میں محبوبیت موجود ہے اس لئے وہ خود روٹھ جاتے ہیں اور پھر یہ توقع کرتے ہیں کہ کوئی حسین آکر اُن کو منائے۔ اردو شاعری میں محبوب کی فرادائی کا حامل ہوتا ہے۔ مگر ریاضؔ کے یہاں اس معاملہ

ریاض ابھی نہیں صورت تو کچھ پروا نہیں اس کی ہماری وضع میں کیا ان سے کم کافر ادائی ہے

دراصل ریاض خوبصورت بھی تھے اور کافر ادا بھی تھے۔ ریاض نے ایک اور شعر میں اپنی اداؤں کا ذکر کیا ہے

چاہتے ہیں کہ تجھے معشوق طرحدار ریاض تجھ میں کمبخت کہاں سے یہ ادائیں آئیں

ریاض کی شاعری مشرقی شاعری سے بڑی حد تک جداگانہ ہے۔ ان کی شاعری روایت سے بغاوت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ریاض کی یہ بغاوت بناوٹی اور مصنوعی نہیں ہے بلکہ صداقت اور حقیقت سے لبریز ہے۔ مشرقی شاعری میں محبوب ہمیشہ عاشق کو جل دیا کرتا ہے مگر ریاض محبوب کو جل دیتے ہیں۔ ان کی یہ ادا ان کی زندگی کا صحیح عکس ہے۔ چنانچہ ریاض فرماتے ہیں

جل دیا کرتی ہے دن رات حسینوں کو ریاض بڑی نٹ کھٹ، بڑی چنچل ہے طبیعت میری

ریاض نے ایک شعر میں اپنے دل کی شوخیوں کا ذکر کیا ہے

ہیں مزے کی اے دلِ بیتاب تیری شوخیاں چل حسینوں پہ تجھے صدقے کریں قرباں کریں

ریاض کی بے نیازی کا عالم ملاحظہ فرمائیے۔

فتنہ کا گزر اس بھری محفل میں نہیں ہے چل اے نگہِ ناز جگہ دل میں نہیں ہے

ریاض نگہِ ناز کو فتنہ کا لقب دیتے ہیں اور اس کو اپنے دل کے مکان سے باہر نکال دیتے ہیں

ریاض اپنے کو بہت نازک طبع خیال کرتے ہیں۔

ہم سے دیوانے ریاض اور کہاں نازک طبع کہ جو وہ پھول سے بھی ماریں تو فریاد کریں

ریاض معشوقوں کی کچھ پروا نہیں کرتے ہیں۔

کافر حسیں بلا سے خفا ہیں ہوا کریں ہم سے خفا ریاض ہمارا خدا نہ ہو

ریاض معشوقوں پر ترس کھانے کے قائل نہیں ہیں۔

ریاض تو اے حسینو تم کو رلا کے چھوڑیں ہیں یہ ریاض ایسے ان کو ترس نہ آئے

کم سنی پر ترس آیا نہ شبِ وصل ریاض اف رے بیدرد حسینوں کو ستانے والے

کیوں تو نے ریاض ان کو شبِ وصل ستایا اب شکل تری اہلِ وفا سے نہیں ملتی

ریاض حسینوں سے بات کرنا بھی نہیں چاہتے ہیں

دیوانہ ریاض اوروں سے کیا بات کرے گا معشوقوں سے تو بات وہ کرتا ہی نہیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ ریاض کے یہاں جذبۂ محبوبیت عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ بذاتِ خود حسین

اس نے حسینان و مہوشاں ان کی نظر میں نہیں جچتے تھے - اسی بنا پر وہ ان کے سامنے عشوہ و غمزہ کا کرتے تھے - وہ ان کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ان کی تمنا تھی کہ وہ شیرنگانِ گورکھپو ران سے محبت کریں دراصل ریاض گورکھپوری اردو شاعری کے یونانی نرگس ہیں۔

سیماب اکبر آبادی
۱۸۸۰ - ۱۹۵۱ء

اگرچہ سیماب اکبر آبادی کوئی حسین و جمیل شخص نہیں تھے مگر انھوں کہیں کہیں جذبہ محبوبیت کا اظہار کیا ہے - اس کا غالباً سبب ان کی شہرت ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں -

رکھئے مری نزاکتِ احساس کا خیال	پھولوں کا ہوں مزاج طبیعت بہار کی

اس شعر میں سیماب نے کہا ہے کہ انھوں نے مزاج پھولوں کا اور طبیعت بہار کی پائی ہے - یہ علانیہ طور پر نرگسی ہے۔

مندرجہ ذیل شعر میں سیماب نے بتایا ہے کہ حسن کی طرح عشق میں بھی دل کشی موجود ہے

دونوں میں ہے ربودگی، مختلف الاثر سہی	حسن ہے دلربا تو کیا، عشق میں دلکشی نہیں

بہرحال سیماب اکبر آبادی کے یہاں جذبہ محبوبیت کی صدا مدھم سُروں میں سنائی دیتی ہے - ان یہاں ریاض کی شاعری جیسا جذبہ محبوبیت کا طوفان و طلاطم موجود نہیں ہے -

جگر مراد آبادی
(۱۸۹۰ء - ۱۹۶۰ء)

جگر مراد آبادی کی شاعری میں جذبہ محبوبیت نہایت طور پر موجود ہے - اس سے قبل ریاض خیر آبادی کے یہاں بھی جذبہ محبوبیت کا طوفان رنگ و بو ہم دیکھ چکے ہیں دونوں شعرا کی محبوبیت میں فرق ہے - ریاض ایک حسین و جمیل انسان تھے اس لئے انھوں نے مختلف میں اپنے حسن و شباب کی تصویریں پیش کی ہیں - جن میں صداقت کا رنگ موجود ہے، انھوں نے محبوب کے سامنے اپنی اداؤں کا بھی مظاہرہ کیا ہے اور اس کو ناز و انداز بھی دکھائے ہیں - جگر کی محبو اس سے مختلف ہے - وہ شکل و شباہت کے اعتبار سے جاذب نظر نہیں تھے بلکہ بڑی حد تک تھے اسلئے انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے جسمانی حسن کا ذکر نہیں کیا ہے مگر اُن کے یہاں عشق کا ایک مل ملتا ہے - ان کی نظر میں عاشق کا مرتبہ بلند ہے - اس لئے اگر معشوق ناز کر سکتا ہے تو عاشق کو بھی ناز کر ہے - انھوں نے قدیم شعرا کی طرح عاشق کو پست و حقیر قرار نہیں دیا بلکہ اس کی عظمت کو بلند کیا - یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بعض اوقات عاشق کو حسین کا بھی خطاب دے دیا ہے - ریاض کے مادی حسن ملتا ہے مگر جگر کے یہاں عشق کا ماورائی حسن موجود ہے -

جگر کے مندرجہ ذیل چند اشعار ان کی محبوبیت کو واضح کریں گے۔ جگر نے ایک شعر کہا ہے۔

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں — حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

اردو شاعری میں حسن کی رعنائیاں مشہور ہیں۔ محبوب جب ناز و انداز دکھاتا ہے تو عاشق مضطر ہوکر انگڑائی لینے لگتا ہے لیکن جگر نے اس تصور کو مسترد کر دیا ہے اور ایک نیا تصور پیش کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ عشق میں بذات خود رعنائیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر حسن انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ جگر نے اس خیال کا اظہار کر کے اپنے جذبۂ محبوبیت کو بے نقاب کیا ہے۔

جگر نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی اپنی محبوبیت کا اظہار کیا ہے۔

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں — مری آغوش کو اب حسرت آغوش نہیں

عام طور سے حسن کا تعلق معشوق سے ہوتا ہے اور عشق کا تعلق عاشق سے لیکن جگر نے حسن کی صفت کو عاشق سے بھی وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے ہی حسن پر فریفتہ ہوں، لہذا اب مجھے محبوب کے آغوش کی ضرورت نہیں ہے

جگر کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

اللہ اللہ نزاکتیں میری — اپنی خاطر پہ بھی گرانبار ہوں میں

نزاکت کا تعلق محبوب کی ذات سے ہے مگر جگر نے اس صفت کو اپنی ذات سے منسلک کر لیا ہے۔ اس طرح اپنے جذبۂ محبوبیت کو آشکارا کیا ہے

ہر لحظہ نیا جلوہ، نئی آن، نئی شان — میری نگہِ شوق بھی کیا شوخ و حسین ہے

یہ امر مسلمہ ہے کہ معشوق کی نظر شوخ و حسین ہوتی ہے لیکن جگر نے اس تصور کو بدل دیا ہے۔ وہ عاشق کی نظر کو بھی شوخ و حسین قرار دیتے ہیں

دست جنون عشق کی گلکاریاں نہ پوچھ — ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

عام طور سے محبوب سراپا بہار ہوتا ہے۔ لیکن یہاں عاشق بھی سراپا بہار ہے۔ جگر نے اس بہار آفرینی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ دست جنون عشق نے جسم کی دھجیاں اڑائیں۔ اس طرح خون رواں ہوا۔ خون کے چھینٹوں نے جسم پر گلکاریوں کے جلوے دکھائے اور بہار کا منظر پیش کر دیا۔

حسن تو تھک بھی گیا لیکن یہ عشق! — کار معشوقانہ کرتا ہی رہا!

جگر نے اس شعر میں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ عشق کارِ معشوقانہ کرتا رہا۔ یعنی عاشق خود معشوق کا کام کرنے لگا۔

اپنے کو میں آپ پوجتا ہوں ——— آئینۂ حسن روبرو ہے

عاشق ہمیشہ معشوق کی پرستش کرتا ہے لیکن جگر خود اپنی پرستش کر رہے ہیں۔ یہ نرگسیت کا نمایاں پہلو ہے۔ یونان کا نرگس بھی پانی میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر اپنے حسن پر فریفتہ ہو گیا تھا۔

اب مرے سامنے ٹھہرے تو گلستاں کوئی ——— ہو چلا ہے مری صورت سے نمایاں کوئی !

اردو شاعری میں معشوق کو اتنا حسین قرار دیا گیا ہے کہ اس کے سامنے گلستاں شرمندہ ہو جاتا ہے مگر یہاں عاشق کے سامنے گلستاں خجل ہے۔ جگر نے یہ خیال پیش کر کے اپنی محبوبیت نمایاں کیا ہے۔

جگر کے مندرجہ ذیل اشعار بھی ان کی محبوبیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بکھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے ——— یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

حسن کو بھی کہاں نصیب جگر ——— وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

عشق کی حد سے نکل کر پھر یہ منظر دیکھتے ——— کاش حسن یار کو ہم حسن بن کر دیکھتے

تم مری آنکھ سے دیکھو تو یہ دنیائے جمال ——— ہائے کیا چیز مرا عشق خدا داد بھی ہے

درد نے کروٹ ہی بدلی تھی کہ دل کی آڑ سے ——— دفعتہً پردہ اٹھا اور پردہ دار آ ہی گیا !

حسن سے بھی دل کو بے پروا کیا ——— کیا کیا اے عشق تو نے کیا کیا

نازک مزاج عشق کی اللہ ری خاطریں ——— اتنی نزاکتوں کو مرا دل بنا دیا ! !

آج اک حسین نے رشک کے قابل بنا دیا ——— آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بیدل بنا دیا

ہوا کچھ ایسی ہی چل گئی ہے دلوں کی دنیا بدل گئی ہے ——— وہ ہم کو مطلوب ہو رہے ہیں ہم ان کو طالب

نیاز عاشقی کو ناز کے قابل سمجھتے ہیں ——— ہم اپنے دل کو بھی اب آپ ہی کا دل سمجھتے

ہمیں بھی نہ اب چین آئے گا جب تک ——— ان آنکھوں میں آنسو نہ بھر لائیے گا

خوشا یہ پندار عشق اپنا، زہے شکست غرور ان کا !

وہ ہم سے نظریں ملا رہے ہیں، ہم ان سے نظریں ہٹا رہے ہیں

وہ اور ناز عشق گوارا کریں مگر ——— اتنا کھنچے ہم ان سے کہ مجبور کر دیا

جلوں میں راہ محبت میں بے نیاز آثار ——— مری بلا سے اگر وہ بھی ناصبور آئے

انکار اور اس پہ اصرار، وہ بھی پیہم ——— تم مجھ کو چاہتے ہو ثابت ہوا یہیں سے

یا وہ تھے خفا ہم سے یا ہم ہیں خفا ان سے ——— کل ان کا زمانہ تھا آج اپنا زمانہ ہے

اے عشق جنوں پیشہ ہاں عشق جنوں پیشہ — آج ایک ستمگر کو ہنس ہنس کے رلانا ہے
عشق تنہا ہی نہیں شوریدہ سر میرے لئے — حسن بھی بے تاب ہے اور کس قدر میرے لئے
وہیں وہیں سے اٹھے ہیں ہزار ہا فتنے — جہاں جہاں سے میں گزرا ہوں بے نیازانہ

یہ سارے اشعار جگر کی محبوبیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ جگر کی محبوبیت نہایت خوشگوار اور طرب آفریں ہے۔ اس میں کڑی دھوپ کی شدت نہیں ہے۔ بلکہ ڈھلتی ہوئی چھاؤں کی لطافت ہے۔

ساغر نظامی (ولادت سنہ ۱۹۰۵)

ساغر نظامی کی شاعری میں بھی جذبۂ محبوبیت کا سنگار ملتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ جوانی میں وہ بھی بے حد حسین تھے۔ شاعروں میں ساغر کی کامیابی کا سبب ان کے ترنم کے علاوہ ان کا حسن و جمال بھی ہے۔ چونکہ ساغر کو خدا نے حسن عطا کیا ہے اس لئے انھوں نے اپنی جوانی کی تعریف چند رباعیات میں کی ہے

ان کی مندرجہ ذیل رباعیات ملاحظہ ہوں۔

تسکین نگاہ ہے جوانی میری — جلووں کی پناہ ہے جوانی میری
آلودۂ تخریب ہوں جوشِ دل سے — فطرت کا گناہ ہے جوانی میری
حسرت کرتی ہے میزبانی میری — وحشت بنتی ہے یارِ جانی میری
لبریز تاثرات ہوں میں ساغر — جذبات کی دنیا ہے جوانی میری

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساغر جب جوان تھے تو ان کی جوانی واقعی تسکینِ نگاہ تھی۔ اب نئی نسل ان کے حسن و شباب کا اندازہ نہیں کر سکتی ہے مگر جن لوگوں نے ان کو ان کے عالم شباب میں دیکھا ہے وہ تسلیم کر لیں گے کہ ساغر نے ان رباعیات میں صداقت کی مے بھر دی ہے۔

غرضیکہ اردو شاعری میں جذبۂ محبوبیت کی جھلک مختلف شعراء کے یہاں ملتی ہے۔ بعض شعراء کے یہاں یہ جھلک ایک آرسی اور آئینہ کی صورت نمودار ہوتی ہے اور بعض شعراء کے یہاں یہ ایک ہلکے سائے کی طرح نظر آتی ہے۔ مگر یہ دونوں صورتیں دلکش ہیں۔ بہرحال اردو شاعری جذبۂ محبوبیت سے خالی نہیں ہے۔ اس کے دامن میں نرگسیت کے اس قسم کے بھی کچھ حسین پھول ہیں جن سے ہمارے دماغ معطر ہو جاتے ہیں

اصغر عباس
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی

سرسید کے نام مشاہیر کے خطوط

(غیر مطبوعہ)

یہاں نواب ضیاءالدین احمد، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی، حالی، احمد علی شوق اور دوسری شخصیتوں کے سرسید کے نام غیر مطبوعہ خطوط پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں بعض خطوط سے ان بزرگوں کی علی گڑھ تحریک سے وابستگی اور دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ سچ پوچھئے تو علی گڑھ تحریک کا پودا عزت کی ہوا میں لگایا گیا تھا لیکن جلد ہی اس کو ایسے لوگ ملے جنہوں نے اس پودے کو پروان چڑھانے میں کنشیم سحر کا کام دیا۔ حالی، شبلی، اور نذیر احمد وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔

ان خطوط سے مکتوب نگاروں کی تعلیمی سرگرمیوں، انکی اصلاحی کوششوں اور علی گڑھ تحریک سے متعلق ان کے ذاتی خیالات کی بھی بہترین عکاسی ہوتی ہے یہی نہیں بلکہ ان سے علی گڑھ کی تحریک کی بعض گمشدہ کڑیوں کا سلسلہ بھی ملتا ہے

نذیر احمد کے تعلقات علی گڑھ تحریک کے ابتدائی دور سے لے کر آخر تک سرسید سے رہے۔ اس زمانے میں یقیناً دونوں نے ایک دوسرے کو خطوط لکھے ہوں گے لیکن حیرت ہے کہ سرسید کے خطوط کے چار مجموعے شائع ہوئے لیکن ان میں ایک خط بھی ڈپٹی نذیر احمد کے نام نہیں ملتا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط کا صرف ایک مجموعہ موعظۂ حسنہ کے نام سے شائع ہوا۔ ان میں صرف وہ خطوط شامل ہیں جو مولوی صاحب نے اپنے بیٹے کے نام لکھے ہیں۔ اس لئے سرسید کے نام اس میں کوئی خط ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے علاوہ راقم کے علم میں ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط کا کوئی مجموعہ نہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں ڈپٹی نذیر احمد کے جو خطوط درج کئے گئے ہیں انکی اہمیت کچھ بڑھ جاتی ہے۔

حالی کے خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے لیکن تعجب ہے کہ ان میں سرسید کے نام ایک خط بھی نہیں ہے حالانکہ حالی کا تعلق سرسید سے ۱۸۶۶ء سے لے کر ان کے آخری ایام تک رہا۔ اس لحاظ سے یہ خطوط اہم ہیں۔

یہاں جو خطوط درج کئے گئے ہیں ان کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ جن لوگوں کے خطوط پہلے سنہ میں شروع ہوئے ان کے خطوط پہلے درج کئے گئے ہیں جن کے بعد میں لکھے گئے ان کو بعد میں رکھا گیا ہے۔

مکتوب نگاروں کے مختصر سوانحی حالات علی گڑھ تحریک کے پس منظر میں درج کئے گئے ہیں۔

یہ خطوط آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی کے ذخیرہ مخطوطات سے دستیاب ہوئے ہیں۔ راقم اس سلسلے میں جناب

پروفیسر نثیر الدین صاحب اور آزاد لائبریری کے کارکنوں کا شکر گزار ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد[1]

(۱)

جناب بندہ ۔ باین عجلت میری رائے یہ ہے کہ بزرگان دین کا توسط انتخاب کمیٹی مذہبی کے لئے امید مفید ہو اول تو بزرگان دین ان معاملات میں صرف توجہ کو فعل عبث سمجھیں گے ثانیاً جو توجہ کریں گے وہ ہضماً للنفس اپنے علیحدہ رکھ کر دوسروں کو نامزد کریں گے۔ اس میں کیا قباحت ہے کہ خود ممبران کمیٹی خزینۃ البضاعۃ اپنی تجویز سے ممبران مذہبی کو نامزد کر کے مشتہر کریں اور عامۂ مسلمین کو وجہ اعتراض کی اجازت دیں اور اعتراضات پر لحاظ مناسب کر انتخاب مستحکم کرلیں۔ بزرگان دین جیسے فی زماننا ہیں امور انتظامی میں رائے دینے کی کمتر قابلیت رکھتے ہیں۔ آپ لکھیے کہ آپ کی کمیٹی خزینۃ البضاعۃ جیسی کتاب ہے اور خصوصاً جیسے کہ وہ ہونے والی ہے بہترین اہل اسلام پر مشتمل ہے اور اوس کو انتخاب کمیٹی مذہبی سے جدا رکھنا گویا دیدہ و دانستہ ایک عمدہ انتظام کا خراب کر اور آپ دیکھ لیجئے گا کہ گو بزرگان دین متوسط قرار دیئے جائیں اور گو جمہور مسلمین کو اعتراض کرنے کی اجازت بھی مگر کام چار و ناچار کمیٹی خزانۃ البضاعۃ کو کرنا پڑے گا۔ فقط

از مقام اعظم گڈھ ۱۲ر جولائی ۱۸۷۴ء

خاکسار نذیر احمد

---

[1] ڈپٹی نذیر احمد مولوی سعادت علی کے بیٹے تھے ۶ر دسمبر ۱۸۳۶ء کو موضع ریہڑ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر اور دہلی کی مسجد اورنگ آبادی میں حاصل کی ۱۸۴۵ء سے دہلی کالج کے طالب علم ہوئے۔ وظیفہ مل گیا۔ خود لکھتے ہیں کہ "جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں اور نہ صرف میں نے بلکہ سارے خاندان نے سلسلۂ ملازمت کا آغاز سمجھا" ملازمت میں خاصی ترقی کی اور حیدرآباد میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو گئے۔ سترہ سو روپیہ تنخواہ ہو گئی۔ سر سید سے بعض اختلافات کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد علی گڈھ تحریک کے معاون رہے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقرروں میں میں نذیر احمد کو امتیاز حاصل تھا۔ سر سید کی وفات کے بعد کانفرنس کے جلسوں میں جانا بہت کم ہو گیا خود کہتے ہیں۔

کیا کہیں شغلہ لکچر کا ابھی چھوٹ گیا		ہم سے ایک یار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا

(۲)

جناب عالی — اس وقت تو میرا حال یہ ہے کہ گھر ہسپتال ہو رہا ہے اور تو معمولی طور کے بیمار ہیں ایک لڑکی اس قدر علیل ہو گئی ہے کہ اس کی طرف سے سب کو پریشانی ہے۔ بشیر کی ایک آنکھ میں خدا جانے کیا آفت آگئی ہے کہ ابتداءً آشوب چشم کا اشتباہ رہا اور اسی کا درمان کرتے رہے علاج سودمند نہ ہوا تو ڈاکٹر لاری کو آنکھ دکھائی انھوں نے تجویز کیا ہے کہ مردمک میں خراش آگیا ہے غرض چند ے ڈاکٹر لاری کا علاج کرتے رہے۔ کچھ فائدہ نہ ہوا ناچار بشیر مدراس چلے گئے وہاں ڈاکٹر براکمن کی طرف رجوع کیا سب سے اخیر خط جو آیا ہے لکھا ہے کہ ہنوز کچھ فائدہ نہیں ان وجوہ سے اس وقت تو میری طبیعت مطلق حاضر نہیں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ خود مدراس بشیر پاس چلا جاؤں اور کبھی کہتا ہوں کہ انکو یہاں آنے پر مجبور کروں۔ اگر دو ہفتہ کے لئے کبھی طبیعت کو اطمینان ہو گیا تو جیسا پر ایسا اتفاق پڑے گا کچھ نہ کچھ لکھ کر کانفرنس میں حاضر ہوں گا مگر پریسیڈنٹ کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی اسی پرانی حیثیت سے کہ جب نوبت آئی کھڑا ہوا کچھ کہدیا۔ پریسیڈنسی کے قبول کرنے سے مجھ کو ابا نے کلی ہے اس سے مجھ کو معاف رکھا جائے۔ زیادہ حد ادب۔

۲۲ ر اکتوبر سنہ ۱۸۹۱ء

فدوی نذیر احمد

(۳)

جناب عالی

میں کسی طرح کی محنت کے خیال سے محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا پریسیڈنٹ ہونے سے گریز نہیں کرتا۔ تین چار دن کی کیا بساط اور ہر اجلاس میں شروع سے آخر تک بیٹھے رہنے کی محنت کیا لیکن میں اقران میں ایسی برتری کا حاصل کرنا سوانگ سمجھتا ہوں اگر جناب میرے انکار سے رنجیدہ خاطر نہیں ہوتے تو مجھ سے بہتر بہتر پریسیڈنٹ بہتیرے۔ وہ لڑکی جس کی علالت سے ہمارا سارا گھر پریشان تھا آخر امراض چند در چند سے جان بر نہ ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

فقط ۶ ر نومبر سنہ ۱۸۹۱ء

فدوی نذیر احمد

(۴)

دہلی۔ ۲۸ر اپریل

جناب عالی

کل ۲۷ر اپریل کو مدرسۂ طبیہ دہلی کا سالانہ جلسہ تھا صاحب کمشنر پریسیڈنٹ تھے اور ڈپٹی کمشنر ڈویژنل جج اور عمائد شہر مجتمع ہوئے تھے میں بھی گیا اور حسب معمول تقریر کر دیا۔ جلسے کی کارروائی سے پہلے شیخ نجم صاحب تحصیلدار دہلی نے مجھ سے کہا کہ صاحب کمشنر کو ایک شریف خاندان کا لڑکا درکار ہے جس کی عمر تقریباً ۲۴ کی ہو اور جو مہاراجہ بیکانیر کو اردو پڑھا سکے اور انکی مصاحبت میں رہے اور ایک شرط یہ ہے کہ علی گڑھ محمڈن طالب علم ہو۔ میں نے اپنے نواسے اور مولوی احسان الحق کے پوتے مشرف الحق کو وہیں تحصیلدار صاحب سے ملا دیا۔ اس واسطے کہ تمام شرائط کو میرے علم میں مشرف الحق اچھی طرح پوری کر سکتے ہیں۔ شریف ہیں اس واسطے کہ مولوی شاہ عبدالحق محدث کی نسل میں ہیں اردو ان کی مادری زبان ہے اور میرے نزدیک ان کی انگریزی استعداد بھی بہت اچھی ہے۔ اردو انگریزی دونوں خط بہت اچھے ہیں مسکین اور نیک بھی پرلے سرے کے ہیں۔

آج تحصیلدار صاحب نے مشرف الحق سے کہا کہ سر سید کی سفارش لاؤ چنانچہ اس سفارش کے لئے: ان کو خدمت عالی میں بھیجتا ہوں اور جس طرح کی سفارش درکار ہے بس ان کو اس کا پورا مستحق سمجھتا ہوا ان کو ڈگری تک پڑھانے کا ارادہ تھا مگر بد قسمتی سے ان کا بیاہ کر دیا گیا ہے اور ان کو نوکری کی دھن ہے ان کے چچا خان بہادر مولوی انوار الحق رزیڈنسی راجستھان کے مدتوں میر منشی رہے ہیں اور اب پنشنر دربار بھرت پور کی وکالت کرتے ہیں اور ان کے بنی اعمام متعدد رجواڑوں میں برسر خدمت ہیں۔ آ جناب کی عنایت سے یہ مہاراجہ بیکانیر کی مصاحبت میں پونہچ جائیں گے تو جینے کی کوئی تدبیر کرلیں گے۔

زیادہ حد ادب

فدوی

نذیر احمد

(۵)

جناب عالی ۔ کمیٹی مجوزہ انعام جواب مضمون میں سے مولوی سید کرامت حسین صاحب سے میں واقف نہیں ۔ مولوی شبلی سے معرفت اور مولوی حالی کی خدمت میں نیاز اور ذکاء اللہ سے دوستی۔ تو اگر آپ مجھ کو اس کمیٹی میں شریک کرتے ہیں تو میں ذکاء اللہ کی ہاں میں ہاں ملا دوں گا ۔

زیادہ حد ادب

۴ر دسمبر ۱۸۹۱ء

فدوی نذیر احمد

(۶)

جناب عالی ۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ مجھ کو پریذیڈنٹ بنانے کا خیال اگر یہ ایک ہی منٹ کے لئے کیوں نہ ہو للہ چھوڑ دیجئے ۔ اس کے تصور سے میرا جگر بدمزہ ہوا جاتا ہے آخر کچھ تو ایسی ہی بات ہے کہ میں اتنا اصرار کرتا ہوں ۔ زیادہ حد ادب

۲۰ر دسمبر ۱۸۹۱ء

فدوی نذیر احمد

نواب ضیاء الدین احمد

(۱)

جناب مولوی صاحب مشفق و مکرم عنایت فرمائے مخلصان سلامت بعد سلام مسنون الاسلام آنکہ سابق کو میں ماہ گذشتہ میں الطاف نامہ سامی مطبوعہ بطلب زرچندہ بابت مدرستہ العلوم اسلامی پاس مخلص کے وصول ہوا تھا موافق اوسکے بالفعل یکصد و پنجاہ روپیہ سکہ چہرہ شاہی کے قرض ملفوف رقیمہ ہذا بصیغہ رجسٹری بتعداد مرقومۃ الذیل بھیجتا ہوں چاہیے کہ رسید زر مرسلہ تحریر فرمادیں اور چونکہ امسال بہ تقریب شادی برخوردار مرزا سعید الدین احمد خاں طالع عمرہ صرف کثیر شادی میں ہوا تھا اس لئے زیادہ تر روپیہ بھیجنے سے معذور رہا آئندہ کو میں انشاء اللہ تعالیٰ بخیر و خیریت ہنگام وصول سال حال دیا آغاز [illegible] میں اسی قدر روپیہ اور بھیجا جاوے گا۔ خاطر مبارک مطمئن ہووے ۔ اطلاعاً لکھا گیا ۔ فقط رقیمہ آلود احقر العباد ضیاء الدین احمد عفی عنہ

مرقومہ ۱۵ر جولائی [illegible] مقام شہر دہلی

لہ ضیاء احمد [illegible] میں پیدا ہوئے ۔ نواب شمس الدین خاں کے چھوٹے بھائی تھے ۔ (ملاحظہ ہو صفحہ [illegible])

(۲)

مولوی صاحب مشفق و مکرم مظہر عنایت آثم مولوی سید احمد خاں صاحب سی ایس آئی سلامت بعد ہٰ
مسنون الاسلام گذارش آنکہ عرصہ دراز کے بعد عنایت نامہ مرقومہ ۲۰ فروری بہ سپیل ڈاک مجھے ملا نہایت ممنون و مشکور کیا آپ کا تشریف لے جانا شام پور میں اور وہاں سے واپس آتے ہوئے بمقام بلند شہر ۲۷ ، ۲۸ فروری تک اور وہاں مخلص کو بلانا بابت جیب کے لئے معلوم ہوا مگر چونکہ مجھے دورہ مرض قدیمہ ضیق النفس کا لاحق ہوتا ہے تو اس حال میں مجھے اتنی بھی طاقت نہیں ہوتی ہے کہ اپنی جگہ سے پائیں مکان تک جا سکوں چنانچہ وہی دورہ اس عرصہ میں مجھے دامن گیر رہا۔ اور ساتھ ہی اس کے بخار و شدید درد سر گاہ دوران سر بھی ہوتا ہے۔ اس لئے مجبور ہوں ورنہ بلند شہر و بنارس کو اپنے گھر کی برابر جانتا ہوں مجھے گمان تھا کہ بہ تقریب اجرائے نہر و تعمیر مقام اوکھلہ جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی وہاں تشریف لاویں گے اور صاحب لوگ و زمینداران و رؤسا اس جگہ فراہم ہوں گے بہ سبب اسکے کہ آپ کا تعلق بھی اسی گورنمنٹ سے ہے شاید آپ بھی تشریف لاویں سو یہ امر بھی بباعث ناسازی مزاج نواب ممدوح کے مذبذبین میں ذلک ہے اس مدعا کو منحصر بر وقت آئندہ رکھتا ہوں اور بس

آپ نے زر چندہ بقیہ مدرسۃ العلوم کے بابت تحریر فرمایا ہے من جملہ اسکے کسی قدر خدمت میں پہونچا اور نیز زر باقی بتدریج انشاء اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً آپ کے پاس پہونچے گا۔ اطلاعاً رقم پذیر ہوا۔ فقط

راقم آثم ضیاء الدین احمد عفی عنہ

مرقومہ ۲۵ فروری سنہ ۶۳ء روز چہار شنبہ۔ مقام شہر دہلی

(حاشیہ ما بقیہ) لوہارو ان کے جد اعلیٰ کی جاگیر تھی۔ عربی، فارسی اور ترکی زبان میں اچھی دستگاہ تھی خاص طور سے علم تواریخ اور جغرافیہ میں نہایت کمال تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایلیٹ نے کیمبرج ہسٹری نواب ضیاء الدین احمد کی مدد سے لکھی۔ ٹیونس کے وزیر خیر الدین کی عربی تاریخ اقوام المسالک کا اردو ترجمہ سر سید نے نواب ضیاء الدین احمد کی تحریک پر کرایا تھا۔ یہ کتاب نواب صاحب نے ہدیۃً مجلس خزینۃ البضاعۃ کو عنایت کی تھی۔ شاعری میں غالب کے شاگرد تھے۔ نیر اور رخشاں تخلص کرتے تھے۔ ۲ رجب ۱۳۰۲ھ کو بعارضہ ضیق النفس دہلی میں انتقال ہوا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی میں دفن کئے گئے۔ حالی نے کہا۔

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبک طناز ۔۔۔ آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبل زار ۔۔۔ سو اس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز

شبلی نعمانی

(۱)

بحضرت اقدس

جو خفیف رقم میں ارسال کرتا ہوں اوس کی نسبت مجھ کو انتظار تھا کہ وہ ایک معتدبہ رقم کے ساتھ مرسل ہوگی۔ مگر میری جسمانی اور اہل شہر کے روحانی ضعف کی وجہ سے اوس میں تعویق ہوئی۔ چھینہ لب بام تھا مجبوراتہ اپنا چندہ بھیجتا ہوں۔

اس بات کی اطلاع بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نے مجبوری سے تعطیل تک کی رخصت کی عرضی پرنسپل صاحب کی خدمت میں ارسال کی ہے مگر حیرت ہے کہ جواب نہیں آیا۔

۱۹ دسمبر ۱۸۸۳ء

خادم قدیم
شبلی نعمانی [1]

---

[1] علامہ شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک مردم خیز قصبہ بندول میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حبیب اللہ تھا۔ شبلی نے اپنے دور کے بڑے علماء و فضلا سے تعلیم حاصل کی جن میں مولانا فاروق چریاکوٹی، مولانا فیض الحسن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لیکن اصل تربیت سرسید کی تھی جس نے محمد شبلی کو علامہ شبلی بنایا۔ علی گڑھ تحریک کا آغاز تو ۱۸۷۵ء سے بلادِ پورب میں ہو چکا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں سرسید اعظم گڑھ گئے اور وہاں انھوں نے باقاعدہ مجلس خزینۃ البضاعۃ کی شاخ قائم کی مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں

"اس تحریک (علی گڑھ تحریک) نے ان اطراف کے مسلمانوں میں کافی اثر پیدا کر دیا تھا خود مولانا (شبلی) کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب اسکے زبردست حامی ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۱ء میں شبلی اپنے بھائی مہدی حسن سے ملنے علی گڑھ آئے اور ساتھ میں سرسید کی شان میں ایک عربی قصیدہ لائے یہی قصیدہ شبلی کی آئندہ شہرت کا دیباچہ بن گیا اور وہ فروری ۱۸۸۳ء میں مدرسۃ العلوم میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہاں سرسید کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ استفادہ کے لئے ان کا کتب خانہ ملا۔ علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا نے جس نے شبلی کے زاویہ نگاہ کو بدل دیا اور انھیں نئی جہتوں سے آشنا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

(۲)

حضرت اقدس

سفرنامہ پنجاب غالباً طیار ہوگیا ہوگا۔ ولیم بیسل کے ذریعہ سے مرحمت ہو۔ روزنامچہ شاہ ایران میں بہت سے ایسے لفظ ملتے ہیں جن کی نسبت شک ہے کہیں سے اونکی تحقیق نہو سکے گی۔ اطلاعاً عرض ہے

۱۵ر جون ۱۸۸۴ء

شبلی نعمانی

(۳)

حضرت اقدس

مولوی محمد فاروق صاحب نے حسب ارشاد اشعار لکھے ہیں جن کو میں ساتھ لاؤں گا۔ صاحب موصوف وہاں کے قیام کو پسند فرماتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ اس پایہ شخص اس قلیل مشاہرہ پر بمشکل ہاتھ آسکتا ہے۔ اگر ارشاد ہو تو میں اون کو ساتھ لاؤں

والسلام

۸ اگست ۱۸۸۴ء

محمد شبلی

(۴)

حضرت سید اقدس ادام اللہ بقاءہ

چونکہ کالج کا کوئی کام اب میرے متعلق نہیں رہا اس لئے امید ہے کہ آپ مجھکو ابھی سے گھر جانے کی اجازت عطا فرمائیں گے

۲۴ر اپریل ۱۸۸۵ء

محمد شبلی

(۵)

سیدی وسیدے دام فضلکم

تعلیمی کانگرس کے متعلق اس وقت تک یہ ہوا کہ ایک سب کمیٹی منعقد ہوئی۔ اور دو قسم کے ممبر قرار پائے۔ (۱) جو اکس بڑی کانگرس کے بھی ممبر ہوں گے۔ اون کے نام ذیل میں ہیں
جناب منشی محمد اکرام صاحب۔ جناب راجہ ریاست حسین صاحب۔ جناب خواجہ مغل صاحب۔ جناب شیخ حبیب اللہ صاحب۔ جناب حکیم حفیظ اللہ صاحب۔ جناب مولوی عبدالمجید صاحب۔ محمد شبلی۔ ان سب نے فیس داخلہ ادا کردی ہے اور علی گڈھ پہونچ کر میں حاضر کردوں گا۔ باقی ممبر وہ ہیں جو رپورٹ وغیرہ کے طیاری میں محنت ومال سے مدد دیں گے۔ اس کمیٹی کی روئداد علی گڈھ گزٹ میں مشتہر ہونی چاہئے تاکہ اور جگہ سب کمیٹیاں قائم ہوں۔ تعجب ہے کہ اسوقت تک بہت کم درخواستیں آئیں۔ شاید اسکی تحریک میں صرف اخبار کی تحریر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ حالانکہ ہر ضلع میں احباب کے پاس رپورٹ خطوط بھیجے جانے چاہئیں۔ یہ امر نہایت ضروری اور مہتم ہے۔ گرمی غضب کی پڑتی ہے۔ روز سے بڑی مشکل سے کٹتے ہیں۔ میں تو آدھا رہ گیا ہوں۔ خط لکھنا بھی بہت دشوار ہوتا ہے۔ اب تسلیم عرض کرتا ہوں۔

۱۴ر جون ۱۸۸۶ء

شبلی۔

(۶)

سیدی

تسلیم۔ مریضہ کا حال بدستور ہے۔ افسوس ہے کہ جناب جدامجد نے بیاسی برس کی عمر میں تین چار دن ہوئے انتقال کیا۔ اگرچہ اونکی عمر پوری ہوچکی تھی لیکن چونکہ اونکی موت ناگہانی طور پر ایک صدمہ سے ہوئی اس لئے لوگوں کو نہایت رنج ہوا۔ اونکے تمام قوی درست تھے۔ میں نے رسالہ حسن او نکو دیا تھا تو بغیر عینک کے پڑھ گئے خدا مغفرت کرے۔ میں اعظم گڈھ ٹھیرا گیا نہ مقصد ہے لیکن چونکہ اس حادثہ کی وجہ سے والد قبلہ خود آئے تھے سامنا ہوگیا۔ میں جلد تر یہاں سے روانہ ہوں گا۔ شاید سردست لکھنؤ جاؤں۔ قانون شہادت وجلد اس پتہ سے ارسال فرمائیے

مولوی محمد سعید وکیل عدالت ضلع اعظم گڈھ

حافظ حبیب اللہ خاں وکیل منصفی اعظم گڈھ ۔ عدالت منصفی دونوں پر کتاب کا نام اردو میں لکھا جائے
لکھ دیا جائے بقرماشی محمد شبلی ۔ حالات مفصل سے مطلع فرمائیے جناب مولوی زین العابدین
کی خدمت میں تسلیم و نیاز

شبلی نعمانی
۱ ؍ جون ۱۸۹۰ء

(۷)

جناب انریبل سید احمد خاں صاحب سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، بجواب آپ کی چٹھی
۳ ؍ نومبر ۱۸۹۱ء کے عرض ہے کہ میں نہایت فخر کے ساتھ کمیٹی تعین انعام کا ممبر ہونا منظور کرتا ہوں

۲ ؍ دسمبر ۱۸۹۱ء
شبلی نعمانی

الطاف حسین حالی

(۱)

عالی جناب سید صاحب قبلہ دام ظلہم العالی
تسلیم بعد تحمید و تکریم ۔ سجاد حسین کا کچھ مختصر حال پہلے عریضہ میں گذارش کر چکا ہوں ۔ باقی حال:
کرنیگ صاحب سکریٹری گورنمنٹ پنجاب کے ایما سے بالفعل یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ جس ڈپارٹمنٹ میں محکمہ
سرکاری ملازمت اختیار کی جائے ، چنانچہ کرنل ہالرائڈ صاحب نے کل سجاد حسین کو ضلع فیروزپور میں ڈسٹرکٹ
انسپکٹر مدارس مقرر کر دیا ہے اوس نے یہ اجازت چاہی تھی کہ میں چند روز کے لئے علی گڈھ جا کر کمیٹی کی اجازت
حاصل کر لوں مگر صاحب ممدوح نے یہ کہا کہ ضلع فیروزپور میں بہت جلد جانا چاہئے کیونکہ وہ بہت دن سے ڈسٹرکٹ
انسپکٹر سے خالی ہے پس تم یہ مراتب بذریعہ تحریر طے کر لو چنانچہ سجاد حسین نے آج تک درخواست پرنسپل صاحب
کی خدمت میں بدر خواست رخصت دو ماہ بھیج دی ہے اور میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ آپ
اس کی اس خواہش کو منظور فرمائیں ۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب نے ۵۶ سکالرشپیں مسلمان طلبہ کے واسطے
بدیں تفصیل مقرر کی ہیں ۲ بی اے کے لئے بتعداد فی کس للعہ اور ۲ ایف اے کے لئے
فی کس عہ اور آٹھ انٹرینس کے لئے فی سے اور ۴۲ مڈل سکول اور اپر پرائمری کے لئے اور ...

سرکیولر تمام سرکاری محکموں میں جاری کیا ہے کہ ملازمت میں آئندہ سے ہندو مسلمانوں کی نسبت کا لحاظ رکھا جائے
اطلاعاً عرض کیا گیا زیادہ حد ادب

عریضہ خاکسار
الطاف حسین ایچیسن کالج لاہور
۱۶ / فروری ۱۸۸۶ء

(۲)

عالی جناب سید صاحب و قبلہ
حسب ارشاد ۱۲ / جولائی تک حاضر خدمت ہوں گا اطلاعاً عرض کیا گیا میرے لئے ٹھیرنے کا کچھ بندوبست
فرمائیے گا میں درصورتیکہ ٹھیرنے کی کہیں گنجائش نہ ہوئی تو محمد زاہد طالب علم فرسٹ ایر کلاس محمدن کالج کے
پاس ٹھیر جاؤں گا ۔ زیاد حد ادب

عریضہ نیاز خاکسار الطاف حسین حالی

۱۶ / جولائی ۱۸۸۶ء

(۳)

عالی جناب سید صاحب و قبلہ مدظلہم العالی
نواب محمد اسحاق خاں صاحب نے آپ کی لائف جو حال میں لکھی گئی ہے لندن سے منگوائی ہے

ؔ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ۱۸۶۷ء میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے حالی کا تعارف سرسید سے کرایا ۔ اس وقت سرسید کی تعلیمی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا ۔ سائنٹیفک سوسائٹی قائم ہو چکی تھی ۔ گزٹ نکل رہا تھا اور پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا چرچا پھیل رہا تھا ۔ حالی کو بھی اس تحریک کی اہمیت کا احساس ہوا ۔ انھیں اندازہ ہوا کہ سرسید نے غلامی کی تیرگی میں آزادی فکر کا جو چراغ روشن کیا ہے اور قوم کے ذہنی جمود کا پر تحقیق و تفتیش کی جو طرح ڈالی ہے اس کے اثرات بہر حال ہوں گے " اس دن سے مرتے دم تک تقریباً چالیس ہی سال حالی کا تعلق علی گڑھ سے رہا وہ سرسید کے کاموں میں ان کے شریک ، مشیر اور ساتھی رہے ۔ زبان سے قلم سے ہاتھ پاؤں سے ہر طرح علی گڑھ تحریک کی خدمت کرتے رہے ۔"

اور اون کا ارادہ اسکو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرنے کا ہے۔ عبارت وغیرہ کی درستی کا وعدہ میں ان سے کر لیا ہے مگر وہ آپ کی اجازت چاہتے ہیں اور انکو یہ بھی خیال آیا ہے کہ شاید کسی اور شخص نے بھی ایسا ارادہ کیا ہو اور میری ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ آپ از راہ عنایت یا تو انکو براہ راست تحریر فرما دیں یا نیازمند کو مطلع فرمائیں کہ آپ کی اس باب میں کیا رائے ہے آیا ترجمہ ہونا چاہئے یا نہیں اور اگر آپ کے علم میں کسی اور شخص نے ترجمہ کا ارادہ کیا ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیں نواب محمد اسحاق خاں صاحب بالفعل ضلع فرخ آباد میں بدل گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آج کل مجھے فرصت ہے اس کتاب کے ترجمہ کرنے کا مجھے بخوبی موقع مل سکتا ہے میں اپنے بڑے بھائی صاحب کی علالت کی خبر سن کر پانی پت آیا تھا اور پرسوں انشاء اللہ تعالیٰ یہاں سے اونکو ساتھ لیکر دلی جانے کا قصد ہے کیونکہ اون کا مرض بڑھ گیا ہے اور یہاں علاج کی کوئی صورت خاطر خواہ نہیں ہے۔ نیاز نامہ کا جواب اگر مرحمت ہو تو دلی میں متصل کوچہ چیلان حویلی میر افضل مرحوم کے پتے سے مرحمت ہو۔

زیادہ حد ادب

عریضہ نیازمند الطاف حسین از قصبہ پانی پت محلہ انصاریان

مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۸۸۵ء

(۴)

عالی جناب

مکرمت نامہ شرف صدور لایا۔ امام غزالی کی لائف لکھنے کو میں حاضر ہوں۔ مولوی شبلی صاحب نے جو کام شروع کیا ہے اسکو پورا ہوتے دیکھئے۔ مگر بالفعل میرا ارادہ یہ ہے کہ جس مضمون کا آپ نے اشتہار دیا ہے اس پر میں بھی اپنے خیالات ظاہر کروں۔ مجوزین انعام میں سے میرا نام خارج کرنے کی شاید کچھ ضرورت نہ ہو کیونکہ وہ صرف ان مضامین کو دیکھیں گے جو بغرض انعام لکھے جائیں گے۔ میں یہ مضمون محض اس خیال سے لکھنا چاہتا ہوں کہ شاید میں کچھ ایسے اسباب بیان کر سکوں جنکا تدارک ممکن ہو اور نیز ان متواتر شکستگیوں کا دفع بھی منظور ہے جو آپ کے احکام کی تعمیل نہ کرنے سے ہوئی ہیں۔

امید ہے کہ اس مضمون کے اختتام کو پہنچنے تک حیدر آباد کا وظیفہ جاری ہو جائیگا۔ اور مجھکو مدرسے سے تعلق قطع کرنے کا موقع ملے گا۔ پھر امام غزالی کی لائف بہ اطمینان تمام لکھ سکوں گا لیکن دہلی یا پانی پت میں ایسے مضامین کے لئے میٹریل بہم پہنچنا سخت دشوار ہے آپ سے استمداد کی بہت ضرورت ہوگی یا علی گڈھ میں رہ کر یہ مضمون پورا کرنا پڑے گا۔

مجھکو حیدر آباد کے معاملات سے ذاتی واقفیت نہیں ہے لیکن اکثر لوگوں سے یہ سنا جاتا ہے کہ سرکار عالی سے جو رقم کسی کے لئے بطور وظیفہ مقرر کی جاتی ہے اسکو چنداں استحکام نہیں ہے اس کے بھروسے پہ مدرسہ کا تعلق قطع کرنا مصلحت نہیں مگر میں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ مجھ جیسے دائم المرض کی زندگی سے تو بہر حال وظیفہ کو زیادہ استحکام ہوگا اور سچ یہ ہے کہ مدرسہ کا کام اب ہو نہیں سکتا۔ اگر مولوی مشتاق حسین صاحب کی بدولت یہ صورت نہ نکلتی تو بھی مدرسہ کا تعلق قائم رکھنا دشوار تھا۔ اگر جناب ممدوح کی موجودگی میں یہ عریضہ پہنچے تو انکی خدمت میں شکر اور دعا اور امید کے سوا اور کیا عرض کروں۔ زیادہ حد ادب

عریضہ خاکسار نیازمند

الطاف حسین حالی از دہلی کوچہ پنڈت

۷ مارچ ۱۸۹۰ء

(۵)

والا جناب

میں نہایت خوشی سے اس کمیٹی کی ممبری اور شرکت کو قبول کرتا ہوں جو رسائل متعلقہ تعلیم اعلیٰ وادنے پر انعام تجویز کرنے کے لئے آپ نے مقرر فرمائی ہے اور جہاں تک ممکن ہوگا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جو آخر ماہ حال میں قرار پایا ہے شریک ہوں گا۔

آپ کا نیازمند

الطاف حسین حالی از پانی پت ضلع کرنال

۴ر دسمبر ۱۸۹۱ء

(۶)

عالی جناب

میں ایک روز کے واسطے دلی گیا تھا۔ ننھے خاں صاحب کے مکان پر مرزا اسکندر شاہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اگر آپ کو انکے وہاں بلانے کی ضرورت باقی ہے تو وہ آنے پر مستعد معلوم ہوتے ہیں میونسپل کمیٹی دہلی میں انکو شاید چالیس روپیہ ماہوار ملتے ہیں اور سول سرجن نے انکے لئے پچاس روپیہ ماہوار کی سفارش کی ہے مگر وہ کمیٹی کے ہندوستانی ممبروں کے سخت شاکی ہیں اور کمیٹی میں رہنا نہیں چاہتے آپ بورڈنگ ہاؤس میں

اگر انکو پچاس روپئے ماہوار دیں گے تو وہ خوشی سے چلے آویں گے مگر وہ کہتے ہیں کہ کمیٹی کے جن ممبروں سے مجھے تعلق ہے ان سے ہرگز یہ توقع نہیں کہ علی گڈھ میں رہنے کے لئے مہینا دو مہینے کی رخصت منظور ہونے دیں پس مجھکو یہاں سے بالکل قطع تعلق کر کے آنا پڑے گا۔ اس صورت میں نہ انکو چند روز بعد واپس چلے جانے کا موقع رہے گا اور نہ آپ درصورتیکہ انکا کام پسند نہ آیا انکو جواب دے سکیں گے۔ لیکن جہاں تک خیال کیا جاتا ہے انکا کام پسند نہ آنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی میری اور نیز دلی کے اکثر احباب کی یہ رائے ہے کہ مرزا سکندر شاہ بورڈنگ ہوس کے انتظام کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مجھکو اور ایک دو آدمی جو میرے ساتھ متعلق ہوں گے انکو بورڈنگ کے باورچی خانے سے کھانا ملنے کی اجازت ہونی چاہئے لیکن اگر میری اور میری متعلقین کی خوراک سے موجودہ اخراجات میں کچھ اضافہ ہو جائیگا تو میں خوراک کی خواہش چھوڑ دوں گا۔ میرے نزدیک اس میں آپ کا کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ انکو دونوں وقت کھانے کی کیفیت بخوبی معلوم ہوتی رہے گی اور وہ کھانا عمدہ تیار کرانے میں زیادہ کوشش کے ساتھ اہتمام کریں گے۔ مرزا سکندر شاہ کے حالات جو مجھکو معلوم ہیں وہ یہ ہیں وہ مرزا الٰہی ولی عہد کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ عمر تقریباً چالیس سے کچھ زیادہ ہے محنتی اور جفاکش ہیں۔ بندوق اچھی لگاتے ہیں۔ شکار کا بہت شوق ہے چال چلن عمدہ ہے بادشاہزادوں میں ایسا چال چلن بہت کم دیکھا گیا ہے۔ انگریزی بھی جانتے ہیں مشن کی یوروپین مسوں کو مدت تک اردو وغیرہ پڑھائی ہے میونسپل کمیٹی دہلی کی طرف سے انکو بالفعل یہ کام سپرد ہے کہ شہر میں کھانے پینے کی چیزیں جو اکثر دوکاندار خالص اور عمدہ نہیں بیچتے ہیں انکی نگرانی کرتے ہیں بوچڑ خانے میں ہمیشہ گوشت کو جا کر دیکھتے ہیں اس کام میں انھوں نے نیکنامی حاصل کی ہے اور میں نے سنا ہے کہ بہت دیانتداری سے ہر ایک جنس کی نگرانی کی ہے چند دوکانداروں کو سزا بھی دلوائی ہے۔ اگر آپ انکو تقرری سے پہلے دیکھنا چاہیں تو شاید وہ ایک روز کے لئے علی گڈھ میں آسکتے ہیں۔ جو کچھ اس باب میں جناب کی رائے ہو اس سے نیازمند کو مطلع فرمائیے۔ زیادہ حد ادب

عریضہ نیازمند الطاف حسین حالی از پانی پت

۲۴ مئی ۱۸۹۵ء

(۷)

عالیجناب

رات کو تار پہنچا جس سے معلوم ہوا کہ مدار المہام اتوار کو تشریف لاویں گے۔ میرا ارادہ کل جمعہ کو روانہ ہونے کا

تھا۔ مگر تار پہنچنے پر میں نے کل کی روانگی ملتوی کر دی ہے کیونکہ اگر کچھ لکھا گیا تو یہاں زیادہ اطمینان سے لکھا جا سکے گا

پس اب یہ ارادہ ہو گیا ہے کہ پرسوں ہفتہ کو علی الصباح بمبئی میل میں سوار ہو کر بارہ بجے دن کے علی گڑھ پہنچوں۔ اب میں اچھا ہوں اور امید ہے کہ شاید پندرہ بیس شعر یا زیادہ سرانجام کر سکوں۔
زیادہ حد ادب

عریضہ نیازمند
الطاف حسین حالی از پانی پت
۲۶ اگست ۱۸۹۵ء روز پنجشنبہ وقت شام

(۸)

عالی جناب

خان بہادر سید الطاف حسین خاں جو سادات بارہ سے ہیں زید شہید کی اولاد میں ہیں جو امام محمد باقرؑ کے بھائی اور امام زین العابدین کے بیٹے تھے۔ اس صورت میں انکو امام زین العابدین کی اولاد میں لکھنا چاہئے

معلوم نہیں کہ بینک کے کاغذات سے مطابقت کرنے کے بعد تغلب کی ٹھیک مقدار کس قدر قرار پائی۔ ہم لوگوں کو اس واقعہ کے پیش آنے سے سب سے زیادہ اس بات کا خیال ہے کہ یہ فکر آپ کی طبیعت پر غالب نہ ہونے پائے۔ اگر آپ کا ذاتی روپیہ اس قدر تلف ہو جاتا تو یقیناً آپ کو چنداں خیال نہ ہوتا مگر بینک کے روپیہ میں اس طرح غبن کا ہو جانا آپ کو طرح طرح کے خیالات میں ڈالتا ہوگا۔ نہ آپ کا شام بہاری لال پر اعتماد اور بھروسا کرنا کوئی نئی بات ہے اور نہ اس کا تغلب کرنا کوئی تازہ بدعت ہے۔ تمام دنیا کے کام اعتبار ہی پر چلتے ہیں بغیر اعتبار کے نہ سلطنت کے کام چل سکتے ہیں نہ تجارت کے اور نہ کسی قسم کی داد و ستد کے۔ ایک تاجر کروڑں روپیہ کا مال جہازوں میں بھر کر ایک ہمسفیر سے دوسرے ہمسفیر میں محض اعتبار پر بھیج دیتا ہے اور اسی اعتبار کا لازمی نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی کسی غفلت یا فروگذاشت یا تغلب کے سبب نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ تو دگورنمنٹ کے خزانہ میں اس قسم کے واقعات ہمیشہ ظہور میں آتے ہیں۔ میرے نزدیک آپ کو بجائے افسوس کرنے کے خوش ہونے کا مقام ہے کہ آپ کی زندگی میں یہ بھید کھل گیا اور مخالفوں کو بیل کا بیل بنانے کا موقع نہ ملا چونکہ آپکی نیت ہمیشہ بخیر رہی ہے اور امید ہے کہ ہمیشہ بخیر رہے گی اس لئے خدا آپ کا مددگار ہے اور ہمیشہ مددگار رہے گا

بعض اخباروں میں اس معاملہ پر ہر قسم کا شور مچا ہے۔ پبلک کے روپئے میں تغلب جیسے کا نہایت افسوس ظاہر کیا جاتا ہے مگر فی الحقیقۃ اس کا مطلق افسوس نہیں بلکہ اس بات کی خوشی ہے کہ ان کو اعتراض کرنے کا موقع ملا اور اخبار گرم کرنے کے لئے ایندھن ہاتھ آیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس روپے کا ضائع ہونے کا افسوس اس شخص کے سوا جس نے پتھروں میں جونکیں لگا کر لہو نکالا ہے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ پبلک کا روپیہ تو درکنار۔ یہاں اگر خود پبلک معدوم ہو جائے تو کچھ پروا نہیں۔　　زیادہ حد ادب

عریضہ نیاز مند

الطاف حسین حالی از پانی پت

یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء

احمد علی شوق

(۱)

لکھنؤ گولا گنج۔ مطبع آزاد

۵ جنوری ۱۸۸۶ء

جناب سید صاحب بہادر دام ظلہم و محتشم مد فیضہ　　ادب سے تسلیم

والا صحیفہ صادر ہوا میں خود مشرقی تعلیم کی بحث کا سخت مخالف ہوں۔ میری رائے میں وہ بحث جو چھڑی تھی بہت ہی نامناسب تھی۔ یہ کہنا کہ مشرقی علوم کو گورنمنٹ ترقی دے گویا اپنے پاؤں میں آپ ہی کلہاڑی مارنا ہے اس لئے کہ مشرقی علوم میں جتنی زیادتی ہوگی مغربی علوم میں اوتنی ہی کمی ہوگی اور یہ صورت ہماری ترقی کے واسطے سخت مضر ہے بلکہ یہ وہی منشاء ہمارے مخالفین کا ہے جس کو ہم روکنا چاہتے ہیں۔ بہرحال میرے خیال اور تحریر میں مشرقی علوم کی پرچھائیں بھی نہیں ہے اور نہ ہوگی۔

منشی سجاد حسین صاحب کو اسپیچوں کے واسطے میں اسی وقت لکھتا ہوں۔ وہ کاکوری میں ہیں۔ میں اونہیں یہ بھی لکھوں گا کہ اون باتوں کو بچائے رہیں جن سے مخالفین کو ہم پر ہنسنے کا موقع ملے۔ جناب منشی صاحب قبلہ سے آج ہی اسپیچ کے واسطے عرض کروں گا۔

اپنی اسپیچیں جلد خدمت اقدس میں روانہ کروں گا۔

سچا فرمانبردار احمد علی[1]

---

[1] خم خانۂ جاوید کے مطابق احمد علی شوق ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ سر سید تحریک کے معاونین میں تھے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

(بقیہ صفحہ اگلے پر)

(۲)

لکھنؤ گولا گنج – مطبع آزاد
۲۳ جنوری [illegible]ء

حضور اقدس – تسلیم – میں کل ملیح پور سے لکھنؤ آیا مجھے ڈاک میں تین خط اس بات سے متعلق ملے کہ علی گڑھ میں کوئی تھیٹر ہونے والا ہے۔ ایک خط بہت بڑے معزز دوست کا تھا کہ جناب سید صاحب خود بھی اس تھیٹر میں ایکٹ کرنے والے ہیں اور ان معزز دوست نے بڑی واویلا مچائی تھی کہ دیکھیے اس سے مسلمانوں کی قسمت میں کتنی بدنامی لکھی ہے جو بعد آپ کے مٹانے نہ مٹے گی۔ انھوں نے بڑی دلسوزی اور محبت کے غصے اور گھبراہٹ سے یہ خط لکھا میں نے ان کو لکھا اتنا ہو جواب لکھ دیا کہ میں آج ہی باہر سے آیا ہوں۔ ناواقف ہوں لیکن عقل سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جناب سید صاحب کا فعل جو ہوگا کسی مصلحت سے ہوگا۔ فضول نہ ہوگا۔ میں حضور سید کی اسی کمیٹی کا خواہاں ہوں۔ اگر کوئی قومی اور ملکی کام ہے اور مخالف ہواؤں کے جھونکوں سے اس کی حفاظت کی گئی ہے تو میں خود بارٹ لینے کو حاضر ہوں اور قطع نظر اس کے کہ مخالفت کو ڈروں یا نہ ڈروں میں حضور کے کام کا ہر طرح پابند ہو سکتا ہوں مگر یہ گھبراہٹ جو معزز دوستوں میں ہے کیوں ہے اور اصلی معاملہ کیا ہے

[illegible]ء کے رسالہ محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کی قیمت کیا ہے۔ پانچ جلدیں یہاں رکھی ہیں۔ ایک معزز صاحب نے بہ قیمت طلب فرمائی ہے

تیسرا سالانہ اجلاس لاہور میں زیر صدارت مرزا محمد حیات خاں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں منشی احمد علی شوق بھی شریک تھے اور چند رباعیات فی البدیہہ پڑھیں جس میں ایک رباعی یہ بھی تھی

دنیا میں اسی کے ہاتھ پالا رکھے		منہ حاسد کمبخت کا کالا رکھے
جب تک انتاب ہے عالم میں		بوڑھے سید کو بول بالا رکھے

سرسید نے منشی احمد علی شوق کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا۔ "بلا شبہ مجھ کو نہایت فخر ہے کہ اس قدر بزرگ جو اس مجلس میں جمع ہیں اور جن میں آپ سا شیریں بیاں و نغز گفتار بھی شامل ہے اس شخص کے ساتھ جس کو آپ نے بوڑھا کہا ہے (حالانکہ وہ ابھی اپنے تئیں گبرو ہی سمجھتا ہے) کیسی محبت و عنایت رکھتے ہیں آپ کا دلی نیاز مندی سے شکر ادا کرتا ہوں"

منشی احمد علی شوق نے مارچ [illegible]ء میں لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار "آزاد" کا اجرا کیا۔ اس کے علاوہ فیضان شوق، ترانہ شوق، عالم خیال، حسن، بہار، برسات، قاسم، زہرہ، در یتیم اور سائنس اینڈ ریلیجن وغیرہ انکی تصانیف ہیں مؤخر الذکر مثنوی پر سرسید کے خیالات کا خاصا اثر ہے۔ اس میں شوق نے یہ ثابت کیا ہے کہ سائنس لازمی طور پر الحاد و بے دینی کا پیغامبر نہیں ہوتا۔ [illegible]ء میں آپ نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

لاہور کی کارروائی رزولیوشنوں پر آج لکھوں گا۔ امید ہے کہ موقع پا سکوں۔

حضور کا سچا فرماں بردار
احمد علی

(۳)

لکھنؤ گولا گنج۔ مطبع آزاد
۱۱ / اپریل ۱۸۹۶ء

حضور اقدس
ادب سے تسلیم

صحیفہ اقدس آیا۔ رباعیاں میں صاف کر کے حضور میں بھیجوں گا لڑکا پھر زیادہ علیل ہو گیا ہے۔ وقت کی ریل میں جاتا ہوں بے شک مجھ سے خطا ہوئی کہ میں نے رباعیوں کی نسبت حضور سے پوچھا اور حضور کی بزرگانہ شفقت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ بے معافی مانگے حضور نے معاف فرمایا میں نے اسی پرچے میں جو کل ۱۲/ اپریل کو شائع ہوگا۔ جناب منشی امتیاز علی صاحب کے ساتھ ہی راجہ محمد رسول خاں صاحب کے چندے کا نوٹ دیا ہے۔ منشی اطہر علی صاحب اور خان بہادر چودھری نصرت کے سامنے بلکہ اور بہت معززین کے سامنے میں نے قبول کرا کے نوٹ شائع کرنے کی اجازت لے لی۔ اب ہے کہ دیں گے۔ خان بہادر چودھری صاحب آج ہی یقین فرماتے تھے کہ دیں گے۔ حضور اب شکریہ فرمائیں اور خان بہادر چودھری صاحب کو بھی تذکرۃً تحریر فرما سکتے ہیں۔ چودھری صاحب سے متعلق یا اور بات بھی خوشی کی ہے کہ وہ بھوپال کو جانے والے تھے مگر انجمن ہند نے انکو یہ روکا ہے کہ سو روپیہ ماہ کی ترقی کی جائے۔

رام پور سے ابھی ابھی جنرل صاحب بہادر کا خط بھی آیا ہے۔ میں نے ایجوکیشنل کانگریس کے جلسے کی نسبت پوچھا تھا۔ حضور سے بھی میں نے پوچھا تھا مگر شاید سہو سے اس جز کا جواب لکھنے سے رہ گیا۔ جنرل صاحب نے لکھا ہے کہ سر سید کے نام خط گیا تھا اس کا جواب اب تک نہیں آیا ہے۔ اب جب تک جواب نہ آئے کیونکر پھر سبقت کی جائے بہتر ہو کہ جناب سید صاحب خط کے جواب میں تحریک فرما دیں تو طے ہو جائے اور اب طے کر دینا مناسب ہے

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو جواب کا انتظار ہے۔ کونسل آف ریجنسی نے ایک لاکھ ۶ ہزار کی رقم بجٹ میں زائد مصارف لامعلوم کی بھی رکھی ہے اس کو کچھ دقت شاید نہ ہو۔

میں وطن سے پلٹ کے دعہ بابت قیمت دس جلد المامون کے بھیج دوں گا۔ شعبان علی خاں صاحب نیز بعض اور معززین کے یہاں سے تب تک قیمت آجائے گی۔

اودھ پنچ کا کوئی دقیقہ زبانی بھی میں نے اٹھا نہیں رکھا ہے۔ حضور نے میری نسبت جن الفاظ کا استعمال فرمایا ہے میں ان کی نسبت اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ خدا کی قسم حضور کی ذات پاک جس عظمت اور پرستش کی مستحق ہے اس کا بہت چھوٹا حصہ بھی مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔

حضور کا سچا فرماں بردار
احمد علی

بھارتیندو بابو ہریش چندر

(۱)

مورخہ بستم جولائی ۱۸۷۲ء

بجناب سید صاحب والا مرتبت مظہر فیض و عنایت جناب سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی زاد رفیقہ

بعد ادائے عبودیت بندگانہ معروض باد دو تین ہفتہ علی گڈھ اخبار کے مطالعہ سے ہم لوگوں کے خیالات نسبت مدرسۃ العلوم کے بدلے جاتے ہیں رو جس شے کو ہم لوگ بالکل غلاف اور جس کی شرکت میں گناہ تصور کرتے تھے اب اسے کچھ کچھ اچھا سمجھنے لگے یہ سب محض جناب والا کے گورکھپور اور ان اضلاع کے دورہ کرنے کی برکت سے ہے اس موقع پر میں اور باتوں کو چھوڑ کر صرف یہی گذارش کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ فقط مدرسۃ العلوم میں درس سنسکرت کو بھی مقدم قرار دینا یکایک ہندوؤں کے دل کو مدرسہ مسطور کی جانب مائل کرنے کا موجب اور ذریعہ اعظم ہوا لہذا میں و نیز میرے احباب بنارس و مقام غیر بابدسال سوالات ذیل مظہر مدعا ہیں کہ اگر جناب والا سے جواب آں لطف فرمائے جاویں تو بعد غور کرنے جواب و سوالات مرسلہ پر ہم لوگ بھی بوجہ مناسب اس سے کرلیا کریں اور میں خاص اپنی نسبت بصدق دل یہ گذارش کرتا ہوں کہ سنسکرت میں چاہے وہ کسی قسم کی ہو میں ہر طرح مدد کے واسطے جو مجھ سے ممکن الوقوع ہے اور ہو اصلاً دریغ نہ کروں گا۔

نیاز مند
ہریش چندر[1]

---

[1] ہندی ادب میں بھارتیندو ہریش چندر کو تقریباً وہی مقام حاصل ہے جو اردو ادب میں سر سید کو۔ ہریش چندر ۱۹۰۰ء

سوالات

۱۔ علم سنسکرت کن قسم کے طلباؤں کو پڑھایا جاوے گا
۲۔ علم سنسکرت میں سے کن قسموں کی کتابیں درس کے واسطے منتخب ہوں گی
۳۔ علم سنسکرت اگر کوئی طالب علم بلا شرکت کسی اور زبان اور علم کے اس مدرسہ میں پڑھ سکے گا یا نہیں
۴۔ علاوہ مسلمان کے اور بھی کوئی شخص اگر صرف سنسکرت پڑھنا چاہے گا تو پڑھ سکے گا یا نہیں۔ فقط

سید محمد نصرت علی

(۱)

عالی جناب کرامت انتساب حامی اسلام قامع اصنام مربی دین و ایمان ظہیر ملت حضرت نبی آخر الزماں دام فیوضہم

بعد ادائے مراسم تعظیم و مدارج تکریم ملتمس خدمت شریف ہوں۔ سرفراز نامہ والا شرف صدور لایا۔ سرفراز فرمایا۔ پرچہ تہذیب الاخلاق بھی پہنچا۔ یہ دوسری سرفرازی بخشی۔ کتاب حمایت الاسلام کے بابت جو میں نے پیشتر گذارش کیا تھا وہ کچھ سنی سنائی بات نہ تھی بلکہ میں نے خود ایک دوست کے پاس سے منگا کر وہ ایک دن واسطے بغور مطالعہ کیا تھا۔ مگر افسوس کہ بہت جلد کتاب واپس دینی پڑی اور بہت عرصہ تک میرے مطالعہ میں نہ رہی۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اس شہر میں اوس کتاب کی بابت سوائے بعض حاضرین خدمت جناب اللہ جابد بندہ کے سب لوگ خلاف انصاف تجویز کرتے ہیں اور اس کی دو وجہیں ہیں اول دہر ناحق پسند ہے اور کم فہم جس نے پیشتر اوس فتوای معلومہ پر

میں کاشی میں پیدا ہوئے اور سمبت ۱۹۴۱ میں وفات پائی۔ انھوں نے سمبت ۱۹۳۰ میں ہریش چندر میگزین نکالی جو بعد میں ہریش چندر چندریکا کے نام سے نکلتی رہی۔ بابو ہریش چندر کو اردو شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی اردو میں رسا تخلص کرتے تھے۔ سر سید سے ان کے ذاتی تعلقات تھے ایک بار جب بنارس میں سر سید سب جج تھے تو ان کی عدالت میں ایک ملاح نے ہریش چندر کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ ملاح کا کچھ روپیہ ہریش چندر پر واجب تھا لیکن ملاح کے پاس کوئی تحریری ثبوت نہ تھا ہریش چندر نے عدالت کے روبرو اقرار کیا کہ ملاح کا روپیہ ان پر واجب ہے لیکن قرض ادا کرنے کے لیے روپیہ موجود نہیں سا تو بھی اپنا ایک دوہا پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ چاند اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے سورج ٹل سکتا ہے اور دنیا کے کاروبار ٹل سکتے ہیں لیکن ہریش چندر کا سچ بولنے کا مصمم ارادہ ٹل نہیں سکتا۔ بعد میں سر سید نے اپنے پاس سے بابو ہریش چندر کا قرض ادا کر دیا۔

اوتعین آمادہ کیا تھا اس جہت سے وہ کتاب اگرچہ کیسی ہی خوب ہو گمراہوں کی نظر میں معیوب ہے ۔ دوسرے کثرت
توجیہہ مناقشات ہمہ گرد مباحثات سے یاد سرہے ۔ اونھیں واقعی ایسی عمدہ عبارات اور بلیغ فقرات تصانیف
اہالی مذاہب غیر کے سمجھنے پر بالکل عبور نہیں ہے اور یہ خرابی سنی و شیعہ دونوں کے لاحق حال ہو رہی ہے پس ایک
نفسانیت اور عدم دیانت کی وجہ سے جیسا کہ اوس کتاب کی خوبیاں چھپانے کے واسطے لوگ کوشش کر رہے
ہیں اوس کی کثرت شہرت کے سبب آپ تک بھی اطلاع ہوئی ہوگی یا اب ہو جائے گی صرف ایک یہی آپ کے
اس نیاز مند کا خاندان اس رائے میں تمام شہر میں مستثنیٰ خیال کر لیجئے اور نہ صرف اس کتاب کی بابت بلکہ اون
ساری مصلحتوں میں جو آپ تجویز فرما رہے ہیں اور بندہ تو نہ صرف یہی کہ اون کی خوبیوں کا بلکہ اس باب میں
تہ دل سے دعا گو بھی ہے اگر جناب والد ماجد کے پاس اوس کتاب کی بعض جلدیں بہ نیتِ نظر رہیں تو وہ اوس کے
فضائل بیان کرنے میں کبھی سست نہ ہوں گے چنانچہ ایسا ہی اون کا حال بھی ہے اور مولوی الفت حسین
صاحب نے جو اپنی مثنوی مطبوعہ کی چند جلدیں ارسال خدمت عالی کی ہیں اوس کے آخر ورق کے ملاحظے سے
بھی میرے اس التماس کی تصدیق ہو سکتی ہے ۔ اور بالفعل (اگرچہ قابل ملاحظہ حضور تو ہوں مگر) جرأت کر کے
دو ایک رسالہ مصنفہ جناب والد ماجد پیشکش خدمت ملاذ و مان کرتا ہوں اون میں سے ایک تو جناب مجتہد العصر
لکھنؤ کے جن کا کسی پادری سے مباحثہ ہوا تھا جواب میں ہے اور دوسرا بھی مناظرہ اہل کتاب میں ہے
زیادہ حد ادب

عریضہ ادب[1]
سید محمد نصرت علی مالک ناصر الاخبار دہلی

---

[1] سید محمد نصرت علی "تیرہویں صدی" اور "علمائے عام" کے ایڈیٹر میر ناصر علی کے چھوٹے بھائی تھے
سید محمد نصرت علی شاعر بھی تھے اور فقیر تخلص کرتے تھے ۔ دہلی میں ... کا ایک پریس نصرت المطابع
تھا ۔ اسی مطبع سے آپ نے تاریخ دینیات اور علوم شرقیہ سے متعلق ... شائع کیں ۔ جن میں چند
کے نام یہ ہیں ۔ ۱ ۔ رحمت کریم ۲ ۔ ذخیرۂ حسنات ۳ ۔ قیصریہ ۴ ۔ مرآۃ السلاطین ۵ ۔
سراب عالم اسباب ۶ ۔ نصرت اللغات ۷ ۔ انشائے نصرت وغیرہ ۔

سید علی محمد شاد عظیم آبادی[1]

(۱)

عالی جناب من تسلیم ۔ خادم نے ایک مثنوی اپنے حال میں تصنیف کر کے چھپوائی ہے ۔ اس مثنوی پر اکثر محققین نے اپنی اپنی مہربانیوں سے کلمات دلسوزی لکھے ہیں ۔ میں نے واجب سمجھا کہ اس کی آپ کی جناب عالی میں بھیج کر اپنی اور نیز کتاب کی عزت بڑھاؤں اگر مناسب ہو تو علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں دو چار کلمے اس کے خصوص میں لکھ دئے جائیں کہ میرے مباہات کا سبب ہو آپ کے چند کلمے میرے ہم جنس یعنی مجھے عزت دیں گے ہنوز میں نے یہ کتاب کسی ایک اخبار کو بھی نہیں بھیجی ہے اور جب تک میں اس عریضہ کا جواب حسب خواہ نہ پالوں گا کسی کو یہ کتاب نہ دکھاؤں گا میں مدت العمر اس بزرگانہ مرحمت کا ممنون رہوں گا جن حضرات نے اس کو دیکھ کر کلمات مہربانی کے لکھ دیئے ہیں ۔ وہ یہ ہیں :۔

جناب مفتی سید محمد عباس صاحب جناب آقا شیخ محمود صاحب جیلانی مقیم کلکتہ اگر کتاب کسی وجہ سے ناپسند ہو تو پرائیوٹ طرق سے مجھے مطلع فرما کر ممنون الطاف مربیانہ فرمائیے ۔

آپ کا خادم فرماں بردار

سید علی محمد شاد

۷ر اگست ۱۸۸۶ء مقام عظیم آباد پٹنہ

منشی محمد سجاد حسین

(۲)

بسم اللہ

کاکوری ۲۳ر جون ۱۸۸۶ء

بخدمت عالی جناب مع القاب صاحب سکریٹری محمدن ایجوکیشنل کانگریس مد ظلہ العالی

---

[1] سید علی محمد شاد ۸ر جنوری ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد میں پیدا ہوئے ان کا انتقال پانی پت میں تھا ۱۸۹۰ء میں شاد پانی پت آئے اور واپسی میں علی گڈھ میں قیام رہا اور اسٹریچی ہال میں اپنا مشہور میلاد شریف ع

دیباچۂ سخن ہے شہ انبیا کی مدح

[2] یہ جلسہ ۴ر دسمبر ۱۸۹۷ء کو منعقد ہوا تھا۔ شاد علی گڈھ تحریک کے مقاصد کے معاونین میں تھے اور اپنی نظموں کے ذریعہ علی گڈھ تحریک کے مقاصد کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیتے تھے۔

تسلیم۔ جناب منشی احمد علی صاحب ایڈیٹر آزاد کی تحریر سے معلوم ہوا کہ کارروائی کانگریس میں نیازمند کی تقریر بند کرنا منظور ہے اور ملازمان والا کو اوس کا سخت انتظار ہے
آپ کی عنایت سے مجھے ترصد ہے کہ ایک دو روز کی اور مہلت عطا فرمائی جائے گی ۔ ۲۴ر جون کو جو کچھ خیالات یاد رہے ہیں ٹانک کر ارسال خدمت ہوں گے ۔ مجھے اوسی زمانے میں ایجاز معلوم نہ ہوا۔ ورنہ ملازمان جناب کو نہ زحمت انتظار گوارا فرمانا ہوتی اور نیازمند کو پرانی گئی گذری باتوں کو مکرر یاد کرنے کی تکلیف

آپ کا خادم
محمد سجاد حسین مالک[1] اودھ پنچ

اکبر علی

(۱)

مقام پٹیالہ

محب قوم آنریبل ڈاکٹر سرسید احمد خاں صاحب بہادر مدظلہ العالی
تسلیم نیاز ۔ مجھے مختصر الفاظ میں اس اعتراف کا اظہار کرنا ضروری ہے کہ جناب کی ذات سے جو تمنا ہی

---

[1] منشی محمد سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کا اجرا کیا یہ اخبار ظرافت کا سرچشمہ تھا لوگ اس کے نقروں لطیفوں اور پھبتیوں کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ اس زمانہ میں علی گڈھ تحریک اپنے عروج پر تھی لیکن اس تحریک سے منشی سجاد حسین کو نظریاتی اختلاف تھا چنانچہ جب ۱۸۹۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو جلسہ کی ایک تجویز کے خلاف حاجی بوا، رمولوی بشیرالدین، میر نثار علی شہرت اور منشی سجاد حسین نے پرجوش تقریریں کیں خصوصاً منشی سجاد حسین کی تقریر میں سرسید پر پھبتیاں تھیں جسے سن کر اہل لکھنؤ جھوم جھوم کر داد دیتے تھے لیکن سرسید نے منشی سجاد حسین کی بذیاں سرائی کا نہ خود جواب دیا اور نہ کسی کو جواب دینے کی اجازت دی۔ سرسید نے فرمایا!
"صاحبو تم ہرگز برا نہ مانو، میری قوم جاہل ہے اس کانفرنس کے انعقاد کی غرض و غایت یہی ہے کہ ہم اپنے عیوب سے آگاہ ہوں اور ایسے نوجوانوں کی اصلاح کریں جو ہنوز قومی معاملات سے ناواقف ہیں۔ بڑوں کو بچوں کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا چاہئے۔ زمانہ آئندہ چل کر خود ان کی اصلاح کر دے گا" کچھ دنوں بعد سجاد حسین پر فالج گرا اور ان کی زبان بند ہو گئی۔ لکھنؤ کے بزرگوں کا کہنا تھا" یہ سرسید سے ضبط و صبر کا نتیجہ تھا کہ خدا کا عذاب فالج کی صورت میں سجاد حسین پر نازل ہوا اور انگشت نمائی کی سزا مل گئی" ۱۹۱۵ء میں منشی سجاد حسین نے انتقال ہوا۔ انکی تصانیف میں "حاجی بغلول" اور "طرحدار لونڈی" مشہور ہے۔

فیوض و فوائد در بارۂ تعلیم قوم کو پہونچ رہے ہیں اور پہونچیں گے ان کے لئے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو
ہمیشہ ممنون رہے گا

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس ہمارے گلستان ترقی کے لئے فصل بہاری ثابت ہوگی۔ مگر مجھے افسوس ہے
ایجوکیشنل کانگرس کے فوائد صرف مسلمانان علاقہ انگریزی کے اندر ہی محدود رہتے ہیں اور ان مسلمانوں کا کچھ
بھی نہیں کیا گیا جو دیسی ریاستوں میں بود و باش کرتے ہیں اور جن کی تعداد ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہے
علاقہ انگریزی میں ایک عام جوش در بارۂ تعلیم پیدا ہو چکا ہے لوگ ترقی کے زینہ پر چڑھنے لگے ہیں یا تنزل
مرض کو سمجھنے یا اپنی کمی کو جاننے اور اس پر افسوس کرنے لگے ہیں۔ علی قدر اختلاف مراتب۔ مگر وہ لوگ جو
کے گوشے میں پڑے ہیں۔ جنکی خفاش صفت آنکھوں کے سامنے روشنی کی جھلک بھی نہیں پڑی۔ جنھوں نے
تہذیب کی پھیلی پھیلی خوشبو بھی نہیں سونگھی۔ ایسے خواب خرگوش میں سو رہے ہیں کہ دنیا و مافیہا کی انکو خبر
نہیں۔ حالانکہ خوش قسمتی سے بعض ایسی عادل ریاستیں ہیں کہ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت و قوم و مذہب
اپنی کل رعایا کی تہذیب و شائستگی و تعلیم و ترقی کو دل سے چاہتی اور ہزاروں روپیہ خزانہ عامرہ کا انکی بہبود
کے لئے صرف کرتی ہیں (جیسی کہ ریاست پٹیالہ) مگر بوجہ نہ ہونے بیرونی تحریک و اندازۂ ضرورت
وہ ان فوائد کے حاصل کرنے میں بھی قاصر ہیں جو انکو بہ آسانی مل سکتے ہیں۔

اس لئے میری اس درخواست کے ذریعہ سے التماس ہے کہ مسلمانان باشندگان ریاست
حالت زار پر بھی توجہ فرمادیں اور حالیہ علیہ کانگرس میں کوئی ایسی تجویز قرار دیں جو ایسے مسلمانوں کے لئے مفید
ثابت ہو۔

میں اس جگہ پر یہ بھی گذارش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نیک اور روشن ضمیر ریاستوں کو محمڈن
ایجوکیشنل کانگرس کے مقاصد سے ضرور دلچسپی اور دلی اتفاق ہوگا۔

آپ کا فرمانبردار
اکبر علی [1]

۱۸ دسمبر ۱۸۹۰ء

ایڈیٹر پٹیالہ اخبار۔ از پٹیالہ

---

[1] مہاراجہ پٹیالہ کی فرمائش پر ۱۸۷۱ء میں منشی نولکشور نے پٹیالہ میں ایک پریس قائم کیا اسی مطبع
سے ۱۸۷۱ء میں پٹیالہ اخبار کا اجرا ہوا۔ اخبار ریاست کا ترجمان تھا۔

سراج الدین احمد

(۱)

جناب عالی قبلہ و کعبہ من روحی فداک

میں اجلاس کانفرنس میں ضرور آؤں گا۔ ہر حال میں آؤں گا میرے ہر سال شریک ہونے میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ دریغ ہو۔ امید ہے کہ حضور کتاب تعلیم کو پڑھیں گے اور اس پر رائے لکھیں گے تاکہ پھر اوس کے فروخت کا اشتہار دیا جاوے

سرمور گزٹ کے واسطے کچھ لکھنے کی درخواست کرنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ جس طرح پہلے حضور تصنیف امام غزالی علیہ الرحمۃ میں سے کچھ مضامین منتخب کر کے لکھتے تھے اسی طرح اور لکھیں تاکہ سرمور گزٹ کی حالت کو ترقی ہو اور لوگوں کو فائدہ ہو۔ والسلام

سراج الدین احمد - ناہن - ۱۰ ستمبر ۹۱ء

خواجہ غلام الثقلین

(۱)

جناب عالی

چند روز ہوئے میں نے سنا تھا کہ جناب مجھ سے ایک سوسائٹی میں شریک ہونے کی وجہ سے نہایت ناراض ہیں۔ چونکہ اس وقت بعد آنر لفٹنٹ گورنر کے آنے کی تیاری میں جناب مشغول تھے اور بعد میں اسی کے متعلق کاموں کی وجہ سے فرصت نہیں تھی اس لئے میں نے جناب کو اپنی معذرت پڑھنے کی تکلیف نہیں

---

[1] سرسید کے ہندوستانی سوانح نگاروں میں منشی سراج الدین احمد کو اولیت حاصل ہے چنانچہ حالی نے حیات جاوید میں منشی سراج الدین احمد کے مسودہ سے استفادہ کیا ہے۔ منشی سراج الدین اگرچہ علم و دانش اور شہرت کے لحاظ سے حالی کے پایہ کے نہ تھے لیکن علی گڈھ تحریک کے مقاصد کی ترویج میں انھوں نے اپنے اخبار سرمور گزٹ اور اخبار چودھویں صدی کے ذریعہ بڑے جوش و انہماک سے حصہ لیا۔ منشی سراج الدین ۱۸۶۶ء میں بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد انھیں ریاست ناہن میں ملازمت ملی یہیں سے انھوں نے سرمور گزٹ کا اجراء کیا اور قیاس ہے کہ اسی زمانہ سے ان کے تعلقات سرسید سے ہوئے۔

دی ۔

۱ ۔ یہ الزام کہ میں اس سوسائٹی کا سرغنہ تھا غلط ہے ۔ میں اس جماعت میں اُن وجوہات سے ہوا تھا جس کی تفصیل میں آگے کروں گا

۲ ۔ یہ سوسائٹی خاص پنجابیوں کی نہ تھی بلکہ جو طلبا اس میں شامل تھے اور جن کی تعداد (۴ ان میں ایک ثلث کے قریب غیر پنجابی تھے ۔

۳ ۔ کسی شخص کو یہ خیال نہ تھا کہ جناب یا اور حکام اس سے ناراض ہوں گے کیوں کہ اس قسم سوسائٹیاں پہلے سے بہت سی موجود تھیں اور جس وقت یہ معلوم ہوا اس کو توڑ دیا گیا

۴ ۔ میں اُس سوسائٹی میں زیادہ تر اس لئے شامل ہوا تھا کہ اس کے مقاصد عمدہ رہیں اور ایک جماعت بننے سے کوئی تکرار یا تنازعہ آپس میں طلبا کے درمیان نہ ہو ۔ میرا مقصد جب سے میں اس کالج میں شامل ہوا ہوں یہ رہا ہے کہ کالج کی بہتری اور جناب کی رضامندی سب کوشش کروں ۔ اور جو ناراضی جناب کو میری طرف سے ہوئی ہے اس کا مجھ کو نہایت افسوس ہے ۔

یونین کے چھوٹے چھوٹے جھگڑے اور طلبا کی باہمی رقابت کے بیان میں جناب تکلیف نہیں دینا چاہتا ۔ لیکن اس قدر عرض کرتا ہوں کہ میری رائے میں بہت سے طلبا موجود یونین سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے اور خصوصاً پنجابیوں سے اور عموماً سب سے جو ایک خاص فریق کے دوست نہ تھے اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا ۔ نئے طلبا کی یہ شکایت تھی کہ وہ سالہا سال یہاں رہ کر چلے جاتے ہیں ۔ اور انکو کوئی موقع تقریر کا نہیں ملتا ۔ اس غرض سے انھوں نے طلبا کی بو ۔ کی مشق کے لئے ایک جماعت قائم کی ۔

انھوں نے مجھ سے بھی شامل ہونے کے لئے کہا ۔ اور چونکہ مجھ کو ان کے مقاصد سے ہمدردی تھی اس لئے میں اس شرط پر شامل ہوا کہ اس سوسائٹی کا مقصد صرف اپنی ترقی کرنا ہو اور اس کے ممبر یونین سے علیحدہ نہ ہوں اور کالج میں صلح سے رہیں ۔ ورنہ اس کا وجود مضر ہوگا یہ سب باتیں تفصیل سے ساتھ میں نے اپنی اسپیچ میں بیان کیں اور سب نے اس کو منظور کیا ۔ میری ملاقات یہاں کالج کے طلبا کے ایک بہت بڑے حصہ سے ہے اور صرف چند طلبا ایسے ہیں جن سے میری زیادہ موافقت نہیں ہے اس میں ممکن ہے کہ میری طبیعت یا میرے خیالات کا قصور ہو مگر کسی سے میری لڑائی ہرگز نہیں ہے ۔ یہ خیال کہ میں صرف شیعہ طلبا سے ملتا رہا ہوں ٹھیک نہیں ۔ بلکہ سوائے تین طلبا شیعہ کے جو میرے ہم جماعت

اور ویسے مجھ کو کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور ان کو یہ شکایت بھی تھی۔

الغرض میں نے اب تک کالج میں جہاں تک مجھ سے ہو سکا ہے یونین میں ڈبیٹ کے ذریعہ سے۔ اخوان الصفا کے ذریعہ سے اتفاق اور اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر بورڈنگ کے طلبا سے رائے لی جائے تو بہت بڑا حصہ یقیناً میری خدمات کی شہادت دے گا۔

اس لئے مجھ کو نہایت افسوس ہوگا کہ اب آخری وقت میں جبکہ میں کالج سے علیحدہ ہونے والا ہوں جناب کو میرے کاموں سے ناراضی ہو اور اگر مجھ سے ناواقفیت کی وجہ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو میں جناب سے سچے دل سے اور عاجزی کے ساتھ معافی مانگتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھ پر اور کیا الزام لگائے گئے ہیں لیکن میں یقین کرتا ہوں کہ جناب کو اطمینان دلانے کے لئے میری بے گناہی بالکل کافی ہوگی۔

جناب کا خادم

غلام الثقلین[1]

میں نے اب تک جو وجوہات بیان کی ہیں انکے رو سے جناب کو کچھ نہیں لکھا تھا۔ صرف آنریبل جسٹس سید محمود صاحب کے اصرار سے مکرمی خوشی محمد خاں کے خط کی تصدیق کی تھی۔

عبدالغفور شہباز
(۱)

قاضی معین الدین چک - پاڑھ

۹ جون ۱۸۹۴ء روز شنبہ

جناب سید صاحب و قبلہ - تسلیم - میں ایک طالب علم ہوں اور آپ تعلیم کے دلدادہ۔ غلط کیا ہے اگر میں اپنے دل میں آپ کی طرف سے کوئی توقع پیدا کروں۔ میں نے اس سال بہار نیشنل کالج سے اف اے پاس کیا ہے۔ عربی میری سکنڈ لنگویج تھی یہ ایک اور وجہ ہے کہ محمدن اینگلو اورینٹل

---

[1] خواجہ غلام الثقلین ۱۸۷۱ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ مولانا حالی کے نواسے تھے۔ غلام الثقلین کی صلاحیتوں کو جس نے مدد پہنچایا وہ در اصل سرسید اور علی گڈھ کی علمی و ادبی فضا تھی چنانچہ انھیں یہاں سفینہ کا علم اور سینہ کا نور دونوں حاصل ہوا۔ سرسید غلام الثقلین کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بہت خوش ہوتے تھے اور انکی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ مدرسۃ العلوم میں اپنے زمانہ طالب علمی میں انھوں نے ایک انجمن اخوان الصفا کے نام سے تشکیل کی جس کے ممبروں کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے علم و عمل کا احتساب کرتے رہیں۔ یہی خیال بعد میں ان کے یہاں اصلاح تمدن کی تحریک ہو جلوہ گر ہوا۔

کالج علی گڈھ کے بانی کو میرے ساتھ ایک خاص ہمدردی ہو۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ بی اے عربی میں آنرز کے
کروں۔ بہار و بنگالہ میں کوئی کالج ایسا نہیں ہے جس میں عربی کی پڑھائی ہوتی ہو۔ البتہ صرف علی گڈھ کا
شرف حاصل ہے کہ وہاں عربی کے پروفیسر بھی ویسے ہی مستعد ہیں جیسے انگریزی کے۔ اسلامی کالج کے
آپ کے ہاں پڑھائی ہوتی ہے دوسری جگہ ممکن نہیں پس یہ طبعی ہے کہ میں اپنے حصول مقاصد تعلیمی کے
علی گڈھ کا قصد کروں۔ لیکن کچھ معلوم نہیں کہ وہاں کے قاعدے کیا ہیں اور وہاں کی شرطہائے امتحان کیا
کون سی ہیں۔ آپ اگر ان امور کی تفصیلی کیفیت سے مطلع فرمائیں تو بڑی مہربانی ہو۔ دوسرا امر یہ بھی قابل غور
کہ میں ایک غریب آدمی ہوں مجھ میں اخراجات کالج کی برداشت کی بغیر اس کے طاقت نہیں کہ کوئی خانگی
میری آمدنی کا ذریعہ ہو۔ یہاں عظیم آباد میں میں نے بڑی مشکلوں سے لڑکے پڑھا پڑھا کر انٹرنس اور ا
پاس کیا ہے۔ انٹرنس میں چونکہ اول ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ تمام بہار سرکل میں پانچواں ہوا تھا
فارسی میں تمام بہار و بنگالہ میں اول اس لئے پندرہ روپیہ کی اسکالرشپ بھی ملی تھی۔ ایک رئیس
میری کامیابی امتحان سے معتقد ہو کر مجھ کو اپنے لڑکوں کی انگریزی اور عربی تعلیم کے لئے چالیس ماہانہ
علاوہ خرچ ماکل و بیت مقرر کیا۔ پارسال تک ان کی سرکار میں تھا۔ لیکن وہ نیک نفس رئیس مرگئے۔ ان کے
کمزور اور محدود خیالات کے آدمی ہیں۔ تعلیم پر ان کو چنداں توجہ نہیں باوجود حسن کارگزاری کے
تنخواہ نصف کردینی چاہی لڑکا اب ایک سکنڈ کلاس میں ہے ایک فرسٹ میں اور یہ میری تعلیم کی بدولت
پھر تنخواہ کی تخفیف کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ عذر سنا نہیں گیا۔ میں بنظر استحفاظ عزت باوجود حاجت
نوکری چھوڑ کر چلا آیا۔ برس روز سے بیکار ہوں اور نہیں معلوم ابھی کب تک رہوں گا۔ اب آپ سے سو
یہ ہے کہ اگر میں علی گڈھ کالج میں تکمیل تعلیم کو آؤں تو آپ وہاں کوئی شکل میری نکال سکتے ہیں یا نہیں
فارسی میں بہت اچھی جانتا ہوں۔ عربی میں بھی استعداد متوسط رکھتا ہوں۔ ادب عربی سے طبیعت کو ایک
خاص مناسبت ہے۔ زمانے نے اور ضروری مشاغل سے فرصت نہ دی کہ اس مناسبت کا کوئی عمدہ جا
دکھا سکتا۔ شاید آگے چل کر کچھ اس کا موقع ملے کیونکہ ارادہ ہے بی اے کے بعد عربی میں ایم۔ اے کی سند
کروں اور فن ادب عربی کی آخیر عمر تک کوئی معقول خدمت کروں کہ قوم میں یادگار رہے۔ عربی کے علاوہ
نثر و نظم اردو میں بھی اچھی مہارت رکھتا ہوں۔ لوگ شاعر جانتے ہیں اور بعض لوگ غلطی سے استاد بھی مانتے ہیں گو میں کہ
لائق نہیں۔ مولانا نذیر احمد کی طبع ثانی کی موعظۂ حسنہ کی ابتدا میں میری نظم ریویو شاید آپ کی نظر سے بھی گذری ہو تو عجب نہیں۔
خودستائی اس لئے کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ میں ایک عام طور پر مفید آدمی ہوں۔ اخبار نویسی کا بھی کسی
تجربہ ہے جس صیغہ میں آپ چاہیں گے میں آپ کو کسی قدر دعوے کے ساتھ تشفی دے سکتا ہوں۔ ایک لطیفہ نقل میرے ایک

ظریف دوست بیان کرتے تھے۔ کہ کسی پرانے خیال کے آدمی کی ایک معتمد شخص نے کسی انگریز سے سفارش کی۔ انگریز نے امیدوار سے پوچھا تم کیا جانتے ہو۔ کہا میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ نالائق دنیا میں کوئی نہیں۔ انگریز نے اپنے دوست کو لکھ بھیجا کہ امیدوار خود نالائقی کا اقرار کرتا ہے۔ نوکری اس کو کیونکر دی جائے۔ پھر دوست نے لکھا کہ طریقۂ شرفا یوں ہی ہے۔ انکساراً اپنی طرف نالائقی کو منسوب کرتے ہیں۔ انگریز نے لکھا تو وہ جھوٹا ہے اور جھوٹا قابلِ خدمت نہیں۔ یہ نقل ضرورت خودستائی کے ثبوت میں پیش کی گئی۔

طولِ سخن معاف۔ الغرض علی گڈھ گزٹ کی اڈیٹری۔ تہذیب الاخلاق کی اڈیٹری۔ کالج میں مختصر سی نوکری۔ کسی دوست کے لڑکے کی ٹیوشری۔ یہ جتنے ہیں جن میں میں استعمال پذیر ہوں اور اگر آپ چاہیں تو میری دستگیری کی بعض شکل نکل سکتی ہے۔ بے اس قسم کی دستگیری کے میں تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتا اور حیف ہے کہ آپ جیسے دستگیر قوم کے ہوتے ایک اولوالعزم طالب علم کو اپنے عزم سے منہ موڑنا پڑے۔ ایک مضمون میں نے اس عنوان سے لکھا ہے "شعراء اردو میں شکسپیر" گو مضمون ادب کا ہے مگر میرے خیال میں عمدہ ہے اور آپ کے تہذیب الاخلاق کے لائق۔ اگر ارشاد ہو تو اس کی ایک نقل بھیج دوں۔ اس سے میری قوتِ تحریری کا بھی اندازہ ہوگا۔ اور شاید تہذیب الاخلاق کا بھی کام نکلے۔

والسلام

عریب گمراہ اولوالعزم طالب علم

محمد عبدالغفور شہباز[1]

---

[1] محمد عبدالغفور شہباز سید طالب علی کے فرزند تھے۔ ضلع پٹنہ کے ایک سید گھرانے میں [illegible]ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ خاندان میں علم و ادب کا چرچا تھا لہٰذا جو تعلیم ملی وہ ٹھوس تھی۔ بڑے ہونے پر انھیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں وہ مظفرپور چلے آئے یہیں شاعری سے شغف پیدا ہوا۔ کچھ دنوں بعد نواب عبداللطیف خاں نے انھیں اپنے اخبار دارالسلطنت کا ایڈیٹر مقرر کیا ۱۸۸۴ء میں انھوں نے خود اپنا رسالہ نمائش کلکتہ سے نکالا۔ [illegible]ء میں وہ بھوپال گئے۔ کچھ دنوں بعد انہیں حیدرآباد میں مولوی عزیز مرزا کی ماتحتی میں ملازمت مل گئی۔ مولوی عزیز مرزا مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے طالب علم تھے ممکن ہے کہ سرسید نے اس سلسلہ میں عزیز مرزا کو کچھ لکھا ہو۔ [illegible] نومبر [illegible]ء کو شہباز کا انتقال ہوگیا۔ ان کی تصانیف میں مقالات حمالیہ، رباعیات شہباز، زندگانی بے نظیر، تصحیح کلیات نظیر اور خیالات شہباز کو شہرت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ شہباز نے ڈیڑھ سو اشعار پر مشتمل سرسید کی وفات پر ایک ترکیب بند مرثیہ بھی لکھا تھا۔ جو رسالہ مخزن میں شائع ہوا تھا۔

مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی

(۱)

مخدومی مکرمی مطاعی نور العین رسول کونین جناب سید صاحب دام اقبالہم
السلام علیکم وعلیٰ من اتبع الہدیٰ ۔ حضرت ! خاکسار وہ شخص ہے جس نے ایوننگ پارٹی
آپ کے خیر مقدم کی تقریب کے لئے اشعار بنائے تھے اور وہ آپ کے سفرنامے میں درج ہوئے۔ آ
پہلے بندہ کی ملاقات آپ سے اس وقت ہوئی تھی جب آپ میرزا محمد سلیمان بہادر گورگانی کے یا
تھے اور چاندنی محل میں دہلی کالج کی تقریب کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا تھا خیران تمام باتوں کو
صرف اس لئے ہوئی کہ کمترین کو ایک ہموطن خیال فرمائیں اور قابل رحم اس لئے سمجھیں کہ ایک تو ہند
ہوں۔ دوسرے مسلمان ہوں۔ تیسرے دہلی کا باشندہ ہوں۔ چوتھے خاندان تیموری سے ہوں
ہے کہ ہر طرح مستحق و مبتذل ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان تمام حوالوں کو مد نظر رکھ کر آپ میری گذ
توجہ فرمایئے وہ گذارش یہ ہے ۔

بندہ زادہ حسین کا نام بلند اختر ہے یہاں سے کئی دن ہوئے امتحان کے ڈر کے مارے بھا
ہے۔ اور غالباً معلوم ہوا ہے کہ علی گڑھ اسکول میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا ہے۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے سکول کی خوبیاں اور آپ کی حمیت و ہمدردی اسلام وہ اکثر میری ز
سنتا رہتا تھا ۔۔۔ . . . . میرا ارادہ تھا کہ اسے خدمت شریف میں بھیجوں۔ مگر کم استطاعتی
باعث ششش و پنج میں تھا۔

جنابا۔ ۸ روپیہ تنخواہ ملتی ہے۔ لاہورت فیروز پور میں مدرس عربی ہو کر آیا
اگر وہ لڑکا حاضر خدمت ہو تو بزرگانہ الطاف فرما کر اطلاع فرمایئے۔ تاکہ اپنی حیثیت کے موافق پڑھنے
بندوبست کروں ۔

نامزدہ کی عمر ۱۶ سال کی ہے۔ سبزہ آغاز ہے۔ رنگ گندمی ہے۔ قد اوسط درجہ
سے عزت کا رنگ دہ طرف جھلکتا ہی ہے بلکہ ٹپکتا ہے۔ طرز گفتگو سے آپ پہچان جائیے گا کہ وہ ایک
ہے اور کسی شریف گھرانے میں رہا ہے۔ یہ باتیں جو آپ کی سمع خراشی کا باعث نہیں اس لئے حوالہ قلم
کی گئیں کہ شاید وہ حالات کی سے اپنا نام بدل لے۔ باپ کا نام بدل دے۔ شہر کا پتہ کچھ اور بتا دے۔
تصدیعہ افزائی کے معافی کے بعد توجہ کا خواستگار ہوں۔ زیادہ والتسلیم ۔

جواب سے ضرور مشرف فرمایا جاؤں ۔

آپ کا فدائی و مطیع طریق

مرزا عبدالغنی ۔ المعروف ارشد بخت ۔ ارشد[1]

مدرس فیروزپور ۔ ضلع لاہور

۲۷ جولائی سنہ ۱۹۰۵ء

---

[1] عبدالغنی ارشد سنہ ۱۸۵۰ء میں قلعہ معلی دہلی میں پیدا ہوئے ۔ سلسلۂ نسب احمد شاہ بادشاہ دہلی تک پہنچتا ہے ۔ شاعری میں مرزا قادر بخش کے شاگرد تھے ۔ شاعری کے علاوہ موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے ۔ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۰۶ء میں ملتان میں انتقال ہوا ۔

انجمن کی چند مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند	۰—۰۰
۲	تلمیحات و اشارات اقبال	ڈاکٹر اکبر حسین قریشی	—۵۰
۳	تذکرۂ گلشن سخن	پروفیسر مسعود حسن رضوی	—۰۰
۴	یادگار نظر	جگر بریلوی	—۵۰
۵	تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	۰—۰۰
۶	فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۳—۰۰
۷	فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحاق صدیقی	۰—۵۰
۸	مضامین رشید	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۶—۰۰
۹	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵—۰۰
۱۰	باپو کے قدموں میں (مکمل)	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۵—۰۰
۱۱	سخن مختصر (مجموعہ کلام)	ڈاکٹر معین احسن جذبی	۲—۰۰
۱۲	سیر افلاک	حکیم احمد	۵—۰۰
۱۳	شرح سود اور زر	ابوسالم	۸—۵۰
۱۴	کچھ زر کی بابت	ابوسالم	۴—۵۰
۱۵	اردو ہندی ڈکشنری	مرتبہ انجمن ترقی اردو ہند	۱۲—۰۰
۱۶	تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶—۰۰
۱۷	گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	۶—۰۰
۱۸	دیمک کی کہانی	ڈاکٹر عبدالبصیر خاں	۲—۰۰
۱۹	زنداں نامہ	فیض احمد فیض	۲—۲۵

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

ڈاکٹر سیفی پریمی

مولانا اسماعیل میرٹھی اور نظم جدید

(گذشتہ سے پیوستہ)

ہیئت کے نئے تجربے :-

مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی نے نظم جدید کی تبلیغ کی اور اسمیں انھیں کامیابی نصیب ہوئی لیکن ان حضرات نے بنے بنائے سانچوں سے کام لیا۔ بڑا کارنامہ ہیئت کے سلسلے میں اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی "مثنوی اور مسدس" کی ہیئتوں کو استعمال کیا گیا البتہ عبدالحلیم شرر نے منظوم ڈراموں میں ہیئت کا نیا تجربہ کیا تھا جو اسی مخصوص صنف سے متعلق تھا۔ اردو میں ڈرامہ کا فن آج بھی دوسری اصناف سخن کی بہ نسبت کم ترقی یافتہ ہے اس لئے اس کا ہمہ گیر اثر نہ تھا۔

جدید نظم نگاروں کی نورانی محفل میں مولانا محمد اسماعیل میرٹھی ہی تنہا وہ نظم نگار شاعر ہیں جنہوں نے اپنی نظموں میں ہیئت کا نیا تجربہ کیا اور اس لحاظ سے وہ اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔

مولانا نے اردو ادب میں "ابیات" کا اضافہ کیا۔ فردیات کا رواج قدیم سے ہے لیکن مطلع کی صورت میں ایک خیال کو صرف دو مصرعوں میں مرکوز کر دینا مولانا کا اختراع ہے۔ مولانا نے مکمل خیال کو قطعہ سے بھی چھوٹی ہیئت میں پیش کرنے کا نیا تجربہ کیا ہے یہ ایجاز بیان اور جامعیت کی نادر مثال ہے اس کو "بیت" یا ایک شعری نظم کہیئے

"ابیات" میں اخلاقی درس و حکمت شامل ہیں مثلاً :

اچھی بات

جو بات کہو صاف ہو، ستھری ہو، بھلی ہو   کڑوی نہ ہو، کھٹی نہ ہو، مصری کی ڈلی ہو

وقت سے کام لو

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ کھینچنے سے بڑھتی ہے، چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

بری صحبت سے بچو

بد کی صحبت مت بیٹھو اس کا ہے انجام برا بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا، بدنام برا

مولانا نے بعض کہانیوں کا اخلاقی سبق ابیات میں نظم کیا ہے۔ مثلاً

کیا کیا خیال باندھے ناداں نے اپنے دل میں پر اونٹ کی سمائی کب ہو چوہے کے بل میں

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت نہیں کام آتی دلیل اور حجت

جبکہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ!

مولانا نے بعض ابیات میں حکیمانہ تجربے پیش کئے ہیں۔

اعتدال خیال

نہ حلوا بن کہ چٹ کر جائیں بھوکے نہ کڑوا بن کہ جو چکھے سو تھوکے

اعتدالِ غذا

نہ کھاؤ اتنا زیادہ کہ ڈال دے بیمار نہ اتنا کم ہو کہ ناطاقتی ہی ڈالے مار

راستی

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

احساس وقت

خبر لو وقت کی اپنے خبر لو! اڑا جاتا ہے جو کرنا ہے کر لو

بخیلی

ہر چند اُس کے مال سے کچھ واسطہ نہ ہو پھر بھی برا ہی کہتی ہے خلقت بخیل کو

مولانا نے مذکورہ ابیات میں معلمِ اخلاق کے اور اپنے تجربوں کا اظہار کیا تھا اب ایک بیت یعنی ایجادی نظم کو قاری کے مطالعہ کے لئے ہم پیش کرتے ہیں۔ اس میں فلسفہ و منطق کا استدلال ہے اور حدیث کا مضمون بھی۔

ساغر زریں ہو یا مٹی کا ہو اک ٹھیکرا تو نظر کر اس پہ جو کچھ اُسکے اندر ہے بھرا

ان ایجادی نظموں میں "کلیات اسماعیل" کے صفحات پر چند غزلوں کے شعر یا فردیات بھی درج ہو گئے ہیں۔ انھیں ہم نے نظر انداز کر دیا ہے۔

عظیم و نادر کارنامہ — مولانا اسماعیل میرٹھی نے دونوں نظموں میں ہیئت کا نیا اور کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اس لئے یہ نظمیں ان کا عظیم و نادر کارنامہ سمجھی جائیں گی۔ ان نظموں کے خالق کی حیثیت سے وہ ایک طرف اپنے معاصرین میں ممتاز و انفرادی مقام پاتے ہیں اور دوسری طرف ترقی پسند آزاد نظم نگار شعرا میں وہ مشعلِ ہدایت قرار پاتے ہیں۔
یہ پہلی نظم "تاروں بھری رات" ملاحظہ فرمائیے۔

تاروں بھری رات

ارے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہوئے — مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسمان پر — جو ہے کُل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے — کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں
گہر اور لعل گویا

جونہی آفتاب تاباں — نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم — یہ تمہاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں — بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی — نہ میسّر آتی اُن کو
تو غریب جنگلوں میں — یونہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس و چپ کی — نہ طرف کی ہوتی اٹکل
نہ نشانِ راہ پاتے
وہ غریب کھیت والے — وہ امیدوار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی — کہیں کھیت کٹ رہا ہے
کہیں لگ رہا ہے خرمن — نہیں آنکھ اُن کی جھپکی!

یونہی شام سے سحر تک ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ نہ شمار وقت وساعت
مگر اے چمکنے والو ہو تمہیں انھیں سمجھاتے
کہ گئی ہے رات کتنی

وہ جہاز جن کے آگے ہے وسیع بحرِ اعظم
انھیں ہولناک موجوں سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے کوئی آرہا ہے واپس
انھیں کچھ خبر نہیں ہے کہ کدھر ہے انکی منزل
نہ تو مرحلہ نہ چوکی نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر مگر اے فلک کے تارو
تمہیں اُن کے رہنما ہو

اس نظم کی ہیئت میں صرف یہ نئی بات نہیں ہے کہ یہ بے قافیہ نظم ہے بلکہ مولانا نے ایک مروجہ بحر کے وزن سے ٹکڑوں میں تقسیم کرکے نظم کے لئے یہ ہیئت اختیار کی ہے
انھوں نے بحر" رمل مثمن مشکول" کے وزن کے ٹکڑے کرکے دو مصرعے بنائے ہیں۔ ارکان حسب ذیل ہیں ۔

فَعِلَاتُ فَاعِلَاتُن فَعِلَاتُ فَاعِلَاتُن

تیسری جدت یہ ہے کہ ہر بند کے بعد ایک مصرع لگایا ہے جو مذکورہ وزن کا ایک ٹکڑا ہے۔
مولانا اسماعیل کی دوسری چونکا دینے والی نظم " چڑیا کے بچے " ہے۔

چڑیا کے بچے

تین چھوٹے بچے چڑیا کے گھونسلے میں
پائے ماںتا سے پھیلا کے دونوں بازو
طرح روزمرہ کرتی ہے ماں حفاظت
ناچڑا گیا ہے چنگا تلاش کرنے
لائیگا تو بچے منہ کھولدینگے جھٹ سے

چپ چاپ لگ رہے ہیں سینہ سے اپنی ماں کے
اپنے پَروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے
سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم ان کو
دانہ کہیں کہیں سے پوٹے میں اپنے بھر کر
اُنکو بھرائے گا وہ ماں اور باپ دونوں

پچوں کی پرورش میں مصروف ہیں برابر
اور چھوٹے بچے خوش ہیں تکلیف کچھ نہیں ہے
اے چھوٹے چھوٹے بچو تم اپنے گھونسلے سے
ہرگز نہیں گروگے، پر اور ذرا سے اب تک
نکلے نہیں تمہارے اس واسطے ابھی تم
اونچے نہ اڑسکوگے ہاں جب تمہارے بازو
اور پر درست ہونگے تو دن کی روشنی میں
سیکھو گے تم بھی اُڑنا، کرتے پھروگے "چیں چیں"
اڑتے پھروگے پُھر پُھر اے چھوٹے بچو لیکن
کوّا بُری بلا ہے اُس سے خدا بچائے

اس نظم کے آخری چار اشعار بیحد مربوط ہیں۔ آخری مصرع کا سلسلہ مصرع اول سے مل جاتا ہے یعنی تسلسل میں کہیں جھول نہیں ہے اور اس لئے وحدت تاثر بے مثال ہے۔ نظم بے قافیہ ہے لیکن یہ مولانا کا کمال ہے اور ہیئت کا نیا تجربہ کہ پوری نظم کو بحر "مضارع مثمن اخرب" میں کہا گیا ہے۔ اس کا وزن یہ ہے

مَفعُولُ فَاعِلَاتُن مَفعُولُ فَاعِلَاتُن

مولانا کا سب سے قابل قدر کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اردو زبان و ادب کی ابتدائی منزل میں قدم رکھنے والے نونہالوں کے ذہنوں کو نظم کی جدید ہیئت سے روشناس کرادیا۔ ہمارا قیاس کہتا ہے کہ آزاد نظم نگار شعراء کے ذہن پر بچپن میں یقیناً مولانا اسماعیل کے کلام کی چھاپ رہی ہوگی۔ وہی نقش بعد میں اُبھرا۔ اس میں رنگ بھرا گیا اور ایک نئی تصویر بن گئی۔

نظموں کا عروضی جائزہ۔

۱۔ کیڑا
۲۔ موت کی گھڑی
۳۔ فادر ولیم
۴۔ حب وطن

مذکورہ تین نظمیں یعنی دوسری، تیسری اور چوتھی بحر خفیف مسدس مخبون $\frac{\text{محذوف}}{\text{مقصور}}$ میں کہی گئی ہیں

۵۔ ایک قانع مفلس
بحر رمل مسدس $\frac{\text{محذوف}}{\text{مقصور}}$ میں ہے

۶ - انسان کی خام خیالی
بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور/محذوف میں ہے۔

طبع زاد نظمیں۔

۱ - چھوٹے سے کام کا بڑا نتیجہ
(بحر رمل مثمن مخبون محذوف)

۲ - ایک گنوار اور قوس قزح
بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور

۳ - شفق
بحر متقارب مثمن مقصور/محذوف

۴ - رات (بحر متقارب مثمن مقصور/محذوف)

۵ - برسات
(بحر متقارب مقصور/محذوف)

۶ - گرمی کا موسم۔
(بحر ہزج مسدس محذوف/مقصور)

۷ - گائے (بحر متدارک مثمن مقطوع)

۸ - اونٹ (بحر رمل مسدس محذوف

۹ - حیا (بحر رمل مسدس محذوف

۱۰ - کاشتکاری (بحر خفیف مسدس مخبون محذوف/مقصور

۱۱ - ریل گاڑی (بحر مضارع مثمن اخرب)

۱۲ - مثمن قلعہ اکبر آباد (بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف/مقصور

۱۳ - قرض (بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف

۱۴ - شمشیر (بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف/مقصور

دیگر نظمیں

۱ ۔ صفت شیخ ، بحر رمل مسدس محذوف / مقصور

۲ ۔ صاحبو یہ وقت ہے آرام کا ، بحر رمل مسدس محذوف / مقصور

۳ ۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے ، بحر خفیف مسدس مخبون محذوف / مقصور

۴ ۔ بچپن میں خدا کی یاد ، بحر خفیف مسدس مخبون محذوف / مقصور

۵ ۔ ماں کی مامتا ، بحر خفیف مسدس مخبون محذوف / مقصور

۶ ۔ ہفت درود محمود ، بحر متقارب مثمن مقبوض اثلم

۷ ۔ تماشائے خیال ، بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف

۸ ۔ میدان کارزار ، بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف

۹ ۔ یاد الٰہی ، بحر ہزج مسدس مقصور / محذوف

۱۰ ۔ خدا حافظ کوئن کا ، بحر ہزج مسدس مقصور / محذوف

۱۱ ۔ اچھا زمانہ آنے والا ہے ، بحر متقارب مثمن محذوف / مقصور

۱۲ ۔ صبح کی آمد ، بحر متقارب مثمن محذوف / مقصور

۱۳ ۔ کوشش کئے جاؤ ، بحر متقارب مثمن محذوف / مقصور

۱۴ ۔ چھوٹی چیونٹی ، بحر متقارب مثمن محذوف / مقصور

۱۵ ۔ نفس سرکش ، بحر متقارب مثمن محذوف / مقصور

۱۶ ۔ خدا قیصر الہند کو سلامت رکھے ، بحر سریع مسدس مطوی موقوف مکسوف

۱۷ ۔ حیات غم ، بحر رمل مثمن مخبون محذوف

۱۸ ۔ انسان ، بحر رمل مثمن مخبون محذوف

۱۹ ۔ محنت کرو ، بحر متدارک مثمن مقطوع

۲۰ ۔ جذبات الم ، بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف

انگریزی نظموں کے ترجمے اور ان کے ماخذ۔

فادر ولیم

1. Carrell, Lewis, Father William
11. Father William
(you are old father William)
ALV., BOCH L-I; BL OV-BTP ECGV-1

حب وطن۔

2. Cooldidge, Susan, Patriotism OOP., P50-, OP-1
Raymond Kresensky, R-H
at Squawrells unknown PAP

کیڑا

3. Davies W. H., Worm's contempt

ایک قانع مفلس۔

4. Greene, Robert, poor Estate

ایک قانع مفلس کا ماخذ یہ نظم بھی ہو سکتی ہے

5. Dickinson, E. The poor

موت کی گھڑی

6. Turner, W. g- Death and despaie

بعض دوسری نظموں کے ماخذ

تاروں بھری رات

1. Campbell, T. The Evening star

ایک کتا اور اس کی پرچھائیں

2. Smart Christopher, Dog in The River
(Translation form Lattin

ایک کتا اور اس کی پرچھائیں۔

3. Taylor, Jefferys Dog of Reflection

مرتب محمد انصار اللہ

قاعدہ ہندی ریختہ

مقالہ اوّل (مفردات میں)

صفحہ

بحث اول ۔ اسم

باب اول ۔ تقسیم میں اسم کی باعتبار اشتقاق　۸۷
جامد　مصدر　مشتق

باب دوم ۔ باعتبار تعیین معنی　۹۰
نکرہ　معرفہ　اسم اشارہ
اسم موصول　متفرقات

باب سیوم ۔ باعتبار دلالت کرتے اوپر معنی کے　۹۷
اسم　صفت مفرد ، مرکب

باب چہارم ۔ تبدیل و عدم تبدیل ، تذکیر و تانیث ، وحدت و جمعت　۱۰۰
فصل اول ۔ عدم تبدیل　فصل دوم ۔ تبدیل　فصل سیوم ۔ تذکیر و تانیث
فصل چہارم ۔ حالات اسما کے　فصل پنجم وحدت و جمع　متفرقات

بحث دوم ۔ فعل

باب اول ۔ بنانے افعال و تصریف　۱۱۰
باب دوم ۔ فعل کے احکام　۱۱۳
فصل اول ۔ اقسام فعل ، لازم متعدی　فصل دوم ۔ فعل و شعبی ، غیر شعبی
مفرد ، مرکب

فصل سیوم ۔ تذکیر و تانیث ، وحدت و جمعیت افعال
فصل چارم ۔ ہندی افعال
باب سیوم ۔ بیان میں مجاز کے
۲۰ بحث سیوم ۔ حرف
۱۲

مقالہ دوم ۔ (مرکبات)

بحث اول ۔ مرکب غیر کلامی
۲۶ نوع اول ۔ توصیفی نوع دوم اضافی
نوع سیوم ۔ تعدادی نوع چارم ۔ امتزاجی
بحث دوم کلام و جملہ
۲۸ جملہ اسمیہ جملہ فعلیہ

خاتمہ

۳۰ فصل اول حال
فصل دوم تمیز
فصل سیوم توابع
فصل چارم بعضے قواعد میں

قاعدہ ہندی ریختہ

مہر
محمد ابوالحسن
۱۲۶۳

مہر
محمد ابوالحسن
۱۲۶۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ رسالہ زبان ریختہ[1] ہندی کی صرف و نحو میں مشتمل ہے دو مقالہ پر

مقالہ اول

مفردات میں

کلمہ وہ لفظ کہ موضوع ہو، واسطے ایک معنی مفرد کے۔ یہ مقالہ شامل ہے تین بحث پر

بحث اول۔ اسم

وہ کلمہ[2] کہ دلالت کرے ایک معنی پر ساتھ استقلال کے، یعنی دلالت کے واسطے محتاج دوسرے کی نہ ہو اور اُس کے معنی کے ساتھ زمانہ نہ سمجھا جائے۔ اس بحث میں چار باب ہیں :

باب اول

تقسیم میں اسم کی، باعتبار اشتقاق و عدم اشتقاق کے

جاننا چاہیئے کہ اس اعتبار کر کے اسم تین نوع ہیں

نوع اول۔ جامد

وہ اسم کہ نہ وہ مشتق (نہ) مشتق منہ ہے، یعنی نکلا ہے وہ کسی سے نہ اس سے کوئی نکلا ہے جیسا پتھر، پانی[3]، مرد، پنڈی۔

---

[1] زبان اردو " ریختہ " کے نام سے بعد تک موسوم رہی ہے چنانچہ غالب نے لکھا ہے " یہ ایک درریختہ والوں کا سہرے" [خطوط غالب ص۱۵۱] خیال ہے کہ دہلی میں قلعہ معلّی سے نسبت کے سبب اسے سب سے پہلے زبان اردوئے معلّی کہا گیا، پورب کے علاقوں میں یہ نام بعد میں رائج ہوا۔ احمد علی یکتا نے اپنی تصنیف دستور الفصاحت میں اسے " اردو " ضرور کہا ہے لیکن اس کا قدیمی نام بعد میں بھی زبانوں پر جاری رہا۔

[2] لفظ " کلمہ " اب متفقہ طور پر مذکر ہے۔ ممکن ہے کہ بنارس میں قدما اسے بھی " لفظ " کے قیاس پر مؤنث بولتے رہے ہوں۔ لفظ کی تانیث کے سلسلے میں غالب نے لکھا ہے " لفظ اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔ اہل پورب اس کو مؤنث بولتے ہیں [خطوط غالب ص۲۴۲]

نوع دوم : مصدر

وہ کہ نکلیں اُس سے[1] افعال یا اسمار مشتقہ۔ علامت مصدر کی ہندی میں حرف "نا" یعنی نون و الف ساکن ہے اور مصدر کی چار قسم ہیں۔

لازمی - جیسا آنا ، جانا

متعدی بیک[2] مفعول جیسا مارنا ، کاٹنا

متعدی بدو مفعول مثلاً کٹوانا ، دلوانا

متعدی بسہ مفعول - دلانا

پھر مصدر متعدی مطلق دو قسم ہیں۔

معروف، کہ مثال اس کی مذکور ہوئی

مجہول ، چنانچہ مارا جانا ، کٹوایا جانا ، دلایا جانا۔ اور تفصیل اس کی کما حقہ بحث فعل میں آوے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

یاد رکھنا چاہیے[3] کہ مصدر دلالت کرتا ہے اوپر صادر ہونے فعل کے فاعل سے یا قائم ہونے پر فعل کے فاعل میں اور اس صدور و قیام کے بعد ایک کیفیت جو حاصل ہو اُس کیفیت پر جو اسم دلالت کرے وہ حاصل بالمصدر ہے پس اگر مصادر کی علامت کے حذف کرنے سے جس قدر باقی ہے وہی حاصل بالمصدر ہے جیسا مار ، پیٹ ، لوٹ ، کاٹ۔ اور کبھی صیغہ جمع امر کا جو بغیر ہمزہ کے آتا ہے حاصل بالمصدر ہوتا ہے مثلاً لگاو ، چڑھاو ، دباو ، بچاو۔ اور کبھی ماضی واحد مذکر کے ساتھ حرف نون لانے سے جیسا لگان ، چلان، اور کبھی حرف پائے فارسی کے آنے سے جیسا ملاپ

---

[1] کاتب نے ضمہ کے مقام پر واو معدولہ اور کسرہ کے محل میں حرف 'یا' کا اضافہ کیا ہے جیسا کہ قدماء کا دستور تھا۔

[2] ہر جگہ کاتب نے (بہ) کے مقام پر حرف 'ب' کو لفظ ما بعد سے پہلے وصل دیا ہے جیسا کہ فارسی تحریر کا اصول ہے

[3] اصل "رکھا چاہئے" [4] بعض مقامی بولیوں میں انھیں لفظوں پر علامت مصدر "نا" کا اضافہ کرتے ہیں مثلاً اونا، دباونا، لگاوتا، بچاونا وغیرہ پوربی میں بھی اس کی صورت ملتی ہے مثلاً اوت اور رووت ، کھوت اور کھودت ، لگات اور لگاوت وغیرہ۔ اسی طرح بجھاسے کے اور سمجھاونے کے بجاسے کے اور بجاوسے کے (معنی بجھانے کے لئے اور بجانے کے لئے) بھی آتے ہیں اس موقعہ پر یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ دوت یا واوت کے بعد جب لفظ ہے آئے گا تو اس کا دت ، لفظ ہے کے ہ سے مخلوط ہو گا [illegible]

نوع سیوم ۔ مشتق

وہ اسم ہے کہ نکلیں کلمۂ مصادر سے ۔ پس مشتق کی چار قسم ہیں

قسم اول ۔ اسم فاعل ۔ وہ کہ دلالت کرے ذات پر اس کی کہ جس سے فعل صادر ہوئے[1] جیسا کہ مارتے والا[2] ۔ یا قائم ہو جیسیں مثلاً مرنے والا ۔ اسم فاعل کی علامت اکثر واقع ہے لفظ " والا " یا " ہارا "

اسم فاعل مذکر واحد ۔ مارنے والا جمع ۔ مارنے والے

موئنث واحد ۔ مارنے والی[3] جمع ۔ مارنے والیں یا مارنے والیاں[4]

فائدہ ۔ اکثر اسم فاعل عربی و فارسی استعمال ہندی میں آتے ہیں جیسا فاضل، عاشق، آیندہ، روندہ

قسم دوم ۔ اسم مفعول ۔ وہ کہ دلالت کرے ذات پر اُس شخص کی کہ جس پر فعل واقع ہو ۔ اسم مفعول کا وزن موافق ہے فعل ماضی کے وزن کے ساتھ جیسا کہتے ہیں وہ تو میرا مارا ہے

اسم مفعول مذکر واحد ۔ مارا جمع ۔ مارے[5]

مؤنث واحد ۔ ماری جمع ماریں یا ماریاں

اور کبھی اسم مفعول کے صیغوں پر زاید کرتے ہیں لفظ ہوا، اور ہوے بیائے مجہول و ہوئی، ہوئیں یا ہوئیاں بیائے معروف کو مثلاً مارا ہوا، مارے ہوے واخواند[6]

قسم سیوم ۔ اسم حالیہ کہ وہ فی الواقع موافق اصطلاح عرب کے حال ہے یعنی جو بیان کرے ہیئت فاعل یا مفعول کی چنانچہ کہتے ہیں زید مارتا چلا جاتا تھا یعنی جاتا تھا جس حالت میں اُس سے مار صادر ہوتی تھی اور[7] اصطلاح میں اُس کی علامت ہے حرف تا و تے بیائے مجہول وتی وتیں و تیاں بیائے معروف

اسم حالیہ مذکر ۔ مارتا، مارتے موئنث ۔ مارتی، مارتیں یا مارتیاں

اور کبھی اُس پر لفظ ہوا ہوے و ہوئی و ہوئیں و ہوئیاں زاید کرتے ہیں جیسا مارتا ہوا

---

[1] اصل "ہوئی ۔ یائے مجہول پر ہمزہ (= ہوئے) یا اس سے پہلے واو (= ہو ؤے) جیسا کہ دہلی کے قرب و جوار میں بولتے ہیں، نہیں ہے ۔

[2] اصل " مارا تے والا " یہ یک الف زاید، سہو کاتب ۔ [3] اصل " مارنیوائی " ۔ اور موئنث کی اکثر مثالوں میں یائے معروف پر ہمزہ بنایا ہے ۔ [4] یہ حالت جمع میں الف نون (اں) کا یہ اضافہ دہلی کے قریب کی بعض بولیوں (مثلاً ہریانی) کی بھی خصوصیت ہے [5] جمع کی یہ صورت دلّی کے روزمرہ کے خلاف ہے [6] اصل " ہیئت " کم و بیش ہوگئی ت، کی ہی صورت ہے ۔ [7] اصل " آور " اور اکثر مقامات پر یہی ہے چنانچہ " اوپر " کو " آدپر " اور " اُن " کو " آون " بھی لکھا ہے

الیٰ آخرہ -

قسم چہارم - اسم تفضیل - وہ کہ دلالت کرے اوپر اس بات کے کہ اُس کے مدلول کو فضیلت یعنی زیادتی ہے اُس کے غیر پر، پس اسم تفضیل کے واسطے کوئی صیغۂ خاص موضوع نہیں بلکہ لفظ سے ویں و حرف کا علامت سے اُس کی بیسانہ تجھ سے بھلا ہے، اُن آدمیوں[1] میں یہ قابل ہے یعنی قابل تر اور سب کا بڑا بھی[2] فایق ہ - اکثر اسمار تفضیل عربی و فارسی کے ہندی میں مستعمل ہیں جیسا افضل و احسن، بہتر و نیک تر، بدتر۔

اور اسم ظرف و اسم آلہ[3] کے واسطے کوئی قاعدہ مقرر نہیں، اما کبھی مصدر معنی ظرف کا فایدہ دیتا ہے جیسا رمنا و جھرنا یعنی ہرن کے رمنے کی جگہ و پانی کے جھرنے[4] (کذا) کی جگہ اور ایسیہی[5] (کذا) کبھی مصدر اسم آلہ کے معنی کو مفید ہوتا ہے جیسا بیلنا[6] اور کبھی اسم آلہ کی علامت حرف نون ساکن یا لفظ نی بیائے معروف ہوتی ہے جیسا بیلن، بیلنی، کترنی، کربلنی، چکنی، سونگھنی، مکھنی

باب دوم

اسم باعتبار تعین و عدم تعین معنی کے دو قسم ہے

اول - نکرہ -

وہ اسم کہ دلالت کرے یک اسم غیر معین پر جیسا مرد، پس دنیا کے سب مردوں پر صادق آسکتا ہے اور ایسیہی ہاتی (= ہاتھی) ادمی، ماقوس[7]، گھوڑا، اونٹھ (کذا)

قسم دوم - معرفہ

وہ اسم ہے کہ ایک معین چیز پر دلالت کرے اور معرفہ کی چار نوع ہیں:

نوع اول - علم - وہ کہ نام ہو ایک شخص معین کا جیسا زید - پس یہ اُس شخص پر دلالت کرتا ہے فقط کہ جس کا نام ہے اور ایسیہی رام، کشن، ستیا، رادھا

فایدہ - جو علم دلالت کرے ایک ذات معین پر ساتھ ایک وصف کے وہ لقب ہے و خطاب ہے۔ شمس الدولہ، منموہن

---

[1] کذا :- اکثر یورپ کے لوگ آدمی کو "ادمی" اور آدمیوں کو "ادمیوں" بہ فتحہ اول بولتے ہیں - یہاں "مد" نہ بنانا ممکن ہے اسی سبب سے ہو، [2] اصل " الئہ " [3] یہ لفظ "جھرنا" چھن چھن کر گرنے کے معنی میں آتا ہے، جھرنا (بہ ڑا ئے ثقیلہ) اس سے مختلف ہے چنانچہ جھرنا پڑے۔ چھننے کو بھی کہتے ہیں۔

[4] ایسیہی = ایس + ہی = ایسے + سی + ہی = ایسا + ہی - "ایس" بجائے ایسا یورپ والوں کا تلفظ ہے۔ [5] پچھم کے لوگ بیلن اور پورب والے بیلنا اور بیلنی کہتے ہیں۔ [7] ماقوس مع واو معدولہ = مکس = ہش ہش بمعنی آدمی

فایدہ ۔ راجپوتوں کے نام کے ساتھ اکثر لفظ سنگھ و رائے واقع ہوتا ہے چنانچہ بلونت سنگھ، دلمیپ سنگھ و لالہ رائے اور مہاجنوں کے نام کے ساتھ لفظ ساہ و سیٹھ جیسا گوکل ساہ و جگت سیٹھ ۔ اور مسلمان فقیروں کے نام کے ساتھ لفظ شاہ و صوفی ۔ و ہندو فقیروں کے نام میں بھگت و ڈنگر[۱] و مُن وغیرہ اور برہمنوں کے نام میں لفظ پانڈے و تیواری و دوبے[۲] و چوبے اور اکثر نام بہ حقارت کہتے ہیں جیسے کرکٹ، جھگوڑیا[۳]، کالے، چرکٹ

نوع دوم ۔ ضمیر ۔ پس ضمایر ہندی میں چند لفظ ہیں

میں[۴] واحد متکلم ہم متکلم جمع تو یا تیں واحد مخاطب

تم[۵] جمع مخاطب وہ[۶] واحد غایب وے[۷] جمع غایب

فایدہ ۔ تذکیر و تانیث ہندی ضمایر میں برابر ہے مثلاً مارا[۸] وہ مرد، ماری وہ عورت اور تثنیہ کے واسطے کوئی ضمیر خاص موضوع نہیں بلکہ ہندی میں تثنیہ کے واسطے لفظ خاص کہیں نہیں ۔ نہ اسما، نہ افعال، نہ حروف، بلکہ تثنیہ و جمع مشترک ہیں اور اسما ضمایر منقسم تین قسم پر؛

قسم اول ضمیر فاعل ۔ جیسا کیا میں[۱۰] کے ہم وغیرہ

قسم دوم ضمیر مفعول ۔ اس کے بنانے کا طریقہ یہ ہے[۱۱] کہ لفظ 'کو' یعنی حرف کاف و واو مجہول، کبھی تیں و حرف 'ی' یعنی یائے مجہول آخر ضمائر کے ساتھ ضم کریں مثلاً دیا مجھے کو،

---

۱ صحیح گرو اور منی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں ان لفظوں کے آخر کی حرکت خفیف ہونے کے سبب ختم کر دی گئی ہے

۲ اس موقع پر دویدی، چترویدی وغیرہ الفاظ بھی آتے ہیں ۔ ۳ پورب کے لوگ اکثر الفاظ صحیح کے آخر میں 'یا' اور 'وا' کا اضافہ کرتے ہیں بکرا سے بکروا اور بکری سے بکریا، پچھم میں بعض اسما میں کم و بیش ایسی صورت ملتی ہے مثلاً کلوا لیکن دونوں کے اصول اشتقاق مختلف ہیں ۔ ۴ اصل "چھہ" = چھ اور یہ املا "چھہ" سے مختلف ہے، کیفیت یہ ہے کہ پورب کے لوگ اس لفظ کو مفتوح الاول بولتے ہیں اور حرف چھ (جیم فارسی مع ہائے مخلوط التلفظ) کی حرکت کے اظہار کے لئے ایک 'ہ' اور لاتے ہیں ۔

۵ لفظ میں دہلی کے قرب و جوار میں بہ کسرۂ اول اور پورب میں مفتوح الاول آتا ہے ۶ 'تم' کے مقام پر پورب میں 'توں' بہ اضافہ نون غنہ بولتے ہیں، اسی طرح 'آپ' کی جگہ پورب کے بعض علاقوں میں "رورے" اور "رواں" بھی کہتے ہیں (تخلیص معلّی ص ۹۰)

۷ 'وہ' پورب میں مفتوح الاول آتا ہے اسلئے دہلی کی طرح وہاں اس لفظ کا تلفظ 'وُ' نہیں ہو سکتا ۸ اس بات غالب نے لکھا ہے "وے کو یکنو اردو بولی ہے" [خطوط غالب ص ۴۲] لیکن یہ لفظ شمالی ہند کی مختلف بولیوں میں رائج ہے ۹ یہ بھی اہل دہلی کی بول چال کے خلاف ہے: مارا اس مرد نے، مارا اس عورت نے، وہاں فعل کی صورت اس طور پر نہیں

۱۰ ان مقامات پر علامت فاعل "نے" کا حذف جدید اردو میں جائز نہیں ہے ۱۱ اصل "اُنہی" = اُن + ہی ۔ لیکن جدید اردو میں "انھیں" آتا ہے ۔

یا مجھے ، دیا ہمکو یا ہمے[1]، مارا تجھکو یا تجھے ، مارا تمکو یا تمہے مارا اُس کو یا اُسکیتیں یا اُسے ، مارا اُنھکو یا اُنھے یا اُنھکیتیں

قسم سیوم ۔ ضمیر مضاف ۔ وہ ضمیر کہ جس کی طرف اضافت کریں کسی لفظ کو ۔ اضافت کی علامت حرف کا یعنی کاف والف ساکن و حرف کے بیائے مجہول و کی بیائے معروف

فائدہ ۔ ضمایر میں اکثر تغیر و تبدیل واقع ہوتی ہے جب[2] اِن کے بعد حروف معنوی آویں اور حروف معنوی با صطلاح جدید دو قسم مقرر کئے ہیں .... مفرد اور مرکب

مفرد صرف حروف ہیں جیسا ہیں وکیتیں و کو ، کا و الا وغیرہ

اور مرکب جہاں تک اسمائے ظروف ہیں جیسا پاس ، طرف ، آگے ، پیچھے وغیرہ اور مشبہ ظروف جیسا موجب برابر وغیرہ

چنانچہ جب لفظ او ر یہ کے بعد حروف معنوی یا اسماء ظروف واقع ہوویں[3] تب اُسکے حرف یا کو بدل کریں گے ساتھ حرف سین کے ، اور حرف واو ، یا کو الف مضمومہ و مکسورہ سے مثلاً اُسکو ، اُسے ، اُسکیتیں ، اُسکا ، اُسکے ، اُس سے[4] ، اُس میں ، اُس نے ، اُس پاس وغیرہ

اور لفظ وے اور یئے[5] (کذا) کے بعد جب حروف معنوی واقع ہویں تب تبدیل ہوتی ہے ساتھ حرف (ن[6]) و نہہ یعنی نون و ہا کے جیسا اُنھکو ، اُنھے ، اُنھونکو ، اُنھوکا ، اُنھونے ، اُنھوں سے ، اُن پاس وغیرہ ۔

لفظ تیں[7] ومیں کے بعد جب حرف کا و کی وکیتیں واقع ہو تب اُن لفظوں کا حرف کاف مبدل

---

[1] پوربی میں "ہمے" بمعنی کو آتا ہے چنانچہ ہمکو = ہم ہمے = ہمھے وعلیٰ ہذا القیاس تمھے ، اُنھے وغیرہ

[2] جب اُن کے ..... موجب ، برابر وغیرہ" یہ عبارت حاشیہ پر لکھی تھی اور جلد و جلدی میں تراش آگئی پھر اس پر غالباً پانی پڑ گیا جس کی وجہ سے حروف پھیل کر ایک حد تک مٹ سے گئے ہیں [3] "ہوویں" ۔ اس کا مروجہ املا "ہوئیں" یا "ہوویں" ہے ۔ [4] تیرھویں صدی ہجری کے ربع ثالث تک تحریر کے اصول متعین نہ ہونے کے سبب اُس سے کو "اُس سے" لکھتے تھے ۔ اس نسخہ کے کاتب نے رواج حال کے مطابق الگ الگ "اُس سے" لکھا ہے

[5] "یئے" پر اعراب ہونے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس لفظ کا تلفظ یہ فتحہ اول کیا جاتا تھا اور اسی قیاس پر "وے" کا تلفظ بھی ہوگا ۔ [6] "ان کو" میں یہ تبدیلی حرف "ن" کے ساتھ بھی ہوتی ہے اسلئے یہ اضافہ کیا گیا ، اس کی تائید مزید قواعد جلیلہ کی بحث سے بھی ہوتی ہے [7] غالب دہلوی نے لکھا ہے "تئیں" کا لفظ متروک اور غیر فصیح ، یہ پنجاب کی بولی ہے ، مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے ہاں نوکر رہی تھی وہ تئیں بولتی تھی تو لونڈیاں اور بیبیاں سب اس پر ہنستی تھیں" خطوط غالب ص ۱۰۸

ہوگا ساتھ حرف را کے جیسا میرا گھوڑا و تیرا و میرے و تیرے ، میرے تیں ، تیرے تیں ہے ۔
بیں حرف ملا و ری و رے وتیں واقع ہے موقع میں کا و کی و کے وکتیں کے ۔ اسی واسطے درست نہیں میرا کا گھوڑا ' میرے کے پاس ، میرے (کی[ا]) لونڈی ۔ میرے کتیں و[۲] نہیں تو لازم آوے گا اجتماع عوض و معوض منہ ' اور جب اُن دونوں کے بعد حرف نے اوے تب تبدیل نہیں ہوتی ہے جیسا میں نے ، تیں نے ۔ اور سوائے اُن پانچ (کذا) حرف کے اور حروف جب واقع ہوویں تب تبدیل ہوتی ہے ساتھ قرار کے ۔ ہمارا ' تمھارا ، ہمارے ، تمھارے ، ہماری ، تمھاری (کذا) ، ہمارے تیں ، تمھارے تیں ۔ سوائے اُسکے اور کسی حروف کے سبب کرکے تبدیل نہیں ہوتی ہے جیسا ہم نے ، تم نے ، ہم سے ، تم سے وغیرہ ۔

نوع سیوم ۔ اسم اشارے کے چار[۳] لفظ ہیں

دو واسطے اشارہ طرف قریب کے یعنی یہ و سیہ

اور دو واسطے اشارہ بعید کے وہ اور وسے

اور اسمائے اشارہ میں تبدیل اُسی طرح سے ہے جیسے ضمیر غائب میں ۔

فائدہ[۴] ۔ جب ایک ہی جملہ میں اسمار ضمایر یا اسمار اشارہ کے بعد دوسرا ضمیر مضاف الیہ یا اسم اشارہ مضاف الیہ واقع ہو تب اُس ضمیر و اسم اشارہ مضاف الیہ کو تعبیر کرتے ہیں ساتھ لفظ اپنا و اپنے ، جا ہے مجہول و یائے معروف کے جیسا میں اپنے گھر جاؤں ، تو اپنا گھوڑا بیچ ، وہ اپنے گھر جاوے ۔ اور نہیں جایز ہے میں میرے گھر جاؤں ، تو تیرا گھوڑا بیچ وغیرہ ۔ بخلاف اِس کے اگر دو جملہ میں واقع ہو ے جیسا میں ہوں یہاں اور میرا گھر وہاں

فائدہ[۵] ۔ ضمائر میں تخصیص یا تاکید کے واسطے اکثر لفظ ہی بیائے معروف یا آپ ، آپھی آپ اپنا خود یا نے یعنی ہی و جیم ساکن استعمال کرتے ہیں جیسا میں ہی جاؤں گا ، میں آپ جاؤں گا ، آپی آپ ...

---

[۱] مذکورہ اصول کے مطابق یہاں "کی" ضروری تھا اسلیے اضافہ کیا گیا تھا ۔ [۲] اصل میں "دو" نہیں ہے لیکن اول تو دونوں ہی "کا یہ محل نہیں ، دوم "دوں" اہل پورب کی بول چال بھی نہیں ۔ ایک زائد واو سہو کاتب ہوگا ۔

[۳] اصل میں "ایکھو" اور یہ جگہ یہی ۔ پورب کے لوگ اس مرکب لفظ کا تلفظ اسطرح کرتے ہیں : ۔ اے + کہی = اسے + کسے ہی ۔ لیکن میر ونشنگ کے اصول کے مطابق اسکا تلفظ "ایکی" بروزن نیکی ہوگا کہ اصل "آپھی" اور یہ جگہ یہی ۔ میر علی اوسط رشک نے اس لفظ کو اسی تلفظ کے ساتھ اپنے لغت میں جگہ دی ہے ۔ پورب کے لوگوں کی زبان آپ + ہی (ہائے فارسی مفتوح ' ہائے ہوز بہ یائے معروف کشیدہ) ثابت [۴] پورب کے دیہاتیوں کی زبان سے چار لفظ اور بھی سنے جاتے ہیں ۔ ای (الف بہ یائے معروف کشیدہ) او (الف بہ واو معروف کشیدہ) اور ہو (ہا مفتوح ، واو معروف ساکن) اور ہی (ہا مفتوح ، یائے معروف ساکن)

حرمت الاکرام



یہ تشنگی کی آگ، یہ آسودگی کا زہر
پیتا ہے کس خوشی سے زمانہ خوشی کا زہر!

وہ بدگمانیاں ہیں کہ خود سے بھی خوش نہیں
خوابوں میں کون گھول گیا آگہی کا زہر!

مدہوشیٔ حیات نہ سمجھی کہ جام میں
غم کا سرور کتنا ہے، کتنا خوشی کا زہر

تا صبح آزماتی ہے تشنہ لبوں کا ظرف
وہ رات جس کے جام میں ہو چاندنی کا زہر

اک تیرا غم تھا مٹ نہ سکیں جس کی تلخیاں
تھا ورنہ خوشگوار بہت زندگی کا زہر

شکوہ نہیں، یہ سادہ دلی کا ہے تجربہ
ہوتا ہے دشمنی سے سوا دوستی کا زہر

تارو! یہ رات مجھ سے گزاری نہ جائے گی
دل میں مرے اتار دو اپنی ہنسی کا زہر

اے گردشِ حیات! نہ لے مجھ سے انتقام
کیا کم عدوئے جاں ہے مری سادگی کا زہر

حرمت دو آتشہ ہے بلا کی، سرشت دل
منزل رسی کی پیاس ہے اور گمرہی کا زہر

؎ تو نے سودا کتیں قتل کیا کہتے ہیں یہ اگر سچ ہے (کذا) ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

اور وہی لفظ کیا اگر جھڑکی کے ساتھ ہو تب منع کے واسطے ہے جیسا اگر کوئی جھڑکی کے ساتھ کہے کہ تو کیا کرتا ہے یعنی مت کر اور کبھی واسطے ظاہر کرنے استغنا کے جیسا ؎

تجھ بن بہشت پیار ہے، میں لے کے کیا کرونگا

اور کبھی واسطے تعجب کے جیسا ؎

جل یقیں بہتر نہیں ہے اس سے جل مرنے کی طرح
کیا ہی پھولے ہیں پلاس اور لگ رہی ہے بن میں آگ

اور کبھی تمنا و حسرت کے جیسا ؎

اگر دلبر ہماری بر میں آج آتا تو کیا ہوتا

اور تبدیل لفظ کون و کیا کی موافق ہے تبدیل اسماء موصول کے جیسا یہ کس کا گھر ہے اور کس کی کتاب ہے

فائدہ [۱]۔ لفظ کوئی اصل میں واسطے تنکیر ذی الروح کے ہے مثلاً کوئی مرد، اور تبدیل اسکی کسی بیائے معروف اور لفظ کچھ اصل میں واسطے تنکیر غیر ذی الروح کے جیسا کچھ چیز اور، تبدیل اسکی کسو مثلاً کسو [۲] ملک میں۔ امّا یہ دونوں لفظ اکثر ایک دوسرے کی جگہ مستعمل ہوتے ہیں مثلاً یہ بھی کچھ آدمی ہے یا یہ بھی کوئی چیز ہے

متفرقات ۔ لفظ کون یا لفظ کوئی یا کچھ کے اور حروف معنوی کے درمیان میں جب وصل واقع (ہو) تو یہ الفاظ ضرورت شعری سے نہیں بدلے جاتے ہیں لیکن نثر میں اس طرح بولنا بہت ضعیف محاورہ ہے جیسا کون شخص کا آدمی ہے، وہ شخص میری کچھ [۲]...۔ (حیثیت ؟) نہیں ہے ... [۲] شعر

مجھ سے مت جی کو لگاؤ کہ نہیں رہنے کا۔
میں مسافر ہوں کوئی دن کو چلا جاؤں گا

یعنی میں کسو [۳] دن کو

---

[۱] اس مقام پر مصنف سے غالباً سہو ہوا، کسو اور کچھ میں وہ ربط نہیں جو بیان کیا گیا، کسو لفظ کسی کی "تبدیل" ضرور ہو سکتا ہے۔ [۲] اس جگہ کچھ لفظ حذف و بند کی تراش میں آ گئے ہیں

[۳] لفظ "کسو" اہل پورب کے روزمرہ میں نہیں ہے۔

لفظ ہم ، تم ، آن ، ان ، جن ، تن ، کن اگرچہ جمع ہیں پر تعظیماً واحد پر اطلاق کرتے ہیں بخلاف اُنھوں ، اِنھوں ، جنھوں ، تنھوں ، کنھوں ، کہ یہ الفاظ سوائے جمع[1] کے واحد پر نہیں بولتے ہیں -

فائدہ - جو شخص خوب لحاظ کرے لفظ یہ اور وہ ، کوں وتوں وکوی پر ، پس اسکو بآسانی معلوم ہوگا یہ کہ جب آن کے ساتھ ملاویں لفظ ان یعنی الف ونون ساکن یا لفظ ین یعنی حرف یا ونون ساکن تب دلالت کریں گے مکان پر مثلاً یہاں ، وہاں ، کہاں ، جہاں ، تہاں ، کہیں وغیرہ

فائدہ - اور جب حرف وں یعنی واو ونون ساکن داخل ہوے تب دال ہوے گی معنی طرح پر یا طلب علت پر مثلاً یوں ، اوں[2] ، کیوں ، جیوں ، تیوں من جرأت

جیوں لگا دیتا ہے کوئی خانۂ دشمن میں آگ

اور جب لفظ دھر ، تب ، دلالت کرتا ہے ظرف پر جیسا ایدھر[3] ، اودھر ، کیدھر ، جیدھر ، تدھر اور جب حرف سا[4] تب تشبیہ پر چنانچہ ایسا ، ویسا ، کیسا ، جیسا ، تیسا

اور لفظ تنا یعنی حرف تا ونون والف ساکن یا لفظ تا[5] ، تب مقدار پر جیسا آتنا ، اِتنا ، وتنا[6] ، وتا ، کتنا کِتا ، جتنا ، جِتا ، تتنا تِتا -

اور جب حرف ہائے موحدہ یا دال ، تب زمان پر چنانچہ اب ، کب ، جب ، جد ، تب ، تد ، وغیرہ

فائدہ - اسماء ضمائر یا اسماء اشارہ یا اسماء موصول یا اسم استفہام یا اسم تنکیر کی تبدیل کے واسطے حروف

---

[1] جدید اردو میں یہ سب الفاظ بھی احتراماً واحد کے لئے مستعمل ہیں [2] کذا - لیکن بحث ماسبق کے پیش نظر یہاں "و" چاہیے ؛ اہل دہلی کے یہاں یہ لفظ اسی طور پر ملتا ہے لیکن پورب والوں کی زبان سے "دوں" کی جگہ "اوں" سنا ہے ، اور غالباً اسی لئے مصنف نے یہاں "آوں" ہی لکھا ہے [3] ایدھر = ای + دھر اور اودھر = او + دھر - اسم اشارہ کی ذیل میں عرض کیا گیا تھا کہ "ای" اور "او" بھی پورب والوں کی بول چال میں آتے ہیں ۔ اسطرح پہلی مرتبہ اس عام خیال کی تردید ہوتی ہے کہ ایدھر ، اودھر ، کیدھر وغیرہ میں ، حروف ی اور واو کسرہ اور ضمہ کی جگہ پر لکھے جاتے تھے - اب معلوم ہوا کہ ان لفظوں اِدھر ، اُدھر اور کدھر میں کسرہ ، و ضمہ حرف ی اور واو کی آواز کو خفیف کر لینے کے نتیجے میں رائج ہوے اس کی مزید تائید اسطرح ہوتی ہے کہ ان لفظوں میں یہ حروف محض لکھے نہیں جاتے تھے بلکہ تلفظ میں بھی آتے تھے مثلاً "کیدھر ہے وہ امتیاز حقیقی" (تلخیص معلی ص ۱۳) لفظ کیدھر ممکن ہے کیہ = کی + دھر ہو - لورب میں لفظ ....

مزوں میں خواہ ملفوظ ہوں یا مقدر مثلاً اُسقدر، کسقدر، جسقدر، تس قدر، اُسوقت، پس اُنھوں کے بعد
یک حرف مقدر ہے یعنی اِسقدر سے، یا اِسوقت میں وغیرہ

باب سیوم

تقسیم اسم کی باعتبار دلالت کرنے اوپر معنی کے

پس اگر اسم دلالت کرے ذات پر یعنی بغیر وصفت کے تب وہ اسم ہے جیسا رام، لچھمن،
کمان، پتھر[1] زید، عمر، کشن، رادھا وغیرہ

اور جب دلالت کرے ایک ذات پر ساتھ ایک وصفت کے تب وہ صفت ہے جیسا
بھلا، برا[2]، نیک و بد وغیرہ۔ پس صفات کی دو قسم ہیں۔

مفرد۔ جیسا اچھا، بھلا، برا، سرخ، سفید، سبز، زرد، موٹا، تپلا، نیک،
بد، باریک، گندہ (کذا) سیدھا، تیڑا (کذا)، دوبلا

مرکب۔ یعنی صیغہ اصلی پر زوائد کے ملانے سے صفات حاصل ہوویں، پس صفات مرکب کی دو
دو ہیں:

قسم اول یہ کہ زوائد آخر میں آویں۔ پس کبھی حرف یائے معروف کو آخر اسم میں ملانے سے
مثلاً پیشگی، خانگی اور لفظ ینہ ملانے سے جیسا چوبینہ، پشمینہ، روزینہ
اور لفظ چی سے چنانچہ خزانچی، مشعلچی، توپچی، قابوچی

اور حرف ا یعنی الف ساکن و لفظ الا و الو و ال و واو دار و ویا و ئیلا بیائے
معروف و یلا بیائے مجہول، اوئیل بیائے معروف اور یلا بیائے ساکن ماقبل مفتوح و ئیل بیائے
مجہول، و یل بیائے مفتوح کے لاحق ہونے سے صفات حاصل ہوتی ہیں چنانچہ بھوکا[3] (کذا) راجا،
بہتا، داتا، بنیا، داتا اور گوالا، سیوالا[4]، ڈنتالو ؟، جھگرالو[6] (کذا)، رکھوال و بسوال

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۶)

کہاں کے معنی میں آتا ہے چنانچہ کہواں = کہہ + واں بجائے کہاں اسی بنیاد پر وجود میں آیا۔ اس کے علاوہ کہاں کے معنی میں پورب والے
کتھوا بھی بولتے ہیں۔ ... اردو نے ... ان لفظوں کو تلفظ ... پورب والے آسپاد (تے + سا) اور دسا ... فتحہ اول کرتے ہیں ... بکسر اول و یائے مجہول اَتیباد (تے + سا) ... آصفی ... وہلی والے اتنا ...

[1] سہارنپور وغیرہ کے لوگ "پھتر" کہتے ہیں۔ غالب نے ... "بھنک" لکھا ہے۔ ... اصل ... وعدہ ... ہر جگہ ...
[2] ان لفظوں میں گی کا اضافہ ہوا۔ اسی قیاس پر نار ... خوانچی وغیرہ بھی آتا ہے [3] بعض مقامات پر ... بھوکھ ... بھی بولتے ہیں [5] سیوالا = شیوالا ... ہندی کے حرف ش ... سین سے بدل ... وعلی ہذا القیاس
غالباً بعض انگریزی لفظوں میں بھی ایسا ہی کرتے ہیں چنانچہ غالب پنشن کو پنسن ... لکھتے تھے لیکن اس کے برعکس بھی دیکھا ہے چنانچہ
... زمیس کو زمیشن کہتے تھے (دیکھو رسالہ ... انشاء اسرار نرینشن) [6] یہاں "جھگڑالو" چاہیئے

پچھوا، مچھوا، جیوار، سکھوار، امیدوار، جلویا[1]، پچھوتیا، ہٹیلا، گھریلا، کٹویلا، گھایل، بوجھل، پایل، کویل۔؟

لفظ "ہارا" اور "ہار" و "آر" یا حرف "ر" فقط اور "یرا" بیائے مجہول و "ڑا" بہ ڑائے ہندی و "اڑے" کے ملانے سے صفات (حاصل) ہوتی ہیں چنانچہ لکڑہارا، مارنہارا، کومہار، سونہار (کدا)، چمار، مردار، ہگیرا، شیرا (کدا)، بھگوڑا، بھکاری، گٹھری و موٹری[2]

لفظ "اک" یعنی الف و کاف و "اکا" و "کا" و "کڑ" بہ ڑائے ہندی و "بھر" و "سا" و "سے" و "کا سا" کے ضم کرنے سے صفات (پیدا) ہوتی ہیں مثلاً دوڑاک، خوراک، لہراکا، بھلکا[3]، کودکڑ، بوجھکڑ، سیربھر، کمربھر، مردسا، عورت سی، حیوان کا سا

لفظ "یت"، "یہ" بیائے مجہول و لفظ "گر" و "گار" و "دار" و "بردار" و "بر" و "بان" و "وان" و "مند" و "نت" و "مان" و "باز" و "ور" اور "کے" داخل ہوتے سے صفات بنتے ہیں چنانچہ ڈکیت، چڑھیت[4]، لٹھیت، پیچیدہ[؟]، جادوگر، رفوگر، خدمتگار، یادگار، بدکار، چترکار، آزمودہ کار، زمیندار[5]، پونی دار[6]، حقہ بردار، فرمانبردار، پیامبر، دلبر، باغبان، بادبان، نگہبان، دربان، گاڑی وان، گاڑھوان، دولتمند، ہوشمند، عقلمند، دھنونت، بودھمان، بدیامان، انکل باز، جانباز، قدمباز، نظرباز، جالوز، نصیبور، بختور، وطالع ور، دلاور، تناور، زورآور

لفظ "گیں" و "یں" بیائے معروف و "ناک" و "سار" و "ندہ" و "زادہ" و "زاد" و "کش" و "ساز" و "خواہ" و "اندیش"[7] و "طلب" و "شناس" و "دان"، "فہم" و "پوش" و "بخش" و "بند" و "پرست" و "فروش" و "گیر" و "خوار" و "خور" کے ضم کرنے سے اکثر صفات حاصل ہوتی ہیں مثلاً غمگین، فرمگیں، نمکیں، رنگیں، پوبیں[8]، شوقین، خطرناک، غمناک، شرمسار، شرمندہ، شاہزادہ، وزیرزادہ، خانہ زاد، مادرزاد، میرزا، مادرزا، سرکش، پیلکش، زمانہ ساز، [illegible]، بداندیش، خیرطلب، سخن شناس، سخندان،

---

[1] جلویا اور پچھوتیا خاص پورب والوں کی بولی ہے جدید اردو میں اس اصول کے مطابق لفظ گویا (گاؤیا) البتہ رائج ہے۔ [2] لفظ موٹری بمعنی گٹھری بھی اضلاع میرابکمیں سننے میں نہیں آیا [3] کمربھر بمعنی کمر کمر یعنی کمرتک، اسی طرح ہاتھ بھر یعنی ایک ہاتھ کی برابر [4] اسی کے مطابق "بڑاکا" اور "بڑکا" بھی آتا ہے [5] اصل "تہ سپت" ؟ اس کے بعد کے دونوں لفظ سمجھ میں نہ آسکے [6] اصل زمیدار بحذف نون غنہ، اسی طرح فرمانبردار و خونخوار کبھی بحذف نون غنہ لکھا ہے [7] اسے "پوشنا" بھی پڑھا جاسکتا ہے [8] اصل "اندیش" ؟ سہو کاتب [9] لفظ شوقین کی بابت محمد حسین خان نادر نے لکھا ہے کہ استعمال اہل عرب میں نہیں ہے اسلئے اسکی جگہ شائق بولنا چاہئے (تعلیق معلی) لیکن یہاں معلوم ہوا کہ یہ اردو والوں کا ایجاد ہے

عروض داں ۔ سخن فہم ، روپوش ، پاپوش ، کرم بخش ، خدابخش ، سپر بند ، دین بند ، بت پرست ، آتش پرست ، میفروش ۔ سخن فروش ، خودفروش ، عالمگیر ، کلگیر ، کفگیر ، خونخوار (کذا) چغلخور ، رشوت خور ،

لفظ خوان و گو و جو و بیں و انداز و چلا و سوار و نشیں کے داخل ہونے سے صفات (پیدا) ہوتے ہیں چنانچہ فارسی خواں ، دروغ گو ، کم گو ، عیب جو ، نام جو ، رنگیں ، دوربیں ، گولنداز ، تیرانداز ، گول چلا[1] ، گھوڑ سوار ، فیل سوار ، دلنشیں ، پالکی نشیں ،

اور ایسی[2] (کذا) لفظ ربا و موہن وچیں و ریز و فشاں و افشاں و سوز و کن و زدہ یا مارا و آلودہ و زن جیسا دلربا ، منموہن ، جگموہن ، خوشہ چیں ، نکتہ چیں ، خونریز رنگریز ، گلفشاں ، زرفشاں ، دلسوز ، عالم سوز ، فتیلہ سوز ، کوہکن ، بیخ کن ، برق زدہ ، کاج مارا ، بیٹ مارا ، شکر آلودہ ، خواب آلودہ ، رہزن

اور ایسی (کذا) لفظ آشوب و آزار و افراز و دوست و دشمن و آموز و آمیز و انگیز جیسا شہرآشوب ، دلآشوب ، دلآزار ، بزم افروز ، سرفراز ، وطن دوست ، خانہ دوست ، فقیر دشمن ، نوآموز ، مکرآمیز ، آتش انگیز

اور اسی طرح لفظ پرور و پال و پرداز و فریب و کشا و گداز و نما و بوس جیسا غریب پرور ، زباں پرور ، بچن پال ، غریب نواز ، کارپرداز ، شکار فریب ، مردم فریب ، مشکل کشا ، جاں گداز ، بدنما ، خوشنما ، قدمبوس ، زمیں بوس

اور لفظ گوں یا فام و مایل[3] و بار کے ضم کرنے سے صفات (حاصل) ہوتی ہیں ۔ چنانچہ گلگوں گندمگوں ، سیاہ فام ، زردی مائل ، سرخی مایل ، بردبار ، اشکبار

اور ایسی لفظ رو و دوز و رس و شو جیسا نیک رو[4] ، گرم رو ، خیمہ دوز ، زمیں دوز ، فریادرس ، مردہ شو

قسم دوم یہ کہ زواید اول میں آویں پس :

لفظ بد و زشت و کو لاحق کرنے سے معنی صفات قبیح (حاصل) ہوتے ہیں بدصورت ، بدشکل ، زشت رو و کوڑ ول

---

[1] "من چلا" "دل چلا" اس کی مثال ہے اور جیم عربی سے "جی جلا" بھی اسی اصول پر ہے [2] ایسی = ایس + ہی = ایسے + ہی ۔ اس لفظ کا یہی املا اکثر مقامات پر ملتا ہے یہ "آپہی" (= آپ + ہی) کی قبیل سے ہو سکتا ہے

[3] اصل مایل بہ یائے حطی نہ کہ ہمزہ ۔ [4] کبھی رو بہ واو معروف کا بھی اضافہ کرتے ہیں جیسا سرخ رو ، گلرو وغیرہ

اور خوش و نیک و خوب و سو اول میں آنے سے صفات نیک حاصل ہوتے ہیں جیسا خوشنما نیک بخت، خوبصورت، سوڈول[1]

اور لفظ تنگ[2] و پست و دوں و کم اول میں آنے سے معنی چھوٹائی (کذا) و کمی کے حاصل ہوتے ہیں جیسا تنگدل و دوں ہمت، پست ہمت، کم ہوش

لفظ ش، کو اول میں لانے سے اکثر معنی تقویت یا کلانی کے حاصل ہوتے ہیں جیسا شہپیر و شہتیر[3]

اور ایسی (کذا) لفظ قابل و صاحب و اہل و ذی کے آنے سے جیسا قابل علاج، صاحب شعور اہل دل، ذی ہوش

اور لفظ زیادہ و فضول و ہم و ایک و ہم و ادھ اول میں لانے سے صفات پیدا ہوتے ہیں جیسا زیادہ گو و فضول گو، ہم جنس، ہمسر، ہموطن، ایک وطن، ہم مردہ اور ادھ مؤا

ایسی (کذا) لفظ پیش و پس، جیسا پیشرو و پس خوردہ، پس رو۔

فایدہ - کبھی صفات سے مراد ہوتی ہیں ذاتیں بغیر لحاظ معنی و صفت کے مثلاً اچھے آدمی یہاں بھوکوں کو کھلاتے ہیں اسلیے کہ وہاں کھلوں میں رہیں پس مراد یہاں ذات اُن کی ہے

اور امر واحد کے ساتھ لفظ و یا یائے مشددہ و حرف اک یعنی الف و کاف ساکن و حرف ک یعنی کاف ساکن و حرف واو معروف اور حرف کڑ یعنی کاف وڑا ملنے سے تب معنی اسم فاعل کے حاصل ہوتے ہیں جیسا مرویا، بھرویا، لڑاک، پیراک، پوچھک، مارو، کھاو، بھگوڑ، کودکڑ، بوجھکڑ

باب چارم

تبدیل و عدم تبدیل و تذکیر و تانیث اور بیان حالات اور وحدت و جمعیت اسما کے بیان میں - مشتمل ہے پانچ فصل پر

---

[1] اس لفظ کا تلفظ سڈول بھی آتا ہے [2] اصل "نیک" سے چھوٹ گیا ہے

[3] اصل "و شہتیر" ہے ان لفظوں میں اضافت دینا لازم نہیں چنانچہ خواجہ میر درد نے کہا ہے ... [illegible]

فصل اول ۔ عدم تبدیل یعنی متبدل نہ ہونے میں اسما یا صفات کے جتنے اسماء کہ اُنکے آخر میں حرف ا یعنی الف ساکن یا حرف ہ ساکن نہ ہو اُن کے صیغہ واحد میں بہ سبب حروف معنوی یا اسماے ظروف ساکن کبھی تبدیل وتغیر نہیں ہوتی ہے جیسا مرد، کتاب، ساقی، لڑکے، لال، زرد، وسرخ، نیک، بد

فصل دوم ۔ جتنے اسما خواہ اسمار جامد ہوں یا صفات یا مصدر یا اسمار مشتق کہ اُن کے اخر میں حرف[1] یا ہ یعنی الف ساکن یا ہائے ساکن ہوے اُن کے صیغہ واحد میں بواسطہ حروف یا اسمار ظرف تبدیل حرف اخر کی ہوتی ہے ساتھ حرف ی کے یعنی یائے مجہول کے مثلاً لڑکا، لڑکے، لڑکے کو، لڑکے کا، لڑکے کی، لڑکے نے، بندہ، بندے[1] کو، بندے کا، بندے کی، بندے نے، بھلا، بھلے کو، بھلے کا، بھلے کی، بھلے نے، کھانا، کھانے کا، کھانے کی وغیرہ۔ مارنے والا، مارنے والے[2] کا، مارنے والے کو، مارنے والے کی، مارنے والے نے، لکھا، لکھے کو، لکھے کا، لکھے کی مثلاً

ع　تقدیر کے لکھے کو، امکاں نہیں ہے، دھونا[3]

یعنی لکھے ہوے کو　ع　خاوند کے کاٹے سر کو، گھوڑا لا ہے بھالا

یعنی کاٹے ہوے سر کو

مگر چند الفاظ کہ وے ہندی میں بطور تانیث مستعمل ہیں یعنی دعا، دوا، سزا، قبا، قفا، قضا، بلا، غذا، جزا، رضا، تمنا، وبا، وفا، خفا بس[4] انہو (کذا) میں بواسطہ حروف کے تبدیل نہیں ہوتی ہے یعنی نہیں کہتے۔ آپ کی دعے سے وغیرہ اور انھوں کی حالتیں (رہیں) موافق ہر اسمار مونث فصل اول کے اور ایسی (کذا) چند سے الفاظ دوسرے مستثنیٰ ہیں جیسا خدا، بابا، بتیا؟ اُمرا، ملا، کتا، لالا، میرزا، خفا، مصفا، پیدا، دانا

فایدہ ۔ جب ایک مرکب حاصل ہوے ایسے دو اسم سے کہ وے دونو (کذا) قابل تبدیل ہیں تب بواسطہ حروف معنوی کے تبدیل ضروری ہے جیسا مثال گلے کے لڑنے سیں

---

[1] اس قاعدہ کے مطابق "بندہ کا" یا "بندہ نے" یہ پائے ہوز لکھنا صحیح نہیں ہے لیکن یہ غلطی نہایت عام ہے [2] اصل "والا" ہے لیکن یہ اس قاعدہ کے خلاف ہے اسلیئے سہو کاتب معلوم ہوتا ہے [3] اصل "ہے تقدیر کے لکھے کو امکان نہیں دھونا" لیکن مصرعہ ناموزوں ہوجاتا ہے بظاہر یہ اور اسکے بعد کا مصرع دونوں کسی مرثیے سے لئے گئے ہیں۔ [4] انہو = ان + ہو ہو بمعنی "یہی"۔ "اِنہو"، "انھو" اور "انھوں" تینوں طرح مستعمل ہے [5] اصل "دوسرا" [6] اصل گلے کیٹی لرکی سین

فائدہ ۳۔ تبدیل اسما کی واسطے حروف معنوی منزور ہے خواہ مذکور ہو جیسا مثال اُس کی سابق گذری یا مقدر ہو جیسا گھر کے آگے رکھو یعنی آگے میں اور ایسے ہی اپنے گھر جاؤ یا اسقدر اور جس دم، اور لڑکے یعنی اے لڑکے

اور کبھی حروف معنوی فارسی وعربی بھی موجب تبدیل کے ہو جاتے ہیں مثلاً بنارس سے تا کلکتہ یا (بلغز ؟) از کہانی وغیرہ

اور اسماء متبدلہ میں لاحق ہیں علامتیں اضافت کی، مرد گھر کے، مرد کے گھر کو اور حروف تشبیہ جیسا جیسا جیسے، کیسا، کیسے

اور جو صفات عددی اُن کے آخر میں حرف واں ہوے بواسطہ حروف کے تبدیل اُن کی ہو گی ساتھ حرف یا ے مجہول و معروف کے مثلاً دسویں مرد کے پاس، دسویں رنڈی کے پاس

فصل سیوم۔ تذکیر و تانیث دو قسم ہے۔ حقیقی یا غیر حقیقی

مذکر حقیقی وہ کہ جس کے مقابل میں ایک مادہ ہوے جنس سے حیوان کی جیسا ہاتی، بیل مرد، خصم

اور مونث حقیقی وہ کہ جس کے مقابل میں ایک نر ہوے حیوان سے جیسا ہتنی، ماد رنڈی، جورو

اور مذکر و مونث غیر حقیقی کی دو قسم ہیں۔ اول سماعی وہ کہ اہل زبان سے سنا گیا ہے اور کوئی مقرر نہیں جیسا کتاب، قدر، لگن یعنی محبت، بھیڑ، قدح

دوسرا قیاسی وہ کہ اُس کے واسطے کوئی قاعدہ ہوے، کلیہ ہو یا اکثری۔ پس جاننا چاہیے ہندی میں مذکر کے واسطے کوئی قانون کلیہ نہیں ہے (بلکہ ایک قاعدہ اکثریہ) اور تانیث کے واسطے تین قانون کلیہ ہیں باقی اکثریہ[۵]

---

[۱] یہ جملہ اصل میں غلط درج کر دیا گیا ہے [۵] غالب دہلوی نے اس باب میں لکھا ہے "پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے" (خطوط غالب ص ۳۳) صحیح یہ ہے کہ اس بارے میں اہل دہلی کا قول یہ تھا "متعلق فارسی تذکیر و تانیث کہاں؟ اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں اور نہ ہم صیغہ متکلم مع الغیر ہے یعنی ہم اور تم اور مجموعہ شرفا اور فصحائے دہلی و لکھنؤ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے، زیادہ جھگڑا بے فائدہ" یہ قدر بلگرامی کے نام ایک خط کا اقتباس ہے غالباً اسی معاملے میں لکھنؤ کا ذکر بھی آ گیا ورنہ داغ دہلوی نے صراحتہً کہا ہے۔

مستند اہل زبان خاص ہیں دہلی والے ❊ اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا

لیکن ... [illegible] ... لوگوں کا کارنامہ

قانون - جو اسما کہ (اُن)[۱] کے آخر میں حرف الف یعنی الف ساکن یا حرف ہ یعنی ہائے ساکن ہووے وے اکثر مذکر ہیں جیسا کپڑا، مہینا[۲]، بندہ، پردہ، خامہ

قانون - جو اسم کہ اُس کے آخر میں حرف ی یعنی یائے معروف ساکن آوے کل مونث ہیں (کذ) گڑوی، لکڑی، ٹوپی[۳]، حویلی مگر چند الفاظ یعنی پانی، جی، گھی، موتی،

کبھی حرف یائے معروف علامت تصغیر کی ہوتی ہے رسا، رسی، گولہ، گولی

قانون - جو اسم تفعیل کے وزن پر آوے کلہم مونث ہیں (کذا) چنانچہ تقدیر، تدبیر، تحصیل، تکمیل وتقریر وغیرہ مگر تعویذ، یا برعایت شعر کے جیسا ہے[۴] ؎

سالہا ہم نے صنم نالہ شبگیر کیا
آہ یک روز ترے دل میں نہ تاثیر کیا[۵]

قانون - جتنے حاصل بالمصدر فارسی کہ اُن کے آخر میں حرف شین آوے کلہم مونث ہیں جیسا سوزش، سفارش، بینش، فرمائش -

قانون - جن کے آخر میں حرف تائے ساکن ہو وہ اکثر مونث ہیں جیسا قدرت، مروت، خلقت، نصرت، کثرت

قانون - اکثر اسماء مذکر ہیں کہ اُن کے مونث کے آخر میں واقع ہوتے ہیں یہ کئی حروف - ی یعنی یائے معروف، یَن یعنی یائے مفتوح و نون ساکن، ِن یعنی نون ساکن و ما قبل اس کے زیر، نِی یعنی نون مکسور و یائے ساکن، و انی الف ساکن و نون مکسور و یائے ساکن معروف و اِن یعنی نون ساکن و ما قبل اُس کے مکسور، و ائن یا مفتوح میان دو ساکن، و او نون مثلاً بگڑا، بگڑی، شاہزادہ، شاہزادی، بنیا، بنیائن[۶]، کیتا، کتیابین؟، پنڈت، پنڈتاین، دولہ، دولھن[۷]، ملا، ملانی، کسیرا، کسیرانی، برہمن، برہمنی، شیر، شیرنی، ٹٹو، ٹٹوانی، مہتر، مہترانی، بھوی، بھوی آنی، سنہار، سنہارن[۸]، نایک، نایکا، باجک، باجکا -

---

۱ اصل "ؤاسکی" ۲ اصل "مہنا" اکثر اس لفظ کے آخر میں حرف "ہا" لکھتے ہیں یعنی "مہینہ" ۳ اصل "روتی"

۴ دہلی کے اساتذۂ قدیم کے کلام میں تذکیر و تانیث کے اختلافات بہ کثرت ملتے ہیں بلکہ غالب نے لکھا ہے: "تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے، جو جس کے کانوں کو لگے، جس کو جس کا دل قبول کرے اُس طرح کہے" (خطوط غالب ۲۳۲)

۵ مصنف نے اس شعر پر اعتماد کر کے تاثیر کو مستثنیٰ قرار دیا ہے - یہ صحیح نہیں یہ لفظ اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے اور مونث بولا جاتا ہے

۶ اہل دہلی بنیاین کو بنینی کہتے ہیں اسی طرح پنڈتانی، شیخانی، پٹھانی وغیرہ ۷ دہلی میں زیر کی جگہ زبر آتا ہے یعنی دولھن (لام مفتوح) جب کہ پورب والوں کا تلفظ دولہن (لام مفتوح، یا مکسور) ہے ۸ پچھم میں سنہارن (بہ فتحۂ را) آتا ہے

اور تذکیر و تانیث عربی بھی ہندی محاورہ میں آتی ہے جیسا کریم، کریمہ، ملک، ملکہ، معشوق، معشوقہ،
فائدہ بعض الفاظ کے مونث متعدد ہوتے ہیں جیسا کہار، کہارن بفتح را و کہارن بکسر را، کہاری،
کہاری اور ایسی (کذا) چمار، چمارن، چمارنی، چماری وغیرہ

قانون۔ اکثر اسمار کی، جنس جو ظاہرا مبہم ہے تذکیر و تانیث کے حق میں اُن کی تذکیر و تانیث کے
تفرقہ کے واسطے سوائے اُن مبہموں کے اور الفاظ مقرر ہیں جیسا ہرن و مرغ مبہم ہے اور واسطے تفرقہ
تذکیر و تانیث کے کہتے ہیں ہرنا، ہرنی، مرغا، مرغی

قانون۔ صفات جہاں تک ہیں ان کی تذکیر و تانیث باعتبار موصوف کے ہوتی ہے مثلاً وہ مرد بھلا تھا
اور وہ عورت بھلی تھی وغیرہ اور ایسی (کذا) لفظ کافر و چاکر و نوکر و خدمت گار چنانچہ وہ کافر کیا بڑا تھا
ہی کیسی کافر ہیں بھی اور ساتھ تھیں۔

اور بعض لفظ کی تذکیر و تانیث میں رعایت مدلول ضرور ہے یعنی مدلول اگر مذکر ہو تو لفظ بھی مذکر اور مدلول اگر
مونث ہو تو لفظ بھی مونث مثلاً آدمی، مانوس جیسا کہتے ہیں جیسا کشن کیا بھلا مانوس تھا اور رادھا
کیا بھلی مانوس تھی

فائدہ۔ بعضے حروف میں بھی تذکیر و تانیث و وحدت و جمع جاری ہے مثلاً کا و کی بیائے معروف و کے
بیائے مجہول یا سا و سی بیائے معروف و سے بیائے مجہول و سوں وغیرہ

لفظ بھائی و راجہ و مانوس[1] کی مونث برخلاف قیاس واقع ہیں بایں طور یعنی بہن، رانی، ماں
اور ایسی قاعدہ چاہتا، تاکہ لفظ راے، گورہ[2]، دخان کی مونث ہوویں رای، گوری و خانن لیکن
برخلاف قیاس کہتے رانی و گوریہ و خانم

موافق اصطلاح فارسی تفرقہ تذکیر و تانیث کے واسطے لفظ نر و مادہ لاتے ہیں جیسا گاو نر، گاو مادہ
شیر نر، شیر مادہ

اور سوائے قوانین مذکورہ کے باقی تذکیر و تانیث سماعی ہیں جیسا اکثر اسماء تذکیر کے یا اکثر
چڑیوں کے نام اور جیسے حروف تہجی سے انیس حرف ہیں یعنی ب، پ، ت، ٹ[3]، ث، ح،

---

[1] یہ "متعدد مونث" مختلف مقامات کی بولیوں کے مطابق ہیں ورنہ پورب میں کہارن (بہ فتح را) اور پچھم میں کہارن (بکسر)
کوئی نہیں بولتا [2] غالب بھی اس لفظ کو (ایک نون کے اضافے کے ساتھ) اسی طرح لکھتے تھے (خطوط غالب ص۱۹۳ ۲۱۶)
لیکن اب اس کا املا "ماموں" ہے بحذف نون اول [3] اصل "گوروہ" لیکن ترک میں "گورہ"
[4] اصل "ٹ"

خ ، د ، ڈ ، ر ، ز ، ژ ، ڑ ، ط ، ظ ، و ، ہ ، ی

فایدہ - بعضے الفاظ مشترک ہیں درمیان تذکیر و تانیث کے مثلاً فکر ، جان[1]

جس لفظ کی تذکیر و تانیث میں ابہام ہووے بطور مذکر استعمال اولیٰ ہے -

فایدہ - فعل متعدی ماضی قریب و بعید کی تذکیر و تانیث میں رعایت مفعول کی ضرور (ہے) اگر علامت مفعول یعنی کو و کتیں و حرف ی یعنی یائے مجہول مذکور نہ ہو خواہ فاعل مذکر ہو یا مونث جیسا زید نے روٹی کھای ، سیتا نے روٹی کھای ، زید نے کھانا کھایا ، سیتا نے کھانا کھایا

اور جب علامت مفعول مذکور ہو تب صیغہ مذکر چاہیے خواہ فاعل مذکر یا مونث جیسا کشن نے روٹی کو کھایا ، سیتا نے روٹی کو کھایا - تفصیل اس کی آوے گی بحث فعل میں ان شاء اللہ تعالیٰ

فائدہ - مصدر کو باعتبار مفعول مونث ہونا درست ہے جیسے جو بات کرنی تھی کی اور جہاں ایک جنس بدل ہو دوسرے کے ساتھ تب فعل کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے اکثر پہلے کی موافقت کریں گے

جیسا رنڈی مرد ہوگیی ، بیت دی تھی خدا نے آنکھ پہ ناسور ہوگیا

صفات عددی کہ اُن کے آخر میں حرف واں ہوگا تانیث میں وین ہوگا بیائے معروف جیسا دسویں لڑکی بیائے معروف

فصل چارم - بیان حالات اسما کے

حالتیں پانچ (کذا) ہیں

اول - حالتِ فاعلیہ - فاعل وہ کہ جس سے فعل صادر ہووے جیسا مارا زید نے ، یا جس میں قایم ہو جیسا سوا زید یا آیا زید -

ہندی میں لفظ لانا و بولنا کے سوا[2] ے جتنے متعدی ہوں سب صیغہ ہائے ماضی کے فاعل کی علامت سوائے ماضی استمراری کے ، حرف نے یعنی نون و بیائے مجہول ہے جیسا مارا ہم نے یا ہم نے مارا تھا اور سوائے اُن کے کسی صیغے کے فاعل کی علامت لفظاً کچھ مقرر نہیں مثلاً ماروں گا میں ، کیا تھا میں -

اور اس کو کما حقہٗ بیان کریں گے بحث فعل میں ان شاء اللہ تعالیٰ -

---

[1] اب لفظ "جان" متفقہ طور پر مونث ہے - اگرچہ بعض علاقوں کے لوگوں کی زبان سے مذکر بھی سننے میں آیا ہے

[2] اصل "سیوائے" اور ہر جگہ یہی املا ہے اصل "لانا"

دوم حالت مفعولیہ[1]۔ مفعول وہ کہ جس پر فعل واقع ہو جیسا ہم نے مارا زید کیتئیں۔ مفعول کی علامت حرف "کو" و "کیتئیں" ہے مثلاً زید کو مارا، عمر کیتئیں کہا اور ضمائر و اسماء اشارہ و موصول و استفہام میں سوائے اُن "د" "ڈ"[2] کے ایک علامت اور بھی ہے یعنی حرف "یے" یائے مجہول جیسا مجھے[3]، ہمے، تجھے، اُسے، اُنھے، جسے، جنھے، کسے، کنھے وغیرہ

فائدہ: علامت مفعول کبھی محذوف ہوتی ہے جیسا اُسکا گھوڑا لا یعنی اُس کے گھوڑے کو، یا میرے گھوڑے کو اور بیعہ (کذا)، حذف کرنا علامت مفعول کو اکثر واقع ہے مفعول ثانی میں افعال متعدی بدو مفعول کے جیسا دیا[4] میں زید کو روپیہ، سکھای میں عمر کو کشتی

اور اکثر فعل مرکب کے مفعول کے ساتھ حرف "کو" کی جگہ حرف "سے" کہتے ہیں جیسا اُسنے (کذا) سے ملاقات کی، نہ اُسکو مگر لفظ بیان کرنا کہ جس میں دونوں[5] (کذا) صحیح ہے یعنی اُس کو بیان کرو اور اُس[6] کا بیان کرو۔

سیوم حالت اضافت۔ وہ نسبت کیا جاوے ایک لفظ طرف دوسرے۔ پس جس کو نسبت کریں اُس کا نام مضاف اور جس کی طرف نسبت کریں وہ مضاف الیہ ہے اور ہندی اضافت میں اصل یہ ہے کہ مضاف الیہ مقدم ہو مضاف پر جیسا کشن کا گھر اور اس کا عکس[7] بھی جائز ہے مثلاً گھر کشن کا۔ اضافت کی علامت تین ہیں، حرف "کا" بکاف مفتوح و الف ساکن جب مضاف واحد مذکر ہوے جیسا زید کا گھر، اور حرف "کے" بیائے مجہول جب مضاف جمع مذکر ہو مثلاً زید کے گھر، یا کہ مضاف مذکر واحد کے بعد حروف آویں جیسے زید کے گھر سے، زید کے گھر کو، زید کے گھر کا وغیرہ یا کہ اسماء ظروف آویں مثلاً زید کے پیچھے، عمر کے سامنے (کذا)، کشن کے پاس یا کہ لفظ مطابق و موافق و ساتھ و برابر وغیرہ اس طرح کے اسماء آویں جیسا اُس کے مطابق، اِس کے ساتھ وغیرہ اور حرف "کی" بیائے معروف جب مضاف مونث ہو خواہ واحد خواہ جمع، خواہ حروف معنوی ہوں یا نہ ہوں جیسا زید کی کتاب، زید کی کتابیں، اسکی کتاب میں وغیرہ۔

---

[1] اصل "مفعولہ"　[2] اصل "دونی" = دوؤں کے = دونوں کے　[3] اکثر ضمائر کے آخر میں جدید اردو میں نون غنہ بھی آتا ہے مثلاً ہمیں، تمھیں وغیرہ باستثنائے مجھے، اسے، جسے، کسے۔ پوربی میں لفظ "ہے" اور "کے" یا مجہول "کو" کے مقام پر آتا ہے چنانچہ مو + ہے = موہے = مجھے، ہم + ہے + ہمے = ہمے، اُس + ہے = اُسے وغیرہ۔ اسی طرح مو کے، ہم کے، او کے وغیرہ بھی آتے ہیں کبھی کبھی حرف آخر کو مشدد بھی بولتے ہیں جیسے ہمّے، کسّے = کس + سے، تمّے وغیرہ　[4] ان دونوں مثالوں میں 'نے' علامت فاعل بھی محذوف ہے یہ صورت اردو میں اس حد تک عام ہے کہ اسے بھی خصوصیات میں شمار کیا جاسکتا ہے　[5] (کذا) — لیکن مطلب ہے کہ "اُس سے بیان کیجئے"　[6] لیکن بہرصورت فارسی کے برعکس ...

اضافت[۱] کے سبب کہ مضاف کو ایک تخصیص ہوتی ہے جیسا صفت مخصص ہے موصوف کا مثلا مرد کا گھر یعنی عورت کا نہیں، شیشہ کا حقہ یعنی روپے سونے کا نہیں

فایدہ ۔ لفظ آپ اکثر مجازاً مستعمل ہوتا ہے معنی میں تم کے چنانچہ آپ کہاں تشریف لے جاتے ہیں اور اس کی اضافت دو طور ہے ایک تو آپ کا، آپ کے، آپ کی ۔ دوسرا اپنا ، اپنے ، اپنی نا و نے و ئی قایم ہیں جگہ میں کا و کے و کی

چارم ۔ حالت ظرفیہ ۔ وہ وقت یا جگہ کہ جس میں فعل سادر ہووے فاعل سے، پس ظرف دو نوع (ہے)

اول ۔ زمان ۔ وہ دو قسم ہے مبہم یعنی غیر معین جیسا وقت ، بیر[۲] ، سمیں[۳]

محدود ۔ یعنی معین جیسا برس یعنی بارہ مہینے[۴] کا ، مہینا ، دن ورات

نوع دوم مکان بھی دو قسم ہے مبہم جیسا جگہ ، ٹھانو یا آگے پیچھے ، دہنے ، بائیں اوپر ، نیچے ، کنے ، پاس ، نزدیک وغیرہ

محدود جیسا گھر ، مسجد ، دھیورا ؟

پس ظرف کی علامت ہے لفظ میں و کو و بیچ ۔ خواہ مذکور ہو جیسا صندوق میں رکھو ، گھر کو جاو ، تالاب بیچ پانی ہے ۔ یا محذوف جیسا میرے آگے لاو اور گھر جاو یعنی آگے ہیں و گھر کو ، یا جس وقت تم جاو یعنی جس وقت میں

پنجم حالت ندا ۔ منادی وہ ہے کہ جس کو بلایا جاوے ان الفاظ کر کے یعنی ارے و ہے و اے بفتح الف و ای بکسر الف ، او بواو مجہول ، ایے ، بے ، اجی ، ہو[۵] ، خواہ وے علامات مذکور ہوں جیسا اے میاں وغیرہ یا مقدر جیسا لڑکے بیاے مجہول یعنی اے لڑکے ، لڑکو یعنی اے لڑکے سب ۔ یا اور باقی حالتوں کا نام جو حصول اُن کا لفظ سے یا ساتھ یا واسطے پر موقوف ہے قلم انداز کیا گیا

فصل پنجم ۔ بیان میں وحدت و جمع کے

اسماء غیر متبدلہ یا صفات غیر متبدلہ فصل اول میں مذکور ہیں ۔ اُن کے مذکر کی جمع کی علامت حالت

---

۱ اصل " اضافہ " ۲ بیر = بار ، مرتبہ ، وقت ۳ سیں ۔ اصل ہندی لفظ " سمے " ہے یعنی وقت ۴ اصل " مہینکا " ۵ اصل " ہوب " ؟

فاعلی میں لفظاً کچھ مغیر نہیں جیسا مرد آ ـــــ بہ یاے مجہول 'یا ساقی بنیٹھے[ع] بیاے مجہول ، مرد نیک گیے ۔
مگر جب اُن کے بعد حرف نے آوے تب حرف وں یعنی واو نون غنہ علامت جمع جیسا مردوں نے
اور اس فصل کے جتنے اسماء مونث کہ اُن کے آخر میں حرف ی یعنی یائے معروف نہ ہو اُن کی
علامت حالت فاعلی میں حرف یں یعنی یا و نون غنہ ہے (جیسا) کتابیں[۱] ، باتیں ، عورتیں بولیں
اور جن اسماء مونث کے آخر میں حرف ی یعنی یاے معروف ہو اُن کی جمع کی علامت حالت فا
میں حرف اں یعنی الف و نون غنہ ہے مثلاً لڑکی ، لڑکیاں ، روٹی ، روٹیاں ، پگڑی ، پگڑیاں
اور حالت ندا میں حرف و یعنی واو مجہول زاید کریں گے خواہ مذکر یا مونث جیسا مردو یعنی
اے مرد سب ، لڑکیو یعنی اے لڑکیاں ، ساقیو یعنی اے ساقی سب
اور حالت مفعولیت اور اضافت و ظرفیت یا جب اور کوئی حروف بعد اسماء غیر متبدلہ کے آویں
تب اُنھوں کی جمع کی علامت یہ ہے کہ حرف وں یعنی واو نون غنہ کو زیادہ کریں خواہ مذکر ہو یا مونث
جیسا مردوں کو ، کتابوں کو ، ساقیوں کو ، مردوں کا ، کتابوں کا ، ساقیوں کا ، لڑکیوں کا ،
آزادوں کا ، مردوں میں ، ساقیوں میں ، لڑکیوں میں ، آزادوں میں مردوں سے ، کتابوں سے
لڑکیوں سے ، آزادوں سے وغیرہ

فایدہ ۔ کبھی وقت زائد کرنے علامت جمع کی ایک حرکت لفظ سے حذف ہوتی ہے جیسے[۳] بہتر ساتھ
تائے مفتوح کے و چاکر ساتھ کاف مفتوح پس اُن دونوں کی جمع ہے بہتروں و چاکروں ساتھ
تا و کاف ساکن کے[۴]

اور اسمائے متبدلہ جو فصل دوم میں مذکور ہیں اُن کی جمع کی علامت حالت فاعلی میں جو بغیر حروف
نے کے ہووے یہ ہے کہ اُن کے حرف آخر کتیں بدل کریں ساتھ حرف ے یعنی یاے کے جیسا
لڑکے و بندے و مردے[۵] بیاے مجہول[۶]

[ع] اصل " بنیٹھے " غالباً بجاے بانٹے مراد ساقیوں نے بانٹا ؟ [۱] اصل "جیب " [۲] حرف با علامت فتحہ بنی ہے ۔ اس کے برخلاف دہلی کے قرب وجوار کے علاقوں میں کتابیں میں حرف با بہ کسرہ مجہول آتا ہے [۳] اصل " جیسی " [۴] لیکن ان لفظوں کا معروف تلفظ بہتروں ، چاکروں بہ فتحہ تا و کاف ہے ۔ [۵] یہ لفظ مُردے (میم مضموم) ہوگا ؟
[۶] اس کے بعد کی عبارت صفحہ ۱۰۴ سے صفحہ ۱۰۵ تک لکھی تھی جس کو کھڑا خط (۲م) بنا کر قلمزد کر دیا گیا ہے:

اور فاعل جو ساتھ حرف نے کے ہوئے اور حالت مفعولیہ و حالت ظرفیہ و اضافت میں جب کوئی اور حروف واقع ہوویں ان صورتوں میں جمع کی علامات یہ ہے (کذا) کہ حرف اخیر کو بدل کریں ساتھ حرف و ن یعنی واو نون غنہ جیسا لڑکوں نے : بندوں نے ، لڑکوں کو ، بندوں کو اور حالت جمع ندا میں حرف اخر کو بدل کریں ساتھ حرف و یعنی واو مجہول کے جیسا لڑکو ، بندو وغیرہ

فایدہ ۔ فصل دوم سے جو چند ے الفاظ مستثنیٰ ہیں اور سابق مذکور ہوئے ہیں[۱] وے وحدت و جمع میں موافق ہیں اسماء فصل اول کے جیسا دعائیں ، سزا ، سزائیں ، دعاوں ، سزاوں ، امراوں ، طلاوں

متفرقات ۔ جب کسی اسم پر اسماء عدد واقع ہوں اُسکی جمع کی احتیاج نہیں جیسا چار مرد[۲] کو مارا ، اور نہیں ضروری کہ چار مردوں کو ۔

اور اکثر اسماء عدد و اسما ظرف میں واسطے فائدہ دینے کثرت یا حصر کے جمع (ی ، علامت یعنی و ں ،) واو نون غنہ لاتے ہیں بغیر اس کے کہ اُس کے بعد حرف نے یا اور کوئی حروف جو علامت مفعولیۃ یا اضافت یا ظرفیہ وغیرہ کی ہے آوے جیسا ہزاروں مرگیے ، برسوں گذرے ، تینوں بھائی آئے ، چاروں[۳] ... : مہینوں ہوئے ، مدتوں گذرے ۔

ہندی میں بھی اکثر بطور فارسی جمع[۴] ہوتی ہیں جیسا باتاں ، راتاں اور اکثر جمع عربی و فارسی مستعمل ہیں[۵] جیسا باتیاں ، ساقیاں ، حیوانات ، ہزارہا ، سالہا و مفردات و مقدمات و معاملات ، اشراف ، نجبا ، شرفا ، طلبا ، فضلا ، علما وغیرہ ۔

اور کبھی جمع عربی و فارسی پر علامت جمع ہندی داخل کرتے ہیں چنانچہ[۶] احکاموں امراوں ، علماوں ، مقدماتوں ، شرفاوں ، نجباوں ، فضلاوں ، غرباوں

---

[۱] اصل " ہوویں ہیں " [۲] انشاء اللہ خاں لکھتے ہیں " دو گھوڑا ، تین گھوڑا ، دو موتی ، تین گا جر کہنا صحیح نہیں ۔ بنگالہ اور پورب والے اس طرح بولتے ہیں لیکن شاہجہاں آباد میں کوئی اس طرح نہیں کہتا ۔ اس طرح کہنا صحیح ہے دو گھوڑے ، تین گھوڑے " (دریائے لطافت ص ۲۷)

[۳] اصل " چاروں نہیں " ؟

[۴] فارسی میں جمع بنانے کے لئے الف و نون کا اضافہ کرتے ہیں دکنی اور ہریانی میں بھی یہی قاعدہ ہے مصنف کے قول کے مطابق اردو نے یہ اصول بعض مخصوص حالات میں فارسی سے اخذ کیا ہے [۵] جمع کی یہ صورت ان لفظوں کے ساتھ ہے جن کے آخر میں یائے معروف ہو مثلاً ساقی + اں = ساقیاں ، پانی + اں = پانیاں وغیرہ [۶] بعض الفاظ جو عربی قاعدہ کے مطابق جمع ہیں اردو والوں کے روزمرہ میں بعد واحد مستعمل ہیں مثلاً [۷] سرکار سے تیری جو ہے احکام نکلتا　[۸] لاؤ تبرکات رسالت مآب کا

فایدہ ۴ - کبھی دو لفظ کہ ایک اُس کا باب چہارم کی فصل اول سے ہے جیسا بندہ اور دوسرا فصل ثانی سے ہوے مثلاً بندہ، اُن دونوں کی جمع ظاہر نظر میں ایکہی (کذا) ہیں چنانچہ قبا بندوں کو، جمع بند کی + زید کے بندوں جمع بندہ کی آیا - بعد تعمق نظر کے معلوم ہوگا کہ اول میں ازو یاد ہے اور دوسرے میں تبدیل ہے[1]۔

فایدہ ۵ زبان قدیم میں لفظ سکھی و نین و آنکھ کی جمع کئی طور پر ہیں یعنی سکھیں بکسر یا و سکھیئن بفتح یا، نین بفتح نون تصغیر کے واسطے ہیں اور حالت فاعلی میں جمع اُن کی انکھیاں، نیناں اور تیاں -

فایدہ ۶ فعل ماضی متعدی قریب و بعید کی جمع ہونے میں رعایت مفعول کی ضرور ہے، خواہ فاعل واحد ہو یا جمع جیسا:

سپاہیوں[1] کے سامنے شراب کے پیالے ساقیوں[2] نے رکھے

یائے مجہول پس رکھے کو بصورت جمع لے دے بہ سبب جمع ہونے مفعول کے یعنی پیالے بہ یائے مجہول، اما جب علامت مفعول مذکور ہو تب فعل واحد ہی ہوگا خواہ مفعول واحد ہو یا جمع جیسا

سپاہیوں کے سامنے (کذا) شراب کے پیالوں کے[3] ساقیوں نے رکھا

اور بیان اس کا بحث فعل میں آوے گا اور بیان کما حقہ کیا جاے[4] گا ان شاء اللہ تعالے

بحث دوم
فعل کے بیان میں

فعل وہ لفظ ہے کہ دلالت کرے ایک معنی پر ساتھ استقلال کے اور تین زمانوں سے ایک زمانہ اس کے ساتھ سمجھا جاے - یہ بحث مشتمل ہے دو باب پر

باب اول

بیان میں بنائے افعال یعنی افعال[5] کے بنانے کے ڈول میں اور تصریف یعنی گردان میں اُس کی

جاننا چاہیے کہ ہندی ریختہ میں مصدر کی علامت حرف نا یعنی والف ساکن ہے جیسا ملنا، دھونا، اور بعد وقع کرنے مصدر کی (علامت) جیسی قدر رہے وہ یعنہ امر واحد ہے اور اس کے ساتھ جب حرف و یعنی واو مجہول زاید

---

[a] اس مقام پر "فایدہ" اور دوسرے میں تبدیل ہے" سہواً مکرر لکھا ہے [1] اصل "سپاہونگی"۔ جہاں جہاں یہ جملہ آیا ہے ہر جگہ یہی [2] اصل "ساقیو" ۔ ہر جگہ یہی [3] کے بعض کو خاص پورب والوں کا بول چال ہے۔ [4] اصل "جائگا"

کریں صیغہ جمع امر ہوگا اور اُنھی امر کے صیغہ پر جب حرف مت یا نہ داخل کریں نہی کے صیغہ حاصل ہوں گے اور
امر و نہی میں مذکر و مونث برابر ہیں ۔

امر حاضر ۔ مار تو ، مارو تم

نہی حاضر ۔ مت مار تو ، مت مارو تم

اور اسمار حالیہ جو سابق مذکور ہوئے، اُن کے ساتھ جب ملاویں لفظ ہوں ہے و ہیں و ہو
تب فعل حال کے صیغہ حاصل ہوں گے اور انھوں سے کبھی لفظ ہوں و اتھوانہ، کو حذف بھی کرتے ہیں

حال مذکر مثبت[2] ۔ میں مارتا ہوں ، تو مارتا ہے ، وہ مارتا ہے

ہم مارتے ہیں ، تم مارتے ہو ، وے مارتے ہیں

حال مونث مثبت ۔

میں مارتی ہوں ، تو مارتی ہے ، وہ مارتی ہے

ہم مارتی ہیں ، تم مارتی ہو ، وے مارتی ہیں

اور امر واحد کے آخر میں جب لاویں حرف الف یعنی الف ساکن و یے یعنی یائے مجہول و یائے معروف
دیں یا بیاں بیائے معروف لاویں تب ماضی کے صیغہ حاصل ہوں گے

ماضی مذکر مثبت[3]

میں مارا ، ہم مارے ، تو مارا

تم مارے ، وہ مارا ، وے مارے

---

[1] پورب کے دیہی علاقوں میں لفظ "جِن" مکسور الاول بھی بمعنی مت سننے میں آیا ہے مثلاً جن مار یعنی مت مار [2] پورب کی دیہاتی بول چال میں یہ گردان اس طرح ہوگی: میں مارت ہوں ، تو مارت ہے وہ مارت ہے ، ہم مارت ہیں ، تم مارت ہو ، وے مارت ہیں ۔ اسی طرح دوسری مختلف حالتوں میں بھی آخری الف محذوف ہو جاتا ہے یعنی مارتا سے مارت ۔۔۔ پورب میں مارت ہے کا تلفظ "مارتے" (یعنی مارت کا ت ہے کے ہ سے مخلوط ہوتا ہے جس کی آواز خفیف ہو کر رہ جاتی ہے) برخلاف علی گڑھ کی بولی مارتّے [ت مشدد اور یہ کسرۂ مجہول آتا ہے] [3] یہ گردانیں پوربی بول چال کے مطابق ہیں، دہلی میں ایسی حالت میں علامت فاعل نے کا حذف جائز نہیں وہاں کہیں گے۔ میں نے مارا ، ہم نے مارا وغیرہ

ماضی مونث مثبت - میں ماری ، ہم ماریں ، تو ماری ، تم ماریں ،
وہ ماری ، وے ماریں / وے ماریاں

لیکن جس وقت امر کے آخر میں حرف الف یا کہ حرف واو ہووے تب بناے ماضی کے واسطے علامت ماضی کے قبل یک حرف لایا جائے جیسا کھایا کھاے و اکھوانہ ، ڈبویا ، ڈبوے و اکھواہا

قاعدہ - گنوار صیغہ کے آخر میں اکثر حرف "یس یعنی یاے معروف و سین زاید کرتے ہیں - مثلاً ماریس ، دمیس ، کھاتیس ، وکانیس وغیرہ

او صیغہ ماضی صیغہ کے آخر میں لفظ ہوں وہیں ، ہے ملاویں تب ماضی قریب کے صیغہ ہوں گے

ماضی قریب مذکر مثبت میں مارا ہوں ، ہم مارے ہیں ، تو مارا ہے
تم مارے ہو ، وہ مارا ہے ، وے مارے ہیں

ماضی قریب مونث مثبت - میں ماری ہوں ، ہم ماری ہیں ، تو ماری ہے
تم ماری ہو ، وہ ماری ہے ، وے ماریں ہیں / وے ماریاں ہیں

لفظ تھا و تھے بہ یاے مجہول و تھی و تھیں بہ یاے معروف کہ ان کا مصدر ہندی میں خوب معلوم نہیں اگرچہ موافق زبان فارسی شاید مصدر اس کا لفظ رہنا ہووے کیونکہ لفظ تھا کی فارسی ہے بود ، بود کا مصدر ہے بودن اور بودن کے معنی رہنا - غرض بہر صورت ان لفظوں کے ماضی کے صیغوں میں ملانے سے حاصل ہوتے ہیں ماضی بعید کے صیغے

ماضی بعید مذکر مثبت - میں مارا تھا ، ہم مارے تھے ، تو مارا تھا
تم مارے تھے ، وہ مارا تھا ، وے مارے تھے

ماضی بعید مونث مثبت - میں ماری تھی ، ہم ماریں تھیں تو ماری تھی
تم ماری تھیں ، وہ ماری تھی ، وے ماریں تھیں

---

[1] یہ زاید صیغہ مصنف نے دلی کے اساتذہ قدیم کے کلام سے لیا ہوگا ورنہ پورب والوں کی یہ بول چال نہیں ہے [2] اصل "قبیل" [3] اصل "یا ی" [4] اس موقع پر "دہیس" یعنی ہمزہ کی جگہ یاے ہوز سننے میں آیا ہے [5] گردانیں اس طرح ہوں گی ، وہ ماریس ، وے مارین ، تو مارے ، تم مارئو ، میں ماروں ، ہم مارین اسی طرح "آیا" کے مقام پر "آما"

یعنی وہ آیا اور وہ آوا دونوں طرح درست ہے [6] اس موقع پر یہ نیز ... ہوں بھی لکھا ہے [7] پروفیسر ... نے لکھا ہے "یا زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اس کو ملتانی زبان کے مصدر "تھیوتا" (یعنی ہونا) کی ماضی مانی لوں ، تھیو تا کی ماضی تھیا آتی ہے اردو والوں نے اسے یاے اشمام سمجھ کر اڑا دیا اور تھا بنالیا " (پنجاب میں اردو ص ...)

اور انھیں لفظوں کو جب اسمارِ حالیہ میں ملا دیں حاصل ہوں گے ماضی استمراری کے صیغے

ماضی استمراری مذکر مثبت[1] ۔ میں مارتا تھا، ہم مارتے تھے، تو مارتا تھا

تم مارتے تھے، وہ مارتا تھا، وے مارتے تھے

ماضی استمراری مونث مثبت ۔ میں مارتی تھی، ہم مارتی تھیں، تو مارتی تھی

تم مارتی تھیں، وہ مارتی تھی، وے مارتی تھیں / وے مارتی تھیاں

اسمارِ حالیہ کے صیغے، کبھی ماضی شرطی واقع ہوتے ہیں

ماضی شرطی مذکر مثبت ۔

میں مارتا، ہم مارتے، تو مارتا، تم مارتے،

وہ مارتا، وے مارتے

ماضی شرطی مونث مثبت ۔ میں مارتی، ہم مارتیں، تو مارتی، تم مارتیں،

وہ مارتی، وے مارتیں

اور امر واحد کے آخر میں جب حرف ون یعنی واو نون غنہ و یں یائے مجہول، نون غنہ زحرف واو یعنی واو و یا مجہول ضم کریں تب مضارع کے صیغہ حاصل ہوں گے اور مضارع میں تذکیر و تانیث برابر ہے

مضارع مثبت ۔ میں ماروں، تو مارے، وہ مارے، ہم ماریں،

تم مارو، وے ماریں

اور انھی مضارع کے صیغوں کے ساتھ جب ملا دیں حرف گا یعنی کاف فارسی و الف و حرف گے بہ یائے مجہول، وگی بیائے معروف وگیں بیائے معروف تب مستقبل کے صیغے حاصل ہوں گے ۔

---

[1] پورب کے بعض علاقوں میں "مارتا" کے الف کو حذف اور "رہا" کا اضافہ کرکے بھی ماضی استمراری بناتے ہیں چنانچہ وہ مارت رہا، وے مارت رہیں، تو مارت رہا، تم مارت رہیو [رہیو بکسرہ ہا وسکون یا] میں مارت رہیوں [ہا مکسور، یائے مجہول ساکن] ہم مارت رہیا لیکن بعض اوقات الف حذف نہیں بھی کرتے اور "مارتا رہا" بھی بولتے ہیں ۔ لفظ "رہا" کے اضافے کے ساتھ ماضی کی دوسری شکلیں بھی آتی ہیں مثلاً ماضی بعید "وہ آیا رہا" اور "وہ آوا رہا" بھی کہتے ہیں ۔ اس طرح پوربی میں لفظ "رہا" لفظ "تھا" کے بدل کے طور پر عموماً استعمال میں آتا ہے ۔ چنانچہ مصنف کا قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

مستقبل مذکر مثبت[1] - میں ماروں گا - ہم ماریں گے ، تو مارے گا ،
تم مارو گے ، وہ مارے گا ، وے ماریں گے

مستقبل مونث مثبت - میں ماروں گی ، ہم ماریں گی ، تو مارے گی ،
تم مارو گی ، وہ مارے گی ، وے ماریں گیں

لفظ کے بہ کاف عربی و کر و کرکے و کر کر دو بیان دو فعل کے آتے ہیں ، اس واسطے کہ فاعل ایک کو عمل میں دوسرے فعل کو اُس میں متصل کرے جیسا مار کے ، مار کر کے ، مار کر بس اگرچہ موافق اصطلاح صرف اس کا نام مقرر نہیں لیکن از روئے معنی معطوف علیہ ہونے کا فائدہ دیتا ہے مثلاً مار کر گیا[2] یعنی مار اس پیچھے گیا قول سودا ہے ؎

دل مرا مارے کے گیا جاتے ہو مری جان

اور کبھی یہ حروف لفظاً محذوف ہوتے ہیں جیسا مار گیا -

یہ تصریف جو ہم نے بیان کی افعال مثبت کی ہیں اور انھی افعال پر جب حرف نہ یا نہیں داخل کریں تب افعال منفی ہو جائے

فایدہ - تصریف مذکورہ سے معلوم ہوا یہ کہ لفظ مارتا و اخواتہ ، کی تین صورتیں (ہیں) کبھی تو وے اسمار حالیہ ہیں اور کبھی فعل نے حال سیغہ اور کبھی ماضی شرطی

لفظ ہونا مصدر لازمی ہے اور تصریف اُس کی بعینہ طریق مذکور پر ہوتی ہے مگر تین باب میں فرق ہے ایک - یہ کہ موافق اُس قاعدے کے جو ماضی کے بنانے میں ذکر ہوا مناسب تھا کہ اُس کے ماضی کے صیغہ لفظ ہویا وغیرہ ساتھ یا کے ہوتے لیکن برخلاف قیاس کہتے ہیں ہُوا ساتھ ضمہ ہاو بغیر یا کے
دوسرا یہ کہ حرف یا کہ اُس کے مضارع کی علامت میں آوے اُس کو حذف کرنا درست ہے ، جیسا

---

[1] مستقبل کے صیغہ بناتے کے بجائے "گا" کے لفظ "ہے" کا اضافہ کرتے ہیں یعنی وہ ماری ہے (ماریگے = مار ہے) وے ماریں ، تو مار ، تم ماریو ، میں ماریوں ، ہم ماریں - کبھی لفظ "مار" کے الف کو مختصر کرتے ہیں یعنی مریگے = مرے ہے [م + ر + یگ + ے] اور کبھی "بے" کا آخر میں اضافہ کرتے ہیں یعنی ہم مار بے (= ہم مریبے) ، تم مار بو (= تم مرلو) وغیرہ — مذکر کے "مرلو" میں واو مجہول اور مونث کے مقام پر مرلوبہ واو معروف آتا ہے [2] پورب میں اس موقع پر مار کے گیا بولیں گے اور لفظ "کے" کا تلفظ یہاں "کیے" اور "دے" کے قیاس پر بہ فتحہ اول ہوگا - یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب فعل اصلی کے آخر میں الف ہو تو ایسے موقع پر "نے" کا بھی درمیان میں اضافہ کرتے ہیں مثلاً پکانے کے کھایا یعنی پکا کرکے کھایا -

ہوا دہوں بولتے ہیں جگہ میں ہوے اور ہویں کے

اور تیسرا یہ کہ اُس کے مضارع کے صیغوں میں ایک حرف واو کو زاید کرنا صحیح ہے جیسا میں ہووں، وہ ہووے ہم ہوویں، تو ہووے، تم ہوو، وے ہوویں اور یہ تیسرا فرق جاری ہے اُن تمام فعلوں میں کہ جن کے آخر آخر میں حرف علت رہے جیسا میں جاووں، تو جاوے، ہم جاویں، تم جاو، وہ جاوے، وے جاویں میں پیوں، تو پیوے، وہ پیوے، ہم پیویں، تم پیو، وے پیویں

اور لفظ جانا کبھی بطور مذکر عنہ متصرف ہے یا صیغہ ماضی میں قیاس تھا کیجایا ہو لیکن گیا بہ کاف فارسی کہتے ہیں اور اس کا سبب افعال غیر صحیح میں بیان کروں گا لیکن عندالترکیب اُس کے ماضی کے صیغہ کبھی اپنی حالت اصلی پر رہتے ہیں چنانچہ جایا چہنا

باب دوم

مشتمل ہے چار فصل پر

اول ۔ بیان میں اقسام فعل کے

اگرچہ اقسام بیان کرتا ہوں افعال کی، لیکن آسانی کے واسطے نظایر میں مصادر کو ذکر کرونگا ۔ پس افعال کی دو قسم ہیں ۔ لازمی ، متعدی

لازمی وہ کہ فقط فاعل میں معنی اُس کے تمام ہوں اور محتاج مفعول کی طرف نہ ہو جیسا ہونا ۔ جانا ، سونا

متعدی وہ کہ فقط فاعل میں تمام نہ ہو، بغیر مفعول کے اور اس کی دو نوع ہیں

اول متعدی بنفسہٖ وہ کہ بغیر واسطہ کسی حرف زاید علامات کے ہوے جیسا سمجھنا، بوجھنا، سوجھنا ڈھونڈنا ۔

دوسرا متعدی بالواسطہ وہ کہ بواسطہ کسی حرف و علامات کے متعدی ہوے پس متعدی بالواسطہ کی تحقیق کے واسطے چار نوع مقرر کی

---

[1] ایسے موقع پر "ہوں" بہ کسرہ اول بھی لکھا ہے [2] اصل "ہوے" [3] "ہویں" [4] یہاں جاہانا میں الف کی آواز خفیف ہو کر صرف فتحہ باقی رہ گیا ہے

[5] اصل "لکہ" [6] اصل "واسطہ"

اُس کی نوع اول یہ کہ مصدر خواہ لازمی ہووے یا متعدی اُس کی علامات مصدر کے ماقبل ا یعنی حرف الف ساکن، یا حرف وا یعنی واو الف ساکن، و حرف لا یعنی لام والف ساکن کے زیادہ کرنے سے متعدی بالواسطہ حاصل ہووے جیسا بجنا[1]، بجانا، بجوانا، دبنا، دبانا، دلوانا، دیوانا[2]

ڈرنا، ڈرانا، بیٹھنا[3]، بٹھلانا، کھُونا[4]، کھلانا، رونا، رُلانا، اور اسی قسم کے متعدی بالواسطہ میں اکثر اعراب میں تغیر و تبدیل ہوتی ہے اسلئے اُس کے بیان کے واسطے دو قانون مقرر کیے

قانون اول۔ یہ کہ حرف علۃ جو اُس فعل میں تھے علامت متعدی بالواسطہ کے داخل ہونے سے حذف ہوجا[ئیں]

تلفظ " نے " میں اور ضمہ و فتحہ و کسرہ کہ اس حرف علۃ پر تھے وے باقی رہتے ہیں جیسا گانا دگوانا، بولنا، بُلانا[5]، سیکھنا، سکھلانا، بھولنا، بھُلانا، رونا، رلانا

قانون دوم۔ یہ کہ اول علامات کے داخل ہونے سے اُس فعل کی ایک حرکت ساقط ہو جاوے جیسا اٹکنا اٹکانا۔ پس وہ فتحہ کہ اٹکنا کے حرف ٹ میں تھا وہ اٹکانا کے حرف ٹ (کذا) میں نہیں ہے

اور ایسی (کذا) برسنا، برسانا

نوع دوم۔ یہ کہ حرف ا یعنی الف ساکن فعل کے ف کلمہ کے بعد بھی لانے سے متعدی بالواسطہ حاصل ہو جیسا تنا (کذا) تانتا، تھَسنا[6]، ٹھاسنا، ٹلنا، ٹالنا، دبنا، دابنا، مرنا، مارنا، ، اڑنا

آڑنا، کٹنا، کاٹنا،

نوع سیوم۔ یہ کہ تلفظ میں حرف واو یا کہ حرف یا کو زاید کرنے سے متعدی بالواسطہ حاصل ہووے جیسا کھُلنا کھولنا، ، رکنا، روکنا، پسنا، پیسنا

---

[1] ان میں کئی افعال خاص پورب والوں کی زبانوں پر جاری ہیں مثلاً غالب لکھتے ہیں " کرانا" یہ پوربیات کی ہے۔ کروانا فصیح ہے " (خطوط غالب ص ۲۷۵)، بعض افعال اب متروک ہیں جیسے سکھلانا، بٹھلانا وغیرہ [2]

تلفظ یائے معلی کی تخفیف کے ساتھ ہوتا ہے یعنی دِوانا (دال پہ کسرۂ مجہول)، اسی طرح چھِلانا، وغیرہ [3]

بجائے بیٹھنا میں حرف یا کی آواز خفیف ہوگئی ہے۔ بٹھلانا اور لفظ بٹھانا بھی اسی سے مشتق ہیں [4] اصل چھوتا،

[5] ابتداءً " بولاتا" بہ واو معدولہ لکھا تھا، نظرثانی میں تصحیح کرکے " بلانا" بنایا گیا ہے اور اس موقع پہ کسی واو معدولہ نہیں لکھا ہے۔ [6] اصل " تھستا تھاستا۔

نوع چارم ۔ یہ کہ ایک حرف صحیح کو دوسرے حرف کے ساتھ بدل کرنے سے متعدی بالواسطہ حاصل ہوے جیسا بکنا، بیچنا، چھوٹنا، چھوڑنا، ٹوٹنا، توڑنا[1]، جانا، جنانا، چھوٹنا، چھوڑنا

فایدہ ۔ اکثر فعلوں کے متعدی کئی طور پہ واقع ہیں جیسا سیکھنا، سکھانا، سکھلانا، بیٹھنا[2]، بیٹھانا، بٹھلانا

بعد دریافت کرنے سین اس تفصیل کے معلوم کیا چاہیے کہ متعدی خواہ بنفسہ ہو یا بالواسطہ تین قسم سیں خالی نہ ہوں گے

متعدی بہ یک مفعول جیسا سمجھنا، بوجھنا، ڈبانا، مارنا، کاٹنا

متعدی بہ دو مفعول جیسا سمجھانا، بوجھانا، مروانا، کٹوانا

و متعدی بہ سہ مفعول جیسا دلانا

اور مطلق متعدی خواہ بہ یک مفعول، خواہ بہ دو مفعول، خواہ بہ سہ مفعول دو قسم ہیں :-

معروف کہ فاعل اُس کا معلوم ہو جیسا سمجھنا، بوجھنا، دیانا، دلانا

مجہول کہ فاعل اُس کا معلوم نہ ہو ۔ سمجھا جانا، مارا جانا، کاٹا جانا، سمجھایا جانا، بوجھایا جانا، کٹوایا جانا، دیا جانا، دلایا جانا اور مجہول بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ ماضی کے صیغے کے ساتھ لفظ جانا کے صیغوں کو ملاویں ۔

فایدہ بعضے فعل مشترک ہے (کذا) درمیان لازمی و متعدی کے جیسا خارش کھجلاتی ہے[3] لازمی اور وہ کھجلاتا ہے خارش کو متعدی ۔ اور ایسی (کذا) کترانا ۔ اور بعضے فعل کی صورت متعدی سی ہے پر فی الواقع لازمی ہے جیسا گھلانا، اماانا، کملانا، گھلانا ۔ اور بعضے فعل اس کے برعکس ہے (کذا) جیسا بکنا، اکڑنا، بدلنا

فایدہ ۔ بعضے لازمی ہیں سب کے معنی کا حاصل رجوع ہووے گا ایک متعدی مجہول کی طرف جیسا بننا یعنی بنایا جانا

فصل دوم ۔ بیان میں فعل اسمی و غیر وضعی، فعل مفرد و مرکب کے

---

[1] اصل "ٹوڑنا" [2] ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے لکھا ہے: "اکثر شعرا بٹھانا اور بٹھانا بمعنی نشانیدن و پوشانیدن استعمال کرتے ہیں میر درشک صاحب نے اس کو ترک کیا اور فرماتے ہیں کہ بعد باے عربی کے یاے حطی اور لفظ ثانی میں بعد باے فارسی کے ہاے ہوز کا ہونا ضروری ہے" (تلخیص معلی ص۳۳) یعنی مصدر "بٹھانا" ہونا چاہیے ۔ مصنف نے اس مقام پر یہی تصور قبول کی ہے لیکن جیسا کہ پہلے گذرا وہ بٹھانا کو بھی صحیح سمجھتا ہے اور بٹھلانا اسی سے مشتق ہے۔ "بٹھلانا" کبیر دیکھنے سننے میں نہیں آیا ۔ اصل "ور" اور "اور" [3] دہلی میں بھی "کھجلانا" بولتے تھے چنانچہ ذوق نے کہا ہے ؎ فرزدہ تو ۔ دست پھر تلوار مرا کھجلانے ہے لیکن اول تو یہ لفظ یہاں مدت ہوئی متروک ہوا ثانیا لازمی اور متعدی دونوں طرح اس کا استعمال ۔ اور غالباً کبھی نہیں ہوا

فعل وضعی ہندی وہ ہے کہ کسی واضع ہندنے اُس کو وضع کیا ہے جیسا مارنا، کاٹنا، آنا، جانا غیر وضعی وہ کہ الفاظ غیر ہندی سے ساتھ علامت مصدر ہندی کی ملا کر مصدر بنا دیں مثلاً قبولنا، خریدنا، بخشنا، بدلنا، داغنا، یا کہ اسمار جامد یا صفات ہندی کے ساتھ علامت مصدری ملا دیں جیسا سونٹا۔ سونٹیانا، پانی، پنیانا، موٹا، موٹاتا، گرم، گرمانا۔ بہرصورت خواہ وضعی ہو یا غیر وضعی۔ فعل کی دو قسم ہیں۔

بسیط یعنی غیر مرکب جیسا دینا، مارنا، بخشنا، بدلنا، قبولنا، موٹاتا، سونٹیانا

مرکب وہ کہ اُس کے دو جز ہویں، پس اُس مرکب کی دو نوع ہیں

نوع اول یہ کہ یک جز اسم ہوے اور دوسرا فعل جیسا غوطہ مارنا، غوطہ کھانا، فکر کرنا، شرط کرنا، رخصت کرنا، موٹا کرنا

نوع دوسرا یہ کہ دونوں جز[1] فعل ہویں۔ پس اس نوع کی طرق اصلی یہ ہے کہ جز اول امر واحد ہو جیسا مار ڈالنا، دے ڈالنا، کھ لیانا، گھبرا جانا، بول جانا، ہو سکنا، کاٹھ دکنا، ڈالنا، پٹک دینا، سو رہنا، جا رہنا اور کبھی جز اول صیغہ ماضی ہوتا ہے مثلاً چلا جانا، مارا چہنا، جاتا چہنا، ناچا کرنا اور کبھی جز اول اسم حالیہ جیسا بولتا جانا، بولتے جانا، پیتا رہنا، بیٹھے رہنا، جاتا رہنا، جاتے رہنا

اور کبھی جز اول مصدر جیسا[2] بولنے لگنا، آنے پانا، جانے دینا

قاعدہ ۔ ہندی فعل مرکب کے دو نوع جز کے درمیان لفظ اجنب لانا درست ہے[3] جیسا

ع　لازم نہیں کہ چھوڑ مجھے یار جاے

یعنی چھوڑ جاے

فصل سیوم ۔　بیان میں بعضے احکام افعال کے اور تذکیر و تانیث[4] و وحدت و جمعیت افعال کے

جتنے افعال متعدی ہیں سبھوں کے صیغہ ماضی کے فاعل کی علامت سوائے[5] ماضی استمراری کے حرف نے یعنی نون و یاے مجہول جیسا میں نے کھایا ہے، تو نے کھلایا ہے، میں نے کھایا تھا، تو نے کھلایا تھا مگر لفظ لانا و یا جب کسی فعل کے ساتھ ترکیب پاوے لفظ جانا یا چلنا یا سکنا تب ماضی کے فاعل کی علامت حرف نے نہیں آتا جیسا میں لایا، وہ بولا، یا، تو کہہ چکا، میں لے سکا[6] اور کبھی بہ طرق شاذ حرف نے فعل حال کے ساتھ لاتے ہیں مثلاً　ع　سنتے ہی عطار نے[7] یہ رنگ و بو کہنے لگا
ہاے میاں ہو تہ ہو

---

[1] اصل " دو نوع "　[2] اس صورت کی مثال آنا جانا"

[3] یہ صورت نظم میں جائز ہے لیکن اس میں تعقید کا عیب ہے اور بول چال میں عموماً جائز نہیں ہے　[4] اصل " سیوا ئی " اور بجز

[5] اصل " ہر سکا "　[6] ... " کا ذانا " ... اردو ... ہند ...　[7] اصل " سنتیہی " ... اور رعطار کی طور

اور کبھی حرف نے ماضی متعدی کے فاعل سے حذف ہوتا ہے جیسا

ع حارث لعیں کی عورت بہتیرا رو پکاری

فعل ماضی متعدی قریب و بعید کے صیغہ سوائے اُن متعدیوں کے کہ جن کے ساتھ حرف نے مذکور نہیں ہوتا ہے تذکیر و تانیث میں متابعت مفعول کی کرتے ہیں مثلاً[1] ع دی تھی خدا نے آنکھ پہ[2] ناسور ہو گیا

اور چنانچہ ہندہ نے کھانا کھایا، یا زید نے روٹی[3] کھای

مگر جب علامت مفعول یعنی حرف کو و کنہیں، و حرف کی مذکور[4] ہو تب فعل ماضی متعدی مذکر ہی ہوگا خواہ مفعول مذکر ہو یا مونث جیسا زید نے کھانے کو کھایا اور عمر نے روٹی کو کھایا ہے

ع یک دم خالی بتایا اشک سے اس آنکھ کو

اور سوائے اُن صیغہ ہائے مذکورہ کے تمامی صیغہ خواہ متعدی ہو یا لازمی تذکیر و تانیث میں فاعل کی موافقت کرتے ہیں جیسا ہندہ کھانا لای، سیتا یہ کلام بولی، ہندہ گیی، ہندہ جاتی ہے

اور (ایسے ہی[4]) حکم ہے فعل کی وحدت و جمع میں یعنی سوائے لازمی اور سوائے اُن متعدیوں کے کہ جن کے ماضی میں حرف نے نہیں لاتے ہیں، جتنے ماضی متعدی قریب و بعید ہیں اُن کے صیغوں میں وحدت و جمع بہ رعایت مفعول کے ہوگی جیسا ہم نے کھانا کھایا، سیتا[5] سوا اس کے سامنے شراب کے پیالے ساقیوں نے رکھے بہ یائے مجہول۔ پس رکھے کی جمعیت بہ سبب جمع ہونے مفعول کے ہے یعنی پیالے بہ یائے مجہول۔

مگر جب علامت مفعول مذکور ہوئے تب فعل واحد ہی ہوگا خواہ مفعول واحد ہو یا جمع مثلاً

شراب کے پیالوں کے[6] ساقیو(ں) نے رکھا۔

فصل چہارم ۔ ہندی میں افعال دو قسم ہیں

صحیح ۔ وہ کہ جس میں تغیر و تبدیل زیادت یا حذف حروف تصریف کی وقت نہیں ہوتی ہے تصریف کے وقت مثلاً مارنا، کاٹنا، کرنا، وغیرہ

اور غیر صحیح ۔ وہ کہ جس میں عند التصریف تغیر و تبدیل یا حذف یا زیادت حرف کا واقع ہو جیسا لفظ کرنا ۔ قیاس

---

[1] اصل "پہ" [2] اصل "روتی" ۔ اور بعض دوسرے مقامات پر بھی یہی [3] اصل "مذکر"

[4] اصل "ایسی" ۔ اور بعض مقامات پر "ایسی" و "ویسی" بھی

[5] اصل "سیا ہونگی" [6] کذا ۔ لیکن بعد ترمیم اسے "کو" بنایا گیا ہے

[7] اصل "بیجا" ؟

چاہتا ہے کہ صیغہ ماضی اِس کا 'کرا' ہوے لیکن حرفِ را کو حرف یاے کے ساتھ بدل کر کے کہتیں (کذا) ہیں کیا[1]

اور ایسی لفظ مرنا میں چاہیے کہ ماضی ہوے مرا و مری و اخوانہ لیکن حرف را کو واو کے ساتھ بدل مُوا کرتے ہیں[2]
اور لفظ جانا کے ماضی کے صیغے چاہیے کہ جا و جایا، جائی و اخوانہٗ ہوے لیکن چونکہ حرف جیم و کاف فارسی
کبھی ایک دوسرے کے ساتھ بدل ہونے میں تو چاہیے کہ گا یا بہ کاف فارسی ہوتا امّا اسطے دفع الناس[3] و
مشابہت ساتھ لفظ گایا کے کہ وہ ماضی ہے لفظ گانا بہ کاف فارسی کا جو معنی سرود کے واقع ہے الف حذف
کر کے گیا و گئے و غیرہ کہتے ہیں[4]۔ امّا عندالترکیب دوسرے فعل کے ساتھ کبھی وہ اپنی اصلی حالت پر رہتا ہے
جیسا جانا چہنا[5]
اور لفظ ہونا کے ماضی کا صیغہ چاہیے کہ لفظ ہو یا و اخوانہ ہوے امّا حرف یا کو حذف کر کے ہوا و اخوانہٗ کہتے ہیں
اور جو فعل کہ اُس کے آخر میں حرف علت ہوے اُس کے مضارع میں قبل علامت مضارع ایک واو زیادہ
کرتے ہیں مثلاً ہووے[6]، کھاوے، پیوے
اور کئی ایسے نظر آتے ہیں کہ عندالتصریف اُس کی حرکات میں تغیر و تبدیل واقع ہوتی ہے جیسا دینا و لینا کے صیغہ ماضی
چاہیے کہ دیا و لیا ساتھ دال و لام مکسورہ بکسرۂ مجہول ہوتے لیکن کہتے ہیں بکسرہ معروف
اور لفظ سمجھنا کے ماضی کے صیغے چاہیے کہ سمجھا بہ میم مفتوح ہوے لیکن کہتے ہیں سمجھا بہ میم ساکن اور اسی طرح دیکھنا،
پھسلانا، پھسانا (کذا)، سرکنا، لچکنا، پگھلنا، نکلنا

باب سیوم

بیان میں مجاز کے جو ہوتے ہیں افعال میں اور بعضے فوائد جو حاصل ہوتے فعلوں سے
ماضی بعید کی جگہ مجازاً کبھی ماضی قریب کو استعمال کرتے ہیں جیسا ہم کل اُس سے ناخوش ہوے، آج خوش ہیں،
یعنی ناخوش تھے۔ ہم کل وہاں (کذا) کیا ہوں، یعنی کیا تھا۔
اور کبھی ماضی کو مجازاً باعتبار قریب الوقوع مستقبل کی جگہ ذکر کرتے ہیں، جیسا کھانا لایا، ہاں صاحب لایا، یعنی

منہ
[1] کیا کے مقام پر 'کرا' بھی اہل دہلی کے استعمال میں ہے [2] موا کا مصدر مونا ہے نہ کہ مرنا اسی طرح مرنا کا
مرا ہے نہ کہ موا۔ [3] اصل "الناس" [4] پروفیسر شیرانی اسے پنجابی کا اثر کہتے ہیں [5] مصنف نے موقع
پر 'چہنا' بجائے 'چاہنا' لکھا ہے یہ پوربی میں کشیدہ آوازوں کو مختصر کرنے کی مثال ہے [6] اصل "ہوت"

نزدیک ہے کہ لاؤں گا

ہندی میں مصدر کو کبھی صیغہ امر یا نہی کی جگہ استعمال کرتے ہیں چنانچہ

ع عالم کو اے دیوانے مت ساتھ لے ڈبوتا

یعنی مت ڈبو۔

اور کبھی صیغہ مضارع صیغہ ماضی کے معنی میں آتا ہے مجازاً جیسا: بس جب حسین سرور دیں، کربلا میں آئے، دیکھا تو سامنے سے لوگ آوے ہیں پرا[1] یعنی دیکھا

اور کبھی صیغہ حال میں ماضی کے جیسا میں فلانی جگہ گیا تھا، دیکھتا ہوں کہ قضیہ مچ رہا ہے یعنی دیکھا

لفظ چاہنا کے صیغے کو یہ لفظ پر یا لفظ لا جب کسی فعل کے ساتھ ملاویں تب استقبال قریب کا فایدہ حاصل ہوتا ہے جیسا مرا چاہتا ہے یا مرنے پر ہے یا مرنے والا ہے، نزدیک ہے کہ مرے گا

اور اُسی لفظ چاہنا سے جو یہ کئی الفاظ مشتق ہیں یعنی چاہیے، چاہتا ہے، چاہے گا آئے۔ اتفاق کدھی کلام میں آنے سے مفید ہوتے ہیں معنی ضرورت یا مناسبت کو مثلاً تم کو چاہیے وہاں جانا یعنی ضرور ہے یا مناسب ہے۔

فعل مرکب جب حاصل ہو لفظ کرنا یا جانا یا رہنا کے ملانے سے تب وہ مفید ہوتا ہے معنی کثرت یا استمرار کو جیسا آنا جایا کرو یعنی اکثر اوقات میں۔ پیتے رہو یعنی ہمیشہ۔ بولتے جاؤ یعنی اکثر اوقات میں

فائدہ ۔ کبھی فعل کو مکرر لاتے ہیں واسطے ہونے معنی کثرت کے جیسا چمن چمن، بولتے بولتے، مارتے مارتے، کھا کھا، کھاتے کھاتے

فایدہ ۔ جس وقت ایک صیغہ ماضی مذکر و ماضی مونث ہو تب وہ دلالت کرتا ہے مشارکت پر اور چاہتے ہیں طرفین کو جیسا مارا ماری، دیکھا دیکھی

فایدہ ۔ جب لفظ بننا یا پڑنا کے صیغے دوسرے مصدر یا حالیہ کے ساتھ ترکیب پاوے ہیں تب مفید ہوتے ہیں معنی ضرورت کو جیسا جانا بنا، جانے بنا، کھانا بنا، کھانے پڑا یعنی جانا، کھانا ضرور ہوا

فایدہ ۔ جمع امر کے صیغے کو اکثر تعظیم کے مقام میں بولتے ہیں جیسے آؤ، اور امر واحد سے مستفاد ہوتی ہے

---

[1] اس جملہ میں حالت فعل کی مناسبت سے "میں" چاہیے۔ ر ک ہم [2] اس جگہ عبارت کرم خوردہ ہے

[3] ابتداً "دیکھی" بعد ترمیم "دیکھا" بنایا گیا۔

کدھی عزت یعنی پیار جب جتی (کذا) آمجھ نین میں نس کہ بنایا تیرے لیے یہ خیمہ سیاہ و سفید ٹپاٹپی[1]

اور کہیں تحقیر جیسا آلے دکھائے یا دکھائے وغیرہ اور اسطرح کے افعال اکثر جزا طلب ہیں جیسا وہ آلے تب میں جاوں گا

فایدہ۔ لفظ جاتا وغیرہ اسی طرح کے الفاظ جو ایسے کلام میں واقع ہیں یعنی جاتا تو اُسے خوب مارتا، ماضی شرطی ہے

لفظ ہے گا و ہے گی مفید ہے معنی حال کو جیسا مارا ہے گا و ماری ہے گی اور لفظ ہوے گا۔ و ہوگا و ہونگے و ہوگی جب کسی فعل ماضی کے ساتھ مرکب ہویں تب مفید ہوتے ہیں اشتباہ کتیں جیسے میں مارا ہونگا، تو مارے ہوگا، وہ مارا ہوگا، ہم مارے ہونگے، تم مارے ہوگے، وے مارے ہوئے

لفظ لگنا کے ساتھ جب کوئی فعل مرکب ہووے تب فایدہ شروع فعل کا دیتا ہے جیسا آنے لگا، کھانے لگا، یعنی کھانے[2] شروع کیا

اور لفظ چکنا کے ساتھ جب مرکب ہو کوی فعل تب فایدہ انتہاے فعل کا حاصل ہوتا ہے جیسا کھاچکا یعنی کھانا تمام ہوا

امر واحد کے ساتھ تعظیم کے مقام میں اکثر لفظ ی یا ئیگا بہ یاے معروف اور جیسا ئیے گا ملاتے ہیں جیسا مارئیے، مارئیے گا، ہوئیے، ہوئیے گا، ہوجیے، ہوجیے گا، دیجیے، دیجیے گا لیجیے، لیجیے گا

اور کبھی لفظ ی کے ضم کرنے سے فایدہ مضارع ہوتا ہے جیسا میں وہاں پہونچتے دکھن ہی یکبار گی خیال میں آیا کہ فلانی جگہ چلیے۔ یعنی چلوں۔

بحث سیوم حروف

حرف وہ لفظ ہے کہ بغیر ملاے دوسرے لفظ کے معنی اُس کے سمجھے نہ جاویں پس حرف سے و ستی و سوں کدھی آتے ہیں واسطے ابتدا کے و حرف تک و تلک و لے و لگ و توڑی[3] واسطے انتہا کے

---

[1] یہ لفظ ایک سے زاید مقامات پر قصہ مہر افروز و دلبر میں آیا ہے چنانچہ ہے:
"بعض جگہ لہریا ہے سبز ..... اور بعضی جگہ ٹپا ٹپی ہے — اور بعضی جگہ لال اور سبز کی ٹپا ٹپی ہے اور بعض جگہ لال اور سبز کا لہریا ہے" (ص۹۵) علاوہ یہ الفاظ پورب والوں کے استعمال میں نہیں ہے

[2] یہاں "کھانا" چاہیے۔ [3] لفظ توڑی بمعنی تک۔ یو پی کے اضلاع مغربی کے دیہاتوں میں اب بھی بولتے ہیں۔

جیسا سیر کی ہم نے مرشد اباد سے لکھنو تک یعنی شروع سیر کا مرشد آباد و انتہا لکھنو میں
اور کبھی وہی حرف سے و ستی و سوں آتے ہیں واسطے تفریق کے اور کبھی واسطے بیان کے
جیسا خلانے کا گھر معمور ہے، اس کو کس بات کی کمی، روپیہ سے اجناس سے کپڑے سے
اور کبھی معنی میں بعض کے جیسا مثلاً زید قوم مسلمان سے ہے یعنی بعض فرد اس کا
اور کبھی معنی میں سبب کے جیسا　شعر　تو شور سے میر سے جی بیزار نہ ہو ہرگز
یعنی بہ سبب شور کے
اور کبھیں معنی میں استعانت کے جیسا ہم نے خلانے کی گردن ماری تروار سے
اور حروف میں واسطے ظرفیہ و استقامت کے خواہ مذکو رہو جیسا چراغ میں تیل نہیں۔
یا مقدر جیسا کھای بھی تیرے گھر پایا تھا ٹھنڈا پانی یعنی تیرے گھر میں
حرف کو و کنتیں و حرف سے یعنی یائے مجہول علامت ہیں مفعول کی جیسا اسکو مارا اسکتیں مارا
اور کبھی حرف کو ظرف کی علامت ہوتی ہے جیسا گھر کو گیا، لکھنو کو جاوں گا یعنی گھر میں یا لکھنو میں
اور کبھی معنی قیمت و عوض مفید ہوتا ہے مثلاً یہ گھوڑا کتنے کو بیچو گے یعنی کتنی قیمت کو
حرف ساتھ واسطے معیت و اتفاق کے ہے جیسا ہمکو وہ خرید ار ساتھ اپنے لے چلے گا
حرف پر دلالت کرتا ہے بلندی اور علو پر جیسا زید ولان کذا پر ہے۔ اور کبھی معنی میں لیکن کے
مثلاً　شعر

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

اور کبھی میں ظرفیہ کے مفید ہوتا ہے جیسا تم مرے گھر پر آو یعنی گھر میں
حرف جو اور حرف کہ یعنی کاف عربی مکسور تے ہیں واسطے بیان ماقبل کے مثلاً کشن نے کہا
گوالن[1] سے جو پیارے کے پاس جاؤ، زید نے کہا عمر کو کہ میں کل باغ کو جاوں گا
حرف نہ و حرف مت و نہیں واسطے نفی کے ہیں اور مثال اس کی ظاہر ہے

---

[1] گوالن، گوالا کی تانیث یعنی گئو والی مجازاً دودھ بیچنے والی عورت
[2] اعظم گڈھ کے قصباتیوں کی زبان سے اس معنی میں لفظ "جن" بہ کسرۂ اول بار سنا ہے

اور حرف آ یعنی الف مفتوح و ان و تر و نِ یعنی نون مکسور دلالت کرتا ہے معنی نفی کے اوپر جیسا
اٹل یعنی ٹلنے والا نہیں ، اَن پڑھ ، نڈر ، نربل

حرف اے بالف مفتوح و اے بالف مکسور و ارے بہ یائے مجہول و ارِی بہ یائے معروف و حرف
او یعنی واو مجہول و رے بہ یائے مجہول و اجے و اجی و ہوت و یا و حرف ا یعنی الف ساکن یہ سب
حرف ندا ہیں مثلاً اے لڑکے ، او چھوکری ، اری ہندہ ، ایے مردک ، اجی میاں اگر ہو سوت[1] یا خدا ، خدایا ، ساقیا

حرف یو جب[2] فعل امر کے آخر میں آوے تب فایدہ دعا کا حاصل ہوتا ہے خواہ نیک یا بد جیسا خوش رہیو
یا مریو یعنی میں دعا کرتا ہوں خدا کے یہاں کہ تو خوش رہے یا کہ مرے

حرف کاف و چہ موافق فارسی کے علامت تصغیر کی ہیں جیسا مردک ، باغچہ یعنی چھوٹا آدمی و چھوٹا باغ -

حرف ا یعنی الف ساکن و ترف وا متعدی بالواسطہ کی علامت ہیں جیسا بجنا ، بجانا ، بجوانا ،

حرف کر بہ کاف عربی ترجمہ حرف با کا ہے[3] فارسی میں مثلاً

ع گھر ہمارا خانہ اللہ کر مشہور تھا

یعنی بخانہ خدا - اور وہی حرف کر اکثر مصدرات پر واقع ہوتا ہے ، جیسا بن کر ، جل کر ، اور کبھی
معنی فاعلیہ کو جیسا دن کر آفتاب کو کہتے ہیں یعنی دن کرنے والا

حرف سا و انہ حرف تشبیہ ہیں مثلاً مردسا ، یا مردانہ یعنی مرد کے برابر

اور حروف اور و پر و لیکن و بھی و ہی و دو بھر حرف عطف کے ہیں

اور حرف یا و کی بیائے معروف و نہیں تو و خواہ و چاہو حرف تردید ہیں مثلاً میں تم کو
روپیہ نہیں دیتے کا خواہ خوش ہو یا بیزار

لفظ اگر و جو حرف شرطیہ ہیں و حرف تو و پس حرف جزا ہیں جیسا اگر یا جو تم میرے آ و تو یا پس

---

[1] ایسے موقع پر " ہو " بروزن او (بہ واو مجہول کشیدہ) اکثر سنا ہے یعنی گیر ہو ہو جلے ! دگبر ہو ، کبھی گمر ہوا
بہ اضافہ الف لبی کہہ کر پکارتے ہیں اور کبھی " رے " کا مزید اضافہ کرتے ہیں یعنی گیر ہوا رے

[2] یو (ی بہ واو معروف کشیدہ) دہلی کی بول چال میں علامت امر کی ہے ، اسی طرح یُو (یائے مفتوح واو ساکن)
پوربی میں علامت استفہام کی ہے مثلاً مَرَیُو یعنی کیا تم مارو گے - بلکہ جس صورت کا مصنف نے ذکر کیا ہے اس میں یائے
مجہول بعد واو ساکن آتی ہے یعنی (ر بے + واو ساکن)

[3] یہاں کر بجائے کرکے یا کہہ کر آیا ہے

تم کو میں روٹی دوں گا۔ اور کبھی حرف تو زاید ہوتا ہے مثلاً

ع صاف تو کہہ میاں کہ تم تو ہوے اہل نصاب

اور لفظ سوا سوائے و مگر و ورا و ماورا حرف استثنا ہیں جیسا آئے ہمارے پاس طلبہ (کذا) سوائے زید کے

لفظ ہاں حرف ایجاب ہے مثلاً تم نے فلانی کتاب پڑھی، خداوند ہاں

لفظ البتہ واسطے تاکید اثبات یا نفی کے ہے اور ہرگز واسطے تاکید نفی کے ہے اور کبھی مصدر کے بعد حرف کا لانے سے معنی ہرگز کی حاصل ہوتی ہے جیسا میں نہیں دینے کا یعنی ہرگز نہیں

لفظ ہی بہ یائے معروف واسطے حصر یا تاکید کے آتا ہے۔ مثلاً اس شہر میں کسن ہی داتا ہے یعنی دوسرا کوئی نہیں، یہی آدمی، اسی کو، کیا ہی آدمی ہے مصرع

ع سنتے ہی یہ دل کو لگی اُس کے چوٹ

فایدہ۔ اکثر حروف فارسی و عربی ہندی میں مستعمل ہیں جیسا از، بر، بہ، نے، یا، غیر، حتیٰ، تا، فی، مع اور کبھی حروف مکرر ایک سے زیادہ سے (کذا) آتے ہیں مثلاً اسکتیں کو دیا، صبح سے تا شام تک خوش کر، اور گھر میں سے گھوڑے پر سے

فایدہ۔ اکثر حروف دو لفظ کے درمیان واقع ہوتے (ہیں) مثلاً حرف ب، ا یعنی الف ساکن، و یے، واو، نہ، و کا و کے و کی جیسا دربدر، دوبدو، لبالب، دوڑا دوڑ[1]، چھپا چھپ، سال بسال، جابجا، گاہ بے گاہ، گفت و گو، رات و رات[2]، لال و لال، کدھی بکدھی، کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں[3]، کھیت کا کھیت، جنگل کا جنگل، ٹھٹ کے ٹھٹ، رات کی رات

---

[1] اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ اُسی (= اُس + ہی)، اِسی (= اِس + ہی)، کسی (= کس + ہی) وغیرہ الفاظ لفظ ہی کو ضم کرنے سے بنے ہیں، اس اصول پر بعض اور لفظ بھی وضع کیے گئے مثلاً ایکی (= ایک + ہی)، اورکا (= اور + ہی)، آپی (= آپ + ہی) ان مثالوں میں آوازوں کو تخفیف کرنے اور ہائے ہوز کو حذف کرنے کا رجحان ملتا ہے عہ اصل "دوڑ دوڑ"

[2] روزمرہ میں "راتوں رات" بولتے ہیں اور غالباً اسی قیاس پر کبھی راتوں رات بھی کہتے ہیں۔

[3] اصل "کہیں نکہیں"

مقالہ دوم

مرکبات

مرکب وہ کہ دو لفظ یا زیادہ ملاویں اس طرح کہ جز لفظ جز معنی پر دلالت کرے مثلاً زید کا گھوڑا پس زید دلالت کرتا ہے اپنے معنی پر اور گھوڑا اپنے معنی پر۔ یہ مقالہ مشتمل ہے دو بحث پر

بحث اول

مرکب غیر کلامی

وہ کہ سننے والا اُسی پر اکتفا نہ کرے بلکہ منتظر رہے دوسری بات کا پس مرکب غیر کلامی کے چار نوع ہیں۔

نوع اول۔ توصیفی وہ کہ صفت و موصوف سے مرکب ہوے۔ ہندی ترکیب توصیفی میں اصل یہ کہ صفت مقدم ہوے موصوف پر مثلاً اچھا شہر، بھلا مانس

اور فارسی ترکیب توصیفی میں اصل یہ کہ موصوف مقدم ہو صفت پر اور اس صورت میں موصوف مکسور ہوگا جیسا عاشقِ پاک، مردِ نیک

اور عکس اس کا صحیح ہے اما اس صورت میں موصوف مکسور نہ ہوگا جیسا پاک عاشق، نیک مرد،

اور ہندی صفت و موصوف کے درمیان موافقت شرط ہے تذکیر و تانیث مثلاً اچھی لڑکی بہ یائے معروف او وحدت و جمع میں جیسا اچھا لڑکا، اچھے لڑکے بہ یائے مجہول، اور حالت جیسا بھلا بندہ، حالت فاعلی میں اچھے لڑکے کو حالت مفعولیہ میں اور اچھے لڑکے کا وغیرہ حالت اضافت میں۔

فائدہ۔ جب دو لفظ مل کر ایک اسم کی صفت واقع ہوت اُس مرکب کے جزء آخر کی تذکیر و تانیث میں اُس موصوف کی رعایت کرتے ہیں مثلاً ٹنگڑی ٹوٹا مرد پس لفظ ٹنگڑی مونث ہے تو چاہیے کہ ٹنگڑی ٹوٹی بہ یائے معروف کہتے لیکن بہ رعایت مرد ٹنگڑی ٹوٹا کہیں گے اور ایسے ہی جھولی بھر لڑکا، اور ما

---

[1] اصل "سینوالا" اگرچہ از روے قواعد "سن نے" (دو نون کے ساتھ) چاہیے لیکن پورب والوں کے روزمرہ میں سینے والا، کرے والا، لکھے والا، جانے والا بجاے سننے والا، کرنے والا، لکھنے والا جاننے والا بھی آتا ہے یعنی وہ مصدر کے علاوہ مضارع پر بھی 'والا' بڑھا کر اسم فاعل بناتے ہیں۔

موسی لڑکی

نوع دوم - ترکیب اضافی

وہ کہ مضاف و مضاف الیہ سے مرکب ہووے اور ترکیب اضافی ہندی میں اصل یہ کہ مضاف الیہ مقدم ہو مضاف پر جیسا مرد کا گھر اور اس کا غلام اور عکس بھی درست ہے مثلاً گھر مرد کا۔ غلام اُس کا و جمیع اضافت فاید تخصیص کا دیتا ہے چنانچہ مرد کا گھر یعنی عورت کا نہیں اور اس کا بیان کر چکا ہوں بحث اسما کے باب چہارم میں

نوع سیوم - ترکیب تعدادی

کہ دو عدد سے مرکب ہووے جیسا اگارہ[1]، بارہ

نوع چہارم - ترکیب امتزاجی

وہ کہ دو لفظ مل جاویں اس طرح کہ گویا ایک لفظ ہے اور وہ مرکب کسی چیز کا نام ہووے جیسا کلکتہ کہ پس یہ لفظ مرکب ہے دو لفظ سے کالی نام ایک دیبی کا اور کتہ بمعنی مالک کے، واسطے کثرت استعمال کے الف کو حذف کر کے کلکتہ کہتے ہیں اور اسی طرح اکبر آباد، شاہ جہان آباد، رام نگر، جہانگیر نگر، غازی پور، جونپور، انوپ شہر، فتح گڈھ، شاہ گنج (کذا)، بھگوان گولہ، سکندر نامہ

اور سوائے ان چاروں کے اور ایسا ترکیبات غیر کلامی ہندی میں واقع ہیں کہ وے مسمی کسی نام کر نہیں چنانچہ اکثر مرکبات کہ وے صفات ہیں بحث صفات میں مذکور ہووے اور بعضے صفات کے آخر میں حرف یائے معروف کے لاحق ہونے سے معنی مصدر حاصل ہوتے ہیں مثلاً دوست، دوستی، دشمن، دشمنی، ترش، ترشی، مرد، مردی، بڑا، بڑائی[2]، میٹھا، میٹھائی، مہربان، مہربانی، بے صبر، بے صبری، بے وقر، بے وقری، کم، کمی، ناچار، ناچاری،

اور کبھی یائے معروف واسطے نسبت آتی ہے جیسا عربی، ہندی، حنفی، عیسوی، موسوی

حرف آی و گی و پن و پنا و پا و اپن و پٹ و اہٹ و وٹ و لش و ل و ش یعنی شین ساکن آخر میں آنے سے معنی مصادر ہوتے ہیں جیسا سیوک، سیوکائی، ادھیک، ادھکائی، ترش، ترشائی، رند، رندگی، مردانگی، موٹاپن، زنان پن، بیوہ پنا، موٹاپا، بڑھاپا، احمقاپن[3]، ملاپٹ، سنناہٹ،

---

[1] دلی میں گیارہ کہتے ہیں۔ [2] اس اصول کے مطابق بڑی، میٹھی وغیرہ میں یائے حطی کے اوپر ہمزہ بنانا غیر ضروری ہے [3] اس لفظ میں دوسرا الف حذف کر کے احمق پن اور کبھی احمق پنا بولتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشا نے اس سلسلے میں لکھا ہے: "دیوان پن۔۔۔ جن لوگوں نے دلی نہیں دیکھی ہے وہ دیوانہ پن کہتے ہیں۔" (دریائے لطافت صفحہ ۱۴۹)

گرداوٹ ۹ سیہ ھاوٹ ، آزمایش ، سوزش ، فرمایش ، کھول ، پلول ، لہرول
فایدہ ۔ اکثر لفظ میں انا کے لاحق ہونے سے معنی مکان کے حاصل ہوتے ہیں جیسا سر ، سرھانہ یعنی سر کی جگہ ، پاؤں ، پیتانا[عہ]
لفظ اس کے آخر میں آنے سے معنی شوق کا فائدہ حاصل ہوتا ہے چنانچہ پیاس ، موتاس ، ہگاس
کبھی حرف نون ساکن و حرف الف اور حرف وا اور حرف واو یعنی واو معروف کو ترکیب دینے سیں (کذا) معنی تصغیر یا تحقیر یا وصفیت کے حاصل ہوتے ہیں جیسا بیرن ، میرن ، بخشا ، ہیکنا ، بخشوا ، بیروا اور جیو و بیوا و ڈھالو
اور ایسیئی حرف ڑا و ری بیائے معروف و حرف کاف ساکن کے آنے سے تصغیر یا تحقیر ہوتا ہے جیسا آنکھ ، انکھڑا ، پاگ ، پگڑی ، کھال ، کھلڑی ، دام ، دمڑی ، گاٹھ ، گٹھڑی ، پھوڑا ، پھوڑیا ، مرد ، مردک ، تومک ، سبزک
کبھی لفظ خانہ و دان و گاہ و ستان ، ستھان و زار واری ، باری ، سال ، سالہ کو آخر میں لانے سے معنی ظرفیت کے حاصل ہوتے ہیں جیسا کتب خانہ ، توپخانہ ، تاسدان (کذا) قلمدان ، شمعدان خوابگاہ ، سحرگاہ ، ہندوستان ، دلوستھان و راجستھان ، دبستان ، گلستان ، لالہ زار ، گلزار[سلہ] ، پھلواری ، خانہ باری ، ٹکسال ، گاوسالہ
لفظ فی و در وال ہیں اوپر ظرفیت کے جیسا فی الفور ، الحال ، درماہ ، درکار ، درمیان
ولفظ سدا جب اول میں واقع ہوتب دال ہوتا ہے معنی دوام پر جیسا سدا بہار

بحث دوم

کلام وجملہ

وہ مرکب ہے کہ سامع اس کے سننے[سلہ] کے بعد محتاج نہ رہے دوسری بات کا

عہ کذا ۔ لیکن اس اصول کے مطابق "سرھانا" بہ الف کشیدہ چاہیے عہ پیتانا = پے تانا یا پائنتی
سلہ اصل "گلزار" ۔ مثنوی "گلزار ارم" کا نام بھی اسی صورت میں تاریخی ہو سکتا ہے جب اس میں زائے ہوز کی جگہ ذال نقطہ ہو ۔ سلہ سننے کے مقام پر "سنے" اہل پورب کی زبانوں پر اب بھی جاری رہتا ہے ، اسی طرح "جاتا" کی جگہ "جانا" کا معاملہ بھی معلوم ہوتا ہے ۔

پہلے جاننا چاہیے کہ جملہ بنانے کے واسطے یک مسند و مسند الیہ چاہیے اور دونو (کذا) ربط کے واسطے یک رابطہ ضرور۔ پس ہندی میں لفظ ہوں و ہے و ہیں و ہو رابطہ غیر زمانی ہیں اور لفظ ہونا کے جمع (کے) صیغے اور لفظ تھا و تھے بیائے مجہول و تھی بیائے معروف و تھیں و یا تھیاں بیائے معروف کی دو حالتیں ہیں؛ یک یہ کہ افعال ناقصہ ہوں اس طور میں و ے بھی رابطہ زمانی ہیں۔
دوسرے یہ کہ بمعنی وجود کے ہوں اسی صورت میں و ے فعل لازمی ہیں جیسا لڑکا ہوا، جنا زمان حال میں، یا عمر تھا یعنی زمان سابق میں
پس جملہ دو قسم ہیں

اول اسمیہ۔ وہ مرکب ہوئے مبتدا خبر سے اور تمامی کلام اسمیہ میں روابط مذکور رہتے ہیں جیسا میں عالم ہوں، تو دانا ہے، وہ فاضل ہے، ہم غریب ہیں، تم طالع ور ہو، وے جاننے والا ہیں، زید فاضل ہو، زید عمر فاضل ہوئے، میں کامل ہوں گا وغیرہ، رام ٹھاکر سیتا ستی (کذا) تھے وغیرہ
قسم دوم۔ جملہ فعلیہ وہ ترکیب پاوے فعل و فاعل سے اور ہندی میں سزاوار ہے یہ کہ فاعل و مفعول مقدم ہو فعل پر اور عکس اس کا بھی درست ہے
اور جملہ فعلیہ میں اکثر رابطہ مذکور رہتے ہیں جب اس جملہ میں فعل ماضی قریب یا ماضی بعید یا ماضی استمراری یا حال ہو جیسا زید آیا ہے، لڑکا ہوا ہے، میں مارا ہے[1] زید کو وغیرہ۔
زید آیا تھا، لڑکا ہوا تھا، میں نے مارا تھا زید کو، زید آتا تھا، لڑکا ہوتا تھا، میں مارتا تھا زید کو وغیرہ۔
زید آیا ہے، لڑکا ہوتا ہے۔ میں مارتا ہوں زید وغیرہ
اور سوائے اس کے باقی جملہ فعلیہ میں مقدر رہتا ہے جیسا میں ماروں گا وغیرہ، میں ماروں وغیرہ، میں مارتا وغیرہ
فایدہ۔ وقت پائے جانے قرینہ کے فعل کو جملہ سے حذف کرنا درست خواہ قرینہ مقالیہ ہو جیسا لفظ نہیں، جواب میں اس شخص کے کہ کھانا لایا، یعنی نہیں لایا۔ یا کہ یک شخص نے پوچھا میں وہاں جاوں، جواب دیا کہ مت یعنی مت جاو یا کہ جواب میں کہے لفظ اوہوں بواو اول معروف و ہائے مضموم و واو ساکن و نون غنہ یا کہ لفظ ہاں جواب میں اس شخص کے پوچھے کھانا کھاو گے" یعنی ہاں کھاوں گا

---

[1] اگرچہ پورب کے لوگ اب بھی بعض اوقات اسی طرح بولتے ہیں لیکن ازروے قواعد" جانے والے" چاہیے [2] اس موقع پر" مارا ہوں" چاہیے"

دعواہ قرینہ حالیہ ہو جیسا ایک شخص نے پوچھا تم باغ کو جاؤ گے اور دوسرے نے انکار کیا اشارے سے سر کے یا ہاتھ کے یا قبول کیا اشارے سے

خاتمہ

مشتمل ہے چار فصل پر

فصل اول ۔ حال

وہ کہ بیان کرے ہیئت فاعل کی جیسا سوار چلا جاتا ہے یعنی جاتا ہے جس حالت میں کہ وہ سوار ہے اور اسی طرح سوتا پڑا ہے[1] یا کہ بیان کرے ہیئت و شکل کسی مفعول کے مثلاً زید کو مارتے دیکھا یعنی زید کو دیکھا جس حالت میں کہ وہ مارتا ہے کسی کو

بعضے کلام میں حال واقع ہوتا ہے اس طرح کہ احتمال ہے دونو (کذا) سے حال ہونے کا یعنی فاعل سے اور مفعول سے جیسا میں نے گھوڑے کو روتے دیکھا پس اس کے دو معنی ہیں یک یہ کہ میں نے اپنے رونے کی حالت میں گھوڑے کو دیکھا اس صورت میں لفظ روتے حال فاعل سے ہے اور دوسرے یہ کہ میں نے گھوڑے کو دیکھا جس حال میں وہ گھوڑا روتا ہے اس صورت میں حال ہے مفعول سے

اور ہندی میں تذکیر و تانیث حال کی بہ رعایت ذی حال کے ہوتی ہے چنانچہ زید سوتا پڑا تھا ہندہ سوتی پڑی[2] تھی

فصل دوم
تمیز

وہ کہ دفع کرے ابہام و شک کو اور اس کی علامت اکثر ہے حرف سے یا بائے موحدہ مازبردستی سے یا بجبر چھین لیا یعنی جبراً اور حرف کر بکاف عربی جیسا میں نے یہ عبارت بھول کر لکھی یعنی سہواً اور کبھی وہ علامتیں مقدر رہتی ہیں اور تذکیر و تانیث تمیز کی موافق تمیز عنہ کے ہوگی جیسا وہ عورت بھلی ناچتی ہے جب تمیز عنہ عورت ہے اور بھلا ناچتی ہے جب تمیز عنہ ہونا چنا جو ضمن میں ناچنے کے ہے ۔

فصل سیوم
توابع

دو نوع ہیں ۔ اول یہ کہ موضوع بامعنی ہو اور اس نوع کی چار قسم ہیں اول صفت کہ تابع ہے موصوف جیسا اچھا شہر، بھلا مانس اور اس کا بیان مرکبات غیر کلامی میں بکما حقہٗ ہوا ہے

---

[1] اصل " پڑا " [2] "یا سوتا پڑا ہے" سہواً مکرر لکھا ہے [3] اصل " پڑی "

دوسرا عطف۔ حروف عطف ہندی میں ہیں لفظ اور پُن یا یا ے فارسی معلوم و حرف واو وغیرہ کہ بحث حروف میں مذکور ہوئے۔ پس حرف عطف کے قبل جو لفظ ہو اس کا نام معطوف علیہ اور جو بعد اس کا نام معطوف ہے اور معطوف و معطوف علیہ کے درمیان موافقت شرط ہے حالات میں یعنی اگر معطوف علیہ فاعل۔ تو معطوف بھی فاعل جیسا وہ آیا اور یہ لڑکا پہونچا (کذا) اور بندہ گیا اور لڑکا بھی

اور اگر معطوف علیہ مفعول ہو تو معطوف بھی مفعول جیسا اُس گھر اور اس گھر کو توڑونگا، لڑکے اور گھوڑے کو یہاں لاوو (کذا)

تیسرا تاکید۔ وہ کہ مقرر کرے اپنے ماقبل کو جیسا اے مرد سب، اُن سبہو (کذا) نے مارا، اُن لوگوں نے کھایا۔ لفظ سب اور سبہوں و لوگوں واسطے تاکید جمعیت کے ہے۔

چوتھا۔ بدل۔ جیسا اے زید تیرا دینا بھیّا۔ بدل ہے دینا سے

نوع دوم۔ یہ کہ توابع مہمل و بے معنی ہوے

اگرچہ کبھی ترکیب اس کی ساتھ متبوع کے مفید یک معنی کو ہوے جیسا چھُری[1] اوری، پس لفظ اوری بے معنی ہے اگرچہ کبھی اس کی ترکیب سے معنی حاصل ہوتے ہیں مثلاً شکاری شکار کے مرنے کے خوف سے کہے کہ چھری اوری لاد یعنی اگر چھری موجود ہے تو لاو نہیں تو لاو کوی ایسی چیز کہ اس سے ذبح ہو سکے اور اسی طرح روتی اوتی (کذا) لڑکی پڑکی، چوکی ووکی

فصل چہارم

بعضے فوائدمیں

لفظ ملنا، پہونچنا، بننا (کذا)، بھانا، بہنا، پوچھنا، سوجھنا، لگنا کے صیغے، اگرچہ افعال لازمی ہیں، تاہم ان کے ساتھ اکثر متعلقات بصورت مفعول کے آتے ہیں سو اگرچہ وے فی الحقیقت مفعول نہیں جیسا فلانی چیز ملی مجھے، تجھے وہاں پہونچنا ضرور، مجھے جانا بنا، یہ کلام تجھے بھاتا نہیں، ناسپی ؟ بہنا نہیں، تجھے یہ چیز سوجھتی نہیں، تمھے (کذا) کیا یہ کام تو فش نہیں لگتا ہے

اور جس طرح فعل مقتضی ہے فاعل و مفعول کا ایسہی مصدر بھی جیسا اُس کو مارنا مناسب نہیں، اس چیز کو کھانا خوب نہیں فایدہ

فایدہ۔ جب دو شے کو جو بحسب مراتب کے اُن میں ایک ادنیٰ اور دوسرا[2] اعلیٰ، ایک جملے میں لاویں تو اکثر ابتدا ادنیٰ سے کرتے ہیں جیسا ماں باپ، چھوٹا بڑا، جورو خصم، کم و بیش، راہ ھاکش (؟)، سیتا رام

---

[1] جیسا مجھنی چھوا   [2] اصل: جھوڑی،   [3] اور ہر جگہ اسی طرح [4] یہ کلیہ نہیں ہے اس کے برخلاف بہت مثالیں ملیں گی یوسف زلیخا، گل و بلبل وغیرہ، داستانوں کے ناموں میں پہلے ذکور کا نام عموماً آتا ہے مثلاً حاتم طائی و لحجۂ آرا ...

لفظ سبحان اللہ واسطے تعجب کے ہے اور لفظ واہ، شاباش ومرحبا وماشاء اللہ کلمہ تحسین کے ہیں

فایدہ — وھنا و ڈھسکنا دو تو (کذا) مترادف ہیں اور ایسی چوسنا، چوسکنا، ہٹنا[عہ]، ٹھٹکنا

مبطور تکیہ کلام اکثر یہ الفاظ ذکر کرتے ہیں یعنی جو ہے سو تمھاری، سو خیر، صاحب مہربان، نام خدا، چشم بد دور

عہ اصل: "ہٹھنا"

تمت تمام شد

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- -

مالک کتاب مجلد ہذا ٹھاکر چند خلف ہمت لعل مالگذار موضع مادھوپور پرگنہ مونگیر کہ جناب (ساے ؟) رام کرن سنگھ صاحب حقیقی (لور ؟) کلاں نے) ام در مقام بنارس نویسانیدہ بود ند

مہر

۱۲۴۲ [مہر]

۱۲۴۲ [مہر]

.. مقتدر ا۔ کوٹہ

بیسویں صدی کے عشرۂ سوم کے تین راجستھانی اردو رسالے

بہ لحاظ اردو پرستی، راجپوتانہ کے والیانِ ریاست کو تین شقوں میں تقسیم کرنا مناسب رہے گا۔ اول وہ جنھوں نے سرکاری طور پر اردو کی سرپرستی کی، اور خود بھی اس کے فروغ و ارتقا میں دلچسپی لیتے رہے۔ مثلاً ٹونک، الور، جھالاواڑ، جے پور۔ دوئم وہ جنھوں نے اردو کی مخالفت کی، مثلاً ریاست بوندی، بقول جائزۂ زبانِ اردو (مرتبہ انجمن ترقیِ اردو ۱۹۴۰ء)، ریاست بوندی کے راجاؤں نے مقامی بولی ہاڑوتی کو ہندی رسم الخط کے ساتھ دفتری تحریروں میں استعمال کی۔ یہاں کے بعض راجا ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے سختی کے ساتھ دفاتر میں اردو فارسی کی آمد کو روکا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں جبکہ مہاراجہ رگھبیر سنگھ حکمراں تھے۔ احکام جاری ہوئے کہ اردو فارسی الفاظ سرکاری تحریروں میں نہ آنے پائیں۔ سوئم وہ والیانِ ریاست جنھوں نے اردو کی نہ مخالفت کی نہ حمایت۔ مثلاً ریاست کوٹہ مہاراؤ امید سنگھ نے ارکینِ ریاست کے اس نظامِ تعلیم اور ریاست کے دفتری طریقِ کار سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ جو ۱۹۱۱ء سے قبل اردو رسم الخط میں ہوتا رہا تھا۔ راجپوتانہ کی بیشتر ریاستوں میں بیسویں صدی کے عشرۂ اول تک اردو بہ حیثیت سرکاری زبان مستعمل رہی۔ (اگرچہ بعض ریاستوں میں تو تاانضمام ریاست اردو ہی جلوہ فگن رہی) اس کے بعد ہندی کا چلن ہوا۔ اور اس سلسلے میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی تحریک کو زیادہ دخل رہا۔ جنھوں نے راجپوت راجاؤں سے بہ حیثیت برہمن یہی دکشنا مانگی کہ اردو کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ تلقین بھی یہی کی کہ ہندو راجا کا دھرم یہی ہے کہ وہ اپنی مذہبی زبان کو فنا نہ ہونے دے۔ مذہبی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اگرچہ رسم الخط کی یہ تبدیلی وقوع میں آگئی۔ تاہم بہت سے راجہ مثلاً راجرانا بھوانی سنگھ والیِ جھالاواڑ اور مہاراجہ جے سنگھ والیِ الور اردو پرستی میں منہمک رہے۔ ویسے بھی اردو فارسی الفاظ ریاستی کاروبار میں برسمِ ہندی، استعمال میں آتے رہے۔ حصولِ آزادی کے بعد سے —— اور اب بعذرِ ہماری خصوصی ذہنیتوں اور تحریکوں کی وجہ سے اردو سے کنارہ کشی کی جارہی ہے

اگرچہ یہ بارہا ثابت کیا جا چکا ہے کہ اردو کی تعمیر و تزئین ساخت و پرداخت اور ارتقاء و ارتفاع میں ہندوستان کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کا ہاتھ رہا ہے اور ہر ملک و مذہب اور ہر عقیدہ و خیال کے لوگوں نے اسے سنوارا اور نکھارا ہے۔ اردو جہاں اسے سرکاری سہارا ملا۔ دن دوگنی رات چوگنی پھیلی اور جمہور کے ذوق و شوق کی بنا پر پلتی بڑھتی رہی۔ دیگر صوبوں کی طرح راجپوتانہ میں بھی اس کے چرچے اور زمزمے رہے۔ یہاں کے باشندوں نے بھی اسے خونِ جگر سے سینچا۔ اردو میں کتابیں بھی لکھی گئیں اور رسائل و اخبارات بھی جاری کئے گئے۔ جلسے اور مشاعرے بھی منعقد ہوئے اور شادی و غمی میں بھی اسے ساتھ رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں کی تحریکیں اور سرگرمیاں یہاں کے ادباء و شعراء بالعموم عدم شہرت اور گمنامی میں دوبے رہے۔ اس کے چند اسباب میں نے اس مضمون میں مفصلاً بیان کئے ہیں۔ جو اردو ادب کے شمارہ ۔۔ سنہ ۱۹۶۶ عیسوی میں یہ عنوان "راجستھان میں فروغِ اردو کا صد سالہ جائزہ" شائع ہوا ہے۔ ۔۔ فوری حوالہ کے لئے یہاں انکا دوہرا دینا غالباً بے محل نہ ہوگا میرے خیال سے حسبِ ذیل وجوہ ہیں جن کی بنا پر یہ راجستھان کی ادبی خدمتیں تاریخ ادب اردو میں نمایاں مقام حاصل نہ کر سکیں:۔

۱ - بیرونی محققین و مورخین نے اس سلسلہ میں زیادہ کاوش و کوشش سے کام نہیں لیا۔ سرسری نظر ڈالی۔ معمولی معلومات فراہم کیں۔ اور وہ بھی بڑی بڑی ریاستوں کے متعلق اور انہیں کو اپنے اطمینان کے لئے کافی سمجھ لیا

۲ - اندرونی طور پر یہ صوبہ قبل آزادی مختلف ریاستوں پر مشتمل تھا۔ ریاستی حدبندیاں، ملکی حدبندیوں کے مانند سدِ راہ بنی رہیں۔ دائرہ کار محدود بھی رہا اور متعین بھی۔ اس لئے مقامی طور پر ادبی سرگرمیاں محدود رہیں۔ بیرونی سرگرمیوں کو نہ زیادہ متاثر کیا گیا نہ ان کا زیادہ اثر قبول کیا گیا۔

۳ - اکثر ریاستوں کے حکمران اردو علم و ادب سے بے بہرہ رہے۔ مقامی اور مادری بولیاں بولتے رہے۔ یعنی سرکاری طور پر اردو کو کوئی سہارا نہ مل سکا۔ ایسے مقامات پر اردو اپنے خدمت گزاروں اور پرستاروں کے بل بوتے پر ہی صنیا بار رہی اور وہی اس کی شمعیں روشن کئے رہے

۴ - تخلیقات اور نگارشات بہت کم چھپیں اور جو چھپیں مقامی طور پر ہی افادہ و استفادہ کا ذریعہ بنی رہیں۔ ریاستی حدبندیاں ان کی عام وسعت و شہرت اور قبولیت و پذیرائی میں مانع رہیں

اس کے بعد ادبی ذخائر کی عدم طباعت و اشاعت کے سلسلے میں کچھ لابدی امور کی جانب اشارات کئے جاتے ہیں۔

(الف) ادباء و شعراء سے تونگری ویسے ہی دور رہتی ہے۔ پھر یہ دماغی کاوشیں چھپتیں تو کیونکر ؟
(ب) طبیعتوں کی فقیر منشی۔ شہرت سے بے نیازی اور مزاج کی قناعت پسندی بھی اس سلسلے میں کارفرما

رہی۔ فطری لگن کی وجہ سے اردو پرستی برقرار رہی اور اپنے ماحول کی جھجک کا سبب بھی رہی۔ لیکن نام و نمود سے بے اعتنائی نے وہ جوش و خروش نہ ابھارا جس سے یہ صلاحیتیں منصۂ شہود پر آسکتیں۔

(ج) بیشتر اُدبا چونکہ اردو سے وابستہ نہ تھے۔ اسلئے ایسی ادبی کاوشوں سے اور ایسے ادبی خدمت گذاروں سے غیر ملتفت رہے۔ ارباب قلم خود تہی دست، کوئی مالی امداد نہیں پھر ادبی کاوشیں روشنی میں آئیں تو کیوں کر؟

(د) اردو پریس کی کمی بھی ایک بڑا سبب رہی۔ آج بھی راجستھان کے ایک دو مقامات اجمیر، ٹونک، جے پور میں اردو پریس ہے۔ اگرچہ تشفی بخش نہیں تاہم اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بقیہ دیگر علاقے تمام تر اس نعمت سے محروم ہیں۔ زمانہ ریاست، کوٹہ کے جیل پریس میں کوئی ادبی تخلیق شائع نہیں ہوئی۔ سرکاری سرکیولر اور دستورالعمل ہی شائع ہوئے۔ جھالاواڑ کے جیل پریس میں ادبی کتابیں بھی شائع ہوئیں اور اردو رسائل بھی۔ لیکن اسے عمومیت نہیں دی جاسکتی۔ غیر مطبوعہ تخلیقات ہر ریاست کے اردو ادبا و شعراء کے پاس درجنوں مل جائیں گی جن میں سے اکثر تصنیفات شائع ہو کر اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کرسکتی ہیں۔ لیکن اردو پریس کی کمی ایسی تصنیفات کو اجاگر نہ کرسکی یہی وجہ راجستھان میں رسائل و اخبار کی کمی کی بھی ہے۔

بایں ہمہ مطبوعہ کتابوں رسالوں اور اخباروں سے جو مختلف ریاستوں سے وقتاً فوقتاً معرض وجود میں آئے ریاستی حدبندیوں کے تحت بکمالہٖ واقفیت نہ ہوسکی۔ نہ مکمل استفادہ ہوسکا۔ ضرورت ہے کہ مقامی ارباب قلم اس خدمت کے لئے کمربستہ ہوں۔ وہ اپنے دائرۂ واقفیت کی ادبی حیثیت سے سب کو متعارف کرائیں تاکہ تاریخ ادب اردو تا حدّ راجستھان مکمل ہوسکے۔

ہمارے بہت سے علمی ادبی اور اصلاحی رسالے، حالات کی ناسازگاری کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کیلئے خاموش ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے مدیران محترم کے جوش کردار اور خروش عمل پر کوئی حرف نہیں آتا ان کی اردو پرستی، خدمت زبان، اور اصلاح قوم و ملت کے جذبات کی قدر کی جانی چاہئے۔ ان کے ذکر و فکر سے ہم اپنے عزائم میں نیا جوش اور اپنے ارادوں میں نیا ولولہ پیدا کرسکتے ہیں۔ جس زبان کے یہ رسالے اور ان کے مدیران محترم علمبردار رہے ہیں۔ اس زبان کی تاریخ میں یقیناً ان کے حالات سے نئے ابواب کا اضافہ ہوتا ہے کسی اردو خدمت گذار کی علمی کاوشوں اور ادبی کاوشوں کی عظمت شناسی اور قدردانی سے عدم اتفاقی کسی صورت میں بھی روا نہیں۔ کام ادھورا ہے یا مکمل ہوجائے۔ آغاز کار و طریق کار سے اس کے معیار و وقار کا

اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہی فہم و شعور ہم میں پیدا ہونا چاہئے۔
اس مضمون میں راجستھان کے تین رسالوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو اس صدی کے عشرۂ سویم میں (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۰ء) وجود پذیر ہوئے۔ تا حد امکان تعارف تفصیلی طور پر کرایا گیا ہے۔ جس سے ان رسالوں کی اہمیت و حیثیت مکمل واضح ہوجائے۔

(۱) رسالہ "شاعری کی کایا پلٹ"
(جھالاواڑ (راجستھان) کا ایک سہ ماہی رسالہ)

"راج رانا بھوانی سنگھ فرماں روائے ریاست جھالاواڑ (راجستھان) کو مختلف زبانوں سے واقفیت حاصل تھی۔ وہ علوم و فنون کے بھی قدرداں تھے۔ اور ارباب کمال کے بھی۔ چنانچہ ان کے دربار میں علمی صحبتیں اور ادبی مجلسیں گرم رہتیں۔ انگریزی زبان کے فاضل، ہندی اور سنسکرت کے ودوان، عربی و فارسی کے عالم اور اردو کے ادیب و شاعر روزانہ صبح سے دس بجے تک حاضر رہتے اور ہر علم و فن پر دلچسپ مباحثے ہوتے۔ ہز ہائی نس خود ہر علم و فن میں خاص دلچسپی سے کام لے کر، با موقع داد دیتے اور حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اردو اور اردو شاعری کو درجۂ امتیاز حاصل تھا۔ ۱۹۰۷ء میں انھیں رئیس جھالاواڑ، راجہ بھوانی سنگھ کے ایما سے ایک پندرہ روزہ بزم مشاعرہ کی بنیاد پڑی۔ حضرت نیرنگ کو شرکت کے لئے مجبور کیا گیا۔ اس بزم نے ذوق و شوق سخن کو ارباب ریاست میں بہت ابھار دیا۔ اور موزوں طبعوں کی جولانی فکر کو بھی بیحد نکھارا۔ مولوی نیرنگ مرحوم کے دیوان "سرمایہ افتخار نیرنگ" کی طباعت کا سہرا انھیں رئیس عالی دماغ کے سر ہے اور اس قدر دانی کے ساتھ کہ ہر غزل کو مطلع سے مقطع تک سماعت فرما کر جا بجا قیمتی مشوروں سے سرفراز کیا۔ نیرنگ صاحب کو افتخار الشعراء کا خطاب بخشا۔ راجہ بھوانی سنگھ کے ذوق شاعرانہ کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے۔ جسے نیرنگ مرحوم نے اپنے دیوان میں ایک شعر کے ضمن میں درج کیا ہے۔ نیرنگ مرحوم کی غزل کا شعر یہ تھا

پائی ہلال چرخ نے کیا نان بے طلب   رتبہ یہ ہے بلند لب بے سوال کا

ذیریں حاشیہ میں جناب نیرنگ نے تحریر فرمایا ہے :-
سرمی حضور دام اقبالہ نے جب یہ شعر سنا تو فرمایا کہ شعر بہت اچھا ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ نان کی تشبیہ بدر سے دی جائے۔ اس مشورہ کے تحت نیرنگ مرحوم نے شعر یوں بدل دیا

پائے میں بدر چرخ ہے اک نان بے طلب   رتبہ بلند ہے دہن بے سوال کا

راجہ کی سخن فہمی اور قدر دانی کے متعلق نیرنگ مرحوم کے کئی اشعار موجود ہیں

کیا سخن فہم ہے بھوانی سنگھ   نقد معنی کا وہ عیار ہے خاص

قدر دانی ہے مہاراج کی بیشک بیرنگ ــــــ ہے شب و روز ہمیں لطف وطن غربت میں
بیرنگ سلطنت بھی اگر ہو تو میں نہ لوں ــــ راجہ بھوانی سنگھ کی سرکار کے عوض

حافظ محمد عالم گیر خاں کیفؔ ٹونکی کا یہ منقطع بھی رئیس موصوف کی قدر دانی کا ترجمان ہے ؎

راجہ بھوانی سنگھ نے کی قدر کیفؔ کی ــــ اچھا ہوا غریب کی بگڑی سنبھل گئی

سب سے زیادہ قابل قدر اور لائق تحسین امر یہ ہے کہ راجہ موصوف یہ چاہتے تھے کہ شاعری کو فطرت اور زندگی کے قریب تر لایا جائے۔ مولوی عبدالوحید بیرنگ "کلیات دانشؔ" کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

حضرت دانشؔ ایک معزز خاندان کے جوہر فرد ہیں۔ لہذا دربار میں بھی آپ کا رسوخ تھا اور یہ موقع شاعری کے پھلنے پھولنے کا قدرتی تھا۔ حضور عالی جاہ سری دیار بہادر والی جھالاواڑ آپ کا کلام کمال اشتیاق سے سماعت فرماتے اور بے انتہا تعریف کرتے تھے۔ جب حضور ممدوح نے اچھی طرح جانچ لیا کہ انھیں شاعری سے نہایت مناسبت اور طبیعت میں بے حد جودت اور قدرتی ذکاوت موجود ہے۔ لیکن اس شاعری سے بجز تضیع اوقات کوئی عمدہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا اور شوق شعر گوئی دانشؔ پر اس قدر غالب ہے کہ اگر مخالفت کی جائے تو افسردہ دلی کا احتمال ہے اور اگر رنگ طبیعت بدلنے میں عجلت کی جائے تو نظر بحالات موجودہ شاعری پر نصیحت دانشؔ اس وقت خاطر خواہ کارگر و ذہن نشین نہ ہوگی۔ لہذا وقت کا انتظار لازم ہے۔ غرضیکہ جب اس عالی دماغ، موقع شناس رئیس نے محسوس کر لیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ مشورہ دیا جائے وہ بہتر ہوگا۔ تو ایک دن ارشاد فرمایا کہ "شمیم و بال (دانشؔ) میں تمہارے خیالات کی بلندی اور شستگی زبان کو بے حد پسند کرتا ہوں لیکن جس شاعری میں تم اپنی جودت طبع اور ذہانت کو صرف کرتے ہو وہ محض بیکار اور بے فائدہ ہے۔ گل و بلبل کیا چیز ہے؟ زلفوں کو ادھر ادھر کھینچنے کا کیا نتیجہ؟ ہاں اگر یہ دماغ سوزی ایسی شاعری میں کرو جس میں سچی باتیں ہوں تو ملک کو فائدہ پہنچے سننے والا مستفید ہو۔ اور تم بھی خوش ہو۔ غرضیکہ سرکار عالی جاہ نے شاعری سے متعلق لیا پڑا تو لکھ دیا۔ کا سی وقت حضرت دانشؔ کا رنگ طبیعت بدل گیا۔ پھر تو لالہ زار سخن میں ایسے ایسے اچھوتے گل کھلائے کہ جس کی نکہت دل کشا سے اہل سخن کے دل و دماغ معطر ہو گئے"۔

راجہ بھوانی سنگھ نے کلیات دانشؔ (۱۹۱۷ء) کے پیش کئے جانے اور اس کتاب کو ان کے نام معنون کئے جانے کے موقع پر اپنے خطاب میں اس کی وضاحت کی ہے:۔

"جھالاواڑ میں بھی اردو شاعری سے متعلق عرصہ سے خیالات ویسے ہی تنگ چلے آتے تھے۔ عاشق کی شکایت، معشوق کا ظلم، پیر مغاں کے ساتھ طعنہ بازیاں، بس انھیں چند مضامین کو

طرح طرح سے پابند ہنا شاعری خیال کیا جاتا تھا۔ نیچر کی پر اسرار کتاب ان کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ حالی
یا ننگ ممنوع خیال کیا جاتا تھا۔ اردو شاعری کے محدود دائرہ میں ہونے کا خیال آکر مجھے اکثر افسوس ہوا کرتا تھا اور میری
خواہش تھی کہ کوئی شخص اپنی ہی ریاست کے آدمیوں میں سے کھڑا ہو کر دکھلائے کہ شاعری ایک بڑا وسیع میدان ہے اور
میں چلنے کے دو چار نہیں لاکھوں راستے موجود ہیں۔ شاعر کا فرض ہے کہ وہ وہی راستے اختیار کرے جو موجودہ تہذیب اور
ضرورت زمانہ کے موافق ہوں۔ اس کو سمجھنا چاہئے کہ سوسائٹی کی حالت بدل گئی ہے زمانہ کسی دوسرے رنگ پر چل رہا
ہے۔ جو مذاق سوسائٹی نے کسی زمانہ میں جائز رکھا تھا اب وہی سوسائٹی میں جائز نہیں ہے ــــ اکبر سا عرصہ ہوا میں
نے اپنے یہ خیالات مصنف پر ظاہر کئے تھے۔ ان کی جلتی پھرتی طبیعت اور شاعرانہ قابلیت نے فوراً اس نقص کو محسوس
کرلیا اور پہلی نظم جو انھوں نے اس میں لکھی ــ وہ ــ وہ ہے جس کو کیفیات دانش میں "پرانی شاعری" کے نام
منسوب کیا ہے ۔۔۔۔ مجھ کو حقیقت میں اس بات کا فخر ہے کہ میری ریاست میں یہیں کا تعلیم و تلقین یافتہ ایک ایسا اوّل
شاعر موجود ہے، انھیں اوصاف پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے اپنی پچھلی سالگرہ کے موقع پر مصنف کو "ملک الشعراء"
خطاب دیا تھا ــ

یہ پس منظر "شاعری کی کایا پلٹ" کو متعارف کرانے کے لئے بے حد ضروری تھا۔ یہ ایک سہ ماہی رسالہ تھا جس
میں اسی قسم کی نئی طرز کی شاعری چھپا کرتی تھی۔ رئیس موصوف نے اکتوبر ۱۹۱۸ء سے انجمن سخن کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے
صدر صاحبزادہ محمد فیاض علی خاں فیاض رئیس وجاہت جو جھالاواڑ ہی قیام پذیر تھے، منتخب ہوئے تھے۔ سکریٹری سید مصطفے
حسین رضوی تھے۔ میں نے جھالاواڑ میں اس رسالہ کی بہت تلاش کی۔ لائبریری کو کھنگالا۔ کہیں نہیں مل سکا۔ تقسیم ہند
کے سلسلہ میں یہاں کی بیشتر اردو داں آبادی پاکستان منتقل ہو گئی ان کے کتب خانے یا تباہ ہو گئے یا بک گئے۔ یا بیچائے
بہرحال بڑی کوشش کے بعد میرے کرم فرمائے خصوصی منشی عزیز الرحمن عزیز جھالاواڑی سے ایک شمارہ دستیاب ہوا۔
یہی ہمارا آج کا موضوع سخن ہے۔

کاغذ سفید۔ سائز ۲۰x۲۶ صفحات ۳۲۔ ٹائٹل کے شروع کا ورق غائب ہے۔ آخری ورق کے صفحہ آخری
(صفحہ ۴) پر تین کتابوں کے اشتہار درج ہیں۔ "ڈراما پر ایک دقیق نظر" از سید محمد حسین رضوی بی۔ اے "کلام"
معنئہ لالہ سیتھو دیال دانش ــــــ رسالہ جنگ یورپ (جنگ یورپ کا مفصل فوٹو بڑے قابل قدر حضرات کا
وغیرہ۔ اس وقت پیش نظر نیا رہیں) جنگ یورپ کے عنوان سے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم پر مختلف موضوعات کے تحت
دلچسپ لیکچروں کا یہ سلسلہ راجہ بھوانی سنگھ کے ایما سے جاری ہوا تھا۔ انھوں نے خود بھی لیکچر دئے اور ریاست کے
قابل اسٹاف سے بھی دلوائے جیسے اس لیکچر خود راجہ بھوانی سنگھ کا "سب میرین" کے موضوع پر ہے۔ اس کی تاریخ
کے نیچے ۱۹۱۷ء درج ہے۔ اس لئے مجھے خیال ہوا تھا کہ پیش نظر شمارہ (شاعری کی کایا پلٹ) ستمبر ۱۹۱۷ء کے بعد کا

ہونا چاہئے۔ لیکن اس میں صاحبزادہ محمد فیاض علی خاں" صدر انجمن سخن جھالاوارڈ" کی ایک نظم درج ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں انجمن قائم ہوئی۔ لہذا یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے بعد کا ہونا چاہئے۔ اس میں ایک عنوان "خدا" درج ہے تحت میں لکھا ہوا ہے " از نتیجۂ فکر افسر الشعراء عالی جناب آغا صاحب شاعر قزلباش دہلوی، ایڈیٹر رسالہ "آفتاب جھالرا پاٹن — رسالہ آفتاب آغا شاعر کی ادارت میں جنوری ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا تھا۔ لہذا موجودہ شمارہ (شاعری کی کایا پلٹ) ۱۹۲۰ء یا اس کے بعد کا ہونا چاہئے۔

ٹائٹل کے تیسرے صفحہ پر "دستور العمل" درج ہے۔ اسے بجنسہ درج کیا جاتا ہے اس سے مزید واقفیت بہم پہنچے گی۔

۱- شاعری کی کایا پلٹ فی الحال ہر تیسرے ماہ کے شروع ہفتہ میں ۳۲ صفحہ پر قلعہ معلّٰی جھالرا پاٹن راجپوتانہ سے شائع ہوا کرے گا۔

۲- اس کی قیمت عام شائقین سے ۲؍ سالانہ و طلبا سے ۱؍ سالانہ ہوگی۔

۳- خریداروں کی خدمت میں دوسرا پرچہ وی۔ پی روانہ ہوگا

۴- انتخاب بذریعہ انتخابیہ کمیٹی ہوگا۔ جس کے ممبرس یہ ہیں :-

(۱) عالیجناب صاحبزادہ محمد فیاض علی خاں صاحب فیاض رئیس دوجانہ پریسیڈنٹ انجمن سخن جھالاوارڈ

(۲) افسر الشعراء جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی ایڈیٹر رسالہ آفتاب جھالاوارڈ

(۳) عالیجناب مولانا عبد الوحید صاحب نیرنگ کاکوروی

(۴) عالیجناب لالہ منشی شمبھو دیال صاحب دانش دہلوی رجسٹرار ریاست ہذا

(۵) عالیجناب حافظ محمد عالمگیر خاں صاحب کیف ٹونکی (۶) خاکسار سکریٹری۔

(۵) نظمیں علمی۔ ادبی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ معاشرتی و تاریخی ہوا کریں گی۔ پولیٹکل یا ہجاریہ نظمیں درج نہ کی جائیں گی۔

(۶) جن رؤسا و مشہور بزرگوں کی خدمت میں یہ رسالہ جھالاواڑ سے باہر بلا طلب روانہ ہوگا اُن سے قیمت کا کبھی تقاضا نہ کیا جائے گا۔ البتہ بطور امداد وہ جو کچھ عطا فرمائیں گے شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا

(۷) دس یا دس سے زائد خریدار بہم پہنچانے والے حضرات کی خدمت میں یہ رسالہ ایک سال تک مفت بھیجا جائے گا

۸- جملہ خط و کتابت و ترسیل زر سکریٹری رسالہ ہذا کے نام سے ہونا چاہئے۔

"سید مصطفیٰ حسین رضوی سکریٹری انجمن سخن"

صفحہ ۱ ۔ ۲۸، سے شروع ہوتا ہے " کتاب " کے عنوان سے نظم " مصنفہ منشی سکھ دیال صاحب دانش دہلوی رجسٹرار ریاست جھالاواڑ " شروع ہوتی ہے ۔ یہ نظم صفحہ ۴ پر ختم ہوئی ہے ۔ صفحہ ۵ پر " روح زوان غالب عالی جناب شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا ر پی ۔ ایچ ۔ ڈی " کی بنیں بیا " نظم شائع ہوئی ہے ۔ جس کی ابتدا اس مطلع سے ہوئی ہے ؎

عطا ایسا بیاں مجھکو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے رازدانوں میں

سترہ اشعار پر یہ نظم مشتمل ہے ۔ اخیر کے تین اشعار ضرور سن لیجئے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نمی گویم قیامت جوش زن یا شور طوفاں شو
ز طوفاں دست بردار آنچہ نتوانی شدن آں شو

صفحہ ۶ اور ۷ پر نظم " خدا " از نتیجۂ فکر آغا شاعر قزلباش " درج ہے ۔ یہ شکل مسدس ہے ۔ شروع کا بند یہ ہے ؎

دنیا میں ہے کلیم کی عزت کلام سے
ناظم کا نام رہتا ہے حسن نظام سے

ہوتی ہے اس میں خاص کی تخصیص عام سے
پھر ہے قبولیت کا صلہ ہر مقام سے

یہ وہ نہیں خراج کسی پر معاف ہو
پتھر کا دل بھی ہو تو یقیناً شگاف ہو

آخر کے دو بند یہ ہیں ؎

توحید جس کی ایک جہاں کو ہوئی پسند
یہ ہے دوئی کی گردیں باندھے ہوئے کمند

اس فلسفہ کو مانتے جاتے ہیں عقلمند
پروا نہیں کسی کی وہ ہے سب سے سربلند

انساں کو فرشتوں سے افضل بنا دیا
آخر کو اپنے حکم سے اوّل بنا دیا

بھیجے ہدایتوں کو پیمبر وہی خدا
بخشے ہے تاجداروں کو افسر وہی خدا

پیدا کئے ہیں خاک سے جوہر وہی خدا
ذروں سے جو بناتا ہے گوہر وہی خدا

دیکھو نظر اٹھا کے جہاں تک بہار ہے
ہر برگ نقش صنعت پروردگار ہے

نظم " نقص عدم تعلیم نسواں " جناب فیاض پریسیڈنٹ انجمن سخن جھالاواڑ کی ہے ۔ جو صفحات آٹھ ۔ نو ۔ دس پر مشتمل ہے ۔ ایک بیگم صاحبہ باعز و شان ۔ جو ریاست کی روح رواں تھیں ۔ لیکن خود تعلیم سے ناآشنا تھیں :

نو برس کی عمر ہو جانے پر اپنے لڑکے کو مکتب بھیجتی ہیں۔ بڑی تیاریاں کرتی ہیں۔ مغلانیاں سمجھاتی ہیں کہ تعلیم تو ہم غریبوں کے پیٹ دھندے کے لئے مجبوراً ضروری ہے۔ آپ کو کیا ضرورت ہے کہ بچے کو پڑھائیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ایک دایا اور ایک خادم کے ساتھ بچہ مکتب میں گیا۔ لیکن مکتب کا ماحول اس کے دماغ میں ایسا خوفناک کر دیا گیا تھا کہ بچہ مکتب میں پہنچتے ہی رونے لگا۔ اور روتے روتے اسے غش آگیا۔ آخر اس جھنجھٹ سے پیچھا چھڑا دیا گیا۔ ماں اگر تعلیم یافتہ ہوتی تو یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔ آخری تین شعر ملاحظہ کے قابل ہیں۔ تمام نظم بڑی موثر اور رواں ہے ؎

شکر ہے فیاض اس معبود کا — اپنا آقا ہے وہ عالی حوصلا !
جس کو تعلیم و تعلم سے ہے کام — ملکوں ملکوں میں ہے جس کا نیک نام
یتامی صدقہ ہیں یہ ذرہ نشین — اے بھوانی سنگھ بہادر آفریں

صفحات ۱۲ سے ۱۴ تک " نیرنگیٔ زمانہ " بہ شکل مسدس ایک نظم منشی محمد سکندر خاں صاحب اوور سیئر محکمہ جنگلات ریاست جھالا واڑ کی ہے۔ عالی جناب شاعر بے مثال پیارے لال صاحب رونق دہلوی ایڈیٹر رسالہ مال/دھلی کی نظم کا عنوان ہے بسنتی خواب کا پہلا سین — " اتحاد " صفحہ ۱۴ سے یہ نظم شروع ہو کر صفحہ ۱۵ پر ختم ہوئی ہے — اتحاد ملکی کا قادر البیانی سے ذکر ہے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن سے اس کا اندازہ ہو سکے گا ؎

ہے اتحاد قوم کا ڈنکا بجا ہوا — بیٹھا ہے اتفاق پر ہر اک تلا ہوا
بھارت کی جے مناتے ہیں بھارت کے سپوت — صدق و صفا و حق کا ہر اک بات میں ثبوت
باہم کچھ ایسے رشتۂ الفت بہم ہوئے — وہ ان کا سانس بن گئے یہ اسکے دم ہوئے
سورج چمک رہا ہے وہ اب اتفاق کا — دنیا سے مٹ گیا ہے اندھیر نفاق کا
یوں ہی اگر یہ منظر صدق و صفا رہا — پھر دیکھنا دکھاتی ہے کیا قدرت خدا

" ہماری حالت " ایک درد انگیز نظم ہے۔ از نتیجۂ فکر منشی وجیہہ الدین احمد خاں صاحب ملازم محکمۂ مال صدر ریاست جھالا واڑ — مولوی محفوظ الرحمٰن یکرنگ سررشتہ دار عدالت فوجداری ریاست جھالا واڑ تلمیذ حضرت رنگ کی نظم " علم " ترکیب بند کے طور پر ہے۔ جو صفحہ ۲۴ پر ختم ہوئی ہے۔ یہ شعر ہر بند کے اخیر میں درج ہے ؎

میں علم باعمل ہوں ، فرمان کبریا ہوں — آنکھوں میں گر ضیا ہے دیکھو مجھے کہ کیا ہوں

علم پر مفصل و مکمل روشنی ڈالی گئی نظم رواں ہے۔ بندش چست ہے ، سراپا آمد ہے۔ کئی پہلوؤں سے علم کے فوائد جتائے ہیں۔ کئی مذہبی کتابوں کے حوالوں سے علم کی ضرورت و وسعت بتائی ہے — آپ اچھا ہو جگ بھی اچھا ہے — منشی ... بیگ صاحب تسلیم ملازم ریاست جھالا واڑ تلمیذ حضرت نیرنگ کی بڑی مفید نظم ہے ۔ مثنوی کا انداز ہے۔ شاعر کا دل ... دست و احباب ، اعزا و اقربا۔ چرخ و زمانہ سب کو برا بے وفا اور بے مہر سمجھتا ہے۔ لیکن دفعتاً غنید کا جھونکا

آیا۔ ایک "مردِ عجیب" کو دیکھا۔ اس نے نصیحت شروع کی اور بتایا کہ اربابِ زمانہ ـــــ یا ـــــ ؎

دوست گر بے وفائی کرتے ہیں　　　اپنے حق میں برائی کرتے ہیں

تجھ کو ہمت خدا نے گر دی ہو　　　عوض ان کی بدی کا نیکی ہو

سن کے تسلیم قول یہ سچا　　　آپ اچھا تو جگ بھی ہے اچھا

"دوست ناداں و بالِ جاں ہوتا ہے" بابو طالب حسین طالب پوسٹ ماسٹر نارووال تلمیذ جناب نیرنگ کی سیدھی سادی نظم ہے "علم" کے عنوان سے حافظ محمد یٰسین صاحب شرر تلمیذ حضرت نیرنگ کی نظم، مثنوی کے انداز پہ ہے صفحہ ۲۹ پر ختم ہوئی ہے۔ شروع کا شعر یہ ہے ؎

گر کوئی چاہے کہ وہ منعم بنے　　　تو حصولِ علم میں کوشش کرے

یہی تقاضا تمام نظم پر چھائی ہوئی ہے۔ اس شعر پر نظم ختم کی گئی ہے ؎

خود پڑھے اوروں کو بھی ترغیب دے　　　جس سے ہو بہبودِ ملکی وہ کرے

اخیر صفحہ ۲۹ سے صفحہ ۳۴ تک غزلیں درج ہیں۔ جناب مینر بیگ رنگین اور بابو شمبر ناتھ نشتر تلامذۂ حضرت نیرنگ نے گل و بلبل سے دور، اسی انداز میں غزلیں کہی ہیں جس انداز کا حامل یہ مجموعہ ہے۔ ان کے تین تین شعر ملاحظہ کیجیے ؎

یہاں تک ہم کو محتاجی ہوئی یورپ کی ہر فن میں　　　کہ زیور ہو گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں

نہ پیسہ ہے نہ کوڑی ہے نہ ہے علم و ہنر باقی　　　مگر پھر بھی مرے مٹتے ہیں ہم فیشن ہی فیشن میں

شوخی ہے نہ رنگینی فقط اک نام رنگیں ہے　　　عجب بودی طبیعت پائی ہے تو نے تو رنگین میں

جس دل میں بحرِ حبِ وطن موج زن ہوا　　　اس دل سے ہے بعید کہ ارماں کسی کا ہو

یارب یہ ہند اہلِ جہاں کی ہو درسگاہ　　　سابق کی طرح پھر یہ دبستاں کسی کا ہو

نشتر جو دردِ دل کی دوا چاہتا ہے تو　　　بہتر ہے یہ کہ درد میں درماں کسی کا ہو

جناب معزالدین شائق کی غزل۔ نظم نما ہے اور تعلیم و ترقی کی تبلیغ و تلقین اس کا موضوع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمیس وقت کی تحریک بڑی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ شائق صاحب نے یہ "قطعہ" "غزل" سے پہلے درج کیا ہے ؎

وہ لکھو جو شاعری ہے کام کی　　　چھوڑ دو باتیں گل و گلفام کی

وقت ضائع کر چکے آغاز میں　　　اب تو کچھ سوچو ذرا انجام کی

ان کی غزل کا مطلع و مقطع حسبِ ذیل ہے ؎

ترقی جس قدر ممکن ہو کیجیے ایجوکیشن میں　　　کہ جس سے خود بخود ہو جائے گی اصلاح فیشن میں

جنھیں کچھ حس نہیں ہے گردشِ دوراں کی اے شائق　　　انھیں کہہ دو کریں آرام جا کے کنجِ مدفن میں

جناب صادق علی خاں بین کا، تلمیذ حضرت کیفؔ کی غزل کا رنگ قدیم ہے۔ مطلع و مقطع سن لیجئے ؎

ان بتوں نے ڈھنگ کچھ یوں کبریائی کے لئے　　　ہوں خدا جیسے یہ ساری خدائی کے لئے
سلطنت تو جیب ہے کہ صادق ساری دنیا ایک ہو　　　اور بھوانی سنگھ ہوں فرماں روائی کے لئے

حضرت نیرنگ اور جناب کیفؔ ٹونکی کی غزلیں کلاسیکل ہیں استادانہ کمالات کی حامل ہیں ؎

لحد کی منزل مشکل گذار باقی ہے　　　یہی تو مرحلۂ گیر و دار باقی ہے
نظر نہ آئے گا نا صاف دلیں جلوۂ یار　　　کہ آئینہ میں ہمارے غبار باقی ہے
اسی کو روح سمجھ باغ زندگانی کی　　　ترے شباب کی جو یک بہار باقی ہے
ذرا سی آہ میں نیرنگ ہل گئے افلاک　　　ہنوز گریۂ بے اختیار باقی ہے

کاغذ دیمک خوردہ ہے اس لئے بقیہ دو اشعار نہیں لکھے جا سکے۔ جناب کیفؔ کی ۱۲ اشعار کی غزل ہے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

پھر رہا ہے تیرے بام کبریائی کے لئے　　　چرخ کو زینہ نہیں ملتا رسائی کے لئے
تو وہ داتا ہے کہ تو نے سب کو بے مانگے دیا　　　تھی کہاں روز ازل جھولی گدائی کے لئے
یہ سنا ہے دست رحمت بڑھ کے ہوگا دستگیر　　　اس لئے سر پہ قدم میں نے برائی کے لئے
جلوہ گر ہر شئے میں ہے لیکن نظر آتا نہیں　　　تو ہے پردے کے لئے یا خود نمائی کے لئے
بے کہے سنتا ہے وہ کہنے کی کچھ حاجت نہیں　　　کہہ دو مژدہ ہے یہ میری بے نوائی کے لئے
آسماں نے ہر طرف دیکھا جو تیرا آستاں　　　جھک پڑا ہر سوز میں یہ جبہ سائی کے لئے
بس وہی پورا کرے گا کیفؔ میرا ہر سوال　　　جس کے در پر دونوں عالم ہیں گدائی کے لئے

۲۔ رسالہ "مسیحائے زماں" تجارہ (گورنمنٹ الور) (راجپوتانہ کا سب سے پہلا ماہواری علمی ادبی اور طبی رسالہ)

یہ دعوی کہ رسالہ "مسیحائے زماں" راجپوتانہ کا سب سے پہلا ماہواری علمی، ادبی اور طبی رسالہ ہے۔ میرا نہیں ہے۔ خود رسالہ مذکور کا ہے جس کا سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ ہے۔ سفید کاغذ ہے "مطبع محبوب المطابع برقی پریس دہلی" میں صرف "ٹائٹل چھپا۔" ٹائٹل سادہ ہے۔ سب سے اوپر کی سطر میں دائیں طرف "ھوالشافی" مرقوم ہے کچھ جگہ چھوڑ کر "حسب منظوری گورنمنٹ الور" لکھا ہوا ہے۔ بائیں کونے میں "رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۳" درج ہے۔ تعداد اشاعت ۳۰۰۰ اور قیمت سالانہ پیشگی دو روپے ہے۔ "مسیحائے زماں" موٹے قلم سے تحریر ہے نیچے لکھا ہے "جو زیر ادارت جناب حکیم قاضی سید محمد کرم حسین صاحب مصنف کتب طبیہ و دیگر علوم و فنون و مالک دواخانہ شفاء الامراض تجارہ گورنمنٹ الور صوبہ راجپوتانہ سے شائع ہوتا ہے" ٹائٹل کے بعد کے صفحہ سے ظاہر ہے کہ یہ شمارہ "بابت ماہ بائے

اپریل مئی جون ۱۹۲۹ء" ہے اسی صفحہ پر یہ عبارت بھی درج ہے :۔

"تیسرا سال ہے کہ یہ رسالہ صحت وری مزاج ہر قوم و ہر مذہب کے لئے جاری کیا ہے اور روز بروز اس کی اشاعت ترقی کر رہی ہے۔ رسالہ مذا پانچ ہزار کی تعداد سے چھپا ہے۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ ہر ایک گھر میں موجود رہے ہر روز نہیں تو اس وقت ضرور دیکھا جائے جبکہ ہر کوئی خاتون استقرار حمل سے مالا مال ہو۔ اس سے حاملہ خاتون وضع حمل تک تندرست اور خوش و خرم رہے گی اور بچہ بآسانی ولادت پاکر زچگی میں اچھا رہے گا اور عمر درازی کو پہنچے گا۔ زچہ بھی زچگی بخیریت فراغت حاصل کر کے باہر آئے گی۔ اسی طرح ہر ماہ کے رسالہ میں تندرستی سے زندگی گذارنے کے مضامین ہوتے ہیں ہر صاحب اولاد کو اس کا خریدار ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپے سالانہ اہل ملک سے اور چار روپے سالانہ غیر ممالک سے مقرر ہے"

اس کے نیچے آخری سطر ذرا جلی قلم سے درج ہے" دیو بید یال پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپا"

ریاست الور کا قدرے ادبی تعارف اس موقع پر غالباً بیجا نہ ہوگا۔ یہ ریاست ایک راجپوت پرتاب سنگھ کے ذریعہ وجود میں آئی۔ جے پور اور بھرت پور دونوں ریاستوں کے کچھ حصوں پر اس نے قبضہ کر کے ریاست الور کی بنیاد ڈالی۔ اس کے ساتھ سات مسلمان اور رفقا۔ لارڈ لیک سے معاہدہ کے وقت ان میں سے چھ مسلمان حصہ داروں نے خود کو دستبردار کر لیا۔ ساتویں حصہ دار محمد بخش نے اپنا حصہ ڈھائی پرگنہ علیحدہ کر کے ریاست لوہارو کی بنیاد ڈالی۔ ان چھ حصہ داروں کے ساتھ پرتاب سنگھ نے محسن کشی کی، انھیں زہر دیکر مروا ڈالا۔ تاہم فتوحات میں ان مسلمانوں کی شرکت نے کاروبار ریاست کو ایک مدت تک اپنے اثرات میں رکھا۔ ۱۸۵۸ء تک سرکاری زبان فارسی رہی۔ راجہ منگل سنگھ نے دور حکومت میں فارسی کے بجائے اردو، حکومت کی زبان مقرر ہوئی۔ ۱۹۱۰ء تک یہ زبان اپنی آب و تاب کے ساتھ راج کرتی رہی۔ مہاراجہ جے سنگھ کی مسند نشینی کے موقع پر مدن موہن مالویہ کی تحریک پر اردو کے بجائے ہندی، حکومت کی زبان بنی۔ کیونکہ پنڈت مالویہ نے برہمن کی حیثیت سے یہی دکشنا مانگی تھی اور یہی تلقین کی تھی کہ ایک ہندو راجہ کا دھرم یہی ہے کہ وہ اپنی مذہبی زبان کو فنا نہ ہونے دے۔ اس ترغیب سے مہاراجہ نے ایسا کچھ اثر لیا کہ ایک ہفتہ میں تمام ملازمین کو ہندی سیکھ لینے ورنہ اپنے آپ کو برطرف سمجھنے کے احکام نافذ کر دئے۔ اس کے بعد اگرچہ رسم الخط ہندی رہا۔ تاہم اردو و فارسی کے الفاظ سرکاری و درباری تحریرات میں مسند نشیں رہے۔ ۱۹۲۱ء کے بعد سے انھیں دیس نکالا دیا جانے لگا۔ اور ان کے بجائے چن چن کر سنسکرت الفاظ کا استعمال ہونے لگا۔ قانونی اصطلاحات بدل دی گئیں۔ دفاتر اور مدارس سے اردو زبردستی نکالی جانے لگی اور اب اردو کا مستقبل اب وہاں بالکل تاریکی میں ہے۔

لیکن رؤسا ماسبق کی فارسی نوازی اور اردو پرستی سے مجال انکار نہیں۔ مہاراجہ بنے سنگھ کے عہد حکومت میں یہاں علما و فضلا اور ادبا و شعرا کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا کہ لوگ الور کو چھوٹی دلّی کہتے تھے۔ الور دلّی سے قریب تھا

غدر کے بہت سے لٹے پٹے ارباب کمال یہاں آکر پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ مرزا غالب بھی الور سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ نے یہیں وفات پائی۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ الور کے مہاراجہ شیودھان سنگھ نے ظہیر، تصویر و تشنہ، شاگردانِ ذوق، میر مجروح اور سالک شاگردان غالب کی بڑی قدر کی۔ مہاراج موصوف نے مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب کو بھی اپنے یہاں بلا لیا تھا۔ منیر شکوہ آبادی مرحوم کے حالات میں لکھا ہے کہ راجہ الور (اور رئیس دھولپور) نے انھیں بلوایا مگر وہ وہاں نہیں گئے۔ منیر مرحوم لکھتے ہیں کہ دل نے گوارا نہیں کیا کہ بقیہ عمر ان بلاد عجیبہ میں سپرد انحطاط کی جائے (اگرچہ ان کا یہ خیال درست نہ تھا کہ ان کی بقیہ عمر وہاں سپرد انحطاط ہوتی) اس واقعہ سے بھی مہاراجہ الور کی شاعر نوازی ظاہر ہوتی ہے۔ مہاراجہ بنے سنگھ نے نہ صرف غدر کے لٹے پٹے ارباب کمال کو پناہ دی بلکہ شاہی کتب خانوں کے قلمی مسودوں، نادر کتابوں اور گراں بہا مطبوعات و مخطوطات کو جمع کر کے بڑا قیمتی کتب خانہ فراہم کر لیا۔ مہاراجہ جے سنگھ جن کے زمانے میں اردو کا اخراج ہوا فارسی و اردو کے بڑے عالم تھے، ہندی بہت کم جانتے تھے۔ اردو کے لئے یہ سانحہ ہمیشہ دردناک رہا ہے کہ اس کے گھر پر اس کے دوستوں ہی نے خنجر پھیرا ہے۔ جھالاواڑ کے راج رانا بھوانی سنگھ بھی اردو کے دلدادہ تھے لیکن سرکار و دربار سے انھیں کے زمانے میں اردو کا اخراج ہوا۔ اگرچہ وہ بعد میں بھی اردو نوازی کرتے رہے۔ یہی حال الور کے مہاراجہ جے سنگھ کا رہا ــــ انھوں اردو فارسی کی نایاب کتابیں حاصل کرنے میں ہزاروں روپے خرچ کئے۔ اصل کتابیں نہ مل سکیں تو نقلیں حاصل کیں اور انھیں اپنے کتب خانہ کی زینت بنایا۔ ادبا و فضلا میں حسب ذیل نام ریاست الور کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ مولنا رکن الدین میر مہدی مجروح، منشی گوپال کرشن تحسین، حکیم سید وزیر علی شیدا، قاضی امداد علی جمالی، مرزا قربان علی بیگ سالک۔ منشی ہیرالال شہرت۔ تین عیسائی شاعروں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ الیگزنڈر ہیڈرلی آزاد۔ ۱۸۶۳ء میں ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا۔ مسٹر جارج شور ۱۸۷۰ء میں "دیوان شور" کے نام سے ان کا کلام چھپا۔ ۱۸۸۰ء مسٹر جوزف فنا کا مجموعہ "دیوان فنا" کے نام سے منظر عام آیا۔ مہاراجہ جے سنگھ، وحشت تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا اور شعرائے ہند کا منتخبہ کلام "انجمن وحشت" کے نام سے ۱۹۱۵ء میں شائع کرایا۔ علاوہ ازیں "چمن وحشت" کے نام سے مہاراجہ نے دو جلدوں میں شعرائے ہند کا انتخاب اور بھی چھپوایا۔ "مرآۃ الہند" الور ہی کی تصنیف ہے جسے ۱۸۵۵ء عیسوی میں حکیم سید وزیر علی خاں شیدا نے تحریر کیا اور ۱۸۵۶ء میں چھپوایا۔

"مسیحائے زماں" کو گورنمنٹ الور کی منظوری حاصل تھی، وہ پانچ ہزار کی تعداد میں چھپا یقیناً اس کی پذیرائی پر دلالت کرتا ہے۔ نیز اردو نوازوں کی قدر دانی کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ صفحہ ۲ پر "ولادت فرزند ارجمند" کے عنوان سے حسب ذیل مسدس درج ہے جس کے چھ بند ہیں۔

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر — راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر — نکہت کوئی بوئے گل تر سے نہیں بہتر

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے　وہ گل ہے کہ گھر رشک گلستاں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے　آبادیٔ کاشانۂ انساں ہے اسی سے
کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ ہے وہ عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے　یہ وہ نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُر نور مکاں رہتا ہے جس سے　وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے
کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

آپ کی اجازت سے بقیہ تین بند اور درج کر رہا ہوں جن میں جذبات کی وہی صداقت ہے۔ خیالات کی وہی رفعت وہی صدق مقالی وہی ارفع خیالی۔

صولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے　ثروت یہی حشمت یہی، اقبال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے　گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے
دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے　تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے　ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے
آرام جگر قوت دل راحت جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی در پہ کھڑی رہتی ہو جس سے　وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہو جس سے
وہ لعل ہے امید بڑی رہتی ہے جس سے　وہ دُر ہے کہ در جان لڑی رہتی ہو جس سے
آرام جگر تاب و تواں ساتھ ہے اس کے
پھرتا ہے جدھر رشتۂ جاں ہاتھ ہے اس کے

حقیقت یہ ہے کہ مدیر رسالہ کے یہاں پوتا ہوا ہے۔ یہ اس کی مسرت و بشاشت میں پھولے نہیں سما رہے ہیں اگلے صفحات اسی خوشی و خوش خبری سے بھرے پڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں پوتا مل جانے کا بڑا زبردست ارمان تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

شب پنجم ماہ محرم ۱۳۴۲ھ وقت خواب، خیال ذکر اشتغال ذوالجلال کی طرف متوجہ تھا کہ یکایک حضرت غوث پاک کی طرف متوجہ ہوا اور زبان سے یہ نکلا کہ اے خدا خالق عالم اس بندۂ ناچیز عاجز و مسکین کی عمر ۶۲ سال کی ہوگئی ہے اگر پہلی اولاد زندہ رہتی تو اب تک پوتا پوتی سے دل کو خورسندی حاصل ہوتی جیسا تیرا اور فضل و کرم ہے اگر ایک پوتے سے بھی خوش و خرم فرمائے تو تیری بندہ نوازی کا بدرجہ اتم شکریہ ادا کرے گا ــــ سبحان اللہ صلی علی المصطفےٰ صبح بعد ادائے ورد و وظائف والدی مولوی مسعود نے یہ خوشخبری سنائی کہ تمہاری بہو خوش تو کے یاں بچہ ہونے کی امید ہے اس نوید مسرت جاوید سے شکر رب اکبر ادا کیا اور ؎

ہوا دل خوشی سے بہت باغ باغ　　　طراوت سے نزہت سے تازہ دماغ

اس کے بعد "عزیزہ صاحبہ تمیزہ" (بہو) کی سعادت مندیوں کا ذکر ہے۔ ولادت سعید کی خوش خبری کا بیان۔ بچے کے کان میں اذان و اقامت کہے جانے، لوگوں کے مبارک باد دینے اور بیند وقیں چھٹرانے کا مفصل تذکرہ ہے۔ "عقیقہ مبارک تمیقہ" کا تفصیلی بیان ہے۔ شرکائے جشن کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ ہدیۂ تہنیت مبارک مسرت کے عنوان سے وہ نظم تحریر ہے جو اس جشن کے موقع پر سنائی گئی۔ مدیر اس قدر دل شاد اور باغ باغ ہیں کہ انہوں نے اس پوتے کے باپ یعنی اپنے لڑکے محمد عتیق القادر کی تین سال پہلے کی شادی کا پورا تفصیلی ذکر اس موقع پر کر دیا ہے۔ بارات کا تجارہ سے روانہ ہونا۔ بھوپال تک راستے کی مفصل کیفیات۔ عقد کا حال۔ سمدھی کے یہاں کے حالات۔ بارات کی واپسی۔ ڈولہ کا گھر میں لینا۔ بارات میں شریک ہونے والوں کے نام۔ راستہ میں مہمان داری اور خاطر کرنیوالوں کے نام۔ منظوم دعوت نامہ، منظوم مبارکبادیں، سہرا اور قصیدہ سب کچھ طول بیانی کے ساتھ درج ہے۔ منظوم دعوت نامہ کے آخری اشعار یہ ہیں ؎

عرض احباب سے یہ ہے کہ بصد عجز و نیاز　　　اب کریں اپنے قدم سے مری آنکھیں ممتاز
اتنی تکلیف جو احباب گوارا کرلیں !　　　قدم میمنت افزود سے عزت بخشیں !
لا کے تشریف کریں آپ سرافراز مجھے　　　آپ کے آنے سے مل جائیگا اعزاز مجھے
اس عنایت سے مرے دل کو مسرت ہوگی　　　آپ کے آنے سے اس بزم کو زینت ہوگی

لڑکی والوں کے منظوم دعوت نامہ کے آخری اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

راحت جاں عتیق کے ہمراہ　　　عقد ہوگا عزیزہ بیگم کا
جمعہ کا دن ہے گیارہویں تاریخ　　　اور مہینہ ربیع الآخر کا
آپ بھوپال لایئے تشریف　　　ہوں عزیز و یگانہ بزم افزا

سب اقارب کو ساتھ میں لیکر — عرصے تک یہاں ہوں جلوہ فزا

مہربانی سے کیجئے منظور — مرحمت جلد ہو جواب اس کا

یہ دعائے منیر ہے ہر دم

روز افزوں ہوں ان پہ فضل خدا

جن لوگوں نے خطوط کے ذریعے مبارک باد بھیجی ان کے اقتباسات موجود ہیں۔ اور ایسے ۲۸ خطوط ہیں۔ شرکت ا رسم میں شرکت کرنے والوں کے "اسمائے گرامی" لکھے ہوئے ہیں۔ بچے کو انھوں نے جو کچھ دیا ہے اس کا بھی ذکر ہے اور اُن اشخاص کی فہرست بھی درج ہے جن کے یہاں اس سال اولاد نرینہ پیدا ہوئی۔ تقسیم شیرینی کا باب اس شعر پر ختم ہوا۔ ؎

دعا پر مختصر کرتا ہے اس مضمون کو اب شہرت — رہے سایہ ہمیشہ ان کے سر پر رب اکبر کا

ان کیفیات و حالات کے خاتمہ پر درج ہے کہ نیاز مندی و محبت روحی کی بنا پر احقر استحقاق رکھتا ہے کہ رسالہ کے ناظرین با تمکین سے مبارک بادی اور عمر کی درازی کی دعا کرے ؎

خدا را تو ایں سال فرخندہ را — مبارک کن و نیک صحت فزا

حاجی محمد زبیر مدرس مدرسہ ریاست بھوپال نے بچے کے کئی تاریخی نام تجویز کر کے اپنے مکتوب میں لکھ کر بھیجے ہیں۔ ولادت کے قطعات و مادہ ہائے تاریخ بہت درج ہیں۔ کچھ بڑے برجستہ ہیں ؎

بیاض دیدۂ اجلال و دولت — ۱۳۴۷ھ

چراغ زندگانی - نور الابصار — ۱۹۲۹ء

انیس جاں - چراغ شادمانی — ۱۹۲۹ء

دُرِ یکتا - گل گلزار ابرار — ۱۳۴۷ھ

تلاطم میں جب آیا بحر تاریخ — کہا ہاتف نے لکھ دے دُرِ شہوار ۱۳۴۷ھ

می کند بلبل بیا بیں گل نثار — گفت گل سرو رواں نور نظر ۱۹۲۹ء

چوں فکر سال نمودہ بگفت ایں ہاتف — محمد مظہر علی نام آں خلیق آمد

۱۳۴۷ھ

ایک مبارک باد بزبان میواتی بھی درج ہے۔ ایک "ہدیۂ مبارکباد" میں حکیم قاضی سید محمد کرم حسین مدیر رسالہ بڑی خوش بیرائیگی کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ پوتے کا حصول آپ کی نیکیوں اور نیک اعمالیوں کے تحت ہے۔ سید اختر اوری اس نظم کے پیش کنندہ ہیں ؎

عجب نقد سودا ہے بازار کا — ذرا سوچ کر ہے یہ بیوپار کا

جو اس ہاتھ دیتا ہے اس ہاتھ لے — کرے دن کو شب کو مکافات لے
برائی کرے تو برائی ملے — بھلائی کرے تو بھلائی ملے
حقیقت میں جس نے ارادہ کیا — پئے خدمت بندگانِ خدا
تو کرتا ہے خالق اسے سرفراز — وہ پاتا ہے اعزاز اور امتیاز
کرے راہ مولا میں جو زر نثار — تو زر اس کو دیتا ہے پروردگار
کسی کی تمنا جو بر لائے گا — وہ بے شک مراد اپنی بھی پائے گا
کسی زخم دل پر جو مرہم رکھے — جو دل میں غم کشتۂ غم رکھے
تو بے شک وہ دل شاد و مسرور ہو — غم و درد و آلام سے دور ہو
بلاریب اے شیخ حکمت مآب — ترے دم سے مخلوق ہے فیض یاب
جو گمراہ ہیں ان کا تو رہنما — جو بے علم ہیں ان کا تو آسرا
شکستہ دلوں کا سہارا ہے تو — جو بیچارہ ہیں ان کا چارہ ہے تو
جو ہیں غمزدہ عید ان کی ہے تو — جو مایوس امید ان کی ہے تو
بجے کیوں نہ ڈنکا ترے نام کا — کہ گھر گھر چرچا ہے ترے کام کا
ریاست کو تجھ پر بجا ناز ہے — کہ تجھ سے ہی اور سرافراز ہے
نہیں میری باتوں میں شامل دروغ — تجارہ نے پایا تجھی سے فروغ
جو تجھ سے ہوئیں عمر بھر نیکیاں — ہوئیں آج وہ بار ور نیکیاں
ملا پور کو پور فرخ لقا — جو ارمان تھا دل میں پورا ہوا
نصیبہ ہوا یاور قسمت رفیق — بنے باپ حافظ محمد عتیق!
مبارک ہو مخدوم فرخ شیم — عطایہ عطا اور کرم پر کرم

"بچے کی پرورش" اور "تربیت اولاد" کے عنوان سے دو بڑے مفید معلوماتی مضامین درج ہیں۔
اشتہارات میں قابل توجہ اشتہار "دین و دنیا" بڑی تقطیع کے مصور اور اعلیٰ ماہواری رسالے کے متعلق منیجر دین و دنیا خواجہ بک ڈپو دہلی کا ہے۔ ۴۶ صفحات اس رسالہ مسیحائے زماں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ بعد میں فہرست ادویات دوا خانہ شفاء الامراض تجارہ ہے جس کے مالک ہی حکیم قاضی سید محمد کرم حسین ایڈیٹر رسالہ مسیحائے زماں تجارہ ہیں۔ پچاس صفحات اس فہرست نے لئے ہیں۔ رسالہ مسیحائے زماں ماہنامہ ہے کیونکہ "نرخنامہ چھپائی اشتہارات" میں بارہ اشاعتوں، چھ اشاعتوں، تین اشاعتوں اور ایک اشاعت کے نرخ کا علیحدہ علیحدہ اندراج ہے۔ زیر نظر

شمارہ تین مہینہ کا ایک مشترک شمارہ ہے۔ اور چونکہ جریدہ مدیر کی "ولادت باسعادت" کے حالات پر ہی مشتمل ہے اس لئے صحیح طور پر اس کی علمی و ادبی حیثیت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ شاید اور کوئی صاحب اس کے ملاحظہ کے بعد کسی دیگر شمارہ سے اس پر روشنی ڈال سکیں تاہم ادبی حیثیت مندرجات بالا سے جو کچھ کی جاسکتی ہے، وہ راجپوتانہ میں اردو کی گیرائی و پذیرائی کو واضح کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ یوں طبی سے اس رسالہ کی افادیت میں شک کی قطعاً گنجائش نہیں۔

(۳) "رسالہ و اخبارات زندگی" کوٹہ (راجپوتانہ)

معاشرہ کی اصلاح کے سلسلہ میں اس پہلو کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ جزوی طور پر اصلاح کرنے سے اس کے ہر گوشہ کی خامیوں پر نظر جا پہنچتی ہے اور ہر چھوٹی بڑی برائی پر مکمل توجہ دی جاسکتی ہے اپنے ماحول کی فلاح و اصلاح کا درد رکھنے والوں نے ایسے چھوٹے پیمانے پر کوششیں شروع کیں اور اس میں کام ہوئے مختلف فرقوں، گروہوں اور طبقوں میں ایسی مساعی جمیلہ آج بھی جاری ہیں اور یہ تحریکیں، انھیں مصلحین کی سرپرستی میں زیادہ مفید و موثر طور پر چل رہی ہیں، جو اس فرقہ اور طبقہ سے اندرونی و بیرونی طور پر باخبر ہیں۔ ان کے مزاج و ماحول سے واقف ہیں اور اس کی سیرت و سرشت سے آگاہی رکھتے ہیں ان تحریکوں کو منسوب و متعلق کر دیا ہے۔ اس ملک، قوم، فرقہ اور طبقہ سے جس کی درستی و برتری مقصود ہوتی ہے۔ عقیدہ و خیال، مسلک و مذہب کی تبلیغ و تلقین بھی ایسی تحریکوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ آریہ گزٹ، آرین سندیش، کائستھ گزٹ، کھنڈیل وال پتریکا، ہماری زبان، مولوی، اہل حدیث، اودھ پنچ، آندھرا پردیش، ندائے اتحاد، ندائے ملت، پیام تعلیم، روہیلکھنڈ اخبار، بہار کی خبریں، فروغ اردو، کسان سندیش، سوشلسٹ سماچار، ہمدرد صحت، ہندوستان طلب وغیرہ وغیرہ یہ سب ان تحریکات کی نمائندگی و ترجمانی کرتے ہیں۔ جو مخصوص نصب العین اور مخصوص نظریہ کے تحت میں آئیں۔ مقصود ان سب کا، اپنے معاشرہ اور سوسائٹی، صوبہ و ملک، فرقہ و طبقہ، نظریہ و عقیدہ کی اصلاح و درستی نمائندگی و رہنمائی اور ارتقاء و ارتفاع ہے۔ یقیناً ان کی وسعت محدود اور مقبولیت مخصوص ہوتی ہے۔ لیکن جزو نہ کل سے بے نیاز ہو سکتا ہے نہ کل جزو سے قطع تعلق کر سکتا ہے۔ جزوی اصلاحیں کل کی خوبیوں کو جلا بخشتی ہیں۔ اور کل کی فیض رسانی سے جزو کا دامن مالا مال ہوتا ہے۔ اس ربط و تعلق سے مجال انکار نہیں۔ اسی اصول کے تحت مصلحین کی جماعتی و طبقاتی کوششیں اگرچہ مخصوص سہی، تاہم نہ غیر موثر ہوتی ہیں۔ نہ قطع نظر کئے جانے کے قابل گویہ پذیرائی کی مستحق بھی ہیں اور حوصلہ افزائی کی بھی۔ ایسے حوصلہ مند اصحاب نہ صرف اس ماحول و معاشرہ میں نیکیاں، اور خوبیاں پھیلاتے ہیں بلکہ اس زبان و بیان میں بھی چار چاند لگاتے ہیں جسے یہ اپنے مقصد کے لئے منتخب کر لیتے ہیں۔ اردو زبان نے ایسی خدمتیں بہت انجام دی ہیں۔ اس نے ہر عقیدہ و مسلک، ہر

زہد وطبقہ اور بہ تحریک وتلقین کا ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے دیا ہے۔ اس کا خزانہ ایسے گوہر پاروں سے مالا مال ہے۔ ایسی آب تابانیوں اور توانائیوں کے ساتھ یہ آج بھی زندہ وتابندہ ہے۔ شاداب و پُربہار ہے اور اس کا یہ فیض یقیناً آئندہ بھی جاری رہیگا۔

رسالہ "نوربات زندگی" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اگرچہ مخصوص فرقہ کی اصلاح کے لئے وجود میں آیا تھا، لیکن یہ جزو اپنے کل سے قطعاً غیر متعلق نہ تھا۔ مدیر کے اغراض و مقاصد سے ظاہر ہے کہ اس فرقہ کی تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کی ترقی و اصلاح کرنا، ادبی و اخلاقی اور تاریخی مضامین شائع کرکے ان کی غفلت و بے حسی کو دور کرنا۔ ان میں علمی ذوق پیدا کرنا۔ نیز فضول رسومات اور بے جا اسراف سے بچانا اور کفایت شعاری کی ترغیب وتعلیم دینا اس کے نصب العین میں تھا۔ لیکن غرض ۲ میں درج ہے :۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں جو بہ اعتبار قومیت تفاخر وتنافر پیدا ہوگیا اس کو دفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی طرح غرض ۴ میں درج ہے :۔ اس قومی پرچہ کو کسی خاص فرقہ اسلامی کے عقائد و اعمال سے تعرض نہ ہوگا۔ بلکہ اسلامی تعلیمات قدر مشترک کے بطور اس کے مسلک میں رہیں گی۔ قواعد وضوابط حسب ذیل تھے :۔

۱۔ ہر عربی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ گم ہو جانے کی صورت میں یوم اشاعت سے ایک ہفتہ کے اندر اطلاع موصول ہونے پر دوبارہ ارسال خدمت ہوگا۔

۲۔ قیمت سالانہ دو روپے آٹھ آنے، مع محصول ڈاک، امراء و رؤسا و متمول اصحاب اپنی عالی ہمتی سے جو کچھ عنایت فرمادیں۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا چاہئے۔ ورنہ عدم جواب کی شکایت معاف۔

۴۔ کل خط وکتابت و ترسیل مضامین وقیمت وغیرہ بنام مدیر ہونی چاہئے۔

۵۔ نمونہ کا پرچہ ۴ کے ٹکٹ موصول ہونے پر روانہ کیا جائے گا۔

۶۔ خریدار حضرات خط وکتابت کے وقت اپنی خریداری نمبر ضرور لکھا کریں۔

۷۔ جو صاحب اس قومی رسالہ کو پندرہ خریدار مہیا کردیں گے۔ علاوہ شکریہ کے ایک سال تک رسالہ "نوربات زندگی" مفت ارسال ہوگا

پیش نظر رسالہ ماہ ذوالحجہ ۱۳۴۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۲۵ء کا ہے۔ کتابت وطباعت گوارا، سرورق دیدہ زیب۔ ٹائٹل کے آخری حصہ پر اشتہار ہے — "دس جواہر کا قرآن مجید بے مثل خوبیوں کا خزانہ، اس کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے — "متن اشتہار میں دسوں خوبیوں کا مفصل ذکر ہے ملنے کا پتہ منیجر حمیدیہ پریس دہلی" ہے۔ فہرست مضامین کے بعد والے صفحہ سے رسالہ شروع ہوتا ہے۔ جس پر صفحہ ۲ درج ہے۔ پہلے حمد باری تعالیٰ ہے ؎

کروں پہلے توحید یزداں رقم　　　جھکا جس کے سجدہ کو اول قلم

اس حمد کے ختم ہونے پر نعت ہے ؎

محمد پیشوا اور رہنمائے خلق و عالم ہیں ۔ معزز ہیں، مقدس ہیں معظم ہیں، مکرم ہیں

"اقتباسیہ و دعا" میں مدیر نے اپنے لئے جرأت و ہمت، اور اپنے اس پرچہ کے لئے زندگی و تابندگی بڑے خلوص سے چاہی ہے۔ "صدائے فریاد زندگی" میں اس رسالہ کے اغراض و مقاصد کی وضاحت ہے۔ چند ابتدائی سطریں ملاحظہ فرمائیے :-

"معزز ناظرین، ہندوستان میں تنظیم المسلمین کی تحریک جاری ہے۔ اور رہنمایان قوم و علمائے کرام تنظیم المسلمین کے پوری ساعی ہیں۔ خدا ان کی سعی کو جلد بار آور کرے۔ ساتھ ہی ان کے مسلمانوں کی دیگر اقوام بھی اپنی اپنی قوم کی اصلاح میں منہمک ہیں اور اخبارات و رسائل کے ذریعے، نیز دیگر طریق سے اپنی اپنی قوم کی اصلاح فرما رہے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے قومیت وار تنظیم زیادہ مفید ثابت ہوگی اور عام تنظیم المسلمین سے زیادہ تر کامیابی قومی تنظیم سے ہو سکتی ہے کہ جس میں ہر ایک قوم اور قوم کے ہر ایک فرد کو کام کرنے کا کافی موقع مل سکتا ہے اور ہر فرد کی کامل دلچسپی کا ذریعہ کامیابی کا یقینی باعث ہوتا ہے"

"قوم سے خطاب" میں بزرگان قوم کو اصلاح و عمل کے لئے بڑے خلوص سے جھنجھوڑا ہے۔ الفاظ میں بڑا درد ہے۔ لب و لہجہ میں بڑا سوز ہے۔ اس مضمون کو اس شعر سے شروع کیا ہے ؎

عجب ... سے سخت اندر دل اگر گویم زباں سوزد ۔ اگر خاموش می مانم بترسم استخواں سوزد

یہ مضمون اس شعر کی مکمل تفسیر ہے کچھ جستہ جستہ فقرے ملاحظہ کیجئے :-

اسمیں شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ ہماری قوم بلکہ جمیع مسلمانان کی تباہی و بربادی کے اسباب زیادہ تر دو ہیں :-
اسراف بیجا و تفاخر ان دو اسباب کی بدولت ہماری قوم محض ناکارہ ہو گئی ہے ... مجھے اس جگہ ہنود کی ایک قوم کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے تاکہ ہمارے بھائی عبرت حاصل کریں اور اسراف بیجا و تفاخر جو امراض مہلک ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کریں ..... قوم کائستھ ایک نہایت بیدار اور قابل تقلید قوم واقع ہوئی ہے کہ جس نے شادی و غمی وغیرہ کے مواقع پر ادائے رسومات کے لئے قوانین بنا رکھے ہیں۔ کیسا ہی امیر اور صاحب عہدہ و باہمت کیوں نہ ہو۔ وہ تقریبات پر برادری کے قوانین سے زیادہ رقم صرف نہیں کریگا۔"

ہمدردان اسلام متوجہ ہوں" میں انھیں خیالات اسراف بیجا و تفاخر کو ذرا وسیع پیمانہ پر پھیلا کر سمجھایا ہے۔ ماضی و حال کا مقابلہ بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ اس مضمون کے کچھ اشعار سے اس کے پُر زور، موثر و مفید ہونے کا پتہ چل سکے گا ؎

تماشوں میں ثروت بڑوں کی اڑائی ۔ نمائش میں دولت خدا کی لٹائی
چھٹی بیاہ میں کرتے لاکھوں کے ساماں ۔ یہ ہیں ان کی خوشیاں یہ ہیں ان کے ارماں

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے		کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکام دیں پر جھکا دینے والے		خدا کے لئے گھر لٹا دینے والے

قابل شرم ہیں دیہات کے اہل اسلام		دیکھنے سے انھیں ہوتی ہے ندامت کیسی
ہر مسلمان کو لازم ہے تدارک اس کا!		منصفی شرط کہ ہے اس کی ضرورت کیسی
ہاں خبردار کہ اب وقت عمل آ پہنچا		دیکھنا یہ ہے کہ ہے آپ کی ہمت کیسی

ریفارمر بنے ہو لیکن فقط زبانی		کچھ کر کے بھی دکھا دو۔ باتیں بنانے والو
طوفان بدتمیزی اب قوم پر ہے آیا		اب ڈوبتا ہے بیڑا پہنچو بچانے والو

"اہل اسلام کی حالت" میں بھی اصلاح و ارتقا رہی خروش، یہی سوز اور یہی جوش و سیع پیمانے پر ہے۔ اسلام کی سیدھی سادی زندگی اور اس کے احکامات شادی و غمی کا ذکر ہے۔ اس کے مقابلہ میں موجودہ رسومات ہیں۔ مہندی۔ سہرا۔ مقنع۔ جلوہ۔ چھٹی۔ باجا گاجا' اور اس کے مصارف اخراجات کا بیان ہے "ہم کہتے ہیں کہ مخلوق کی خوشنودگی اور رضاجوئی کی خاطر خالق کی نافرمانی کرنی کہاں کی مسلمانی ہے۔" اور رسم و رواج بنانے روزگار کو حکم خدا و رسول پر مقدم قرار دیا۔ کہاں کا اسلام ہے۔" لا طاعۃ المخلوق فی معصیت الخالق" احکام شریعت پر عمل پیرا ہو کر اپنی عزت اور اسلام کو بچانا نہایت ضروری ہے۔

قرب قیامت اور لوگوں کی غفلت۔ مدیر محترم فرماتے ہیں :-

گھڑی کی چھوٹی بڑی سوئی کی حرکت اور چال کو دیکھ کر ہم بہت خوش ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اگر ہم اپنے حساب کے وقت کو خیال کر کے کچھ متنبہ ہو جائیں تو بہت ہی بہتر ہے۔ کیا ہم ایسے محاسب و حاکم کے سامنے حساب لے جائیں گے جو ہماری زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اپنے منصرم سے جانچ کرائے گا۔ جس منصرم کو ہم رشوت دیکر یا خوشامد کر کے دعوتیں کھلا کر اپنی غلطیوں کو حاکم تک نہ جانے دیں گے۔ استغفر اللہ! اس کے پاس تو ہمارا حساب لکھا ہے۔ جس کو دیکھ کر لوگ چلا اٹھیں گے :" یہ تو عجب طرح کا اعمال نامہ ہے جس نے چھوٹے بڑے کسی کو نہ چھوڑا۔ سب کو گھیر رکھا ہے" غرض لوگ اپنے سب کاموں کو اس میں لکھا ہوا پائیں گے۔ اس کے سامنے ہماری کوئی چالاکی نہ چل سکے گی ؎

عمر برف است و آفتاب تموز		اند کے ماند و خواجہ غرہ ہنوز

ع۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ فَاِنَّ الْوَقْتَ سَیْفٌ قَاطِعٌ ؎

آگے کے دن پاچھے گئے ہر سو کیوں نہ ہیست		اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

اس شعر پر یہ مضمون ختم ہوتا ہے ؎

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر		زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

"حسن خلق" بھی مدیر محترم کا مضمون ہے۔ اور موضوع کی تفصیل و تفسیر کو اصحاب عظام اور اولیائے کرام کی مثالوں سے سجایا

ہے۔ شیخ سعدی کے اس قطعہ پر مضمون ختم ہوتا ہے

شنیدم کہ مردان راہ خدا	دل دشمناں ہم دکردند تنگ
ترا کے میسر شود این مقام	کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

ان مضامین سے واضح ہوگا کہ مدیر مرحوم اپنے ہم مذہبوں کو جزوی کلی طور پر اخلاقی و روحانی معاشرتی اور سماجی اعتبار سے طرح بیدار و خبردار اور تاباں و توانا کرنے کا درد و جوش اپنے دل میں رکھتے تھے ——— "درد دل کی فریاد" حافظ تاجی بارچہ کوٹہ راجپوتانہ کا مضمون ہے۔ سوز و گداز سے بھرپور اور خلوص و صداقت سے لبریز علمائے کرام کی زندگی متعدد مثالیں پیش کر کے مضمون کو بڑا مفید بنا دیا ہے ...... "کیا تم اس کا جواب اثبات میں دے سکتے ہو کہ کسی کے اوپر کے حصے والے نیچے والے حصہ کے سوراخ کا جس میں سمندر کا پانی جہاز کے اندر آ رہا ہے۔ انتظام کے بغیر جہاز غرق سے بچا سکتے ہیں؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا تو پھر میں پوچھتا ہوں تمہاری اس غفلت کا کیا باعث ہے؟"
یہ مضمون اس شعر پر ختم ہوا ہے ؎

از کرم بپذیر یارب! جوش بے اندازہ را	تا قیامت زندہ دار ایں زندگی تازہ را

"شرافت کیا ہے" میں مولینا ابو طاہر صاحب بہاری نے اسلامی نقطہ نظر سے تقوی و پرہیزگاری کی تفسیر کی ہے۔ مضمون کی قابلیت و علمیت میں شک نہیں۔ موضوع کو خوب نبھایا ہے۔ عربی اشعار بطور مثال پیش کئے ہیں۔ ابوا شاعر کا خلیفہ مہدی و خلیفہ ہادی کے دربار کا واقعہ بڑی عبرت انگیزی سے درج کیا ہے ——— "مسلمان اور افلاس" جناب صابر علی صابر نے تجارت کی فضیلت بتائی ہے اور اس طرف ہمیں رغبت دلائی ہے۔ ؎

وہ دین حجازی کا بیباک بیڑا	نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا	نہ عماں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا
کئے طے پئے سیر ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگائے آکر

"فضیلت انسان" چودھری محمد اسماعیل کا بڑا پُر فضیلت مضمون ہے۔ علم آموزی کی تلقین اس میں بڑے درد و خلوص سے ساتھ ہے ؎ بنی آدم از علم یابد کمال	نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

ہم اب رسالہ کے آخری صفحہ تک علی پہنچے ہیں۔ صفحات ۳۸۔۳۹ اور ۴۰ میں شعر و سخن کی بہار ہے۔ تاہم اسی نصب العین کے مطابق جو اس رسالہ کا مقصد اجرا ہے یہ ہمارا فیشن "از غلام دستگیر نامی لاہوری تعداد اشعار ۱۶ ؎

کر دیا ترک مسلمانوں نے اپنا فیشن	ہوا منظور نظر ان کو پرایا فیشن
ہو مسلمان تو اسلام کے ہم رنگ بنو	ماسوا اس کے تمہارا ہے نکما فیشن

نظم از سید حامد حسین صاحب الہ آبادی ؎

مسلمانو کہاں ہم میں ہے اب اگلی سی قربانی نہ وہ اگلی سی رونق ہے نہ وہ شان مسلمانی

۲۶ اشعار پر مشتمل یہ بڑی لمبی نظم ہے۔

"ہماری حالت" از جناب عبد الغنی مضطر مالیگانوی تعداد اشعار بارہ ؎

کینہ نہیں رکھتے ہیں کہ جھگڑا نہیں کرتے ہم اپنے ہی ہم قوم سے کیا کیا نہیں کرتے
کچھ صنعت و حرفت کا نہیں شوق دلوں میں بھولے سے ترقی کا ارادہ نہیں کرتے

"قوم کا خطاب جوانان قوم سے" از جناب مولوی عبد الغنی صاحب غنی ندوی تعداد اشعار ۹ ؎

لو اٹھو جاگو جوانو مدتوں تک سو چکے ہوش میں آؤ کہ اب سونے کے دن تو ہو چکے

اس رسالہ کا مقام اشاعت ــــــ محلہ رام پورہ کوٹہ راجپوتانہ تھا، مدیر محترم تھے مولوی محمد سلیمان جو ریاست کوٹہ کے محکمۂ تعلیم میں ملازم یعنی مدرس تھے۔ اردو کی ابتدائی جماعتیں پڑھاتے تھے۔ ٹھگنا قد، گٹھا جسم، صحت اچھی، سر پر صافہ یا اونچی باڑھ کی کلف لگی ہوئی جالی دار ٹوپی، تنگ۔ مہری کا پاجامہ۔ کرتا یا قمیص۔ اس پر شیروانی۔ پاؤں میں دیسی جوتہ۔ ڈاڑھی کے سفید بال، حنائی رنگ سے سرخرو رہتے تھے۔ باشرع و باشعور انسان۔ نفاست و لطافت، مزاج کا خصوصی جز۔ رفتار و گفتار کا انداز مخصوص دور سے دیکھ کر یا سن کر پہچانا جاسکتا تھا کہ ہاں مولوی صاحب ہیں۔ ۱۹۰۶ء سے اخبار بینی کا شوق تھا۔ اس لئے نشیب و فراز زمانہ سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ رفتار عالم سے آگاہ تھے۔ قوم کی محبت اور ملت سے انسیت فطری تھی۔ مدرسی کو بھی اصلاح قوم و بہبود ملت کا ذریعہ گردانا۔ شروع ہی سے بچوں کے دل و دماغ مستقبل کے لئے ہموار کئے۔ پنشن کے بعد بھی مدرسوں اور مکتبوں ہی کی جانب ملتفت رہے۔ کوٹہ میں غالباً ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں تحریک تعلیم کمیٹی کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مولوی صاحب نے پیرانہ سالی کے باوجود تمام اطراف و اکناف میں بڑی سرگرمی سے دورے کئے۔ اس سے انھیں مقامی خصوصاً دیہاتی مکتبوں اور مدرسوں کے جائزہ لینے کا زریں موقع ہاتھ لگا۔ جہاں جہاں پہنچے۔ چھوٹوں کی تربیت و تعلیم اور بڑوں کی تعمیر و تہذیب کے لئے انھوں نے تقریریں کیں۔ قوم کو تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ تباہ کن رسم و رواج کو ترک کرنے کی ترغیب دی۔ قوم کو غار مذلت سے نکالنے کا سودا انھیں ہمیشہ رہا اور تا حد امکان وہ اس میں سرگرم عمل رہے۔ یہ رسالہ اسی جذبہ کا شاخسانہ تھا۔ مولوی صاحب اردو کے پرستار و فداکار تھے۔ اردو کے متعلق اسکول سے اگر کسی معاملہ میں عدم توجہی برتی جاتی یا اور کوئی مشکلات آتیں مثلاً نصابی کتابوں کا وقت پر مہیا نہ ہونا۔ بچوں کے داخلہ میں الجھنیں۔ تو یہ سہولتیں بہم پہنچانے میں پیش پیش رہتے۔ اپنے افسروں تک سے اڑ جاتے۔ لڑجاتے۔ لیکن اردو کی حمایت سے باز نہ آتے۔ نجی طور پر عندالملاقات بچوں کے والدین سے بچوں کی تعلیمی خامیاں ظاہر کرتے۔ ان کی درستی کی طرف انھیں متوجہ کرتے۔ زیادہ دنوں تک غیر حاضر رہنے بچوں کو گھر سے بلوا لاکر۔ تو کبھی [illegible]

کبھی تنہا یہ دست دگرے دست بہ دست و گہے بغرض قہر و مہر دونوں استعمال کرتے۔ میں نے مرحوم کے پاس تعلیم نہیں پائی مرحوم میرے والد کے دوست اور میرے دوست کے والد تھے اس لئے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہمارے واش ہونے پر ہم نے ان کا مطالعہ کئی لحاظ سے کیا۔ ان کا سا خلوص، درد اور جوش آج ناپید ہے۔

مولوی صاحب بڑے اچھے خوش نویس تھے۔ اپنے طالب علموں کی خوش نویسی کی طرف بہت توجہ دیتے تختیوں پر خوب مشق کراتے تھے۔ اسکول کو یہ سجھاؤ انھوں نے ہی دیا تھا کہ اسکول ہی سے قلم قیمتاً مہیا کئے جائیں اسکول کو بھی کچھ فائدہ ہوگا۔ لڑکوں کو بھی قاعدہ کے قلم مہیا ہو جائیں گے۔ قلم خود بناتے بعض مرتبہ کالی سیاہی کرتے۔ وہ خود اردو و عربی عبارتیں بڑی دیدہ زیبی سے تحریر فرماتے تھے۔ میں نے اپنی لڑکیوں کی شادی میں آ رخصتی نظم کہی تھی اسے مولوی صاحب مرحوم ہی سے لکھوایا۔ شیشہ میں مڑھوا کر جہیز کے دیگر اسباب کے ساتھ یہ نظم بھی اب بھی جب اس پر نظر پڑ جاتی ہے مرحوم کی یاد سے دل بے ساختہ تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ نظم لیکر جب میں حاضر خدمت ہو اپنی خواہش ظاہر کی تو فرمایا کہ بینائی کی کمزوری کے باعث میں نے کافی دنوں سے شغل قرطاس و قلم قطعاً چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری خاطر سے یہ نظم ضرور لکھوں گا۔ اس احسان و مروت اور عنایت و شفقت کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔

انھوں نے ۱۹۳۷ء عیسوی میں "نعرہ بیداری" کے نام سے ایک سولہ صفحات کا کتابچہ شائع اور تقسیم کیا جس کا نعرہ رکھدیا ہے کلیجہ نکال کے" بقول ان کے۔ "یہ مسلمانوں کی دردبھری کہانی ایک پُر درد دل مسلمان کی زبانی تھی۔ د و ملت کی اصلاح کا جذبہ دینی ماحول؛ معاشرہ کی درستی کا جوش یہ جنون و سودا انھیں مرتے دم تک رہا۔ نعرۂ بیداری کے عنوانات ملاحظہ کیجئے جس سے اس کتابچہ کی اہمیت واضح ہو جائے گی :-

مسلمانوں کی حالت۔ بزرگان قوم سے خطاب۔ نوجوانان قوم و بزرگان قوم سے خطاب خطرے کی گھنٹی۔ اصلاح کے قابل اسباب۔ مسلمانوں کا دستور العمل کیا ہونا چاہئے۔ غیر شرعی رسومات۔ عقیقہ۔ ختنہ۔ بسم اللہ۔ منگنی۔ شادی۔ دعوت ولیمہ۔ رسومات غمی۔ شرعی رسومات کے اجراء کی صورت۔

مولوی صاحب کی شخصیت کی یہ تفصیل انھیں سمجھنے میں مدد دے گی اور رسالہ کے مندرجات کی توضیح خود رسالہ کی عظمت کو سمجھا سکے گی۔ افسوس کہ ریاست کے آمرانہ نظام نے اس شمارہ کے مزید اجراء کی اجازت نہ دی۔ جس کا افسوس مولوی کو عمر بھر رہا۔ اس لئے ان سے زبان اور قوم کی اصلاح کا ایک بہترین ذریعہ اور بڑا زرین موقع چھین لیا گیا۔ ان کا انتقال دل کی بیماری ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو قریباً ۷۳ سال کی عمر میں ہوا۔ ان کے تعزیتی جلسہ میں میں نے ایک نظم پڑھی تھی۔ اس کے آخری بند پر یہ ختم کیا جاتا ہے

تجھے تسکین روحانی رہی تا زندگی حاصل　　اسی کو میں سمجھتا ہوں کہ تھا عیش سلیمانی
یہ تیری خدمت اصلاح تو تھی خدمت دیں گویا　　کہ حب قوم ہے حق جملۂ اجزائے ایمانی

جو تیرا کام تھا۔ تو نے کیا، کرتا رہا پیہم
اب اس کے آگے جو کچھ ہے وہ ہے تقدیر ربانی

ملے مقصد کہ ناکامی، یہ سب مرضیٔ مولا ہے
خدا کی مصلحت کے تحت ہے تدبیر انسانی

جنھیں کرنا ہے کوئی کام۔ وہ کہتے ہی رہتے ہیں
کہ تدبیروں کی حد آخری ہے حسنِ امکانی

میں توفیق عمل کی التجائیں حق سے کرتا ہوں
نہیں ہے اشک ریزی ہی فقط۔ میری مرثیہ خوانی

ہمیں نعم البدل بخشے۔ خدا جنت تجھے بخشے
کہ بے پایاں و لامحدود ہیں الطاف یزدانی

امید خیر و بہبودی ہے ہم کو حق تعالےٰ سے
کہ ہے مدِ نظر۔ لاتقنطو۔ فرمان قرآنی

میسر ہم کو دونوں ہوں امیری بھی فقیری بھی
ضروری دونوں جلوے ہیں سلیمانی و سلمانی

میری فطرت کی تو ہے درس گیری سو درس اندوزی
رہے گی تیری ہستی سے، مری ہستی میں تابانی

رکھے اللہ ترا گلشن فردوس میں ڈیرا
قبول اے ہستیٔ اقدس، سلام آخری میرا

انگریزی دور حکومت میں۔ ریاستوں کی حیثیت نظام در نظام حکومت کی تھی، تاہم بیشتر ریاستوں میں اردو کا بول بالا تھا۔ اور انیسوی صدی کے اختتام تک تو اردو مکمل طور پر سرکار و دربار پہ چھائی ہوئی تھی اگرچہ سرکاری زبان کی حیثیت بی حیثیت نہیں ہوتی، تاہم ادبی حیثیت کی برقراری میں مدد و معاون ضرور ہوتی ہے۔ جمہور کے طرز و دماغ کا ماحول سازگار ہتا ہے۔ چنانچہ روایات و حکایات اس امر کی تصدیق میں موجود ہیں کہ عوام اردو کے دلدادہ رہے ہیں اس سے مستفید و مستفیض ہوتے رہے، اس کے مکتبوں اور مدرسوں کے ساختہ و پرداختہ رہے، اس کی محفلوں، مجلسوں اور مشاعروں از انو بہ زانو بھی بیٹھے رہے، ہندو مسلم کی تفریق، سیاسی مصلحتوں پہ بعد میں اچھالی گئی۔ رہن سہن۔ کاروبار۔ دکھ سکھ، شادی و میں سب ایک دوسرے کے شریک حال رہتے تھے ہمسائیگی و قربت میں باہمی رواداری و انسیت کی فضائیں گرم رہتی تھیں، چاہئے ہو کہ ہم اپنی بھولی قدروں کو پہچانیں، اپنی فراموش کردہ تہذیب کو گلے لگائیں۔ اپنی زبانوں کی قدر کریں۔ اور بزرگوں کے تہذیبی سرمایہ کے صحیح وارث بنیں ——

مترجم: رحیم علی الہاشمی

قبلا خاں

(کولرج کی نظم قبلا خاں کا منظوم ترجمہ)

زناڈو میں قصرِ عالی شان کی تعمیر کا — حکم عالی جاہ قبلا خاں نے صادر کر دیا
الف کا دریا مقدس تھا اسی جانب رواں — راہ میں تھے غار گہرے اور گہری گھاٹیاں
انکی پیمائش کرے یہ بس نہ تھا انسان کا — بحرِ بے پایاں سے جا ملتا تھا دریا کا سرا
دس مربع میل کے رقبے کو گھیرے میں لیا — جس زمیں کا ذرہ ذرہ خوشتر و زرخیز تھا
لہلہاتے باغ لہراتے ہوئے چشمے بھی تھے — وہ شجر جن کے مہکتے شاخ اور پتے بھی تھے
اور جنگل بھی پرانے تھے پہاڑوں کی طرح — روشنی تھی اور سبزہ تھا بہاروں کی طرح
ڈھال پہ اک غار تھا لیکن وہ تھی اسکی خبر — ہر طرف سے اسکو گھیرے تھے صنوبر کے شجر
تھی جگہ پر ہول بھی اور سحر کا ماحول تھا — اور سایہ اُس پہ تھا اک طرح کی تقدیس کا
وہیں مدھم روشنی میں چاند کی اک مہ لقا — دیوزاد عاشق پہ اپنے کرتی تھی آہ و بکا
یا خروش اس غار سے پُر شور چشمہ تھا رواں — جس پہ رک رک کر چلتی تھوڑی تھیں ہچکیاں
آسماں سے ژالہ باری جس طرح ہو تیز تر — یا کہ خرمن کو جسے غلہ کی بارش خاک پر
رقص میں تھیں یہ چٹانیں جن سے دریا تھا رواں — جو کہ خاص و عام میں تقدیس کا تھا اک نشاں
پانچ میلوں تک چلا جاتا تھا لہراتا ہوا — جنگلوں اور گھاٹیوں میں پیچ و خم کھاتا ہوا
غار گہرے جنکی پیمائش نہ تھی انسان کا بس — بحرِ بے پایاں میں دریا جاکے مل جاتا تھا بس
دور کی آواز اک قبلا کے کانوں میں پڑی — شور میں دی سورماؤں نے خبر اک جنگ کی
عیش کے اس قصر کا گنبد نظر آیا اُسے — تھا معلق بیچ میں لہروں کے ہموار کے
جبکہ چشموں اور غاروں سے نکلتی تھی صدا — معجزہ تھا ایک یا عالم تھا کوئی سحر کا
عیش کے گنبد میں تھی اک روشنی پھیلی ہوئی — برف کے غاروں سے تھی جس کی چمک دونی ہوئی
خواب میں دیکھی تھی میں نے ایک لڑکی ایکبار — ہو لئے تھی ہاتھ میں اک خوبصورت سا ستار
حبش کی لڑکی تھی جس کے لب پہ تھی اک راگنی — جس کے نغموں میں ابورا کوہ کی تعریف تھی
راگنی اسکی اور اسکی دلکشی جب یاد کرے — دل مرا خوشیوں کی لذت اسطرح محسوس پائے
ایک ہو نغمی موسیقی سے اک قصر کی تعمیر ہو — جو معلق ہو فضا میں خواب کی تعبیر ہو

ہو وہی رونق سا گنبد غار پر فانی بھی ہوں — جو حسیں باتیں ہیں وہ آنکھوں میں لہراتی بھی ہوں
باخبر ہو باخبر سب کی زباں پر ہو یہی — بال ہوں بکھرے بنے آنکھوں میں نشتر ہو یہی
گرد اُس کے ایک حلقہ اُن سے بن جائے وہیں — آنکھ کیا ہو اک مقدس خوف سا بھی جانشیں

شہد شبنم کا تھا اُس کی روز کی گویا غذا
دودھ اُس کو جو ملا جنت سے تھا آیا ہوا

رمت اللہ کوام

نمائش گاہ

رات گردش میں ہے زمیں کی طرح
روشنی دائرہ بناتی ہے
روشنی جس کی سرد باہوں میں
ایک تاریخ پھڑپھڑاتی ہے
قہقہے ہیں کہ آنسوؤں کی لکیر
حلقہ آلا ہے صورتِ زنجیر
کھو گئی ہے نہ جانے روح کہاں؟
جیسے ہر آدمی ہے اک تصویر
رنگ و روغن ہے بیچ کی دیوار
اُس طرف کون دیکھنے جائے

چہرے آنکھوں سے رخ بچائے ہوئے
جسم، دل سے نظر چرائے ہوئے
اک دھواں نطق سے سماعت تک
راکھ کے ڈھیر بجھتے سینوں میں
اک شرر بھی نہیں جبینوں میں
خواہ مرہم ملے نہ زخموں کو
پٹیوں کو لباس کہنے دو
مسکراتی ہوئی سی ویرانی
گنگناتا ہوا سا سناٹا
قہقہوں کے نحیف کاندھوں پر

سطح سے کون ہو بلند اتنا
سوچنا یہ ہے، پاؤں کے نیچے
جب نہ ہوگی زمیں تو کیا ہوگا
دیں گے کب تک نگاہ کو دھوکے؟
قافلے چلتی پھرتی لاشوں کے
روشنی دائرہ بناتی ہے
روشنی جس کی سرد باہوں میں
ایک تاریخ پھڑپھڑاتی ہے
چھن چھنا چھن کی زہر افشاں گونج
بے تھرکتے بدن، مچلتی روح
بھوک کا رقص۔ رقص نوٹوں کا
رقص زخموں کا رقص جوتوں کا
کون دیکھے یہ رقص جس کے لئے
پھینٹ آنکھوں کی شرط اول ہے
(کس کو آنکھوں سے اپنی پیار نہیں)
اور، یہ رقص تو انوکھا ہے
دل کی آنکھیں بھی مانگ لیتا ہے،
رقص جاری ہے اک زمانے سے
رقص دھرتی کا رک سکا نہ کبھی
ناچتا وقت، ناچتے لمحات
آدمی کو نچانے جاتے ہیں
ساعتیں ہیں کہ بین کا نغمہ
زندگی ہے کہ جھومتا ہوا ناگ
دل دھڑکتے ہیں ڈھونڈتی ہے نگاہ
اور سپیرا نظر نہیں آتا

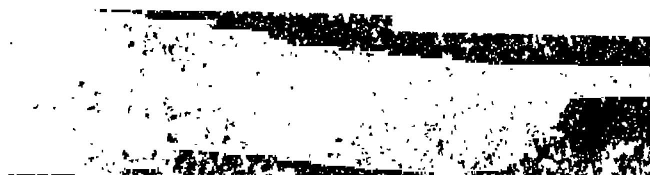
بوجھ فولاد کی چٹانوں کا
زندگی بکتی ہے دکانوں میں
موت، خلوت گزیں ہے جانوں میں

رات، گردش میں ہے زمیں کی طرح
درد کا زہر کون اتارے گا؟
کون پھونکے گا ناگ کا منتر
تن کا بس کیسے دودھ تک پہنچے؟
ناگ کو جھومتا ہی رہنے دو
بین کی آگ یونہی بہنے دو
بیت جائے اسی طرح کچھ وقت
اور سپیرا کہیں سے آ جائے

بات اتنی مگر بڑھائیں کیوں؟
اک سپیرا خرید لیں ہم بھی
ان دکانوں کا اور حاصل کیا؟
ان دکانوں میں کیا نہیں بکتا؟
کیوں سپیرے کا انتظار کریں!
بات بنتی ہے چند سکوں میں
ورنہ بکنا پڑے نہ خود ہم کو
یہ زمانہ ہے مصر کا بازار
کام کس کے پیمبری آئی؟
سب سے اونچی ہے یاں زلیخائی۔

(QUARTERLY)





[illegible] اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

[illegible]

۱۹۷۱ء

شمارہ نمبر ۳

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ	بارہ روپے
قیمت فی پرچہ	تین روپے

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند
سے شائع کیا۔

اردو ادب

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ
۱-	شمالی ہند کا سنہ ۱۱۰۰ھ کا ایک منظوم مخطوطہ	سفارش حسین رضوی	۵
۲-	مسلمانوں کا نظریۂ اقتدار اعلیٰ	ڈاکٹر نعمان احمد صدیقی (مترجم)	۱۷
۳-	ہندوستان پر سلطان مسعود غزنوی کی معرکہ آرائی	کبیر احمد جائسی (مترجم)	۳۱
۴-	اردو کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی	ذکیہ انجم	۶۱
۵-	تجوید و صوتیات - ایک موازنہ	حامد اللہ ندوی	۷۹
۶-	لیز اردو ڈی ٹارمے (ناول)	ڈاکٹر نعیم احمد (مترجم)	۱۹۵
۷-	اردو شاعری اور رومانویت	ذکار الدین شایاں	۱۲۵
۸-	سر سید کی نثر	بشیر بدر	۱۳۷

منظومات

۹ -	خزاں کا موسم	رحم علی الہاشمی	۱۵۰
۱۰	شہر سے دور چلیں	حرمت الاکرام	۱۵۱
۱۱ -	غزل	حرمت الاکرام	۱۵۲

سفارش حسین رضوی

شمالی ہند کا سنہ ۱۱۰۰ھ کا ایک منظوم مخطوطہ

اردو زبان کے ابتدائی نظم و نثر کے نمونوں کا مذہب اور عقیدے سے گہرا تعلق ہے۔ اس کے اسباب بھی ہیں۔ اردو عوام کی زبان اور جنتا کی بولی تھی۔ عوام کے خدمت گذار صوفی اور درویشوں کی بولی تھی۔ عوام کی زندگی میں مذہب اور عقیدے کی تسکین کو بڑی اہمیت ہوتی ہے اس کام کے لئے ان صوفیوں اور درویشوں نے اس بولی کو استعمال کیا اور یوں اردو کا یہ ابتدائی ادب وجود میں آیا۔

یہ کام گجرات اور دکن میں بہت پہلے ہوا جس کے نمونے ہمارے سامنے ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں یہ کام نہ ہوا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کام تو ضرور ہوا ہوگا۔ مگر اس کے نمونے ہمارے سامنے نہ آئے۔ امکان یہ بھی ہے کہ ابتدائی کام راجدھانی اور بڑے شہروں کے مقابلے میں چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ہوا ہوگا۔ جہاں اس کے تلف ہو جانے کا امکان بھی بہت تھا۔ پیش نظر نسخہ ایک چھوٹے شہر کی پیداوار ہے۔ اس کا مصنف روشن علی کہیں سے آکر سہارنگ پور (سہارنپور) میں مقیم ہو گیا تھا۔ نام اس کا "عاشور نامہ" جس میں تین ہزار چھ سو اتالیس شعر ہیں۔ یہ سنہ ۱۱۰۰ھ کی تصنیف ہے۔ جسے ایک شعر میں نظم کر دیا ہے۔

ہزار اور یک صد میں بیتیں تمام　　　بروز دو شنبہ صفر وقت شام

عاشور نامے میں کربلا کے واقعے کا ذکر تفصیل سے ہے اور ان اسباب کا بھی جن کی وجہ سے یہ وقوع میں آیا۔ مصنف جب کربلا کے واقعے کا ذکر لیتا ہے تو حضرت علی علیہ السلام کے صاحبزادے محمد حنیفہ کے اس فرضی قصہ کو بھی بیان کرتا ہے، جس میں وہ یزید سے جنگ کرتے اور آخر میں اُسے قتل کر کے امام زین العابدین علیہ السلام کو تخت پر بٹھاتے ہیں۔ یوں عاشور نامہ تمام ہوتا ہے۔

پوری نظم میں نہ کوئی باب ہے، نہ عنوان۔ بیان کا ایک سلسلہ ہے، لیکن جب کوئی بیان شروع ہوتا ہے تو اس کی تمہید میں کچھ شعر ہوتے ہیں اور خاتمے پر بھی اس انداز کے جن سے پتہ چلے کہ واقعہ ختم ہوا۔ مثلاً ایک واقع کو شروع کرنے سے پہلے لکھا ہے۔

اول معجزہ میں کروں ہوں بیاں ۔ پچھے کربلا کا سو دونگا نشاں
کتب معتبر سے پڑھا یا سنا　　نظم ہندوی کرکے سب کو لکھا

جب معجزہ بیان ہو چکا تو لکھا ۔

اے روشن علی مختصر کہہ کتاب　　کہاں تک کہے معجزے یا ثواب
کرامت شہوں کی کا حد ہے کہاں　　عمر ساری ہو لی نہیں امتحاں
شروع ذکر اب تو شہادت کا کر　　سراسر عناں زباں پھیر کر

پوری نظم اسی انداز سے ترتیب دی گئی ہے ۔

روشن علی کہاں کا رہنے والا تھا، یہ نہیں کہا جا سکتا۔ نظم سے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں سے آکر سہارنگ پور میں مقیم ہو گیا تھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ سہارن پور کے قریب وجوار ہی کا رہنے والا ہوگا۔ اپنے قیام کے متعلق لکھتا ہے ۔

یہ کر سیر دنیا سو اتق قدر　　سکونت کیا تھا سہارنگ پور شہر

اسی سلسلے میں عاشور نامے کی تصنیف کا سبب بھی بتاتا ہے

بعضے مرداں یوں کہا آیے کر　　اگر ہووے تم سے کرو یہ ذکر
کہ شاہزادے دین کے نبی کے ہیں آل　　اونہوں سیتی ہے دین قائم بحال
یہ غربت اونھوں کے ظلم ظالماں　　کہوں جنگ نامہ یہ ہندی زباں

اس سے پتہ لگتا ہے کہ عاشور نامہ کی تصنیف عوام کی طلب پر ہوئی اور یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس وقت تک عوام کے پاس اسطرح کی کوئی چیز نہ تھی جس سے وہ اپنے عقیدے کی تسکین کر لیتے ۔

نظم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ روشن علی صوفی منش اور تصوف مشرب تھا۔ اس نے لوگوں سے وعدہ کر لیا کہ انکی فرمائش پوری کرے گا مگر اب اُسے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوا

یہ سن سامیوں سے کیا میں فکر　　جو عاشور نامے کا یوں ذکر
ولے عقل اتنی کہاں ہے مجھے　　نہ اتنا فہم نکتہ داں ہے مجھے
اگر اس زباں کو مدد ہووے رب　　عجب کیا ہے کہنا کروں میں یہ سب
کروں استخارہ کہا دل بہتر　　کہ کیا حکم ہوا از اماماں مگر
جمعرات کی رات وہ تھی سہی　　بہت روز اور ان سے بہتر کہی
یہی فکر میں سوچ دل بیچ دھر　　گیا اوٹھ کے سجدے سے جو بہتر

بہت فکر اس کے میں سرساں ہوئے　　اسی غم کے بہتر رہا جاکے سوئے
ولے نیند ہے عاشقوں پر حرام　　کریں یاد حق کی اور جاگیں مدام
کیا میں مناجات حق سے یہی　　مجل کیجیو مت بحق نبی
طرف مصطفیٰ کے کیا التجا　　ادب سے مرقعے کو لایا بجا
اماموں سے عاجزی بہت کر　　کیا عرض احوال اپنا ذکر
کہ میں وعدہ لوگوں ستی یوں کرا　　ولے عقل اپنا کہاں ہے میرا
کہ اس جنگ نامے کو ہندی کروں　　فہم عقل اتنا نہیں میں دھروں
ادہر ان کے وقت واقف انتہا　　نین سوتے ہیں و دل جاگتا
یکایک دیکھا خواب میں عجب　　ہوئی روشنی جھونپڑی بیچ سب
وہیں ہم آ مجھکو وارد ہوا　　یکایک اوجالا ہویدا ہوا
اپس مکھہ ستی کر کے چادر کو دور　　سوتا کہ نظر میں پڑا آکے نور

. . . .

کہ اتنے میں دو شخص آکر کھڑے　　دو نورانی برقعہ اونہوں پر پڑے
فرمایا اونہوں نے تو سن اے فقیر　　تیری بیچ کے مہماں سو اب دستگیر
تو غم فکر دل بیچ اپنے نہ دھر　　بیاں وار قصہ تو ہندی میں کر
کیا عرض میں نے کہو تم بیاں　　دیو تو نام اپنے سے صاحب نشاں
فرمایا انہوں نے تو سن بات عین　　نواسے نبی کے حسن اور حسین

. . . .

صبح ہوتے میں نے شروع سے کیا　　موافق قصوں کے خبر میں دیا

اس بشارت کے بعد حسن علی نے تصنیف کا آغاز کیا۔ رواج کے مطابق پہلے حمد، پھر نعت، اس کے بعد مدح چار یار اور پھر اپنے سہارنگ پور میں قیام اور لوگوں کی فرمائش کا ذکر کرنے کے بعد اصل موضوع کی ابتدا حسنین علیہم السلام کے معجزوں سے کرتا ہے۔ مگر اس سے قبل بی بی ام الفضل کو جو امام حسین علیہ السلام کی ولادت کی بشارت ہوئی اُسے بیان کرتا ہے۔

اول معجزہ ہے حسن اور حسین!　　پڑھا تھا کتب سے سو کہتا ہوں عین
بیاں ہے روایت شہیدوں کے اب　　کہ ام الفضل خواب دیکھا یہ شب
کہ یکبارہ نور حبیب خدا　　آیا گود میری میں ہوکر جدا

نبی نے کہا سنتو ام الفضل ۔ ہے تعبیر اس خواب کی یہ اصل
شاید فاطمہ کے ہووے ایک پسر ہدایت کے معدن سے دوسر بسر
تجھے اوسکے اوپر میں دائی کروں تری گود خالی پسر سے بھروں

امام حسین علیہ السلام کی ولادت ہوتی ہے ۔ فرشتے مبارک باد پیش کرنے کے لئے حاضر ہوتے ہیں ۔ اسی میں جبرئیل امام کی شہادت کی خبر دیتے ہیں ۔ اس کے بعد مصنف اصل قصے پر آتا ہے ۔

بولوں جنگ کا ابتدا دیندار شرح اسکی کا کچھ نہیں ہے شمار
روایت ہے از کتب معتبر بموجب اوسکے میں بولا خبر
کہ اکدن کہا معاویہ خاص و عام امیراں ندیماں تھیں حاضر تمام

. . . .

اس واقعے کو بیان کر کے کہتا ہے

بیٹھا تخت اوپر وہ ظالم یزید ظلم اوسکی گھڑی سے ہوا آفرید
سو اوس وقت دل میں نیت یہ کھرے ماروں کس وجے سے یہ ہمت کرے
جو روشن علی حق کے تھا علم میں ہوا آکے ظاہر دو ہی قلم میں

اس کے بعد لکھتا ہے ۔

قصے اگلوں بہتر ستا یہ ذکر بیاں کر سناؤں مسلماں خبر
یزید نے لکھا تھا مدینہ کو خط کہ مضمون تھا اوس کا سن اس خط
حسن اور حسین کو تو کچھ فند کر گما دے جہاں سے مکر جہند کر

مدینے کا حاکم ، مصنف کے بیان کے مطابق ، ایک کٹنی کے ذریعہ امام حسن علیہ السلام کو زہر دلواتا ہے ان کی شہادت بیان کر کے امام حسین علیہ السلام کی مدینے سے روانگی لکھتا ہے ۔

روایت کتابوں ستی یوں سنا سنو مسلمانو بولوں بیاں
نبی مصطفے کے سو روضہ میاں حسین شاہ گئے تھے زیارت کتاں
یکایک اونہوں کو یہ آیا جواب بشارت دیا مصطفے با صواب
وہ سرور دو عالم خدیجہ بھی تھی علی مرتضی فاطمہ و حسن بھی
سبھوں نے کہا سن تو اے جان من شتابی سے ہم پاس آؤ تمن

. . . .

امام علیہ السلام مکے میں پہونچے

کئی دن میں پہونچے مکے کی زمین　　آئے پیش اون کے وہ سب مسلمیں
ادب آرزو سے ملے وہ تمام　　عمر شاہ بولے کہ آؤ امام

. . . .

قصہ مختصر کر اے روشن علی　　نہ خوانندہ کو ہو ملولی دلی
دو جاسوس یزید کے خبر لے چلے　　مسلماں کے کئے حسین سے ملے

مصنف کوفیوں کے خطوں کا ذکر کرتا ہے۔ اور کوفے کے حاکم کے خط کا بھی جس نے فریب دینے کے لئے امام علیہ السلام کو لکھا کہ اُس نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے ہدایت فرمائی ہے کہ وہ امام علیہ السلام کو کوفے بلائے۔ امام نے جناب مسلم کو کوفے بھیجا پر خود بھی مکے روانہ ہو گئے۔ راہ میں جناب مسلم کی شہادت کی خبر ملی اس کے بعد حُر کا رسالہ جس نے راستہ روکا

امام علیہ السلام کربلا پہونچے، یزیدی فوجیں جمع ہو گئیں۔ جنگ ہوئی اور پہلے حُر امام کی رفاقت میں شہید ہوا۔

علم حق تعالے کے میں تہا یہی　　جواں مرد حر کو شہادت ملی
کیا ذکر روشن علی درد کا　　شہادت اول حُر جیسے مرد کا

حر کے بھائی اور غلام کی شہادت کے بعد جناب قاسم کی شہادت کا ذکر کرتا ہے اور پھر جناب علی اکبر کی۔

شہیدوں کا رتبہ سنو سر بسر　　یہ اکبر علی تھے حسین کے پسر
دیکھا شاہ قاسم شہید ہو گئے　　یہ عم اور الم سیتی بیتاب تھے

جناب علی اکبر کی شہادت یوں بیان کی۔

یہہ میدان اون کا سنو دیندار　　کرو غم اونہو کا بچشم اشکبار
بہت صدق سے تم یہ ماتم کرو　　یہ دس روز عاشورہ غم دل دہرو
حسین کے تھے فرزند اکبر علی　　شہادت کی اون کی روشن علی

ں کے بعد جناب علی اصغر کی شہادت کا ذکر کرتا ہے ۔

گھڑی ایک گذری تھی دلخواہ کو　　کہا شہربانو نے یہ شاہ کو
کہ اکبر علی سے ہوئی میں تراس　　یہہ اصغر علی میرا مرتا ہے پیاس

اصغر کی شہادت کے بعد امام خود جہاد کے لئے تیار ہوتے ہیں کہ

اتنے میں اوٹھا ایک غبار بھی　　یکایک ہوا ابر اندھیار بھی

قیامت کا سب پر ہوا یہ گماں — ہوا گرد سیتی ایک پر گھٹ جہاں

یہ جن تھا جو امام کی مدد کے لئے آیا امام نے اوسے واپس کر دیا

کیا شاہ نے حکم اوس جن کو یوں — میں اس زندگانی سے نومید ہوں

کیا رخصت اوسکو اوسی کے مقام — کیا منع لڑنے کو اوس کو تمام

امام علیہ السلام میدان میں پہونچ کر فوج مخالف کو خطاب کرتے ہیں۔

کہ نانا مرے تھے محمد رسول — تھے اصحاب اون کے گلستاں کے پھول

پہلے یار ابا بکر صدیق تھے — عمر دوسرے یار تحقیق تھے

وے یار سوم وو عثمان ہیں — چہارم علی شاہ مردان ہیں

یہ چاروں ہر ایک وقت میں تھے رفیق — اونہیں سے ہے اسلام ہر ہر طریق

ہمارے محمد ہیں نانا ہمی — اور بابا ہمارے ہیں حضرت علی

مری والدہ ہینگی حضرت بتول — کری اونکی اور دتم نے ملول

پھر امام علیہ السلام کی شہادت بیان کی ہے۔

کیا شہ نے اوس وقت سجدہ ادا — شمر نے خنجر سے کیا سر جدا

چلے چھوڑ دنیا کو وو خوش تھا — کیا جا کے ڈیرا بہ دار البقا

بتاریخ دسویں جمعہ کا تھا دن — مہینہ محرم و ہجری کا سن

بوقت ظہر شہ نے پیالا پیا — رضا تھی خدا کی سر اپنا دیا

یزید کے پڑا سر پہ شاہوں کا خوں — قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون

کہا جب لعیں نے وہیں پر دیا — لہو کا نہ پایا زمیں پر نشاں

نمودار سرخی تھی آسماں پر — ہوا قہر یہ غاں[1] مردان پر

یہ قدرت تھی اس رب بے چون کی — نشانی حسین شاہ کے خون کی

یہ سبزے کا دیکھو سماں پر نشاں — ز ہر شہ حسن کے ہے رنگیں عیاں

سرخ آسماں دیکھے خاص و عام — شہیدوں کے لو ہو کی سرخی تمام

لگے تھر تھرانے وہ لوگ سب — ہوا وقت غم کا وہ ظاہر عجب

---

[1] یہاں کچھ اور لفظ ہوگا۔ کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔

کانپیں گگن احمر ہوئی سرخی زمیں قیامت کے دن کا ہوا سب یقیں
جنا ور جو رو ویں سو گر گر پڑیں دو لوہوں میں شہ کے پروں کو بھریں
خزاں سب گلستاں میں غم سے بھرے سبھی بوستاں غم سے مرجھا گئے
پروں کو کبوتر لوہو سے بھریں محمد کے روضہ پہ جا جا گریں

. . . .

وہ سرور شہیداں شہادت جو کہا یہ محشر تلک غم باتمت رکھا
جتنے تام قصوں میں دیکھے لکھے بیان وار ہندی میں ظاہر کرے
جتنے دیکھ روشن علی نے لکھے خدا کو خبر ہے جو باقی رہے
کتاب اولیوں سے ہے یہ عیاں بہتر شہادت کرے ہیں بیاں

. . . .

امام علیہ السلام کی شہادت کے بعد خیمے لوٹے گئے، اہلبیت اسیر ہوئے، شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر چڑھایا گیا۔ اور قافلہ پہلے کوفے کو پہونچا اور وہاں سے یزید کے پاس دمشق۔ راہ میں ایک راہب نے قافلے کو مہمان کیا۔ اور امام حسین علیہ السلام کے سر کے معجزے سے مسلمان ہو کر اپنے سات بیٹوں کو قربان کیا۔ اس کے بعد ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ شہادت امام کے بعد تمام نبیوں اور دوسرے مقدس لوگوں کی روحیں مقتل میں آئیں اور آہ و زاری کی۔

روایت سنی ہے کہوں وہ عیاں امام جعفر صادق سے یوں ہے بیاں
جعفر بن ابابکر نے یوں کہا کہ تاریخ دسویں مکہ میں رہا
زیارت مکے کی جو کرتا تھا میں قرباں گرد اون کے کے پھرتا تھا میں
وہ تھا برقعہ پوش ایک ولی نوجواں دیکھا رو پھرتا تھا گریہ کناں

اس روایت کو ختم کر کے ایک اور روایت بیان کی ہے۔

اے روشن علی قصہ کہہ کر تمام نبی پنجتن پر درود و سلام
دیگر یہ روایت سن اے نیک داں میں بھی سن کے بولا ہندی زباں
دیکھا روضہ شہیداں کے بہتر ذکر یہ ظاہر کیا میں وے مختصر
کہ اکدن یزید کے سبھی سرہنگا رہے خوان زر میں وہ جا بجا

. . . .

کہا ہے یہ روشن علی نے ذکر یہ جنگنا موں پہلوں سنی دیکھ کر

سنی ہے روایت یہ میں نے یہیں — خیالات اب کے چھپاتا نہیں
یزید کو ایک آزار ظاہر ہوا — ستم درد بے طرح ظاہر ہوا

- - - - - - - - - - - - - -

یزید کے مصاحبوں نے اہلبیت کو رہا کرنے کا مشورہ دیا۔

یزید کے مصاحبوں نے کیا عرض آ — حقیقت مفصل و سمجھا بوجھا
ہوا کام تمہارا سبھی انتظام — کیا قتل دشمن کا بیٹیک تمام
یہ طفلاں اہلبیت ہیں قید میں — تجھے کیا ہے حاصل اب اس قید میں

- - - - - - - - - - - - - -

جو سنتا کوئی اون کا سوز جگر — تو اوس غم کا ہوتا ہے اوس پر اثر
نبی مصطفےٰ کے ہیں سب دوستدار — اہلبیت روتے ہیں زار زار
تمہیں دوستداری سے کہتے ہیں اب — پہنچا دو مدینہ خرچ دیکے سات

یزید نے اس مشورہ پر عمل کیا اور شہیدوں کے سر دیکر اہلبیت کو رخصت کیا

امام زماں تب چلے کوچ کر — کئی دن میں پہنچے فرات آب پر
دیکھے دھڑ شہیدوں کے ننگے پڑے — زلیں دیکھتے ہی پھر آنسو بھرے
سنا یعنے اور اقوں سے یوں ذکر — پہنچے روز چہلم اوس جگہ پر
وہ سر دھڑ ملا کر کئے سب دفن — پڑے تھے وہاں جتنے سر تا کفن

- - - - - - - - - - - - - -

سنا قصہ اور دوں سنی اسقدر — یہ لازم ہے مجھکو کہوں سربسر
زین العابدیں اہل بیتاں تمام — رہے قید میں بہت مدت بہ شام
محمد حنیف نے فتح جب کیا — یزید کو قتل کرکے اونکو لیا
خلاصی ہوئی اونکی اوسوقت پر — علم غیب سے ہیگی حق کو خبر
لیکن روضۂ شہدا میں تھا اسطرح — بموجب اوسی کے میں بولا شرح

- - - - - - - - - - - - - -

جو کوئی اسے پڑھ کے زاری کرے — غم اندوہ و دل سنی بھاری کرے
دیکھیگا وہ رتبہ بروز حشر — کہ آفتاب آدیگا نیزہ اوپر

طفیلش اور گرمی کا پاوے اماں — اما طیفی او سیر ہو ویں مہرباں
نبی پاک کا اوسپہ ہوگا کرم — علی فاطمہ کا بھی ہووے رحم
دیکھا جنگناموں میں تھا جیسے طور — عیاں کر سنایا مسلماں بغور
کتابوں میں دیکھا سنا جو اتہا — کہا بیالنوار بالکل کہتا
اس سے نقل کرکے بولا بیاں — لطافت ہے اسکا خدا پر عیاں
نہ اس غم کا ہے ابتدا انتہا — سنا تہا جو میں نظم ہندی لکھا
جو کوئی پڑھے گا اُسے دل صدق — وہ پاویگا جنت سکونت بہ حق
کرو سوز غم اب تم مومناں — بھرو آنسو آنکھیں سے گریباں
یہی عیش و عشرت کتیں کریو دور — یہہ دس روز کو غم کرو تم ضرور

اس کے بعد مناجات لکھی ہے

الٰہی ترے دوستوں کا ذکر — بولا ہیچ ہندی کے روشن خبر
مراد نویسندہ را کن قبول — زخطرات دنیا نباشد ملول
کرم جا تری بخش ہے سب میں عام — بہ طفیل قصہ دنیا میں سب نیک نام
فہم میں کسی کے جو سکتہ پڑے — تو اپنے حلم سے وہ عفو کرے
آگے فارسی اور عربی زباں — کہا ہے گا سب نے یہہ غم کا بیاں

. . . .

اے روشن علی جنگ اتمام کر — وہ احوال سب کہہ چکا سر بسر
شروع کر نیا یہاں سیتی قصہ لطیف — علی کے پسر تھے محمد حنیف

یہاں سے مصنف کا بیان "جنگنامہ محمد حنیف" کے انداز کا ہے جو اکثر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے۔ قصہ رمنی ہے مصنف بھی اس سے باخبر ہے لکھتا ہے۔

حنیف کا کو اہیگا سب قیاس کر

حنیف کی جنگ میں ہاتھیوں کا استعمال بھی ہے۔

یزید نے پہلا فیل ہو کر دلیر — ادھر سے امیرانِ غزاں چو شیر

سے میں محمد حنیف نے قسم کھائی تھی کہ جب تک گھوڑا خون میں نہ پیرے گا وہ قتال بند نہ کریں گے چنانچہ —

لگا پیرنے اونکا گھوڑا وہاں — دی آواز ہاتف نے فوراً عیاں

ہوئی قسم پوری بس اب منہ کرو   ترا اسپ پہرتا ہے لو ہو بہتر

جنگ ختم ہوئی اور مصنف نے مناجات لکھی ۔

مناجات بولوں جو ہووے نجات   خدا ہیگا عالم کذب صدق سات
الٰہی بحق ہمہ چہار یار   کہ اسلام جن سیتی ہے برقرار
الٰہی بحق ہمہ پنجتن   کہ قایم ہے جن سے ستون عدن
الٰہی بحق محمد حبیب   قصر حور جنت میں ہو نجا لنصیب

- - - - - - - - - - -

محمد حنیف کی لڑائی کا ذکر   بموجب قصوں کے دیا ہے خبر

- - - - - - - - - - -

ہزار اوپر یکصد پاس پینتیس تمام   بروز دو شنبہ سفر وقت شام

خاتمے پر لسنر نیگو بد کے عنوان سے مصنف کی تحریر ایک مسئلہ پیدا کرتی ہے ۔ وہ لکھتا ہے یہ تاریخ انیسویں کا شمار کہ تھی دو ہزار ہفت سال

بحق خداوند اور مصطفے   روایت قصوں میں سنئے اختلاف
بعضے مردمان ذکر یوں ہی کیا   مجھے کہنا لازم یہ مذکور تھا
غیر معتبر سن کے اخبار کو   ..... ـــــــ ـ ـ موہو
کیا دبند او جنگ کا ذکر   حنیف کا کرائیگا ... قیاس کر
اس طور بولا ہوں ساری خبر   بحق خداوند باشد تمام

یہ مخطوطہ سنہ ۱۲۳۶ھ میں نقل ہوا ، کاتب نے خاتمے پر لکھا ہے

" تمت تمام شد کار من نظام شد ۔ کتاب نسخہ عاشور نامہ از فضل الٰہی اختتام یافت بزبان ہندی من تصنیف میاں روشن علی وساکن دیار سہارنگ پور وکاتب الحروف جعفر علی ولد میاں غلام مرتضیٰ شاہ تحریر بتاریخ بست نہم از شہر جمادی الاول سنہ ۱۲۳۶ھ زیادہ چہ نویسم کہ سند باشد "

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف کے اصل نسخہ سے نقل نہیں ہوا بلکہ کسی نقل سے نقل ہوا ہے موجودہ نقل تصنیف کے کچھ ڈیڑھ سو سال بعد کی ہے ۔ اس دوران میں اس کی نقل نہ ہوئی ہو ۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ پھر اس نسخے میں بہت سے شعر ایسے ہیں جن کا وزن ٹھیک نہیں ۔ اس لئے گمان ہوتا ہے کہ شعروں میں دست برد اس نسخے میں ہوئی جس سے یہ نقل ہوا ۔ اور خود ناقل نے بھی اپنے پیشرو کی طرح وہی عمل کیا ویسے کچھ شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کا ذوق شعری

بُرا نہیں ہے۔

کافی شعروں میں لفظوں کی نشست بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس سے مصرعے کا وزن گرتا ہے لیکن صحیح کر کے پڑھا جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ کاتب کا سہو ہے۔ نقل میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے

نسخے میں بہت سے لفظوں کا املا ایک جگہ کچھ ہے اور دوسری جگہ کچھ جیسے پیالہ، ٹہیر، دو، کوچ وغیرہ انھیں اسطرح بھی لکھا گیا ہے۔ پیالا، ٹھیر، دوہ، کونچ۔ املے کی اس تبدیلی سے پتہ چلتا ہے کہ کتابت کے وقت ان لفظوں کا املا وہ نہیں رہا تھا۔ جو اصل نسخے کے وقت رائج تھا۔

زبان قصباتی ہے اور اسوقت کی راجدھانی کی زبان سے بدلی ہوئی۔ قصباتی لفظ بیشتر ایسے ہیں جو آج بھی قصبوں اور دیہاتوں میں بولے جاتے ہیں۔ جیسے ایک لا، اُدرلن، لک، نہوڑ ے وغیرہ

مصنف اس زبان کو ہندی کہتا ہے۔ مگر ایک جگہ ہندوستانی بھی لکھا ہے

روشن علی، میر جعفر زٹلی کا ہم عصر ہے۔ زٹلی کی پیدائش ۱۶۵۸ء بتائی جاتی ہے۔ عاشور نامے کی تصنیف کا وقت ۱۶۸۸ء کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ مصنف نے اسے بیس اور تیس سال کی عمر کے درمیان لکھا تو اسکی تاریخ ولادت بھی قریب قریب وہی ہو جاتی ہے

شیخ مبارک آبرو اس کے دوسرے ہم عصر ہیں۔ مگر عمر میں کافی چھوٹے۔ اس مخطوطے کے کسی اور نسخے کا ہمیں پتہ نہیں چلتا۔

— — — — — —

انجمن کی نئی کتاب

خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری

از

ڈاکٹر وحید اختر

جسمیں

پہلی بار تصوف کا معروضی انداز سے
مطالعہ کیا گیا ہے

اور

میر درد کی شاعری پر اس کے اثرات کی
نشاندہی کی گئی ہے۔

ضخامت ۵۸۴ صفحات — قیمت پندرہ روپے

انجمن ترقی اردو ہند، علیگڑھ

مصنف آر۔پی ترپاٹھی
مترجم ڈاکٹر نعمان احمد صدیقی

مسلمانوں کا نظریہ اقتدار اعلیٰ

باب اول

مسلمانوں میں سب سے پہلے عربوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ عملی طور پر ان کی نقل و حرکت دریائے سندھ کے
ی علاقوں یعنی سندھ تک محدود رہی اور ان کی سرگرمیوں کا اثر ہندوستان کی سیاسی زندگی اور تہذیب کے
ی حاشیے سے آگے نہ بڑھا۔ سندھ پر عربوں کا تسلّط ایک گذر جانے والا واقعہ ثابت ہوا اور اگرچہ یہ واقعہ اپنی جگہ پر
دلچسپ تھا لیکن اس نے ہندوستان کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے پر گہرے اثرات نہیں چھوڑے۔
اس کے برخلاف غزنویوں اور غوریوں کی تگ و تاز کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے اور بالآخر انہوں نے
ے بعد کے عہد کے سیاسی نقشے کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ یہ حملہ آور ہندوستان کے وسطی حصہ میں جا گھسے اور بالآخر انہوں
ی گرامی ہندو فاتحوں اور حکمرانوں مثلاً چندر گپت سمدر گپت اور ہرش کی جگہ لے لی۔ اقتدار اعلیٰ مسلمان سلطان کے
ں میں منتقل ہوگیا اور وہ اپنی صوابدید اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اس اقتدار اعلیٰ کو بروئے کار لایا۔
تاہم مسلمان سلطان ماضی کے ہندو راجاؤں سے دو باتوں میں مختلف تھا۔ وہ جس ملک میں حکومت کرنے آیا تھا
ا کا اپنا ملک نہیں تھا۔ لہٰذا ناگزیر طور پر اسے اس نئے ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے میں کافی وقت لگا۔ دوسری
ی کہ وہ جس مذہب کا پیرو تھا اُس کا مطمحِ نظر سماجی اور سیاسی مسائل میں ہندوؤں سے بہت مختلف تھا۔ وہ
عیتوں اور ہنوں کی طرح صرف تسخیر ملک کی غرض سے نہیں آیا تھا بلکہ وہ ایک مذہب اپنے ساتھ لایا تھا جس کے
ت بہت واضح اور متعین تھے۔ اس کے ساتھ ایک انتہائی ترقی یافتہ تہذیب اور بعض ایسے ادارے بھی آئے
ر اُسے پورا ایمان تھا اور وہ اُن سے منسلک و وابستہ تھا۔
واقعہ تو یہ ہے کہ ان اداروں کی اصل روح کو برقرار رکھنا اور ان کو مفتوحہ ممالک میں قائم کرنا اُس کے بنیادی
مقاصد تھے۔ مسلمان ریاست میں مذہبی حکومت تھی۔ مسلمانوں کے جو بھی ادارے تھے چاہے وہ ان کے ساختہ
ہوں یا انہوں نے مستعار لئے ہوں ان کا مقصد و منشاء یہ تھا کہ وہ شریعت کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ

نہیں جس کا وجود ان اداروں پر تفوق رکھتا تھا - شریعت کے بعد مسلمانوں کے سیاسی نظریہ میں سب سے زیادہ اہمیت اقتدار اعلیٰ کے تصور کو تھی ۔ مسلمانوں کے سیاسی اداروں کو ایک مخصوص شکل دینے میں سب سے زیادہ موثر اور فیصلہ کن حصہ مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کے تصور نے لیا ہے ۔

اہل سنت کے نظریے کے مطابق اقتدار اعلیٰ کی حامل امت مسلمہ ہے ۔ امت اقتدار اعلیٰ کو کسی بھی مسلمان کو تفویض کر سکتی ہے - ان کے نزدیک انتخاب رسول کے قبیلہ قریش سے ہونا چاہیے ۔

انتخاب میں ہر مسلمان کے براہ راست حصہ لینے کی دشواریوں کا احساس اسلامی فتوحات کے ابتدائی دور ہی میں ہو چلا ہوگا ۔ خلفاء بنی اُمیہ کے دور ہی میں یہ رجحان عام ہو چلا تھا کہ خلیفہ اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشین کو نامزد کر دے ۔ یہ ہرگز لازمی نہیں تھا کہ نامزدگی خاندان کی اولاد صلبی ہی تک محدود ہو - نامزدگی کے رائج ہونے کے باوجود انتخاب کا اصول ترک نہیں کیا گیا ۔ دونوں اصولوں کے درمیان کی خلیج کو پر کرنے کے لئے یہ نظریہ وضع کیا گیا کہ اگر صدور و اکابر کسی شخص کی خلافت کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیں تو یہ اس کے انتخاب کے مترادف ہوگا ۔ اس زمانہ کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ طریقۂ کار سیدھا سادا اور قابل عمل تھا ۔ لیکن بعد میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل انتخاب کے ہونے میں جو فوائد تھے وہ یکسر مفقود ہو گئے - واقعہ یہ ہے کہ اس طریقۂ کار کا ایک ہی مطلب تھا کہ نامزد کو بلاچون وچرا تسلیم کر لیا جائے[1] ۔ ظاہر ہے کہ یہ بات دوسرے ذرائع سے بھی حاصل ہو سکتی تھی اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ صدور و اکابر کا فعال حق انتخاب اعلیٰ کو تفویض کرے ۔

اس طرح کی بلا چون وچرا اطاعت میں انتخاب کی باضابطہ رسم پورے طور پر نظر انداز نہیں کی جا سکی ۔ رسم انتخاب کو برقرار رکھنا ضروری تھا ۔ یہ ایک مذہبی ضرورت تھی اس لئے عملی طور پر انتخاب میں حصہ لینے والوں کا حلقہ دارالسلطنت کے صدور و اکابر تک محدود کر دیا گیا ۔ بعد میں یہ حلقہ صرف گیارہ[2] یا پانچ یا دو افراد اور یہاں تک کہ صرف ایک فرد پر مشتمل ہو کر رہ گیا ۔ انتخاب کرنے والوں کی تعداد میں کمی کے رجحان نے آخر کار یہ شکل اختیار کی کہ حکمراں کو خود اپنا جانشین منتخب کرنے کا اختیار دے دیا گیا ۔

ماوردی کا یہ استنباط واقعات اور حقائق کی دلیل سے متاثر ہوا اور اس نے یہ کوشش کی کہ وہ نظریے اور حقائق کو ہم آہنگ کرے ۔ اس طریقۂ کار نے انتخاب کے اصول کو دفنا دیا اور اقتدار اعلیٰ کے وراثتی انتقال کو در پردہ تسلیم کر لیا ۔ کیونکہ انسانی فطرت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی بھی حکمراں کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ وہ جانشینی کے سلسلے میں اپنی ہی اولاد خصوصاً لڑکے کو دے[3] ۔

---

[1] کیمبرج تاریخ وسطی، چہارم، صفحہ ۲۸۲　[2] الماوردی قانون خلافت (نوردراو وکالیفہ) پیرس صفحہ ۹۵ - ۹۶

[3] بنی امیہ میں ۱۴ خلیفوں میں سے صرف ۴ خلیفوں کے جانشین انکے لڑکے ہوئے اور عباسیوں میں ۳۶ میں ۱۶

پھر بھی انتخاب کے نظریے نے اپنی اہمیت بالکل نہیں کھوئی۔ اس نظریے کی موجودگی نے اس بات کی گنجائش باقی رکھی کہ ناپسندیدہ حکمراں کو نظر انداز کر دیا جائے یا اس سے نجات پائی جائے اور یہ تصور بھی برقرار رہا کہ اُمتِ مسلمہ ہی اقتدار اعلیٰ کا اصلی سرچشمہ ہے۔ عملاً اس طریقہ کار میں نہ تو انتخاب کے فوائد تھے اور نہ وراثتی جانشینی کے۔ اس کے برخلاف اس میں دونوں طریقِ کار کی برائیاں موجود تھیں

اہل سنت کے مکتب فکر کے اکثر و بیشتر فقیہہ اور مورخین امام یا خلیفہ کے منصب کو شریعت اور انسانی معاشرے کی بہبود کے لئے قطعی طور پر ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی امام نہ ہو تو شریعت اَن گنت متضاد راہوں کا شکار ہو جائے گی۔ طاقتور کمزوروں پر ظلم و ستم کریں گے نظم و نسق کی جگہ انتشار اور تاراج لے لیگا اور تخلیق کا مقصد و منشا تشنۂ تکمیل رہ جائے گا[1]

یہ نظریہ مذہبی ریاست کے پس منظر کے باوجود سراسر افادیت پرستی پر مبنی ہے۔ انتخاب کے تصور کا کسی حد تک افادیت پرستی کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شیعوں کے نظریے میں یہ دونوں عناصر مفقود ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے امام کی تاریخ میں اہل سنت کا نظریہ سب سے زیادہ غالب حیثیت کا حامل رہا ہے

اس بنا پر امام کے فرائض دین پناہی اور جہاں بانی قرار پائے۔ فقہاء نے امام کو امور مالی و ملکی کے اختیارات تفویض کئے تھے۔ امام کو صلح اور جنگ کرنے قوجی اور امور مالی کے عہدہ داروں کے تقرر یا برخاست، مقدمات اور تنازعات فیصل کرنے، رعایا، برایا کے حقوق کے تحفظ اور اسلام کی حرمت و دینیات کو برقرار رکھنے کے اختیارات حاصل تھے[2] مختصر یہ ہے کہ امام کو ایک طاقتور حاکم کے سارے اختیارات تفویض کئے گئے تھے

اپنے وسیع اختیارات کے باوجود امام پابندیوں سے بری نہ تھا۔ مثال کے طور پر وہ احکام شریعت کی پابندی سے خود کو مستثنیٰ نہیں قرار دے سکتا تھا۔ احکام شریعت کی رُو سے کم از کم اصولاً، اس کی حیثیت اس کے ادنیٰ ترین رعایا سے زیادہ نہیں تھی۔ بہت معمولی آدمی اسکے خلاف قاضی یا حاکم کی عدالت میں مقدمہ دائر کر سکتا تھا۔ وہ قرآن کے احکام میں ردوبدل نہیں کر سکتا تھا۔ اسکے لئے ضروری تھا کہ وہ ان احکام کے سلسلہ میں ان تفسیروں کی پابندی کرے جو اس نے مسلک فقہ کے بانیوں نے کی تھی۔ وہ اس کا مجاز تھا کہ وہ شریعت کے مطابق احکام و ضوابط وضع کرے لیکن وہ شریعت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔

---

[1] ...کل، ورق ۱۳۴ و ۱۴۰ ر، ذخیرۃ الملوک، ورق ۵۵ ر، نصیحت نامہ ورق ۵۵ ر، ابن حزم، مضامین خدا بخش میں دو ...نا، ہندوستانی اور اسلامی صفحہ ۴۷ – ۵۴ - ابن خلدون، ڈاکٹر آرنلڈ کی تصنیف خلافت میں صفحہ ۷۵ -

[2] ...کے فرائض کی تفصیلی فہرست یا یہ کہ اس کو عملی طور پر کیا کرنا ضروری تھا اس کے لئے تاریخ قرون وسطیٰ کیمبرج، چہارم صفحہ ۲۷۱، ۲۷۲ ملاحظہ ...فت مصنفہ آرنلڈ صفحہ ۷۲، "مشرق" خلفاء کے عہد میں مصنفہ خدا بخش، صفحہ ۲۷۵ فخر الدین مبارک شاہ صفحہ ۱۳ – ۱۵ ...الملوک ورق ۱۹ ار -

امام کے اختیار و اقتدار پر ایک مزید عملی پابندی مسلمانوں کا نظریہ اولی الامر یا اطاعت حاکم کا تصور تھا۔ اس نظریے کے مطابق امام کو اختیار اور عزت و حرمت اُس کے ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں حاصل تھی بلکہ امت مسلمہ کی مرضی سے۔ اس کی طاقت کا سرچشمہ مسلمان رعایا تھی۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اسلامی شریعت کے مطابق مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ امام کی بے چون و چرا اطاعت کریں، لیکن وہ اطاعت مکمل طور پر شرائط سے مبرا نہیں ہے۔ اگر امام نے شریعت کی خلاف ورزی کی یا اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے میں ناکام رہا تو اُسے اطاعت کے سارے مطالبات اور حقوق کے کھو بیٹھنے کے خطرے سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ صرف انتہائی نازک صورت حال میں بعض فقیہوں نے غیر مشروط اطاعت کا مشورہ دیا ہے[1] مثلاً جب رعایا کو طوائف الملوکی یا تمس افرانفری کا خطرہ لاحق ہو۔ اس طرح اہل سنت کا نظریہ اطاعت کی اخلاقی بنیاد کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اسے محض شرعی یا روایتی جواز سے متمیز کرتا ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر جو حق تفویض کیا جاتا تھا وہ صرف بے جا حرف کی حیثیت نہ رکھتا تھا، کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں متعدد بار ایک غاصب بادشاہ کے خلاف کو بالکل جائز قرار دیا گیا۔ یہ نظریہ ڈیموکلس کی تلوار کی طرح بادشاہ کے سر پر لٹکتا رہتا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ شریعت کی خلاف ورزی کرنے میں کسی حد تک محتاط رہے۔

مسلمانوں کے نظریہ اقتدار اعلیٰ کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ امام کے اختیارات مطلق تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے اختیارات بادشاہی میں شریک و سہیم نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنے زمانہ میں اُسے قطعی جملہ سیاسی اختیارات حاصل تھے۔ اسلامی شریعت صرف ایک امام کو تسلیم کرتی تھی۔ ایک وقت میں دو امام نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ دو اماموں کی گنجائش رکھی گئی تھی لیکن صرف اس صورت حال میں جبکہ دو براعظموں کے درمیان ایک وسیع سمندر حائل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس تصور کو بعد کے تاریخی حقائق نے جنم دیا۔ اصلی اور حقیقی نظریہ یہ تھا کہ ساری اسلامی دنیا کا ایک امام ہو۔ اسلام کی وحدت اور امام مطلق کی یکتائی مسلمانوں کے سیاسی نظریہ کے عناصر ترکیبی ہیں۔

---

[1] مسلمان دینیات اور فقہ مصنفہ میکڈانلڈ صفحہ ۶۲، نصیحت نامہ، ورق ۱۱۰، ۱۱۶، ۱۱۲، ۱۴

باب دوم

سلاطین دہلی کا تاریخی ورثہ

دولت غزنویہ کے بانی الپتگین کی وفات پانے پر اس کا بیٹا جانشین ہوا[1] لیکن اسے تخت سے اتار دیا گیا۔ سامانی شہنشاہوں نے پھر بھی اس کی مدد کی اور ان کی حمایت سے وہ غزنی کے تخت و تاج کا مالک ہو گیا لیکن ابھی ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ وہ اس دنیا سے چل بسا۔ الپتگین کے حاشیہ برداروں نے اس وقت اپنے ایک سردار کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ دس سال حکومت کرنے کے بعد وہ فوت ہو گیا۔ اس مرتبہ الپتگین کے غلام سبکتگین کو منتخب کیا گیا[2]۔ وہ خاندان غزنویہ کا بانی ہوا جس نے ایران، وسط ایشیا اور ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا۔

اگرچہ سبکتگین کے سر پر چتر لعل کا سایہ رہتا تھا لیکن اسے خود مختار حکمراں نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ملک نوح سامانی کا باج گذار تھا جس کا نام سکّہ پر کندہ تھا۔ سبکتگین اسماعیل اور یہاں تک کہ محمود نے (اپنے ابتدائی دور حکومت میں) اپنے سکّوں میں خود کو مقامی امیر بتایا ہے[4] خراسان۔ ترکستان ماوراء النہر، سندھ اور جرجان کی ایالت خلیفہ بغداد نے دسویں صدی کے آغاز میں اسمٰعیل سامانی کو تفویض کی تھی[5]

عتبی نے سبکتگین کیلئے بادشاہ کا لفظ بڑی حد تک رواداری میں استعمال کیا ہے۔ چونکہ وہ صرف نام کے لئے منصور کا ماتحت

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۷، ریورٹی ۱، ۲، ۷ ؛ سلاطین غزنی کے سکّے از ٹامس، صفحات ۳ ـ ۳۰ ؛ جوامع الحکایات۔ بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ سبکتگین سے پہلے پیری بادشاہ ہوا لیکن اسے تخت سے اتار دیا گیا اور اس کی جگہ سبکتگین کو منتخب کیا گیا۔ [2] تاریخ یمینی (مخطوطہ) ورق ۱۴، [3] ریورٹی، I ؛ ۳، ۷ ـ ۴، ۷

[4] سلاطین غزنی کے سکّے، صفحہ ۲، ملاحظہ ہو تاریخ یمینی، ورق ۱۷۵

[5] نرشخی، تاریخ بخارا، شیفر، صفحہ ۹۰، رائل ایشیاٹک سوسائٹی مخطوطہ ۱۲۰، صفحہ ۱۰۰ و مین فارس، جرجان، تلارستان، خراسان، ماوراء النہر ترکستان سندھ اور ہند ....

یہ واقعہ سال ۲۸۲ ہجری کا ہے۔

حاکم تھا اور دراصل خود مختار تھا اس لئے اُس کا شمار بادشاہوں میں کیا جا سکتا ہے سبکتگین کی وفات کے بعد جانشینی کے سوال کو متفقہ انتخاب کے ذریعے طے کرنے کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ محمود کا چھوٹا بھائی دارالخلافہ کے قریب ہی موجود تھا۔ اس بنا پر غزنی کی سلطنت کے لئے خود کو باپ کا جانشین تسلیم کروانے میں اُسے کامیابی ہوئی بعد کے مورخین نے لکھا ہے کہ سبکتگین نے یہ وصیت کی تھی کہ اسماعیل کو اُس کا جانشین بنایا جائے۔[1] محمود بہرحال اسماعیل کے حق کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوا۔ اس کی دلیل یہ نہیں تھی کہ وہ اسمٰعیل سے عمر میں بڑا ہے بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ سلطنت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا زیادہ اہل تھا۔[2] یہ دلیل لوگوں کے نزدیک اسلئے زیادہ معقول تھی کہ وہ اس کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے چونکہ اسماعیل کوئی معاہمہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے تلوار کا فیصلہ ناگزیر ہو گیا۔ انتخاب کا اصول پس پشت ڈال دیا اور سیف الدولہ[3] تلوار کے بل بوتے پر تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔

محمود کے طاقت در دورِ حکومت میں غزنہ کی ریاست کی توسیع اور سامانیوں کے زوال نے اس کی شہرت[4] اور ناموری کو بڑھا دیا۔ وہ اب سامانیوں کا باج گذار نہ رہ گیا تھا، اور ۳۸۹ ہجری (۹۹۹ عیسوی) میں اس نے امیر کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور سامانیوں کے نام کو سکوں پر سے محو کرا دیا۔ اس نے اپنے کو کافی طاقتور سمجھتے ہوئے اپنی طاقت پر اتنا بھروسہ کیا کہ اس نے سلطان کا اعلیٰ لقب اختیار کر لیا۔[5]

ایک طاقتور اور دولت مند حکمراں ہوتے ہوئے بھی محمود نے یہ ضروری سمجھا کہ بغداد کا خلیفہ اس بات کی توثیق کر دے کہ وہ ایک خود مختار سلطان کی حیثیت رکھتا ہے۔[6] مسلمانوں کی نظر میں محمود کی شرعی و قانونی حیثیت مستحکم ہونے کے لئے یہ توثیق ضروری تھی۔ محمود غیر معمولی شہرت اور سطوت کا مالک تھا اور مسلمان اس کے احسان مند تھے۔ اس بنا پر محمود کا

---

[1] تاریخ گزیدہ، گیب میموریل، چوہدراں صفحہ ۳۹۲، فرشتہ اول ۲۱، اس کے برخلاف ملاحظہ ہو نظام التواریخ از بیضاوی، برٹش میوزیم
[2] یمینی (ترجمہ) ۱۸۴-۱۸۸، انڈیا آفس مخطوطہ ورق ۱۰۶ ر۔ [3] سیف الدولہ محمود کا لقب جو نوح سامانی نے دیا تھا، یمینی طہران صفحہ ۱۲۵-۱۲۶ [4] سلاطین غزنی کے سکے، صفحہ ۲ اور مشرقی سکوں کی فہرست برٹش میوزیم میں مصنفہ لین پول جلد نہم ۱۹۹ ---
[5] اس بات پر بڑا اختلاف رائے ہے۔ گزیدہ صفحہ ۳۹۶ کا کہنا ہے کہ خلف بن احمد سیستانی نے محمود سے شکست کھانے پر اسے سلطان کے لقب سے خطاب کیا۔ محمود نے اس لقب کو پسند کیا اور اختیار کر لیا۔ سلاطین غزنہ کے سکے صفحہ ۵ بھی ملاحظہ ہو۔ بیضاوی برٹش میوزیم ۲۹۴، جس میں اس کے برخلاف لکھا ہے کہ عبدالملک کے مقابلہ میں محمود کی فتح کے اعزاز میں بغداد کے خلیفہ نے خراسان اور سیستان کی حکومت اسے مستقل طور پر عطا کر دی۔ خلعت بھیجی اور اسے سلطان کا خطاب عطا کیا۔ اس روایت میں تواتر پایا جاتا ہے کہ محمود پہلا حکمران تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ (بہ حوالہ طبقات ناصری، صفحہ ۹، سیاست نامہ اول صفحہ ۴۴۔ صادق شہید ورق ۳۸ ر) لیکن یہ بات حرف بہ حرف درست نہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ

کم ازکم یہ توقع ضرور تھی کہ وہ اپنا جانشین نامزد کر سکے گا۔ وہ اپنے سب سے بڑے لڑکے مسعود کے رندانہ اور عیاشانہ طور طریقوں سے ناخوش تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے دوسرے لڑکے محمد کو اگر ساری سلطنت کا نہیں تو غزنہ کے تخت و تاج کا وارث قرار دے گا۔ اس کو اندیشہ تھا کہ مسعود، محمد کی حکومت گوارا نہ کرے گا۔[۱] اس لئے اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ سلطنت دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دی جائے۔ اس فیصلے کے باوجود بعض امیر اور عباسی خلفا کے طرز عمل کی تقلید کرتے ہوئے اس نے اپنے ملوک و اُمرا سے محمد کی اطاعت کی بیعت کرائی اور اس کے نام کو خطبے میں شامل کرا لیا۔[۲] محمود کی وفات کے بعد مقامی ملوک و امرا نے محمد کی اطاعت کی بیعت کی تجدید کی۔ لیکن مسعود نے اس کو سلطان تسلیم نہ کیا اور تین دلیلوں کی بنا پر جانشینی کے لئے اپنے استحقاق کو ثابت کرنا چاہا۔ اول یہ کہ وہ جب لڑکا تھا اس وقت اسے باپ کا ولی عہد قرار دیا گیا تھا۔[۳] دوم یہ کہ خلیفہ بغداد نے اُسے منشور اور کرامات عطا کی تھیں جس نے اسے اپنے باپ کا جانشین ہونے کا حقدار بنا دیا تھا۔[۴] سوئم یہ کہ اسے ملوک و امرا، عوام الناس اور مشائخ و علما کی حمایت حاصل تھی۔[۵]

جانشینی کے مسئلے میں اُس کے حق کی خلیفہ کی جانب سے توثیق کی اہمیت کا احساس مسعود کو بہت پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اس نے قادر باللہ کے پاس ایک سفیر بھیجا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ ہر سال خلیفہ کو دو لاکھ دینار اور دس ہزار تھان پارچہ جات اور دوسرے تحائف بھیجا کرے گا۔[۶] اس نے خلیفہ سے درخواست کی کہ وہ اس کے استحقاق کی توثیق کرا دے۔ خلیفہ نے کمال خوشی کے ساتھ باقاعدہ طور پر منشور ارسال کیا اور اس نے محمود کو جا ایک بحر دسہ اور القاب تفویض کئے اور ایک نئے لقب ظہیر خلافت اللہ امیر المومنین سے سرفراز کیا۔[۷] مسعود نے اس بات کو اپنی بڑی کامیابی سمجھی اور ہر مناسب موقع پر اس کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتا تھا۔ پھر تو یہ ہوا کہ منشور کی تقویت پر وہ ہر اس علاقہ کو جہاں پر کوئی معقول شخص حکومت کرنے کے لئے موجود نہ تھا اپنی عمراست میں لینے کا دعویدار ہونے لگا۔ خلیفہ[۸] کے عطا نے خطاب و منشور پر کوئی بھی معترض نہ ہوا۔ البتہ سلجوقیوں نے مسعود کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں اعتراض کیا۔ اُنہوں نے مسعود سے صاف

(حاشیہ پچھلا صفحہ)
[۱] محمود نے یمین الدولہ امد امین الملت کا لقب پایا تھا، لیکن وہ خلیفہ سے مزید لقب حاصل کرنے کا متمنی تھا لیکن موخر الذکر نے مزید لقب عطا کرنے سے انکار کر دیا۔ کتاب بنسیاست ادرق ۹۲۰ ر
(حاشیہ صفحہ ہذا ملاحظہ فرمائیں)

[۱] بیضاوی ایلیٹ ڈاؤسن دوم ۲۵۶۰ [۲] طبقات ناصری صفحہ ۱۴ - ریورٹی، صفحہ ۹۲، حاشیہ ۴
[۳] بیہقی، ۱۵۱ - ۵۳ [۴] مسلسل ۲۶۱ ، ۴۴۵ [۵] مسلسل اور جا بجا۔ منشور کے معنی حطلب بسند یا فرمان ہیں۔ کرامات، تشریف، اعزازی خلعت اور ایسے ہی دوسرے تحائف کو کہتے ہیں [۶] بیہقی صفحہ [۷] بیہقی صفحات ۱۷، ۱۷ ، ۱۹۴ مسلسل بیہقی صفحہ ۰۰ [۸] بیہقی، صفحہ ۳۳۵ ، بیہقی (ب) ورق ۲۴۰ ر

کہہ دیا کہ انہیں اس بات کی چنداں پرواہ نہیں کہ خلیفہ نے اُسے اختیار حکومت تفویض کیا تھا۔ محمود نے اسے اپنا جانشین بنایا تھا وہ تو صرف تلوار کو سب سے بالاو برتر حکم مانتے تھے[1] قادر باللہ کے وفات پا نے پر مسعود نے اپنے عہد کی تجدید امر باللہ سے کرائی[2]

مسعود اور محمد کی باہمی خانہ جنگی نے لوگوں کو سوچ میں ڈال دیا۔ انہیں حیرت تھی کہ محمود جیسا سمجھدار تجربہ کار اور صاحب اختیار شخص کس طرح اپنی وفات کے بعد جانشینی کے لئے کوئی قابل اطمینان بندوبست کرنے سے قاصر رہا تاہم وہ کوئی تشفی بخش جواب نہ پا سکے۔ کیونکہ وہ یہ پتہ نہ پا سکے کہ غلطی محمود کی نہیں تھی۔ اس نے حتی الامکان کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ خرابی کی بنیاد جانشینی کے بارے میں غیر متعین قانون یا روایت اور ملوک و امراء کا ناقابل اعتبار کردار تھا۔

اگرچہ مسعود کو تخت و تاج وراثت، خلیفہ کی توثیق اور امراء و علماء، اور مشائخ کی بیعت کی بنا پر حاصل ہوا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُسے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ بادشاہ کو حکمرانی اور فرماں روائی کی صلاحیتوں کے بغیر برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ نہ تو اُس کا شاہی حسب و نسب اور نہ ہی خلیفہ کی توثیق اُسے تخت سے اتارے جانے سے بچا سکی بالآخر اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا

مسعود کی وفات کے بعد جانشینی کا مسئلہ بہت الجھ گیا۔ اُس کے پانچ لڑکوں نے باری باری سے حکومت کی اور درمیان میں صرف ایک اہم موقع پر یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ بادشاہت کے حصول کا عام طریقہ کار تلوار آزمائی قرار پایا لیکن یہ سوال کبھی نہ اٹھا کہ محمود کے خاندان کے باہر کے کسی شخص کو حکمران تسلیم کرلیا جائے۔ سب سے بڑا غیر معمولی واقعہ مسعود کے لڑکے مودود کی جانشینی تھی، لیکن ایک ماہ کے مختصر دور حکومت کے بعد اُسے تخت سے اتار دیا گیا۔ رعایا نے محمود کے خاندان کے ایک کمزور بچے کو دوسرے خاندان کے طاقت ور حکمران پر ترجیح دی۔ اس کی توضیح طغرل کے واقعہ سے ہوتی ہے۔ طغرل نے الپ ارسلان کو شکست دی تھی اور وہ غزنہ کی فوج کا سب سے با اثر سپاہی تھا۔ جب طغرل سے پوچھا گیا کہ اس کے دل میں حکومت کرنے کا خیال کیونکر پیدا ہوا تو اس نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ جس وقت عبد الرشید مجھے الپ ارسلان اور داؤد کے خلاف جنگ کرنے کے لئے روانہ کر رہا تھا اور مجھے ہدایت دے رہا تھا اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے رکھا تھا، اُس وقت اُس پر اس درجہ خوف غالب تھا کہ وہ کانپ رہا تھا اور مجھے اس کی ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بزدل آدمی بادشاہت کے لائق

---

[1] بیہقی صفحہ ۶۷ [2] بیہقی صفحہ ۳۵۲-۳۵۴، ۰۰۰، ۳۶۱ — ۳۸

[3] بیہقی صفحہ ۵۵

نہیں - پس حکومت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہو گیا[1]- ان حالات کے ہوتے ہوئے عوام نے اُس کے غاصبانہ اقدام کو برداشت نہ کیا انہوں نے بغاوت کردی اور چالیس دن کے اندر ہی انہوں نے محمود کے ایک وارث کو تخت پر بٹھا دیا[2]۔ طغرل نے محمود کی ساری اولاد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اور اس لئے کسی بھی لائق و فائق شخص کو تخت پر قبضہ کرنے کا اچھا موقع تھا - لیکن کسی نے بھی یہ جسارت نہیں کی۔ محمود کے خاندان کے کسی بھی باحیات فرد کی تلاش پوری تندہی کے ساتھ کی گئی- دو یا تین شاہزادے صحیح و سلامت پائے گئے۔ ان میں سے ایک کا نام فرخ زاد تھا۔ اسے فوراً تخت پر بٹھا دیا گیا[3]۔

غزنوں کی تاریخ دو باتوں کو بیّن طور پر سامنے لے آتی ہے۔ شروع شروع میں حکمرانی کی صلاحیت نہ ہونا صریحی نقص سمجھا جاتا تھا اور نہ تو شاہی حسب و نسب اور نہ کوئی دوسرا استحقاق اس مسلمہ اصول کو نظر انداز کر سکتا تھا - سبک تگین کے زمانہ سے، لیکن خاص طور سے محمود کے بعد سے حسب و نسب سب سے زیادہ اہم قابل لحاظ امر قرار پایا اور حکمرانی کی صلاحیت کو ثانوی درجہ دیا گیا - حکمرانی کی صلاحیت یا تلوار کی قوت محمود کی اولاد کے استحقاق کو ختم کرنے میں ناکام رہی۔ محمود کے نام اور اس کی شہرت نے انجام کار اس کے خاندان کے حق حکمرانی کو استحکام بخشا طاقت، استحقاق کے سامنے جھکتی نظر آئی۔ یہ استحقاق خاندان کے کسی فرد کا نہیں بلکہ خاندان کا تھا۔ تاہم یہ طے نہ ہو سکا کہ کسی حکمراں کے لڑکوں یا بھائیوں میں کس کو جانشینی کا سب سے زیادہ حق پہونچتا تھا۔ ان میں سے جس کو سب سے زیادہ لوگوں کی حمایت حاصل ہو جاتی تھی اس کے امکانات سب سے زیادہ تھے۔ اس وجہ سے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کم سن لڑکے کو کبھی بھی غزنہ کا حکمراں تسلیم نہیں کیا گیا۔ ایک کم سن لڑکے نے البتہ صرف ایک بار چند دنوں حکومت کی[4]۔ لیکن یہ روایت بھی مشتبہ ہے۔

محمود نے یہ تجویز سامنے رکھی تھی کہ اگر اس کا بھائی محمود کے حق میں دست بردار ہو جائے تو وہ اسے خراسان کی امارت

---

[1] ریورٹی، صفحہ ۱۰۰۔

[2] گزیدہ، صفحہ ۴۰۳۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۶ پر درج ہے کہ مسعود اور علی مشترکہ طور پر بادشاہت کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ریورٹی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ایسے بند و بست کا امکان نہیں۔ [3] نکسی جیسے بعض معتبر ماخذوں میں عبدالرشید اور ابراہیم کے درمیان میں فرخ زاد کا نام نہیں پایا جاتا۔ لیکن خوندمیر نے ذکر کیا ہے۔ فارسی ماخذوں میں غزنہ کے حکمرانوں کی فہرست میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سب سے معتبر طریقہ کار سکوں کی شہادت پر بھروسہ کرنا ہے۔ فرخ زاد کے سلسلہ میں سلاطین غزنہ کے سکے صفحہ ۹۰۔ سکہ نمبر ۹۷ اور نالول کی تصنیف مشرقی سکوں کی فہرست برٹش میوزیم جلد نہم صفحہ ۲۴۴ ملاحظہ ہو۔ [4] طبقات ناصری (۳) صفحہ ۱۰ کے مطابق دو ماہ، گزیدہ صفحہ ۴۰۴ کے مطابق دو سال، ریورٹی صفحہ ۹۷، حاشیہ ۴؛ طبقات اکبری، صفحہ ۳۱؛ بدایونی، طبقات اکبری کی تائید صفحہ ۳۳ پر کرتا ہے۔

عطا کر دے گا۔ لیکن اس تجویز کو معقول نہ سمجھا گیا اور وہ ختم ہو گئی۔ سلطنت یا بادشاہت کو تقسیم کرنے کے تصور کو غزنوی حکمرانوں نے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کے برخلاف غوریوں نے اس خیال کو ایمانداری کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ مشہور و معروف غوری برادران غیاث الدین اور معز الدین کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے اور انہوں نے مشترکہ طور پر ایک وسیع و عریض سلطنت پر حکومت کی۔ سکوں پر دونوں بھائیوں کے نام کندہ کئے جاتے تھے۔ غزنہ میں ہر طرح سے آزاد اور خود مختار حکومت ہونے کے باوجود معز الدین اپنے بڑے بھائی کو بادشاہ تسلیم کرتا تھا۔ اگرچہ اُس کے حامیوں اور سپاہیوں کی تعداد بہت بڑی تھی۔ اور اُس کے فوجی کارنامے شاندار تھے مگر پھر بھی وہ آخر دم تک اپنے بڑے بھائی کا وفادار رہا، چونکہ دونوں بھائیوں کے تعلقات کی نوعیت ذاتی تھی اس لئے اُن کی مستقل اہمیت کا اندازہ ان میں سے ایک کے انتقال کے بعد ہی ہو سکا۔

جو سوال سامنے درپیش تھا وہ یہ تھا کہ آیا فیروزکوہ اور غزنہ کی حکومتیں باہم اتحاد و اتفاق کے ساتھ کام کر سکیں گی۔ معز الدین کے اقدامات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ذہن اس سلسلے میں صاف نہیں تھا۔ اپنے بھائی کی وفات پر اُس نے فیروزکوہ کی سلطنت کو اپنی حکومت میں شامل نہیں کیا بلکہ ملک علاء الدین بن شجاع الدین ابی علی کو تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ متوفی سلطان کا داماد تھا۔ اور اُس نے پرتھوی راج کے خلاف جنگ میں نمایاں حصہ لیا تھا۔[۱] معز الدین اس اقدام میں اور غیاث الدین کے لڑکوں کو نظرانداز کرنے میں کہاں تک حق بجانب تھا، اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ اس میں البتہ شبہ نہیں کہ وہ اپنی شہرت و ناموری اور اثر و اقتدار کی بنا پر اپنے بھائی کی سلطنت کے معاملات میں دخل دے سکتا۔

اگر اس کا اقدام صرف فیروزکوہ کے حکمراں کی نامزدگی تک محدود ہوتا تو اس کا طریق کار آسانی سے سمجھ میں آجاتا۔ لیکن جب اس نے فیروزکوہ کی سلطنت کو (۱) فیروزکوہ اور گرم سیر (۲) بست فراہ اور اسفزار اور (۳) ہرات کی تین ریاستوں میں تقسیم کیا تو وہ حد سے تجاوز کر گیا۔[۲] غالباً اس کو یہ توقع تھی کہ اس کی سربراہی میں سلطنت کے چھوٹے چھوٹے حصوں کے ذریعے سلطنت کا انتظام بہتر اور زیادہ اطمینان بخش ہو گا اور نظم و نسق کے بہتر ہونے کی بنا پر اُن ترک دشمنوں کا جو شمال اور مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے، مقابلہ بخوبی کیا جا سکے گا! یا کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ متعدد شاہزادوں کو مطمئن کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے۔ جن کی خدمات اگرچہ گراں قدر نہیں لیکن جن کے حُبِ جاہ کی روک تھام کے لئے کوئی سبیل نکالنی ضروری تھی؟ یا کیا اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ فیروزکوہ کی سلطنت کو کمزور کر کے آخر میں وہاں کا بادشاہ بن بیٹھے؟ اُس نے خود کو

۱؎ راجرس صفحہ ۴ ۔ ۲؎ تاریخ محمدی، ورق ۱۸۱ ر ۔ طبقات اکبری (ترجمہ از ڈے) صفحہ ۴۰

۳؎ تاریخ محمدی، ورق ۱۸۱ ر، تاریخ طبقات اکبری (ترجمہ از ڈے) فراہ ۔ اسفزار ۔ ملاحظہ ہو طبقات ناصری جلد اول صفحہ ۳۷۳

اپنے بھائی کا جانشین کیوں نہیں قرار دیا؟ وہ صرف اپنا امیدوار نامزد کرنے پر کیسے مطمئن ہو گیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ فیروزکوہ کی سلطنت کی جداگانہ حیثیت کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ غزنہ کے الگ وجود کو بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ اپنے غلام یلدز کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا[1]

معزالدین نے فیروزکوہ کا جو بندوبست کیا اس کا مقصد جانشینی کے مسئلے میں کوئی صحت مند اصول قائم کرنا نہیں تھا۔ اس کے اچانک اور لاوارث فوت ہو جانے کی بنا پر غور اور بامیان کے دونوں خاندان غزنہ کی سلطنت کے دعویدار ہوئے۔ بامیان خاندان کا علاء الدین غالب آیا لیکن جب اُس نے بیت المال کو اپنے اور اپنے بھائیوں کے درمیان میں تقسیم کر لیا تو غزنہ کے ترک امراء اس سے بدظن ہو گئے۔ یہ تقسیم نہ تو اسلامی شریعت کی رو سے جائز تھی اور نہ غزنہ کا دستور اس کی اجازت دیتا تھا۔ اس تقسیم کے پس پردہ یہ اصول کارفرما تھا کہ گویا ریاست حکمراں کی ذاتی جائیداد تھی۔ علاوہ بریں یہ تقسیم غزنہ کے مفاد کے ہر طرح خلاف تھی۔ وزیر عبداللہ سنجری نے جب علاء الدین کی اطاعت سے عہد پر قائم رہنے سے انکار کر دیا تو عوام اور امراء نے اس کی حمایت کی اور معزالدین کے سب سے مقرب غلام اور کرمان کے امیر یلدز کو غزنہ آنے اور تخت پر قبضہ کرنے کا دعوت نامہ بھیج دیا۔

یلدز کو سلطان بنانے میں پھر بھی ایک فقہی دشواری تھی۔ اسلامی شریعت کی رو سے سلطان کو خود حر ہونا چاہئے۔ لیکن یلدز غلام تھا غزنین تاہم اس کا حامی تھا۔ اگر معزالدین کے بھتیجے اور اس وقت فیروزکوہ کے حکمران سلطان غیاث الدین نے یلدز کو خط عتق دینے سے انکار کر دیا ہوتا تو اس بات کی آزمائش ہو جاتی کہ بادشاہت کے قانونی جواز زیادہ اہم ہے یا تخت و تاج پر قبضہ۔ غیاث الدین نے نہ صرف یہ کہ اُسے آزاد کر دیا بلکہ غزنہ کی سلطنت بھی اسکو تفویض کر دی[2]۔ یہ قدم کسی طرح بھی طبعی فیاضی کا نتیجہ نہ تھا۔ اس صورت حال میں غیاث الدین کے لئے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ بامیان خاندان سے رقابت اور سرحد پر سلطنت خوارزم شاہی کی فوجوں کے بڑھتے ہوئے اجتماع کا تقاضا یہ تھا کہ وہ یلدز جیسے مقبول لائق و فائق آدمی کی مخالفت کے بجائے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔

غزنی سلطان کی اولاد کے استحقاق حکومت کو محمود نے قائم کیا اور غزنہ نے ایک صدی تک اس استحقاق کا احترام کیا۔ غزنہ میں یہ استحقاق غوریوں کے دور میں ختم ہو گیا۔ تاہم فیروزکوہ میں ایسا نہ ہوا۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ غزنہ کے باشندے غوریوں کو غاصب ہی سمجھتے تھے۔ معزالدین لاوارث ہی فوت ہوا۔ اور اس کے ترک غلام جو اس کے فرماں بردار

---

[1] طبقات ناصری (مخطوطہ) ورق ۱۶۶ ر، ریورٹی ۵۰۰؛ تاریخ محمدی ورق ۲۰۲ و۔ فرشتہ اول صفحہ ۶۳

[2] طبقات ناصری ورق ۱۶۶ ر؛ ریورٹی، ۴۹۸، ۵۰۰، ۵۰۱ حاشیہ، ۵۰۲، ۵۰۴؛ تاریخ محمدی ۲۰۳ و۔ ۲۰۲ و؛ فرشتہ ۶۴

اور حمایتیوں میں سب سے زیادہ لائق و فائق تھے۔ اس کا ذاتی طور پر احترام کرتے تھے۔ اور اُن کے دلوں میں تاجکیوں جن سے خاندان غوریہ منسوب تھا، کوئی احترام نہیں تھا۔ آخری لیکن کافی اہم وجہ یہ تھی کہ فیروزکوہ کا حکمراں یا اتراک امرا پر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ غوریوں نے اس طرح غزنہ میں استحقاق کے اصول کو پس پشت ڈال طاقت اور انتخاب کے اصولوں کو غیر ارادی طور پر دوبارہ قائم و نافذ کر دیا۔ نامزدگی کا اصول غزنہ میں غزنوی غوری دونوں دوروں میں مقبول نہ ہو سکا۔

قرائن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگ رذیل اور کم ذات شخص کی حکومت کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس بنا غزنویوں اور غوریوں دونوں ہی کو اپنا رشتہ ان قدیم خاندانوں سے جوڑنا پڑا جو ایران اور توران میں عربوں کی سے پہلے حکمراں تھے۔ سبکتگین اپنا شجرہ نسب براہ راست یزدجرد سے ملاتا تھا[1] اور فیروزکوہ کی سلطنت کا بانی علا جہاں سوز خود کو ضحاک کی اولاد بتاتا تھا[2]۔ اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ یہ شجرۂ نسب فرضی تھے لیکن قصہ کہانی سیاست میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ اہمیت رہی ہے۔

غزنویوں کی طرح غوریوں کو بھی خلیفہ بغداد سے سلطنت کی توثیق حاصل کرنے کی اہمیت کا احساس تھا۔ غیاث الدین نے المستضی باللہ اور الناصر سے منشور حاصل کئے[3]۔ یلدز کو اپنی حکومت کے لئے خلیفہ کے اجازت نامے کا حصول اور بھی زیادہ ضروری تھا۔ اس بات سے اس کی حیثیت زیادہ مستحکم ہو جاتی اور ضرورت پڑنے پر فیروزکوہ سے مکمل آزادی کے حصول کا امکان بھی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ غزنہ کے باشندوں کے ضمیر مطمئن کرنے کا سامان بھی بہم پہونچ جاتا۔ لہذا اس نے خلیفہ سے منشور کی درخواست کی جو اسے مل گیا[4]۔

اس دور میں بھی سلطان کو حیرت اور ہیبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور یہ عقیدہ تھا کہ وہ بنی نوع انسان کے درمیان سب سے اونچا درجہ رکھتا ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی کے نزدیک بادشاہت عطیہ الٰہی سے کم نہیں اور منصب نبوت کے بعد بادشاہت سے بڑا کوئی بار نہیں[5]۔ فخرالدین مبارک شاہ بادشاہ کو ظل اللہ بتاتا ہے اور اسے ظالم کے ظلم سے مظلوم کی پناہ گاہ سے تعبیر کرتا ہے[6]۔

---

[1] طبقات ناصری (س)، صفحہ ۱۷۔ فرشتہ صفحہ ۱۸، نسخہ جہاں آرا۔ یزدی جرد ساسانی نسل کا ایران کا بادشاہ تھا۔ ضحاک، داستان کا بادشاہ، سائیکس تاریخ ایران، اول، ۱۴۲، ۱۴۳ - ۱۴۴۔ [2] پوری تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب روضۃ الجنات فی اوصاف مدینۃ الہرات، برٹش میوزیم ۴۴ ورق ۱۰۰۔ نسخہ جہاں آرا بھی ملاحظہ ہو برٹش میوزیم، ورق ۹۴ الف، ۹۴ب۔ ریورٹی ۳۰۲ - ۳۰۳، ۳۰۴، تاریخ محمدی ورق [3] تاریخ النصر، برٹش میوزیم - ۲۹۷، ورق ۱۷۰، تاج المآثر کے مصنف اور فخرالدین نے صرف اسباب کی بنا پر اس کا ذکر نہیں کیا۔ طبقات ناصری کی خاموشی میں بھی تعجب کی کوئی بات نہیں۔ [4] [5] چہار مقالہ، ای، جی براؤن صفحہ ۳ [6] فخرالدین صفحہ ۱۳۔ یہ امر قابل ذکر ہے مصنف مذکور عجیب و غریب مشتقات فراہم کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر شہر کرام کے سلسلہ میں اس کی توجیہہ ملاحظہ ہو۔ ماسبق ذکر صفحہ ۲۲۔ یہ طفلانہ اور مضحکہ خیز ہے۔

معزالدین غوری کی وفات اور یلدز کے انتخاب کے بعد فطری طور پر یہ سوال اٹھا کہ غزنہ کے نئے حکمراں اور ہندوستان میں معزالدین غوری کے جو لوگ و امرا رہ گئے تھے اُن کے باہمی تعلقات کیا ہوں؟ معزالدین نے اس بات کو صاف نہیں کیا تھا کہ وہ ہندوستان میں اپنے مقبوضہ ممالک کو الگ رکھنا چاہتا تھا یا نہیں۔ یہ سوال اُس کی زندگی میں سنجیدگی کے ساتھ اٹھا بھی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے ہندوستانی مقبوضہ علاقے ایک طرح سے بنگال تک پھیلے ہوئے تھے اور غزنہ جیسی دور دراز جگہ سے ان کا معقول انتظام کرنے میں بظاہر بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ پھر بھی اِس کا امکان بہت کم ہے کہ اس نے یہ سوچا ہو کہ ہندوستان کو غزنہ سے علیحدہ کر دیا جائے اگر غزنہ کی سلطنت مشرق میں پھیلی ہوئی تھی تو وہ مغرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مغربی سرحد غزنہ کے وجود کے لئے اتنی اہم تھی جتنی کہ مشرقی فتوحات، اس کی خوش حالی کے لئے۔ اس وجہ سے غوری سلطنت کے دار الخلافہ کے لئے غزنہ زیادہ موزوں تھا۔ اس کے علاوہ معزالدین بخوبی جانتا تھا کہ غزنہ کی قوت اور خوش حالی کا دار و مدار ہندوستان سے لائے ہوئے مال و دولت پر تھا اور مصیبت پڑنے یا حالات ناساز گار ہو جانے کی صورت میں ہندوستان غزنہ کے حکمراں کو پناہ دے سکتا تھا۔ ایک ہم عصر مورخ کے بیان کے مطابق لاہور معزالدین کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا اور وہ اسے سلطنت کا دوسرا دار الخلافہ سمجھتا تھا[1]۔ ہندوستان میں ایک ایسی سلطنت کا قیام جو غزنہ سے آزاد ہو معزالدین کے لئے قابل قبول نہ ہو سکتی تھی

کیا معزالدین نے قطب الدین ایبک کو اپنی ہندوستانی مملکت کا گورنر جنرل مقرر کیا تھا؟ فخرالدین کی تاریخ منتسبہ قطب الدین میں لکھا ہے کہ سلطان نے ۶۰۲ ہجری میں کھوکھروں پر فتح حاصل کرنے کے بعد قطب الدین کو ہندوستان کے لئے اپنا ولی عہد نامزد کر دیا[2]۔ حسن نظامی دوسرا اہم عصر اور معتبر مورخ اس اہم واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کا بیان ہے کہ معزالدین نے قطب الدین کو کرامت اور تشریف عطا کی تھی[3]۔ لیکن اس بنا پر کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ قطب الدین ساری ہندوستانی مملکت کا حاکم یا امیر ہو گیا تھا۔

قطب الدین ہانسی کا مقطع تھا اور دہلی اس کی ذاتی اقطاع تھی۔ اس وقت دہلی پر قبضہ کی کوئی اہمیت نہ تھی کیونکہ نہ تو دہلی ہندوستان کا دار الخلافہ تھا اور نہ مسلمانوں کا سب سے اہم شہر۔ قطب الدین معزالدین کے سب سے زیادہ کارگذار اور لائق امرا میں سے تھا۔ اور اس نے اپنی رشتہ داریوں اور فیاضی کی بنا پر شہرت اور مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ وہ خود معزالدین کے سب سے با اثر امیر یلدز کا داماد تھا۔ التمش اور قباچہ اس کے داماد تھے۔

---

[1] فخرالدین مبارک شاہ، صفحہ ۲۰۔ [2] فخرالدین، صفحات ۲۸-۲۹، عجائب خانہ کیمبرج، فرشتہ نے صفحہ ۶۱ پر لکھا ہے کہ معزالدین نے اسے ہندوستان کا سپہ سالار بنایا تھا [3] تاج المآثر (د) ورق ۳۷ و ب؛ (ا) ۸۷ ا؛ (س) ورق ۱۲۸ و۔ تشریف اعزازی خلعت کو کہتے ہیں۔

صرف ان وجوہ کی بنا پر یہ ضروری نہیں تھا کہ اپنے آقا کی وفات پر وہ ہندوستان کی سلطنت کا مالک بن بیٹھے
معزالدین کی وفات پر ہندوستان میں مسلمان ملوک و امرا میں وہ سب سے زیادہ با اثر اور طاقتور تھا
اس بنا پر اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور لاہور میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا[1] - لاہور اس زمانہ میں ہندوستان
اسلام کا مرکز تھا[2] ۔ لاہور میں اس کی حکومت کو تسلیم کئے جانے کا لازمی نتیجہ تھا کہ دوسرے مسلمان شہروں پر
کافی اثر پڑے

---

[1] تاج المآثر (ر) ورق ۱۰۸ ر ؛ ...... ؛ (د) ، ورق ۱۲۴ و ؛ ...... (۳) ورق ۱۸۶ و
عجائب نامہ صفحہ ۲۰۱ ۔ طبقات ناصری کا بیان تھوڑا الجھا ہوا ہے کیونکہ اسمیں اس واقعہ کے لئے دو مختلف تاریخیں دی
ہیں ۶۰۲ ہجری ۔ راورٹی نے تضاد کا ذکر کیا ہے لیکن تاویل ذکر نہیں کی ۔ طبقات ناصری کے اس بیان میں صداقت
ہے کہ پہلے قطب کے حکم سے خطبہ فیروز کوہ کے محمود کے نام پڑھا گیا لیکن فخرالدین کا بیان اس مسئلہ پر فیصلہ کن ۔
طبقات ناصری ورق ۱۶۸ پر اجمالی بیان ملتا ہے اس کی ترتیب بھی صاف نہیں ہے ۔
[2] فخرالدین صفحہ ۳۱

ڈاکٹر نذیر احمد
مترجم کبیر احمد جائسی

ہندوستان پر سلطان مسعود غزنوی کی معرکہ آرائی

کے بارے میں

بیہقی کے بیانات کا ایک تنقیدی جائزہ

بقول گردیزی محمود غزنوی کے انتقال پر[1] مسعود غزنوی اپنے بھائی محمد سے معمولی کشمکش کے بعد شوال ۴۲۱ھ[2] میں تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے والد کی ہندوستان پر معرکہ آرائی کی پالیسی کو برقرار رکھنے کا زبردست حامی تھا۔ مشہور مورخ اور عالم ابوالفضل بیہقی (المتوفی ۴۷۰ھ) سلطان مسعود کا ہم عصر تھا اور اس نے سلطان مسعود کے دور حکومت (۴۲۱ھ - ۴۳۲ھ) کے چند اہم ہندوستانی معرکوں کا حال بیان کیا ہے۔ زیر نظر مقالے میں اسی کے ان بیانات کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے

ہندوستان کے سلسلے میں اپنی پالیسی کو برقرار رکھنے کے لئے سلطان مسعود نے اپنے فوجی اور غیر فوجی عملہ میں تبدیلی کو ناگزیر سمجھا کیا۔ چنانچہ احمد ینالتگین[3] شعبان ۴۲۲ھ میں ہندوستانی افواج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا، لیکن اس کے تقرر سے قبل اس بارے میں کافی تبادلہ خیال کر لیا گیا تھا۔ احمد ینالتگین کا نام خود بادشاہ نے تجویز کیا تھا اور اس کی تائید اس کے وزیر اعظم خواجہ احمد حسن[4] میمندی نے کی تھی۔ خواجہ مذکور احمد ینالتگین سے بدگمان تھا کیونکہ اس نے اس وقت بہت سے منصوبے بنائے تھے جبکہ وہ اپنے اوپر عائد شدہ جرمانوں سے سبکدوش

---

۱ سلطان محمود کا انتقال جمعرات کے دن ۲۲ ربیع الثانی ۴۲۱ھ کو ہوا تھا (بیہقی ص ۱۲)۔ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو ابن الاثیر جلد ۹ ص ۱۲۹)

۲ سلطان مسعود کی تاج پوشی پر غزنوی دربار کے امراء کا تہنیتی خط تکین آباد (Takinabad) سے ۳ شوال ۴۲۱ھ کو بھیجا گیا تھا جو سلطان مسعود کو ۸ شوال بروز دوشنبہ ملا۔ اور اس کے نام کا خطبہ ۱۰ شوال بروز جمعہ کو پڑھا گیا (ملاحظہ ہو بیہقی صفحات ۳۱، ۵۰)۔ ۳ احمد ینالتگین کی ترکیب اضافت ابنی کی ایک مثال ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ احمد، ینالتگین کا لڑکا تھا (ملاحظہ ہو ابن الاثیر جلد ۹ ص ۲۸۱)، احمد کے والد کا صحیح نام ینالتگین تھا نہ کہ نیالتگین جیسا کہ تاریخ بیہقی کے ایک مطبوعہ نسخہ اور چند مخطوطات میں ملتا ہے [ملاحظہ ہو کلکتہ ایڈیشن صفحات ۴۹۶ - ۴۹۸ وغیرہ) زین الاخبار (مرتبہ ناظم) صفحات ۹۷ - ۱۰۲، ایلیٹ اور ڈاؤسن (Elliot & Dowson) جلد ۲ صفحات ۱۱۲ - ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۳۳ - ۱۳۴ اور Hodivala ص ۱۲۲] کے صحیح نام کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ بیہقی (طبع تہران ۱۳۲۹) صفحات ۲۷۱، ۳۴۷۔ ابن الاثیر ۹، طبقات ناصری، تعلیقات ص ۳۹۷ وغیرہ

۴ احمد حسن میمندی؛ یہ بھی اضافت ابنی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وزیر اعظم کا نام احمد تھا اور اس کے والد کا نام حسن، لیکن بعض جدید کتابوں میں یہ نام غلطی سے احمد بن حسن کی بجائے احمد حسن لکھا گیا ہے یہ کوئی مرکب نام مثل شاہجہاں نہیں ہے جس میں اضافت کو ختم کر دیا گیا ہے

ہو رہا تھا۔ خواجہ مذکور، قاضی شیراز ابوالحسن کا بھی دشمن تھا اس نے احمد ینال تگین جیسے عظیم شخص کو قاضی شیراز کا مدمقابل بنانا تصور کیا کیونکہ احمد ینال تگین کا تقرر قاضی شیراز کے لئے موجب ذلت تھا۔

۴ شعبان ۴۲۱ھ بروز اتوار بادشاہ نے حکم دیا کہ احمد کو توشہ خانہ میں لے جا کر اس کو خلعت سے نوازا جائے۔ موزیر خلقی سے اس کی پذیرائی کی۔ دوسرے دن وہ پھر دربار میں آیا جہاں اس نے حلف وفاداری اٹھایا اور اقرارنامہ کے کاغذات کئے جو محافظ خانہ کے نگران کی تحویل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد خواجہ احمد حسن میمندی نے احمد سے کہا "تم ایک سپہ سالار ہو تم کو اپنے اقرارنامہ کی دفعات کے مطابق عمل درآمد کرنا ہے تم کسی بھی فرد سے سیاسی یا مالی مسائل پر کوئی گفتگو نہ کرو ہاں تم ایک کمانڈر کے تمام فرائض ادا کرنے کی کوشش کرو گے تاکہ قاضی شیراز نہ تمہارے معاملات پر ہاتھ ڈال سکے اور کسی قسم کی رکاوٹ کا سبب بن سکے۔ اعلیٰ حضرت اس بات کو مناسب تصور فرماتے ہیں کہ تمہارے ہمراہ کچھ دیلمی سردار اور کر دیئے جائیں جنہوں نے سرکش باغی غلاموں کی جہاں نوازی کی ہے تم ان سب کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے اور ان سے کام لو گے لیکن ان کو دریائے چندرابا (چناب)[1] کے اس پار اپنے یا بادشاہ سلامت کی اجازت کے بغیر نہ جانے دینا تم کو یہ بھی خیال رکھو گے کہ وہ لاہور کے قلعہ کی فوج سے ملنے نہ پائیں۔ اور ان کو شراب پینے اور چوگان کھیلنے کی بھی اجازت نہ ہو۔"

۵ شعبان بروز اتوار، بادشاہ اپنے بہت سے ہمراہیوں کے ساتھ داؤدی شاہ بہار کو روانہ ہوا۔ اسی وقت ہندوستان کے سپہ سالار کا بھی گھوڑا طلب کیا گیا جس پر وہ سوار ہو کر روانہ ہوا۔[2]

بنارس پر احمد کا حملہ

احمد ینال تگین کی روانگی کے وقت اس کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ وہ قاضی شیراز سے ہوشیار رہے کیونکہ سپہ سالار کی حیثیت سے احمد کا انتخاب بادشاہ نے کیا تھا اور اس پر قاضی کا کوئی کنٹرول نہ تھا۔ اسی وجہ سے احمد اور قاضی شیراز کے درمیان فوج کی سربراہی کے سلسلہ میں اختلافات رونما ہوا جس نے بہت طول کھینچا۔ فوج اور سپاہی احمد کے ساتھ ہو گئے اور اس نے اپنے ہمراہیوں کے مشورہ سے ایک پلان بنایا کہ وہ کسی دور دراز مقام پر جائے۔ قاضی نے اپنے قاصدوں کے ذریعہ بادشاہ سے احمد کی شکایت کہلائی۔ بادشاہ نے اپنے وزیر اعظم سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ وزیر اعظم نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ قاضی کو اس بات سے مطلع کر دینا چاہیئے کہ اس کا کام صرف مالیاتی مسائل کی نگہداشت ہے اس کو سپہ سالاری یا فوج کے کسی معاملے سے کوئی علاقہ نہ رکھنا چاہیئے۔ احمد خود وہ کچھ کرے گا جو کچھ اس کو کرنا چاہیئے اور وہ ٹھاکروں سے مال اور خراج دونوں وصول کر کے اس میں گراں بہا اضافہ کرے گا۔ احمد کو جب اس خط کا علم ہوا جو قاضی کو لکھا گیا تھا تو اس کی ہمت اور بڑھ گئی وہ اپنے سپاہیوں ا

---

[1] چناب کا اصل نام چندر بیگا تھا ملاحظہ ہو ۲۶۲ و ۴ ق ۵۰ - ۱۱۱۷۷ و ۸ ۴ ۹ ۵۰ Kalhana III البیرونی نے دونوں نام اور چندرابا لکھے ہیں ملاحظہ ہو ۲۵۹ ۰ I و Sachau [2] تاریخ بیہقی، تہران ۱۳۴۴، صفحات ۲۶۶ - ۲۷۱ میں نے بیشتر اور ڈاؤسن کے انگریزی ترجمہ کو پیش نظر رکھا ہے ملاحظہ ہو جلد ۲ صفحات ۱۱۶ - ۱۲۲

کی فوج کے ساتھ چلا اور انھی نے ٹھاکروں سے کافی خراج وصول کیا۔ اس نے دریائے گنگا کو پار کیا اور اس کے بائیں کنارے پر پہونچا۔ خلاف توقع وہ ایک ایسے شہر میں وارد ہوا جس کا نام بنارس تھا اور وہ شہر گنگ (Gang) کے علاقہ سے متعلق تھا۔ اس وقت تک کوئی مسلم فوج ابھی تک نہ پہونچی تھی۔ یہ شہر دو فرسنگ[1] کے مربع میں پھیلا ہوا تھا جس میں پانی کی بہتات تھی۔ اس علاقہ میں احمد کی فوج خوف کی وجہ سے صبح سے نماز ظہر[2] تک ہی رہی۔ زیادہ تاخت و تاراج ممکن نہ تھی اس لئے بزازوں[3]، گندھیوں اور جوہریوں کے بازار لوٹے گئے فوجیوں کو کافی دولت ملی اور وہ لوگ سونا، چاندی، جواہرات اور خوشبو کی اشیاء لے کر اپنے مستقر بحفاظت واپس آگئے۔

احمد کی اس فتح سے قاضی کو اتنا صدمہ ہوا کہ قریب تھا کہ وہ پاگل ہو جائے اس نے تیز رفتاری کے ساتھ بادشاہ کے پاس قاصد بھیجے اور یہ پیغام کہلایا کہ احمد نے ٹھاکروں سے کافی دولت اور خراج وصول کیا ہے جس کا ایک بڑا حصہ اپنے تصرف میں رکھا ہے اور مختصر سا حصہ دربار کو بھیجا گیا ہے۔ قاضی کے خفیہ ایجنٹوں نے بھی دربار میں قاضی کے شر سے سر ملایا۔ اور احمد کی شکایت میں اس کی ہم نوائی کی۔ محاسبوں اور اہم درباری امراء نے احمد کے حساب میں وہ تمام رقم لکھ دی جس کی اطلاع قاضی نے بہم پہونچائی تھی۔

قاضی کے اس پیغام نے سلطان مسعود کو بہت برگشتہ خاطر کیا۔ اسی اثنا میں احمد کا فرستادہ قاصد مال خراج اور اس کے ایک خط کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا جس میں بنارس کی فتح کا مژدہ عظیم تھا جس کی وجہ سے فوج مالا مال ہو گئی تھی اس کے علاوہ ٹھاکروں سے وافر دولت اور خراج بھی وصول کیا گیا تھا جس میں بہت سے ہاتھی بھی شامل تھے۔ یہ خط اندر پت[4] سے لکھا گیا تھا اور فوج لاہور کے راستے خوشی خوشی واپس ہو رہی تھی۔

بیہقی کے اس بیان کا خلاصہ ہے جس میں اس نے احمد کی تقرری (بحیثیت سپہ سالار افواج ہند) اور حملہ بنارس کی فتح کا حال اپنی تاریخ میں لکھا ہے میں اس بیان پر مندرجہ ذیل معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں گا۔

(۱) اس واقعہ کا بیان ابن الاثیر نے بھی کیا ہے (کامل ج ۹ ص ۱۲۰) اگرچہ اس کا بیان غلطیوں سے خالی نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کے بیان سے مذکورہ حملہ پر کچھ نئی روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] فرسنگ یا فرسخ چار عربی میل کے برابر ہوتا ہے جو ڈاکٹر ... کے قول کے مطابق ۵ میل سے کچھ ہی کم ہوتا ہے (دیباچہ 22.4.3، ... Vala ۱۹۵۰ء) اس بات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کاشی اور شاید بدھوں کا شہر سارناتھ اس میں شامل تھے کیونکہ سنسکرت ادب میں کاشی اور وارانسی مترادف کلمات ہیں۔ اور سارناتھ موجودہ شہر سے ۴ میل شمال کی طرف ہے۔ [2] ایلیٹ اور ڈاوسن کے ترجمہ میں یہ نماز ظہر (ص ۱۲۳) ہے مگر اصل متن میں نماز دیگر کا لفظ ہے جس کے معنی نماز عصر کے ہیں۔ "نماز پیشین" کا ترجمہ نماز ظہر کیا جا سکتا ہے ملاحظہ ہو تاریخ بیہقی ص ۴۵۵۔ [3] ابن الاثیر جلد ۹ ص ۱۳۱ میں ہے۔ وہ بازار اور ان میں خوشبو، جوہریوں اور گندھیوں کے بازاروں کا تذکرہ ہے۔ بزازوں کے بازار کا تذکرہ نہیں ہے۔ [4] فارسی متن صفحات ۱۲۴-۱۲۵ ایلیٹ اور ڈاوسن جلد ۲ صفحات ۱۲۴ - ۱۲۵

"احمد ینال تگین نے شہر کے ایک حصہ پر چڑھائی کی اور اس کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ لوگ جو کچھ دور پہ بسے ہوئے تھے اس سے آگاہ نہ ہو سکے۔ مسلم فوج نے شہر کو اس طرح لوٹا کہ مال غنیمت میں سے سونا اور چاندی تول کر تقسیم کی گئی۔ اس حملہ سے قبل یا بعد اس شہر تک کوئی مسلم فوج نہ آسکی تھی۔ احمد نے اس شہر پر دوبارہ حملہ کا ارادہ کیا لیکن اس کے ہمراہی اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔"

ابن الاثیر نے احمد ینال تگین کو ہندوستان میں سلطان محمود بن سبکتگین کا نائب لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ احمد کا تقرر سلطان مسعود نے کیا تھا جیسا کہ بعد کے صفحات میں خود ابن الاثیر نے بھی لکھا ہے (ایضاً ص ۱۶۰) ابن الاثیر نے تاریخ کامل میں حملہ کا سال ۴۲۱ھ لکھا ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ بقول بیہقی یہ حملہ ۴۲۴ھ کے موسم گرما میں ہوا تھا اور جس شہر پر یہ حملہ ہوا تھا اس کا نام وارانسی چاہئے نہ کہ نارسی۔

۲۔ بنارس پر احمد کے حملہ کا ذکر کسی معاصر یا بعد کے مورخ نے نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ گردیزی کی تاریخ زین الاخبار بھی اس ذکر سے خالی ہے اس واقعہ کا ناقل صرف ابن الاثیر ہے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تاریخ بیہقی کے نسخوں تک دسترس نہ رکھتے تھے ابوالحسن بیہقی مصنف تاریخ بیہق، ابوالفضل بیہقی کی تاریخ کی کمیابی کا ذکر کرتا ہے

۳۔ گردیزی اور اس کے متعلد مورخین سلطان مسعود کے بنارس پر حملہ کے بجائے درۂ کشمیر کے ایک قلعہ سرسوتی پر حملہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن الاثیر وہ واحد مورخ ہے جس نے دونوں حملوں کا ذکر کیا ہے۔ گردیزی کا بیان یہ ہے کہ[۳]

"امیر شاہد، سلطان مسعود ۴۲۴ھ میں ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور درۂ کشمیر کے ایک قلعہ کے خلاف مورچہ بندی کی۔ قلعہ کے لوگوں نے کافی جم کر مقابلہ کیا لیکن آخرکار انکو پسپا ہونا پڑا اور قلعہ فتح کر لیا گیا۔ فوج مال غنیمت سے مالا مال ہو گئی اور بہار کے موسم میں غزنی واپس ہوئی"

اس مہم کا حال ابن الاثیر،[۴] نظام الدین بخشی،[۵] فرشتہ،[۶] بدایونی[۷]، اور دیگر مورخین نے بیان کیا ہے لیکن سب سے زیادہ مربوط بیان وہ ہے جو ابن الاثیر نے لکھا ہے۔ ۴۲۴ھ کے واقعات کے تحت وہ لکھتا ہے[۸]

---

[۱] باقی اہل البلد لم یعلموا بذلک لان طولہ منزل من منازل الہنود وعرضہ مثلہ کے الفاظ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ حملہ شہر کے اس حصہ پر کیا گیا تھا جو ہندو آبادی سے دور تھا ممکن ہے جس جگہ حملہ کیا گیا تھا وہ بودھوں کا شہر سارناتھ ہو جو ۷ میل کی دوری پر ہے [۲] طبع ص ۱۷۵-۱۰۰

[۳] زین الاخبار، تہران ۱۳۴۷، ص ۱۹۰

[۴] جلد ۹ صفحات ۱۶۰-۱۶۲

[۵] طبقات اکبری، اول، ص ۲۲ [۶] جلد اول ص ۴۱

[۷] منتخب التواریخ، ص ۱۲ [۸] جلد ۹، ص ۱۶۰

" رجب کے مہینے سلطان مسعود بن محمود بن سبکتگین نیشاپور سے غزنہ آیا اور وہاں سے ہندوستان گیا ۔
ہندوستان جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی تخت نشینی کے بعد احمد بن ینال تگین کو ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کیا تھا تاکہ وہ ہندوستانی سرحد کے مسائل کو حل کرتا رہے ۔ احمد ینال تگین نے خود کو وہاں مستحکم کر لیا تھا۔
مسعود جب عراق جانے کے لئے خراسان سے گذر رہا تھا تو اس کو ہندوستان میں احمد کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ سلطان نے آگے جانا ملتوی کر دیا اور تیز رفتاری کے ساتھ غزنہ آیا اور یہاں کے مسائل حل کر کے وہ عازم ہندوستان ہوا ۔ وہاں پہونچکر وہ احمد کی بغاوت کو دبانے میں کامیاب ہوا اور اس کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ پھر سلطان نے سرسوتی پر فوج کشی کر کے اس کا محاصرہ کیا اور قلعہ کو فتح کر لیا جسکو فتح کرنے سے اس کا والد سلطان محمود[1] قاصر رہا تھا "

[2]۴۲۹ھ کے واقعات کے تحت ابن الاثیر رقم طراز ہے ۔

"اس سال سلطان مسعود نے سرسوتی اور اس کے پاس کے دیگر قلعوں کو فتح کیا۔ اس حملہ کا خاص سبب ہندوستان میں احمد بن ینال تگین کی حکم عدولی تھی جس کا ذکر آگے آ چکا ہے ۔ اس کو مطیع کرنے کے بعد سلطان مسعود کافی عرصہ تک ہندوستان میں مقیم رہا۔ پھر وہ سرسوتی کے قلعہ کو فتح کرنے کے ارادہ سے چلا یہ قلعہ ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں تھا مسعود نے اپنے والد کی طرح اس کا محاصرہ کیا۔ محصور راجہ ایک بڑی رقم نذر کرنے پر تیار ہو گیا جس کو اس نے قلعہ کے مسلم تاجروں سے جبراً وصول کیا تھا۔ یہ تاجر کسی نہ کسی طرح سلطان تک اپنا پیغام پہونچانے میں کامیاب ہو گئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس محاصرہ کو ختم نہ کرے سلطان نے ان تاجروں کے مشورہ پر عمل کیا اور نتیجہ کے طور پر قلعہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد سلطان نے اس سے ملحقہ شہروں کو بھی فتح کیا۔ "

مسعود کی خواہش تھی کہ وہ ہندوستان میں اور ٹھہرے لیکن خراسان کے واقعات نے اس کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کو خیر باد کہکر ایران چلا جائے۔ بہرحال اسی اثنا میں اس کو موقع مل گیا کہ وہ ایک قلعہ کا جس کا نام Naghsi (غالباً ہانسی) تھا محاصرہ کرے۔ جہاں وہ ۱۰ صفر کو پہونچا لیکن اس نے یہ محاصرہ ایک ساحر کی ہوشیاری کی وجہ سے اٹھا لیا۔
مذکورہ بالا بیان اس بات کو روز روشن کی طرح واضح کرتا ہے کہ مسعود نے ۴۲۲ھ / ۴۲۵ھ میں تلک (Tilak)

---

[1] ص ۱۶۲ ، لیکن تاریخ کی جو کتابیں ہماری دسترس میں ہیں ان میں سے کسی میں بھی یہ بات مندرج نہیں ہے۔ غالباً مؤلف ۴۰۹ھ کے سرسوا پر محمود کا حملہ (ایم ناظم سلطان محمود غزنوی ص ۱۱۰) سرسوتی کے حملہ سے بالکل مختلف ہے۔ ملاحظہ ہو - Cunningham

[2] Archaeological survey of india ، ۱۸۷۶-۱۸۷۷ء جلد ۹ ص ۱۶۲
[3] اس کا ذکر فرشتہ نے بھی کیا ہے ، جلد اول ص ۴۲

کا تقرر ہندوستانی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے کیا تھا جو آخرکار احمد ینال تگین کی بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہوا۔
سرسوتی کا قلعہ کہاں تھا؟ اس سلسلہ میں کافی اختلاف رائے ہے ہم جانتے ہیں کہ کشمیر میں اس کا نام کا کوئی قلعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک دریا کا نام ہے جس کا ذکر سنسکرت کے شاعر کلہانا (Kalhana) نے اپنی کتاب راج ترنگنی میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے[1]

جب کوئی شخص شارداد یوی کے معبد تک جاتا ہے تو وہ دریائے مدھومتی اور سرسوتی کے پاس پہونچ جاتا ہے جس کی شاعر پرستش کرتا ہے (کتاب اول سطر ۳۷)

مسٹر ایم۔ اے۔ اسٹین[2] (M.A. Stein) نے اس دریا کے جائے وقوع کی تعیین اپنے اس بیان میں کی ہے

"دریائے مدھومتی کے داہنے کنارے پر شارداد یوی کا معبد ایک ممتاز جگہ پر نمایاں ہے۔ اس کے شمال مغربی ڈھلوان میں وہ جگہ ہے جہاں مدھومتی اور کشن گنگا کا پانی ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ شمال کی طرف چٹانوں میں ایک چھوٹا سا خستہ دریائے سارنگ کے گھومنے کی جگہ کی نشاندہی کرتا ہے جو پہاڑوں سے نکل کر آتا ہے اور دریائے مدھومتی سے اوپر کی طرف کچھ فاصلہ پر کشن گنگا سے مل جاتا ہے۔ یہی وہ سرسوتی ہے جس کا ذکر کلہانا نے کیا ہے جو آج بھی روایتی طور سے اسی نام سے معروف ہے۔ مغرب کی طرف ایک اونچا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو کھاگان (Khagan) کی چڑھائی کا منظر پیش کرتا ہے"[3]

بظن غالب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کشمیر کے اس حصہ پر سلطان مسعود نے حملہ کیا ہو، لیکن یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ کلہانا نے اپنی کتاب راج ترنگنی میں سلطان مسعود کے والد سلطان محمود کا ذکر کیا ہے نہ کہ سلطان مسعود کا۔ وہ اپنے بیان میں میں ایک لڑائی کا حال لکھتا ہے جو ہمیرہ[4] (اس نے سلطان ذکر اسی لفظ سے کیا ہے) اور ہندوشاہیہ کے راجہ ترلوچن پال سے ہوئی تھی۔[5]

بہرحال ہم کو ان دو دریاؤں کا علم ہے جو سرسوتی کے نام سے معروف ہیں اور جن کا تذکرہ امپیریل گزیٹیر[6] میں اسطرح ہے۔

سرسوتی (۱) پنجاب کا دریا ہے جو ریاست سرمور سے نکلتا ہے اور انبالہ ضلع کی سرحد پر ختم ہو جاتا ہے یہ دریا

---

[1] کتاب اول سطر ۳۷ (First book. L. 37)
[2] Kalhana II P. 282
[3] Kalhana BK VII ll. 535–56
[4] یہ لفظ امیر کی بگڑی ہوئی شکل ہے ملاحظہ ہو ناظم کی کتاب سلطان محمود غزنوی صفحات ۹۲–۹۳
[5] V. XXII P. 97

میدان میں اَدھو بدری کے پاس مڑتا ہے اور چند میلوں کے بعد ریت میں ناپید ہو جاتا ہے لیکن جنوب میں تین میل چلنے کے بعد بھوانی پور کے گاؤں میں پھر نمودار ہو جاتا ہے۔ یال چھتر کے مقام پر کچھ دور کے بعد پھر ناپید ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ نمودار ہو کر جنوب مغربی سمت میں کرنال سے بہتا ہوا پٹیالہ کے مقام پر گھگر (؟) Ghaggar میں ۱۰۱ میل چل کر مل جاتا ہے ۔

سرسوتی (ب) ایک چھوٹا لیکن مغربی ہندوستان کا مقدس دریا جو اراولی (Aralli) کے جنوب مغرب سے نکلتا ہے اور جنوب مغرب کی طرف تقریباً ۱۰۱ میل بہتا ہوا چھوٹے رن کچھ میں مل جاتا ہے [1]

بظن غالب دوسرا دریا ہے سرسوتی البیرونی کے کتاب الہند کے بیان کردہ سرسوتی کے مماثل ہے تو سومنات کے دہانہ پر سمندر سے مل جاتا ہے یہ دریا مقدس مانا جاتا تھا اور اس کا ذکر پُران میں بھی ہے [2]۔

ان دریاؤں کے آس پاس پنجاب میں ایک شہر تھا جس کا نام بھی یہی تھا اور اسی جگہ پر آجکل کا سرسا آباد ہے۔ یہ مقام ضلع حصار کی تحصیل اور اس کا صدر مقام ہے اور حصار سے ۲۰ میل کی دوری پر واقع ہے جو آجکل ریاست ہریانہ کا ایک ضلع ہے۔ یہ ایک قدیمی مقام ہے اور اس کا ذکر سرسوتی کے نام سے اُس جگہ کے لئے کیا جاتا ہے جہاں پرتھوی راج محمد غوری سے شکست کھانے کے بعد گرفتار ہوا تھا۔ اس شہر کا ذکر طبقات ناصری میں بھی ملتا ہے [3]۔ غالباً یہی وہ شہر ہے جس کو مسعود نے تاخت و تاراج کیا تھا نہ کہ کشمیر کا کوئی شہر۔ اس نظریہ کو ابن الاثیر کے اس بیان سے بھی تقویت پہونچتی ہے کہ اسی سلسلہ میں مسعود نے ہانسی پر بھی حملہ کیا تھا جو مذکورہ مقام سے نزدیک ہی ہے

۴۔ بیہقی کا بیان ہے کہ احمد ینالتگین نے ٹھکروں سے خراج وصول کیا تھا۔ یہ لفظ ٹھاکروں کا مفرس ہے جس کے معنی حکمراں کے ہیں لیکن موجودہ زمانے میں یہ لفظ ذات کی نمائندگی کرتا ہے نہ کہ کسی عہدے کی۔ ہندوستانی لفظیات کا مفرس جبت ہے۔ یعنی اس لفظ میں لمبے مصوتے کی جگہ چھوٹا مصوتہ رکھ لیا گیا ہے جو تشدید پر ختم ہوتا ہے اور پنجابی زبان کے لہجے کو نمایاں کرتا ہے ۔

۵۔ بیہقی کا یہ بیان اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ احمد ینالتگین کے حملہ سے قبل بنارس تک کوئی بھی مسلم فوج نہ پہونچی تھی۔ آئین اکبری میں لکھا ہوا ہے کہ محمود غزنوی دو مرتبہ ۴۱۰ھ اور ۴۱۳ھ ہجری میں بنارس آیا لیکن

---

[1] Sachau I, P. 257, 261, 45 — II P. 105
[2] Sachau I, P. 142 [3] Imperial Gazetteer XXII P.145 (last line), XXIII, P.45
[4] ملاحظہ ہو کابل ایڈیشن جلد اول صفحات ۲۲۴، ۲۵۴، ۲۰۷، ۴۰ [5] ملاحظہ ہو کابل ایڈیشن جلد اول صفحات ۲۰۰، ۲۰۷، ۲۵۴، ۲۲۴
[6] ص ۱۰۱ [7] ریورٹی دوم ۱۱، Jarrett ص ۱۸۸، یہاں دوسری تاریخ ۴۱۶ درج ہے ۔ فارسی متن میں ۴۱۲ ہے (ج ۲ ص ۱۷)

یہ بات نا ممکن معلوم ہوتی ہے[1]، اگرچہ مقامی روایات یہی ہیں کہ اس بادشاہ نے بنارس کے چوہان راجہ کو اکھاڑ پھینکا تھا ایک عالم افسانہ، سید سالار مسعود غازی کے حملہ کا سرا بھی بنارس کے حملے سے ملاتا ہے، سید موصوف محمود غزنوی کے ایک جرنل تھے جو مزار یوپی کے ایک شہر بہرائچ میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید مذکور اور احمد نیال تگین کے حملے ایک دوسرے سے گڈمڈ کر گئے ہیں اس کے علاوہ یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا رہا ہے کہ بنارس میں مسلم آبادی اور مسلمان گورنر راجا قنوج کے زمانے میں بھی تھے۔

۶۔ تاریخ بیہقی میں شہر کا نام بنارس مرقوم ہے۔ یہ ایک جدید نام ہے قدیم نام وارانسی یا بارانسی تھا۔ بیرونی کی الہند میں بارانسی کا لفظ چار بار آیا ہے (جلد اول صفحات ۱۲۱، س ۶، ۱۳۵، س ۴، جلد دوم ص ۶۵ س ۲ اور ایک بار اس کا تلفظ بنارسی بھی ہے (ج ا ص ۱۷، س ۱۰ اور ص ۱۵۹ س ۱۶) یہ نام اس بات پر دال کرتا ہے کہ بارانسی کا لفظ جو وارانسی کا مفرس ہے اس کی صحیح قرأت بارانسی ہے اور دوسری قرأتیں ہجے کی غلطیاں ہیں لفظ بنارس ایک قدیم لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے ماخذ مشکوک ہیں۔ پرانوں[2] کا شی کھا میا (— میاہتمیہ) اور کاشی کھنڈ کے بیان کے مطابق اس کا جائے وقوع ورونا یا برنا اور اسی[3] کے درمیان تھا۔ انھیں ناموں کے مرکب سے موجودہ نام بنا ہے۔ راج ترنگنی[4]، جو احمد کے حملہ کے سوا سو سال بعد لکھی گئی ہے اس شہر کا نام وارانسی بتلاتی ہے۔ اس بات کا ذکر دلچسپ ہوگا کہ ۱۹۵۵ء میں سرکاری طور پر بنارس شہر کا نام بدل کر وارانسی کر دیا گیا ہے اور جو وہاں پر ہے اس کا نام بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی ہو گیا ہے

۷۔ اس جملہ میں " وناگاہ بر شہری زد کہ آنرا بنارس گویند از ولایت گنگ بود" آخری لفظ بود بہت کم موزوں ہے۔ اس کی صحیح قرأت گنگ دیو ہونی چاہئے جیسا کہ اس کے حاشیے میں بھی مندرج ہے۔ کیونکہ گنگا دیو' (Gangeya) حکمران گنگیا دیو چیدہ کے مماثل ہے جو عرف عام میں گنگیا کہلاتا ہے اور ڈہلا (Dahala) کا حکمران تھا اس مماثلت

---

[1] اس سلسلہ میں ابوالفضل کا بیان کوئی اہمیت اور وزن نہیں رکھتا کیونکہ اس بارہ خاص میں عتبی اور گردیزی خاموش ہیں اور بیہقی اس کی تردید کرتا ہے۔ اس بات کی تصدیق البیرونی کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ اس مقدس شہر کو سلطان غزنہ نے کبھی بھی تاخت و تاراج نہ کیا۔ (ملاحظہ ہو Sachau I, Hodivala, P. 151 and Elliot, II P. 59)

[2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر آف یوپی XXVI صفحات ۱۸۹ - ۱۹۰ District Gazetteer of U.P. Vol. XXVI, P. 184

[3] آسی صرف ایک چشمہ ہے اور شہر گنگا کے بائیں کنارے پر شمال مشرق میں برنا ندی اور جنوب مغرب میں اسی نالہ کے درمیان ہے۔ Cunningham, Ancient Geog. of India P. 437.

[4] Book III LL. 297, 320, VII, LL. 846, 1007, 1010, VIII L. 13.

وجوہ حسب ذیل ہیں

(۱) احمد ینال تگین کے حملے کا زمانہ (۴۲۴ھ ۱۰۳۳ء) گنگیا کے حکمرانی کا زمانہ ہے (۱۰۲۰ء تا ۱۰۴۱ء)[1]

(ب) گوکلا دیو کا لڑکا گنگیا اس دور کا سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم حکمراں تھا جس نے شمالی ہندوستان کے ایک بڑے علاقے کو اپنے زیر نگین کر رکھا تھا وہ دھلا کا حکمراں تھا جس کا ایک پایہ تخت تری پوری اور دوسرا پریاگ[2] تھا۔ البیرونی نے بھی ۱۰۳۰ء میں اس کا ذکر دھلا کے زندہ حکمران کی حیثیت سے کیا ہے جس کا پایہ تخت تری پوری تھا[3] مزید برآں کچھ کتبے بھی مع اس کتبہ کے جو Mauani میں ہے اور جس پر ۱۰۳۷ - ۱۰۳۸ مرقوم ہے اس کے زندہ حکمراں[4] ہونے کے شاہد ہیں۔ پروفیسر ہودی ولا کا یہ بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ابن ظفیر نے جس کا بکو تجدا یا نجدا کا ذکر کیا ہے، اور جو اس علاقہ کا حکمراں تھا جس کی سرحد چندال کے حکمراں گندا کی ریاست کی سرحد سے ملتی تھی اور جس نے محمود غزنوی کو اسکے مہربان رویہ کی بنا پر بیش قیمت تحائف بھیجے تھے، وہ گنگیا چیدا سے مماثل ہے[5]

(ج) گنگیا، انگا (موجودہ بھاگل پور اور مونگیر کے اضلاع) سے اپنا اسلحہ منگواتا تھا، اس حقیقت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وارانسی جس کو کاشی بھی کہا جاتا ہے، اس کے قبضہ میں تھا۔

(د) کاشی، گنگیا کے لڑکے کرن دیو کے زیر حکومت تھا۔ جس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جس برہمن نے اس نے والد کے سالانہ شرادھ کی جنوری ۱۰۴۲ء میں سربراہی کی تھی اس کو اس نے کاشی میں ایک گاؤں بطور جاگیر بخشا تھا[6]

پروفیسر ہودی والا کا یہ بیان صحیح ہے کہ بیہقی کا ذکر کردہ گنگا دیو اور البیرونی کا ذکر کردہ گنگیا ایک ہی شخص ہے۔[7] لیکن عتبی[8] اور گردیزی[9] کے بیان کردہ چندر رائے کو ہودی ولا کا گنگیا قرار دینا قابل قبول نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ چندر نے

---

1 Mirashi, corpus inscription um Indicarum vol. IV Inscriptions of The Kalachuri - chedi Era, Introduction studies in Indo Muslim Hist. P 73 2 corpus Inscription u IV. Introduction 3 sachau, Alberunies India, P 202

4 Archaelogical survey of India reports, XXI PP 112 and Plate XXVI

5 پروفیسر ہودی والا کا خیال ہے کہ کا بکنہ، ثانیہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور نجدیا تجدا چیدہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے (ملاحظہ ہو Studies in Indo Muslim Hist p. 73 6 corpus Inscriptionum IV, Introduction. 7 Banaras Palate of Karana, Asiatic researches vol P. 106 8 Studies in Indo Muslim Hist PP 148-161

9 تاریخ بیہقی ص ۱۳ 10 زین الاخبار ص ۱۸۳ 11 ایم۔ ناظم، محمود غزنوی صفحات ۹۳ - ۱۰۶

شردا کا حکمراں تھا۔ جس کا گنگیا کے دھلا اور اس کے پایۂ تخت ترو نپوری سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔

گنگیا کالاچوری خاندان کا معروف ترین حکمراں تھا۔ جب وہ تخت سلطنت پر بیٹھا تو کالاچوری حکومت مدو بہ زوال تھی اس نے اپنی سیاست اور شجاعت سے خاندان کا وقار بحال کر دیا اس نے اپنی سلطنت کو شمال میں اس حد تک بڑھایا کہ اترپردیش کا ایک بڑا علاقہ اس کے زیر نگیں آگیا چونکہ یہاں کے لوگ اتنے کمزور تھے کہ وہ مسلمانوں کے حملوں سے اپنے مقدس مقامات نہیں بچا سکتے تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ گنگیا نے انکو اپنے زیر عاطفت پناہ دی اور ان کی نگرانی کے لئے اس نے اپنا دوسرا دارالسلطنت بنایا جیسا کہ Piawan کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے اس نے مہاراج آدھی راج اور پرمیشور کے القاب اختیار کئے۔ یہ کتبہ اس کے عہد کا ہے۔[a] اس کے علاوہ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے اپنے پوتے کی طرح وکرماجیت کا بھی لقب اختیار کیا تھا۔ اس کے دشمنوں کی تحریروں میں بھی اس کا ذکر ایک فاتح عالم کی حیثیت سے ہے۔ جنوری ۱۰۴۱ء[b] میں اس نے اپنی موت کے وقت ایک وسیع اور عریض سلطنت چھوڑی جس کے حدود میں اس کے بیٹے کرن نے اور بھی اضافے کئے۔

۸ - جس خوشخبری کا ذکر اوپر آچکا ہے وہ اندراپی سے بھیجی گئی تھی۔ اس نام کی ایک قرات اندرا درتید ی بھی ہے جو غلط قرات معلوم ہوتی ہے۔ البیرونی دوآبہ کا ذکر اندراویدی کے نام سے کرتا ہے (ملاحظہ ہو ۱ : ۲۱۱) انتا یا انتراویدی، زیریں دوآبہ کا قدیم ہندو نام ہے جو موجودہ اٹاوہ سے الہ آباد تک کے علاقہ پر محیط تھا۔ گویا کہ یہ لفظ کبھی پورے دوآبے کیلئے بھی مستعمل تھا۔ غالباً بیہقی نے اسی علاقہ کا ذکر کیا ہے اب بھی اندراپت نام کا ایک مقام موجود ہے جو قدیم اندراپرستھا کا قائم مقام ہے اور ۲۸ ۳۶ شمال میں ۲۰ ۷۷ مشرق میں یہی دہلی سے ملحق ہے۔ اصل گاؤں جمنا کے کنارے فیروز شاہ کوٹلا اور ہمایوں کے مقبرے کے درمیان واقع تھا۔ اس زمانے تک بھی اس گاؤں کا ایک پتھر ابھی تک محفوظ ہے لیکن اندراپت گاؤں کا علاقہ غالباً اس کا اصل جائے وقوع تھا۔ یہ گاؤں عہد وسطیٰ میں پرگنہ اہمیت کا حامل تھا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں علماء اور فضلاء کی ایک بڑی تعداد کو اس سرزمین نے خوش آمدید کہا ہے مثلاً مولانا عالم اندراپتی (مجموعۂ لطائف، مخطوطہ برٹش میوزیم، ریو سپلیمنٹری ورق ۱۴۳) مولانا حسام الدین اندراپتی (سیر الاولیاء) مولانا رکن الدین اندراپتی (ایضاً ۲۶۷ - ۶۸)

---

[1] Archaeological Survey of India reports vol. XXI pp 112 and XXXVIII

[2] Corpus inscriptionum Indicarum vol. IV introduction.

[3] EP. Ind. vol. I P. 222

[4] Studies in Indo Muslim History P 161

[5] Imperial Gazetteer XXIII P 331

تاریخ بیہقی میں خلا

تاریخ بیہقی کے کچھ مطبوعہ نسخوں اور کچھ مخطوطات میں بھی احمد کے بنارس پر حملہ کے بعد کے واقعات کے سلسلہ میں ایک خلا سا ہے۔ ڈاؤسن کا خیال ہے کہ صفحہ ۴۹۸ پر (طبع Bibliotheca Indica) ڈیڑھ صفحات[1] کا مواد درمیان سے غائب ہے (طبع تہران ۱۳۲۴ھ ص ۴۰۲) لیکن تہران کے مطبوعہ نسخے میں ایک موزوں جملہ سے اس خلا کو پُر کر دیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا گم گشدہ مواد صرف ایک سطر کا تھا جیسا کہ طبع تہران میں مندرج ہے یا ڈیڑھ صفحات کا تھا جیسا کہ طبع Bibliotheca Indica کا بیان ہے یا اس سے بھی زیادہ مواد غائب ہے جیسا کہ ہودی وال کا بیان ہے[2]؟ ہودی والا کے خیال کے مطابق یہ مواد گیارہ ماہ کے حالات پر محیط ہے لیکن جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، نو یا دس ماہ کے حالات بیچ سے غائب ہیں نہ کہ گیارہ ماہ کے حالات۔ اسلئے یہ خیال حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ گم شدہ مواد ڈیڑھ صفحات سے زائد تھا۔

۴۲۴ھ کے اواخر کے حالات میں مذکورہ خلا سے پہلے ان وقائع کا ذکر ہے۔

۱- یکم رجب ۴۲۲ھ بروز جمعہ کو بوسہل ہمدوی کی روانگی، ص ۳۹۵
۲- ۲ رجب ۴۲۲ھ کو گرگانی قاصد کو خلعت دینے کا فیصلہ، ص ۳۹۶
۳- ۳ رجب بروز اتوار ۴۲۲ھ کو قاصدوں کی روانگی، ص ۳۹۶
۴- ۴ رجب بروز دوشنبہ ۴۲۲ھ ابوالحسن عقیلی کی وفات، ص ۳۹۷
۵- موسم گرما ۴۲۲ھ نیشاپور کے وقایع، صفحات ۳۹۷-۴۰۰
۶- " " ۴۲۲ھ بنارس پر احمد کا حملہ، صفحات ۴۰۰-۴۰۱

یہی وہ مقام ہے جہاں خلا کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ صفحہ ۴۰۲ پر جو وقائع مندرج ہیں اس پر جمادی الثانی بروز جمعہ کی تاریخ درج ہے (سال مندرج نہیں ہے جو یقیناً [illegible] ہوگا) اس کے بعد سہ شنبہ ۱۵ جمادی الثانی، ۱۵ رجب، پنجشنبہ ۲۴ رجب، یکم شعبان، ۵ شعبان (یہ تمام تاریخیں ص ۴۰۹ پر درج ہیں) اور ۱۶ شعبان، ۳۰ رمضان (ص ۴۱۱)، ۱۰ پنجشنبہ دس رمضان ۴۲۲ھ (ص ۴۲۱) کی تاریخیں درج ہیں۔ اس کے بعد پورے سال کی ڈائری حسب سابق لکھی ہوئی ہے۔ ۱۵ رمضان، یکم شوال بروز سہ شنبہ (ص ۴۲۴)، شوال، بروز جمعہ ص ۴۲۵) ۷، ۲۷ شوال، ۷ ذیقعدہ (ص ۴۳۳) ۳ ذیقعدہ (ص ۴۳۳) ۱۵ ذی الحجہ بروز سہ شنبہ ۲۱ ذی الحجہ بروز

---

[1] جس قلمی نسخہ پر طہران ایڈیشن کی بنیاد ہے۔ اس میں بھی یہ خلا موجود ہے، ص ۴۰۲

[2] Studies in Indo Muslim History pp. 161, 162

[3] رجب کا مہینہ جون میں پڑا تھا

بچہار شنبہ (ص ۲۷۴) سلسلہ وار مندرج ہیں ۔ سنہ ۴۲۶ھ کی محرم کی پہلی تاریخ اتوار کے دن پڑی تھی [1] (ص ۴۲۶) چونکہ بیہقی دن کے لکھنے کا التزام کرتا تھا جس دن کہ محرم کی پہلی تاریخ پڑتی تھی [2]، اسلئے ۴۲۶ھ کے بقیہ ان دنوں کا تذکرہ ہوا میں محرم کی پہلی تاریخ پڑی تھی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ۴۲۵ھ کے اواخر کے ۴، ۵ ماہ کے حالات اور ۴۲۶ھ اوائل کے ۴، ۵ ماہ کے حالات تاریخ بیہقی کے موجودہ نسخوں سے غائب ہو گئے ہیں ۔

اس موقع پر یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ گمشدہ مواد سلطان مسعود کے ۴۲۵ھ کے آخری ماہ میں ہندوستان آنے، سرستی فتح کرنے اور ہانسی کا محاصرہ کرنے کے واقعات پر مشتمل ہوگا ۔اس گمان کو مندرجہ ذیل حقائق سے بھی تقویت پہونچتی ہے ۔

(۱) احمد کی بغاوت کا زمانہ وہی ہے جو سلطان مسعود کے حملۂ سرسوتی کا زمانہ ہے [3]

(۲) بیہقی ہی کے بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسعود ہندوستان میں دوبارہ آیا تھا ۔جبکہ موجودہ تاریخ صرف اسکے ایکبار ہندوستان آنے کا تذکرہ کرتے ہیں وہ حوالجات مندرجہ ذیل ہیں

"نذر کردم کہ گر ایزد عز ذکرہ شفا ارزانی دارد بر جانب ہندوستان روم تا قلعت ہانسی آید واز وقت کہ بنا کام از آنجا باز گشتم بضرورت چہ نالانی افتاد" [4]

"پس از قضای ایزد عز ذکرہ این علتہا پدید آمد از رفتن دو بار یکبار بہندوستان ویکبار بطبرستان" [5]

میرے خیال میں "دوبار" کے لفظ کے بعد "یکبار" کا لفظ زوائد میں سے ہے کیونکہ یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے سلطان دو بار ہندوستان آیا تھا

(۳) - یہ جملہ "سپاہ سالار گفت احمد را از پیش وی گریختہ بود، نماندہ بود پس شوکتی و ہر سالار کہ نامزد کردہ آید تا پذیرد او رود بآسانی شغل او کفایت شود" غالباً احمد کی اس پہلی بغاوت کی طرف اشارہ کرتا ہے [6] سلطان مسعود نے خود فرو کیا تھا جیسا کہ ابن الاثیر کا بیان ہے چونکہ سیاق عبارت کا علم نہیں تھا اس لئے تہران ایڈ

---

[1] سنہ ستہ وعشرین واربعمایہ غرہ اش روز شنبہ بود [2] محرم این سال (سنہ اثنی وعشرین واربعمایہ سہ شنبہ بود (ص ۲۷۴) تاریخ سنہ ثلاث وعشرین واربعمایہ غرہ محرم روز پنجشنبہ بود (ص ۳۶۶) سال اربع وعشرین واربعمایہ در آمد، غرۂ ماہ وسال روز پنجشنبہ بود (ص ۹ ؟)

[3] بنارس پر احمد کا حملہ رجب ۴۲۴ھ کے بعد ہوا ہوگا اور بغاوت کی خبر (غالباً دوسری بار کی بغاوت) جمادی الثانی ۴۲۵ھ (ملاحظہ ہو، تاریخ بیہقی صفحات ۳۹۵ -۴۰۰- ۴۰۳- ۴۰۴- ۴۰۴)

[4] صفحات ۵۳۰، ۵۴۷

کے مرتب کو متن کے گنجلک ہونے کا احساس ہوا (ص ۲۰۲) اسی جگہ ایلیٹ اور ڈاوسن کے یہاں غلط ترجمہ راہ پا گیا ہے۔ ص ۱۲۵ جو درج ذیل ہے

"The commanue in chief said:
When one runs away from Ahmad
There can not be much honour
left, but what ever general is
sent against him, he will have
enough to do for There is a
strong force at Lahore"

سپہ سالار نے کہا: جب کوئی شخص احمد سے
فرار اختیار کرتا ہے تو یہ کوئی قابل عزت بات
نہیں ہوتی۔ جو کوئی بھی سپہ سالار اس کے مقابل
بھیجا جائے گا اس کو بہت کچھ کرنا ہوگا کیونکہ لاہور
میں ایک زبردست فوج مجتمع ہے

میرے خیال میں صحیح ترجمہ یہ ہوگا ۔

"The commander in chief said:
Since Ahmad had fled before
him (the sultan) there was not
honour left, who so ever be
appoin[illegible] general if generally
acceptable, his task would
easily accomplished for There is
a strong force at Lahore"

سپہ سالار نے کہا: چونکہ احمد اس کے
(بادشاہ کے) روبرو سے فرار اختیار کر چکا
ہے اب (اسکی) کوئی عزت باقی نہیں رہ گئی۔
جو بھی شخص سپہ سالار مقرر ہوتا ہے اور وہ سب
کے لئے قابل قبول بھی ہوتا ہے اس کا کام آسانی
سے پورا ہو جائے گا کیونکہ قلعہ لاہور میں
ایک زبردست فوج مجتمع ہے ۔

۴۔ ابن الاثیر نے وضاحت کے ساتھ اس بات کو بیان[1] کیا ہے کہ سنہ ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود، احمد کی بغاوت کی خبر سن کر تیز رفتاری سے ہندوستان آیا۔ باغیوں سے جنگ کے بعد اس نے سنہ ۴۲۵ھ میں سرسوتی پر حملہ کیا اور اسکو دوسرے قلعوں کے ساتھ فتح کیا۔ اس کے بعد وہ ہانسی کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ کر لیا لیکن بدقسمتی سے اس کو یہ محاصرہ اٹھا کر ایران واپس جانا پڑا۔

بظاہر ابن الاثیر نے یہ معلومات تاریخ بیہقی یا اسی طرح کی کسی دوسری تصنیف سے بہم پہونچائی ہوں گی۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ موجودہ تاریخ (بیہقی) ناقص ہے اور لہٰذا یہ اس زمانے کے حالات سے متعلق ہے جب سلطان مسعود نے سرسوتی وغیرہ پر حملہ کیا تھا۔

---

[1] IX P. 160

احمد ینال تگین کی بغاوت، گرفتاری اور موت

احمد ینال تگین کے تعلقات سلطان مسعود اور اعظم احمد حسن میمندی دونوں سے اچھے نہ تھے۔ یہ احمد ینال تگین (محمود کی) وفات پر مسعود کے دشمنوں کا طرفدار ہوگیا تھا اور نتیجہ کے طور پر مسعود کے تخت نشین کے بعد داروگیر کا شکار ہوا اور ایک بڑے جرمانے کا سزاوار قرار دیا گیا۔ مذکورہ جرمانہ کو پورا پورا ادا کرنے اس کو ہندوستان بھیجا گیا۔ اس لئے احمد ینال تگین ہندوستان کے دور سپہ سالاری میں مسعود سے کینہ گردیزی کا بیان ہے کہ

"چون مال بداد او را بسوی ہندوستان فرستاد و سالاری ہندوستان بدو داد اورا بجای الیاروق الحاجب آنجا فرستاد، و آن غضبہا و مصادرہ و رنج و استخفافہا کہ بر احمد ینال تگین رسیدہ بود، اندر دل احمد بود، چون بہندوستان رسید سر از اطاعت بکشید و عصیان پدید کرد"

بیہقی نے خواجہ احمد حسن میمندی اور احمد ینال تگین کے اختلافات کی اصل وجہ تو لکھی ہے کہ بات کا تذکرہ نہیں کیا ہے جس کا ذکر گردیزی کے بیان میں ہے۔ بہر حال احمد ینال تگین کو ہندوستان آنے سے جس معاہدہ پر دستخط کرنے پڑے تھے اور جس کا تذکرہ تاریخ بیہقی میں بھی ہے وہ معاہدہ گردیزی کے بیان کو صحیح کرنے میں پوری پوری مدد کرتا ہے۔

اس رنجش کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمد نے ۴۲۴ھ میں جب بنارس پر حملہ کیا تو اسکے فوراً بعد ہی سلطان مسعود سے اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے سلطان مسعود نے بذات خود آکر باغیوں کا قلع قمع کیا۔ سلطان مسعود نے ہندو اپنے منصوبوں کی تکمیل کی یعنی سرستی کو فتح کیا، ہانسی کا محاصرہ کرنے کے بعد ۴۲۵ھ کے اوائل میں ایران واپس چلا گیا۔ سلطان مسعود کی ہی دونوں کے بعد احمد نے دوبارہ بغاوت کی۔ اس بغاوت کی خبر کو سنکر سلطان مسعود بہت فکرمند ہوا اور فوراً ہی اپنے اور دوسرے امراء سے اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا۔ طے یہ پایا کہ تلک نامی ایک ہندو کا تقرر سپہ سالار کی حیثیت جو احمد کی بغاوت کو فرو کرے۔ سلطان مسعود نے تلک کو کامل اختیارات سونپ دیئے اور حکم دیا کہ وہ

۱ے طبع تہران ص ۱۹۷، طبع برلن ص ۹۷　۲ے ملاحظہ ہو تاریخ بیہقی صفحات ۲۸۴، ۱۴۹، ۱۲۳، ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۲۴
۳ے صفحات ۲۹۷، ۴۰۰　۴ے ص ۲۷　۵ے یہ بیان ابن الاثیر کا ہے، جلد ۹ صفحات ۱۲۰-۱۲۲　۶ے تار
یہ لفظ　۷ے جو کتابت کی غلطی ہے جلد ۴ ص ۱۲۱　۸ے بیہقی صفحات ۴۰۴-۴۰۹

وزد کرنے کے سلسلے میں جو عمل بھی مناسب سمجھے اس پر کاربند ہو اس کے علاوہ اس نے دبیر سلطنت کو بھی یہ پیغام بھیجا کہ وہ تلک کے تقرر کے سلسلے میں فرمان جاری کردے۔ بالآخر تلک نے احمد ینال تگین کے مقابلہ کے لئے سپہ سالار کی جگہ سنبھالی اور ۱۵ رجمادی الثانی ۴۲۵ھ کو ہندوستان کی طرف روانہ ہوا[1]

ماہ رمضان کے وسط میں[2] سلطان مسعود کو خبر ملی کہ احمد ینال تگین اپنے بہت سے سپاہیوں کے ساتھ لاہور آگیا ہے اور وہ قاضی شیراز اپنے تمام صلاح کاروں کے ساتھ Mandak ka kur[3] کے قلعہ میں در آیا ہے اور وہاں بار بار جنگ بھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اس قلعہ کے آس پاس کے تمام علاقے تاراج کرنے لگے ہیں۔ عید کے دن سلطان مسعود کو خبر دی گئی کہ احمد نے قلعہ فتح کرلیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلا دیا گیا کہ تلک نے ایک زبردست فوج جمع کرلی ہے اور اسی سمت بڑھ رہا ہے۔

سلطان مسعود نے تلک کو ایک خط لکھے جانے کا حکم دیا۔ جس میں اس نے تلک کو لکھوایا کہ جس تیز رفتاری سے ممکن ہو وہ احمد ینال تگین کے مقابلہ کو بڑھے۔ اس خط پر سلطان مسعود نے اپنی مہر لگائی اور اپنے دست خاص سے اس پر مکرر حکم تحریر کیا اس تحریر کی عبارت حاکمانہ[4] زور بیان کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ پھر یہ خط مکمہ تیز رفتاری

---

[1] بیہقی ص ۴۰۹ [2] ایضاً ص ۴۲۳ [3] (اس مقالہ کی جو سائیکلو پیڈیا کی مترجم کو ملی ہے اس پر حاشیہ آرائی ناصاف اور کٹا پٹا ہے کہ مترجم اسکا ترجمہ سے کرنے سے قاصر ہے)

[4] اس مقام پر ایلیٹ اور ڈاؤسن کا ترجمہ ناقص ہے مثلاً "آں مخذول را دل بشکست و دو گروہی میان لشکر افتاد" کا ترجمہ یہ کیا ہے "The heart of That vile rebel was quaking with him, and that there was a space of only four koss between the two armies"

حقیقتاً ملعون باغی کا دل اس سے تھرا رہا تھا کیونکہ وہاں دونوں افواج کے درمیان دو کوس کا فاصلہ تھا۔ اس جگہ بعینہٖ گروہ کا لفظ گروہ ہی پڑھنا چاہئے ترجمہ طبع کلکتہ میں گروہ کا لفظ مذکور ہے۔ مطلب یہ کہ فوج نظریاتی اختلاف کی وجہ سے دو گروہ میں منقسم ہو گئی تھی۔ "و مخاطب شد

رایں وقت از دیوان ما المعتمد بود" کا ترجمہ بالکل غلط کیا گیا ہے "and at the same time appropriate to the person addressed, This was concealed from his confidential Diwan. During this period, in our chancery Tilak was addressed as al-Mu-tamad (the most trust worthy.)"

(اور مخاطب شخص کے لئے اسی موزوں وقت، یہ بات اس کے خفیہ دیوان سے پوشیدہ رکھی گئی) صحیح ترجمہ یہ ہوگا (ہماری دارالکتاب میں اس وقت سے تلک کو المعتمد کا خطاب دیا گیا)

کے ساتھ تلک کو بھیج دیا گیا۔ ذیقعدہ سنہ ۴۲۵ھ کے اواخر میں تلک کا قاصد آیا[1] جس نے اطلاع دی کہ تلک نے دانشمندی سے باغی (احمد) کو قتل کر دیا ہے اس کے لڑکے کو قید کر لیا ہے اور جو ترکمان احمد کے ہمراہ تھے ان کو مغلوب کر لیا ہے۔ اس خط میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ کس طرح باغی نے اس کا مقابلہ کیا۔ پسپا ہوا اور شاہی افواج کے سامنے سے اپنے تین سو گھوڑ سواروں کے ساتھ بھاگا۔ تلک نے اس کے تعاقب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور اس کے لئے ۵ لاکھ درہم کا اعلان کیا۔ ایک دن اپنے دو سو گھوڑ سواروں کے ساتھ ایک دریا کے کنارے آیا جہاں پر اسے جٹوں[2] اور دوسرے ہندوؤں[3] کی ایک بہت بڑی تعداد نے گھیر لیا۔ جب جٹ اس پر حملہ آور ہوئے تو اس نے دریا میں غوطہ مارا اور جب وہ لوگ وہاں بھی اس کے پاس پہونچ گئے تو اس نے چاہا کہ اپنے لڑکے کو مار ڈالے مگر ہندوؤں نے اس کے لڑکے کو بچا لیا اور گرفتار کر لیا پھر وہ احمد کے مقابل ہوئے، احمد نے اپنا دفاع بڑی جوانمردی سے کیا لیکن ان لوگوں نے اس کو مار ڈالا اور اس کا سر قلم کر لیا[4]۔ سلطان مسعود اپنے فوجیوں کو پریشانی سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے سپہ سالار کو واپس آنے کا حکم دیا جس نے ۲۱ ذی الحجہ کو ۔۔۔ ۴۲۵ھ آنے کا انتظام کیا[5]۔ ا صفر سنہ ۴۲۶ھ کو سلطان مسعود نے ایک بیش قیمت خلعت اس کو عطا کی اور[6] ربیع الاول سنہ ۴۲۶ھ کو حاصل کردہ کامیابی کی خوشی میں ایک جشن عظیم منانے کا اہتمام کیا[7]۔

یہ سلطان محمود اور سلطان مسعود کے زمانے کے ایک اہم شخص کی مختصر سرگذشت ہے جس کا دور خود اپنی بے عقلی کی وجہ سے اچانک مختصر ہو گیا۔

گردیزی اور دیگر متاخر مورخین اگرچہ بیہقی کی تحقیق کے اصل نکتہ سے متفق ہیں مگر وہ مندرجہ ذیل میں اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

(۱) بقول گردیزی اور دیگر مورخین احمد کے خلاف مہم کا آغاز سنہ ۴۲۵ھ میں نہیں بلکہ سنہ ۴۲۶ھ میں ہوا۔

---

[1] ص ۴۴۳ [2] جاٹ ایک جنگجو نسل ہے جو بیشتر مغربی یوپی ہریانہ اور پنجاب میں آباد ہے۔ یوپی کے سابق وزیر اعلی چرن سنگھ جاٹ تھے۔ تاریخ بیہقی طبع تہران سنہ ۱۳۲۴ھ ص ۴۴۳ کا یہ حاشیہ کہ "بیشتر جاٹ نو مذہب ہیں جو پہلے مسلمان تھے" بالکل غلط ہے۔ سہیلی طور نثاری کا یہ خیال بھی کہ "جاٹ خانہ بدوشوں کی قوم ہے" بالکل غلط ہے۔ اس طرح لفظ جتا کی بجائے جٹیان بھی گئے ہے (آداب الحرب ص ۲۵۴) [3] ص ۴۴۴

[4] ص ۴۹۴ [5] ص ۴۹۷ [6] ۴۹۷

[7] زین الاخبار ص ۲۰۰

لیکن بقول ابن الاثیر[1] یہ احمد کی دوسری بغاوت تھی اس کی پہلی بغاوت ۴۲۲ھ[2] میں ہوئی تھی جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ابن الاثیر کا بیان زیادہ صحیح اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

(ب) احمد کے خلاف جو سپہ سالار بھیجا گیا تھا وہ بھی ایک ہندو تھا جس کا نام ناتھ[3] تھا اور جو احمد سے مقابلہ میں مغلوب ہو کر مارا گیا تھا۔ اس حادثہ کا ذکر ابن الاثیر اور بیہقی دونوں سے چھوٹ گیا ہے

(ج) زین الاخبار میں دوسرے سپہ سالار کا نام تلک لکھا ہوا ہے جو جہلان (Jahlan) کا لڑکا تھا جبکہ تاریخ بیہقی[4] میں اس کو ایک حجام کا لڑکا لکھا گیا ہے۔ بعد کے مورخین اس کو تلک بن حسین[5]، تولک بن حسین[6]، تلک بن جے سین[7] اور مالک بن جے سین[8] بھی لکھتے ہیں۔ یقیناً جے سین ایک معنی دار لفظ ہے لیکن یہ حسین کی تصحیف ہے جو فرشتہ اور تاریخ بیہقی میں واقع ہوئی ہے جبکہ حسین کا لفظ "جہلان" کے لفظ کی غلطی سے[9] معلوم ہوتا ہے کیونکہ قدیم ترین ماخذ میں یہ لفظ اسی طرح ملتا ہے۔ ہودی ولا کو جل[10] ہاتا (alhana) یا جہ لانسی کا لفظ شاہی شجرہ اور کتبہ میں ملا ہے۔

(د) گردیزی کا بیان ہے کہ تلک کے مجبور کرنے پر احمد شاہی افواج کی آمد سے قبل ہی مفرور ہو کر منصورہ اور سندھ کی طرف بڑھا۔ وہ دریا کو پار کرنے ہی والا تھا کہ طوفان آ گیا اور وہ دریا میں غرق ہو گیا۔ اس کی لاش دریا کے کنارے پڑی تھی جس کو دشمن کی فوج کے کسی شخص نے شناخت کیا کہ یہ احمد کی لاش ہے۔ اس شخص نے اس کا سر کاٹ لیا اور رکھا ہوا سر سلطان مسعود کے ملاحظہ کے لئے بلخ بھیج دیا گیا۔ ابن الاثیر گردیزی کے اس بیان سے متفق ہے لیکن اس مخصوص موضوع پر وہ اپنی بات زیادہ تفصیل سے پیش کرتا ہے۔

---

[1] جلد ۹ ص ۱۷۴ [2] صفحات ۱۶۰، ۱۶۲ [3] گردیزی: ناتھ بن محمد علی، طبقات، اول، ص ۲۳۳، ناتھ بن محمد علی، فرشتہ، اول، ص ۴۲، نے ناتھ لکھا ہے اور ہم نے یہی اختیار کیا ہے۔ بدایونی (اول ص ۲۲) نے ایک سپہ سالار کا ذکر کیا ہے جس کا نام ناہر تھا۔
[4] ص ۵۰۱ [5] ص ۴۰۶۔ بیہقی نے اس کے بارے میں مفصل اور مفید حالات قلم بند کئے ہیں (ص ۴۰۶-۴۱۴)
[6] طبقات، اول ص ۲۳ [7] فرشتہ، اول، ص ۴۲ [8] ایلیٹ اور ڈاؤسن ص ۹۰
[9] ایضاً [10] Studies in Indo Muslim History p.163
[11] جلد ۹ ص ۱۷۴

"احمد تلک سے مغلوب ہو کر تیزی کے ساتھ ملتان کی طرف اور پھر راجہ بھاٹیہ[1] (Bhatia) کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت بھی احمد کے ساتھ ایک بڑی فوج تھی اس لئے راجہ اس کا مزاحم نہ ہوا۔ احمد نے راجہ سے دریا پار کرنے کے لئے کشتیاں طلب کیں جن کو راجہ نے مہیا کر دیا۔ مذکورہ دریا میں ایک [جزیرہ] تھا جس کو احمد اور اس کے ساتھیوں نے غلطی سے لب ساحل سمجھا۔ ملاحوں نے ان کو اسی جزیرہ میں چھوڑ دیا اور چلے گئے احمد اور اس کے ساتھی وہیں رہے لیکن ان لوگوں کے پاس صرف تو ہی دن کا ذخیرہ تھا اور وہ لوگ گہرے پانی کو پار نہ کر سکے۔ اسی اثنا میں شاہی فوج جزیرہ میں داخل ہوئی جس نے احمد کے بیشتر ساتھیوں کو مار ڈالا اور اس کو گرفتار کر لیا۔ اس سانحہ پر احمد نے خودکشی کر لی۔"

(۵) گردیزی اور اس کے متبع مورخین احمد کے لڑکے کو قیدی بنائے جانے کا ذکر نہیں کرتے۔

ہانسی پر مسعود کا حملہ

سنہ ۴۲۸ھ کی عید الاضحیٰ کے تیسرے دن[2] مسعود نے اپنے مشیروں کی ایک مخصوص میٹنگ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کی کہ فوج کو کس راستہ سے بھیجا جائے ؟[3] کے سوال پر سلطان مسعود نے یہ بات واضح کی کہ اس نے اپنی بست[4] کی بیماری کے بعد صفر، سنہ ۴۲۸ھ، دریائے کے حادثہ کے بعد، قسم کھائی تھی کہ اگر خداوند تعالیٰ نے اس کو تندرستی عطا کی تو وہ ہانسی کا قلعہ فتح کرنے کے لئے ہندوستان جائے گا۔ جب سے وہ ہانسی سے اپنا مقصد حاصل کئے بغیر آیا ہے اس کی طبیعت مکدر ہے اس لئے اب وہ وہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور جب تک کہ قلعہ ہانسی فتح نہیں ہو جاتا وہ کسی اور مہم کا ارادہ نہ کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ وہ نوروز سے پہلے غزنی[5] واپس آجائے گا۔ لیکن اس بارے میں وہ اپنے مشیروں کی رائے جاننے کا منتظر ہے۔ وزیر اعظم نے سلطان کے سوال کے جواب میں یہ عرض کیا کہ سلطان کو کسی بھی قیمت پر ہندوستان نہ جانا چاہیئے بلکہ اس کو مرو کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیئے تاکہ خراسان، رے اور جبال زیر ہو سکیں لیکن اگر سلطان معظم کا ارا[دہ]

---

[1] بھاٹیہ (Bhatia) جس پر سلطان محمود نے سنہ ۳۹۵ھ میں حملہ کیا تھا ان مختلف ناموں سے بھی معروف ہے۔ بھیرہ، بھتنر (Bhatnair)، بھٹنڈہ، بہاولپور۔ لیکن محمد ناظم کے خیال کے مطابق بھٹنڈہ اور رہوڈی ولا کے خیال کے مطابق اُچ (کاللتا اس جگہ کی) صحیح تعیین ہے ملاحظہ ہو سلطان محمود غزنوی صفحات ۱۹۷ - ۱۹۸ اور [illegible] Bibliotheca Indica Text of Muslim Hist., P. 138 میں بدیگر روز درج ہے جو غلط ہے۔ جیسا کہ طبع تہران ص ۱۸۹ پر "سدیگر روز" درج ہے بالکل صحیح ہے [3] ایلیٹ اور ڈاوسن کے ترجمہ کے ص ۱۴۴ پر "پس از حادثہ آب" کے الفاظ ترک کرنے سے رہ گئے ہیں [4] تاریخ بیہقی ص ۵۰۰ [5] ص ۵۰۳ "باز گردیم چنانکہ پیش از نوروز بغزنی باز رسیم" ۱۴ ستمبر سنہ ۱۰۳۷ء [illegible] ان لوگوں کے پاس آنے جانے کے لئے ۵ ماہ کا وقفہ تھا۔

فتح کرنے ہی کا ہے تو غازیوں (Ghazis منہ) کے سربراہ لاہور کے قلعہ کی محافظ فوج اور ایک حاجب جس کو دربار متعین کرے اس کام کا بیڑا اٹھا سکتے ہیں کیونکہ اگر ترکمانوں نے تھوڑا سا حصہ یا کوئی گاؤں ہی فتح کر لیا تو وہ اتنی قتل و غارت گری کریں گے کہ ہانسی کے خلاف دس جہاد بھی اس کی برابری نہ کر سکیں گے[1] " لیکن سلطان مسعود کا ہانسی جانے اور حملہ کی سربراہی کرنے کا ارادہ مستحکم تھا۔[2]

اپنے فیصلے کے مطابق سلطان مسعود ۱۹ ذی الحجہ بروز دوشنبہ کو بہت سویرے گھوڑے پر سوار ہوا[3] اور فیروزی باغ گیا تاکہ وہ اپنی فوج کی مختلف ٹکڑیوں کو وہاں سے گذرتا دیکھ سکے۔ اس کے بعد ظہر کی نماز کے وقت اس کا لڑکا، وزیر اعظم اور سپہ سالار پا پیادہ وہاں آئے اور اس کی تعظیم بجا لائے۔ بالآخر پنجشنبہ کے دن جبکہ ماہ ذی الحجہ میں ۲ دن باقی رہ گئے تھے۔ سلطان مسعود[4] براہ کابل غزنی سے ہندوستان روانہ ہوا تاکہ ہانسی کے خلاف جہاد کرے۔ وہ دس دن تک کابل میں رکا رہا۔ ۷ محرم ۴۲۹ھ بروز پنجشنبہ وہ کابل سے روانہ ہوا اور شنبہ کے دن اس کی فوج کی ٹکڑیاں خراسان اور رے سے آ گئیں لیکن سلطان مسعود نے ان ٹکڑیوں کا کچھ خیال نہ کیا اور بیہقی کے استاد بونصر کو حکم دیا کہ وہ وزیر اعظم کو ایک خط لکھے۔ سہ شنبہ کے دن جبکہ محرم کے مہینے میں ۵ دن باقی تھے سلطان مسعود جہلم پہونچا اور دریا کے کنارے دینار کوٹ کے پاس خیمہ زن ہوا۔ یہاں وہ بیمار پڑا اور ۱۴ دن تک علیل رہا۔ یہیں عالم انفعال میں اس نے شراب نوشی سے توبہ کی اور حکم دیا کہ ساری شراب اور رہر زہ مرائی

---

[1] اس کے بعد ایک جملہ یوں آتا ہے "شدن بآمل و آمدن ، این بلا یار آورد ، و این رفتن بہندوستان بتراز آنست" اس کا انگریزی میں یوں ترجمہ کیا گیا ہے۔ "These evils have occurred, For they are already at Amul, and still it is considered expedient to go to Hindustan"

(یہ خرابیاں اس لئے پیدا ہوئیں کہ وہ لوگ پہلے ہی سے آمل میں ہیں، اور اب بھی ہندوستان جانا قرین مصلحت تصور کیا جاتا ہے) اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہئے There evils have occurred for comming and going to Amul & The Indias expedition is still worse Than That، (یہ خرابیاں آمل آنے جانے سے پیدا ہوئیں ہندوستان کی یہ مہم ہنوز اس سے بدتر ہے)

[2] ص ۱۳۱ ھ

[3] ایلیٹ اور ڈاؤسن کے بیاں "پگاہ نشست" کا ترجمہ Rose early (سویرے اٹھا) کیا گیا ہے جو غلط ہے کیونکہ "بر نشستن" کے معنی Ride (سوار ہونا) کے ہیں نہ کہ Rise (اٹھنا کے)

[4] ۱۱ ذوالحجہ بروز شنبہ کو وزیر اعظم کو بیش بہا خلعت عطا کی گئی لیکن طبع تہران ۱۳۲۴ھ کے فارسی متن میں "سہ شنبہ" درج ہے صحیح نہیں ہے۔ پروفیسر نفیسی کے مرتبہ کردہ نسخے (ص ۶۴۴) اور طبع کلکتہ (ص ۶۶۳) میں شنبہ کا لفظ درج ہے جو صحیح ہے۔

کا سارا مال جہیلم میں پھینک دیا جائے۔ اس کے بعد بوسعید مشرف[1] کو خفیہ طور سے جاکی ہندو کے قلعہ کے سے بھیجا گیا۔ وہ لوگ جہیلم ہی میں مقیم رہے تا آنکہ ان لوگوں کو راجہ کشمیر کی موت کی خبر ملی۔

۴ صفر بروز شنبہ کو سلطان کی طبیعت بحال ہوئی اور ۷ صفر بروز سہ شنبہ وہ جہیلم سے روانہ ہوا۔ اور ۹ ربیع الاول بروز چہارشنبہ کو "قلعۂ ہانسی" پہونچا اور قلعہ کے باہر خیمہ زن ہوا۔ دو درمیان مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ قلعہ کی محافظ فوج نے مایوس کن مدافعت کی کوشش کی لیکن دوشنبہ کے دن قلعہ فتح ہو گیا جبکہ ربیع الاول کے ختم ہونے میں دس دن باقی رہ گئے تھے[2]۔ وہاں کے تمام برہمن قتل کر ڈالے گئے اور وہاں سے جو بھی مال و دولت حاصل ہوئی سب کی سب فوج میں تقسیم کر دی گئی۔ ہندوستان میں یہ قلعہ کا شمار بے داغ قلعوں میں ہوتا تھا کیونکہ ابتک کوئی بھی شخص اس کو فتح نہ کر سکا تھا۔

نیچے دس دن جبکہ اس مہینہ میں دس دن باقی رہ گئے تھے سلطان مسعود نے ہانسی کو خیرباد کہا اور ۱۷ جمادی الاول بروز یکشنبہ غزنی واپس پہنچا ۲۱ جمادی الاول بروز سہ شنبہ نوروز کا تیوہار منایا گیا جس میں ایک محفل نا و نوش برپا ہوئی اور سلطان مسعود نے اپنی گم پورا پورا بدلہ چکا یا کیونکہ جب سے وہ جہیلم میں منتقل ہوا تھا اس نے مطلقاً شراب نہ پی تھی۔

یہ مسعود کی فتح ہانسی کے بارے میں بیہقی کے بیان کا خلاصہ ہے اس سلسلہ میں میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

---

[1] "بوسعید مشرف را بہمی نزدیک جکی ہندو فرستادہ بقلعتش، وکس بر آن واقف نگشت" ایلیٹ اور ڈاؤسن کے ترجمہ میں (ص ۱۲۰) اس جملہ کا ترجمہ غلط ہو گیا ہے Said Mushrif was sent on an edition against chakki Hindu to a fort about which one knew anything (بوسعید مشرف چکی ہندو کے خلاف ایک مہم پر ایک قلعہ بھیجا گیا جس سے کوئی شخص واقف نہ تھا) یقیناً یہ اسم معرفہ قلعہ کا نام سمجھ لیا گیا ہے۔ فارسی متن اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس اسم معرفہ کا تعلق خود جبر سے ہے۔ جکی یا جاکی حلیف تھا اس لئے اس کے خلاف معرکہ آرائی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ مذکورہ کتاب کے حاشیہ نمبر ۱ میں یہاں کشمیر کے چک سے نسبت دی گئی ہے لیکن یہ نسبت بھی غلط ہے۔ [2] سنہ ۴۲۹ھ کے صفر کا مہینہ ۲۹ دن کا تھا۔ ورنہ ربیع الاول کی ۹ تاریخ چہارشنبہ نہیں پڑ سکتی تھی جیسا کہ متن کے ص ۳۳۴ پر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح غالباً ۴۲۹ھ کا ربیع الاول بھی ۲۹ دنوں کا تھا کیونکہ قلعہ دوشنبہ کے دن فتح ہوا۔ جبکہ ربیع الاول کے خاتمے میں دس دن رہ گئے تھے جب ۹ ربیع الاول کو چہارشنبہ تھا تو صرف ۱۹ ربیع الاول کو شنبہ ہو سکتا ہے لیکن ہم یہاں ایک وقت سے دوچار ہوتے ہیں ص ۳۴۰ پر تاریخ واپسی اسطرح درج ہے " روز یکشنبہ چہار روز مانده بود از جمادی الاول" ایسی صورت میں جبکہ مہینہ ۲۹ دن کا رہا ہو واپسی کی تاریخ ۲۶ ہو جاتی ہے اور یہ تاریخ جمعہ کے دن تھی نہ کہ یکشنبہ کے دن۔ بہرحال تاریخ کے سلسلے میں متن میں کافی گڑبڑ ہے۔ [3] ص ۳۴۰

(ق) یہ جملہ "بر جانب ہندوستان روم تا قلعت ہانسی را گشادہ آید و از آن وقت باز کہ بنا کام از آنجا باز گشتم بضرورت چہ نالائی افتاد" واضح طور سے اس حملہ پر سلطان مسعود کے پہلے حملے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس بیان کی توثیق بیہقی کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ سلطان مسعود کے دو بار ہندوستان جانے کا تذکرہ کرتا ہے۔ یقیناً اس کے ذہن سے سلطان مسعود کا آخری سفر فراموش ہو گیا ہے جس کے دوران سلطان مسعود کی اچانک موت ہوئی تھی، امپیریل گزیٹیر آف انڈیا میں بھی اس کی صراحت ہے کہ یہ قلعہ دوسرے[1] حملے میں فتح ہوا تھا۔

(ب) ریاست ہریانہ کے ضلع حصار میں ہانسی نام کا ایک سب ڈویژن بھی ہے جو شمال میں ۲۹° اور مشرق میں ۷۶° ۵ پر ریواڑی بھٹنڈہ لائین پر حصار سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر دور واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہانسی کشنوں (Kushans) کا قلعہ تھا لیکن مقامی روایتوں کے مطابق اس کی بنیاد انگ پال سنہ[2] الی تھی جو دہلی کا تومر بادشاہ تھا۔ ٹاڈ[3] کی تصنیف راجستھان کے مطابق[4] آسی یا ہانسی ۱۱ویں صدی عیسوی میں چوہان بادشاہ باسدیو اس کے لڑکے اتور ایچ اور پوتے اشٹ پال کے زیر حکومت تھا اور مسعود انہیں حکمرانوں میں سے کسی ایک سے لڑا ہو گا۔ بقول فرشتہ[5]، برس کے بعد دہلی کے راجہ نے مودود غزنوی کے دور حکومت میں (۴۳۲ھ - ۴۴۱ھ) ہانسی کے قلعہ کو غزنویوں سے واپس لے لیا۔ اس کے تقریباً ۱۵۰ سال کے بعد یہ قلعہ محمد غوری کے ہاتھوں دوبارہ فتح ہوا۔ التمش کے دور حکومت کے مشہور صوفی شاعر قطب جمال ہانسوی کا مدفن اسی شہر میں ہے۔

---

[1] 25 - ج ۱۱۱ X فتح کی تاریخ سنہ ۱۰۳۶ء بیان کی گئی ہے لیکن قلعہ اصلاً ۳ دسمبر سنہ ۱۰۳۷ء کو فتح کیا گیا تھا (مطابق ۱۹ ربیع الاول سنہ ۴۲۹ھ)

[2] گزیٹیر ۱۱۱ X [illegible] [3] سوم ص ۴۶۲ [4] جلد اول ص ۴۴ "در سنہ خمس و ثلاثین و اربعمائۃ راجہ دہلی و دیگر راجہ ہا اتفاق کردہ بلدہ ہانسی و تھانیسر را با سائر مضافات از تصرف گماشتگان غزنویہ برآوردہ متوجہ نگر کوٹ شدند" اس بیان کی تصدیق کسی اور تاریخی کتاب سے نہیں ہوتی۔ ابن الاثیر نے (جلد ۹ ص ۱۹۳) ایک دوسرا واقعہ بیان کیا ہے۔

"سنہ ۴۳۵ھ میں تین ہندوستانی راجاؤں نے متحد ہو کر لاہور پر حملہ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ مسلم فوج کے سپہ سالار نے اپنی فوج کو مجتمع کیا اور سلطان مودود کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ سلطان مسعود نے خبر ملتے ہی فوج کا ایک دستہ ان کی مدد کے لئے بھیج دیا۔ اسی اثنا میں ایک راجہ اس معاہدہ سے الگ ہو گیا اور اس نے مسعود کی اطاعت قبول کر لی بقیہ دونوں راجہ کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی اپنی حکومتوں کو واپس چلے گئے۔ مسلم فوج نے ان میں سے ایک، دوبل ہریانہ پر حملہ کیا اور اس کو شکست دی نتیجتاً اس راجہ نے اپنے مضبوط قلعہ میں اپنے ۵ ہزار گھوڑ

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

(ج) بقول صاحب راج ترنگنی[1] اور دیگر افراد دریائے جہلم کا نام ''وی تاستا'' تھا اس بات کی تصدیق
کتاب الہند سے بھی ہوتی ہے جس میں اس کے قدیم ترین نام کو بی یاتا (Bayatta)
یہ لفظ سنسکرت لفظ وی تاستا (Vitasta) کی تصحیف ہے) اور عام نام جہلم لکھا گیا ہے بقو
یہ دریا ہرامکوٹ (Haramakot) کے پہاڑ سے نکلتا ہے جہاں سے گنگا بھی نکلتی ہے بعلاقہ سر
اور نہ قابل دخول ہے جہاں نہ تو کبھی برف گلتی ہے اور نہ غائب ہوتی ہے[2] لیکن البیرونی کا یہ خیال
ہے کیونکہ دریائے گنگا کا منبع اس سے بالکل مختلف اور بہت دور مشرق میں واقع ہے ہم اس بات
طور پر جانتے ہیں کہ دریائے جہلم کا منبع ورناگ ہے جو شاہ آباد کے پرگنہ میں مشہور ورہ بانی ہال
نیچے واقع ہے ۔ مسٹر ایم ۔ اے اسٹین کا خیال یہ ہے[3] کہ البیرونی کا اشارہ مقدس گنگا جھیل کی طرف ہے جو ہر
(Haramukula) پہاڑ کے گلیشیر کے حصار میں واقع ہے ۔ جس کے متعلق قدیم کشمیری روایت یہ ہے
دریائے سندھو (سندھ) کا منبع ہے ۔ موخرالذکر دریا کشمیر میں وی تاستا کی سب سے بڑی شاخ ہے ا
کشمیری روایت کے مطابق اس کو گنگا کہا جاتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ وی تاستا کا روایتی نام یمونا (جمنا)
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ اسٹین کے خیال کے مطابق اسم جہلم مسلمانوں کا دیا ہوا ہے اور پنجاب
پورے علاقہ میں دریائے وی تاستا پر اسی نام کا اطلاق ہوتا ہے ۔ لیکن البیرونی جو بی یاتا
(وی تاستا) کی جگہ پر جہلم کا نام استعمال کرتا ہے اس طرح کی کسی بات کی طرف اشارہ نہیں کر

(د) دینار کوٹ یا دینار گوتہ کو دریائے جہلم کے کنارے آباد ایک گاؤں کہا گیا ہے ۔ اس نام کی درس
قرارت بالکل غلط ہے کیونکہ ''دینار'' اور ''گوتہ'' دونوں فارسی الفاظ ہیں ۔ دوسرا لفظ یقیناً کوٹھ یا
ہے جو کچھ اور مخطوطات میں بھی ملتا ہے لیکن دینار کا لفظ دینا یا اسی کے کسی مماثل لفظ کی کتابت کی
ہو سکتا ہے ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) سواروں اور ستر ہزار پیادوں کے ساتھ پناہ لی ۔ مسلم افواج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور راجہ کو مطیع ہو
گیا ۔ اس طرح مسلم فوج پانچ ہزار مسلمان سپاہیوں کو جو قلعہ میں قید تھے ، چھڑانے میں کامیاب ہوئی ۔ اس کے بعد مسلم فوج دوسر
ثابت مالری سے بنرہ آزما ہوئی جس نے بڑی مردانگی سے مدافعت کی لیکن اس کو بھی شکست ہوئی ۔ مسلمانوں کے قبضہ میں
اسلحہ بارود اور جانوروں کے ریوڑ آئے ۔ اس کے بعد تیسرا باغی راجہ بھی مطیع ہو گیا ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] Kalhana II P. 411 [2] Sachau I PP. 206, 259, 260; II P. 181

[3] شروع کی تین جگہوں پر اس کا نام بی یاتا لکھا ہے اور ص ۱۸۱ پر وی تاستا ، اگرچہ عربی متن میں بھی یہ لفظ بیتہ درج ہے جیسے حیدرآباد ا

[4] Sachau I P. 207 ، عربی متن ص ۱۲۱ پر ابیتہ جہلم درج ہے ۔ [5] Kalhana II P. 363 [6] Sachau I P. 207

اس مقام کے صحیح نام کی تعیین کے سلسلہ میں پروفیسر ہوڈی والا کچھ متبادل نام تجویز کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ
"جس سرزمین پر جنگ برپا ہوا تھا اس کی نشاندہی نہیں ہو سکی ہے کیونکہ "ر" اور "ک" کے حروف
کاتب نے ادل بدل کر دیئے ہیں۔ جہلم کے کنارے جس مقام کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ غالباً دھانگ
روٹ یا دانگ روٹ تھا جو آج بھی ماہشیر مچھلی کے شکار کے لئے مشہور ہے اور اب ضلع جہلم کا
ایک حصہ ہے۔ اس مقام کا نام تانگروٹ بھی ہے اور ایک ریلوے اسٹیشن دینا سے ملحق ہے جو جہلم
گاؤں سے شمال کی طرف ۱۱ میل کی دوری پر واقع ہے۔ اس مقام دھانگروٹ کو دین کوٹ یا دھان
کوٹ کا مماثل نہ سمجھنا چاہیئے جس کا تذکرہ بعض اوقات کچھ مغل روزنامچوں میں ملتا ہے۔ دیناکوٹ دریائے سندھ
پر کالا باغ سے سات میل کی اونچائی پر واقع تھا اور اب غرقاب ہو چکا ہے"
یہ بات بھی ممکن ہو سکتی ہے کہ دینا ریلوے اسٹیشن جو جہلم سے گیارہ میل کی دوری پر واقع ہے وہی
ہو جس کا تذکرہ بیہقی نے کیا ہے۔

(۷) قلعہ کا وہ حکمران جس کو مسعود نے جہلم سے پیغام بھیجا تھا۔ جکی کے نام سے موسوم ہے جو غالباً جانکی کی جگہ پر
کتابت کی غلطی سے تحریر ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران جنگی یا چنگی سے مماثل ہے جس کا نام تاریخ
بیہقی[۱]، زین الاخبار[۲]، آثار الوزرا[۳] وغیرہ میں خواجہ احمد حسن میمندی کی قید کے سلسلہ میں درج ہے اور
تاریخ یمینی[۴] میں محمود کے حملے کے سلسلہ میں اس کا ذکر ہے۔ بیہقی کے ایک دوسرے بیان سے (ص ۱۸۱)
جس کا حوالہ فرشتہ میں بھی ہے (ج ۱ ص ۴۰) یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ مذکور کشمیر کے ایک
قلعہ کالنجر[۵] میں قید کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس بادشاہ کے نام کا پتہ نہیں چلتا جس کے زمانے میں وہ قید ہوا تھا۔

؁ Muslim Hist, P. 165 - Mudalisna in Indo　　؁ صفحات ۶۵، ۸۲، ۹۴، ۱۴۹　　؁ ص ۱۹۶
؁ ص ۱۷۸　　؁ ص ۳۰۵، لیکن دوسری قرارت sabba ہے　　؁ یہ قلعہ محمود غزنوی کے زمانہ میں قیدو بند کے لئے مخصوص
تھا۔ فصیحی کی مجمل کے قول کے مطابق (ص ۳۰) محمود نے اپنے بھائی اسماعیل کو اسی قلعہ میں قید کیا تھا اس کے علاوہ اسرائیل سلجوقی
سلطان محمود کے حکم سے ۴۱۹ھ میں اسی قلعہ میں قید کیا گیا تھا (ایضاً ص ۱۴۳) اور یہ سلجوقی شاہزادہ سلطان مسعود کے زمانے میں
۴۲۶ھ میں قید خانہ ہی میں فوت ہوا تھا۔ لیکن فصیحی کے قلعہ کے بیان کردہ نام بلوار کی تصدیق کسی دوسری تاریخ سے نہیں ہوتی۔
فصیحی کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ اسرائیل سلجوق کا پوتا تھا کیونکہ وہ سلجوق کا لڑکا تھا نہ کہ پوتا۔ (ملاحظہ ہو زین الاخبار
ص ۸۹، ۱۰۸) کالنجر میں اسماعیل کی قید کے سلسلہ میں ابن الاثیر جلد ۹ صفحات ۲۶۱ - ۳۲۳ ، راوندی صفحات ۸۸ - ۸۹
گردیزی ص ۴۲۵ وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

آثار الوزراء میں اس مقام کا نام ذرا سا اختلاف کے ساتھ درج ہے اور حکمران کا نام جنگی یا جینگی ہے۔ اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ احمد حسن میمندی کالنجر کے قلعہ میں قید جس کا حکمران جانگی تھا[۱] اور سلطان مسعود کی درخواست پر اسی کے حکم سے خواجہ نے رہائی پائی یہ وہی جانگی ہے جس سے سلطان مسعود نے ہانسی پر حملہ کے وقت رابطہ قائم کیا تھا۔

عتبی[۲] نے جنگی یا سبلی بن شاہی بن بہمی (Bahmani) کا ذکر کیا ہے جس کے قبضہ میں کشمیر کے درے تھے۔ اس نے سلطان محمود کو دعوت اتحاد دیتے ہوئے اپنی خدمات کی پیشکش بھی کی تھی کہ وہ اس راہ میں اس کی راہ نمائی کرے۔ ناظم بیہقی کے تذکرہ کردہ اس جنگی کو جس کی قید میں احمد حسن میمندی تھا عتبی کے تذکرہ کردہ جنگی یا سبلی کے مماثل قرار دے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کا اصل نام جانگی کے علاوہ کچھ اور نہ رہا ہوگا[۳]۔ ہودی والا[۴] کا خیال ہے کہ صحیح ملفظ بہیمی (Bahmani) ہے۔ کشمیر کی رسوا ترین ملکہ دِدّا Didda کی بہیمی شاہی کی نواسی تھی اور اس لاہور کا شاہزادہ تھا یہ بھی ممکن ہے کہ بہیم شاہی کی اولاد میں سے کسی نے لاہور کے خاندان میں شادی کی ہو اور یہ اسی کی اولاد ہو۔

کالنجر کا قلعہ کشمیر کی جنوبی پہاڑیوں میں واقع تھا Aurel Stein نے کوٹلی کی سمت[۵] میں اس کی جو نشاندہی کی ہے غالباً وہ صحیح ہے۔

یہ کالنجر جس کا تذکرہ Kalhana اور دیگر مسلم مورخین کے یہاں ملتا ہے اس کو اتر پردیش کے باندہ ضلع کے کالنجر قلعہ سے ملتبس نہ کرنا چاہیئے کیونکہ بہت سے بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اول الذکر قلعہ پہاڑیوں میں واقع تھا۔

اس مقام کی ہجے تین طرح سے لکھی گئی ہے

کالنجر Kalinjar) (بیہقی، زین الاخبار، راج ترنگنی وغیرہ)

کالنجر Kalanjar) (آثار الوزرا ص ۱۷۲)

کانجر (Kalanjar) (راج ترنگنی VIII 1256)

لیکن اس کی مشہور ترین صورت کالنجر (Kalinjar) ہے[۶]۔ ڈاکٹر ناظم[۷] اس کا تلفظ یو پی کے کالنجر Kalinjar

---

[۱] محمد ناظم، سلطان محمود غزنوی ص ۱۰۶ [۲] تاریخ یمینی ص ۴۰۵ [۳] سلطان محمود غزنوی، ص ۱۰۶ [۴] Studies in Indo Muslim History [۵] Abid VIII L.1256 N [۶] Kalhana II P. 433 [۷] Muslim Hist P. 145 سلطان محمود غزنوی ص ۱۳۶، ۱۰۶، ۷۴، ۷۳

مقابلہ میں کالانجار (Kalanjara) قرار دیتے ہیں اور سر اسٹین اس کے ہجے دوسری طرح کرتے ہیں[1] ۔

(و) تاریخ بیہقی اور زین الاخبار[2] کے کچھ مرتبین نے جانگی کو "کوتوال محافظانِ زندانیان" کے نام سے یاد کیا ہے لیکن مذکورہ بالا عہدیداروں کا عہدہ بہت چھوٹا ہوتا تھا اور وہ سفرا کے ذریعہ سلطان محمود اور مسعود سے ابلاغیہ کے مجوز نہیں ہوسکتے۔ یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی اپنی گورنر یا حکمراں کی طرح سے آزاد حیثیت رہی ہوگی جیسے غزنوی سلاطین سے کوئی معاہدہ کر لیا ہوگا۔

(ز) بیہقی نے ہانسی کو اس وجہ سے بیداغ قلعہ ([illegible]) کہا ہے[4] کہ کوئی حملہ آور اس کو کبھی فتح نہ کرسکا اور جب اس قلعہ کو سلطان مسعود نے فتح کر لیا تو گردیزی اس موقع کے لئے "حصار عورت اشد" کے الفاظ استعمال کرتا ہے[5] ۔ گردیزی کے یہ الفاظ بیہقی کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ پروفیسر حبیبی نے بجا طور پر اپنی مرتب کردہ زین الاخبار میں اس کی نشاندہی کی ہے۔ مذکورہ بالا حقیقت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ سلطان محمود ہانسی کے قلعہ کو فتح نہیں کرسکا تھا۔

جیسا کہ وزیر اعظم نے عرض کیا تھا کہ (ص ۵۱۳) ممکن ہے کہ ہانسی پر حملہ کرنا نقصان دہ ثابت ہو، اور سلطان نے اس کو تسلیم بھی کر لیا تھا۔ اس کے بارے میں بیہقی کا بیان یہ ہے کہ[10]

> "۳ جمادی الآخر بروز پنجشنبہ خراسان اور رے سے بہت اہم مراسلے آئے تھے جس میں یہ درج تھا کہ موسم سرما کے اوائل میں جبکہ سلطان وہاں موجود نہ تھا، ترکمانوں نے تالقان اور فریاب کو تاخت و تاراج کیا اور دیگر جگہوں پر بھی بدقسمتیاں ظاہر ہوئیں کا ہنگار فوج کے لئے یہ ناممکن تھا کہ اس موسم میں ان جگہوں تک پہونچ سکے۔"

---

[1] Kalhana, VIII, L. 1256 N. [2] جیکی گویا نام کوتوال قلعہ کالنجر و زندانیان (احمد حسن)، [3] طبع تہران ۱۳۲۹، ص ۲۵ [4] ۱۹۲ "پس می توان گفت کہ چیکی نام ہندو محافظ آن قلعہ بود یا شاید مراد جہنگ باشد کہ برکنار راست رود جہلم واقع است" جب بیہقی اس کو "جیکی محافظ قلعہ" کہتا ہے تو اس کی متبادل صورت بالکل فضول نکلتی ہے۔ بقول ہودی والا غالباً جانکی لاہور کے حکمران خاندان کا ایک فرد تھا خود حکمران نہ تھا۔ (Studies in Indo Muslim Hist. P. 145) لیکن ڈاکٹر ناظم اس کو کالنجر کا حکمران بتلاتے ہیں (سلطان محمود غزنوی ص ۹؟) سلطان محمود نے ۲۰ رجب سنہ ۴۰۹ھ میں جب دوآبہ پر حملہ کیا تھا اور دریائے جمنا کو پار کیا تھا اس وقت جانکی نے اس کی رہبری کی تھی (ایضاً) [5] مسعود سعد سلمان، سیف الدولہ محمود کے ہاتھوں قلعہ آگرہ کی فتح کا جب تذکرہ کرتا ہے تو وہ اپنے اس شعر میں اس کو بے داغ قلعہ کہتا ہے [6] ہمی بجستم حصنی عظیم دوشیزہ + کہ در جہاں بنرفتش بہیچ خسرو و سالار [7] ص ۲۶

[8] فارسی متن ص ۵۳۵، ایلیٹ اور ڈاوسن دوم صفحات ۱۴۱ — ۱۴۲

یہ تمام واقعات سلطان کے حملۂ ہانسی کی بنا پر ظہور پذیر ہوئے۔ اس وقت رے کا علاقہ بھی محصور بادشاہ اپنے ہندوستان جاتے پریشان تھا جس سے اس کو کوئی نفع نہ پہونچا تھا۔

اب ہم مذکورہ حملے کا سلسلہ میں بیہقی کے بیانات کا گردیزی اور اس کے مقلدین کے بیانات سے تقابلی مطالعہ کریں گے۔ یہ تقابلی مطالعہ اس بات کو واضح کرے گا کہ تاریخ بیہقی کے نسخے دوسرے مورخین دسترس میں نہیں تھے اور اسی وجہ سے مذکورہ مورخین نے بیشتر گردیزی کی تاریخ زین الاخبار کے بیانات پر ہی تکیہ

گردیزی کا بیان ہے کہ[۱] ذیقعدہ ۴۲۷ھ میں سلطان مسعود فتح ہانسی کے ارادہ سے ہندوستان کی طرف اس حملہ کا اختتام ۶ دن کی باہمی جنگ کے بعد ہوا۔ اس کے بعد وہ سونی پت کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت ہریانہ کے زیر حکومت تھا۔ جیسے ہی راجہ مذکور نے اس حملہ کی خبر سنی اس نے راہِ فرار اختیار کی اور نزدیک ایک جنگل میں روپوش ہو گیا۔ غزنوی افواج نے اس کا تعاقب کیا۔ دیپل نے محسوس کیا کہ وہ مدافعت قابل نہیں ہے اس لئے وہ وہاں سے بھی فرار ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان مسعود نے ڈیرائے رام[۲] Ram...... پر حملہ کیا اس حملہ کی خبر سنکر رام نے سلطان کی خدمت میں تحائف بھیجے اور دربار سے اپنی غیر حاضری پر معذرت کی۔ کیونکہ یہ شخص ضعیف تھا اور سلطان کی خدمت میں بذاتِ خود حاضر ہونے سے قاصر تھا۔ اس کے بعد مسعود غزنی واپس ہوا اور چلتے وقت لاہور کی حکمرانی اس نے اپنے لڑکے مجدود کے سپرد کی۔ ہانسی پر حملہ کام ۴۲۸ھ میں اپنے اختتام پر پہونچا "

فرشتہ[۳]، بدایونی اور نظام الدین بخشی[۴] نے عام طور سے اسی بیان کو نقل کر دیا ہے لیکن ان لوگوں کا تاریخ بیہقی کے بیان سے ان امور میں مختلف ہے۔

(۱) بیہقی[۵] روانگی کی تاریخ ۲۲ ذی الحجہ ۴۲۸ھ بتلاتا ہے جبکہ گردیزی اور دیگر مورخین ذیقعدہ ۴۲۷ھ روانگی کی تاریخ قرار دیتے ہیں۔

(ب) بقول بیہقی[۶] قلعہ کا محاصرہ دس یا گیارہ دن، ۹ ربیع الاول سے ۲۰ ربیع الاول تک کیا گیا تھا اور اسی آخری دن (۲۰ ربیع الاول) قلعہ فتح ہوا تھا۔

---

[۱] ص ۲۰۰　[۲] ابن الاثیر ج ۹ ص ۱۹۳، ایک راجہ کا ذکر کرتا ہے جس کا نام دوبال ہریانہ بتلاتا ہے جس سے مودود بن مسعود نے ۴۳۵ھ میں جنگ کی تھی اور اس کو شکست دی تھی۔ یہ دونوں ایک ہی فرد ہو سکتے ہیں۔
[۳] اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ مقام رام پور، یو۔ پی ہو سکتا ہے (ص ۲۰۱)، لیکن یہ خیال بے بنیاد ہے　[۴] اول، ص ۴۲　[۵] اول ص ۲۲　[۶] طبقات اول ص ۲۳　[۷] ص ۵۲۲　[۸] ص ۵۲۲

(ج) بقول بیہقی مسعود نے ہانسی میں سترہ دن تک قیام کیا تھا اور اس کے بعد وہ غزنی واپس ہوا تھا جہاں پینتیس دن کے بعد پہونچا تھا جبکہ بالعموم یہ سفر کہتر دن تمام ہوا تھا جس میں دس دن کا کابل کا قیام اور بیس دن کا جہیلم کا قیام بھی شامل ہے۔ اس طرح سے اصل سفر انتالیس دن تک رہا۔ اس حساب سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس عرصہ میں سلطان مسعود نے کوئی اور جنگ نہیں کی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی گردیزی اور دیگر مورخین کے بیانات میں دیکھا ہے سلطان مسعود نے حملۂ ہانسی کے خاتمہ پر سونی پت کا رخ کیا اور وہاں کے حکمراں کو بھگا دیا۔ اس بیان کی تطبیق بیہقی کے بیان سے نہیں کی جا سکتی کیونکہ سلطان کا پروگرام مقرر تھا اور اس کو نوروز سے پہلے پہلے غزنی واپس پہونچنا تھا۔ ہم نے اوپر کے بیان میں دیکھا ہے کہ اس نے اس حملہ کو اپنے وقت مقررہ میں ختم کرنے کی کوشش کی اور نوروز سے سترہ دن قبل غزنی واپس آگیا۔ چونکہ بیہقی نے اپنے بیانات کو دن اور تاریخ وار صحیح صحیح پیش کیا ہے، اور چونکہ جو کچھ ہو رہا تھا اس سے بیہقی کا کچھ نہ کچھ تعلق بھی تھا اس لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم اس کے بیانات کو صحیح تسلیم کرلیں۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ سونی پت اور ڈیرائے رام کے حملے مسعود کے سپہ سالاروں کی سربراہی میں ہوئے ہوں نہ کہ خود مسعود کی سربراہی میں۔ بہرحال اس تناقض کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔

(د) بقول گردیزی جب سلطان مسعود حملۂ ہانسی کے بعد غزنی واپس آرہا تھا تو شہزادہ مجدود کو لاہور کی حکمرانی سپرد کی گئی پھر اس کا یہ بھی قول ہے کہ اس جنگ میں مجدود سلطان مسعود کے ہمراہ تھا اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"از آنجا (= ہانسی) بازگشت و روی بغزنین نہاد، پس امیر مجدود بن مسعود را رحمہ اللہ ولایت لاہور داد و طبل و علم داد و او را بحشم و حاشیت سوی لاہور بفرستاد و خود سوی غزنین آمد"

بیہقی کا بیان ہے کہ سلطان مسعود نے شہزادہ مجدود کو ۳ ذیقعدہ ۴۲۷ھ میں لاہور کا گورنر مقرر کیا تھا یعنی اپنے حملۂ ہانسی سے ۱۲ ماہ قبل ہی وہ یہ عہدہ مجدود کے سپرد کر چکا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں

"روز یکشنبہ نوزدہم (شوال) بباغ صد ہزارہ آمد .... بیست و ششم ابوالحسن عراقی ...
سوی ہرات رفت ... روز شنبہ سوم ذی القعدہ خداوند زادہ امیر مجدود خلعت پوشید

---

۱۰ ص ۱۰۷　　۱۲ ص ۱۰۵

با میری ہندوستان تا سوی لاہور رود تعلق بیگو چنانکہ امیران را و ہند خاصہ کہ فرزند تعیین
پادشاہ باشد . . . . . و دیگر روز پیش پدر آمد رضی اللہ عنہا تعبیہ کردہ بیاع پیروزی و
سلطان در کنارش گرفت و وی رسم خدمت و وداع بجای آورد و برفت، .... روز شنبہ
بیست و چہارم ذی القعدہ مہرگان بود الخ ... ۴۸

یہ تاریخ وار تفصیل جو بیہقی نے پیش کی ہے اس کی بات کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے ۔

سلطان مسعود غزنوی کے دور حکومت (۴۲۱ - ۴۳۲ھ) میں ہندوستان پر تین حملے ہوئے تھے۔ پہلا رجب ۴۲۴ھ کے بعد بنارس پر، اس حملہ کا سربراہ بنا مقرر شدہ سپہ سالار احمد ینال تگین تھا۔ دوسرا حملہ اس حملہ کے کچھ عرصہ بعد ہوا تھا جس کی سربراہی خود سلطان مسعود نے کی تھی جس کا مقصد احمد ینال تگین کی بغاوت کو فرو کرنا اور پھر سرسوتی اور اس کے ملحق قلعوں کو فتح کرنا تھا۔ اس حملہ کا ذکر تاریخ بیہقی کے موجودہ نسخوں میں نہیں ملتا اور گمان غالب یہ ہے کہ اس حملہ کا ذکر تاریخ بیہقی کے تلف شدہ اوراق میں رہا ہوگا اور تیسرا حملہ بھی سلطان مسعود کی سربراہی میں ہوا تھا جس کا مقصد ہانسی کو فتح کرنا تھا۔ اس مقالہ کا مقصد یہی تھا کہ کچھ تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کے حامل نکات کا جائزہ لے کر انکو مکمل کیا جائے لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مایوس کن بات یہ ہے کہ ہندوستان میں معاصر تاریخی اور جغرافیائی مواد محفوظ نہیں ہے۔ صرف چند کتبے، مثلاً گنگیا دیو کا کتبہ جس پر کالاچوری سنہ ہے ۱۰۳۷-۳۸ء/۴۹
Archaelogical survey of India reports vol, XXX P. 112 مطبوعہ
اور کرانہ کی پلیٹیں (Mahalan) کالاچوری ۷۹۳ مطابق جنوری ۱۰۴۲ء مطبوعہ ایشیاٹک ریسرچیز جلد ۹ ص ۱۰۴
محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا مواد نہیں ہے جو اس طرح کے مطالعہ کے لئے مفید ثابت ہو سکے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں، گاؤں اور قلعوں کے کچھ اسماء، ان کے جائے وقوع، اب بھی اسی طرح تاریکی میں ہیں جس طرح پہلے تھے۔

ماخذ

۱- ابوالفضل — آئین اکبری، انگریزی ترجمہ مترجم Jarret کلکتہ ۱۸۹۱ء
۲- ابوریحان بیرونی — فی تحقیق ما للہند، حیدرآباد ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء
۳- بدایونی — منتخب التواریخ، کلکتہ ۱۸۶۵ء
۴- بیہقی (ابوالفضل) — تاریخ مسعودی، کلکتہ ۱۸۶۲ء
" " تہران ۱۳۲۴ شمسی
" جلد دوم " ۱۳۲۶

۵- بیہقی (ابوالحسن) — تاریخ بیہقی طبع دوم، تہران

۶- Cu nnigham — Archaelogical survey of India XIV, Calcutta, 1882

۷- Eliot and Dowson — History of India as told by its own historians, II, Kitab Mahal Allah Abad

۸- فخر مدبر — آداب الحرب والشجاعہ، تہران سنہ ۱۳۴۶ھ شمسی

۹- نعیمی — مجمل نعیمی، تہران

۱۰- فرشتہ — تاریخ فرشتہ، نولکشور، کانپور، سنہ ۱۳۰۱ھ

۱۱- گردیزی — زین الاخبار، برلن سنہ ۱۹۲۸ء
تہران سنہ ۱۳۴۷ھ شمسی

۱۲- Hodivala — Studies in Indo-Muslim History, Bombay, 1939

۱۳- ابن الاثیر — الکامل، ۹، مصر، سنہ ۱۳۰۳ھ

۱۴- Kalhana — Rajatarangini, Eng. Tr. by A. Stein, Motilal Banarasi Dass

۱۵- James Todd — Rajasthan, III, Oxford university Press, 1920.

۱۶- منہاج سراج — طبقات ناصری، کابل، جلد اول سنہ ۱۹۶۳ء، جلد دوم سنہ ۱۹۶۴ء

۱۷- Mirashi — Corpus inscriptionum vol. IV Inscription of The Kalachuri chedi era, Ootacammund, 1955.

۱۱- محمد ناظم — The life and times of Mahmud of Ghazna, Cambridge, 1931

۱۹۔ مستوفی — تاریخ گزیدہ، فارسی متن، لندن ۱۹۱۰ء
۲۰۔ نظام الدین — طبقات اکبری کلکتہ ۱۹۲۷ء
۲۱۔ Suchau — Al Beruni's India, London 1914.
۲۲۔ راوندی — راحت الصدور، لیڈن ۱۹۲۱ء
۲۳۔ سیف الدین حاجی — آثار الوزراء، تہران ۱۳۳۷ شمسی
۲۴۔ عتبی — تاریخ یمینی، لاہور ۱۳۰۰ھ
۲۵۔ District Gazetteer of U.P. (Benaras) Allahabad 1909
۲۶۔ Imperial Gazetteer of India, New ed. XIII, XXII, XXIII, Oxford, 1908

(انگریزی سے ترجمہ)

— — . — - —

ڈاکٹر ذکیہ انجم

اردو کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی

مثنوی دردمند

زیر نظر مثنوی میر فقیہ دردمند، شاگرد مرزا مظہر جان جاناں، کی غیر مطبوعہ مثنوی ہے۔ شاعر بسم اللہ سے مثنوی شروع کرتا ہے، خدا سے خطاب کرتے ہوئے حمد و نعت، دونوں سے خود کو عاجز بتاتا ہے لیکن مظہر جان جاناں سے عقیدت کا اظہار اس قدر تعریف و توصیف اور شاعرانہ غلو سے کرتا ہے کہ من و عن ایک طویل قصیدہ کا گمان ہوتا ہے۔ مثنوی کے اسی حصہ میں شاعر نے یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ استاد کے مشورہ سے ہی ریختی میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصیدہ کی روایت برقرار رکھتے ہوئے محمد علی خاں (جن کی مدح مرزا مظہر سے کچھ سوا ہی ہے اور جس کے سبب بعض تذکرہ نویسوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ مثنوی دراصل انہیں کی مدح میں ہے) کی تعریف میں دعائیہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد شاعر ساقی سے خطاب کرتے ہوئے اسے اس کا وعدہ یاد دلاتا ہے کہ فصل گل آگئی ہے۔ باغ، پہاڑ، دشت و کوہ سب پر بہار کی حکمرانی ہے، لیکن تو نہ تو مجھے جام شراب دیتا ہے اور نہ ہی میری فریاد کا جواب — پھر شاعر کبھی ساقی کو جام و صہبا کے سر کی قسم دیتا ہے، کبھی باغ کے رنگ و بو کی اور کبھی خود اس کی خود سرپرستی کی — ساقی جب اس پر بھی توجہ نہیں کرتا تو شاعر التماس کا دوسرا طریقہ استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یوں تو کسی کا بھی پریشان کرنا ٹھیک نہیں، لیکن مجھ کو جلانا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ مجھ پر رحم نہیں کرتا تو خود پر تو کر، میں تیرا مخلص ہوں، کیا تجھے میری زندگی عزیز نہیں ہے۔ میں پست ہمت عاشق یا کم عقل نہیں ہوں — اگر تیری بھلائی منظور نہ ہوتی تو مجھے مرنے قطعی تامل نہ ہوتا۔ یہ غم کہ تو نے ایک لمحہ کے لئے بھی مجھ پر عنایت نہیں کی، میرے ساتھ تو یہ ملال قبر میں جائے گا۔ عنایت کی امید ہی میری زندگی کا سبب ہے۔ تجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قیامت کے دن ظالم کی نجات نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد پروانہ کی حکایت بیان کی ہے کہ وہ شمع کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اور جل کر خاک

ہو جاتا ہے ۔ اسی موت کو شاعر نے افضل بتایا ہے ۔ پھر زاہد کو مطعون کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو شراب کی خوبیوں سے ناواقف ہے ۔ اگر تو شراب کے اسرار جانتا تو شراب نوشی سے منکر نہ ہوتا ۔ بعد ازاں شاعر رندوں کو فصلِ گل کی تہنیت پیش کرتا ہے ـــــ بہار میں اسے اتنی دلکشی نظر آتی ہے کہ وہ خیال کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس موسم میں لوگ اپنے غم بھولتے جا رہے ہیں ۔ لیکن ساتھ ہی شاعر کو بہار اور دنیا دونوں کی بے ثباتی کا شدید احساس ہے ، اسلئے وہ اس لمحہ کو غنیمت جانتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ یہی موقع ہے کہ ایک دوسرے سے مل لیں ، ورنہ ایک دم میں بچھڑ کر نامعلوم راہوں میں گم ہو جائیں گے ۔ اپنے محبوب سے اس سال نہ ملنے کا افسوس کرتا ہے ۔ محبوب کے بغیر بہار کی تمام رنگینیاں ماند نظر آتی ہیں ۔ اتفاقاً وہ چمن کی طرف سے گذرتا ہے تو بلبل کی آہ و زاری اُسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ـــ بلبل چمن میں قفس کو یاد کر کے گریاں ہے اور تڑپ تڑپ کر کہہ رہی ہے کہ مجھے قفس اس لئے عزیز تھا کہ ہم سب ساتھی ایک ساتھ تھے اور ایک دوسرے پر جان فدا کرتے تھے ، صیاد بھی ہم پر مہربان تھا ، لیکن بدقسمتی سے اس سال ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں ، اب چمن کی ہوا بھی ہم پر بار ہے اور گل کا سایہ بھی گراں گزر رہا ہے ۔ اس حالت میں جب کہ دل پہ ساتھیوں کا داغ جدائی ہو ، تنہا باغ کی سیر میں کیا لطف آسکتا ہے ۔

آخر میں ان تمام حکایتوں سے ہٹ کر شاعر مطرب کے پاس جاتا ہے اور اس سے توجہ کی توقع رکھتا ہے ۔ اس سے ہمدردی کا خواہش مند ہے ، کہتا ہے " میں بادہ و صہبا کے ذوق کو تج کر تیرے پاس آیا ہوں ، اس وقت مجھے صرف راگ کی پیاس ہے ۔ مجھے اس تشنگی کی حالت میں نہ چھوڑ ، ورنہ صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا ـــ ایک خواہش یہ بھی تھی کہ میں تیرے ساتھ چاندنی کی سیر کروں لیکن قسمت کی خرابی کہ تمام لوگ لب دریا جا بیٹھے ہیں اور مجھے اپنا جی مارنا پڑا ہے ـــ چاند کی کرنیں دیکھ کر جی ڈوبا جاتا ہے ـــ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے ، جس کے بدلے میں یہ عذاب نازل ہوا ہے ـــــــ

یہ مخطوطہ کسی کم سواد کاتب کا لکھا ہوا ہے ۔ البتہ خط صاف اور نستعلیق ہے ، کہیں کہیں خط شکستہ بھی ہے ۔ کاغذ بادامی ہے ، جدول اور سرخی لال روشنائی سے لکھی ہوئی ہے ـــ مثنوی میں تذکیر و تانیث کا قطعی خیال نہیں رکھا گیا ہے ۔ مثلاً

ع میری بات تو نے نہ مانا کبھو (میری بات تو نے نہ مانی کبھو)

ع لہو دل کا پیتا ہے گلشن کا سیر (لہو دل کی پیتی ہے گلشن کی سیر)

مخطوطہ میں پیش کے اظہار کے لئے اکثر واو استعمال ہوا ہے ، لیکن بعض الفاظ اور ہیں کہیں

وہ الفاظ جو پہلے واو سے لکھے گئے تھے، پیش سے بھی لکھے گئے ہیں مثلاً

اداسی ـــــ اس (اوداسی ـــــ اوس)

مثنوی میں حروف ربط کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے ــ کا ، کے ، کی ، کا استعمال غلط ملط ہے ۔

یہی صورت 'کہ' اور 'کے' کے استعمال کی ہے ۔ اکثر "کے" بجائے "کہ" لکھا گیا ہے۔ اسے کاتب کی کم سوادی پر محمول کیا جائے یا مصنف کی لاپروائی پر کہ مثنوی میں املا رائج الوقت کی بھی کافی غلطیاں ہیں ـــ مثلاً (زندگی) زندہ گانی (زندگانی) پہچہان (پہچان) جاہو جلال (جاہ و جلال) ظالم (ظالمو) جاوگے (جاؤ گے) بالخیر (بالخیر)

آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے ، اس لئے معلوم نہ ہو سکا کہ کب لکھی گئی ۔ اس کے مصنف کا نام بھی کہیں اور درج نہیں ہے۔ مثنوی کے آخر میں صرف اتنا لکھا ہے :ـ

تمت بالخیر

مثنوی دردمند

لیکن تذکروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مثنوی مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد محمد فقیہہ دردمند کی ہے ۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب" اردو مثنوی شمالی ہند میں" میں اس مثنوی اور اس کے شاعر پر خاصی روشنی ڈالی ہے :

"مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد محمد فقیہہ دردمند نے مثنوی ساقی نامہ لکھی ۔ دکن میں اردو کے مطابق دردمند بے ور (دکن) میں پیدا ہوئے ۔ لیکن بعد میں دہلی چلے آئے ۔ چونکہ میر نے "نکات الشعراء" میں دردمند کے ساقی نامہ کا ذکر کیا ہے ، اس لئے یہ ۱۱۶۵ھ سے قبل کی تصنیف ہے ساقی نامہ کے کئی اشعار تذکروں میں ملتے ہیں ۔ یہ نظم کسی شخص محمد علی خاں کی مدح میں ہے ۔ قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں کہ اس کی مثنوی بہت مشہور اور زبان خلق پر جاری ہے ۔ مثنوی کی تمہید اس طرح ہے :

ارے ساقی اے جان فصل بہار	یہی تھا ہمارا و تیرا قرار
ہمارے لیسر نے کی یہ فصل نئیں	فراموش کرنے کی یہ فصل نئیں
ستم سے گزر کچھ تو انصاف کر	خدا سیتی ڈر کچھ تو انصاف کر
کہ میں جاں بلب ہوں پیالے کی طرح	لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح

نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف ۔ شگوفے کو آتے ہیں مستی میں کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک ۔ کہ نرگس کی جاتی ہے گردن ڈھلک[1]

ڈاکٹر گیان چند جین کے اس مختصر سے بیان سے اس بات کی طرف ہلکا سا اشارہ (قیاساً) ضرور ملتا ہے کہ مثنوی ۱۱۶۵ھ سے قبل کی ہے اور محمد علی نامی شخص کی مدح میں ہے۔ لیکن کتنے عرصہ قبل کی ہے اس کی طرف کسی بھی تذکرے میں اشارہ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے حوالے میں جو شعر دئے ہیں وہ املا کے لحاظ سے تو اس کے مخطوطے سے مختلف ہیں کہ مروجہ املا میں ہیں، جیسے "نین" کو "نہیں"، "ٹکہ" کو "ٹک" کر دیا گیا ہے، البتہ "پیالہ" "پیالے" لکھنا کچھ سمجھ میں نہیں آیا، جبکہ اکثر شعری رعایت سے واحد کو جمع پڑھا جاتا ہے، مثلاً نامہ، رشتہ، اندیشہ وغیرہ۔ یہی حال نثر کا ہے، یہاں تک کہ ہم "املا" لکھ کر "املے" پڑھتے ہیں۔ تیسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں "الطاف" کے بجائے "الصاف" لکھا گیا ہے۔ آخری شعر کے مصرعہ ثانی کی ترتیب بھی بدل گئی ہے۔ مخطوطہ میں مصرعہ اس طرح ہے

کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک

"نرگس" کو کاتب نے "برگس" لکھا ہے۔ قیاس غالب "نرگس" کی حمایت کرتا ہے۔

میر "نکات الشعرا" میں محمد تقیہ درد مند کے بارے میں معلومات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"ہر چند کہ یک ملاقات با او کردم لیکن خوب از احوالش معلوم نیستم، ایں قدر دانم کہ نظر یافتہ مرزا مظہر مسطور است و اشعار او ہم بگوش فقیر نرسیدہ مگر چند بیت ساقی نامہ کہ در مدح ممدوح خود گفتہ:

کرے کیوں نہ مشکل دو عالم کی حل ۔ کہ جس کا ید اللہ ہے یا نبہ بل
کوئی آج اس کے برابر نہیں ۔ وہ سب کچھ ہے اللہ پیمبر نہیں

کدام محمد علی خاں نے داشت۔ در صفت او گوید:

پڑی اس کی خوبی کی از بسکہ دھوم ۔ لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم

در شروع ساقی نامہ گوید:

اے ساقی اے جان فصل بہار ۔ یہی تھا ہمارا و تیرا قرار
ہمارے بسرنے کی یہ فصل نئیں ۔ فراموش کرنے کی یہ فصل نہیں

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ ص ۲۷۱

درتسمیہ میگوید :

تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں   تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں

درتحریہ گفتہ :

تیری جیاں کی سوں غنیمت ہوں میں   سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں
مرا عقل میں کون انباز ہے   ارسطو مرا ایک دوا ساز ہے
فلک تیر رخ مارے گا گر صد ہزار   نہ لاوے گا مجھ سا کوئی روزگار

دراشتیاق گوید :

نہ یہ مے نہ یہ باغ رہ جائے گا   یہی ملنے کا داغ رہ جائے گا[1]

اور اصل مخطوطہ میں آخری مصرعہ اس طرح ہے :

نہ ملنے کا یہ داغ رہ جائے گا

ساقی سے خطاب کے پہلے ہی شعر میں الفاظ کی رد و بدل ہے مخطوطہ میں شعر اس طرح ہے :

ارے ساقی اب جان فصل بہار   یہی تھا ہمارا اور تیرا اقرار

اس مثنوی کے سلسلہ میں جن دیگر تذکروں کا استفادہ کیا گیا ہے حسب ذیل ہیں :

تذکرہ "سخن شعراء" میں درد مند کو مرزا مظہر جان جاناں کا شاگرد بتایا ہے نیز یہ کہ درد مند بنگالہ ئے گئے تھے ، ۱۱۶۷ھ میں مرشد آباد میں وفات پائی ۔ صاحب ساقی نامہ و دیوان فارسی گزرے ۔

اس تذکرہ میں ایک رباعی بھی ملتی ہے جو حسب ذیل ہے :

کہسار میں جا کر ناحق کے تئیں   پرویز سے جا بھڑا ناحق کے تئیں
کوئی فکر پہاڑ سے لیتا ہے   فرہاد کا سر پھرا ہے ناحق کے تئیں

تذکرہ "طبقات الشعراء ہند" نے درد مند کے بارے میں کافی تفصیل سے کام لیا ہے جس کا خلاصہ ہے ، مرزا مظہر درد مند سے بہت خوش تھے اور مثنوی ساقی نامہ ان سے اکثر سنا کرتے تھے ۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق انہوں نے اچھے اشعار کہے ہیں لیکن یہ ساقی نامہ تمام ہندوستان میں مشہور ہے دکن میں پیدا ہوئے ، کچھ عرصہ عظیم آباد میں نواب غلام حسین خاں کے پاس رہے ۔ ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی ۔

---

[1] نکات الشعراء : مولفہ میر تقی میر ۔ مرتب حبیب الرحمن شروانی ص۱۲۴–۱۲۵

تذکرۂ گلشن ہند میں ہے کہ درمند مرزا مظہر کے مرید تھے۔ نوازش محمد خاں شہامت جنگ، بھتیجے نواب علی وردی خاں۔ مہابت جنگ کے ملازم سے بر مرشد آباد آئے یہیں ۱۱۷۶ھ میں انتقال ہوا۔ فارسی دیوان صاحب نظروں کا منظور ہے اور ہندی میں تو یہی ساقی نامہ مشہور ہے

اسی تذکرہ میں یہ رباعی ملتی ہے۔

بے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد — اس دھڑکے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد

پرویز کے شیشۂ خانۂ عشرت پر — سنگ آیا ولیک سخت آیا فرہاد

تذکرہ "یادگار شعراء" نے دوسرے تذکروں کے حوالہ سے درمند کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ساقی نامہ لکھا ہے۔ (تذکرہ گردیزی) سرور نے ان کے علاوہ ایک اور درد مند، ساکن دکن کا ذکر کیا ہے جو دہلی بھی آئے تھے۔ دونوں مظہر کے شاگرد ہیں اور غالباً ایک ہی ہیں۔

تذکرہ "سرو آزاد" کے اعتبار سے دردمند کمسنی میں ۱۱۳۶ھ میں دہلی آئے اور شاہ ولی اللہ کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد والد کا انتقال ہو گیا۔ تو مرزا مظہر نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ انہیں کی تربیت میں کمال کو پہنچے۔ خود مرزا صاحب نے ان کے فضل و کمال کو اس طرح سند دی ہے:

مظہر مباش غافل از احوال دردمند — نعلیست اینکہ در گرہ روزگار نیست

اس تذکرہ میں اس بات پر اور روشنی ڈالی گئی ہے کہ دردمند کا فارسی دیوان ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا۔ اردو کا کلام بہت کم پایا جاتا ہے۔ ان کا ساقی نامہ بہت مشہور ہے۔ سن وفات ۱۱۷۶ھ درج ہے۔ فارسی کی دو رباعیاں بھی نقل کی گئی ہیں:

از فیض تو اے شارع روز محشر — ہر روز عید غدیر دیگر

چوں جام بود چشم امیدم در حشر — بہ دست تو اے ساقی حوض کوثر

یکچند عتاب ناز ظاہری کرد — ویں عمر دو روز بار خاطر کردی

بعد از مردن رہست بجا کم افتاد — اول بایست آنچہ آخر کردی

یہ بات کہ دونوں دردمند ایک ہی تھے۔ درست نہیں، اس لئے کہ تذکرہ "سخن شعراء" نے دوسرے دردمند کا نام کریم اللہ خاں بتایا ہے۔ یہ شاہ عالم کے عہد میں علی اصغر کبیر کے ہمراہ مرہٹوں کی لڑائی میں شہید ہوئے تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ظالم کروں میں ظلم سے فریاد کب تلک — ٹک رحم بھی ضرور ہے فریاد کب تلک

تحمّل آتشِ غم میں دل بیتاب کیا جانے ٹھہرتا ایک دم بھی آگ پر سیماب کیا جانے

قابلِ غور بات یہ ہے کہ محض "سرور" نے دونوں دردمند کو ایک ہی بتایا ہے اور نمونۂ کلام میں جو رباعی دی ہے وہ "گلشن ہند" میں میر محمد فقیہ دردمند کے نام سے درج ہے۔ باقی کلام خواجہ میر درد کا پیش کیا ہے جس سے مصنف کی لاپرواہی اور مرتب کی "بے تحقیقی" ظاہر ہوتی ہے، اس لئے ہم اس بیان پر قطعی طور پر یقین نہیں کر سکتے۔

جہاں تک محمد فقیہ دردمند کا تعلق ہے۔ تمام تذکروں میں ان کے ہندی کلام میں صرف ساقی نامہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس لئے "گلشن ہند" اور تذکرہ "سخن شعرا" میں جو رباعیاں محمد فقیہ کے نام سے اردو میں درج کی گئی ہیں، فی الحال مشتبہ ہیں۔ اس لئے کہ ابھی سوائے "ساقی نامہ" کے ان کا اور کوئی ہندی کلام نظر سے نہیں گزرا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں رباعیاں بھی کریم اللہ خاں، دردمند کی ہوں۔

بہر حال محمد فقیہ دردمند کے متعلق اب تک کے بیانات میں ایک اہم تعضاد ان کا سن وفات ہے۔ تذکرۂ "سخن شعراء" میں ۱۱۶۷ھ درج ہے۔ لیکن "طبقات الشعراء ہند" یادگار شعراء اور "سرو آزاد" نے ۱۱۷۶ھ سن وفات لکھا ہے۔ اگر ہم دردمند کی وفات ۱۱۶۷ھ فرض کر لیتے ہیں تو نکات الشعراء اور "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے بیان کے مطابق یہ کہنا ہوگا کہ مثنوی ساقی نامہ (اس مثنوی تمام تذکروں نے "مثنوی ساقی نامہ" لکھا ہے، اس لئے ہم بھی اسے ساقی نامہ سے موسوم کرتے ہیں۔) دردمند نے مرنے سے صرف دو سال پہلے لکھی۔ لیکن دوسری طرف ہمیں یہ بیان ملتا ہے کہ مرزا مظہر اکثر اس مثنوی کو خود دردمند سے سنا کرتے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مرزا مظہر کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا ہے۔ اس لئے اگر دردمند ۱۱۶۷ھ میں وفات پائے، تو استاد سے اٹھائیس سال پہلے مر گئے۔ اس لئے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ یا تو مثنوی ۱۱۶۵ھ سے بہت پہلے لکھی گئی۔ یا دردمند ۱۱۶۷ھ کے کافی سال بعد وفات پائے۔ نتیجتاً ہمیں تذکرۂ طبقات الشعراء ہند" تذکرۂ گلشن ہند، تذکرہ یادگار شعراء، اور تذکرۂ سرو آزاد" پر فی الحال انحصار کرنا پڑتا ہے اور ہم دردمند کا سن وفات ۱۱۷۶ھ فرض کرتے ہیں۔ آئندہ کی تلاش اگر سن وفات کا تعین کر سکی، تو تحقیق کے کئی گوشے سامنے آجائیں گے۔

الغرض یہ مثنوی ساٹھ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں تیرہ [۱۳] اشعار ہیں، اور کل مثنوی میں ۱۷۲ اشعار ہیں۔ مثنوی کی نقل املا کے لحاظ سے اصل مخطوطہ کی طرح ہے۔ قارئین کی آسانی کے لئے مروجہ املا حاشیے پر درج ہے۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

"مثنوی درد مند"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٰہی تیرا حمد مقدور نہیں[1]	اگرچہ سخن کا یہ دستور نہیں[2]
بجا ہے جو تیرا ثنا گر نہیں	یہ مو بہ منہ[3] ان شرالوں کا شاعر نہیں
میرا نعت میں بھی یہی حال ہے	وہی عجز اس عجز پہ دال ہے
کہ جیوں شمع ہوں سخت عاجز بیاں	جلانے کے قابل ہے میری زباں
مناجات میری یہی ہے تمام	کہ ساقی کوثر دلوے مجھ[4]کو جام
زہے پیر و مرشد زہے پیشوا	کوئی کیا کرے اوس[5] کی مدح و ثنا
نپٹ مدح کا قافیہ تنگ ہے	کہ اس مدح سے اسکتیں[6] تنگ ہے
خدایو سخن مرزا جان جاں	کہ حکم اوسکا[7] ہے ناطقے پر رواں
ہے اوسکا لقب ذوالجلال سخن	کہ بندے ہیں اوسکے[10] سب ارباب فن
سب اہل کمال اوس[11] سے ہیں مستفید	کہیں علم و عقل اوسکے[12] دونوں مرید
کہے کیوں نہ مشکل دو عالم کی حل	کہ جسکا[13] ید اللہ ہے بانہہ بل
کوئی آج اوسکے[14] برابر نہیں	وہ سب کچھ ہے الا پیمبر نہیں
میں پھرتا ہوں گرد اوسکے ہر صبح و شام	کہ ہے عشق[15] کا اوسکے دل پر[16] مقام
تمنا ہے یہ اس کف خاک کو ن	کہ چھوڑے نہ اوس[17] دامن پاک کو ن
اوسے[18] سب میں یارب امارت رہے	قیامت تلک وہ سلامت رہے
کہاں تھا مجھے ریختی کا خیال	ہوا جب سے اس امر کا امتثال
محبت نے مجھکون کیا لاجواب	وگرنہ میں اور ریختہ کا خیال

۱۔ نہیں ۵۔ اُسن ۹۔ اُس کا ۱۳۔ جس کا ۱۷۔ اُس
۲۔ نہیں ۶۔ اُس کے تئیں ۱۰۔ اُس کے ۱۴۔ اُس کے ۱۸۔ اُسے
۳۔ منہ ۷۔ اُس کا ۱۱۔ اُس ۱۵۔ عشق کا

رہے نئیں[1] مجھے نیک و بد کی تمیز — کہ ہے ایک خاطر قیامت عزیز
کروں آب گوہر سے اول وضو — تب اوس[2] نام سے میں کروں گفتگو
سعادت سے اوس[3] نام کا ذکر خیر — عبادت بھی ناتمام اوس[4] بغیر
نبی اور علی اوس سے آتے ہیں یاد — دو دولت ہیں یکنام سے مستفاد
محمد علی خاں سیادت کا جاں[5] — کہ کرتے ہیں فخر اوس سے دونو جہاں
امارت کا نخل برومند ہے — کہ شاہ ولایت کا فرزند ہے
کہوں کیا سواریکا[6] میں اوسکی[7] شان — کہ چلتا ہے سورج لے اوسکا[8] نشان
کہوں اوسکی دولت کا کیا اقتدار — کہ کرتے ہیں یاں بخت بھی افتخار
یہی اوسکی[9] نعت پہ بس ہے گواہ — کہ نعلش یا اوسکے[10] ہاتی[11] کا ماہ
عطا میں ہے بات اوسکا سب سے بلند — جسے دل کے دینے میں یہ دردمند
کہوں اونکی[12] جرات کا کیا کاروبار — جنوں[13] کی ہے میراث[14] ذوالفقار
کروں سجدۂ شکر قدرت کیتیں[15] — نہ پوچھوں معانی و صورت کیتیں[16]
بڑی اوسکی[17] خوبی کی از بس کہ دھوم — لیا بات قدرت کا صانع نے چوم
کروں اوسکے[18] اخلاق کا کیا بیاں — مجھے شکر سے اوسکے[19] فرصت کہاں
غرض میں کروں یہ یہی ہے یقیں — کہ جد اوسکا[20] ہے سید المرسلیں
کیا چاہئے سب کچھ اوس پر[21] قیاس — کہ حیرت سے میرے رہے نئیں[22] حواس
مناسب نہیں اب بغیر از سکوت — کہ ہے وو[23] تصور میرے دلکا[24] قوت
الٰہی بحق دل و درد مند — اوسے[25] دو نو عالم میں رکھ سربلند
اوے ساقی اب جان فصل بہار — یہی تھا ہمارا اور تیرا قرار

۱۔ نہیں
۲۔ اُس
۳۔ اُس
۴۔ اُس
۵۔ کی
۶۔ سواری کا
۷۔ اُس کی
۸۔ اُس کا
۹۔ اُس کی
۱۰۔ اُس کے
۱۱۔ ہاتھی
۱۲۔ اُن کی
۱۳۔ جنون کی
۱۴۔ میراث
۱۵۔ کے تئیں
۱۶۔ کے تئیں
۱۷۔ اُس کی
۱۸۔ اُس کے
۱۹۔ اُس کے
۲۰۔ اُس کا
۲۱۔ اُس پر
۲۲۔ نہیں
۲۳۔ وہ
۲۴۔ دل کا
۲۵۔ اُسے

ہمارے بسر نیکی یہ فصل نیں — فراموش کرنیکی یہ فصل نیں
ستم سے گزر کچھ تو انصاف کر — خدا سیتی ڈر کچھ تو الطاف کر
تامل سے ٹک دیکھ گل کا شکوہ — کہ لبریز ہے باغ بھی دشت کوہ
اس آتش میں میرا نکو دل کباب — بگڑ تیری طاقت کے زہرہ کو آب
کہ میں جاں بلب ہوں پیالہ کی طرح — لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح
ارے مجھ سے کیا جرم واقع ہوا — کہ دلکا تیرے مجھ سے دل پھر گیا
نہ توں مجکوں دیتا ہے جام شراب — نہ فریاد کا میری دیتا جو اب
میرے عیش کا دفتر ابتر نکر — قیامت کو مجھ پر تکرر نکر
تیرے اس تغافل سے ظاہر ہوا — کہ پایا ہے تو نے ستم کا مزا
تجھے جام وصہبا کے سر کی قسم — تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم
تجھے خون گل کے لہو کی قسم — تجھے باغکے رنگ و بو کی قسم
تجھے جام کی چشم تر کی قسم — تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم
اداسی لہکنے کی تجکوں قسم — نت سے بہکنے کی تجکوں قسم
تجھے ناز مستی کی اپنی قسم — تجھے خود پرستی کی اپنی قسم
تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں — تجھے بے قراروں کی فرصت کی سوں
شب عیدی تجکو چاہونکی سوں — تجھے اپنے مہدیکی پاؤں کی سوں
جو تونے کیا میکو مجھ پہ حرام — تو اتنا کر اے ظالموں کے امام
کہ اس سرکشی سے نکر پائمال — میرے خوں کو کر اپنے اوپر حلال
اے ساقی اے سربلند و دماغ — ارے بزم مستوں کی شمع چراغ

۱۔ بسرنے کی
۲۔ نہیں
۳۔ کرنے کی
۴۔ نہیں
۵۔ نہ کر
۷۔ لالہ
۸۔ مجھ سے
۹۔ دل کا
۱۰۔ مجھ سے
۱۱۔ نہ کر
۱۲۔ مجھ
۱۳۔ نہ کر
۱۴۔ باغ کے
۱۵۔ تجھ کو
۱۶۔ تجھ کو
۱۷۔ ناتوانوں کی
۱۸۔ بے قراروں کی
۱۹۔ چاہوں کی
۲۰۔ مہدی کی
۲۱۔ مے کو
۲۲۔ ظالموں کے

اُٹھا[1] خاک سے پرخماروں[2] کے تیں　　　جلا اِن تغافل سے یاروں[3] کے تیں

کسی کا ستانا تجھے خوب نیں[4]　　　خصوصاً جلانا مجھے خوب نیں[5]

مجھے اسطرح[6] مت بسر رحم کر　　　نہ مجھ پر کر اپنے اوپر رحم کر

مجھے مرتے جیتے کی نیں[7] کچھ تمیز　　　ترے واسطے زندگی[8] ہے عزیز

تجھے رحم کچھ مجھ پر[9] آتا نہیں　　　مگر جیونا میرا بھاتا نہیں

تو اتنا سخن دل سیتی مان رکھ　　　کہ میں سخت مخلص ہوں پہچان[10] رکھو

پر امید ہو گر کچھ بھلا میں کہوں　　　کہ آخر تیری خیرخواہی میں ہوں

تیری جان کیسوں[11] غنیمت ہوں میں　　　سلیقوں[12] میں پیارے قیامت ہوں میں

میری وضع اطوار پر کر نظر　　　میری طرز گفتار پر کر نظر

اگر عشق میں دلویں تحمل کو عرض　　　لیوے کوہ کن مجھ سے[13] ہمت کو قرض

میری عقل میں کون انباز ہے　　　ارسطو میرا ایک دوا ساز ہے

فلک چرخ مارے اگر صد ہزار　　　نہ لاوے[14] گا مجھ سے[15] کوئی روبکار

نہ توڑ آئینہ اپنے دیدار کا　　　زیاں خوئے نیں[16] اپنی سرکار کا

یہ سب بتکدہ میں جو آتے ہیں یار　　　مجھے دیکھ ہوتے ہیں تیرے شکار

اگرچہ تجھے مجھ سے[17] رغبت نہیں　　　و لے کوئی ایسا خسارت نہیں

کہ مجھسا جدا ہوئے تجھ[18] سات سے　　　یہ شہباز جاتا رہے ہات سے

کوئی تجھ سا خوبیاں میں[19] فائق نہیں　　　تیری شان کا ظلم لائق نہیں

مت اسطرح[20] پیارے کسیکوں بسر　　　مبادا کوئی ناتواں جائے مر

نہ اپنی سفارش یہ کرتا ہوں میں　　　تیری خیرخواہی میں مرتا ہوں میاں

۱۔ اُٹھا
۲۔ پرخماروں کے تئیں
۳۔ یاروں کے تئیں
۴۔ نہیں
۵۔ نہیں
۶۔ اس طرح
۷۔ نہیں
۸۔ زندگی
۹۔ مجھ پر
۱۰۔ پہچان
۱۱۔ جان کے سوں
۱۲۔ سلیقوں میں
۱۳۔ مجھ سے
۱۴۔ لاوے گا
۱۵۔ مجھ سے
۱۶۔ نہیں
۱۷۔ مجھ سے
۱۸۔ تجھ
۱۹۔ خوبیاں میں
۲۰۔ اس طرح

جو منظور تیری بھلائی نہوئے[1] — نظر میں تیری آشنائی نہوئے[2]
تو مرنے کی کچھ مجھکو[3] پروا نہیں — کچھ اس جیونیکی[4] تمنا نہیں
جو کچھ تھا سو ہمت میری کر گئی — ولے آرزو جی میں یہ رہ گئی
میری بات تو نے نمانا[5] کبھو — میری قدر تو نے نجانا[6] کبھو
اسی غم کو لے جاؤں گا گور میں — کہونگا[7] یہی حشر کے شور میں
محبت نے مجھکو کیا بے ادب — محبت ہے ان شوخیونکا[9] سبب
وگرنہ کہاں مجھکو یہ تاب ہے — کب اس چیز کا یہ دہن تاب ہے
یقین جانیو گر نہو[10] ایک آن — تیری مہربانی کا ہمکو[11] گمان
تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات — نکل جاوے ہے ناامید[12] یکے سات
محبت کا ہم خوب پایا ہے بھید — سبب زندہ گی[13] کا نہیں جز امید
جو کھینچے کبھو مہر سے تو نے ہات — ستمگر[14] کو محشر میں نئیں[15] ہے نجات
تو یہ زندگانی[16] گوارا نہیں — اجل جو نہ آوے تو چارہ نہیں
ولیکن شکایت کا نئیں[17] احتمال — کہاں ہے اسیروں کو یہاں تک مجال
یہ ممکن نہیں بندۂ خاص سے — کہ پر درد ہے شان اخلاص سے
لگن میں پڑا ایک پروانہ رات — یہ کہتا تھا ارباب مجلس کے سات
کہ اس بے پروبال کی عرض ہے — کہ ابلاغ اوسکا[18] تمہیں فرض ہے
میرا شمع سے یہ سندیسا کہو — اوسے[19] خوب سمجھا کے ایسا کہو
یہی تھا لکھا میری قسمت میں جان — قیامت تلک ہجر و صل ایک آن
جو تجھکو میرا یوں خوش آتا ہے حال — تو مجھکو[20] شکایت کا[21] کب ہے مجال

۱۔ نہ ہوئے
۲۔ نہ ہوئے
۳۔ مجھ کو
۴۔ جیونے کی
۵۔ نہ جاتی
۶۔ نہ جاتی
۷۔ کیوں گا
۸۔ مجھ کو
۹۔ شوخیوں کا
۱۰۔ نہ ہو
۱۱۔ ہم کو
۱۲۔ نا امیدی کے
۱۳۔ زندگی
۱۴۔ ستم گر
۱۵۔ نہیں
۱۶۔ زندگانی
۱۷۔ نہیں
۱۸۔ اُس کا
۱۹۔ اُسے
۲۰۔ مجھ کو
۲۱۔ مجھ کو
۲۲۔ کی

سراپا میرا گرچہ آتش میں ہے — سعادت میری تیری خواہش میں ہے
جو میری برائی، تیرا ہو بھلا — تو مجکو[1] نہیں چارہ غیر از رضا
وہی[2] کر تو جس میں ترا کام ہو — ولیکن نہ اتنا کہ بدنام ہو
یہ کہہ کر گیا کام اپنا تمام — ہوا زندگانی[3] کا روز اوس پر[4] شام
جو کوئی عشق میں ادب سے مرے — خدا تا ابد اوس پر[5] رحمت کرے
ارے زاہد، اے منکرونکے[6] امام — ارے آب انگور تجھ پر[7] حرام
نہیں جانتا تو جو اسرار مئے[8] — تکرنا ہو[9] قوتی ہے انکار مئے[10]
یہ وہ آب ہے جس سے آتش ڈرے — ہزار الامان اوس[11] سے دوزخ کرے
موافق کے ہے واسطے سلسبیل — مخالف کو یوں ہے کہ جیوں آب نیل
زباں مت نکل اپنی خامہ کی طرح — نہ چڑ[12] سر پہ اتنا عمامے کی طرح
نوازا او دیتا ہے مستونکے تین[13] — ستاتا ہے ساغر پرستونکے تین[14]
یہ محشر کے دن تیرے شانے سے ریش — بلائے سیہ ہو کے آویگی[15] پیش
جلاوینگے[16] روز قیامت کے تئیں[17] — یہ مسواک سے تیرے قامت کے تئیں[18]
جو اندھے کو دیکھے کوئی چاہ پر — تو واجب ہے لاوے اوسے[19] راہ پر
میں کہتا ہوں یہ وضع کچھ خوب نیں[20] — سلامت روی کا یہ اسلوب نیں[21]
نہیں بات مستونکے[22] رہتی عناں — مبادا بہونچے[23] جائے تجکو[24] زیاں
مبارک ہوئے میکشاں[25] فصل گل — کہ آیا ہے کیا شان سے فصل گل

۱۔ مجھ کو
۲۔ وہی
۳۔ زندگانی
۴۔ اُس پہ
۵۔ اس پہ
۶۔ منکروں کے
۷۔ تجھ پہ
۸۔ ے
۹۔ بیہو توتی (قیاس)
۱۰۔ مے
۱۱۔ اُس
۱۲۔ چڑھ
۱۳۔ مستوں کے تئیں
۱۴۔ پرستوں کے تئیں
۱۵۔ آوے گی
۱۶۔ جلادیں گے
۱۷۔ تئیں
۱۸۔ تئیں
۱۹۔ اُسے
۲۰۔ نہیں
۲۱۔ نہیں
۲۲۔ مستوں کے
۲۳۔ پہنچ
۲۴۔ تجھ کو
۲۵۔ مےکشاں

دیکھو تو شہ[1] وگل کا جاہ[2] و جلال — کہ جھکتا ہے فوارہ سا مور چال
نظر تو کرو کچھ چمن کی طرف[3] — شگوفہ کو مستی میں آیا ہے کیف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک — کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
تماشہ[4] میں جاتے ہیں سب غم بسر — کہ پھولا ہے گلزار[5] دل کھول کر
ہوا کے نشہ نے کیا لبکہ زور — پٹا آب کرتا ہے مستی سے شور
زبس گرم جوشی کا یہاں ہے رواج — دل اسطرح[6] پھلا ہے پھولوں کا[7] آج
عزیزو تغافل کا ہنگام نیں[8] — مگر تمکو[9] گل سات کچھ کام نیں[10]
یہ دن کچھ غنیمت نہیں جانتے — مری عرض یارب نہیں مانتے
ارے ظالم و مغتنم ہے یہ بہار — کہاں پھر نشہ پھر کہاں یہ خمار
کہ جیوں نقش بر آب ہے یہ جہاں — ٹک یک سوچ میں ہم کہاں تم کہاں
اولٹ[11] جائیگا[12] ایک دم میں ورق — کروگے کبھی جیوں قلم سینہ شق
نہ بیٹھے[13] نہ یہ باغ رہ جائیگا[14] — نہ ملنیکا[15] یہ داغ رہ جائیگا[16]
کوئی داد اس دکھ سے برتر نہیں — کہ سب ٹھاٹ ہے تم میسر نہیں
لہو دل[17] کا پیتی[18] ہے گلشن کی[19] سیر — یہ آب خضر زہر ہے تم بغیر
جو ہو جاویگا باغ بے آب و تاب — کوئی پیکے تب کیا کرے گا شراب
میں کچھ پوچھتا نیں[20] تغافل کا بھید — نتھی[21] ہائے تم سے[22] مجھے یہ امید
کہ اسطرح[23] جاؤ گے[24] ادسر کو چوک — کرو تم اسی فصل میں یہ سلوک
یہ سختی ہے حقیں[25] تمہارے زبوں — کہ گلشن کے زہرے کو کرتی ہے خوں

۱۔ شہ وگل
۲۔ جاہ و جلال
۳۔ جس کا
۴۔ تماشہ میں
۵۔ گل زار
۶۔ اس طرح
۷۔ پھولوں کا
۸۔ نہیں
۹۔ تم کو
۱۰۔ نہیں
۱۱۔ اُلٹ
۱۲۔ جائے گا
۱۳۔ سے
۱۴۔ جائے گا
۱۵۔ ملنے کا
۱۶۔ جائے گا
۱۷۔ دل کا
۱۸۔ پیتی
۱۹۔ کی
۲۰۔ نہیں
۲۱۔ نہ تھی
۲۲۔ تم سے
۲۳۔ اس طرح
۲۴۔ جاؤ گے
۲۵۔ حق میں

نہ روتا ہوں اس چشم خونبار پر — مجھے رحم آتا ہے گلزار پر
کہ ہم بن عجب حال ہے ایک سال — چمن پر برستا ہے گرد و ملال
مجھے یہ خوشی تھی کہ آئی بہار — نکل جائیگا دل کے سب خار خار
کہو کب تھا طالع سے یہ احتمال — کہ شادی سے تو اپنے ماتم کی فال
نتھا جانتا ہائے یہ سب یہ ریش — کہ سب دوست دشمن ہوا ایک بیش
تغافل نے یاروں کے مارا مجھے — کہ بیوقت انھوں نے بسارا مجھے
میرے تیئں پڑا اتفاق ایک بار — چمن کی طرف فصل گل میں گزار
کھڑا دیکھتا تھا بہار ظہور — کہ ناگہ سنا میں نے بلبل کا شور
پھڑکتی تھی تنہا اپنٹ درہ سے — دل گرم سے اور دم سرد سے
کہ ایام اسیری کے کیا خوب تھے — خصوصاً مجھے سخت مرغوب تھے
پھنسے تھے سبھی ہم قفس ایکبار — ہمیں دام لگتا تھا باغ و بہار
عجب تھا مزہ درد و اندوہ کا — عجب جشن تھا مرگ و انبوہ کا
توجہ تھی ہم سات صیاد کو — پہونچتا تھا ہر وقت فریاد کو
موافق تھی دام و قفس کی ہوا — سب آپس میں کرتے تھے جی کو فدا
نتھے آشنا درد و بیداد کے — کہ تھے ہم اسیر ایک صیاد کے
پڑا ایک سال اسطرح اتفاق — کہ جاتے رہے سب وہ اہل وفاق
چمن کی ہوا مجھ پہ اب سنگ ہے — میری زندگی موت کا ڈھنگ ہے
نہ لگتا ہی صحبت عنبر سے — نہ کھلتا ہے دل باغ کی سیر سے

١- تھوں یار
٢- گل زار
٣- کہ
٤- جائے گا
٥- دل کے
٦- نہ تھا
٧- بے وقت
٨- تیئں
٩- میں نے
١٠- اسیری کے
١١- لگتا
١٢- پہنچتا
١٣- آپس میں
١٤- نہ تھے
١٥- وہ
١٦- مجھ
١٧- زندگی
١٨- لگتا
١٩- باغ کی

نہ کچھ رذق[1] ہے آب و دانے سیتی　　　بچھڑتا ہے جی آشیانے سیتی
مجھے گل کا سایہ لگے ہے زبوں　　　چمن ہے نظر میں میرے جوش خوں
اکیلے کو خوب لگتا ہے باغ　　　ملا ہے رنیقوں[2] کا دوری کا داغ
سخن میں توقف جو واقع ہوا　　　بجز غصہ اوسکا سبب کچھ ہوا
نتھا[3] کچھ مجھے طاقت زور ہے　　　کہ میں دم لیا تھا ٹک یک شور ہے
پھر آیا سخن کا نشہ جوشیں[4]　　　پھر آیا ہے دیوانگی ہوشیں[5]
جنوں[6] کا سراب کیوں ہووے بلند　　　کہ ہے دل میرا ایک مطرب بند
جو کچھ کام ہے مجکو اوس سات[7] ہے　　　میرے دلکا دل اسکے اب ہات[8] ہے
ارے مطرب اے دردمندوں کی جاں　　　کبھی تو کہاں ہیں سوا انکا ماں

تغافل کے ہاتو نے طنبور دار　　　گریباں کو میرے نکر تار تار
سدا گوش کر اپنے مشتاق کی　　　خبر لے ٹک[9] ایک اپنے عشاق کی
مجھے اب تلک ذوق صہبا سے تھا　　　جو کچھ کام تھا جام مینا سے تھا
لگی ہے مجھے پیاس اب راگ کی　　　گلوگیر ہے تشنگی آگ کی
نچھوڑ اسطرح پیاس کے حال میں　　　ڈبو دے مجھے راگ کے تال میں
نکر سر بلند اپنے بیداد کی　　　نکر حق تلفی میری فریاد کی
نہ تاکید کرتا ہوں اس واسطے　　　ترے کان بھرتا ہوں اس واسطے
دیکھہ ٹک[10] یک صبر کا پاؤ چل جائیگا　　　تو یہ جی خفا ہو نکل جائیگا

---

۱ - رزق
۲ - رفیقوں کی
۳ - نہ تھا
۴ - جوشش میں
۵ - ہوش میں
۶ - جنوں کا
۷ - ساتھ
۸ - ہاتھ
۹ - ٹک
۱۰ - ٹک

ملاقات کا سب طرح ذوق تھا | خصوصاً مجھے یہ بڑا شوق تھا
کروں چاندنی کی تیرے سات سیر | ولیکن تیرے جیکی سوں تجھ بغیر
پڑا آجکی رات یوں اتفاق | کہ سب ہوگئے جمع اہل وفاق
کہ شبخون کر لشکر خواب پر | سبھی جا کے بیٹھے لب آب پر
میرا جی گیا ڈوب مہتاب دیکھ | جیسے مرگی والیکا جی آب دیکھ
عداوت کی کب چاند سے تھی امید | ولیکن ہوا مجکو معلوم بعید
کہ واقع ہوئے ہمسے از بس گناہ | گئے تاؤ کی طرح چہرے سیاہ
ہوئے سب طرح مستحقِ عذاب | تو لازم ہوا اب نزول عذاب
ولیکن خدا کیبھتا تھا سدا | مناسب ہر یک قوم کی یک بلا

نبی کی ہوئی اسکے خدمت ضرور
اسی امت پر آیا ہے طوفان نور

تمت بالخیر
مثنوی دردمند

---

۱ ـ ساتھ
۲ ـ جی کی
۳ ـ تجھ
۴ ـ آج کی
۵ ـ جا کے
۶ ـ والے کا
۷ ـ ہم سے
۸ ـ تار (قیاس)
۹ ـ سب طرح
۱۰ ـ پتہ (اوپر)

ادبی حلقہ

شرائط رکنیت

(۱) حلقہ کی رکنیت کی فیس سالانہ ۲۴ روپے یک مشت یا بارہ کی، ایک اور گیارہ گیارہ کی دو قسطیں۔ اس طرح کل تین سہ ماہی قسطوں میں۔

(۲) حلقہ ممبروں کو ہر سال پچیس روپے کی کتابیں اور انجمن کا ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" قیمتی پانچ روپے، اور سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" قیمتی بارہ روپے، کل بیالیس روپے کی مطبوعات پیش کرے گا۔

(۳) ارکان کو بقدر پچیس روپے انجمن کی مطبوعات میں سے اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے کا حق ہوگا۔

(۴) ۲۴ روپے کے عوض بیالیس روپے کی مطبوعات مندرجہ بالا صورت میں دی جائیں گی

اس کے علاوہ اگر کوئی رکن انجمن کی دوسری کتابیں خریدے گا تو ان پر پچیس فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

مزید تفصیلات کے لئے دفتر سے خط و کتابت کریں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ

حامد اللہ ندوی

تجوید اور صوتیات - ایک موازنہ

قرآن مجید اسلامی تعلیمات کا اولین سرچشمہ ہے، اس کو سمجھ کر پڑھنے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی جو اہمیت ہے وہ تو ہے ہی لیکن اس کی قرأت اور تلاوت کے بھی کچھ آداب ہیں جن پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لئے حتی الامکان ضروری ہے کیونکہ خود قرآن نے اس سلسلہ میں ترتیل کا حکم دیا ہے، ترتیل عربی میں خوش لحانی اور حسن ادائیگی کو کہتے ہیں، رسول اللہ نے بھی قرآن مجید کو نہ صرف عمدگی اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کا حکم فرمایا ہے بلکہ خود بھی قرآن مجید بڑی عمدگی کے ساتھ رک رک کر پڑھتے تھے، صحابۂ کرام نے بھی اپنے عمل سے اس روایت کو زندہ و باقی رکھا، اس طرح قرآن مجید کی دینی اہمیت، خدا کے حکم اور رسول اللہ و صحابہ کے عمل نے ابتدا ہی سے مسلمانوں میں قرآن مجید کو پوری صحت اور حسن ادائیگی کے ساتھ پڑھنے کا ایک خاص رجحان پیدا کر دیا اور اس رجحان کو اصولی شکل دینے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

عملاً اس سلسلہ میں بعض دشواریاں تھیں، پہلی دشواری یہ تھی کہ قرآن مجید مکمل ہونے کے باوجود آ... وہ صحابۂ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا یا پتوں، پتھروں، ہڈیوں اور چمڑوں پر لکھا ہوا تھا کتابی صورت میں ایک جا جمع نہ تھا۔ دوسری دشواری یہ تھی کہ رسول اللہ کے عہد تک عربی کوئی ترقی یافتہ زبان نہ تھی، بلکہ وہ متعدد بولیوں میں بٹی ہوئی تھی جنمیں بنو قریش، بنو حنیف، اہل ہوازن، اہل یمن، بنو ثقیف، بنو ہذیل اور بنو تمیم کی بولیاں زیادہ عام تھیں، دوسرا یہ کہ اس وقت تک اعراب اور نقطوں وغیرہ کا بھی وجود نہ تھا۔ بعض اوقات ایک ہی لفظ مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا اور ہر قرأت پر معنی بھی بدل جاتے تھے مثلاً

۱۔ یعفرن، یَنفَطِرنَ بھی پڑھا جا سکتا اور یَتَفَطَّرنَ بھی، دونوں لفظ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۲۔ اسمہ، یہ آیَتُہٗ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور آیٰتُہٗ بھی، دونوں میں واحد اور جمع کا فرق ہے۔

۳۔ تعملون، یہ یَعمَلُونَ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور تَعمَلُونَ بھی، پہلا صیغہ غائب ہے اور دوسرا حاضر

۴ ۔ میت ، یہ مَیِّتٌ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور مَیْتٌ بھی ، دونوں میں تاکید و غیر تاکید کا فرق ہے
۵ ۔ اٰمنتم ، یہ آمنتم بھی پڑھا جا سکتا ہے اور أَآمنتم ، پہلا خبریہ ہے اور دوسرا استفہامیہ ہے۔
۶ ۔ نعرشوت ، یہ نُعْرِشُوتَ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور تُعْرِشُوتَ بھی ، پہلا صیغہ معروف اور دوسرا مجہول

جہاں تک پہلی دشواری کا تعلق ہے رسول اللہ کے جیتے جی مسلمانوں کو اس کا کوئی خاص احساس نہ ہوا کیونکہ اس سلسلہ میں جب کبھی کوئی دشواری ہوتی وہ رسول اللہ کی طرف رجوع کر کے دور کر لیا کرتے تھے لیکن رسول کے انتقال کے بعد یہ سہولت باقی نہ رہی اس لئے ضروری تھا کہ اس کی طرف پہلی فرصت میں توجہ دی جائے چنانچہ حضرت ابوبکر کے دورِ خلافت میں نبوت کے بعض جھوٹے دعویداروں کی وجہ سے امت مسلمہ میں انتشار سا پھیلنے لگا اور اس کے تدارک کے لئے جنگیں کرنا پڑیں تو بعض جنگوں میں سینکڑوں حافظ قرآن بھی شہید ہو گئے۔ حفاظ کی شہادت نے حضرت عمر کو جو جھٹکا سا دیا اور ان کے توجہ دلانے پر حضرت ابوبکر اس بات کے لئے تیار ہو گئے کہ قرآن مجید کو کتابی صورت میں محفوظ کر لیا جائے۔ کاتب الوحی حضرت زید بن ثابت کو یہ ذمہ داری سونپی گئی اور انھوں نے پوری محنت اور جانفشانی کے ساتھ قرآن مجید کو حفاظ کے سینوں اور پتوں، پتھروں اور ہڈیوں وغیرہ سے نکال کر کتابی صورت میں جمع کر دیا اور ان کا جمع کیا ہوا قرآن مجید پہلے حضرت ابوبکر کے پاس پھر حضرت عمر کے پاس اور پھر ان کی صاحبزادی حضرت حفصہ کے پاس محفوظ رہا۔

حضرت عثمان کے خلیفہ بنتے بنتے اسلامی مملکت کی حدود بہت دور دور تک پھیل گئیں، شام، روم اور ایران جیسے متعدد غیر عربی علاقے بھی مسلمانوں کے زیر اثر آ گئے، مسلمانوں کے ساتھ ساتھ قرآن مجید بھی ان دور دراز علاقوں میں پہنچا، اور ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی، پتہ چلا کہ مختلف علاقوں میں قرآن مجید مختلف طریقوں سے پڑھا جا رہا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان نے حضرت عثمان کو اس طرف متوجہ کیا، لہٰذا وہ محفوظ نسخہ حضرت حفصہ کے پاس سے منگوایا گیا اور پھر ایک بار رسول اللہ کے کاتب الوحی کو تکلیف دی گئی کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر حضرت سعید بن عاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث کی مدد سے اس نسخہ پر نظر ثانی کریں اور جہاں کہیں کسی لفظ کے متعلق اختلاف ہو وہاں بنو قریش کی زبان کو ترجیح دی جائے۔ جب یہ نسخہ مکمل ہو کر آیا تو اس کی نقلیں تیار کروائی گئیں اور ان کو ساری مملکت اسلامیہ میں پھیلا دیا گیا اور حکم دیا کہ اس نسخہ کو صحیح سمجھا جاوے۔ اور باقی سب کو جلا دیا جائے۔

اب دوسری دشواری کھل کر سامنے آئی اور یہ دشواری عربی رسم الخط کی اصلاح، نقطے اور اعراب کی ایجاد اصوات اور مخارج کی تعیین اور قواعد کی تدوین سے متعلق تھی، اس دوسری دشواری کو دور کرنے کی جو کوششیں شروع ہوئیں ان میں حضرت علی کو شرف اولیت حاصل ہے، وہ نہ صرف یہ کہ عربی زبان کے ایک بلیغ شاعر اور خطیب تھے بلکہ لسانیات کی بنیادی باتوں کا بھی انھیں خدا داد علم تھا، ابوالاسود دؤلی جو عربی قواعد کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے وہ حضرت

علی ہی کو اپنا استاد بنایا تھا۔ حضرت علی کے بعد جب اموی دور خلافت شروع ہوا تو عبدالملک بن مروان نے اس کی طرف مزید توجہ کی، اس نے نہ صرف یہ کہ پوری مملکت میں عربی کو سرکاری زبان قرار دیا بلکہ عربی زبان کی خامیوں کو دور کرکے اس کو معیاری زبان بنانے کا بھی باقاعدہ بیڑا اٹھایا۔ اموی دور کے دو با اثر حاکم زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف جو یکے بعد دیگرے عراق کے گورنر بنے اور عربی زبان کے ماہر بھی تھے اس کام میں بڑے مددگار ثابت ہوئے، انھوں نے اپنے اثر و رسوخ اور ذاتی دلچسپی سے کام لے کر ایک مختصر سی مدت میں بصرہ اور کوفے کو زبان اور علم زبان کا مرکز بنادیا اور عربی قواعد کی تدوین زور و شور سے شروع ہوگئی

بصرہ نے جن قواعد نویسوں کو جنم دیا ان میں ابوالاسود دؤلی کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ابو عمرو، خلیل بن احمد، سیبویہ، ابو عبیدہ، اصمعی، مبرد، اور ابن درید کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دؤلی نے زیاد کے حکم سے قرآن مجید کی صحیح قرات کی خاطر حروف علت اور اعراب کئے تو خلیل نے ان میں اصلاح کرکے ان کو قابل عمل بنایا، دؤلی اور خلیل کا عربی قواعد کی تدوین میں جو بنیادی حصہ ہے۔ اس کی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ خلیل کے ایک شاگرد سیبویہ نے الکتاب کے نام سے قواعد کی جو کتاب دو جلدوں میں لکھی اس کو قرآنی قواعد کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اصمعی ابو عبیدہ وغیرہ نے بھی متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے بعض قرآنی قواعد سے متعلق ہیں

یہی کچھ حال کوفہ کا بھی تھا۔ یہاں کے سربرآوردہ قواعد نویسوں میں کسائی، الفراء، ثعلب، ابن السکیت وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ان لوگوں نے عربی قواعد کو اپنی نگارشات کے ذریعہ جو کچھ دیا وہ بصری علماء کی دین سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا۔ اس طرح مجموعی طور پر قواعد کا کوئی ایسا گوشہ باقی نہ رہا جو ان نحویوں کے احاطہ تحریر میں نہ آیا ہو، تجوید بھی انہی قواعد کا ایک حصہ ہے اور قواعد تو پوری عربی زبان کے لئے عام ہوگئے لیکن فن تجوید محض قرآن مجید کی قرات سے ہمیشہ مخصوص رہا اور آج بھی لوگ محض قرآن مجید کی صحیح قرات کی خاطر اس کو سیکھتے ہیں۔

تجوید میں بعض مخصوص قرآنی مباحث کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ اس کی صوتیات یعنی عربی آوازوں کی ادائیگی ان کے مخارج، اعضائے نطق اور اوقاف و رموز وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

(۲)

زبان اور اسکے اصولوں سے انسان کی دلچسپی بہت پرانی ہے، کیونکہ یہی اک ایسا ذریعہ ہے جو انسان کو انسان کی بات سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور دلوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ اس علم سے دلچسپی لینے والے اکیلے مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ ان سے پہلے بھی لوگوں نے دلچسپی لی تھی اور ان کے بعد بھی لوگوں نے دلچسپی لی ہے، فرق اگر کچھ ہے تو وہ مقاصد کا ہے کسی کے پیش نظر محض انسانی تعلقات تھے، کسی کے پیش نظر محض مذہب تھا اور کسی کے پیش نظر محض سیاسی

تسلط یہ دائرہ اپنے اپنے مرکز پر چکر کاٹ رہا تھا۔ آج یورپ اور امریکہ اس چکر میں پڑے ہوئے ہیں ا
اس علم سے خاص طور پر دلچسپی لے رہے ہیں

نشاۃ ثانیہ کے بعد جب مغرب میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی تو وہاں زندگی کے ہر شعبہ میں ایک
کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اور لوگ مذہبی، سیاسی، معاشی، سماجی، ثقافتی ہر میدان میں ایک نئے جوش
نئے جذبے سے کام کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زبان و ادب کا اس تبدیلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا
چنانچہ اس میدان میں بھی غور و فکر اور چھان بین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، لیکن اس غور و فکر کے جو نتائج سامنے
ان کی حیثیت محض چند فلسفیانہ نظریات کی سی تھی، جن کی تفصیلات زبان اور علم زبان کی کتابوں میں ملجاتی
علم زبان سے دلچسپی نے مغرب میں نئی کروٹ اس وقت لی جب جب نئی دریافتوں کا دور آیا ا
نئی زمین نئے آسمان پیدا کئے گئے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب اہل مغرب کو دنیا کی متعدد نئی زبانوں کے متعلق معلومات
فراہم ہوئیں اور سیاح اور مشنریوں نے افریقہ اور امریکہ میں پائی جانے والی متعدد زبانوں کے قواعد لکھنے کی
مہم شروع کی، اس مہم کی ابتدائی شکل تقابلی مطالعہ کی سی تھی جس کسی کو بھی کسی اور زبان کا سیکھنا یا اس کا
عمل معلوم کرنا ہوتا وہ اس زبان کا مقابلہ اپنی یا کسی اور معلومہ زبان سے کرتا اور اس سے جو نتائج حاصل ہوتے ان کو ا
کی شکل دیدی جاتی تھی، اس طرح مطالعہ زبان کے سلسلہ میں بتدریج جو اصول مدون ہوئے انھیں تقابلی لسانیات
(coparative Linguistics) کہا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ تقابلی لسانیات کو ایک مستقل لسانی صنف کی شکل دینے میں سر ولیم جونز Sir William
(Jones) کی کوششوں کو بڑا دخل ہے، اسی نے پہلی بار اپنے مضامین میں سنسکرت، یونانی اور لاطینی زبانوں کا مقا
کر کے بتایا کہ یہ زبانیں مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھتے اور ایک دوسرے سے بالکل ہی بے تعلق ہوتے کے باو
ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں، اس نے اپنے نتائج فکر کی مدد سے یہ بھی ثابت کیا کہ دنیا کی اکثر زبانوں کی ساخت،
ان کی نشوونما اور ان کے ارتقاء کی کہانی ایک جیسی ہے، یہ زبانیں ایک خاص نظام اور اصول کے تحت بدلتی ہیں اگر
کسی ایک زبان کے نظام عمل کا پتہ چلانا ہو تو دوسری زبان سے اس کا مقابلہ کر کے بڑی آسانی کے ساتھ یہ مقصد
حاصل کیا جاسکتا ہے۔

گو کہ اس صنف لسانیات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن یہ دوسری زبانوں کے سمجھنے میں صرف اسی وقت
تک معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ جب ہم ان زبانوں کی تاریخ، ان کے رسم خط اور ان کے معنی مطلب سے واقف
ہوں اور اکثر حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب یورپ اور امریکہ کا دائرہ اثر مزید وسیع ہوا، اہل مغرب کو
آئے دن نئے انسانوں، نئی تہذیبوں اور نئی زبانوں سے سابقہ پڑنے لگا اور ان کی مشنریوں نے مفتوحہ علاقوں

اور نو آبادیوں میں دور دور تک جانے اور اپنے مذہب کی اشاعت کی خاطر وہاں کے دور افتادہ اور پسماندہ قبیلوں اور آبادیوں سے راہ رسم پیدا کرنے کی کوشش کی تو انہیں احساس ہوا کہ اگر کسی ایسی زبان سے سابقہ پڑ جائے جس کی کوئی تاریخ نہیں جس کا کوئی رسم خط نہیں اور جس کے معنی مطلب سے ہم بالکل ہی نابلد ہوں اور جو محض ایک بولی کی حیثیت رکھتی ہو تو وہاں تقابلی لسانیات کے اصول بالکل رہنمائی نہیں کرتے اور انسان بے بسی محسوس کرنے لگتا ہے۔

تقابلی لسانیات سے ان کی اس مایوسی نے انہیں زبان (LANGUAGE) کی بجائے بولی (DIALECT) کو بنیاد بنا کر اک نیا تجربہ کرنے پر مجبور کر دیا اور ان کے مسلسل تجربات کے نتیجے میں توضیحی لسانیات - (Descriptive Linguistics) صنف - وجود میں آئی، اس صنف لسانیات کی بنیاد تحریر (Writing) اور معنی (Meaning) کی بجائے بول چال (Speech) اور ساخت (Structure) پر ہے اور اس میں ہر زبان کو اس کے معنی مطلب کا سہارا لئے بغیر محض اس کے اصوات، اس کے اجزا اور اس کے حصص کی مدد سے اس کے پورے نظام کا تعین کیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اس توضیحی لسانیات کے پیشرو دی ساسور (De Saussure) دی کرتنے (De Courtenay) فرنز بواس (Franz Boas) ولیم ڈوائٹ وھٹنے (William Dwight Whitney) ایڈورڈ ساپر (Edward Sapir) لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) اور ہیرس (Harris) وغیرہ سمجھے جاتے ہیں اور انکی تحریروں کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

توضیحی اور تقابلی دونوں قسم کی لسانیات کی تعبیر و تشریح کا سلسلہ یورپ میں عموماً اور امریکہ میں خصوصاً آج بھی بڑے زور و شور سے جاری ہے اور ان کی نت نئی تفسیریں صبح شام سامنے آ رہی ہیں۔ کثرت تعبیر بعض اوقات خواب ہی کو پریشان کر دیتی ہے اس لئے یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ اس کی آخری صورت کیا ہوگی۔ البتہ اس لسانیات کے تجزیے کے لئے جو طریق کار اور مدارج مقرر کئے گئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں۔ (۱) علم الصوت (Phonetics) (۲) صوتیات (Phonemics) (۳) صرف (Morphology) (۴) صرفی صوتیات (Morphophonemics) (۵) نحو (Syntax) (۶) فرہنگ نویسی (Lexicography)

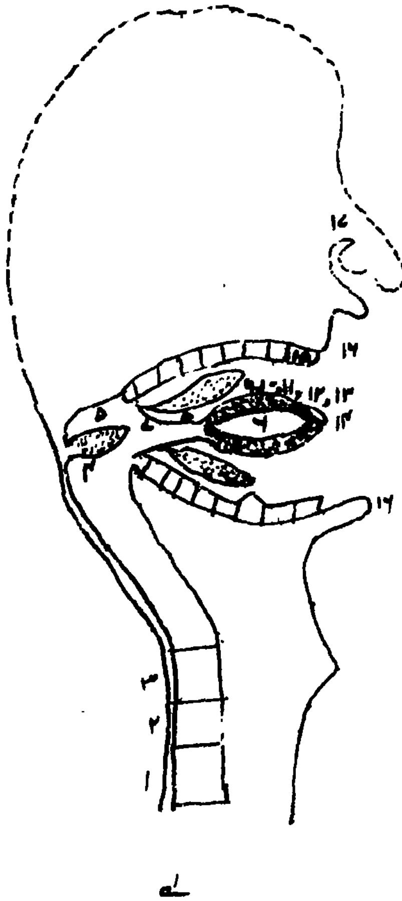
لسانیات کے مدارج کے جو نام اوپر دئے گئے ان سے صاف ظاہر ہے کہ صوتیات، لسانیات کی ایک اہم کڑی ہے اور اس میں کسی زبان میں استعمال ہونے والی نطقی اصوات (Vocal sounds) جیسے مصوتے (Vowels) نیم مصوتے (Semivowels) مصمتے (Consonants) کے علاوہ لہجے (Tone) زور (Stresses) اور اتصال (Juncture) وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

(۳)

اوپر ہم نے تجوید اور صوتیات کا مختصر سا تعارفی پس منظر پیش کیا ہے۔ بہ ظاہر ان دونوں میں کوئی
نہیں آتی مگر جب ہم ان دونوں کی تفصیلات کو لے کر ان کا آپس میں موازنہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان د
کے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہونے کے باوجود روشنی اور سائے کا سا ایک نامعلوم رشتہ بھی ہے جو حیرت
طور پر دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے اور بعض اوقات ایک ہی مرکز پر دونوں آکر مل بھی جاتے ہیں
لسانی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہماری آواز کا دارومدار زیادہ تر ہماری سانس پر ہے سانس کی
ہمارے سینہ میں خاموشی کے ساتھ چوبیس گھنٹے جاری رہتی ہے۔ آواز اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس سانس
اس آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتا آواز پیدا کرنے والی انہی رکاوٹوں سے موثر استعمال کا نا
چال ہے یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی بولی یا زبان کا صوتیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے تو اس کی شروعات سانس اور اعضا
نطق (organs of speech) کی تفصیلات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ تجوید اور صوتیات میں بھی انہی چیزوں کو اولیت
دی گئی ہے اور بحث کا آغاز سانس اور اعضائے نطق کے ذکر سے کیا گیا ہے

تجوید میں عام طور پر جن اعضائے نطق سے بحث کی گئی ہے ان میں ناف، اور پھیپھڑوں کے علاوہ حلق لہات، نوک
زبان، نوک زبان، تالو، مسوڑھے، ہونٹ اور ناک کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس بارے میں تھوڑا
اختلاف ہے کہ جملہ مخارج کی صحیح تعداد کیا ہے، کسی نے اس کو پندرہ بتلایا ہے اور کسی نے سولہ اور
تجوید کی کتابوں میں نہ صرف یہ کہ ان مخارج اور ان سے ادا ہونے والی عربی آوازوں کی پوری صراحت ہو
ہے بلکہ اکثر و بیشتر کتابوں میں ان کی مزید وضاحت کے لئے نقشے بھی دئے گئے ہیں۔ ولی القاری میں اس طرح
کے جو نقشے دئے گئے ہیں ان میں سے ایک نقشہ تھوڑے سے تصرف کے ساتھ یہاں پیش کیا جاتا ہے

نقشہ اگلے صفحہ پر دیکھیں



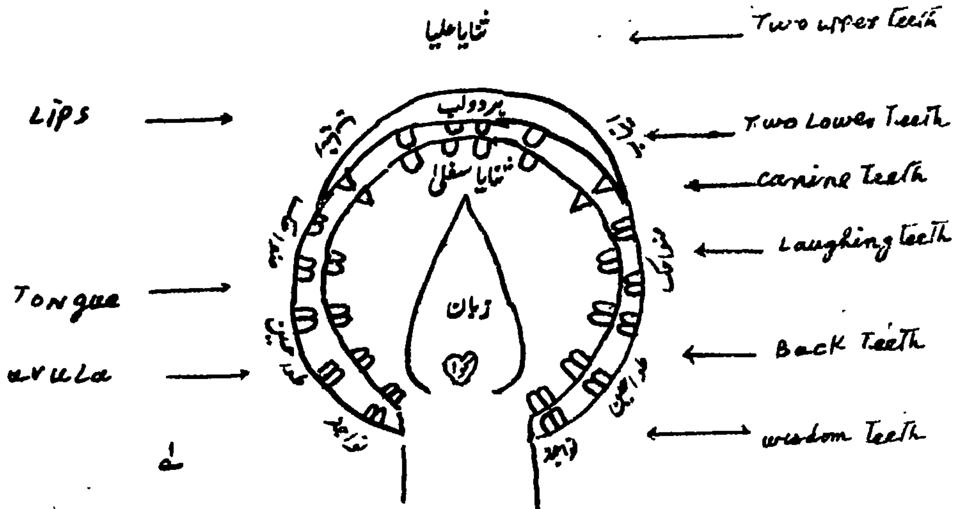
لہ

ابتدائے حلق	۱-	Primary Gullet
وسط حلق	۲-	Central Gullet
آخر حلق	۳-	Final Gullet
غلصمہ	۴-	Epiglottis
عکدہ	۵	Root of THE Tongue
شجر	۶-	Slit (Tongue)
علوے دہن	۷	oral passage
ضرس	۸-	Teethe
ابتدائے ذلق	۹-	EDGE of THE Tongue, Primary par:
وسط ذلق	۱۰-	" central Part
آخر ذلق	۱۱-	" Final Part
نطع	۱۲-	Fore part of The PALate
لثہ	۱۳-	The gums
اسلہ	۱۴-	Tip of The Tongue
بطن شفت	۱۵	ALveslaa
شفتین	۱۶-	Lips
خیشوم	۱۷-	Nasal passage

ان اعضائے نطق میں بعض اعضا کی مزید وضاحت بھی ملتی ہے ، اس سلسلہ میں دانتوں کی مثال پیش کی جا سکتی ہے تجوید میں نہ صرف یہ کہ پورے بتیس دانتوں کی درجہ بندی کر کے ان کے نام مقرر کئے گئے ہیں بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عربی زبان کی بعض مخصوص آوازوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں ان کی اہمیت کیا ہے ، دانتوں

لہ دولی القاری مصنفہ مولوی محمد ابراہیم قاری ، ص ۶۰

کی یہ درجہ بندی حسب ذیل نقشے سے سمجھ میں آ سکتی ہے ۔



لے

صوتیات میں عموماً جن اعضائے نطق کی نشاندہی کی گئی ہے وہ مذکورہ بالا اعضا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں ۔ یہاں بھی تعداد میں مختلف ماہرین کے ہاں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے یہاں بھی ان کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں ہے ۔ چنانچہ گلیسن نے اپنی کتاب An Introduction to Descriptive Linguistics میں ان مخارج یا اعضا کا جو خاکہ دیا ہے وہ یہ ہے



ے

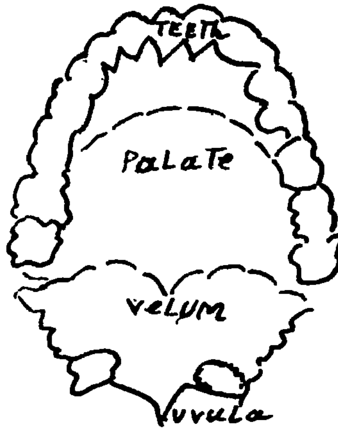
لے کریم اللہ خان قاری: وسیلۃ القاری ص ۱۱

ے H.A. GLEASON: AN INTRODUCTION TO DESCRIPTIVE

اس سلسلہ میں اگر ماہرین تجوید نے دانتوں کی درجہ بندی اور انکی مزید وضاحت کو ضروری سمجھا تو ماہرین صوتیات نے بہ استثنائے ثنایا سب کو غیر اہم قرار دیا۔ چنانچہ گلیسن نے دانتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ "

بہت سی ادائیگیوں میں زبان کے کنارے ڈاڑھوں (MOLARS) کو چھوتے اور خلوئے دہن (ORAL PASSAGE) کو دونوں بازوؤں سے بند کر دیتے ہیں تاہم اس عمل کی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں بلکہ یہ بالعموم زبان کی بلندی و پستی کا ایک ضمنی حصہ ہوتا ہے اس لئے کہنا چاہئے کہ ڈاڑھوں یا دانتوں کی صوتیات میں کوئی خاص اہمیت نہیں"۔[1]

اس کے برعکس انھوں نے حنک یا تالو (PALATE) کی طرف زیادہ توجہ دی ہے اور اسکو تین حصوں میں تقسیم کر کے اس کا نقشہ کچھ اس طرح بنایا ہے۔



[2]

اعضائے نطق کی تعین کے بعد دوسرا مرحلہ خود اصوات کی تقسیم کا ہے، چونکہ تجوید میں مروجہ عربی حروف ہی کو صوتی اکائی مان کران کی تقسیم کی گئی ہے اس لئے ان کو مصوتوں اور مصمتوں میں بانٹنے کے بجائے دونوں کو ایک ہی زمرے میں رکھ کران کی خصوصیات بیان کرتے کو زیادہ ضروری سمجھا گیا

---

[1] H.A. Gleason An Introduction to Descriptive Linguistics, P.243
[2] ABID P.-243

ہے، اس سلسلہ میں ماہرین تجوید نے دو چیزوں کو بنیاد بنایا ہے
(۱) دائرہ نطق (Speech Tract (1 اور (۲) کیفیت نطق (Vocal quality)
دائرہ نطق کے حساب سے: نفوں نے پوری آوازوں کو تین عام حصوں میں بانٹا ہے۔ حلقی (Guttural)
وسطی (Central) اور شفوی (Labial) اور کیفیت نطق کے حساب سے ان کی
خصوصیات قرار دی ہیں، جنہیں باہمی نسبت تضاد ہے اور جن کی حسب ذیل پانچ جوڑیاں بنتی ہیں

۱۔ مجہورہ (Voiced)		مہموسہ	(Breathed)
۲۔ شدیدہ (Hard)		رخوہ	(Soft)
۳۔ مستعلیہ (High)		مستفلہ	(Low)
۴۔ مطبقہ (Covered)		منفتحہ	(Open)
۵۔ مذلقہ (Slippery)		مصمتہ	(Solid)

پہلی جوڑی میں آواز کی بلندی و پستی کو دوسری میں آواز کی سختی و نرمی کو، تیسری میں زبان
کے تالو (حنک) تک بلند ہونے نہ ہونے کو، چوتھی میں زبان کے تالو سے چپاں ہونے اور زبان
ڈھلکنے نہ ڈھلکنے کو اور پانچویں میں سرعت اور ادائیگی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ یہ خصوصیات سبھی عربی آواز
کے لئے عام ہیں اور تقریباً سبھی اہل تجوید کے ہاں مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن بعض خصوصیات ایسی
بھی ہیں جو تمام حروف کے لئے عام نہیں بلکہ بعض بعض ہی کے ساتھ مخصوص ہیں ان کی تعداد بھی دس
گیارہ سے زیادہ نہیں، مثلاً مد (Length)، لین (Placidity) اور اعتلال (Weakness)
یہ تین خصوصیتیں صرف الف، واو، ی میں پائی جاتی ہیں۔ تکریر (Trill) یہ ر کی خصوصیت
ہے، صفیر (Sibilance) یہ س، ز، ص کی خاصیت ہے، انحراف (Laterality)
محض ل کی اور غنہ (Nasality) ن اور میم کی خصوصیتیں ہیں

تجوید کی بعض کتابوں میں ان کے علاوہ بھی دو چار مزید خصوصیات کا ذکر ملتا ہے۔ بہر حال
جس قدر بھی خصوصیات گنائی گئی ہیں ان میں سے کم سے کم چھ (۶) اور زیادہ سے زیادہ دس (۱۰)
خصوصیات عربی زبان کی ہر آواز یا حرف میں پائی جانی ضروری ہے اس طرح پورے حروف تہجی
کی صفات یا خصوصیات کا با عتبار مخارج جو نقشہ بنتا ہے وہ "ولی القاری" میں درج ہے، وضاحت کیلئے
اسکی بالکل نقل یہاں دی جاتی ہے۔

نقشہ حروف ہجی کی صفات کا باعتبار مخارج کے

حلقی						
ا	ء	ہ	ع	ح	غ	خ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
مجہورہ	مجہورہ	مہموسہ	مجہورہ	مہموسہ	مجہورہ	مہموسہ
متوسط	شدیدہ	رخوہ	متوسط	رخوہ	رخوہ	شدیدہ
منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ
مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ	مستعلیہ	مستعلیہ
مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ
ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ
لین	·	·	·	·	·	·
·	·	·	·	·	·	·
جرسیہ	طبورہ	·	·	جرسیہ	جرسیہ	جرسیہ
مدہ	مسہلہ	·	·	·	·	·
۹	۸	۶	۶	۷	۷	۷
·	·	·	·	·	·	·

وسطی																	
ق	ک	ج	ش	ی	ض	ل	ن	ر	د	ت	ط	ذ	ث	ظ	ص	س	ز
۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵
مجہورہ	مہموسہ	مجہورہ	مہموسہ	مجہورہ	مجہورہ	مجہورہ	مجہورہ	مجہورہ	مجہورہ	مہموسہ	مجہورہ	مجہورہ	مہموسہ	مجہورہ	مہموسہ	مہموسہ	مجہورہ
شدیدہ	شدیدہ	شدیدہ	رخوہ	متوسط	رخوہ	متوسط	متوسط	متوسط	شدیدہ	شدیدہ	شدیدہ	رخوہ	رخوہ	رخوہ	رخوہ	رخوہ	رخوہ
منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	مطبقہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ	مطبقہ	منفتحہ	منفتحہ	مطبقہ	مطبقہ	منفتحہ	منفتحہ
مستعلیہ	مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ	مستعلیہ	مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ	مستعلیہ	مستفلہ	مستفلہ	مستعلیہ	مستعلیہ	مستفلہ	مستفلہ
مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مذلقہ	مذلقہ	مذلقہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ	مصمتہ
ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	·	·	قلقلہ	ساکنہ	قلقلہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ	ساکنہ
·	·	·	·	لین	·	·	غنہ	مکررہ	·	·	·	·	·	·	صفیرہ	صفیرہ	صفیرہ
·	·	·	·	خفیہ	مفخمہ	مفخمہ	راجعہ	منحرفہ	·	·	مفخمہ	·	·	مفخمہ	مفخمہ	·	-
·	·	·	تفشی	-	-	منحرفہ	·	·	·	·	·	·	·	·	·	-	·
·	·	·	·	مدہ	مستطیلہ	·	·	·	·	·	-	·	·	-	·	-	·
۹	۶	۶	۷	۹	۸	۸	۷	۷	۶	۶	۷	۶	۶	۷	۸	۷	۷
·	·	·	·	·	·	·	·	·	·	·	·	·	·	·	·	·	·

شفوی		
و	ف	ب
۲۶	۲۷	۲۸
مجہورہ	مہموسہ	مجہورہ
متوسط	رخوہ	شدیدہ
منفتحہ	منفتحہ	منفتحہ
مستفلہ	مستفلہ	مستفلہ
مصمتہ	مذلقہ	مذلقہ
ساکنہ	ساکنہ	قلقلہ
لین	·	·
خفیہ	·	·
متصلہ	·	·
مدہ	·	·
۱۰	۶	۶
·	·	·

صوتیات میں سانس کی آزادانہ آمدورفت اور اس کی مختلف رکاوٹوں کو بنیاد بنا کر ساری نطقی آوازوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایسی آوازوں کو جو بغیر کسی رکاوٹ یا دخل اندازی کے نکلتی ہیں مصوتے (VOWELS) اور ایسی آوازوں کو جو رکاوٹوں سے متاثر ہو کر خارج ہوتی ہیں مصمتے (CONSONANTS) نام دیا ہے۔ مصوتوں کی درجہ بندی کے لئے زبان کی حالتوں (TONGUE POSITION) اور ہونٹوں کی حالتوں (LIP POSITION) کو بنیاد بنایا ہے لیکن مصمتوں کے معاملے میں ماہرین صوتیات کے پیمانے بھی کم و بیش وہی ہیں جو اہل تجوید کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل تجوید کی طرح ماہرین صوتیات نے بھی دائرۂ نطق اور کیفیت نطق ہی کو بنیاد بنا کر ان کا باہمی فرق واضح کرنے کی کوشش کی ہے، نتیجتاً انکی اس صوتی پیمائش کا حاصل بھی عام حالات میں اہل تجوید کی تفصیلات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ بعض حالات میں یہ خصوصیات اہل تجوید کی بتائی ہوئی خصوصیات سے بدرجہا کم ہیں۔ بہر حال ماہرین صوتیات نے ان مصمتوں کی مختلف خصوصیات کو واضح کرنے کیلئے جو نقشہ بنایا ہے وہ انگریزی کی مناسبت سے کچھ اس طرح ہو گا۔

TABLE OF ENGLISH SOUNDS

		LABIAL		DENTAL	ALVEOLAR	POST ALVEOLAR	PALATO ALVEOLAR	PALATAL	VELAR	GLOTTAL
CONSONANTS	PLOSIVE	p b			t d				k g	
	AFFRICATE					tr dr	tʃ dʒ			
	NASAL	m			n				ŋ	
	LATERAL				l				(l)	
	FRICATIVE	.	f v	θ ð	s z	r	ʃ ʒ			h
	SEMIVOWEL	w						j	w	

		LABIAL	FRONT	CENTRAL	BACK
VOWELS	CLOSE	(u:) (u)	i: i		u: u
	HALF CLOSE	(o)	e	ə:	o
	HALF OPEN	(ɔ:)	ɛ	ə	ɔ:
	OPEN	(ɔ)	æ a	ʌ	ɑ

ف: DANIEL JONES: AN OUTLINE OF ENGLISH PHONETICS. P. XVIII

ان دو مراحل کے بعد تیسرا مرحلہ آتا ہے جو دراصل انہی دو مراحل کا حاصل ہے جس کو وضاحت مزید سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور یہ مرحلہ ہے ہر آواز کی نام بہ نام کیفیت بیان کرنے کا، اہل تجوید نے اس کا بڑا اہتمام کیا ہے اور تقریباً ہر تجوید کی کتاب میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، وہ حرفاً حرفاً ہر آواز کو لیتے ہیں اور اس کی خصوصیت بیان کرتے چلے جاتے ہیں مثلاً :

"مخرج باء کا دونوں ہونٹوں سے اور تری ہونٹ نیچے کے سے"

"مخرج تاء کا سرا زبان کا اور جڑ اوپر کی دونوں دانتوں کے کہ جن کو ثنایا علیا کہتے ہیں ۔"[1]

"مخرج را کا کنارہ سرا زبان کا اور جڑ رباعیہ اور ناب اور ضاحک ہر دو جانب کے سے وغیرہ"

ماہرین صوتیات کے ہاں یہ اہتمام بہت کم ملتا ہے وہ شاید اس اہتمام کو تحصیل حاصل سمجھتے ہیں دانیال جونس نے البتہ اپنی بعض کتابوں میں اس طریقے کو اپنایا ہے چنانچہ اس کی مشہور کتاب (An outline of English phonetics) میں انگریزی زبان کی آوازوں کی تشریح اسی نہج پر نام بہ نام ملتی ہے جو نسبتاً زیادہ مفصل اور واضح ہے اور اس میں ہر آواز کی ادائیگی کے وقت سانس کی آمد و رفت میں پیدا ہونے والی مختلف رکاوٹوں کو بھی بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے ۔

(۴)

اوپر ہم نے تجوید اور صوتیات کے چند عام اصولوں کو لے کر ان کا آپس میں مقابلہ کیا ہے اور احتیاطاً ان اصولوں کے ضمن میں آنے والی ساری اصطلاحات کے، اگر وہ عربی ہیں تو انگریزی اور انگریزی ہیں تو عربی، مترادفات بھی دے دیئے ہیں تاکہ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو ہماری نشاندہی کے بغیر ہی اندازہ ہو جائے کہ ان دونوں علوم میں کس قدر مشابہت اور یکسانی ہے، اس مقابلے کو محض چند عام اصولوں تک محدود رکھنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ جزئیات میں ایک دوسرے اس قدر قریب نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ دونوں کے ماحول، مقاصد اور ضروریات کے مختلف ہونے کی وجہ سے آگے جا کر ان دونوں کے راستے بھی بدل گئے ہیں لیکن اس کے باوجود اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان دونوں کی متعدد جزئی تفصیلات میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی قدر مشترک یا نسبت تضاد ضرور مل جائے گی ۔ چنانچہ اس قسم کی بعض جزئیات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے ۔

---

[1] کریم اللہ خان قاری : وسیلۃ القاری ص ۵ - ۶ ۔

(الف) مصوتے :۔ ہم نے لکھا ہے کہ اہل تجوید نے مصوتوں اور مصمتوں کو ایک ہی صف میں رکھا ہے اور ماہرین صوتیات کی طرح دونوں کے بنیادی فرق کو پیش نظر رکھ کر انہیں الگ الگ کرنے کی کوشش نہیں کی، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اہل تجوید مصوتوں کی مخصوص حالت سے واقف نہ تھے، وہ یقیناً ان کی مخصوص حالت سے واقف تھے اسی وجہ سے انھوں نے الف، واو، ی کو مصمتوں کے ایک صنف میں برقرار رکھنے کے باوجود، ماہرین صوتیات ہی کی طرح خلوے دہن ان کا مخرج قرار دیتے ہوئے انھیں مجہورہ (VOICED) کہا ہے اور ان کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے۔

"خلوے دہن سے الف واو یائے مدہ نکلتے ہیں، ان کے ہوائی ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ جب یہ حروف ساکن ہوں اور حرکت ماقبل اسی جنس کی ہو تو ان کی آواز سوائے دہن سے خارج ہوتی ہے یعنی الف کی ہوا حلق اور دہن سے متعلق ہے اور ی کی ہوا وسط دہن سے علاقہ رکھتی ہے اور واو کی ہوا منہ اور دونوں لبوں سے نکلتی ہے اس لئے یہ حروف ہوائی کہلاتے ہیں" [۱]

علاوہ ازیں اہل تجوید کے ہاں اعراب کے نام سے علامات امتیاز (DIACRITICAL MARKS) کا ایک مستقل نظام موجود ہے جس میں فتحہ، کسرہ اور ضمہ بھی شامل ہیں جو عربی میں مصوتوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں الف واو ی کی حیثیت محض حروف مدہ کی سی ہے جن کو ان مصوتوں کے ساتھ (LENGTH) پیدا کرنے کے لئے ذیلی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

(ب) مصمتے :۔ عربی اصوات اردو اصوات کا بنیادی حصہ ہیں، ان میں سے بعض آوازوں کو ایک دوسرے کی ہو بہو نقل سمجھ کر ان کو فاضل یا غیر ضروری قرار دینے کا رجحان اردو ماہرین لسانیات میں عام ہے، ہو سکتا ہے نظریاتی طور پر اردو کی حد تک یہ درست بھی ہو، ورنہ عربی میں ان کی ایک مستقل حیثیت ہے اور ان کے باہمی فرق کو واضح کرنے کا اہتمام تقریباً ہر تجوید کی کتاب میں ملتا ہے چنانچہ تو اعد التجوید فی ذکر التجوید میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

" قاری کو یعنی پڑھنے والے کو چاہئے کہ درمیان ث اور س اور ص کے اور درمیان ذ اور ز اور ظ اور ض کے اور درمیان ت اور د اور ط کے اور درمیان ح اور ہ کے

---

[۱] حافظ محمد ابراہیم قاری: ولی القاری - ۴۰

کے اور درمیان ع اور ق کے فرق کرے تاکہ مخرج ان کے مل نہ جاویں اور اس طرح پڑھیں کہ سننے والا سمجھ لے۔[1]

اس کے علاوہ دانتوں کی درجہ بندی اور مطبقہ و منفتحہ جیسی اصطلاحیں جو اہل تجوید کے ہاں پائی جاتی ہیں وہ انہی ہم آواز حروف میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔

(ج) ادغام :- اہل تجوید کے ہاں ادغام نام ہے دو مصمتوں کے ملنے اور ہم آواز ہو جانے کا۔ یہ ادغام تین قسم کا ہوتا ہے (۱) ادغام متماثلین (۲) ادغام متجانسین (۳) ادغام متقاربین۔ ادغام متماثلین میں ایک جیسے دو مصمتے اکٹھے ہوتے ہیں جیسے اضرب بعصاک، ربحت تجارتھم، وقد دخلوا وغیرہ، پہلی مثال میں ب اور ب، دوسری مثال میں ت اور ت اور تیسری مثال میں د اور د اکٹھے ہوگئے ہیں، ادغام متجانسین میں دو ہم مخرج مگر مختلف الخصوصیت مصمتے جمع ہو کر ہم آواز بن جاتے ہیں، جیسے قد تبین، اذ ظلموا و قل رب وغیرہ، پہلی مثال میں د کو ت نے، دوسری مثال میں ذ کو ظ نے اور تیسری مثال میں ل کو ر نے اپنا ہمنوا بنالیا ہے۔ ادغام متقاربین میں دو قریب المخرج مصمتے جو خصوصیات میں متحد بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف بھی ساتھ آکر ایک دوسرے کو متاثر کر دیتے ہیں۔ جیسے قد جاءکم، الم نخلقکم، قد سمعنا وغیرہ پہلی مثال میں د کو ج نے دوسری مثال میں ق کو ک نے اور تیسری مثال میں د کو س نے، ساتھ آنے کی وجہ سے صوتاً بھی متاثر کر دیا ہے

تقریباً یہی چیز ہمیں انجذاب Assimilation کے نام صوتیات میں بھی ملتی ہے۔ انجذاب سے مراد کسی آواز کی ایسی تبدیلی ہے جو ساتھ والی آواز سے متاثر ہونے کی وجہ سے واقع ہوئی ہو۔ مثلاً ایک انگریزی لفظ ہے "cupboard" اس لفظ میں [p] اور [b] دو ہم مخرج مگر مختلف الخصوصیت مصمتے ایک ساتھ آگئے ہیں اور عملاً [b] کی آواز نے [p] کی آواز کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب وہ لفظ بولا جائے گا تو ثانی الذکر کی آواز کو اول الذکر کی آواز میں بدل کر cubboard بولا جائے گا۔

(د) معانقہ :- معانقہ عربی میں گلے ملنے کو کہتے ہیں، تجوید میں معانقہ سے مراد بعض الفاظ کی وہ مخصوص حالت ہے جس کی وجہ سے اس کو جملۂ ماقبل سے بھی متعلق کیا جا سکتا ہے اور جملۂ مابعد سے بھی اور دونوں صورتوں میں وہ معناً بھی صحیح ہوگا، مثلاً ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للناس، اس آیت میں لفظ [فیہ] اس موقف میں ہے کہ اس کو ذٰلک الکتاب لا ریب کے ساتھ بھی جوڑا جا سکتا ہے اور ھدی للناس

---

[1] قاری شیخ احمد : قواعد التجوید۔ ص ۲۹

کے ساتھ بھی اس صورت حال سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم علامت [∴] کے ذریعہ یہ ظاہر کریں کہ ہم اس لفظ کو کس کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں فیہ کو ذٰلک الکتاب لا ریب کے ساتھ رکھنا منظور ہے تو اس کو اس طرح ظاہر کرنا ہوگا :

ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ ∴ ھدی اللناس

لیکن اگر اس کے برعکس ھدی اللناس ملانا ہو تو اس کو اس طرح لکھنا ہوگا :

ذٰلک الکتاب لا ریب ∴ فیہ ھدی اللناس

صوتیات میں اس سے ملتا جلتا بھی ایک اصول ہے جس کو اتصال (Juncture) کہتے ہیں۔ اس سے مراد آواز کی وہ عبوری کیفیت ہے جو دو اصوات، دو ارکان، دو الفاظ، دو فقرے یا دو جملوں کو آپس میں ملاتی یا جدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر [جالا] ایک لفظ ہے جو دو ارکان [جا] اور [لا] پر مشتمل ہے۔ اس لفظ کی ادائیگی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک صورت یہ کہ ہم پورا لفظ ان دو ارکان کے بیچ میں توقف کئے بغیر ایک سانس میں بول جائیں، دوسری صورت یہ ہے کہ ہم پہلے رکن [جا] پر تھوڑا توقف کریں اور پھر [لا] بولیں، پہلی صورت میں اس لفظ کے معنی ہوں گے مکڑی کی سفید جھلی وغیرہ اور دوسری صورت میں اس کا مطلب ہوگا جاؤ اور لاؤ، دوسری صورت میں چونکہ ہم نے دو ارکان کو الگ الگ حیثیت دے کر ان میں اتصال پیدا کرنے کی شعوری طور پر کوشش کی ہے۔ اس لئے اس غیر مرئی اتصال کے اظہار کے لئے کسی تحریری علامت کا ہونا ضروری ہے اور صوتیات میں علامت جمع [+] کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے گویا دوسری صورت میں ہم کو وہ لفظ صوتیاتی اصول کے مطابق اس طرح لکھنا ہوگا [جا + لا] اور پہلی صورت میں بغیر علامت کے اس طرح [جالا]. اور یہ چیز تجوید کے مذکورہ بالا اصول معانقہ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

مطالعے سے ان کے علاوہ بھی ایسی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جو تجوید اور صوتیات کے کلی اصولوں کی طرح جزئی باتوں میں بھی قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ تجوید تیرہ سو سال پرانا علم ہے اور صوتیات کی عمر ~~سو~~ سو سال سے زیادہ نہیں، دونوں میں پورے بارہ سو سال کا فاصلہ ہے۔ اس پر بھی اہل مغرب کو ناز ہے کہ صوتیات سر تا سر انھیں کی دین ہے۔

ع　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

— • — - - - -

مترجم۔ ڈاکٹر نعیم احمد
مصنف نا معلوم ۔

لیزارو ڈی ٹارمے

سولہویں صدی کا ایک ہسپانوی ناول

بسلسلہ شمارہ ۲ سنہ ۱۹۷۱ء

تیسرا باب

انجام کار مجھے اپنی نقاہت سے قوت حاصل کرنی پڑی اور رحمدل لوگوں سے مدد لیتا ہوا آہستہ آہستہ اس عظیم الشان شہر ٹولیڈو میں پہنچ گیا۔ یہاں خدا کا شکر ہے کہ دو ہفتے میں میرے زخم بھر گئے۔ جب میں بیمار تھا تو دوسروں کی مدد کا مستحق ہو سکتا تھا، لیکن جب ٹھیک ہو گیا تو ہر ایک کہنے لگا :

' تم ۔ تم تو بدمعاش اور لفنگے معلوم ہوتے ہو ۔ چلو ۔ چلو ۔ نوکری کرو '۔

' میں کسی کی نوکری کرنے کے لئے اسے کہاں تلاش کروں '، میں خاموشی سے جواب دیتا جب تک خدا کوئی ایسی ہستی پیدا نہ کرے کہ جس کی نوکری کی جائے! اسی طرح جیسے اس نے دنیا کو عدم سے پیدا کیا تھا' ؟

جب میں ایک گلی میں ہر دروازے پر صدا لگاتا اور ان میں سے بیشتر کو اپنے لئے بند ہوتا دیکھتا چلا جا رہا تھا، کیونکہ خیرات نہ صرف گھر سے شروع ہوئی تھی بلکہ وہیں مقیم بھی ہو گئی تھی تو اتفاقاً ایک بھلا مانس چہل قدمی کرتا ہوا مل گیا۔ وہ بڑا عمدہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھا، اس کے بال سلیقے سے آراستہ تھے اور وہ اچھا خاصہ خوش حال معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور میں نے اسے دیکھا۔ پھر وہ بولا :

' لڑکے، کیا تم کام کی تلاش میں ہو ؟ '

' جی حضور '۔ میں نے جواب دیا ۔

' ٹھیک ہے تو پھر میرے ساتھ آؤ ' وہ بولا ' خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں مجھ سے ملا دیا۔ تم نے آج بڑے خلوص سے دعا مانگی ہوگی '۔

اس بھلے آدمی نے جو کچھ کہا تھا میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس

بات سے اس کے کپڑوں اور اس کے طرزِ عمل سے میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے کسی ایسے ہی مالک کی ضرورت تھی۔

جب اس تیسرے آقا سے میری ملاقات ہوئی تو صبح کا وقت تھا اور وہ مجھے اپنے ہمراہ شہر بھر میں گھماتا رہا۔ ہم اس منڈی سے گذرے جہاں ڈبل روٹی اور خوراک کا دیگر سامان بکتا ہے۔ میں نے سوچا بلکہ یہ امید باندھی کہ وہ سامان خرید کر مجھ پر لادنا چاہتا تھا۔ آخر یہی تو وقت ہے جب آدمی عموماً دن بھر کی ضرورت کی چیزیں خریدتا ہے۔ شاید اسے یہاں کا سامان پسند نہیں آیا، میں نے خود سے کہا، اور وہ کہیں اور خریداری کرے گا۔

اس طرح ہم گیارہ بجے تک چلتے رہے۔ پھر وہ ایک بڑے کلیسا میں گھسا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا میں اسے نماز اور دوسرے مقدس فرائض میں بڑی عقیدت سے شریک ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ اس وقت تک رکا رہا جب تک کہ ہر کام ختم نہ ہو گیا اور تمام لوگ چلے نہ گئے۔ اس کے بعد ہم وہاں سے باہر نکلے۔

ہم بہت آہستگی سے ایک گلی میں چلنے لگے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ اس نئے آقا نے کھانے کے لئے کچھ خریدنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تو میں بے حد خوش ہوا۔ میں نے سوچا کہ یہ نیا آقا شاید کھانے کا سامان اکٹھا خرید لیتا ہے اور اب کھانا میری پسند بلکہ صحیح بات یہ کہ میری ضرورت کے مطابق تیار ملے گا۔

جب ہم گھر پہنچے تو ایک بج رہا تھا۔ میرا آقا مکان سے باہر رکا تو میں بھی تھم گیا۔ اس نے اپنے بائیں کاندھے سے لبادہ سرکایا اور آستین کی جیب میں سے چابی نکال دروازہ کھولا اور میں اسکے ساتھ اپنے نئے مکان میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی اتنی تاریک تھی کہ کوئی بھی اس میں داخل ہوتے ہوئے ڈر جاتا مگر اندر ایک چھوٹا سا آنگن اور خاصے بڑے کمرے تھے۔

ہم اندر داخل ہو گئے تو اس نے اپنا لبادہ اتارا اور پوچھا کیا میرے ہاتھ صاف ہیں؟ پھر ہم نے اسے جھاڑ کر تہہ کیا۔ اس نے ایک بنچ کی گرد صاف کی اور لبادے کو اس پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے لبادے کے پاس بیٹھ گیا اور مجھ سے میرے شہر اور اس جگہ پہنچنے سے متعلق طویل سوالات پوچھنے لگا۔ میں اسے یہ لمبی کہانی سنانا نہیں چاہتا تھا چونکہ میرے خیال میں تو یہ سوال جواب کا نہیں بلکہ دسترخوان بچھنے اور کھانا نکلنے کا حکم دئے جانے کا وقت تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنی دروغ بیانی کی اعلیٰ ترین استعداد کام میں لا کر اسے خود سے مطمئن کر دیا میں نے اُسے تمام اچھی باتیں بتا دیں مگر ناخوشگوار چیزوں کا تذکرہ نہیں کیا کیونکہ میں انہیں دیوان خانے میں دہرانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

جب یہ سب کچھ ختم ہو گیا تو وہ کچھ دیر کے لئے خاموش بیٹھ گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ دو بجنے والے تھے اور وہ کھاتا اسی طرح کھاتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مردہ۔ پھر مجھے دروازہ مقفل ہونے

اور پورے مکان میں کسی اور کے قیام کا نشان نہ ہونے کا خیال آیا۔ مجھے دیواروں کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا — نہ تو چاکلیٹ گھوٹنے والی چیز نظر آئی، نہ گوشت کوٹنے کی مُگدری اور نہ ہی کوئی بنچ یا میز۔ اس پادری جیسا کوئی صندوق تک نہیں تھا۔ درحقیقت گھر کسی بھوت کی پناہ گاہ معلوم ہوتا تھا۔ جب میں یہ سب حساب لگا رہا تھا تو وہ پوچھنے لگا:

'کیا تم نے کھانا کھا لیا ہے لڑکے؟'

'نہیں جناب، میں نے جواب دیا۔ جب میں حضور سے ملا ہوں تو آٹھ بھی نہیں بجے تھے'۔

متیر۔ اگرچہ اس وقت سویرا تھا مگر میں نے کھانا کھا لیا تھا۔ تمہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے بعد میں نصف شب تک کچھ نہیں کھاتا۔ اب جیسے بھی ہو تمہیں کام چلانا پڑے گا۔ ہم سونے سے پہلے ناشتہ کر لیں گے'۔

حضور ذرا اس کا تصور کیجئے کہ جب میں نے اسے یہ بات کہتے سنا تو میں تقریباً بالکل بے ہوش ہو گیا۔ بھوک کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ سمجھ کر کہ تقدیر نے اپنا خنجر میرے قلب میں پیوست کر دیا ہے۔ میں اپنے تمام گذشتہ دکھوں کو یاد کر کے اور آئندہ کی کٹھن زندگی کا تصور کر کے آنسو بہاتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے اس پادری کو چھوڑ دینے کے امکان پر غور کیا تھا تو میرے ذہن میں کونسی بات آئی تھی۔ میں نے خود کو سمجھایا تھا کہ اگرچہ وہ حرامی بدمعاش خسیس تھا لیکن کہیں کوئی اس سے بھی گیا گذرا پلّے نہ پڑ جائے۔ میں اپنی گذشتہ دردناک زندگی پر اور موت پر جو مجھے سر پر منڈلاتی ہوئی نظر آ رہی تھی، آہ و زاری کرنے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ دل ہی دل میں ہو رہا تھا اور میں جتنا بھی ممکن ہو سکا اپنے جذبات چھپائے رہا۔ میں نے اپنے نئے آقا سے کہا:

'جناب میں ایسا لڑکا ہوں جسے پیٹ کی پرواہ نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اپنے تمام دوستوں اور مالکوں سے چھوٹا پیٹ عطا کیا ہے اور مجھے اب تک جو آقا ملے ہیں انہوں نے مجھے اسی بنا پر بہت پسند کیا ہے'۔

'یہ بڑی خوبی ہے' وہ بولا۔ 'اور میں اس بات کی وجہ سے تمہیں اور اچھا سمجھنے لگا ہوں۔ ٹھونسے جانا تو سور کی فطرت ہوتی ہے، شائستہ لوگ بڑے اعتدال سے کھاتے ہیں'۔

'اور میں تو کہتا ہوں' میں نے خود سے کہا۔ 'یہ تمام اعلیٰ خوبیاں جو میرے مالکوں کو فاقہ کشی میں نظر آتی ہیں، جہنم میں جائیں'۔

میں دروازے میں آ کھڑا ہوا اور اپنی صدری میں سے ڈبل روٹی کے کچھ ٹکڑے نکالے۔ میں نے بھیک میں سے انہیں بچا رکھا تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو بولا:

'اے لڑکے یہاں آؤ۔ تم کیا کھا رہے ہو؟'

میں اس کے قریب گیا اور اسے ڈبل روٹی دکھائی۔ اس نے میرے ہاتھ سے ایک ٹکڑا لے لیا۔ حقیقت میں یہ میرے ہا
کے تینوں ٹکڑوں میں سب سے عمدہ اور سب سے بڑا تھا۔

'میرے خیال میں' وہ بولا 'یہ ڈبل روٹی خاصی اچھی معلوم ہوتی ہے'۔

'ہاں یہ اچھی ہے۔ تو آپ کے خیال میں یہ اچھی ہے؟ کیا آپ یہی کہنا چاہتے ہیں؟'

'ہاں بہت اچھی ہے۔ تم نے یہ کہاں سے لی؟ کیا اسے کسی نے صاف ہاتھوں سے گوندھا ہوگا!

'یہ میں نہیں کہہ سکتا' میں نے جواب دیا 'ہاں اس کا مزہ خراب نہیں ہے'۔

'خیر۔ میرے خیال میں نہیں ہوگا' میرے غریب مالک نے کہا۔

اس نے اسے منہ میں رکھا اور میری طرح بھیڑیے کے انداز میں ٹکڑے نوچنے لگا۔

' خدا کی قسم یہ تو بڑی مزیدار ہے'۔ اس نے کہا

میں نے ہوا کا رخ دیکھا تو جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا کیونکہ میں سمجھ گیا کہ اگر اس نے مجھ سے پہلے یہ ٹکڑا ختم کر لیا تو جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے بھی اڑانے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے ہم دونوں نے کم و بیش ایک ہی وقت کھانا ختم کیا۔ میرا مالک ان بھوروں کو صاف کرنے لگا جو اس کے کپڑوں پر گر گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے بغلی دروازے میں گیا اور ایک جگ اٹھا لایا جس کا کنارہ ٹوٹا ہوا تھا اور جو بہت پرانا معلوم ہوتا تھا۔ خود پی چکنے کے بعد اس نے مجھ سے پینے کو کہا۔ میں اسے اس گمان میں رکھنا چاہتا تھا کہ میں نشہ نہیں کرتا۔ اس لئے جواب میں بولا:

'حضور میں شراب نہیں پیتا!'

'تم اسے پی سکتے ہو' اس نے کہا 'یہ تو پانی ہے۔'

میں نے جگ لے کر تھوڑا پانی پیا —— زیادہ اس لئے نہیں کیونکہ پیاس میرا بنیادی مسئلہ نہیں تھی۔
شام تک ہم نے بس یہی کھایا پیا۔ وہ مجھ سے سوال کرتا رہا اور میں جتنی بھی اچھی طرح ممکن تھا جواب دیتا رہا پھر وہ مجھے اس کمرے میں لے گیا جس میں پانی کا جگ رکھا ہوا تھا اور بولا:

لڑکے، تم بس وہیں کھڑے رہو۔ میں تمہیں بستر بچھانے کا طریقہ سکھاتا ہوں تاکہ آئندہ تم اسی طرح بچھاؤ۔

'میں ایک طرف اور وہ دوسری طرف کھڑا ہو گیا اور ہم نے وہ وبالِ جان بستر بچھا لیا۔ درحقیقت وہاں کچھ تھا ہی نہیں، بس ایک چوکھٹا تھا جو کچھ بنچوں پر بچھا ہوا تھا۔ اور اس پر چادریں پھیلی تھیں۔ وہ عموماً دھلتی نہیں تھیں اس لئے سوزنیاں معلوم نہیں ہوتی تھیں حالانکہ وہ تھیں سوزنیاں ہی۔ ان کا اون اتنا کم ہو گیا تھا کہ کوئی بھی غیرت مند سوزنی یہ بات ہرگز گوارا نہ کرتی۔ ہم نے سوزنی بچھا کر اسے نرم کرنے کیلئے

تھوڑا بہت کوٹا پیٹا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا کیونکہ سوئی کے کان سے ریشمی بٹوا نہیں بنایا جا سکتا لیکن یہ مردود تو اس کے اندر ہی گھسی ہوئی تھی کیونکہ جب ہم نے اسے چوکھٹے پر رکھا تو تمام بچہ نمایاں ہو گئے اور وہ ایک نحیف و نزار سور کا پہلو نظر آنے لگی تھی۔ اس المناک حد تک پتلی سوزنی پر اسی قماش کا کمبل رکھ دیا۔ میں بتا ہی نہیں سکتا کہ اس کا اصلی رنگ کیا رہا ہوگا؟ جب بستر بچھ گیا اور رات ہوگئی تو اس نے مجھ سے کہا:

لیزارو اب رات بہت ہوگئی۔ اور یہاں سے منڈی بہت دور ہے، اس کے علاوہ شہر میں شہدے بہت ہیں۔ کہیں وہ تم پر حملہ نہ کر دیں اور تمہارا لبادہ نہ اتار لیں۔ آج رات ہم بھوک برداشت کر لیں، کل خدا ہمیں رزق مہیا کر دے گا۔ میں تنہا رہتا ہوں۔ اس لئے میں نے کھانے پینے کا سامان بھروایا نہیں۔ درحقیقت کچھ عرصے میں باہر کھاتا کھا رہا ہوں۔ ویسے بے شک اب یہ سب کچھ بدلنا پڑے گا۔

"آپ میری پرواہ نہ کیجئے حضور" میں نے کہا "میں ایک رات بلکہ اگر کوئی صورت نہ بنے تو اس سے بھی زیادہ عرصہ خالی پیٹ سونا جانتا ہوں۔"

"اسی لئے تم ایک طویل اور صحت مند عمر پاؤ گے" وہ بولا "کیونکہ جیسا کہ ہم دن میں گفتگو کر رہے تھے لمبی عمر پانے کا ایک ہی راز ہے اور وہ یہ کہ آدمی کم کھائے۔"

"اگر یہ درست ہے" میں نے خود سے کہا "تو میں تو کبھی مروں گا ہی نہیں کیونکہ میں کبھی اس اصول پر عمل کرنے سے باز نہیں رہ سکا اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی بدقسمتی کے سہارے ہمیشہ اس پر چلتا رہوں گا۔"

وہ اپنی برجس اور صدری کا تکیہ بنا کر سونے لیٹ گیا۔ مجھ سے اس نے پائنتی لیٹنے کو کہا اور میں اسی طرح پڑ گیا لیکن میں کچھ زیادہ سو نہ سکا کیونکہ لکڑی کے تختے اور میری ہڈیاں رات بھر آپس میں دست و گریباں رہیں۔ اس میں کوئی تعجب بھی نہیں کیونکہ یہ تمام مصائب اٹھانے کے بعد میرے جسم پر گوشت کی ایک بوٹی بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس رات میں نے کچھ کھایا نہیں تھا اور بھوک اور نیند کا رشتہ کبھی اچھی طرح نہیں جڑتا۔ میں بار بار خود کو کوستا رہا۔ خدا مجھے معاف کر دے۔ میں تمام رات اپنی بدنصیبی پر غضبناک ہوتا رہا۔ اس سب سے بڑھ کر یہ کہ میں نے کئی مرتبہ خدا سے دعا مانگی کہ وہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے۔ یہ سارے کام میں کروٹ بھی لئے بغیر کرتا رہا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کی نیند نہ کھل جائے۔

صبح ہم اٹھے تو وہ اپنی برجس، صدری، کوٹ اور لبادہ جھاڑنے اور ان کی شکنیں دور کرنے لگا۔ میں خدمتگار کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس نے بہت آہستگی اور بڑی سنجیدگی سے لباس تبدیل کیا۔ میں نے اس کے ہاتھ دھلائے، اس نے کنگھا کیا اور پیٹی میں تلوار لگائی۔ یہ کام کرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا:

"لڑکے تمہیں نہیں معلوم کہ یہ کتنا عمدہ ہتھیار ہے! میں اس کا سونے سے بھی مول نہ کروں۔

ٹولیڈو کے مشہور زمانہ اینٹونیو نے جتنی بھی تلواریں بنائی تھیں انہیں سے کوئی اس سے زیادہ بیک نہیں ہے
اس نے تلوار میان سے نکالی، اسے اپنی انگلی سے جانچا اور دیکھا :
" اسے دیکھتے ہو ؟ میں خیال کرتا ہوں کہ میں اس سے اون کا گولا کاٹ سکتا ہوں "
" میں ایک پورے ڈھیر کو کتر سکتا ہوں، میں نے خود سے کہا، جبکہ میرے دانت لوہے کے بنے ہو نہیں ہیں "

اس نے تلوار دوبارہ نیام میں رکھی اور تسبیح کے بڑے دانوں کا ایک حلقہ پیٹی میں لگایا۔ وہ دروازے سے بڑے باوقار انداز میں بالکل سیدھا ہو کر نکلا۔ اس کی روش اور وضع سے وقار اور شرافت ٹپک رہی تھی اس نے لبادے کا ایک سرا کاندھے پر ڈال کر اسے بغل میں سے نکال لیا اور اپنا دایاں ہاتھ بڑی شان سے کولہے پر رکھ لیا۔

" لیزارو" اس نے جاتے ہوئے کہا " میں عشائے ربانی کی دعا سننے جا رہا ہوں۔ میری غیر حاضری میں گھر کا خیال رکھنا۔ بستر بچھا دینا اور مکان کے پیچھے جو ڈھلوان ہے وہاں دریا بہہ رہا ہے اس سے پانی کا جگ بھر لانا باہر جاؤ تو تالا لگا نا نہ بھولنا۔ میں واپس آؤں تو کوئی چیز غائب نہ ملے۔ چابی دراز میں رکھ دینا تاکہ اگر میں تمہاری غیر موجودگی میں آ جاؤں تو گھر کھول سکوں "

وہ سڑک پر اتنے غرور اور شان سے چلنے لگا کہ اگر کوئی بھی انجان شخص اسے دیکھتا تو اس کو یقین ہو جاتا کہ یہ کاؤنٹ آف آرکوس کا رشتہ دار یا کم از کم اس کا ذاتی خدمتگار ہے۔

خدایا تو حمد و ثنا کے قابل ہے، میں وہاں کھڑا کھڑا بولنے لگا " تو دکھ دیتا ہے تو پھر دوا بھی کرتا ہے۔ میرے مالک سے اگر اس وقت کوئی ملے تو اسے اس قدر خوش دیکھ کر سمجھے گا کہ اس شخص نے رات سونے سے قبل خوب ناشتہ کیا ہو گا " آرام دہ بستر میں سویا ہو گا اور اگرچہ ابھی سویرا ہے مگر یہ ڈٹ کے کھانا کھا چکا ہے۔ اے خدا تو بڑے رازوں کا مالک ہے جو عام آدمی نہیں جانتا۔ کون ایسا ہے جو اس کی وضع داری اس کی بانکی صدری اور لبادے سے فریب نہیں کھا جائے گا اور کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ اس شریف آدمی نے کل تمام دن ایک لقمہ بھی کھائے بغیر کاٹا تھا اور اگر کچھ کھایا بھی تو روٹی کا وہ ٹکڑا جو اس کا نوکر لیزارو ڈیڑھ دن تک اپنی قمیص میں رکھے رہا تھا جہاں وہ صاف نہ رہ گیا ہو گا۔ اور صبح ہاتھ دھونے کے بعد تولیہ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنی قمیص کے دامن سے پونچھا تھا ؟

کوئی خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا۔ دنیا میں جا بجا ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے مضحکہ خیز و تاریکی وجہ سے وہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں جو کبھی اور شخص کی وجہ سے ہرگز نہیں کریں گے ؟

میں اسی طرح دروازے پر کھڑا اپنے آقا کو دیکھتا رہا اور یہ باتیں سوچتا رہا، یہاں تک کہ وہ لمبی تنگ گلی کو پار کر کے باہر نکل گیا پھر میں گھر میں واپس آیا اور اوپر سے نیچے تک پورے گھر کا رکھے بغیر یا کوئی بکنے کے قابل چیز دیکھے بغیر لمحے بھر میں چکر لگا ڈالا۔ میں نے وہ پھٹا ہوا بستر بچھایا اور جگ بھرنے کے لئے دریا کی طرف چلا جہاں میرا مالک میدان میں دو نقاب ڈالی ہوئی عورتوں سے بڑے جوش و خروش سے باتیں کر رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس پیشے سے تعلق رکھتی جس کی وہاں کمی نہیں تھی۔ درحقیقت ایسی بہت سی عورتوں کی عادت ہے کہ وہ صبح سویرے دریا کے کنارے پہنچ کر وہاں دل بہلاتی ہیں اور کھانے پینے کا سامان بہم پہنچائے بغیر پیش از وقت دوپہر کا کھانا کھا لیتی ہیں۔ دریا کے کنارے ٹہلتی رہتی ہے اور انہیں بھروسہ ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی انہیں کھانا کھلا ہی دے گا کیونکہ شہر کے سربرآوردہ شرفاء اس رواج سے بخوبی واقف ہیں۔

بہر حال جیسا کہ میں نے ابھی کہا وہ ایک سچے عاشق مزاج لڑکے کی سی اداکاری کر رہا تھا اور اور وہ سے بہتر جھپک رہا تھا۔ انہوں نے اسے عاشق مزاج دیکھا تو بڑی ڈھٹائی سے عام شرائط کے مطابق کھانے کا مطالبہ کر بیٹھیں۔ اس کا بٹوہ اتنا ہی خالی تھا جتنا کہ اس کا دل خواہشات سے لبریز تھا اسلئے اس کا سانس اوپر نیچے ہونے لگا اور اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ وہ ہکلانے اور وضع وضع کے بہانے تراشنے لگا۔ وہ دونوں بڑی تجربکار تھیں اسلئے حقیقت کی تہہ تک پہنچ گئیں اور اسے چھوڑ کر چلتی بنیں

میں نے باسی شلجم کے کچھ ٹھنڈے کھائے کیونکہ اس کے سوا کچھ مل ہی نہ سکا پھر بڑی فرض شناسی سے جیسا کہ ایک نئے نوکر کو کرنا چاہیئے، گھر لوٹا تاکہ صفائی کروں۔ اس کی ضرورت بھی تھی مگر جھاڑو ہی نہ مل سکی۔ میں یہ سوچتا رہا کہ آخر کروں تو کیا کروں ؟ میں نے طے کیا کہ دوپہر تک راہ دیکھوں کہ اس کے لوٹنے اور اور کھانے کے لئے کچھ لانے کا امکان ہے یا نہیں۔ لیکن میں فضول انتظار کرتا رہا۔

جب دو بج گئے مگر وہ واپس نہ آیا اور میں بھوک سے بیتاب ہو گیا تو دروازہ مقفل کر کے چابی اس کی بتائی ہوئی جگہ رکھ، اپنی ضرورت پوری کرنے نکلا۔ میں بڑی مدھم اور کمزور آواز میں، سینے پر ہاتھ باندھے اس انداز میں تکتا ہوا جیسے میری نظریں خدا پر لگی ہوئی ہوں اور اس کا نام میرے ہونٹوں سے کبھی جدا نہ ہوتا ہو، ان دروازوں پر بھیک مانگنے لگا جن سے شان امارت ٹپک رہی تھی۔ مجھے یہ خوبی اپنی ماں سے دودھ میں ملی تھی میرا مطلب ہے کہ میں نے اسے اس اندھے سے سیکھا تھا — اور اس فن میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ چار بجے سے بھی قبل چار ڈبل روٹیاں تو میرے جسم میں غرق ہو چکی تھیں اور دو سے زیادہ میری آستینوں اور قمیص میں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ کارنامہ میں نے اس مفلسی کے زمانے میں اور ایسے شہر میں

انجام دیا تھا جہاں لوگ زیادہ خیر خیرات نہیں کرتے ! میں گھر کی طرف پلٹا تو راستے میں اوجھڑی دکھائی نظر آئی۔ میں نے ایک عورت کے آگے دستِ سوال دراز کیا تو اس نے گائے کا ایک پایہ اور اوجھڑی کے کچھ ٹکڑے مجھے دے دیئے۔

گھر پہنچا تو مالک پہلے ہی سے موجود تھا ـــــ اس کا لبادہ نفاست سے طے کیا ہوا بنچ پر رکھا تھا آنگن میں ٹہل رہا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ سیدھا میرے پاس آیا۔ میں نے سوچا کہ یہ دیر میں آنے کی وجہ سے گھر سے باہر کرنے والا ہے لیکن خدا نے مجھے اس سے بھی سخت سزا دی۔ اس نے پوچھا کہ میں کہاں گیا تھا ؟ میں نے جواب دیا :

حضور میں یہاں دو بجے تک ٹھہرا رہا اور جب مجھے اندازہ ہوا کہ آپ ابھی واپس تشریف نہیں لائیں گے تو میں لوگوں سے ملاقات کرنے کے لئے شہر چلا گیا۔ انہوں نے مجھے یہ چیزیں دی ہیں

میں نے اسے ڈبل روٹی اور اوجھڑی دکھائی جو میں نے اپنے کوٹ کے استر میں چھپا رکھی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اس میں جان سی پڑ گئی اور کہنے لگا :

'خیر، میں نے تو کھانے کے لئے تمہارا انتظار کیا اور جب تم نہیں آئے تو اکیلے ہی کھا لیا۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ تم نے بڑے اچھے کردار کا مظاہرہ کیا ہے کیونکہ بہر صورت مانگنا چرانے سے بہتر ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا جس طرح مناسب سمجھے گا تمہارے ذریعے میری مدد کرے گا۔ لیکن تمہیں ایک بات یاد رکھنا چاہئے اور وہ یہ کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ تم میرے ساتھ رہتے ہو ـــــ یہ میرے وقار کا سوال ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا اور میرے خیال میں کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کیونکہ اس شہر میں مجھے مشکل ہی سے کوئی جانتا ہے۔ اے کاش میں یہاں کبھی نہ آیا ہوتا !'

'حضور آپ اس کی فکر نہ کیجئے' میں بولا 'اگر کسی نے مجھ سے میرا اتا پتہ پوچھا تو میں اس پر لعنت بھیجوں گا اور آپ کے بارے میں ہرگز ایک لفظ نہیں کہوں گا'

'پھر ٹھیک ہے۔ اے مصیبت کے مارے اب کھانا کھا لو۔ اے خدا تیرا شکر ہے کہ اس طرح ہم بہت جلد مصیبت سے نجات پا جائیں گے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں جب سے آیا ہوں میرا کوئی کام ٹھیک نہیں ہوا۔ اس گھر پر ضرور خدا کا قہر ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ بعض گھر منحوس ہوتے ہیں اور جو شخص ان میں رہے وہ نحوست میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ گھر بھی ایسا ہی ہے۔ میں ایک اور بات تمہیں بتاتا ہوں ـــــ جب یہ مہینہ ختم ہو جائے گا تو میں یہاں نہیں رکوں گا خواہ یہ گھر مجھے کرائے کے بغیر ہی کیوں نہ ملے'

میں بنچ کے سرے پر ٹک گیا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے لالچی سمجھے اس لئے میں نے اسے یہ نہیں

بتایا کہ مجھے جو بھیک ملی تھی اس کا کافی حصہ پہلے ہی کھا چکا ہوں۔ میں ڈبل روٹی کے لقمے اوجھڑی کے ٹکڑے سے لگا کر کھانے لگا اور اس بیچارے کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ وہ میرے کوٹ کے استر سے جیسے میں طشتری کی جگہ استعمال کر رہا تھا، نظریں نہ ہٹا سکا مجھے یقین ہے کہ خدا مجھ پر اسی طرح ترس کھاتا ہے جس طرح مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ میں اس کا درد محسوس کر رہا تھا ——— آخر میں نے اکثر یہ اذیت اٹھائی تھی اور اکثر بعد میں بھی اٹھاتا رہا ہوں۔ میں حیران تھا کہ کیا میں اتنا گر سکتا ہوں کہ اسے شرکت کی دعوت دیدوں۔ چونکہ اس نے کہا تھا کہ وہ کھانا کھا چکا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ وہ میری دعوت نامنظور کر دے گا مختصر یہ کہ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ بے چارہ بدنصیب میری بھیک سے اپنی بھوک مٹالے۔ میری خواہش تھی کہ وہ کل کی طرح کھانے لگے۔ آخر کھانا آج کل سے بہتر تھا اور میں خود کچھ زیادہ بھوکا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے خدا نے میری اور اس کی تمنا پوری کر دی کیونکہ جب میں نے کھانا شروع کیا اور وہ اِدھر اُدھر چکر لگانے لگا تو اچانک میرے پاس آکر بولا :

لیزار و کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کھاتے دیکھ کر کیسی سچی خوشی ہوتی ہے۔ اگر کوئی تمہیں کھاتے دیکھے تو وہ بھوک محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا خواہ وہ درحقیقت بھوکا نہ ہو۔

" تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے" میں نے خود سے کہا " تم فاقے سے ہو۔"

اس کے باوجود میں نے سوچا کہ مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے۔ وہ میری مدد کر رہا تھا اور مجھے خود کو مدعو کرنے کا طریقہ بتا رہا تھا۔ میں نے کہا :

" حضور ایک کہاوت ہے کہ اچھے اوزار کاریگر کو اچھا بنا دیتے ہیں۔ یہ ڈبل روٹی بڑے مزے کی ہے اور گائے کا پایہ بہت اچھی طرح اور بڑا لذیذ پکا ہوا ہے۔ اس کی مہک سے کسی بھی شخص کے منہ میں پانی آجائے گا۔"

" گائے کا پایہ، کیا واقعی ؟"

" جی حضور ۔"

" تمہیں معلوم ہے کہ میری رائے میں یہ دنیا کی لذیذ ترین شے ہے ۔ میں ہر حالت میں اسے تیتر کے گوشت پر ترجیح دوں گا۔"

" تو حضور ایک ٹکڑا کھا لیجئے۔ دیکھئے یہ کتنا عمدہ ہے۔"

میں نے گائے کا پایہ اور سفید ترین ڈبل روٹی کے تین چار ٹکڑے اس کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا اور اس طرح کھانے لگا جیسے وہ واقعی ہر چھوٹی سے چھوٹی ہڈی کتے کی طرح بھنبھوڑنا چاہتا ہو

'یہ عمدہ کھانا تو' وہ بولا 'لہسن کی چٹنی سے تیار کیا گیا ہے'!
'خود تم میں گوشت سے زیادہ چٹنی ہے'! میں نے دل ہی دل میں کہا۔
اس نے پانی کا جگ مانگا اور جب میں وہ اٹھا کر لایا تو وہ آتنا ہی بھرا ہوا تھا جتنا میں دریا سے!
اس سے مجھے صاف معلوم ہو گیا کہ اس دن اس نے کچھ زیادہ نہیں کھایا تھا۔ ہم پانی پی کر خوش خوش ہو چلے گئے۔

میں قصے کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا اس لئے آپ سے محض یہ عرض کرتا ہوں کہ ہم تقریباً دس دن تک اسی طرح گذر بسر کرتے رہے۔ وہ چھوٹا طمع باز اسی طرح ہر صبح طمطراق سے سڑک پر نکل جاتا اور بیچارہ لیزارو اس کی خاطر غیر دلچسپ کام انجام دیتا۔ میں اکثر اپنی زندگی پر غور کرتا۔ میں دو ظالم مالکوں سے کسی بہتر آقا کی تلاش میں بچ کر بھاگا تھا مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ میں ایک ایسے کے پاس پہنچ گیا جو نہ صرف مجھے کھلاتا بلکہ مجھے خود کو اور اسے دونوں کو کھلانا پڑتا!

اس کے باوجود میں اسے کافی پسند کرتا تھا کیونکہ وہ تہی دست تھا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ اکثر میں خود نہ کھاتا اور یہ کوشش کرتا کہ اس کا پیٹ بھر جائے۔ ایک دن صبح کو وہ شب خوابی کی قمیض پہنے پہنے فراغت پانے کے لئے مکان کی چھت پر گیا میں نے یہ تحقیق کرنے کیلئے کہ کیا واقعی وہ اتنا ہی تہی دست ہے جتنا نظر آتا ہے' اس کی صدری اور برجس ٹٹولی جو تہہ کی ہوئی سرہانے رکھی تھی تو ایک صاف مخمل کا شکن در شکن بٹوہ نظر آیا۔ اس میں کوڑی تک نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ایسے آثار نظر آئے جن سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس میں کافی عرصے سے پیسے نہیں ڈالے گئے۔

'یہ آدمی میں نے سوچا' مفلس ہے اور کوئی شخص وہ چیز نہیں دے سکتا جو خود اس کے پاس نہ ہو۔ لیکن وہ خسیس اندھا اور وہ شیطان پادری جنہیں خدا نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ ایک کو اس کی تیز زبانی تو دوسرے کو اس کے کام کی وجہ سے ——— مجھے بھوکا مارے ڈال رہے تھے۔ اس لئے میں انہیں چھوڑنے میں اسی طرح حق بجانب تھا جس طرح اس شخص پر ترس کھانے میں'۔

خدا گواہ ہے کہ میں اب جب کبھی کسی ایسے شریف زادے سے ملتا ہوں جو اس طرح چل رہا ہو جیسے اس جگہ کا مالک ہو تو مجھے اس پر ترس آتا ہے اور حیران ہوتا ہوں کہ کیا یہ بھی میرے آقا کی سی اذیتیں اٹھا رہا ہے۔ اگرچہ وہ مفلس تھا مگر مجھے متذکرہ بالا سبب کی بنا پر اس کی خدمت میں مزا آتا تھا مجھے اس سے ایک شکایت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے اونچے مقام سے ذرا زمین پر آ جاتا اور حقیقتوں کا کچھ تو سامنا کرتا۔ اس کے باوجود جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ہر قسم کے لوگوں کا ایک پرانا اصول ہے جسے یہ پوری طرح نبھاتے ہیں۔ خواہ ان کی جیب میں ایک پیسہ نہ ہو مگر وہ

ظاہری آن بان قائم رکھتے ہیں ۔ اس سلسلے میں کوئی کچھ نہیں کرسکتا ۔ وہ مرنے تک یہی انداز قائم رکھتے ہیں ۔

ہاں تو یہ معاملہ تھا اور اس طرح میری زندگی کٹ رہی تھی کہ بالفعل نے جو کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی اس با مشقت اور شرمناک زندگی کا خاتمہ کردیا ۔ اس کا ماجرا یہ ہے کہ اس سال فصل خراب ہوئی تھی ۔ اس لئے شہر کی انتظامیہ مجلس نے یہ طے کیا کہ وہ تمام مفلس جو اس مقام کے باشندے نہیں ہیں ۔ یہاں سے چلے جائیں ۔ شہر کے ڈھنڈورچی نے اعلان کیا کہ اگر کوئی بھی غیر مقامی آدمی پایا گیا تو اسے کوڑے لگائے جائیں گے ۔ اس قانون پر عمل بھی ہوا اور چار دن کے بعد میں نے بے بس دکھیاروں کی ایک بھیڑ کو مرکزی گلیوں میں کوڑے لگتے دیکھے ۔ اس سے میں اتنا ڈرا کہ مجھے مانگنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ۔

اگر آپ میں تھوڑی سی بھی قوت متخیلہ ہے تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ہم پر کیا گذری ہوگی ، ہماری حالت کتنی ناگفتہ بہ تھی اور ہمارے منہ کس قدر سی دئے گئے تھے بعض مرتبہ ہمیں دو دو یا تین تین دن تک کچھ کھانے کو نہ ملتا اور ہمارے منہ سے کوئی آواز نہ نکلتی ۔ مجھے وہ عورتیں کھلا پلا دیتی تھیں جو اپنے گھروں میں سوت کاتتی تھیں ۔ وہ ہیٹ بناتی تھیں اور ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں ۔ میں ان سے بخوبی واقف تھا ۔ وہ اپنے حقیر روزینے میں مجھے شریک کرلیتی تھیں اور اس طرح میں نے جسم اور جان کا رشتہ باقی رکھا ۔

میں اپنے لئے اتنا پریشان نہیں تھا جتنا کہ اپنے دکھیا عیار آقا کے لئے غمزدہ تھا جس نے پورے ہفتے میں ڈبل روٹی کے ایک ٹکڑے کے بقدر بھی خوراک نہیں کھائی تھی ۔ کم از کم اس کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی ۔ مجھے اس کا ہلکا سا شائبہ تک نہیں کہ وہ کیا کرتا تھا ، کہاں جاتا تھا اور اگر وہ کچھ کھاتا تھا تو کیا کھاتا تھا ۔ اس کا دوپہر کے کھانے کے وقت سر کو اکڑائے ہوئے چلنا بھی دیکھنے کا منظر ہوتا تھا ۔ وہ اتنا دبلا پتلا تھا کہ عمدہ نسل کا تازی کتا معلوم ہوتا تھا ! اپنے مضحکہ خیز وقار کی تسکین کے لئے وہ خلال اٹھاتا (گھر میں یہ بھی کافی تعداد میں نہیں تھیں) اور دروازے میں جاکر اپنے دانتوں میں کرنے لگتا جن میں کچھ بھی اٹکا ہوا نہیں ہوتا تھا ۔ وہ اب بھی اپنے مکان کا شکوہ کرتا رہتا :

'یہ بات بالکل واضح بات ہے کہ اس مکان کو کسی کی بددعا لگی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہم سب پر مصیبت نازل ہو رہی تھی ۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ کتنا تاریک اور شکستہ ہے ۔ ہم جب تک یہاں رہیں گے ہمیں تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی میں صرف مہینہ ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں تاکہ اسے چھوڑ دوں :'

جب ہم صحیح معنوں میں فاقے کر رہے تھے تو قسمت کے کسی عجوبے کے نتیجے میں میرے مالک کو ایک ریال مل گیا ۔ وہ اسے گھر لے آیا اور اتنے فخر سے مجھے دکھانے لگا جیسے وہ جمہوریہ وینس کا افسانوی خزانہ ہو ۔ اس نے بڑے زوروں میں مسکراتے ہوئے وہ ریال مجھے دیا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا :

"آؤ لیزار و، یہ لو، آخر خدا ہم پر مہربان ہو رہا ہے۔ منڈی سے ڈبل روٹی، کچھ شراب اور گوشت خرید لاؤ! ہم شیطان کے منہ پر تھوک دیں گے! میں تمہیں ایک بات اور بتاتا ہوں جس سے تم خوش ہو جاؤ۔ میں نے ایک اور مکان کرائے پر لے لیا ہے اور اس مہینے کے بعد ہمیں اس رذیل جگہ نہیں رہنا پڑے گا۔ اس جگہ سے اور اس کے بنوانے والے سے نفرت ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں میری تقدیر بگڑ گئی ہے۔ خدا کی قسم جب سے میں اس گھر میں آیا ہوں مجھے شراب کا ایک گلاس یا گوشت کا ایک ٹکڑا یا دو سکون کچھ میسر نہیں آیا اور پھر یہ جگہ کتنی شکستہ، تاریک، افسردہ کرنے والی اور سونی ہے! جاؤ اور دیکھو لگانا۔ آج کی رات ہم بادشاہوں کی طرح کھائیں گے۔"

میں نے ریال اور جگ لیا اور منڈی کی طرف لپکا۔ میں سچ مچ بہت خوش تھا۔ لیکن اس کا عاقبت کیا ہے؟ میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اگر مجھے خوشی نصیب بھی ہو تو تکلیف اس کی سواری میں آئے۔ اس وقت ایسا ہی ہوا۔

میں گلی میں یہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ ریال کس طرح خرچ کیا جائے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ چیزیں خریدی جا سکیں اور ساتھ ہی خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اپنے کرم بے پایاں سے مجھے ایسا مالک عطا کیا ہے جس کے پاس روپیہ ہے۔ عین اس وقت جبکہ مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ اچانک ایک مردہ میرے سامنے آ گیا جسے بہت سے پادری اور دوسرے اشخاص تختے پر لئے جا رہے تھے۔ میں دیوار میں دبک گیا تاکہ وہ لوگ گذر جائیں۔ جوں ہی وہ جنازہ گذر گیا تو جلو میں ایک عورت نظر آئی جو یقیناً اس مردے کی بیوی رہی ہو گی۔ اس کے ساتھ اور بہت سی عورتیں بھی تھیں اور وہ چیخ چلا رہی تھی:

"اے میرے پیارے خوبرو، یہ لوگ تمہیں کہاں لئے جا رہے ہیں؟ اس افسردہ اور منحوس جگہ، اس سونی اور تاریک رہائش گاہ میں، اس مملکت میں جہاں نہ کھانا ہوتا ہے نہ پینا!"

یہ سنتے ہی میں غش کھا گیا اور میرے منہ سے نکلا:

"آہ اے یسوع مسیح، یہ لوگ اس لاش کو میرے گھر لئے جا رہے ہیں!"

میں منڈی جانا چھوڑ، اس جلوس میں سے گذر کر پوری تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچ کر دھڑ سے دروازہ بند کیا اور مالک سے التجا کرنے لگا کہ وہ مجھے بچانے اور دروازے کی حفاظت کرے۔ میں دہشت کے مارے اس سے چمٹ گیا۔

اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں اتنا غل کیوں مچا رہا ہوں۔ اس نے پوچھا:

"لڑکے تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم کیوں چلا رہے ہو؟ تم نے دروازہ اتنے زور سے کیوں بھیڑا ہے؟

'حضور' میں نے ہانپتے ہوئے کہا 'میری مدد کیجئے۔ لوگ ایک مردے کو یہاں لا رہے ہیں۔'
'تم کہہ کیا رہے ہو؟'
'میں نے اسے گلی میں دیکھا ہے۔ اس کی بیوی چلا چلا کر کہہ رہی ہے: "اے میرے پیارے شوہر یہ لوگ تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ اس اندھیرے اور افسردہ گھر میں، اس ناامیدی کے غمناک ٹھکانے میں، اس مکان میں جہاں نہ کوئی کھاتا ہے نہ پیتا ہے!" وہ اسے سیدھے یہیں لا رہے ہیں، حضور۔'
میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اگرچہ ہنسنے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی لیکن میرے مالک نے جونہی میری بات سنی تو اسے ہنسی کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ کافی دیر تک بول نہ سکا۔ اتنی دیر میں میں تڑا لگا کر میں دروازے سے لگ گیا تھا تاکہ وہ اور محفوظ ہو جائے۔ لوگ جنازہ لیکر وہاں سے گذر بھی گئے مگر میں ڈرتا ہی رہا کہ وہ اسے یہیں لائیں گے۔ جب میرا مالک ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا اور اسے بھوک کا خیال آیا تو بولا:-
'سچ تو یہ ہے لیزارو کہ اس بیوہ کی فریاد سنکر تم نے ٹھیک ہی خیال کیا۔ لیکن بہر حال معاملہ اتنا خراب نہیں ہوا ہے، اب دروازہ کھولو اور کچھ کھانے کو لاؤ۔'
'حضور' میں گھگھیایا 'انہیں گلی سے باہر نکل جانے دیجئے۔'
آخر مالک دروازے تک آیا اور اس نے مجھے دھکیل کر دروازہ کھولا۔ اسے مجھے دھکیلنا یوں پڑا کہ میں ابھی تک خوف سے بے حواس تھا۔ میں کھانا لانے گیا۔ ہم نے اس دن خوب کھایا لیکن مجھے کچھ مزہ نہ آیا اور میں تین دن تک اپنے ہوش و حواس میں نہ آیا۔ جب کبھی میرے مالک کو میرے اس تصور کا دھیان آتا تو وہ بے تحاشہ قہقہے لگانے لگتا۔
چند روز تک مزید میں اپنے اس بیچارے تیسرے مالک کے ساتھ رہا۔ جتنے عرصے میں اس کے ساتھ رہا یہ جاننے کے لئے مرا جا رہا تھا کہ وہ اس علاقے میں کیوں آیا اور یہاں کر کیا رہا تھا کیونکہ اس سے ملتے ہی مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس جگہ کا باشندہ نہیں ہے۔ وہ کسی سے واقف نہیں تھا اور شہر میں کسی سے اس کی دوستی نہیں تھی۔ آخر میرا تجسس دور ہو گیا اور جو کچھ میں جاننا چاہتا تھا وہ مجھے معلوم ہو گیا۔
ایک دن جب ہم ڈٹ کے کھا چکے تھے اور وہ بڑا خوش تھا تو اس نے مجھ سے اپنے معاملات کا ذکر کیا۔ وہ پرانے قلعے سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اپنا گھر محض اس لئے چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ اپنے ایک اعلیٰ خاندان کے پڑوسی کو سلام کرنا نہیں چاہتا تھا۔
'لیکن حضور' میں نے کہا 'اگر وہ ویسا ہی تھا جیسا کہ آپ نے بتایا اور آپ سے برتر تھا تو کیا سلام میں

پہل نہ کرنے میں آپ کی غلطی نہیں تھی ؟ پھر یہ کہ آپ کے بقول وہ سلام کا جواب بھی دیتا تھا؛'

'ہاں وہ اعلیٰ خاندان کا تھا اور اس کا سماجی درجہ مجھ سے بلند تھا اور وہ میرے سلام کا جواب بھی دیتا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے سلام کرنے میں اتنی بار پہل کی تھی کہ اگر وہ صرف ایک ہی مرتبہ پہل کر لیتا یہ کچھ ایسی بری بات نہ ہوتی۔'

'میں تو اس کی پرواہ نہ کرتا اور خاص طور پر اپنے سے اعلیٰ درجے کے لوگوں سے تو قطعاً یہ امید نہ کرتا۔'

'تم بچے ہو' اس نے جواب دیا 'اور ابھی وقار کا مسئلہ نہیں سمجھتے۔ شرفا کے پاس اب یہی باقی رہ گیا ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں اور تم خود بھی اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں اب محض ایک دیہاتی تو ہو کر رہ گیا ہوں۔ لیکن خدا کی قسم اگر اب بھی مجھے راستے میں کوئی نواب مل جائے اور وہ تعظیماً اپنا ہیٹ اور وہ بھی قاعدہ سے اتار کر مجھے سلام نہ کرے تو اگلی مرتبہ میں اسے دیکھ کر کسی مکان میں گھس جاؤں گا اور یہ ظاہر کرنے لگوں گا کہ گویا وہاں مجھے کوئی کام ہے یا پھر اگر کوئی دوسری سڑک ہوئی تو راستہ بدل دوں گا۔ مجھے خواہ کچھ بھی کرنا پڑے مگر میں اپنا ہیٹ نہیں اتاروں گا۔ کوئی بھی شریف آدمی خدا اور بادشاہ کے علاوہ کسی دوسرے کا ممنونِ کرم نہیں ہوا کرتا اور کسی بھی شریف آدمی کے لئے اپنی آن بان قربان کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں گھر میں ایک بڑھئی پر بگڑ گیا تھا کیونکہ وہ جب بھی مجھے ملتا حضور اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے کہتا۔ میں نے اس سے کہا تھا 'نکمے دہقان تو ''حضور اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے'' جو کہتا ہے تو کیا مجھے کوئی معمولی آدمی سمجھتا ہے؟' اس کے بعد وہ مجھ سے سلیقے سے بات کرتا اور جس طرح اسے ہیٹ اتارنا چاہیئے تھا، اسی طرح اتارا کرتا۔'

'لیکن کیا ایک شخص کا کسی دوسرے کو ''اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے'' کہکر استقبال کرنا صحیح نہیں ہوتا ؟' میں نے پوچھا۔

'تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہے' وہ بولا۔ یہ بات عام آدمی سے کہی جاتی ہے۔ لیکن میرے جیسے اعلیٰ درجے کے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ''میں حضور کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں'' یا اگر مخاطب کرنے والا خود بھی اعلیٰ درجہ کا مالک ہے تو کم از کم یہ کہ ''میں جناب کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں'' اسی لئے میں اس دہقان کی بات گوارہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جو ہمیشہ مجھ پر خدا کی رحمت نازل کیا کرتا تھا اور میں یہ بات قطعاً برداشت کر ہی نہیں سکتا خواہ کہنے والا بادشاہ یا کسی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا انسان کیوں نہ ہو۔ ذرا کوئی ''اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے'' کہکر دیکھے تو میں اسے کیسا مزہ چکھاتا ہوں۔'

'اللہ خیر۔' میں نے کہا۔ 'اسی لئے تو خدا آپ کی خبر نہیں لیتا کیونکہ آپ چاہتے ہی نہیں کہ کوئی اس سے آپ کی مدد کی درخواست کرے۔!'

'کچھ بھی ہو' اس نے پھر بولنا شروع کیا میں اتنا مفلس نہیں کہ میرے شہر میں میرے تھوڑے بہت مکانات نہ ہوں۔ وہ ڈھے گئے ہیں اور ان کی حالت بہت ہی خستہ ہو گئی ہے۔ لیکن اگر وہ اس حال میں نہ ہوتے تو پھر ان کی مالیت دو لاکھ مراودی سے بھی زیادہ ہوتی۔ وہ میری جائے پیدائش سے بیس فرسخ کے فاصلے پر 'لاڈ ولڈ' کے صدر بازار میں ہیں۔ انہیں دوبارہ تعمیر کر دیا جائے تو بڑی عالیشان معلوم ہوں گے میرا ایک کبوتر خانہ بھی ہے جس کی حالت تباہ نہ ہوتی تو وہ مجھے دو سو کبوتر سالانہ پیدا کر کے دیتا۔ میرے پاس اور بہت سی چیزیں ہیں جنکا میں تذکرہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے ان سب کو اسلئے چھوڑ دیا کیونکہ میرے وقار کا مسئلہ تھا۔ میں اس شہر میں اس لئے آیا تھا کہ یہاں مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائیگی لیکن بدقسمتی سے اتنا اچھا نتیجہ نہیں نکلا جتنی کہ مجھے امید تھی۔ مجھے بہت سے پادری اور کلیسائی عہدے دار مل جاتے ہیں لیکن یہ لوگ دماغ کے بڑے ہی ٹھس ہوتے ہیں اور کوئی بھی شخص انہیں اپنے طور طریقے بدلنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اکثر مجھ سے چھوٹے درجے کے امراء کا دست راست بننے کی درخواست کی جاتی ہے۔ لیکن ان کے ساتھ کام کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ پھر آپ انسان نہیں رہتے بلکہ ان کے استعمال کی چیز بنجاتے ہیں۔ اگر آپ ان کے اشارے پر نہ چلیں تو آپ کی "چھٹی" کر دی جاتی ہے۔ اکثر تو آپ کی تنخواہ خطرے میں رہتی ہے۔ بدترین بات یہ ہوتی ہے کہ آپ کو تنخواہ فراموش کر کے پیٹ بھرنے کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ جب کبھی وہ اپنے ضمیر کی آواز سے مجبور ہو جاتے ہیں اور آپ نے ان کی جو خدمت کی ہے اسکا صلہ دینا چاہتے ہیں تو پسینہ میں تر صدری یا پھٹی ہوئی جیکٹ یا لبادہ، پرانے کپڑوں کی کوٹھڑی سے نکال کر دیدیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو کسی خطاب یافتہ امیر کے یہاں ملازمت مل جائے تو بھی آپ کو بھکی کے پالوں میں پسنا پڑتا ہے۔ کیا میں تمہارے خیال میں ان میں سے کسی کی خدمت اور تشفی نہیں کر سکتا تھا؟ خدا کی قسم اگر ایسا کوئی شخص مجھے مل جائے تو میں اس کے لئے ناگزیر بن جاؤں اور اسے اپنے تمام راز مجھے بتانے پڑیں۔ میں کسی بھی آدمی کی طرح اس سے جھوٹ بولتا رہوں گا اور ہمہ وقت اس کی خوشامد میں لگا رہوں گا۔ میں اس کے لطیفوں اور اس کی پیاری عادتوں پر ہنستا رہوں گا۔ خواہ ان میں کوئی خاص بات نہ ہو۔ میں کبھی کوئی ایسی بات نہ کہوں گا جس سے اس کی طبیعت منغض ہو، خواہ اس میں اس کا فائدہ ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ میں اس کے بارے میں کچھ کہوں گا یا اس کا کوئی کام کروں گا تو دونوں صورتوں میں بڑی گرمجوشی کا اظہار کروں گا۔ میں صرف اسی وقت کام میں جان تک دینے پر آمادہ رہوں گا جبکہ اس کی نظریں مجھ پر ہوں اور نوکروں کو بھی جب ہی بلاؤں

دوں گا تاکہ وہ یہ سمجھے کہ مجھے اس کے آرام کا بہت خیال ہے ۔ اگر وہ کسی ذکر سے بحث کرے تو میں بڑی ہوشیاری سے کوئی ایسا معاندانہ جملہ کہدوں گا جس سے وہ بدمزہ ہو جائے اور اس ذکر پر میری قابلیت کا رعب پڑے ۔ اگر اسے پسند ہوا تو میں بڑے خوشگوار انداز میں گفتگو کیا کروں گا اور دوسرے لوگوں کے بارے میں معلومات فراہم کروں گا ۔ میں اسے ان تمام باتوں کا مفصل بیان دیا کروں گا اور ان کے علاوہ آج کل امراء کے گھروں میں جو تمام طرفہ باتیں ہوتی ہیں وہ بھی بتایا کروں گا ۔ امیروں کو یہ باتیں پسند ہوتی ہیں اور وہ اپنے گھروں میں ایماندار آدمی رکھنا نہیں چاہتے ۔ درحقیقت وہ انہیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے اور احمق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ دنیادار نہیں ہیں اور کوئی امیر ان کی مصاحبت سے دل نہیں بہلا سکتا تو جیسا کہ میں تمہیں بتا رہا ہوں آج کل ہوشیار آدمی اپنے مالکوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور اگر مجھے کوئی ایسا مل جائے تو میں بھی یہی کروں ۔ مگر یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے کوئی ملتا نہیں ۔

غرض میرا مالک زندگی کا شکوہ کرتا رہا کیونکہ وہ کبھی اسے سازگار نہیں آئی اور مجھے بتاتا رہا کہ وہ کتنا آدمی ہے ۔ میری داستان یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک دن آدمی اور ایک بوڑھی عورت مکان میں داخل ہوئے ۔ آدمی نے مکان کا اور اس عورت نے بستر کا کرایہ مانگا ۔ ان دونوں نے دو دو مہینے کی رقم کا حساب لگایا جو اتنی بنتی تھی کہ وہ سال بھر میں بھی نہیں کماتا تھا ۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی بارہ تیرہ ریال کا معاملہ تھا ۔ اس نے انہیں بڑا اچھا جواب دیا ۔ وہ کہنے لگا کہ میں ابھی ڈبلون بھنانے منڈی جانے والا ہوں اور اگر وہ شام کو آئیں تو کوئی زحمت تو نہیں ہوگی ؟ لیکن وہ وہاں سے کھسک گیا ۔ جب وہ دوبارہ آئے تو وقت نکل چکا تھا ۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ ابھی واپس نہیں لوٹا ۔ رات کو بھی وہ نہیں آیا اور مجھے اکیلے گھر میں ڈر لگنے لگا تو میں نے پڑوس میں جاکر ساری بات بتائی اور رات بھر وہیں رہا ۔ اگلے دن قرضخواہ پھر آئے اور انہوں نے ہمارے گھر پر کھڑے ہوکر اسے آواز دی ۔ پڑوسی عورتوں نے کہا :

' دیکھو یہ اس کا ملازم اور یہ دروازے کی چابی ہے '

انہوں نے مجھ سے اس کا پتہ پوچھا تو میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم اور وہ جب سے ڈبلون بھنانے گیا ہے اس وقت سے نہیں لوٹا ۔ میں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ وہ ہم سب کو چل دیکر ریزگاری لے بھاگا ہے ۔ یہ سنتے ہی وہ جھٹ سے سپاہی اور منشی کو بلانے چلے گئے ۔ انہوں نے آتے ہی چابی لی ، مجھے بلایا ، گواہ لئے اور دروازہ کھولا ۔ تاکہ اپنے قرض ادا ہونے تک میرے مالک کا سامان ضبط کریں ۔ انہوں نے گھر کا چکر لگایا تو وہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں خالی ڈھنڈار پڑا تھا ۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا :

' تمہارے مالک کا تمام سامان کہاں ہے ؟ اس کے صندوق ، دیوار کے پردے اور میز کرسیاں

کہاں ہیں ؟'

'مجھے بالکل خبر نہیں' میں نے جواب دیا ۔

'اس کا اس کے سوا کوئی اور جواز نہیں ہو سکتا' انہوں نے کہا 'کہ کل رات یہ لوگ اسے سمیٹ کر کہیں اور لے گئے ہوں ۔ سپاہی اس لڑکے کو گرفتار کر لو ۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا مالک کہاں ہے ۔'

سپاہی نے آگے بڑھ کر میری صدری کا کالر پکڑ لیا ۔

'لڑکے' وہ بولا ' اگر تم نے اپنے مالک کے چھپے ہوئے سامان کا پتہ نہ دیا تو تمہیں پکڑ لیا جائے گا'

میں اس سے پہلے کبھی ایسی گڑبڑ میں نہ پھنسا تھا ۔ انہیں کوئی شک نہیں کہ کئی مرتبہ میرا کالر پکڑا جا چکا تھا ۔ لیکن اسے نرمی سے پکڑا گیا تھا تاکہ میں ایک نابینا کو راستہ دکھا سکوں ۔ اس مرتبہ میں بہت ڈرا اور آہ و زاری کرنے لگا ۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ جو کچھ پوچھیں گے ، بتا دوں گا ۔

'ٹھیک ہے' انہوں نے کہا 'تمہیں جو کچھ معلوم ہے ہمیں بتا دو اور دیکھو ڈرو مت ۔'

منشی بنچ پر فہرست بنانے بیٹھ گیا اور مجھ سے میرے مالک کی چیزیں معلوم کرنے لگا ۔

'جناب' میں نے کہا 'میرے مالک کے پاس جیسا کہ اس نے مجھ سے تذکرہ کیا تھا ، ایک پورے محلے کے مکانات اور ایک ٹوٹا پھوٹا کبوتر خانہ ہے ۔'

'بہت خوب' وہ بولے 'اس کی مالیت کتنی بھی کم کیوں نہ ہو ، اس سے ہمارا قرض تو ادا ہو ہی سکتا ہے ۔ مگر وہ شہر میں ہیں کس جگہ ؟'

'وہاں جہاں سے وہ آیا تھا' میں نے جواب دیا ۔

'واللہ یہ تو بڑی نرالی بات ہے اور وہ آیا کہاں سے تھا ؟'

'اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پرانے قلعے سے آیا تھا' میں نے جواب دیا ۔

سپاہی اور منشی بڑے زور سے ہنسے اور کہنے لگے :

'ہاں تمہاری رقم وصول کرنے کے لئے یہ اطلاع کافی ہے ۔ یہ خیال رہے کہ کچھ زیادہ بات معلوم ہو جائے تو ہم اس کا پتہ لگا سکتے ہیں ۔'

میری پڑوسنیں وہیں موجود تھیں انہوں نے کہا :

'دیکھئے' یہ لڑکا بالکل معصوم ہے ۔ یہ اس آدمی کے ساتھ چند ہی دن سے ہے اور اس کے بارے میں آپ صاحبان سے زیادہ نہیں جانتا ۔ درحقیقت یہ غریب تو کھانا مانگنے بھی ہمارے گھر آتا ہے اور ہم جو کچھ ہو سکتا ہے اسے دے دیتے ہیں ۔ یہ تو رات کو اس مکان میں سونے جایا کرتا تھا ۔ بس [illegible]

منشی نے اس آدمی اور عورت سے اپنا معاوضہ طلب کیا تو اس پر بڑی بحث اور رنڈا جھگڑا ہوا۔
دعویٰ یہ تھا کہ انہیں کوئی معاوضہ نہیں دینا کیونکہ ادائیگی کے لیے کوئی چیز ملی ہی نہیں تھی اور منبطی کا کاغذ
بھی تیار نہیں ہوا تھا۔ دوسرے فریق کا دعویٰ یہ تھا کہ انھوں نے اس کی خاطر ایک اور اہم معاملہ چھوڑ
تھا۔ آخر جب وہ خوب چیخ پکار مچا چکے تو ایک چیتھڑے لگے ہڈیوں کے مجسمے نے اس بوڑھی عورت کا بستر
اٹھالیا۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کچھ زیادہ بوجھ نہیں تھا۔ وہ لوگ خوب غل مچاتے ہوئے
چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اس گندے پرانے بستر سے ان کے سب قرضے ادا ہو گئے ہوں گے اور یہ ہوا
ٹھیک ہی۔ جب اس بستر کو اس کی سابقہ خدمات کے صلے میں آرام ملنا چاہئے تھا۔ اس بیچارے کو دوبارہ
کام میں لگا دیا گیا

اس طرح مجھے میرے تیسرے مالک نے چھوڑ دیا۔ اب مجھے اپنے المناک مقدر کا یقین ہو گیا اور مجھے
تجربہ ہو گیا کہ ہر چیز میری مخالف ہے۔ میری تمام محنت زیر و زبر ہو گئی کیونکہ عام طور پر مالک کو نوکر چھوڑا کرتے ہیں
لیکن میرے ساتھ معاملہ اس کے برخلاف ہوا ...... اس نے مجھے چھوڑ دیا بلکہ درحقیقت میرے ساتھ دغا کی،

چوتھا باب

مجھے چوتھا مالک ڈھونڈنا پڑا اور وہ آرڈر آف مرسی کا ایک راہب نکلا۔ جن عورتوں کا میں ذکر
کر چکا ہوں انہوں نے ہی میری اس سے سفارش کی تھی کیونکہ وہ ان کا کوئی رشتہ دار تھا۔ اسے نہ تو سماع کی محفلوں
میں گانے سے دلچسپی تھی اور نہ ہی وہ خانقاہ میں کھانا کھاتا۔ اسے باہر نکلنے، دنیاوی معاملات میں حصہ لینے اور لوگوں
سے ملنے کا شوق تھا۔ میرے خیال میں وہ اکیلا جتنے جوتے پھاڑ ڈالتا تھا اتنے اس کے فرقے کے سب لوگ
مل کر بھی نہ پھاڑتے ہوں گے۔ اس نے مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ جوتے پہننے کے لئے دئے۔ مگر وہ ایک ہفتے
بھی نہ چلے اور میں ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اس کو اس وجہ سے اور دو ایک دیگر
باتوں کی بنا پر چھوڑ دیا جن کا بیان کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔

پانچواں باب

مجھے جس پانچویں مالک سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ پاپائے روم کے معافی نامے فروخت کیا کرتا تھا۔ میں نے
اپنی تمام زندگی میں اس سے بڑھ کر منافق یا بے حیا نہیں دیکھا۔ وہ جتنا کچھ فروخت کرتا تھا اتنا نہ تو میں نے کبھی دیکھا،
نہ تصور کیا اور نہ ہی دوبارہ کبھی دیکھنے کی امید ہے۔ اس نے فروخت کے فن کا مطالعہ کیا تھا اور کچھ بہت ہی

کاریگر چالیں جانتا تھا۔

جب کبھی وہ کسی ایسی جگہ پہنچتا جہاں اسے معافی نامے فروخت کرتے ہوتے تو وہ سب سے پہلا کام یہ کرتا کہ پادریوں اور دوسرے اہل کلیسا کو چند معمولی تحفے دیتا۔ ان کی قیمت کچھ زیادہ نہیں ہوتی تھی: ایک manianna سلاد، اگر ان کی فصل ہوتی، کچھ نیبو یا سنترے، کچھ خوب بڑے آڑو یا پھر ہر ایک کو ایک بڑی سی ناشپاتی۔ اس طرح وہ انہیں اپنا دوست بنا لیتا تاکہ وہ اس کے کاروبار میں مدد کریں اور اپنے کلیسائی حلقے کے لوگوں کو معافی نامے خریدنے کے لئے طلب کریں۔

جب وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو اسے ان کی تعلیم کا اندازہ ہو جاتا۔ اگر وہ لاطینی جانتے ہوتے تو وہ اس زبان کا ایک لفظ نہ بولتا۔ (CASTILIAN) کاسٹیلین استعمال کرتا جو بڑی عمدہ اور شستہ تھی اور بڑی روانی سے بولتا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اہل کلیسا بس قابل احترام ہیں اور تعلیم کے بجائے پیسے کی وجہ سے انہیں باقاعدہ نصاب پڑھائے بغیر نامزد کر دیا گیا ہے تو ایسا گمان ہوتا جیسے وہ سینٹ ٹامس ایکوئنس ہے۔ وہ دو گھنٹے لاطینی میں بولتا رہتا انہیں کوئی شک نہیں کہ یہ لاطینی نہیں ہوتی تھی مگر معلوم وہی ہوتی تھی۔

اگر وہ راست بازی سے معافی نامے فروخت کر رہا ہوتا اور لوگ نہ خریدتے تو پھر وہ دغابازی سے کام لیتا۔ وہ سب لوگوں کو پریشان کر دیتا یا پھر بڑی استادانہ چالیں چلتا۔ میں نے اسے جو حرکتیں کرتے دیکھا تھا ان سب کے تذکرے میں تو بڑا عرصہ لگے گا اس لئے میں آپ کو ایک بہت ہی مزاحیہ واقعہ سناتا ہوں جس سے آپ کو اس کی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

ایکبار وہ ٹولیڈو کے قریب ایک گاؤں میں دو یا تین دن سے وعظ کہہ رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اپنی سی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن ایک بھی معافی نامہ نہیں بکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بھی آدمی کا ایک بھی معافی نامہ خریدنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اگلے دن اپنا مال بیچنے کی کوشش میں پورے گاؤں کو طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس رات کو کھانے کے بعد وہ اور سپاہی دونوں جوا کھیلنے لگے۔ وہ کھیل میں جھگڑ پڑے اور ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے۔ اس نے سپاہی کو چور کہا تو سپاہی نے اسے جعل ساز قرار دیا۔ اس الزام پر میرے مالک نے وہ چھوٹا نیزہ اٹھا لیا جو سرائے کی دہلیز میں پڑا ہوا تھا۔ سپاہی نے تلوار پر ہاتھ ڈالا جو اس کی پیٹی میں لگی ہوئی تھی۔ ہم سب پورے زور سے چیخنے چلانے لگے تو تمام مسافر وہاں آ گئے اور انہوں نے ان دونوں کو علیحدہ کیا۔ دونوں حریف غصے میں تھے اور بچانے والوں کے ہاتھوں سے نکلنے کے لئے زور لگا رہے تھے تاکہ ایک دوسرے کو قتل کر ڈالیں۔ لیکن جوں جوں غل زیادہ ہوتا گیا اور

لوگ آتے گئے جلد ہی پورا مکان بھر گیا۔ سپاہی اور گناہ بخشنے والے نے جو یہ دیکھا کہ اب وہ ایک دوسرے ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو مغلظات بک کر اپنی تسلی کرنے لگے۔ سپاہی نے میرے مالک سے جو باتیں کہیں ان میں یہ بھی شامل تھی کہ وہ جعل ساز ہے اور اس کے معافی نامے اصلی نہیں ہیں

آخر شہر والوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ لڑائی ختم نہیں کرا سکتے تو انہوں نے سپاہی کو سرائے سے لے جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے مالک کو غصے میں پیچ و تاب کھانے کے لئے وہاں چھوڑ دیا گیا۔ جب مسافر اور ہمسایوں نے اس سے غصہ تھوک دینے اور سو جانے کی درخواست کی تب آخر وہ لیٹنے کیلئے گیا اس کے بعد ہم سب اندر داخل ہوئے۔

صبح کو میرا مالک گرجا گھر گیا اور گھنٹی بجانے والے سے نماز اور وعظ کے لئے گھنٹی بجانے کو کہا۔ سارا گاؤں پلٹ گیا۔ سب ہی بڑبڑا رہے تھے کہ معافی نامے جعلی ہیں اور سپاہی نے غصہ میں بے اختیاری خود یہ بات کہی تھی۔ گویا یہ لوگ جن کا معافی نامے لینے کا پہلے ہی ارادہ نہیں تھا اب تو انہیں نہ لینے کا تہیہ کر بیٹھے

وہ گناہ بخشنے والا منبر پر چڑھا اور وعظ کہنے لگا۔ اس نے لوگوں پر زور دیا کہ وہ خود کو اس عظیم منافع اور فوائد سے محروم نہ کریں جو انہیں متبرک معافی ناموں سے ہو سکتے ہیں۔ جب وہ زور خطابت کے منتہی پر تھا تو سپاہی گرجا گھر میں داخل ہوا۔ اس نے نماز پڑھی، اٹھا اور واضح مگر احتیاط آمیز دھیمی آواز میں کہنے لگا:

خواتین و حضرات، براہِ مہربانی ایک منٹ کے لئے میری بات سن لیجئے، اس کے بعد آپ جسے سنیں۔ میں اس ٹھگ کے ساتھ جو آپ کے سامنے وعظ کہہ رہا ہے یہاں آیا تھا۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس کے کاروبار میں مدد کروں تو وہ مجھے منافع میں سے حصہ دے گا لیکن اب مجھے اس نقصان کا اندازہ ہو رہا ہے جو اس سے میرے ضمیر اور آپ کی جیبوں کو ہو گا۔ میں نے جو کیا اس پر میں نادم ہوں اور آپ سے برملا کہتا ہوں کہ یہ شخص جو معافی نامے بیچنے کی کوشش کر رہا ہے وہ جعلی ہیں۔ اس کا یقین نہ کیجئے اور معافی نامے قبول نہ کیجئے۔ میری انہیں براہ راست یا بالواسطہ کوئی شرکت نہیں ہے۔ اسی جگہ اور اسی وقت میں اپنے عہدے کے عصا سے دست بردار ہوتا ہوں اور اسے زمین پر پٹخ کر توڑے ڈالتا ہوں۔ اگر اسے کسی وقت دھوکہ دہی کے الزام میں سزا ہو تو آپ گواہ رہئے گا کہ میں نہ تو اس کے ساتھ ہوں اور نہ ہی اس کی کوئی مدد کر رہا ہوں۔ اس کے برخلاف میں تو اس گناہ گار کے اصلی چہرے سے نقاب ہٹا رہا ہوں

اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کچھ محب وطن اشخاص نے جو وہاں موجود تھے یہ کوشش کی کہ قومی رسوائی سے بچنے کے لئے اٹھ کر وہ اس سپاہی کو گرجا گھر سے باہر پھینک دیں مگر میرے مالک نے انہیں روکا اور حاضرین کو حکم دیا کہ کوئی اسے نہ روکے بلکہ جو کچھ وہ چاہے اسے کہنے دیا جائے اور اگر کسی نے بھی حکم عدولی کی تو اسے کلیسائی حقوق سے محروم کر دیا جائے گا۔ وہ خود بھی کچھ نہ بولا جبکہ سپاہی جیسا کہ میں نے عرض کیا سب کچھ کہتا رہا۔

جب وہ رک گیا تو میرے مالک نے اس سے درخواست کی کہ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو تو براے مہربانی وہ بھی کہہ لیجئے ۔ سپاہی بولا :

تمہاری دروغ بیانی کے متعلق میں اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن فی الحال اتنا ہی کافی ہے !

اس پر وہ گناہ بخشنے والا منبر پر گھٹنوں کے بل جھک گیا ، دونوں ہاتھ باندھے اور آسمان کی طرف منہ اٹھاکر کہنے لگا :

" اے خدا ، تو جس سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے بلکہ جس پر سب کچھ ظاہر ہے ، جس کے لئے کچھ ناممکن نہیں بلکہ سب کچھ ممکن ہے تجھے حقیقت کا علم ہے اور تو اس بات سے واقف ہے کہ مجھ پر کتنا غلط الزام لگایا جا رہا ہے ۔ جہاں تک میرا اپنا معاملہ ہے میں اسے اسی طرح معاف کرتا ہوں جس طرح میرے پروردگار تو مجھے معاف کرتا ہے ۔ اسے سزا مت دے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے ۔ اور کیا کر رہا ہے ۔ لیکن اس نے تیری جو خطا کی ہے میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں ، التجا کرتا ہوں کہ اسے انصاف کی خاطر فراموش نہ کر ۔ شاید کوئی ایسا شخص یہاں ہو جس نے اتفاق سے معافی نامے لینا چاہتا ہو لیکن اس نے اس کی جھوٹی بات کا یقین کر لیا ہو اور اب وہ انہیں نہ لے ۔ چونکہ اس میں میرے ساتھی کا نقصان ہے اس لئے اے پروردگار میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو درگذر نہ کر بلکہ اسی جگہ اور اسی وقت اس طرح کرامت دکھا دے کہ ———— اگر اس کی بات سچی ہے اور میں فریب اور دروغ ساتھ لایا ہوں تو یہ منبر مجھ سمیت زمین میں چالیس فٹ اس طرح دھنس جائے کہ پھر کبھی یہ یا میں دکھائی نہ دوں ۔ لیکن اگر میں سچ بول رہا ہوں اور اس پر شیطان غالب آگیا ہے تاکہ وہ یہاں کے باشندوں کو ان کے نیک اجر سے محروم کر دے تو پھر اسے سزا دی جائے تاکہ ہر شخص کو اس کی بدی کا اندازہ ہو جائے ۔"

میرے پارسا مالک نے اپنی دعا ابھی بمشکل ہی ختم کی ہوگی کہ وہ گناہ گار سپاہی ایسے زوردار دھما کے سے گر پڑا کہ پورا گرجا گھر لرز اٹھا ۔ وہ واویلا کرنے لگا ، اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور اس کے چہرے پر بھیانک تشنجی کیفیت طاری ہوگئی ۔ وہ ہاتھ پیر چلانے اور ادھر ادھر لڑھکنیاں کھانے لگا ۔ لوگ اتنے زور سے چیخنے چلانے لگے کہ کسی کو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ۔ بعض کے چہرے خوف سے سفید پڑ گئے تھے کچھ لوگ دعا مانگ رہے تھے " اللہ اس پر فضل کر ! " ایسے لوگ بھی تھے جن کی رائے یہ تھی :

" اس کی سزا یہی ہے : کس طرح سے جھوٹا حلف اٹھا رہا تھا ۔"

آخر چند لوگوں نے جو میرے خیال میں خوب ڈرے ہوئے بھی تھے ، اس کے پاس پہنچکر اس کے ہاتھ پکڑ لئے کیونکہ جو بھی اس کے بالکل نزدیک جاتا تھا وہ اسے گھونسہ رسید کر دیتا تھا ۔ بعض نے بڑی سختی سے اس کی ٹانگیں

پکڑ لیں کیونکہ وہ کسی سرکش خچر سے بھی زیادہ زور سے لاتیں مار رہا تھا۔ وہ اسی طرح اسے کافی دیر تک مضبوطی سے پکڑے رہے ۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسے پندرہ آدمی سنبھالے ہوئے تھے لیکن اگر بھی دھیان بٹتا تو منہ پر ایک زور کی لات پڑتی ۔

اس عرصہ میں میرا مالک منبر پر دوزانو رہا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے اور اس کی نظریں آسما جمی ہوئی تھیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح مقدس جوہر میں حلول کر گئی ہے ۔ گرجا گھر کے تما شور غل سے اس کے مقدس مراقبے میں کوئی خلل نہ آئے ۔

کچھ نیک آدمی اس کے قریب گئے ، انہوں نے چلا کر اسے خبردار کیا اور اس کی منت کرتے ۔ کہ وہ اس بے بس آدمی کو، جو تکلیف سے مرا جا رہا تھا مدد کرے ۔ انہوں نے اس سے التجا کی کہ جو کچھ ہو چکا ہے اسے فراموش کر دے کیونکہ سپاہی نے جو تہمت لگائی تھی اسے اسکی اچھی سزا مل گئی ۔

لیکن کیا وہ خدا کے نام پر اسے اس اذیت اور یقینی موت سے نہیں بچا سکتا ؟

بات واضح ہو گئی تھی کہ سپاہی گناہگار ہے اور وہ سچا اور نیک ہے کیونکہ جوں ہی اس نے درخواست کی خد نے اپنا قہر نازل کر دیا۔

خوشگوار اونگھ سے بیدار ہونے والے کسی شخص کے انداز میں میرے مالک نے ان آدمیوں اس معصیت کار اور اردگرد کھڑے تمام لوگوں پر نظر ڈالی اور بڑے پرسکون انداز میں بولا :

" نیک انسانوں تمہیں مجھ سے ایک ایسے شخص کی سفارش کے واسطے نہیں کہنا چاہئے جو مشیت ایزدی منظر ہے۔ لیکن جیسا کہ اس کا فرمان ہے کہ ہم بدی کے بدلے بھلائی کریں اور طمانچے کے لئے دوسرا گال بھی پیش کر دیں۔ اس لئے ہم بڑے اعتماد سے اس سے التجا کر سکتے ہیں کہ وہ خود بھی اپنے اس فرمان پر عمل کرے مرا۔ اے اللہ اس شخص کو معاف کر دے ۔ جس نے دین متین کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر کے تجھے ناراض کیا ہے ۔ آیئے ہم سب دوزانو ہو کر دعا مانگیں "

وہ منبر سے اتر آیا اور سب حاضرین سے کہنے لگا کہ وہ مالک حقیقی سے بڑے خلوص دل سے دعا مانگیں کہ وہ اس گناہگار کو بخشش دے اور اسے دوبارہ ذہنی و جسمانی صحت عطا کر دے اور اگر اس نے سپاہی کے گناہ کی وجہ سے وہ فتنہ اس کے جسم میں داخل کیا ہے تو پھر اسے باہر نکال بھی ڈالے ۔ سب لوگ دوزانو ہو گئے اور وہ اور پادری قربان گاہ کے سامنے کھڑے ہو کر دعائے مغفرت پڑھنے لگے ۔ پھر وہ صلیب اور مقدس پانی لیکر آیا اور اس نے سپاہی کے قریب جا کر دعا پڑھنی شروع کی۔ میرے مالک نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ، اپنی آنکھیں اتنی دور گڑو دیں کہ ان کی سپیدی کے سوا کچھ اور نظر نہ آ رہا تھا اور ایک دعا پڑھنی شروع کی جو جتنی

ملی تھی اتنی ہی عقیدت سے بھرپور بھی تھی۔ اس نے لوگوں کو اس طرح رلادیا جس طرح عید الفصح کے تہوار پر خصوصی وعظ رلادیتے ہیں۔ اس نے خدائے تعالیٰ سے تو گنہگار کی موت نہیں بلکہ اس کی زندگی اور ندامت چاہتا ہے۔ یہ التجا کی کہ وہ اس بے بس کو معاف کر دے جسے شیطان نے بہکا کر گناہ میں پھنسا لیا تھا۔ وہ خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتا رہا کہ وہ اس کو زندگی اور صحت عطا کر دے تاکہ وہ ندامت کا اظہار اور اپنے گناہوں کا اقرار کر سکے۔

اس کے بعد اس نے معافی نامہ منگوایا اور اسے سپاہی کے سر پر رکھ دیا۔ آہستہ آہستہ اس گناہگار کو ہوش آنے لگا۔ جب وہ بالکل ٹھیک ہوگیا تو گناہ بخشنے والے کے قدموں پر گر کر معافی کی التجا کرنے اور اس بات کا اعتراف کرنے لگا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ خود شیطان کے حکم کی تعمیل میں کہا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ اس سے اپنا بدلہ لینا چاہتا تھا اور دوسری اس سے بھی اہم وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو معافی ناموں سے جو زبردست فائدہ پہنچ رہا تھا اس کا شیطان کو سخت صدمہ تھا۔ میرے مالک نے اسے معاف کر دیا اور ان میں دوبارہ دوستی ہوگئی اور معافی ناموں کی تو اتنی طلب ہوئی کہ اس گاؤں میں کوئی ایسا آدمی نہیں بچا جس نے انہیں خریدا نہ ہو ——— شوہر اور بیوی، لڑکے اور لڑکیاں، نوجوان مرد اور عورت سب ہی ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

اس واقعے کی خبر ارد گرد کے دیہات میں پھیل گئی چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے تو نہ تو وعظ کہنے کی ضرورت پڑی اور نہ ہی گرجا گھر جانا پڑا۔ لوگ معافی نامے لینے کے لئے سرائے میں ہی پہنچ گئے۔ آپ سوچیں گے کہ ہم بغیر کچھ لئے کچھ دیے رہے تھے۔ غرض جن دس گیارہ مقامات پر میرا مالک پہنچا وہاں اس نے ایک بھی وعظ کہے بغیر دس گیارہ ہزار معافی نامے فروخت کر ڈالے۔

جب وہ اپنا عمل کر رہا تھا تو مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ میں اسی طرح ڈر گیا تھا جس طرح کوئی بھی شخص خوفزدہ ہو جائے گا۔ لیکن میں نے جب بعد میں اپنے مالک اور سپاہی کو بے تحاشہ ہنستے دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ تو اس چالاک اور عیار گناہ بخشنے والے کا بنایا ہوا منصوبہ تھا۔

ایک اور شہر میں جسے الجھن سے بچانے کے لئے میں اس کا نام نہیں لوں گا ایک دوسرا واقعہ ہوا۔ میرے مالک نے دو تین وعظ کہے مگر پھر بھی معافی نامہ نہ بکا۔ اس نے حالات کا اندازہ لگایا اور اگرچہ اس نے عیاری سے یہ بھی کہا کہ معافی نامے ایک سال تک کارگر رہیں گے مگر کوئی ایک بھی خریدنے پر راضی نہ ہوا۔ دوسرے لفظوں میں وہ لوگ ٹھیلے تھے اور وہ اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ اس لئے اس نے گھنٹیاں بجوائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس نے منبر پر سے الوداعی خطبہ دیا۔ جب وہ منبر سے اترنے ہی والا تھا تو اس نے مجھے اور منشی کو بلایا۔ میں کچھ بھاری تھیلے لئے ہوئے تھا۔ ہم نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اور گناہ بخشنے والے نے منشی سے معافی نامے لے لئے۔ پھر وہ منبر پر واپس گیا اور خوب مسکراتے ہوئے اس مجمع میں بیک وقت

دس دس بیس بیس معافی نامے کھنکنے اور چلانے لگا :

برادرانِ عزیز ، لو یہ خدا کا فضل و کرم لو جو وہ تمہارے اپنے گھروں پر تمہارے لئے نازل کر رہا ہے۔ جشن مناؤ کیونکہ مسلمانوں سے عیسائیوں کو چھڑانا مقدس کام ہے۔ وہ ہمارے مقدس مذہب سے نہ پھر جائیں اور جہنم کے شعلوں کی نذر نہ ہو جائیں اس لئے کم از کم پانچ "پیٹر نوسٹر" اور پانچ "آوے میریا" انہیں قید سے چھڑانے میں مدد دو۔ معافی نامے تمہارے والدین ، بھائیوں ، بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں کے بھی کام آئیں گے خواہ وہ اعراف میں ہی کیوں نہ ہوں ، یہ سب پاپائے اعظم کا نوشتہ ہے !

لوگوں نے جواسے معافی نامے اس طرح لٹاتے دیکھا جس طرح کوئی چیز مفت میں دی جاتی ہے جیسے کہ خدا اپنے ہاتھ سے لٹاتا ہے تو وہ انگلیوں پر حساب لگا لگا کر دودھ پیتے بچوں ، تمام مردہ رشتے داروں اور چھوٹے بچوں سے لیکر ادنیٰ سے ادنیٰ ملازموں تک کے لئے جھپٹنے لگے۔ بھیڑ اتنی ہو گئی کہ انھوں نے میرا خراب خستہ کوٹ بھی میرے جسم پر سے نوچ لیا۔ میں حضور والا سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک گھنٹے سے کچھ ہی زائد عرصے میں میرے تھیلے میں ایک بھی معافی نامہ نہ بچا اور مجھے مزید معافی نامے لانے کے لئے اس سرائے واپس جانا پڑا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

جب سب لوگوں نے معافی نامے لے لئے تو میرے مالک نے منبر پر سے اپنے منشی اور قصبہ کے منشی سے کہا کہ وہ اٹھ کر ان لوگوں کے نام درج کر لیں جو ان مقدس معافی ناموں سے فائدہ اٹھاتے ہیں تاکہ جب اس سے حساب مانگا جائے تو وہ ٹھیک حساب دے سکے۔ اس پر ہر آدمی بڑا فہرست وار یہ بتانے لگا کہ اس نے اپنے بچوں ، نوکروں اور مردہ عزیزوں کے لئے کتنے معافی نامے لئے ہیں۔ جب فہرست مکمل ہو گئی تو اس نے صدر بلدیہ سے درخواست کی کہ وہ براہِ مہربانی منشی کے کھاتے اور فروخت شدہ معافی ناموں کی تعداد کی تصدیق کر دیں کیونکہ اسے اب کہیں اور جانا ہے۔ اس کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوا تو اس کے چہرے پر تبسم کھل رہا تھا۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس سے نائب پادری اور بلدیہ کے اراکین تک نے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا معافی نامے ان بچوں کے لئے بھی کار آمد ہیں جو ابھی پیٹ میں ہیں۔ گناہ بخشنے والے نے جواب دیا کہ اس نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان کے مطابق ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ انہیں یہ سوال فقیہوں سے پوچھنا چاہئے جو اس سے زیادہ عالم ہیں مگر اس کی اپنی رائے یہی ہے۔

ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو حالات کے اس طرح رخ بدل لینے پر ہر شخص خوش تھا۔ میرے مالک نے منشی اور سپاہی سے کہا :

ہاں تو تمہارا ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ یہ دہقان سمجھتے ہیں کہ انہیں صرف اتنا کہنا ہے کہ: ایک عیسائی ہیں" اور وہ اچھے اعمال کئے بغیر اور کوئی بھی قیمت ادا کئے بغیر جنت میں چلے جائیں گے۔ میں تمہیں بات بتاتا ہوں ؛ ان لوگوں کو الجزائر سے کم از کم دس عیسائیوں کے چھڑانے کا زرِ فدیہ ادا کرنے پڑیگا !

اس کے بعد ہم ٹولیڈو کے جنوب میں واقع ایک گاؤں پہنچے جو لا ماچا کہلاتا تھا۔ وہ لوگ بھی بڑے نکلے اور کسی طرح معافی نامے خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ میرے مالک اور ہم سب نے حسب اپنی کاریگری دکھائی لیکن دو تعطیلوں کے بعد بھی یہ حقیقت کھلی کہ ہم تیس سے زیادہ معافی نامے منتقل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ گناہ بخشنے والے کو بڑا غصہ آیا اور اسے جو دو پیہ خرچ کرنا پڑ رہا تھا اس کی بھی تشویش ہوئی۔ چنانچہ اس دن اس نے عشائے ربانی کی پر تکلف رسم ادا کی۔ وعظ کہنے کے بعد وہ قربان گاہ کے قریب گیا اور ایک ننھی سی صلیب نکالی جو مشکل اس کے ہاتھ کے برابر تھی۔

قربان گاہ پر سلگتے ہوئے کوئلوں کی ایک چھوٹی طشتری رکھی ہوئی تھی جو وہ اس دن سردی کی وجہ سے ہاتھ گرم کرنے کے لئے لایا تھا۔ اس نے طشتری اپنی کتاب کے پیچھے رکھ صلیب کو پھرتی سے کوئلوں پر رکھدیا۔ نماز پڑھنے اور خیر و برکت کی دعا دینے کے بعد اس نے اسے اپنے رومال سے پکڑ کر اٹھایا، اسے اچھی طرح لپیٹ کر داہنے ہاتھ میں سنبھالا اور بائیں ہاتھ میں معافی نامے لے لئے۔ وہ قربان گاہ کی سب سے نچلی سیڑھی پر اتر پھر اس نے صلیب کو بوسہ دینے کا بہانہ بنایا اور مجمع کو بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا۔ اس لئے حسب دستور پہلے بلا تاخیر اپنے اپنے درجہ کے مطابق ایک ایک کر کے آگے بڑھے۔ پہلا ایک بوڑھا آدمی تھا اور اگرچہ گناہ بخشنے والے صلیب سے اس کا منہ چھوا ہی تھا لیکن وہ جل گیا اور وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹا۔ میرے مالک نے یہ دیکھا تو زور سے بولا:

"خاموش، پرسکون ہو جائے جناب، یہ تو کرامت ہے !

یہی معاملہ اگلے نصف درجن لوگوں کے ساتھ ہوا اور اس نے ہر ایک سے یہی کہا :

"چپ، خاموش ، یہ تو کرامت ہے !

جب اس نے دیکھا کہ اس نے وافر شہادت کے لئے کافی چہرے جلا دئے ہیں تو دوسرے لوگوں کو صلیب کو دینے سے روک دیا۔ وہ قربان گاہ کے قریب پہنچا اور وہاں سے اس کراماتی واقعہ کا اعلان کیا۔ چونکہ وہ لوگ بخیل ہیں اس لئے خدا نے یہ معجزہ دکھایا ہے۔ اب اس صلیب کو لاٹ پادری کے علاقے کے کنیسا و اسقف لے جایا جائے گا۔ اور یہ بتایا جائے گا کہ یہ اس لئے چمکتی تھی کیونکہ وہ لوگ بجد کنجوس تھے۔ پھر تو معافی ناموں کیلئے بھیڑ ہوئی کہ وہ منشی، اگر جا گھر کے لوگ اور وہاں رہنے والے گورکن مل کر بھی سب نام نہ لکھ سکے۔ مجھے پورا یاد ہے کہ ہم نے تین ہزار سے زاید معافی نامے بیچے۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو ہم بڑی عقیدت سے

صلیب اٹھانے پہنچے۔ اس نے کہا کہ اس پر اسے بجا طور پر سونے کا خول چڑھوانا پڑے گا۔ اس سے مجلس بلدیہ اور مقامی اہلِ کلیسا نے درخواست کی کہ وہ اس مقدس صلیب کو اس معجزے کی یادگار کے طور وہیں رہنے دے۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے آمادہ کیا کہ آخر وہ اس کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس کے بدلے ان لوگوں نے اسے چاندی کی ایک صلیب دی جو خود ان کے بقول دو یا تین پونڈ وزنی تھی۔

غرض ہم وہاں سے چل دیئے۔ ہم اس تبادلہ اور جو کاروبار ہم نے کیا تھا، دونوں کی وجہ سے خوش تھے۔ میرے علاوہ کسی اور نے اس کی حرکت نہ دیکھی تھی۔ میں قربان گاہ کے پاس گیا تاکہ یہ دیکھوں کہ کہیں طشتریوں میں کوئی ایسی چیز تو نہیں رہ گئی ہے جس کے دام کھرے کئے جا سکیں۔ وہ میرے لئے تفاخر کا موقعہ تھا۔ گناہ بخشنے والے نے جو مجھے وہاں دیکھا تو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کا دعویٰ رکھنے گا کہ وہ کرامت دیکھنے کے بعد میں ہر ایک کو اس کی خبر کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس عیار گناہ بخشنے والے سے ڈرا ہوا تھا جس نے کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا تھا۔ درحقیقت میں نے کبھی کسی کو بتایا بھی نہیں کیونکہ جو کچھ ہوا تھا میں نے اسے ظاہر نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ میں اب تک اپنی اس قسم کا پابند رہا ہوں۔

میں اس وقت لڑکا ہی تھا مگر اس کی چال سے بہت متاثر ہوا اور خود سے کہنے لگا:

"خدا جانے اس جیسے اور کتنے لوگ ہوں گے جو بھولے بھالے لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔"

میں اپنے پانچویں مالک کے ساتھ کل چار ماہ سے کچھ زائد عرصے رہا۔ مگر اس کے ساتھ بھی مجھے تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ ہاں یہ بات ضرور قابلِ لحاظ ہے کہ جب کبھی ہم تبلیغ کرنے جاتے تو وہ پادریوں اور دوسرے کلیسائیوں کے خرچ پر مجھے خوب کھلاتا تھا۔

چھٹا باب

اس کے بعد میں ایک مصور کے ساتھ رہا جو دیواروں پر نقش و نگار بنا کر روزی کماتا تھا۔ مجھے اس کے لئے رنگ ملانے پڑتے تھے اور زندگی بڑی مشکل ہوگئی تھی۔

اب میں ایک لمبا تڑنگا جوان ہو چکا تھا۔ ایک دن میں کلیسا میں تھا تو ایک پادری نے مجھے ایک کام دیدیا۔ اس نے مجھے ایک گدھا، چار گھڑے اور ایک چابک دیا اور میں شہر میں پانی بھرنے لگا۔ یہ ایک شریف آدمی بننے کی سمت میں میرا پہلا قدم تھا۔ کیونکہ اب میرا پیٹ بھر جاتا تھا۔ میں اپنے مالک کو روزانہ تیس مراودی دیا کرتا اور ہفتہ کو خود اپنے لئے کام کرتا۔ اس کے علاوہ اگر کبھی مجھے تیس مرویدی سے زیادہ کی آمدنی ہوتی تو وہ میں اپنے پاس رکھ لیتا۔

میں نے یہ کام اتنی خوبی سے کیا کہ چار سال تک احتیاط سے پیسہ بچانے کے بعد میں اس قابل ہوگیا کہ استعمال شدہ کپڑے خرید کر شائستگی سے تن ڈھک سکوں۔ میں نے موٹے کپڑے کی ایک پرانی صدری اور ایک پرانا کوٹ خریدا جس کی آستین ادھڑ گئی تھیں اور جس میں سوراخ ہوگیا تھا۔ میں نے ایک چغہ بھی خریدا جس میں کبھی جھالر لگی ہوئی ہوگی اور ایک پرانی تلوار بنوائی جو اس زمانہ کی معلوم ہوتی تھی جب تلواریں Cuellar بناکرتی تھیں۔

جوں ہی میں نے خود کو نئے پارچہ میں ملبوس دیکھا تو اپنے مالک سے بولا کہ وہ اپنا گدھا واپس لے لے کیونکہ اب میں وہ کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ساتواں باب

پادری کو چھوڑ کر میں ایک سپاہی کے پاس کام کرنے لگا کیونکہ یہ خیال اچھا معلوم ہوا کہ قانون سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ لیکن میں وہاں زیادہ عرصہ نہ رکا کیونکہ یہ کام خطرناک تھا۔ خاص طور پر ایک رات تو کچھ مفرور میرے مالک کا اور میرا پیچھا کرتے گئے۔ انہوں نے ہم پر پتھر پھینکے اور لاٹھیوں سے حملہ کیا۔ وہ مجھے تو نہ پکڑ سکے لیکن انہوں نے میرے مالک کی خوب مرمت کی۔

میں حیران تھا کہ آخر کیا کام کرتے لگوں تاکہ زندگی آرام سے گذرے اور بڑھاپے کے لئے کچھ بچا بھی لوں۔ خدا نے بڑا کرم کیا کہ اس نے میرا رستہ روشن کر دیا اور میرے قدم ایک سود بخش راستے پر ڈال دیئے۔ دوستوں اور ذی رتبہ لوگوں نے مجھ پر بڑی مہربانی کی اور مجھے جو عہدہ ملا اس سے اب تک میں نے جو مصیبتیں اٹھائی تھیں اور جو جد وجہد کی تھی، ان سب کی کسر پوری ہوگئی۔ مجھے انتظامی صیغے میں ملازمت مل گئی! مجھے یہ اندازہ ہوا کہ جب تک ذی سرکاری نوکری نہ ملے کسی کا کام نہیں چل سکتا۔ میں اب بھی یہ نوکری کر رہا ہوں اور خدا اور حضور عالی کا خدمت گزار ہوں۔

اب میرا یہ کام ہے کہ میں شہر میں بکنے والی شراب اور گمشدہ مال کے نیلام کا اعلان کیا کروں۔ میں سزا یافتہ مجرموں کے ساتھ ان کے جرم کا اعلان کرتا ہوا بھی چلتا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یا سیدھی سادی اردو میں یوں کہئے کہ میں شہر کا ڈھنڈورچی ہوں۔

قسمت کچھ ایسی مہربان ہوئی ہے اور میں نے مواقع سے اتنی خوبی سے فائدہ اٹھایا ہے کہ ہر چیز میرے ہاتھوں میں سے گذرتی ہے۔ اس لئے اگر ٹولیڈو میں کسی بھی جگہ کسی بھی شخص کو شراب یا کوئی بھی چیز بیچنی ہو تو وہ اپنے کاروبار میں اس وقت تک کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک لیزارو ڈی ٹورمے کی مٹھی گرم نہ ہو۔

یہ ملازمت حاصل کرنے کے فوراً ہی بعد سینٹ سلواڈور کے اسقف اعظم نے میرا تذکرہ سنا۔ انہوں نے میری تیزی اور ذہانت کا اندازہ لگا لیا کیونکہ میں انکی شراب کی فروخت کا اعلان کیا کرتا تھا چنانچہ انہوں نے اپنی ایک ملازمہ سے میری شادی طے کردی۔ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میرے آقا اور حضور کے خادم اور دوست اس مقدس نیک ہستی سے تعلق پیدا ہونے میں صرف فائدے ہی پہنچ سکتے ہیں اور بھلا ہی ہوسکتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہماری شادی ہوگئی اور مجھے کبھی اس کا افسوس نہیں ہوا کیونکہ وہ نہ صرف ایک اچھی اور خلیق لڑکی ہے بلکہ اسقف اعظم مجھ پر ہمیشہ بہت مہربان رہتے ہیں۔ ہر سال مجھے وافر مقدار میں غلہ مل جاتا ہے، کرسمس اور عید الفصح کو گوشت مل جاتا ہے اور آئے دن چڑھاوے کی کئی روٹیاں یا پرانے موزوں کا جوڑہ مل جاتا ہے۔ انہوں نے ہمارے لئے اپنے پڑوس میں مکان کا انتظام کیا۔ اتوار اور چھٹی کے دنوں میں ہم تقریباً ہمیشہ انہی کے یہاں کھانا کھاتے ہیں لیکن شیطانی زبانوں نے جن کی نہ اب کمی ہے اور نہ کبھی ہوگی میرا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ وہ لوگ کوئی نہ کوئی بات کہتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میری بیوی ان کا بستر بچھانے اور رات کا کھانا پکانے جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا ان کی دروغ گوئی بخش دے گا۔

اس کا دھیان رکھئے گا کہ ایکبار میں ملامت آمیز شبہ میں پڑگیا تھا اور اسی لئے چند مرتبہ رات کا کھانا بڑی بیدلی سے کھایا کیونکہ کئی بار میں نے اس کا انتظار کیا تو وہ فجر کی نماز تو کیا اس کے بعد تک بھی نہیں آئی۔ مجھے یاد ہے کہ ایسکالونا میں اس نابینا نے نعل پر ہاتھ رکھ کر کیا کہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شیطان نے جان بوجھ کر میرے ذہن کو اس اندیشے میں ڈالا تھا تاکہ میری شادی منسوخ ہوجائے۔ لیکن اسے اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا کیونکہ ایک تو وہ ایسی عورت نہیں جو اس قسم کی چیز کو کھیل سمجھتی ہے اور پھر میرے ولی نعمت اسقف اعظم نے ایک دن مجھ سے ایک عہد بھی کیا تھا جس کی وہ یقیناً پابندی کریں گے۔ انہوں نے مجھ سے یہ بات کہی تھی :

'لیزارو ڈی ٹارمے اگر تم لوگوں کی باتوں کا خیال کروگے تو کبھی زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکو گے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ اس نے تمہاری بیوی کو میرے گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے تو تمہیں حیران نہیں ہونا چاہئے . . . . میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ جو کچھ بھی کرے اس پر تم دونوں میں سے کسی کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کسی کی بات پر دھیان نہ دو ؛ صرف اپنے معاملات پر غور کرو ؛ میرا مطلب ہے یہ دیکھو کہ تمہارے لئے کونسی چیز سب سے اچھی ہے۔'

'جناب' میں نے ان سے کہا کہ 'میں نے کافی عرصے پہلے ذی حیثیت لوگوں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میرے دوستوں نے میری بیوی کے بارے میں مجھ سے کچھ کہا ہے۔ درحقیقت انہوں نے یہ ثابت

کر دیا ہے کہ مجھ سے شادی ہونے سے پہلے اس کے تین بچے ہو چکے تھے۔ یہ بات میں ادب سے کہہ رہا ہوں کیونکہ بیگم صاحب اس وقت یہیں موجود ہیں۔"

اس پر میری بیوی نے ایسی ڈراؤنی قسمیں کھانی شروع کر دیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ مکان ہمارے سروں پر گرنے ہی والا ہے۔ وہ رونے لگی اور اس شخص کو کوسنے لگی جس نے ہماری شادی کرائی تھی۔ میں نے سوچا کاش میں مر گیا ہوتا اور جو بات کہی تھی وہ کبھی نہ کہتا۔ لیکن میرے آقا نے اور میں نے بات بدل دی اور اس سے اتنے وعدے کئے کہ اس نے رونا بند کر دیا۔ مجھے قسم کھانی پڑی کہ جب تک میں زندہ ہوں کبھی اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہوں گا اور یہ کہ میں خوش اور مطمئن ہوں کہ وہ دن رات میں جب چاہے اس گھر میں آتی جاتی رہے کیونکہ مجھے اسکی وفا پر پورا بھروسہ ہے۔ ہم سب اس بندوبست پر بہت خوش ہوئے۔ کسی شخص نے ہمیں اس موضوع پر دوبارہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ درحقیقت جب مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے بارے میں مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے تو میں سلسلہ کلام منقطع کر کے اس سے کہتا ہوں:

" دیکھیے اگر آپ میرے دوست ہیں تو کوئی ایسی بات نہ کہئے جس سے میری طبیعت منغض ہو جائے کیونکہ اگر کوئی مجھے ناراض کرے تو پھر وہ میرا دوست نہیں ہو سکتا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ جب وہ میرے اور میری بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا کرنا چاہتا ہو۔ میں اس سے دنیا کی ہر چیز یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی زیادہ محبت کرتا ہوں۔ الحمد للہ کہ اس کے ساتھ میری زندگی بڑے آرام سے گذر رہی ہے ––– اتنے مزے سے جس کا میں مستحق بھی نہیں ہوں۔ میں مقدس روٹی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ٹولیڈو کی کسی بھی عورت جتنی پارسا ہے اگر کوئی اس کے خلاف کچھ کہے گا تو میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔"

یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ کوئی اس کے خلاف کچھ نہیں کہتا اور ہمارے گھر میں سکون رہتا ہے۔

یہ اسی سال بات کی بات ہے جب ہمارے فاتح شہنشاہ ٹولیڈو کے اس مشہور شہر میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے یہاں اپنی مجلس قانون ساز کا اجلاس منعقد کیا تھا۔ اس وقت جیسا کہ حضور نے بھی یقیناً سنا ہو گا بڑا زبردست جشن منایا گیا تھا۔ اس وقت میں اپنی خوش بختی کے منتہا پر تھا۔ میں مناسب موقع پر حضور کو اپنے مستقبل کے حالات سے آگاہ کروں گا۔

۔۔۔۔۔۔

انجمن کی چند مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	یادگارِ نظر	جگر بریلوی	۶ر۵۰
۲	تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	۷ر۰۰
۳	خوابِ شیریں	جے کرشن چودھری	۲ر۰۰
۴	کچھ زر کی بابت	ابو سالم	۴ر۵۰
۵	کلامِ سودا	خورشید الاسلام	۶ر۰۰
۶	گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	۷ر۰۰
۷	گاندھی اور نہرو کی راہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۵ر۰۰
۸	مذہب اور دھرم	مہاتما گاندھی	۴ر۰۰
۹	مشترکہ زبان	״	۴ر۰۰
۱۰	مضامینِ رشید	رشید احمد صدیقی	۶ر۰۰
۱۱	نسیمِ مغرب	اے سی بہار	۲ر۵۰
۱۲	اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	۱۷ر۰۰
۱۳	سخن مختصر (نیا مجموعہ کلام)	معین احسن جذبی	۲ر۰۰
۱۴	سیرِ افلاک	حکیم احمد	۵ر۰۰
۱۵	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵ر۰۰
۱۶	صحیفۂ خوش نویسان	مولوی احترام الدین احمد شاغل	۶ر۰۰
۱۷	فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۳ر۰۰
۱۸	باز دید	غلیب الرحمن	۳ر۵۰
۱۹	اردو صرف و نحو (جدید ایڈیشن)	مولوی عبد الحق	۱ر۲۵
۲۰	خطوطِ غالب	مالک رام	۷ر۵۰

انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ

ذکاء الدین شایاں

اردو شاعری اور رومانویت

(انقلاب فرانس اور انگریزی شاعری میں رومانوی تحریک)

(سلسلہ شمارہ ۲ ۱۹۷۱ء)

ہر ملک کی تاریخ شاہد ہے کہ انقلاب، عالمگیر جنگ یا عوامی بغاوت کی تباہ کاریاں، تہذیب، معاشرت اور تجارت سے کہیں زیادہ انسانی ذہن و شعور کو متاثر کرتی ہیں۔ اور ان کے نتیجہ میں اگر ایک طرف شعر و ادب، زبان و بیان اور اقدار و رسوم وغیرہ پر کاری ضرب لگتی ہے تو دوسری طرف اِن ہی کی نئی سمتیں بھی متعین ہوتی ہیں۔ اور شیرازہ بندی کی جاتی ہے۔ اگر کچھ مروجہ قدریں ٹھکرائی جاتی ہیں اور کچھ نظریے پامال کئے جاتے ہیں یا شک کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں تو کچھ پر نئے سرے سے ایمان بھی لایا جاتا ہے۔ اس طرح ہر انقلاب کے بعد ایک ایسی ذہنی فضا (خصوصاً شعر و ادب اور فن کی دنیا میں) پیدا ہو جاتی ہے جو کسی واضح اور نمایاں رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جنگ کا اپنا ایک فلسفہ، ماحول، تقاضہ اور نتیجہ ہوتا ہے اور وہ ہے انسانی ذہن میں وسیع پیمانے پر خوف (TERROR) کو پیدا کرنا۔ خوف کا یہ جذبہ بڑا اہم ہے۔ جنگ سے پہلے امن اور خوشحالی کے زمانے میں انسان کے ادراک اور فہم و شعور پر ایک قسم کا سکون، اطمینان، یا جمود طاری ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے خیال و عمل، نظریوں، فلسفوں اور قدروں کے بتوں کو لئے ہوئے اپنے ذہنی حصار میں قید ہو جاتا ہے۔ جنگ اس بنے بنائے حصار کو ایک دم غارت کر دیتی ہے اور انسان کو پھر ایک مرتبہ خوف، مصیبت اور موت کے بھیانک غار کے سامنے لے آتی ہے۔ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر دنیا کا یہ "تماشا" کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ یہ قتل و خون، یہ موت کی گرم بازاری اور ارزانی کیا حقیقتاً انسانیت کا مقدر ہے؟ چنانچہ ذہنی طور پر گھبرایا ہوا اور تلخ و عریاں حقیقت سے خوف زدہ یہ انسان ایسے نازک وقت میں کسی پناہ، کسی سہارے اور کسی "ایمان" کی طرف لپکنے لگتا ہے اور جہاں بھی اُسے کوئی "چھاؤں" دکھائی دیتی ہے جس سے اس کو روحانی طمانیت حاصل ہو سکے، اُسی طرف وہ چلا جاتا

ہے۔ چاہے وہ اپنے سر کے اوپر کی لامحدود بلندیوں (خدا، مذہب) کی جانب دیکھے، چاہے آبادیوں شور و غل سے اکتا کر دشت یا کھلی فضا (فطرت) سے ذہنی ارتباط قائم کرے اور چاہے وہ اپنی ذات او تنہائی کے کنوئیں (تصوف، عرفانِ حقیقت) میں سکڑ کر اور دنیا کی گہرائیوں میں اتر کر اپنے "وجود" کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہے۔ وہ بہر صورت کسی جہت کو ضرور اپنائے گا۔ انسانی ذہن کی یہ مراجعت اور فراریت بڑی حد تک فطری ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکر، دانشور، فلسفی، حکیم، شاعر، ادیب اور سیاست داں ہمیشہ اس کیفیت سے دوچار ہوئے ہیں۔

انیسویں صدی کے اوائل میں فرانس میں جو زبردست انقلاب رونما ہوا، اس کے سیاسی، معاشی اور تاریخی اسباب کی تفصیل یہاں بے محل ہے۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ انقلاب ظلم اور شہنشاہیت کے خلاف ایسی آواز لے کر اٹھا جس میں عوام کی بہبودی، غلامی سے نجات کا جذبہ، آزادی کا تحفظ، سماجی بہتر مستقبل کے خواب، علم و ادب اور فن کی ترقیاں اور قدروں اور نظریوں کی شکست و ریخت وغیرہ سبکا شامل تھا۔ اس انقلاب اور جنگ کو وقت کے بہت سے مفکر، صاحب نظر، اہل قلم اور جانباز سپاہی یا سپہ سالا مل گئے۔ مثلاً ایڈمنڈ برک اور ولیم گاڈون نے اپنی تصنیفات "انسان کے حقوق" اور سیاسی انصاف" کے ذر سماجی ڈھانچے کو بدلنے کے ساتھ ساتھ انسان کی خوشحالی، آزادی اور مستقبل کی مسرتوں کا یقین دلایا۔ جمہور میں رجائیت پیدا کی اور تعلیم کی طرف عوام کو راغب کیا۔ روسو (جو رومانویت کا "باوا آدم" سمجھا جاتا ہے نے اپنی کتاب "معاہدۂ عمرانیات" میں اپنے نظریوں کا جھنڈا اس طرح بلند کیا —— "انسان فطرتاً نیک اور اچھا ہوتا ہے۔ اسے خراب آئین و رسوم بگاڑ دیتے ہیں۔ انسان کو ان برائیوں سے نجات دلانا ضروری ہے اسی کے ساتھ اسے اس قابل بھی کر دینا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو اپنا رہبر بنا سکیں ——" ان سیاسی مفکرین کے پہلو بہ پہلو نپولین جیسے بہادر سپہ سالار کی دیو پیکر ہستی تھی جس نے بہت سی جنگیں لڑیں، انسانیت کا خون بہایا اور نہ صرف فرانس میں بلکہ تمام یورپ میں اپنی دہشت پھیلا دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "انقلابِ فرانس" کا تصور نپولین اور اس کی جنگوں کے بغیر ناممکن ہو گیا۔

انقلاب اور جنگ کے اس خوفناک ماحول میں رومانی شاعروں کی پہلی نسل نے آنکھ کھولی۔ اس گروہ میں ولیم بلیک، ورڈسورتھ، اور کالرج شامل تھے۔ یہ وہ شاعر تھے جو ذہنی اور عملی، دونوں حیثیتوں سے ابتدا میں "انقلاب" سے وابستہ تھے۔ اور اس پر ایمان رکھتے تھے۔

بلیک بجا طور پر رومانوی شاعروں کا پیش رو تھا۔ اس نے اپنی نثریہ نظم "دی فرنچ ریوولیوشن" میں انقلابِ فرانس کی ابتدا کی تاریخ کو تخیلی انداز میں پیش کیا۔ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلیک کو انقلاب

پسندوں سے خاص ہمدردی تھی اور اسے ان کے نظریات سے اتفاق تھا۔ بلیک، برطانوی انقلاب پسندوں مثلاً ڈاکٹر پرائس، ولیم گاڈون اور ٹامس پین وغیرہ ——— کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہ سب لوگ جانسن کے مکان پر جمع ہوتے تھے جو اس وقت ناشر تھا۔

بلیک نے چھوٹی چھوٹی خوب صورت نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں غنائیت اور گیت کی کیفیات اس درجہ ہیں کہ کچھ نقاد اسے رومانوی عہد کا پہلا اور بڑا غنائی شاعر ماننے کے لئے مجبور ہیں۔ بلیک کے سامنے انقلاب کے بعد کی ستائی ہوئی اور سسکتی ہوئی جو خارجی دنیا تھی، وہ قابل توجہ ضرور تھی اور بلیک کو اس سے بڑی حد تک ہمدردی بھی تھی، لیکن اس سے زیادہ وہ انسان کی روح میں اثر کرا حساس جذبات اور شخصیت کی مختلف پرچھائیوں کا تجزیہ کرنا پسند کرتا تھا۔ وہ عام معلومات کو قبول کرنے پر کبھی اکتفا نہیں کر سکا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مادی دنیا غیر حقیقی ہے۔ ہمارے لئے اس جیتی جاگتی اور نظر آنے والی کائنات میں سچے مشاہدہ کا سامان بہت کم ہے۔ انسان بالکل اندھا ہے۔ وہ اپنی ظاہری آنکھوں سے نہ اس جہان کو سمجھ سکتا ہے اور نہ وہ زندگی کی حقیقی اور روحانی قدر یا فطرت سے پوری طرح شناسائی حاصل کر سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بلیک انسان کے فطری احساس اور جبلت (Natural impulse) کو بہت اہم سمجھتا ہے۔ وہ اس احساس کو تخیل (Imagination) یا قوت (Energy) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نظریے کے مطابق یہی بھلائی کے مترادف ہے جبکہ اخلاق اور فرض ایسی زنجیریں ہیں جو انسانیت کی روح کو قید کر لیتی ہیں اور اسے دکھ پہنچاتی ہیں۔

بلیک کی نظموں کے مجموعے "سانگس آف انوسینس اینڈ آف اکسپیرینس" کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسانی احساس و روح کے دو مختلف اور متضاد مدارج ——— بچوں جیسا یقین اور کشمکش میں مبتلا کرنے والا شک ——— پیش کرنا چاہتا ہے۔ "نرس سانگ" کے عنوان سے اس نے دو نظمیں لکھی ہیں۔ ایک میں دکھایا ہے کہ دن چھپنے کے وقت کچھ بچے ہرے میدان میں کھیل رہے ہیں اور ان کی آیا (نرس یا مغلانی) انہیں بلاتی ہے کہ وہ آکر اپنے بستروں پر لیٹ جائیں۔ لیکن بچے کھیل میں اتنے منہمک ہیں کہ مغلانی کی بات پر بالکل دھیان نہیں دیتے۔ بہت اصرار کرنے پر وہ اتنا کہتے ہیں۔ "ابھی آتے ہیں" مغلانی ان معصوم بچوں کے کھیل اور اس کے اشتیاق کو دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ بلیک اس نظم میں چھوٹے بچوں کی معصومیت اور ان کے کھیل میں مشغول رہنے کی کیفیت کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اسی عنوان کے تحت لکھی ہوئی دوسری نظم کی فضا اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں ایک نوجوان نرس (کرخت چہرے والی) ہے جو ایک غمگین بچے کو ڈانٹ رہی ہے یہ فرض کی پابند نرس بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ بچے کھیل میں اپنا قیمتی وقت خراب کر رہے

ہیں۔ انھیں نہ اپنے فرائض کا احساس ہے اور نہ اپنے ذہن و شعور کی تربیت کی پروا ہے۔ اور یہ سوچ کر جب نرس اپنی گذری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتی ہے اور اُن باتوں اور خواہشوں کو یاد کرتی ہے (جو اب تکلیف دینے والی اور چونکا دینے والی ثابت ہو رہی ہیں) جن میں وہ خود گرفتار رہی تھی تو اس کا "چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے" بلیک نے اس کیفیت کو ان لفظوں میں واضح کیا ہے۔

جب ہرے میدان میں، بچوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں
اور وادی میں سرگوشیاں گونجنے لگتی ہیں ___
تب، مجھے (نرس) اپنی جوانی کے دن اور واقعات یاد آجاتے ہیں
اور میرا چہرہ زرد ہو جاتا ہے

اے بچو! سورج چھپ گیا ہے۔ تم اپنے گھر آجاؤ
رات کی شبنم اپنا سر اٹھا رہی ہے
تمہارے دن اور تمہاری بہاریں کھیل میں برباد ہو رہی ہیں
اور موسم سرما اور تمہاری رات سوانگ بھر رہی ہے۔

خارجی مظاہر کو انسان کے روحانی احساسات سے وابستہ کرنے کا انداز بلیک کے اُس ذہن کا غماز ہے جو روما نویت کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ وہ کبھی انسان کو فطرت کے پُرکار سادہ رنگوں اور ماحول میں گھرا ہوا دکھا کر ایک معصوم بچہ کی طرح خوش ہوتا ہے اور ہر شے کا بچے ہی کی نظر سے جائزہ لیتا ہے ___ اور کبھی وہ انسانی روح کی اُن پرچھائیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جس پر فطرت کے جلال و جمال کا عکس بھی ہے اور زندگی کے تجربات، غم اور کشاکش کا پرتو بھی ___ ایک نظم "فلائی" (بے صلحت) میں انسان زندگی کی داخلی یکسانیت کو پیش کیا ہے

"اے چھوٹی مکھی ___
میرے بے پروا ہاتھوں نے
تیرے موسم گرما کے کھیل کو
تباہ کر دیا ہے (تیرے پروں کو مسل دیا ہے)

کیا میں تیری طرح ایک مکھی نہیں ہوں ؟
کیا تو میری طرح ایک انسان نہیں ہے ؟
کیونکہ ، میں ناچتا ہوں
اور پیتا ہوں — اور گاتا ہوں
یہاں تک کہ کوئی غیبی ہاتھ
میرے پروں کو (بھی) مسل ڈالے گا

اگر زندگی ، قوت اور سانس
خیالوں ہی سے عبارت ہے
اور خیالات کا نہ ہونا ہی موت ہے

تو پھر چاہے میں زندہ رہوں یا مر جاؤں
میں مسرت سے ہمکنار مکھی ہوں ۔

گرے اور کالنس کی طرح بلیک بھی موسموں کی خوشبو اور رات اور دن کی جھلکیوں کو اپنے انفرادی شاہدے اور محسوسات کی گرفت میں لیتا ہے اور اُن میں بہت سے معانی ڈھونڈھتا ہے ۔ وہ شاعرانہ تخیل کو اندرونی نظر " VISION) ہی کا دوسرا روپ سمجھتا ہے کیونکہ اسی کی مدد سے ہم اس خیال تک پہنچ سکتے ہیں جو اصل حقیقت ہے ۔ ظاہری اشیاء اور مظاہر کا رنگ روپ جیسے عام نظر اور عام خیال محسوس کر لیتا ہے ، حقیقت نہیں ہے ۔ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں اندرونی نظر اور وجدان کی مدد درکار ہو گی ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک " تصور " کو " تعقل " پر ترجیح دیتا ہے ۔ وہ ظاہری نظر ، توہمات اور سائنس کا سخت مخالف ہے کیونکہ اُس کے خیال میں ظاہری نظر سے دیکھی جانے والی اشیاء اور ان پر کیا جانے والا تبصرہ غیر حقیقی ہے ۔ اس نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے اگر بلیک کی اُن نظموں کو دیکھا جائے جن میں فطرت اور بیرونی مظاہر کا عکس ہے تو ان کے اندر بڑی گہرائی اور معنویت ملے گی ۔ یہ معنویت انسانی محسوسات اور وجدان سے جدا کر کے نہیں پرکھی جا سکتی ، مثلاً ایک نظم " رات " پہلا بند یہ ہے ۔

" سورج اُفقِ مغرب میں اُتر رہا ہے ۔

شام کا تارہ چمکتا ہے —
چڑیاں اپنے گھونسلوں میں خاموش ہیں
اور میں ؟ —— اپنی پناہ کی تلاش میں ہوں
چاند —— پرمسرت سکوت کے ساتھ ——
آسماں کی اونچی شاخ پر — ایک پھول کی طرح ——
بیٹھا ہے —— اور رات پرخندہ زن ہے

" لافنگ سانگ " میں ایک بچے کے سادہ احساس کی روشنی میں فطرت کی مسکراہٹوں کا تجزیہ کیا ہے ۔

" جب — خوشی کی آواز کے ساتھ ہرے جنگل ہنسنے لگیں
اور لہراتا ہوا چشمہ قہقہہ لگا کر گذرے
جب — یہ ہوا ہمارے مسرت آمیز مزاج سے کھکھلا پڑے
اور جب اس آواز سے ہری بھری پہاڑیاں مسکرا اٹھیں
—— آؤ " اور اس وقت ہمارے ساتھ مل کر خوش ہو جاؤ

لیکن بلیک کی یہ رجائیت اور بچے جیسی معصوم ہنسی زیادہ دیر تک اس کا ساتھ نہیں دے سکتی وہ جب انسانی روح اور احساس کے دوسرے رخ —— (—— غم تشکیک ، اخلاقی اور سماجی بندشوں کا کرب) پر نظر کرتا ہے تو اداس ہو جاتا ہے ۔ اسے فطرت کی مسکراہٹ بھی زہریلی لگتی ہے ۔ اور مذہب تہذیب ، معاشرت اور اخلاق کے بنے ہوئے اصول زنجیروں کی طرح اس کے بدن پر گڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔ بلیک ان کے درد کو سینے سے لگائے اپنی انفرادیت اور شخصیت کے خول میں اتر جاتا ہے ۔ اور اپنے تجربات ، وجدان اور ذاتی مشاہدے کا سہارا لے کر کائنات کو پرکھتا ہے ۔ وہ اپنے طور پر محسوس کی ہوئی حقیقت کو مختلف زاویوں اور معنوں کے ساتھ ، سامنے رکھتا ہے ۔ اور اس طرح وہ انسان کی روح کو تخیل کے رتھ پر بالکل آزاد دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے ۔ بلیک کی نظم " لندن " انسان کے شہری سماج کی کمزوریوں کا ایک مرثیہ ہے ۔ سوسائٹی کی خامیوں کو شاعر نے نہ صرف شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے بلکہ اس غم میں وہ سب کا شریک بھی رہا ہے ۔ اس نے تین سماجی برائیوں —— ظلم

ں۔ ہوس (جنس) ـــــ کو تین علامتوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ "ظلم" کی علامت، خاکروب (یا جھاڑو دینے والا صفائی کرنے والا لڑکا ـــــ ہے جو "چرچ" (مذہب کے لئے ایک لعنت ہے (بلیک کے عہد میں والدین اپنے بچوں کو اُن مالکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے یا ان کے سپرد کر دیتے تھے جو اُن سے کارخانوں میں چمنیاں صاف کراتے تھے - یہ مالک ان لڑکوں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی ہمدردی میں ایک بل پاس کیا گیا اور ان پر کئے جانے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ـــــ) دوسری برائی "جنگ" ہے، جسے سپاہی کی علامت میں ظاہر کیا ہے - یہ سپاہی محل (عیش و آرام) کے لئے ایک لعنت ہے۔ تیسری برائی "ہوس (جنس)، کی علامت طوائف ہے، جو شادی کے تقدس اور بچوں کی خوشیوں کو ہمیشہ ڈراتی رہتی ہے - اس فضا کو سمجھنے کے لئے پوری نظم کا مطالعہ ضروری ہے -

" میں (لندن کی) ہر آزاد سڑک پر گھومتا ہوں
وہاں جاتا ہوں ، جہاں آزاد ٹیمس بہتا ہے
میں جس چہرے کو دیکھتا ہوں
اُس پر غم اور کمزوری کے نشانات ہیں

مجھے ـــــ ہر شخص کی چیخ میں
ہر بچے کی خوفزدہ پکار میں ،
ہر آواز ، اور ہر بندش میں ـــــ
زنجیروں میں پٹے ہوئے انسانی ذہن کی فریاد سنائی دیتی ہے
(یہ زنجیریں مذہب اور اخلاق کی ہیں)

" (میں دیکھتا ہوں) کس طرح چمنی صاف کرنے والے لڑکے کی چیخ
سیاہ دل چرچ (مذہب) کو لرزا دیتی ہے
اور کس طرح ، ایک بدنصیب سپاہی کی آہ
محل کی دیواروں کے نیچے خون میں لت پت دوڑتی ہے

لیکن (سب سے عجیب بات عام طور پر آدھی رات کے وقت گلیوں میں سنتا ہوں

کہ کس طرح نوجوان طوائف کا کوسنا (لعنت)
نئے پیدا ہونے والے بچوں کے آنسوؤں کو اڑا دیتا ہے
اور گندگی کا یہ "بلیگ" کس طرح شادی کی پاکیزگی کا جنازہ اٹھا دیتا ہے

یہ نظم اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ بلیک اپنی "رومانویت" کے وسیلے سے صرف فطرت کے ہلکے اور گہرے رنگوں کا احساس کرانا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ پوری انسانیت کے درد اور مسرتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اس نظم میں کلاسیکی شاعری کا سا نہ تو کوئی درس ہے اور نہ پروپیگنڈا ہے۔ شاعر نے اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں انسانی روح، وجدان اور اندرونی نظر کی مدد سے کائنات کا مطالعہ کیا ہے۔ بلیک کا یہ پہلا قدم رومانویت کی منزل اور اس کی پُر پیچ، مبہم اور اونچی نیچی راہوں کا نشانِ اوّل ہے

یہ اتفاق بھی کچھ کم اہم نہیں، کہ بلیک "رومانویت" کا پیش رو ہونے کے ساتھ ساتھ "علامت نگاری" کا بھی موجد ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ علامت نگاری نے رومانویت ہی کی کوکھ سے جنم لیا، اور "ابہام" اسی کا دوسرا بھائی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ویسے ابہام کے سلسلے میں بلیک سے پہلے دانتے وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے شعر میں ابہام کی روایت کو کسی نہ کسی حد تک قائم ضرور کر دیا تھا۔ بلیک کے معاصرین اس کے ابہام سے سخت نالاں تھے۔ سدے بلیک کو پاگل گردانتا تھا۔ کیونکہ ایک مرتبہ اس نے ایک نظم "یروشلم" سدے کو دکھائی جس میں بیان کیا گیا تھا کہ "آکسفورڈ اسٹریٹ "یروشلم" میں ہے۔ ورڈسورتھ بھی بلیک کی تخلیقات کو پاگل ذہن کی پیداوار سمجھتا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی اعتراف کرتا تھا کہ ـــ "اس شخص کی دیوانگی میں کوئی ایسی دلچسپ بات ضرور ہے جو لارڈ بائرن اور والٹر اسکاٹ کے صحت مند ذہن سے بلند اور برتر ہے"۔ بلیک کو خود بھی اس کا احساس تھا اور وہ اکثر کہا کرتا تھا "میں چھپا ہوا ہوں"۔

بلیک کی علامت نگاری کے ضمن میں Albert C. Baugh اپنی کتاب "اے لٹریری ہسٹری آف انگلینڈ" میں رقم طراز ہے :-

" بلیک کا ذہن غیر تربیت یافتہ تھا۔ اس میں کلاسیکی توازن اور برداشت کے عناصر مفقود تھے۔ اس کے دماغ کی مبہم تحریک "استعارہ" مانگتی تھی۔ وہ مشابہت سے زیادہ شناخت (Identification) کو دیکھتا تھا۔ مبہم وسیلوں سے حاصل کئے ہوئے اپنے شعری طریقۂ کار کو بلیک نے اپنے اس زمانے پر منطبق کرنے کی کوشش کی جو علامات میں سوچنے کا عادی نہیں تھا۔ اس کے تخیل نے حقیقت کے خلاف ہی حدود کی بغاوت نہیں کی بلکہ ان ذرائع سے بھی انحراف کیا جن کی مدد سے وہ بصیرت (VISION) کو

دوسروں کے سامنے واضح کرسکتا تھا۔ وہ اپنے متعلقات سے واسطہ رکھتا تھا۔ لیکن اُن میں سے
بہت تھوڑے حصے یا ٹکڑے کا ابلاغ کرتے ہوئے باقی کو بکھرے ہوئے اشاروں میں چھوڑ دیتا تھا
وہ سب دروازوں کو کھولنے کے لئے کوئی کنجی مہیا نہیں کرتا تھا ——— اُس کی علامت نگاری
(Y S mb [illegible]) ——— زمانہ، فاصلہ، دھندلاہٹ، الجھے ہوئے ناموں کی عجیب عجیب
صورتیں، عہدِ حاضر کے لوگ اور واقعات، ماضی کی شخصیتیں اور مختلف مقامات۔
——— سب کا احاطہ کرتی تھیں۔

یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ بلیک شعر کہتے وقت اپنے وجدان اور تخیل میں اتنا کھو جاتا تھا کہ مختلف
ذرائع سے حاصل کی ہوئی خیال کی برقی لپک، اور کئی سمتوں اور زاویوں میں دور تک پھیلی ہوئی اُس کی تیز رو کو وہ
چند اشاروں میں بیان کر کے تشنہ چھوڑ دیتا تھا اور یہ سمجھ لیتا تھا کہ قاری ان اشاروں کی تہہ کو پہنچ جائے گا۔
وہ شاعری میں وضاحت کا قطعی قائل نہیں تھا اسی لئے اس کی شاعری کا بیشتر حصہ آج بھی پوری طرح ذہن کی گرفت
سے باہر ہے۔ اُس نے اپنے دماغ سے تہہ دار اور دور از فہم علامتیں اختراع کی ہیں جن کی وجہ سے اُس کے شعری بیان
میں ایک قسم کا خلا پیدا ہو گیا ہے جو دھندلاہٹ اور ابہام کا باعث ہے

بلیک کی دو تقابلی نظمیں "دی لیمب" (بھیڑ کا بچہ) اور "دی ٹائیگر" (چیتا) علامت نگاری کی بہترین
مثالیں ہیں۔ بھیڑ کے بچے کو انسانی ذہن کی اُس کیفیت کا "سمبل" مانا گیا ہے جس میں معصومیت ہے اور جو رحمدل،
بے گناہ اور خوبصورت ہے۔ دوسری نظم میں چیتا انسانی دماغ کی اُس کیفیت کی علامت جو زندگی کے مخصوص تجربات
غم، ناامیدیاں اور بے انصافیوں سے عبارت ہے۔ یہ چیتے کی طرح ظالم، مضبوط اور مہیب صورت ہے۔ بھیڑ کے
بچے اور چیتے کی علامتوں میں خوبصورتی مشترک ہے۔ نظم "دی لیمپ" میں بھیڑ کے بچے کی علامت سے خدا کو بھی ظاہر کیا ہے
جو معصوم، رحمدل اور خوبصورت ہے۔ مثلاً

"اے بھیڑ کے بچے! تو جانتا ہے، کس نے تجھے بنایا ہے؟
کس نے تجھے زندگی دی ——— کھانا دیا؟
(چشمے کے کنارے ——— جہاں تو پھرتا ہے)
کس نے تجھے نرم کپڑے دئے؟ ——— (نرم اونی کپڑے ———)
کس نے تجھے شیریں آواز دی، جس سے تمام وادی گونجتی ہے؟

اے بچے ! میں بتاتا ہوں —
یہ سب چیزیں تجھے خدا نے دی ہیں
کیونکہ وہ بھی خود کو بھیڑ کے بچے کی طرح سمجھتا ہے
وہ بھی نرم دل اور معصوم ہے ! "

دوسری نظم " دی ٹائیگر " میں بلیک یہ کہتا ہے

" اے چیتے ! رات کے جنگل میں
تو چمک دار اور بپھرا ہوا ہے !
تیرے (جسم کے) خوفناک تناسب کو
کن ہاتھوں یا آنکھوں نے ترتیب دیا ہے !

جب ستاروں نے اپنے بھالے نیچے پھینک دے
اور اپنے آنسوں سے آسمان کو سیراب کر چکے
تو (اُس وقت) کیا خدا اپنی کائنات کو دیکھ کر مسکرایا ؟
کیا اُس خدا ہی نے — جس نے بھیڑ کے بچے کو بنایا — تجھے بنایا ہے ؟

بلیک نے بہت سی مختصر نظموں میں علامات سے کام لیا ہے ۔ مثلاً " دی سک روز " (بیمار پھول) اور " مائی پریٹی روز ٹری " (میرا خوب صورت گلاب کا درخت) میں محبت، غم، حسد اور رقابت کو علامتی پیرائے میں انتہائی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے

(بیمار پھول)

" اے پھول — تو بیمار ہے !
اُس پوشیدہ کیڑے نے ———
جو چنگھاڑتے ہوئے طوفان میں
رات کے وقت اڑتا ہے

تیری (پھول)، رنگین خوشی کے بستر کو پا لیا ہے
اور اس کی (کیڑے) سیاہ اور چھپی ہوئی محبت نے
تیری (پھول) زندگی برباد کر دی ہے ۔

("میرا خوبصورت گلاب کا درخت")

"مجھے ایک پھول پیش کیا گیا
ایسا پھول جسے "مئی" بھی پیدا نہ کر سکے
لیکن میں نے کہا :"میرے پاس ایک خوبصورت گلاب کا درخت ہے ۔"
اور میں شیریں پھول کے پاس سے گذر گیا

پھر، میں اپنے خوب صورت گلاب کے درخت کے نزدیک گیا
تاکہ دن رات اُس کی حفاظت کر سکوں
لیکن میرے گلاب (پھول) نے حسد کے جذبے کے ساتھ مجھ سے منہ موڑ لیا
اور اس کے کانٹے ہی میری خوشی بن گئے ۔"

اسی طرح ایک نظم "دی للی" میں بلیک واضح کرتا ہے کہ معصوم اور خوب صورت چیزوں میں کوئی نہ کوئی ایسا نقص ضرور ہوتا ہے جو اُن کی ذات میں دھبہ لگا دیتا ہے لیکن للی کا پھول مکمل خوبصورتی کی علامت ہے کیونکہ وہ پوری طرح معصوم ہے۔

"معصوم گلاب اپنے کانٹے پیش کر دیتا ہے
سیدھی سادھی بھیڑ اپنے سینگوں کو بڑھا دیتی ہے
لیکن ___ سفید للی کا پھول، جو محبت کی مسرت سے سرشار رہتا ہے
اپنی چمکدار خوب صورتی کے رنگ بکھیرتا ہے
کیونکہ اُس کے پہلو میں نہ کانٹا ہے اور نہ سینگ ۔"

بلیک کا رومانوی ذہن مذہب اور اخلاق کی بندشوں سے بیزار ہے۔ وہ ایسی فضا چاہتا ہے، جہاں انسان تمام قیود سے آزاد ہو کر اپنے ضمیر اور دل کی سچی روشنی میں زندگی بسر کرے۔ بلیک کی اکثر نظموں میں یہ عنصر موجود ہے۔ ایک نظم میں آوارہ اور آزاد پھرنے والے ایک لڑکے کو پیش کیا ہے جو چرچ (مذہب) پر تنقید کرتا ہے۔ لڑکا آزاد اور معصوم انسانی ذہن کی علامت ہے۔

اے میری پیاری ماں! چرچ انتہائی سرد ہے
لیکن شراب خانہ گرم، خوشگوار اور صحت مند نظر آتا ہے۔
—— اگر لوگ چرچ میں ہمیں کچھ شراب اور آگ
فراہم کر دیں، تو ہماری روح کو خوشی حاصل ہو سکتی ہے
تب ہم تمام وقت چرچ میں گائیں گے اور دعا مانگیں گے
اور کبھی بھی چرچ سے باہر بھاگنے کا ارادہ نہیں کریں گے

(باقی آئندہ)

بشیر بلّامی

سرسید کی نثر

ہمارے یہاں اسلوب، قسم (KIND) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً ہمیں یہ کہنا ہے کہ نثر کی مختلف قسمیں ہیں جیسے تمثیلی نثر، محاوراتی نثر، مرصع نثر اور سادہ نثر، تو عام طور پر ہم کہیں گے کہ نثر کے مختلف اسالیب ہیں مثلاً تمثیلی اسلوب، محاوراتی اسلوب، مرصع اسلوب اور سادہ اسلوب۔ جب تک اسلوب کے یہ معنی بھی ہیں ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کی تحریریں کسی ایک اسلوب کی مکمل پابند نہیں ہیں

اسلوب کا دوسرا مفہوم وہ ہے جسے (STYLE) کہتے ہیں، اس میں لکھنے والی کی شخصیت کا اظہار اتنا بھرپور اور اس کا طریقہ کار اتنا انفرادی ہوتا ہے کہ وہ کسی قسم کی نثر لکھے لیکن اس کی مختلف اقسام تحریریں اُسی کی معلوم ہونگی۔ یہ بات سرسید کی تحریروں پر صادق آتی ہے اگرچہ بنیادی طور پر اُن کی نثر سادہ، واضح، بیانیہ اور منطقی ہے لیکن موضوع کی تبدیلیوں کے ساتھ ان کا طریقہ کار اوپری سطح پر تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ان کی تحریریں بتاتی ہیں کہ انہوں نے بروقت ضرورت اُن طریقوں سے بھی مدد لی ہے جو تمثیلی یا محاوراتی یا شاعرانہ انداز کی نثر لکھنے والوں سے منسوب ہیں۔ کوئی اسلوب، جو موضوع سے ہم آہنگی نہ پیدا کر سکے اُس کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس بات کو مڈلٹن مرے نے بھی کہا ہے کہ خوش مذاقی کا تقاضا ہے کہ اسٹائل موضوع کے ساتھ بلند و پست کیا جا سکے۔ اسلوب کے سلسلہ میں بنیادی بات موضوع ہے۔ اس کے بعد شخصیت، نمایاں رجحانات، میلانات اور ضرورت اظہار ہیں۔

سرسید کی علمی، سیاسی اور سماجی اصلاحات کا تذکرہ اس مضمون کے حدود سے باہر ہے لیکن سرسید کی شخصیت اور وہ رجحانات و میلانات جو ان کی شخصیت کا جزو بن گئے تھے اپنے ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ان کی شخصیت کی ہمہ گیری کا اندازہ کرنے کے لئے اُن کی مختلف تصانیف کے بارے میں جاننا اس لئے ناگزیر ہے کہ انہیں کئی تصانیف کا ادب سے براہ راست تعلق (شاید) نہ ہو لیکن ان کے اسلوب کو شہت پہلو بنانے میں! زبان کو ادب زندگی کے لائق بنانے میں اُن تمام عناصر کا دخل ہے

(۱) جام جم (فارسی)، امیر تیمور سے بادشاہوں کا حال ہے ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔

(۲) جلاء القلوب بذکر المحبوب ۔ مولفہ ۱۸۴۲ء یہ رسالہ میلاد ہے ۔
(۳) تحفۂ حسن (۱۸۴۴ء) ۔ اس رسالہ میں شیعوں کے بعض نظریات سے اختلاف کیا گیا ہے
(۴) تسہیل فی جر الثقیل مطبوعہ ۱۸۴۴ء ۔ فارسی ترجمہ ہے ، بھاری چیزوں کو اٹھانے ، دبانے ، پانچ کلیں ہیں جن کی تفصیل ہے ۔
(۵) آثار الصنادید ۔ اس میں دہلی کی عمارتوں کا حال ہے جو ۱۸۴۷ء میں چھپی ہے ۔ پہلے قدیم طرز کی رنگین عبارت میں لکھوائی گئی تھی ، دوبارہ سادہ زبان میں لکھی گئی ۔
(۶) کلمۃ الحق ۔ ۱۸۴۹ء یہ رسالہ پیری ، مریدی اور بیعت کے خلاف ہے ۔
(۷) راہ سنت ور ردّ بدعت ۱۸۵۰ء یہ رسالہ اہل بدعت کے خلاف ہے
(۸) نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ ۔ (۱۸۵۲ء) (یہ فارسی زبان میں ہے)
(۹) سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء) ۔ راجہ یدھشٹر سے ملکہ وکٹوریہ تک ۲۰۲ بادشاہوں کا حال ہے
(۱۰) قول متین در ابطال حرکت زمین ۔ اس میں قدیم خیال کے مطابق زمین کی حرکت کی تھیوری کو غلط ثابت کیا ہے ۔ بعد میں اپنا یہ نظریہ بدل دیا تھا ۔
(۱۱) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار ۔ ترجمہ ۱۸۴۶ء ۔ فارسی سے "پرکار متناسبہ" کا ترجمہ کیا ۔
(۱۲) سیرت فریدیہ ۔ اپنے نانا دبیر الدولہ کے حالات لکھے ہیں ۔
(۱۳) تاریخ ضلع بجنور ۔ ضلع بجنور کی تاریخ ہے
(۱۴) تصحیح آئین اکبری ۔ ابوالفضل کی تصنیف میں کتابت وغیرہ کی وجہ سے جو غلطیاں عام ہو گئی تھیں اُن کی تصحیح کی ۔
(۱۵) تاریخ سرکشی بجنور ۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک واقعات غدر ہیں
(۱۶) رسالہ اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۸ء ۔ اس کتاب میں سرسید نے غدر کا الزام حکومت کی کوتاہی پر بتایا اور انگریزوں اور مسلمان میں جو نفرت کی خلیج تھی اسے کم کرنے کی بیحد کوشش کی ہے ۔
(۱۷) لائل محمڈنز آف انڈیا ۔ یہ اردو اور انگریزی دونوں میں شائع ہوئی ۔ جس میں مسلمانوں کو انگریزوں

---

1 THE rule of good taste is That your style be lowered or raised according your subject.

۲ داستان تاریخ اردو ص ۲۹۸ — ۲۸۶

قریب کرنے کی کوششیں تھیں ۔

(۱۸) تحقیقِ لفظ نصاریٰ ۔ انگریزوں کو یہ شک ہو گیا تھا کہ مسلمان انکی تحقیر کے لئے انھیں نصاریٰ کہتے ہیں اسمیں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے ۔

(۱۹) تصحیح تاریخ فیروز شاہی ۔ یہ فیروز شاہی کی تصحیح ہے جسے ضیاء الدین برنی نے تصنیف کیا تھا

(۲۰) تبئین الکلام ۔ اس میں بھی تفسیر انجیل اور تفسیر قرآن ہے ۔

(۲۱) علاج ہومیو پیتھک ۔ ۱۸۶۷ء میں لکھی

(۲۲) احکام طعام ۔ اس میں انگریزوں کے طریقہ طعام کی تعریف بھی ہے

(۲۳) سفر نامہ لندن ۔ اُن کے سفر لندن کا حال ہے

(۲۴) خطبات احمدیہ ۔ یہ خالص اسلامی کتاب ہے ۔ یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے ، اسلام پر جو اعتراضات ہوئے ہیں ان کا منطقی جواب ہے ۔

(۲۵) رسالہ ابطالِ غلامی ۔ غلاموں کے ساتھ اسلام نے کس حسن سلوک کا حکم دیا ہے اس کا بیان ہے ۔

(۲۶) تفسیر قرآن ۔ اسلام کے ہر عقیدے کو عقل کے معیار پر ثابت کیا گیا ہے ۔

(۲۷) النظر فی بعض المسائل ۔ چند مسائل اسلامی و قرآنی ہیں ۔

(۲۸) سفر نامہ پنجاب ۔ علی گڈھ کالج کے قیام کے سلسلہ میں پنجاب میں جو تقاریر کی تھیں وہ سید اقبال علی نے قلم بند کرلی تھیں

(۲۹) جواب اُمہات المومنین ۔ کسی دیسی عیسائی نے حضرت رسول کے تعدد ازدواج پر اعتراض کیا اس کا جواب ہے ۔

(۳۰-۳۱) انشاء اللہ ۔ نادان خدا پرست ۔ یہ دو مضمون قصّے کے انداز پر لکھے گئے ہیں ۔

(۳۲) مضامین تہذیب الاخلاق ۔ یہ رسالہ تین بار بند ہو کر گیارہ برس تک جاری رہا ۔ اس کے بیشتر مضامین سرسید ہی نے لکھے ہیں ۔ اس میں مذہبی ، اخلاقی اور قومی رحجانات کے ساتھ ساتھ منطق و فلسفہ سے بھی بحث کی ہے مگر بڑی بات یہ ہے کہ یہ مضامین اپنے تاثر ، جوش ، متانت ، جرأت ، شوخی ، ظرافت کی وجہ سے ادب کا جلوہ صدر رنگ ہیں ۔

(۳۳) خطوط سرسید ۔ اور (۳۴) مجموعہ لکچرز و اسپیچز ۔

ممکن ہے کہ اُن کی تصانیف کی یہ فہرست یہاں زیادتی سمجھی جائے مگر میرا خیال ہے کہ ۔ ثابت کردے گا کہ سرسید کے فکر و نظر کی دنیا نہایت وسیع تھی اس میں تاریخ ، مذہب ، کیمرہ

تہذیب معاشرت، سفرنامہ، قصہ گوئی، انشاپردازی، اصلاح اور ادب سب شامل تھے۔
اس لئے انھیں بہرصورت ایک ایسا اسلوب اپنانا تھا جس میں تاریخ، جغرافیہ، سیاست منطقی دلائل کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ ادبیت اور تخیل سائنسی حقائق کا پردہ نہ بن جائیں۔ مذہب، تہذ کے بیان میں موضوع خطابت، جوش ایمانی، عقلی اور منطقی دلائل کی متانت کا ساتھ دے سکے، اسی اصلاحی قصہ گوئی ہو (نادان خدا پرست) تو بیان میں وہ شوخی، دلچسپی، دلکشی آ سکے جو اس کے مطال پورا سکے۔ ایسے متنوع شخصیت کے لئے کسی ایسے اسلوب کا پابند ہو جانا جو کسی خاص موضوع ہی کے اور نکھرتا ہے، مناسب نہ ہوتا۔ مثلاً قصہ گوئی کے لئے محاوراتی اسلوب ناموزوں نہیں ہے لیکن محاورا بہرحال ثانوی چیز ہے۔ اصل چیز موضوع سے ہم آہنگی اور فنکارانہ بصیرت ہے۔ ورنہ صرف محاو کے استعمال کی وجہ سے راشد الخیری، میر امن اور نذیر احمد سے بڑے فنکار ہوتے لیکن سب جانتے میر امن اور نذیر احمد، راشد الخیری سے بڑے فنکار ہیں، اس لئے کہ ان کے یہاں محاورہ ذریعہ ہے، ا راشد الخیری کے کامیاب حصوں میں بھی یہی حال ہے لیکن کبھی کبھی محاوروں کی فہرست سازی، ذریعہ نہیں معلوم ہوتی ہے۔

اب ایک دلچسپ سوال یہاں اٹھ سکتا ہے کہ سرسید جب قصہ گوئی کرتے تو نذیر احمد کا اسلوب تہذیبی مرقع نگاری کرتے تو آزاد کا اتباع کرتے، تو یہ عرض کر دیا جائے کہ اسلوب، باہر سے لائی والی کوئی ہے۔ یہ پوری شخصیت کا موثر اظہار ہے

"Effectiveness of assertation is The alpha and omega of style" " Bernad shaw"

سرسید کا ذہن اس معاملے میں بالکل صاف ہے۔ ان کے یہاں موضوع کے ساتھ اسالیب بدلتے ر اور یہ ان کی خوبی ہے کہ کوئی اسلوب ان کی شخصیت پر حاوی نہیں ہوتا۔ ان کی تحریروں کے تجزیے سے یہ بات ہوگی کہ وہ اقلیدس کی سادہ نثر نہیں لکھتے تھے۔ ان کا سوز دروں تاثر پیدا کرتا تھا۔ یہیں سے ادبیت کی ا ہے۔ یہ بات سرسید کو خود معلوم تھی جس کا اظہار انہوں نے شبلی کی المامون (طبع ثانی) کے دیباچہ میں
اردو زبان نے بہت ترقی کی مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان کا طرز جدا گانہ ہو۔ تاریخ کی کتابوں ~~میں ناول~~ یا قصہ اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کسی ہی فصاحت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔ لارڈ میکالے جو انگریزی زبان کا ادیب ۱۰ رکھی مضامین یا اعتبار فصاحت و بلاغت اپنا جواب نہیں رکھتے مگر شاعرانہ

طرزِ ادا کی وجہ سے تاریخی اصلیت کو بہت کچھ نقصان پہنچانے والے ہیں ۔
حامد حسن قادری مصنف "داستان تاریخ اردو" کا کہنا ہے کہ پوری انیسویں صدی میں اپنے موضوعات کے تنوع اور ضخامت و حجم کے لحاظ سے (ان کی تصنیفات) اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔ سرسید نے ایک جگہ مضمون اور اسلوب بیان کی ہم آہنگی کو قرآن پاک کے حوالے سے واضح کیا ہے ۔ اُن کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں موضوع کے ساتھ اسالیب میں بھی ہلکے گہرے اور متنوع رنگ آتے ہیں ۔ موضوع اور اسلوب کی مکمل اکائی بھی اعجاز ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں ۔

ادائے کلام بمقتضائے اس مضمون کے ہوتا ہے جو ادا کیا جاتا ہے نعیم جنت اور عذاب جحیم ایک طرز کلام سے ادا نہیں ہو سکتے اور نہ ایک طرزِ ادا پر مقتضائے فصاحت و بلاغت ہے جس وقت کہ ایک مضمون قہر آلود زجر و توبیخ کا بیان کیا جاتا ہے ۔ اس کے الفاظ اور لفظوں کی ترکیب اور فقروں کی ترکیب دوسری طرح کی ہوتی ہے ۔ اگرچہ جب لوگ اس کو پڑھتے ہیں تو اس وقت صرف وہ لفظ ہی موجود رہتے ہیں اور جس لَون سے الفاظ ادا کئے گئے ہیں وہ لَون موجود نہیں ہوتی مگر اس کے الفاظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب اس قسم کی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں وہی لَون پیدا کرتے ہے اور جب کوئی مضمون محبت و شفقت اور رحم و عفو کا بیان ہوتا ہے تو اس کے لفظ اور لفظوں کی ترتیب اور فقروں کی ترکیب جدا قسم کی ہوتی ہے ۔ اور جب کوئی واقعہ یا حالات بیان کئے جاتے ہیں تو اس کے الفاظ نہایت سادہ اور عبارت سلیس اور سہل ممتنع ہوتی ہے۔[1]

سرسید اصولی اور عملی طور پر کسی مخصوص اسلوب میں خود کو محدود نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ وہ نثر کو خیال کی زبان سمجھتے تھے لیکن اقلیدس کی زبان بھی خیال کی زبان ہے تو بہتر یہی ہوگا کہ اب ہم سرسید کے مختلف مضامین سے کچھ اقتباسات لیں اور ان کا تجزیہ کریں ۔ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء کے پہلے پرچہ میں لکھتے ہیں ۔

" اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے ہندوستان کے مسلمان کو اول درجہ کی سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے ، تاکہ جس حقارت سے سویلیزڈ یعنی مہذب قومیں انکو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے اور وہ بھی مہذب قومیں کہلائیں ۔"

طوالت کے خیال سے اقتباس مختصر دیا گیا ہے لیکن تمام مضمون میں ایک مسئلہ کی تعریف اور وضاحت ہے کہ ہم نے تہذیب کے کیا معنی سمجھے ہیں چونکہ موضوع خالص علمی ہے اس لئے لہجہ بھی علمی ہے جس میں ایک تعمیر

---

[1] مضمون بہ نسبت تنزل علوم دینیہ و عربیہ و فلسفہ یونانیہ ۔

مدلل، اور منطقی فکر و اظہار ہے جو اچھی نثر کی بنیادی شرط ہے لیکن اس میں وہ غیر جانبداری یا بے تعلقی
جو جومیٹری کے کسی مسئلہ کی وضاحت کرنے والے کی زبان میں ہو سکتی ہے۔ اس میں مصنف کے
اپنے قوم کا درد بہرصورت محسوس ہوتا ہے اور یہی "تاثر" اسے ادبی بناتا ہے۔
علامہ اقبال کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے

بات صاف ہے کہ "مے" کا کردار اس کی تیزی ہے۔ نثر میں کمال فن کا جوہر دکھانا گویا مے کو شیشے
دکھنا ہے لیکن اس سے مے کی تیزی نہیں بڑھتی۔ ہاں اگر مے میں تیزی ہے تو وہ خواہ مٹی کے سبو میں ہو یا
صراحی میں کوئی حرج نہیں اور غالباً شیشے کی صراحی میں ذرا لطف دے گی اسی طرح نثر میں منطقی فکر و دلائل
انضباط حقائق، کیفیت، بالیت اور بہرحال جس پہلو سے تو وہ ادبی ہے۔ یہ صفات خواہ بغیر کسی شاعرانہ حسن کا
مدد سے آئی ہوں یا تشبیہہ و استعارہ، مبالغہ، تکرار سے پیدا کی گئی ہوں۔ شرط اول یہ ہے کہ خیا
کی وضاحت، تشکیل اور موزوں اظہار پہلے ہو۔
تہذیب الاخلاق کی اشاعت ۱۸۷۱ء کے پہلے شمارے میں لکھتے ہیں

"الحمد للہ کہ ۱۲۸۷ھ پورا ہوا، ۱۲۸۸ھ شروع ہو گیا۔ ہمارے اس پرچہ کو جاری ہوئے سوا تین برس
ہو گئے۔ پچھلا سال بھی خندۂ گل و نالۂ بلبل سے خالی نہ گیا۔ ہمارے آہ و نالے نے بدستور غلغلہ رکھا۔
اور ہمارے ناصحان شفیق بھی شور و شغب کم نہ ہوا۔

حسن شہرت، عشق رسوائی تقاضا می کند	جرم معشوق و گناہ عاشق بیچارہ نیست

ــــ ــــ ــــ اس کے مضامین ظاہرا تو جناب حاجی مولوی سید امداد علی صاحب بہادر کے
طبع زاد معلوم ہوتے ہیں مگر بعض لوگ ان مضامین کو لے پالک بتاتے ہیں بہرحال ہم کو اس
سے کیا کہ وہ میاں نذیر کے ہیں یا میاں بغیر کے کسی کے ہوں، مگر دلچسپ ہیں، خدا انکی
عمر دراز کرے۔

اس سے قبل جو اقتباس دیا گیا تھا اس کی متانت اور فکر کا مطالبہ تھا کہ منطقی غور و فکر سے کام لیا جائے
اس اقتباس میں عرض حال ہے۔ مخالفین کی مخالفت، اور اپنی کامیابی کا اظہار ہے۔ اس کے لئے خندہ گل نالۂ بلبل کے
استعارہ سے مدد لی۔ ایک خاصا عاشقانہ شعر بھی پڑھا جس سے حقیقت بھی ظاہر ہو گی اور قاری کو اپنی شگفتہ مزاجی

شوخی بیان اور ہلکے طنز سے اپنایا بھی یعنی یہ عنادیہ مضمون اس سے زیادہ پر لطف انداز میں اثر انداز بالکل ہوتا اگر یہ لکھ دیا جاتا کہ گذشتہ سال بھی ہم قوم کو جگانے کی سعی کرتے رہے اور مخالفین ہمارے اس کار نیک کی مخالفت کرتے رہے۔

مضامین کو بے مالک کا استعارہ دیا۔ جو کیسا چمکتا ہے۔ پھر کسی کے ہوں؟ کا فقرہ، گفتگو کی اپنائیت رکھتا ہے۔ تمثیلی اسلوب کا پہلا کامیاب نمونہ وجہی نے سب رس میں پیش کیا۔ جس میں تکرار ہے اور دلنشیں ہے۔ تشبیہات ہیں اور توانائی سے ترنم پیدا کیا گیا ہے۔ تمثیل کے لئے یہ اسلوب مناسب ہے۔ ہر زبان کے ابتدائی ادب میں تمثیل (ALLEGORY) نے ادب کو آگے بڑھایا ہے اسلئے کہ ذہن انسانی مجرد مسائل کی دنیا میں پرواز کر سکے اور اسے کسی سہارے کی ضرورت نہ پڑے، مشکل کام ہے۔

بقول اقبال ؎ خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر

آج بھی جب کسی بڑے خیال یا وسیع کینوس پر ناول لکھا جاتا ہے تو تمثیل نگاری مددگار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "آگ کا دریا" ـــ کسی مجرد خیال کو براہ راست بیان کر دینے میں دو خطرے ہیں۔ پہلی بات کہ وہ قاری کو متوجہ نہ کر سکے اور دوسری بات یہ کہ اگر سمجھ میں آ بھی جائے تو وہ احساس جمال اور بصیرت نہ دے سکے جو صرف ادب کا مقدر ہے۔

اب سرسید کے مضمون "امید کی خوشی" کی تمثیل نگاری دیکھئے

"او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید! یہ خدائی زدشتی تیرے ہی ساتھ ہے، تو ہی ہماری مصیبتوں کے وقت ہم کو تسلی دیتی، تو ہی آڑے وقتوں میں کام آتی ہے، تیرے ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں، تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں، تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لئے، نام آوری نام آوری کے لئے، بہادری بہادری کے لئے، فیاضی فیاضی کے لئے، محنت محنت کے لئے، نیکی نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں۔"

اس اقتباس کا تجزیہ ثابت کرتا ہے۔

"یقین" کو نورانی چہرے والا کہہ کر اور امید کو اس کی اکلوتی بیٹی کہہ کر تجسیم کر دینا شوق انشا پردازی نہیں تھا بلکہ یقین ایک مہربان بزرگ ہے جسکی نورانی ڈاڑھی ہے جو ایک روحانی پیکر ہے۔ اس

اس بزرگ نورانی پیکر کی " اکلوتی خوبصورت بیٹی " کا جو حسن تقدیس کا ایک نسوانی پیکر ذہن میں پیش کیا
اس احساس جمالی کی آسودگی کرتا ہے جو ہر ادب کے قاری کا مطالبہ ہے۔ آٹھ بار روشنی کو تو بار
نہیں کہا گیا ہے۔ یہ تکرار اس پیکر کو پڑھنے والے کے اور قریب کر لی ہے۔ اسی طرح
فقروں میں جو بات کہی گئی ہے وہ ایک طویل جملے میں اس طرح لکھی جا سکتی تھی کہ ایک ضمیر ا
سے کام چل جاتا۔ لیکن یہاں مقصد صرف " نیکی " " امید " کے بارے میں کوئی منطقی اور معلوماتی بیان
تھا اگرچہ اس حسن کاری تحریر کی قوت وہی منطقی انداز ہے جو امید کی افضلیت بیان کر رہا ہے
والے کے دل و دماغ کو پیکر تراشی، صوتی آہنگ، غیر محسوس ہونے والی قافیہ بندی سے بھی متاثر
اب یہ صرف ایک معلوماتی بیان نہیں ہے بلکہ لکھنے اور پڑھنے والے کے جذبات سے بھی ملاقات ہے
سر سید نے دلی کی عمارتوں کی تاریخ و تفصیل آثار الصنادید کے نام سے لکھی ہے۔ اس کا مقصد
عمارتوں کی تاریخ و تفصیل دینا ہے پھر ہم ادب میں کیوں شمار کریں۔ ایک اقتباس دیکھ لیں۔

" جامع مسجد دہلی کے " دروازہ شمالی کی طرف ۳۹ سیڑھیاں ہیں۔ اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیٹھے
ہیں اور سودے والے اپنی دکان لگائے ہوئے ہیں لیکن بڑا تماشا اس طرف مداریوں اور قصہ خوانوں
کا ہوتا ہے۔ تیسرے پہر قصہ خواں مونڈھا بچھائے ہوئے بیٹھتا ہے اور داستان امیر حمزہ کہتا ہے
کسی طرف قصہ حاتم طائی اور کہیں بوستان خیال ہوتی ہے اور صدہا آدمی اس کے سننے
کو جمع ہوتے ہیں "

اس اقتباس میں جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ کمال خوبی سے ادا ہو جاتی ہے۔ بظاہر اس میں
ادبیت نہیں۔ اس لئے کہ تکرار، مبالغہ، تشبیہہ و استعارہ کچھ بھی تو نہیں۔ لیکن آپ ذرا غور کریں تو تین
ایسے ہیں حسن کاری لیے اور قافیہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا التزام نہیں کیا ہوگا اور ہماری کو
آپ ہی آپ ایسے " التزامات " آجاتے ہیں لیکن یہ فطری ہیں۔ اس وقت ہوتا ہے جب " مرصع کاری "
ہو جائے اور جو کہنا ہے وہ ثانوی درجہ اختیار کر لے۔ یہ بات تو میں نے خود ہی مان لی
آگیا اور یہ کسی جغرافیہ کی کتاب میں آ سکتا ہے پھر ہم اسے ادبی کیوں کہیں۔
یہ اس لئے ادبی ہے کہ اس میں لکھنے والے کا تاثر شامل ہے۔ مثلاً یہ دو لفظ بڑا تماشا ثابت کرتے ہیں
اس سلطنت میں وہ شریک ہے اور ہمیں شریک کر رہا ہے۔ پھر سارے بیان کی فضا محاکاتی ہے لیکن بنیادی
بات یہی ہے کہ دروازہ شمالی کی طرف ۳۹ سیڑھیاں ہیں جہاں سودے کی دکانیں ہیں، مداری اور قصہ خواں
ہیں۔ قصہ خواں امیر حمزہ، حاتم طائی اور بوستان خیال کی داستانیں پڑھتے ہیں۔ سر سید کی دی ہو

ساری اطلاعات کافی کم الفاظ میں آگئیں لیکن کیا اس طرح ہم اس لطف میں شریک ہوئے جو سرسید کے اقتباس میں ملتا ہے۔ اسی لئے سرسید کی یہ معلوماتی نثر بھی ادبی نثر ہے۔ اسی لئے مولانا حالی نے حیات جاوید میں ان کی طرز تحریر کے بارے میں لکھا ہے کہ "ہر شاخ میں وہی پیرایہ بیان پایا جاتا ہے جو اس کے لئے موزوں ہے۔ اور یہ اسلوب بیان موقع اور موضوع کے اعتبار سے اپنا طریقہ کار بدلتے رہتے ہیں: حیاتِ جاوید میں مولانا حالی لکھتے ہیں

"واقعات وحالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچتے تھے کہ جو برائیاں اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہیں ان کی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے"

مثال کے طور پر مسلمانوں کے پرانے طریقہ طعام کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ انگلی چاٹنے والے مناظر دکھا کر ایک طرح کی کراہیت پیدا کرتے ہیں، مقصد اصلاح ہے اور اس کے لئے سیرا راست طریقہ موثر نہ ہوتا اسی طرح بحث و تکرار کتوں کی جنگ کا منظر اس طرح کھینچا ہے کہ اگر انسان کو بحث و تکرار کے موقع پر وہ مضمون یاد آجائے تو آئینہ کا کام دے، یہ کام آسان بھی نہیں ہے۔ کتوں کی حرکات و سکنات کا یہ مشاہدہ اور پھر کامیاب بیان اُن کے مشاہدہ میں نظر کا ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہو

"جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے اور پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چڑھ کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عجیب آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹیٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو جھنجوڑا جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا"

— سرسید کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ یہ چند جملوں کا اقتباس اُن کی قصہ گوئی کا اچھا نمونہ ہے۔ ان چند جملوں میں جہاں کتوں کی جنگ کا محاکاتی نقشہ ہے اس میں ہر لحہ بدلتی ہوئی کیفیت کا "اور" سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اس مختصر تحریر میں ۹ بار اور لکھا ہے وجہ نہیں "اور" کی یہ تکرار جہاں تحریر کو گفتگو کا لہجہ دیتی ہے وہیں منظر میں جو ہر لحہ تیزی اور حرکت ہے اُس کی وضاحت کرتی ہے۔ چند فقروں



دیتے ہیں اور تاثر پیدا کرتے ہیں جملے چھوٹے چھوٹے ہیں ۔ یہ انداز کمرے میں گفتگو کا ہے، کسی بڑے ہال میں تقریر کرنے کا نہیں ہے ۔

رسم و رواج میں ایک جملہ یوں ہے " ہماری قوم کے نیک اور مقدس لوگوں کو کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ تہذیب اور حسن معاشرت صرف دنیاوی امور ہیں "

اس میں اپنی بات کتنی وضاحت اور صفائی سے کہدی گئی ہے ۔ " نیک اور مقدس لوگوں " میں جو ہلکا سا طنز ہے وہ ادب کا مہذب اسٹائل ہے ۔

تعصب میں لکھتے ہیں

" دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں "

یہ جملہ اس طرح بھی لکھا جا سکتا ہے " دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے خود ہی تمام کمالات خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں " مگر ان کے جملے میں جو وضاحت اور تشریح ہے وہ ان کے ابلاغ کو کامیاب بناتی ہے اور اپنے حلقہ اثر کو وسیع کر لینے کے لئے ان کے یہاں تمام علمی مسئلے کے لئے بھی تشریحی اور تفصیلی انداز ہے ، اس میں اپنائیت کبھی " اے صاحب " کہہ کر پیدا ہوتی ہے ۔ کبھی ایک بات کی نفی کر کے اس کی تعمیر ہوتی ہے جیسے

" ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ کچھ چیز نہیں بجز اس کے کہ انسان کی حالت کی تصویر ہے جس کا ہر شعر دل میں گھر کر جاتا ہے بجز اس کے کہ اس نے انسان کا نیچر یعنی قدرتی بناوٹ طبیعت کو بیان کیا ہے جو نہایت موثر انسان کی طبیعت پر ہے "

ان کے یہاں حشو و زوائد بھی ہیں ۔ اضافت کی غلطی بھی ہے ۔ اس عبارت میں "بناوٹ طبیعت" یقیناً غلط ہے ۔ (اس اضافت کے سوا اور کوئی مفہوم نہیں نکلتا) لیکن وہ اپنی بات کہہ گئے ہیں ۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ گرامر ان کے مقصد کی تکمیل میں حارج نہیں ہو سکتی تھی اور جس طرح غالب نے اپنی زبان بنائی تھی اسی طرح سر سید نے بھی اپنی زبان بنائی اور رجوع مروجہ گرامر اور دیگر قیود سے آزاد ہونے کی بھی کوشش کرتی ہے ۔ اسی طرح ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنے مضمون "سر سید کا اثر اردو ادبیات پر" میں لکھا ہے ۔

شاید یہ بھی پہلی ہی مرتبہ احساس ہوا کہ ادب کی تخلیق میں قاری کا وجود بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے

اور دل میں بیٹھے ، سرسید کے اس تصور میں قاری کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی خود ادیب کو "

پروفیسر آل احمد سرور کا بھی یہی خیال ہے

ان کے پاس بے شمار خیالات تھے جنہیں لوگوں تک پہونچانے کا کام انہوں نے اپنے ذمے لیا تھا وہ اُن خیالات کی اہمیت اور صداقت محسوس کرتے تھے ۔ وہ ایک تبدیلی چاہتے تھے وہ اس تبدیلی کی اہمیت جتانے کے لئے بے تاب تھے ۔ خلوص، شدید جذبے اور خیالات کی تازہ کاری نے اُن کے مضامین اور کتابوں میں ادب کی روح پھونک دی ہے اور اُن کے سیدھے سادے الفاظ میں ایک نشتریت اور کھنک پیدا کردی ہے ۔ بڑے مقصد اور پُر خلوص اظہار نے اُن کے اسلوب میں عظمت پیدا کردی ہے ۔ انہوں نے خیالات کے پُر اثر اور دل نشیں ہونے کے لئے جا بجا تمثیلیں استعمال کی ہیں قصّے لکھے ہیں، لطیفے بیان کئے ہیں ، پرانے اور نئے واقعات سے مدد لی ہے اس طرح وہ نہ صرف اپنے مضمون کو پڑھنے والے کے دل میں اتار دیتے ہیں بلکہ تکرار کی مدد سے ایک نقش جما دیتے ہیں "

۔ پروفیسر سرور صاحب نے ان کے یہاں جو نشتریت اور کھنک محسوس کی ہے وہ دراصل جذبہ خلوص ہے جس کا اظہار ، وجدان کی برابری کرنے لگے تو بقول کروچے اسٹائل وجود میں آتا ہے موجودہ نثر جو حالی اور مولوی عبدالحق سے ہوتی ہوئی آج کی اچھی نثر ہے وہ اس کا سلسلہ سرسید کی اس نثر سے ہے جس میں منطقی فکر، تشکیکی اظہار ، وضاحتی اور تشریحی انداز ہے لیکن جس کی بنیاد خلوص، سادگی اور سچائی ہے ۔ جس میں بیان و ادب کے بھی حسن شامل ہو سکتے ہیں لیکن انھیں نثر کی بنیادی خصوصیات کو اور واضح کرنا ہو گا ۔ سرسید کی نثر کسی ادبی حسن کو نثر کی نثریت کی قیمت پر قبول نہیں کرتی ، اس کی سلامتی کا یہ بھی ایک راز ہے۔

انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر جدید اردو نثر کا آغاز ہوا کالج سے باہر دیگر مرکزوں میں بھی انفرادی طور پر نثر کی کتابیں لکھی گئیں ۔ میر امن ۔ رجب علی بیگ اور مرزا غالب کے ... صرف تاریخی اہمیت ہی نہیں رکھتے بلکہ تین اہم اسالیب کی مثالیں ۔ لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ ... تو میر امن کا محاوراتی سادہ اسلوب، اس وقت رجب علی بیگ کے مرصع اسلوب کے مقابلہ

سم علی الہاشمی

خزاں کا موسم

یہ موسم کہر کا ہے میٹھے پھلوں کا
جوانی کو سورج ہے جن کا سہارا
بھرے اور بڑھے بس یہ سازش ہوا کی
یہ انگور کی بیل غاروں پہ پھیلی
مکانوں میں کائی لگے جو شجر ہیں
پھلیں اور بھرپور پختہ ہوں شاخیں
بڑے ہوں کدو اور ہیزل کی بادامی
مزیدار ہو مغز کلیاں اُبھرتی
بہت پھول ہوں شہد کی مکھیو نکلے
جو سمجھیں خزاں کا یہ موسم نہ جائے
کہ گرمی نے ان کے ملائم گھروں میں
بہت چپچپا رس بھرا ان دنوں میں
سبھی نے تجھے تیرے چھتے پہ دیکھا
جو نکلا کوئی گھر سے باہر تو پایا
کہ بیٹھی ہے اک کھیت پر بے خبر سی
ہوا سے ہے جنبش ترے بال و پر کی
کٹے کھیت کی نالیوں پر بھی سوتے
نئے پوست کے پھول سے مست ہوتے
کٹی گھاس کے ڈھیر کو چھوڑ جاتے
تمام اُگتے پھولوں سے دامن بچاتے
کبھی جیسے ہوں کھیت کے چننے والے
بھرے سر سے نالے کے اُس پار بیٹھے
کبھی سیب کے عرق کی کل پہ بیٹھے
بڑے صبر سے آخری رس کو تکتے
کہاں ہیں بہاروں کی موسم کے گانے؟
تجھے فکر کیا تیرے گانے سہانے
ٹھہرتا ہوا ابر ڈھلتا ہوا دن
گلابی ہے ٹھونٹھوں پہ بیٹھی ہو ساکن
وہ ماتم کی گاتے ہوئے راگ مچھر
گزرتے ہوئے بید دریا کے اوپر
ہوا کی اُلٹ پھیر سے گرتے پڑتے
وہ چشموں پہ ہیں میمنے شور کرتے
وہ جھاڑی کے جھینگر بھی اب گا رہے ہیں
اُدھر باغ میں بلبلوں کی ملاریں
ابابیل کے جھنڈ دیتے ہیں سیٹی
اُڑان ان کی جا کر فلک بوس ہوتی

میں کہیں کم ادبی خیال کیا جاتا تھا دوسرے عالمانہ و فلسفیانہ، مشن سیاسی، ادبی اور مذہبی مضامین کا بار پوری موزونیت سے نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ غالب کے خطوط کی اہمیت، اور انفرادیت مسلم لیکن نہ یہ ان کا اتباع ممکن تھا اور نہ یہی زندگی کی تمام ضرورتوں کے لئے وہ موزوں تھا۔ سرسید کے اسلوب میں تنوع، ہمہ گیری، لچک اور ارتقا ہے۔ اسی لئے وقت کے ساتھ اس میں پھیلاؤ آتا رہا۔

یہ سچ ہے کہ سرسید کی جامعیت حیرت انگیز ہے۔ وہ صرف ادب ہی کے آدمی نہ تھے۔ ان کے پاس کام بہت اور وقت کم تھا۔ اسلئے وہ فنی ریاضت، غور و فکر جو کسی اسلوب کی تراش خراش کے لئے ضروری ہوتی ہے وہ اُن کے یہاں عام طور پر نہیں ہے۔ انہوں نے زندگی اور علم کے بہت پہلوؤں پر لکھا۔ اس مضمون میں ان کے اسلوب کے مختلف نمونوں کے جو تجزیے کئے گئے ہیں، وہ اُن کے نمائندہ رجحانات اور میلانات کی وضاحت ہیں۔ ان اقتباسات سے بہتر یا ان سے کم کہیں کم اور کمزور، کھردرے اقتباسات بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن کسی کی قدر قیمت کا تعین اس کے اصل جوہر پر ہوتا ہے نہ کہ اس کی محض کمزوریوں پر۔ تمیز کی میرٹ اُن کے نمائندہ کلام پر ہے۔ اُن کے کمزور اور پست اشعار پر نہیں، اس لئے اس اعتراف سے سرسید کی ادبی اہمیت کم نہیں ہوتی کہ اُن کی مصروفیت نے شاید ہی انہیں اپنی تحریروں کی نوک پلک سنوارنے کا موقع دیا ہو۔ اس لئے کہیں کہیں کوئی سقم یا کھردرا پن بھی رہ گیا ہے۔ لیکن اُن کے نمائندہ اسلوب کی تحریریں وہی ہیں جہاں اُن کی شخصیت، ابلاغ و اظہار ہو گئی ہے۔ تخلیق کا یہ عمل کسی تراش خراش کے بغیر بھی کامیاب ہو سکتا ہے

اس باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ سرسید کے اسلوب میں وہ وسعت اور لچک ہے جو ادب و زندگی کی بہت بڑے بساط کا احاطہ کر لیتی ہے۔

۱۹۷۱ء
شمارہ نمبر ۴

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ	بارہ روپے
قیمت فی پرچہ	تین روپے

مالک انجمن ترقی (اردو ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی ہند علیگڑھ شائع

اردو ادب

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	سرسید کے نام رفقائے سرسید کے غیر مطبوعہ خطوط	اصغر عباس	۵
۲	صوبۂ بمبئی کے قدیم اردو مطابع و مطبوعات	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی	۵۳
۳	میکبتھ کا منظوم ترجمہ	رحم علی الہاشمی	۶۳
۴	یادوں کی برات (تبصرہ)	ذکار الدین شایاں	۱۲۵

اصغر عباس

سرسید کے نام رفقائے سرسید کے غیر مطبوعہ خطوط

سرسید اور ان کے رفقاء ہماری تاریخ کے وہ مشاہیر ہیں جنہوں نے شدید مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں جدید تعلیم اور فعال زندگی کا چراغ جلایا اور اپنے ہم کیشوں کے لئے عزت مندانہ زندگی کا کبھی نہ مٹنے والا نقش قائم کردیا۔ یہی وہ لوگ تھے جو زندگی کے دھارے کا رخ موڑنے اور زمانے کے تقاضوں کو پہچاننے کا سلیقہ جانتے تھے۔ انہوں نے وقت کا مزاج پہچان کر اُسے زندگی کا وہ خاکہ قبول کرنے کی دعوت دی جس میں تجدد اور نئی اقدار کی آب و تاب تھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ زندگی کرنا مقدس ترین فریضہ ہے اور اس میں نئی قدروں کی افادیت مسلم۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو نئی نسل کی سمتِ سفر متعین کرنے میں ان بزرگوں کا بیش قرار حصہ ہے۔

اس لئے رفقائے سرسید کی تحریریں ہمارے لئے زندہ فیضان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ اُس زمانے کے مختلف احوال و وقائع کی حقیقی حیثیت متعین کرنے میں ہمیں رفقائے سرسید کی تحریروں سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ پھر علی گڈھ تحریک کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے جزئیات کا علم بھی ضروری ہے۔ رفقائے سرسید کے جو خطوط پیش کئے جا رہے ہیں ان کے تانے بانے سے بہت سی ایسی تصویریں بنیں گی جو آج کے قاری کو علی گڈھ تحریک اور اس عہد کے سمجھنے میں کچھ مدد دیں گی۔ ان خطوط کے ذریعہ سے ہمیں مکتوب نگاروں کے پبلک حالات سے لے کر ذاتی رجحانات کا صحیح حال معلوم ہوسکتا ہے اور ان کے کارناموں کی تفسیر و تشریح میں بھی آسانی ہوسکتی ہے۔ ان خطوط میں موضوعات کی رنگا رنگی نہیں بلکہ اس قدر کی تکرار ملتی ہے جسے قوم کی محبت کہتے ہیں

یہ خطوط علی گڈھ تحریک کے کارواں سالار اور روحِ رواں سرسید کے نام لکھے گئے ہیں۔ خطوط کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ جن لوگوں کے خطوط پہلے سنہ میں لکھے گئے ہیں ان کے خطوط پہلے درج کئے گئے اور جن کے بعد کے سنہ سے شروع ہوتے ہیں انھیں بعد میں درج کیا گیا ہے۔ مکتوب نگاروں کے

مختصر حالات زندگی اس طرح درج کئے ہیں جس سے علی گڑھ تحریک اور سرسید سے ان کے روابط کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ یہ خطوط آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ مخطوطات سے دستیاب ہوئے ہیں۔ راقم آزاد لائبریری کے شکریہ کے ساتھ یہ خطوط شائع کر رہا ہے۔

خطوط مولوی عنایت رسول چریا کوٹی[1]

(۱)

بسم اللہ

جناب مولوی صاحب مخدوم معظم عصر و مطاع و مکرم دامت برکاتکم

بعد سلام مسنون و اشتیاق ملاقات کے مدعائے ضروری یوں گذارش ہے کہ تاریخ ۲۹ ماہ اگست کو عنایت نامہ آپ کا پہونچا حال معلوم ہوا درخواست چندہ رایان عالی قدر سے مری دانست میں مناسب و صواب ہے لہذا سکریٹری کو اجازت واسطے درخواست چندہ کے رایان عالی شان سے تنہا ضرور لیس جس قدر مضمون دفعہ ۱۶ منافی رئیس مقصود کے ہو اوس کی ترمیم لازم فقط میں جب سے یہاں آیا ہوں بطور مناسب اس مقصد میں کوشش کر رہا ہوں کوئی منکر یا معترض نہیں ہے بلکہ بعد دریافت منافع دینی و دنیاوی جو اوس پر مترتب ہیں حالت وجد ہوتی ہے اعظم گڑھ میں بھی لوگ بہت آمادہ و مستعد ہیں پہلے تو لوگوں کی رائے کچھ کم دینے کی تھی لیکن بعد دیکھنے فہرست چندہ جو درج

---

[1] مولوی عنایت رسول چریا کوٹی کو سرسید ایک خط میں لکھتے ہیں "بارش شروع ہوگئی ہے۔ اس موسم میں آپ کا ارادہ یہاں تشریف لانے کا ہے یا نہیں۔ اگر ہو تو مجھ کو اطلاع فرما دیں تاکہ میں ایک ملازم آپ کے پاس بھیجدوں تاکہ وہ آپ کو ساتھ لے کر یہاں آجاوے" ایک اور خط میں سرسید لکھتے ہیں

"آپ تو علیگڑھ تشریف نہیں لاتے ناچار مجھ کو چڑیاکوٹ آنا پڑے گا اور پوٹ کی پوٹ آپ کی تصنیفات کی جو آپ نے باندھ باندھ کر رکھ چھوڑی ہے سب اٹھا لاؤں گا۔"

ان خطوط سے سرسید اور مولوی عنایت رسول کے روابط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

قاضی علی اکبر کے فرزند مولوی عنایت رسول چڑیاکوٹی ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ کی تحصیل مولوی احمد علی چریا کوٹی، ملا فضل رسول بدایونی اور مولانا حیدر علی رامپوری سے کی۔ عبرانی زبان سیکھنے کے شوق میں کلکتہ گئے اور وہاں یہودی علماء سے عبرانی زبان کا علم حاصل کیا اور توریت و زبور کی آیات سے ان البشارات

اخبار ہوئی ہے صدر الصدور ضلع و تحصیلدار و منشی محمد اکرام وغیرہ سو سو روپیہ دینے کا قصد رکھتے ہیں۔ دیدہ باید کہ چہ از پردہ برون می آید

من اللہ التوفیق والسلام

سید احمد[1]

۲۹ رماہ اگست سنہ ۱۸۷۲ء

(۲) ۲ ھ

مخدوم و معظم عنایت فرمائے نیاز مندان دامت برکاتکم

بعد سلام مسنون و اشتیاق ملاقات کے مدعا ئے ضروری یہ ہے کہ عنایت نامہ درباب تہذیب الاخلاق کے پہونچا حال معلوم ہوا۔ میرے نزدیک خرید کرنا دیہات زمینداری مناسب ہے بلاشبہ دفعہ ۲۰ قواعد کمیٹی ترمیم ہو اور نسبت تبدیل نام کے اگرچہ خفیف ہے مضائقہ نہیں۔ لفظ دار العلوم

اور پیشین گوئیوں کو جو آنحضرت صلعم کے بارے میں تھیں جمع کیا جو ۱۹۳۲ء میں لندن کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ ۱۸۶۲ء میں جب سرسید غازی پور پہنچے تو یہاں انھوں نے علاوہ سائنٹیفک سوسائٹی اور ایک مدرسہ کی تاسیس کے تبیین الکلام کا آغاز کیا۔ یہیں ان کی ملاقات مولوی عنایت رسول سے ہوئی۔ تبیین الکلام توریت و انجیل اور قرآن شریف کے تقابلی مطالعہ پر مبنی ہے اور اس کے بعض مقامات کی تفسیر و تشریح میں سرسید نے مولوی عنایت رسول سے مدد لی ہے۔ بنارس سے جس ہمہ گیر تحریک کا آغاز سرسید نے کیا اس کے حامی و معاونین میں مولوی عنایت رسول بھی تھے اور انھوں نے بنارس میں مجلس خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ للمسلمین کے ایک اجلاس منعقدہ ۱۳ جولائی سنہ ۱۸۷۲ء کی صدارت کی۔

[1] سرسید کا یہ خط اور مولوی عنایت رسول کا دستخط لفافہ کی پشت پر موجود ہے۔

بعونہ المستعان بشہر بنارس محلہ سکرور

بعالی خدمت جناب مولوی صاحب مخدوم و معظم مطاع و مکرم آفاق جناب سید احمد خاں صاحب صدر الصدور دامت برکاتکم موصول باید ۲۹ رماہ اگست سنہ ۱۸۷۲ء عنایت رسول غفر اللہ لہ از چریا کوٹ محصول بے باق

[2] اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں۔ لفافہ پر مولوی عنایت رسول کا دستخط ہے لیکن ڈاکخانہ کی مہر صاف نہیں ہے جس سے

مدرستہ العلوم سے مختصر اور فصیح اور کثرت علوم پر دلالت کرتا ہے بنظر کثرت علوم کے اسے دارالعلوم مدینۃ العلم کہنا کچھ بے جا نہیں مگر جب جمع معرف باللام ہوتی ہے تو حاصل اس کا جنس ہوتا ہے لہذا نتیجہ دارالعلوم و العلم کا ایک ہے اطلاعاً گذارش ہے فقط - اس مرتبہ بھی مجھے ایک خط بھیجنے سے معاف فرمائیے گا فقط - بخدمت جمیع رفیقان سلام مسنون قبول باد خصوصاً سید محمد حامد صاحب و سید محمد محمود صاحب اگر تشریف داشتہ باشد باشوق دیدار فقط

خطوط محمد برکت علی خاںؒ[1]

(۱)

جناب مولوی صاحب مکرم معظم نیاز کیشان مولوی سید احمد خان صاحب زاد لطفہٗ

بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ :۔ تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ قیاس ہے کہ یہ خط ۱۸۷۷ء کا ہے -

۱ محمد برکت علی خاں ابن محمد عارف خاں، ۲۱ نومبر ۱۸۲۱ء کو شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئے لیکن ملازمت کے سلسلے اُن کا قیام لاہور میں رہا۔ وہ اپنی خوش اخلاقی کے باعث پورے پنجاب میں مشہور تھے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے لئے نمایاں کوششیں کیں وہ انجمن اسلامیہ پنجاب کے روح رواں تھے۔ انھوں نے صوبۂ پنجاب کی ترقی کے لئے اہم رول انجام دیا ہے برکت علیخاں کا شمار پنجاب کے ان چند نفوس میں تھا جنھوں نے سرسید کی تحریک کو اس علاقہ میں مقبول بنایا۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سرسید کو ۱۸۸۴ء کے سفر پنجاب میں مدرستہ العلوم کے لئے گرانقدر رقم ملی۔ سرسید سے برکت علی خاں کو بے پناہ عقیدت تھی اس کا اظہار اس گفتگو سے بھی ہوتا ہے جو ان کے اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مابین ہوئی۔ برکت علیخاں نے ایک بار دوران گفتگو میں نواب صدر یار جنگ سے کہا کہ "علیگڑھ کے لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ انھیں سرسید کی زندگی میں انکی قربت حاصل رہی اور انکی وفات کے بعد بھی تربت کے قریب رہے - ان الفاظ میں جو خلوص و عقیدت پوشیدہ ہے اس سے سرسید سے برکت علیخاں کے قلبی لگاؤ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سفرنامۂ پنجاب میں سید اقبال علی لکھتے ہیں " مدرستہ العلوم علی گڈھ بھی ان (برکت علیخاں) کی فیاضیوں کا کچھ کم ممنون نہیں ہے۔ ہمیشہ اپنی جیب خاص سے مدرسہ کے قیام کے لئے بہت فیاضی کی ہے۔ ہمیشہ اس کی تائید میں سرگرم رہے ہیں ۱۸۸۴ء میں مدرستہ العلوم کی طرف سے ایک ڈیپوٹیشن پنجاب میں گیا تھا جس میں سید صاحب ، جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں، جناب محمد مشتاق حسین صاحب اور احباب شامل تھے اور ان سب کے میزبان ہمارے برکت علی خاں تھے اور صرف مہمان نوازی میں سیکڑوں روپیہ خرچ کر دیا تھا اس زمانہ میں بھی انہی کے سبب سے معتدبہ چندہ ہوا تھا حال کے سفر میں اگرچہ سید صاحب نے کوشش کی تھی کہ مہمانی کے اخراجات سے

بعد تسلیم نیاز مندی کے عرض یہ ہے۔ نامہ نامی مورخہ ۸ جولائی سنہ ۱۸۷۳ء ورود تفاخر لایا۔ یاد خاطر والا ہو
کہ نیاز مند کو سنہ ۱۸۶۶ء سے بمقام آگرہ بایام دربار گورنری بخدمت سامی نیاز حاصل ہے بعد اوس کے اپریل سنہ ۱۸۶۷ء
کو جبکہ نیاز مند کلکتہ سے ہمراہ سفیر شاہ بخارا واپس آتا تھا بمقام بنارس بار دیگر خدمت سامی میں حاضر ہوا
تھا۔ ابتدا سنہ ۱۸۶۶ء سے جو جو کارنامہ ذات سامی سے واسطے بہبودی اور ہمدردی اپنے ملک اور اپنے
قوم کی ظہور پذیر ہوئی ہیں اون میں سے مجھکو کم وبیش کچھ کچھ معلوم ہوتی رہی ہیں، اب جو کچھ توجہ سامی واسطے
تعلیم اور تربیت اور تہذیب، مسلمانان کے مبذول ہے اوس کی قدر او منزلت جہاں تک ہو سکے
کم ہے جو کچھ بعض بعض صاحبان نے بیرونے حسد و رشک خواہ بہ سبب جہالت و حماقت و بخل اس کارِ
نیک اور بہبود قومی میں مخالفت پر کمر باندھی ہے۔ اون کا حال اظہر من الشمس ہے کہ وہ کس درجہ کے
مسلمان دیندار ہیں۔ ہزار ہزار مقام شکر کا ہے کہ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم اہل اسلام اپنے ارادہ پر
ہر طرح مستقل ہے میں بہت عرصہ سے چاہتا تھا کہ کوئی موقعہ ایسا ملے جس کے ذریعہ سے پنجاب میں تجویز
وصول چندہ بطور معقول ہو سکے اس عرصہ میں مجھکو زیادہ تر اتفاق رہنے ضلع ملتان اور بعد اوس کے ہمراہ
کیمپ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے رہا اور آخر فروری کو لاہور میں تبدیل ہوکر آگیا بمقام ملتان اور اثنا ایام
دورہ ہمراہ کیمپ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر اکثر احباب اہل اسلام سے اس امر میں گفتگو کرتا رہا کسی کو موافق
کسی کو مخالف پایا آخر کار جب چند احباب کو جو صاحب رتبہ اور اہل ہمت ہیں اس کام میں ممد و معاون
پایا تو مرتبہ آدھ ایک جلسہ میں وہ تقریر سامی جو جلسہ شہر پٹنہ میں زبان مبارک سے نکلی حاضرین جلسہ کو
سنائی گئی چونکہ اس جلسہ میں صاحبان رئیس عظام اہل اسلام شریک نہ تھے اس واسطے حصر زیادہ گفتگو اور
اصلی مقصود کا جلسہ ثانی پر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ۲۰ جولائی سنہ ۱۸۷۳ء کو ایک جلسہ عالی شان مسجد شاہی
لاہور میں منعقد کیا گیا اور اوس جلسہ میں نواب نوازش علی خاں صاحب قزلباش جو بفضل خدا شہر لاہور بلکہ تمام
پنجاب میں فخر اہل اسلام اور فیض اور سخاوت اور مروت میں شہرہ عام ہیں شریک تھے اوس روز یہ افسوس
رہا کہ نواب عبدالمجید خاں صاحب کے جو اس شہر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے واسطے شمول جلسہ تہنیت سالگرہ
مہاراجہ صاحب بہادر کپورتھلہ کو حسب الطلب مہاراجہ صاحب ممدوح تشریف لے گئے ہوئے ہیں شریک
نہ ہو سکے دیگر اکثر رؤسا و شرفا و نجبا و فضلا و چودھریان پیشہ و محلہ اہل اسلام شریک جلسہ تھے اس جلسہ کی

سے دوستوں کو بچایا جاوے مگر وہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی ... برکت علی خاں نے نقد بھی دیا اور فراہمی چندہ کی
کوشش فرمائی ان کی ان کوششوں کے لئے صرف ہم لوگ ہی ممنون نہیں ہیں بلکہ تمام قوم اور آئندہ نسلیں بھی ممنون ہیں۔

کارروائی مفصل اخبار انجمن اور اخبار پنجابی لاہور میں چھاپہ ہوئی ہیں ملاحظہ میں گذریں گی۔ تاتکمیل اتفاق رائے اہل اسلام اور مشورہ باہمی اہل اسلام میں نے جواب خط میں عمداً توقف کیا تھا الحمد للہ کہ اب امید کامیابی کی ہے اس لئے مشورہ جمیع احباب عرض کرتا ہوں۔ آں مکرم اگر آخر ہفتہ ماہ دسمبر کو لاہور میں تشریف لاویں تو اوسمیں ہر طرح کی امید کامیابی کی ہے اوس موقع پر سب حکام موجود ہوں گے موسم اچھا ہوگا اگست سے اکتوبر تک اس ملک میں اکثر بہ نسبت معمول کے بیماری کثرت سے رہتی ہے۔ نومبر سے موسم بدل جاتا ہے اس لئے آخر دسمبر سب سے بہتر ہوگا۔ مکرمی محمد حیات صاحب بہادر کا خط معہ جناب میرے پاس آیا ہوا ہے اوس کا جواب بھی آج کے روز روانہ کیا گیا ہے میرا ارادہ ہے کہ قبل تشریف آوری سامی کچھ کچھ تدبیر حصول چندہ کی کی جاوے اور بروقت تشریف آوری سامی رقم مذکورہ پیش کی جاوے۔ ۳ر اگست کو ایک جلسہ کیا جاوے گا اوس میں خطوط بنام رئیسان و اہلکاران اسلام روانہ کئے جاویں گے

آپ کا نیازمند
محمد برکت علیخاں
۲۳ر جولائی ۱۸۷۳ء

(۲)

جناب مولانا مکرمنا ہادی گمراہان مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر دامت فیوضکم

بعد سلام سنت الاسلام عرض یہ ہے صحیفہ گرامی وُرود لایا باعث اعزاز کا ہوا قبل پہونچنے نامہ نامی کے بندہ دہم نومبر کو لداخ سے واپس ہو کر لاہور میں پہونچا ہے اگرچہ محکود اجب تھا کہ فوراً جواب باصواب مرسل خدمت سامی کرتا مگر بنظر وقت و استحکام کار خیر جو توقف تحریر جواب میں ہوا ہے وہ لائق عفو کے ہے۔ سبب توقف تحریر جواب یہ ہے کہ میری غیبت میں جو منجانب مولوی امداد العلی خان صاحب بہادر اور دیگر رفقاء اور حواشی ان کی سعی رسالہ امداد الآفاق اور دیگر مضامین لاہور اور دیگر شہر پنجاب میں برخلاف مدرسۃ العلوم مسلمانان کے پہونچے ان کے مطالعہ سے کچھ انقلاب ہو گیا تھا اور وہ احباب بھی جو پہلی سی تائید مدرسۃ العلوم مسلمانان متوجہ تھی منحرف ہو گئی تھی چنانچہ اس وجہ سے میں نے بکمال سعی اور کوشش کے اکثر احباب کو اپنے ساتھ متفق کر لیا ہے اور جو کچھ محمد حیات خاں بہادر نے ضلع کانگڑہ کار نمایاں کیا ہوا ہے اور چونکہ ان دنوں وہ لاہور کو آنے والے تھے اس لئے ان کا بھی انتظار

کیا گیا اور روز ہوئے کہ محمد حیات خاں بہادر لاہور میں آئے ہیں باہم دیگر سب ذکر کیا گیا اب باطمینان تمام بخدمت سامی التماس کرتا ہوں کہ آپ اپنے قدوم مبارک سے لاہور اور تمام پنجاب کو رونق دیں۔ ہفتہ آخر ماہ دسمبر میں آٹھ دن کی تعطیل عام ہے ۲۶ دسمبر سے یکم جنوری تک۔ تاریخ انعقاد مجلس واسطے فراہمی چندہ اور ملاقات رئیسان و اہلکاران لاہور باختیار آں جناب اور سب احباب کے ہے۔ ۳۰ نومبر ۱۸۸۳ء کو لاہور میں ایک جلسہ واسطے انضباط قواعد وصول چندہ واسطے مدرسۃ العلوم مسلمانان کے منعقد کیا جاوے گا اور اس جلسہ میں یہ بھی فیصلہ ہو جاوے گا کہ کون سی تاریخ بوقت تشریف آوری سامی کے واسطے جلسہ عام کے قرار دی جاوے صرف مجکو ایک افسوس یہ ہے کہ اوس موقع پر جناب لفٹننٹ گورنر بہادر لاہور میں تشریف نہ رکھتے ہوں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ ہفتہ عشرہ امرتسر میں جا کر احباب موافق کو اپنے شامل کر کے احباب ناموافق کو موافق کروں اور نیز خطوط بنام صاحبان اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنران و تحصیلداران و رئیسان اہل اسلام ملک پنجاب واسطے شمول جلسہ جو آخر ہفتہ دسمبر کو منعقد ہوگا روانہ کروں کسی طرح استحکام اس کام نیک سے غافل نہیں ہوں لیکن چونکہ فتور مخالفان نے ترقی علوم اہل اسلام میں ڈال دیا ہے اس کا فوراً رفع ہونا محال معلوم ہوتا ہے بہرحال استقلال اور ہمت کو ہاتھ سے دینا نہ چاہئے کہ جس سے اصلاح عام متصور ہو۔ آں جناب اپنے ارادہ تشریف آوری سے بقید تاریخ مطلع فرماویں اگر ممکن ہو تو جناب سید مہدی علی صاحب بہادر بھی ضرور تشریف لاویں۔

نیاز مند

محمد برکت علی

(۳)

جناب سیدنا مولانا زاد مجدکم

بعد سلام مسنون اور سلام عرض یہ ہے یہ نوازش نامہ نامی بحالات مفصل ورود تفاخر لایا۔ احباب منتخب کو دکھلایا جو کچھ مشورہ قرار پایا وہ درج اخبار انجمن و پنجابی وکوہ نور۔ جناب کو اگر کوئی امر بروقت روانگی نہ ہو تو جناب بتاریخ ۲۷ دسمبر اول ٹرین میں جو بارہ بجے لاہور میں پہونچتی ہے تشریف لاویں ورنہ ذریعہ تار برقی وقت تشریف آوری اطلاع فرماویں دیگر حالات اخباروں سے جناب کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ جو تقریر خیر مقدم سامی میں بروقت رونق افروزی جلسہ قبل تقریر سامی اس طرف سے ہوگی وہ تقریر معہ چار نقلوں کے تیار رہے گی اسی طرح دیگر امور میں بصلاح و مشورہ جناب

عمل ہوگا ۔

باعث توقف تحریر جواب ہوا کہ مجھکو دلی خیال ہے کہ اس جلسہ میں شمولیت حکام انگریز ہو۔ چاہیئے چنانچہ میں نے بخدمت جی ڈبلیو سمتھ صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور اور بخدمت جناب مسٹر لنڈ صاحب بہادر جج چیف کورٹ پنجاب اور دیگر حکام انگریز کے تحریک کی ہے ۔ جج صاحب موصوف نے آن جناب کی تعریف و توصیف کی اور فرمایا کہ سید صاحب ہمارے بہت دوست ہیں ہمارا سلام لکھ بھیجو ہم خوشی سے شامل ہوں گے اور جو خیالات جناب نفع و نقص شمولیت صاحبان ہیں اون پر سب طرح لحاظ کیا گیا ہے ۔ چونکہ مسٹر گرین صاحب بہادر دورہ میں تشریف لانے والے ہیں مگر آج معلوم ہوا کہ وہ جلد نہ اویں گے اس واسطے توقف روانگی خط میں ہوا معاف فرمائیے ۔ یہ سنتے خبر وحشت اثر انتقال فرزند دلبند سید مولوی مہدی علی صاحب بہادر سے دل کو کمال رنج ۔ تقدیر الہی میں کچھ چارہ نہیں ہو سکتا ہے ۔ خدائے تعالیٰ صبر عطا کرے اور سید صاحب کو فرزند مرحوم کا نعم البدل دیوے آمین یارب العالمین ۔ کچھ شک نہیں ہے کہ سید مولوی مہدی علی صاحب کو رنج بہت سخت گذرا ہے لیکن میرے نزدیک اگر سید صاحب اس سفر میں شمول آں جناب تشریف لاویں تو کسی قدر دفع رنج متصور ہوگا ۔ کچھ خطوط بطور دعوت اون احباب کے جن پر کچھ بھروسا پڑتا ہے چھپوائے گئے اور آج روانہ کئے جاویں گے اون میں سے ایک خط بخدمت سامی خط بذا حیث توضیح حال روانہ کرتا ہوں ۔ جو احباب ہمراہ آنجناب عازم اس طرف کے ہوں آنجناب دو تین روز اون حضرات کے نام نامی سے مطلع فرماویں ۔ بخدمت جناب مولوی سید محمد محمود صاحب بعد سلام نیاز کے یہ عرض ہے کہ آپ ضرور تشریف لاویں کہ باعث فخر نوجوانان اہل اسلام کا ہو ۔ کل بوقت تین بجے خان بہادر محمد حیات خاں سی ایس ۔ آئی سمت کانگڑہ تشریف لے گئے انشاء اللہ تعالیٰ تا تاریخ ۲۶ دسمبر خاں بہادر ممدوح لاہور میں واپس آجاویں گے ۔

زیادہ نیاز

محمد برکت علی عفی عنہ
۱۴ دسمبر ۱۸۸۳ء

(۴۲)

جناب سیدنا مولانا مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر نجم الہند زاد برکاتہ بعد سلام نیاز

الّتیام گذارشِ مدعا ہوں۔ مکاتبہ روح افزا تخطی سامی وررود تفاخر لاکر باعث طمانیت خاطر حزیں ہوا بدریافت
صحت و عافیت ذات مجمع حسنات آں برگزیدہ صفات سجدہ شکر خدا بجا لایا۔ ہر چند دنیا فانی ہے اور انسان
ضعیف البنیان ہے لیکن اس زمانہ میں خدا کی جناب میں یہ دعا ہے کہ جس طرح خداوند عالم و عالمیان نے آں جناب
کو عمر انوپ عطا کیا ہے اوسی طرح عمر خضر عطا کرے۔ آج وقت تحریر خط ہذا نادر علی شاہ سیفی اڈیٹر اخبار کرونود
میرے پاس تشریف لائے، میں نے خط سامی اون کو ملاحظہ کرایا اور سمجھایا کہ اس قسم کی خبر بدون
کامل تصدیق کے اخبار میں درج کر دینی شعار اڈیٹری سے بعید ہے وہ بیچارہ بہت شرمائے اور
کہنے لگے کہ الہ آباد سے ایک کارسپانڈنٹ نے یہ خبر بھیجی تھی بخدا جس روز یہ خبر درج اخبار دیکھی تھی
دل کو سخت رنج گذرا تھا لاچونکہ اوس سے دو روز پیشتر خط سامی بطور رسید نصف نوٹ میرے پاس
آیا تھا اور دوسرا حصہ نوٹ کا ذریعہ نیاز نامہ مرسل خدمت سامی کیا گیا تھا اور اوس کے جواب کا
منتظر تھا اس واسطے میرے دل کو وہ خبر مندرجہ کوہ نور غلط معلوم ہوتی تھی پس شکر خدا کہ وہ خبر
غلط نکلی جس سے دل دوستوں کے شاد اور خانۂ دشمنان برباد ہو گئے۔

جو کچھ جناب نے بابت خط و کتابت مولوی علی بخش خاں صاحب بہادر سچی اور پکی خیر خواہی مسلمانان میں کام
فرمایا ہے حق تو یہ ہے کہ وہ کام فرشتوں کا ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو برملا گالیاں دیتا ہے کافر کہتا ہے
دوسرا فریق برخلاف ترکی بہ ترکی کے فریق مخالف کی شرائط خارج از بحث کو بہ یکجاں نیک نیتی اور سچائی کے بذریعہ
دستاویزات کے تسلیم اور منظور کر لیتا ہے۔ اگر اب اوس پر بھی کوئی اور شرط جو باعث بے رونقی اور خلاف ترقی منشا
اجرائے کار مدرسۃ العلوم فریق مخالف یا مولوی حاجی علی بخش خاں صاحب بہادر پیش کرنا اور اوس کو منظور کرانا
چاہتے ہیں تو یہ امر نہایت افسوس میں داخل ہے۔ ممبران خزینۃ البضاعۃ اور اوس حد اور درجہ تک
جہاں تک کہ کوئی نقص تعلیم مدرسۃ العلوم یا کارروائی ممبران خزینۃ البضاعۃ میں عائد نہ ہووے
متحمل شرائط ہو سکتی ہیں خواہ کوئی فریق مخالف سے شامل ہو یا نہ ہو۔

ان دنوں ضلع ہوشیار پور میں باہم عیسائیان اور مسلمانان کی بابت آب نوشی چاہات عام
جن سے ہندو و مسلمان بالاشتراک آب نوشی کرتے ہیں تنازعہ ہو رہا ہے میں نے بھی کوشش کی تھی
لیکن ہنوز فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ نادر علی شاہ سیفی نے اپنے سیر و سیاحت کے ضمن میں اس خبر کو بہت طویل تحریر
کیا ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ یہ خبر اخباروں میں تا فیصلہ فتوائے علماء دین درج نہ ہووے مگر اڈیٹر ممدوح
نے بدون اطلاع میرے کے یہ خبر درج کر دی کہ جس سے ایک گونہ مسلمانوں میں وحشت پیدا ہو گئی ہے
جو خبر مضمون فریدکوٹ میں بابتہ لاہور کے درج ہے وہ کچھ صحیح اور کچھ غلط ہے اوس کی اصلاح آئندہ۔

کی جاوے گی۔ یہ رسالہ حلت الطعام لاہل الکتاب مولفہ جناب اس جگہ نایاب ہے امید ہے کہ دو جلد رسالہ مذکور جلد مرحمت ہوں۔ حساب قیمت کتاب سابقہ یعنی حمایت الاسلام وغیرہا اور قیمت تہذیب الاخلاق عنقریب مرسل ہوگا۔ زیادہ نیاز

نیازمند

محمد برکت علی خاں از لاہور

۹ر اگست ۱۸۷۳ء

(۵)

جناب مکرم معظم حضرت مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر نجم الہند زاد عنایتکم بعد سلام مسنون الاسلام عرض پرداز ہوں۔ ان دنوں پرچہ تہذیب الاخلاق مطبوعہ ۱۵ر شعبان المعظم میرے مطالعہ میں آیا۔ جو مضمون بہ لفظ سرخی "دافع البہتان" آں جناب نے تحریر فرمایا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے اس مضمون کا مشتہر ہونا نہایت ضروری اور واجبی تھا۔ انشاء اللہ تعالیٰ امید ہے کہ جب یہ مضمون بذریعہ اخبار دل دیسی کے بخوبی شائع اور مشتہر ہوجائے گا تو جن لوگوں نے صرف رسالہ مولفہ مولوی حاجی امداد العلی اور مولوی حاجی علی بخش خاں صاحب کو دیکھا یا اون کے مضمون خلاف واقعہ کو جو سراسر بہتان ہیں سنا ہے اون کے دلوں کو جناب کے سچے اور نہایت سچے عقیدہ پر پورا اطمینان ہوگا۔ گویا اس مضمون کے مشتہر ہونے پر تمام ہند میں روشنی پھیل جاوے گی تاریکی دور ہوگی۔ پرچہ روئیداد کمیٹی منعقدہ ۲۴ر ستمبر ورود لایا اوس کے مطالعہ سے دل کو زیادہ تقویت ہوئی ارحم الراحمین ذات جامع کمالات آنجناب کو دیرگاہ سلامت رکھے جو تجویز واسطے خرید کوٹھی ہا اور بنائے احاطہ خوشنما اور دروازہ ہا وغیرہ کمیٹی نے منظور کرلی ہے نہایت انسب ہے۔ بہ سبب موسم گرما اور نیز بلحاظ دیگر امورات کے میں نے دو ماہ سے کوئی جلسہ فراہمی چندہ نہیں کیا لیکن اپنے احباب کی خدمت میں برابر تحریک تحریری و تقریری جاری ہے۔ بموجب تحریک سابقہ اور حال کے ضلع شاہ پور میں بہ سعی و توجہ خان بہادر غلام محمد خاں رئیس ڈیرہ اسمٰعیل خاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر شاہ پور دوم اکتوبر ۱۸۷۳ء کو ایک جلسہ عالی اس لئے فراہم چندہ بامداد مدرسۃ العلوم منعقد ہوا اور اسی جلسہ میں النالعبہ درج فہرست چندہ ہوگئے روئداد جلسہ شاہ پور واسطے طبع ہونے انجمن اخبار میں بھیجے گئے نقل اوس روئداد کی ذریعہ نیاز نامہ ہذا مرسل خدمت سامی کرتا ہوں جو شرط مندرج خط ہے امید ہے کہ آنجناب اپنی طرف سے ایک خط بخدمت خاں بہادر غلام محمد خاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر شاہ پور روانہ فرماویں اور اس خط میں علاوہ

اون کے شکریہ ہمدردی قومی کے شرط مندرجہ خط کو تسلیم فرماویں۔ ۱۲ ستمبر ۱۸۸۶ء کو نیاز مند نے شملہ پر بنابر ملاقات ساتھ صاحب بہادر کے دلی گیا تھا۔ ۲۴ ستمبر کو لاہور میں واپس آیا۔ بمقام شملہ مولوی حاجی عبداللہ صاحب سررشتہ دار اور دیگر اہل اسلام سے واسطے امداد مدرستہ العلوم کے بہت کچھ ذکر رہا جو کچھ شبہات اون کے دلوں میں تھے اون کو رفع کیا اور علاوہ امداد مدرستہ العلوم کا لیا گیا انشاء اللہ تعالیٰ امید ہے کہ شملہ میں بھی کمیٹی مقرر ہو کر عنقریب چندہ وصول ہوگا۔

نیاز مند
محمد برکت علی خاں عفی عنہ
۹ر اکتوبر ۱۸۸۶ء

(۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب سیدنا و مولانا

تسلیم ۔ جناب کے خطوط مورخہ یکم و ۶ر دسمبر ۱۸۸۸ء شرف صدور لائے۔ تمام حالات سے مطلع ہو کر مطمئن ہوا چشتی، اور راوس کے بعض رفقا جو [illegible] خیانت سے برخلاف انجمن اسلامیہ اور اب برخلاف محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کارروائی کرتے ہیں خدا کے فضل پر بھروسہ ہے کہ وہ روسیاہ ہوں گے اور جلسہ کارروائی جلسہ محمڈن ایجوکیشنل کانگرس انشاء اللہ تعالیٰ کمال خوشی اور فخر سے انجام پذیر ہوگی۔

جو آنحضرت نے اپنی تشریف آوری کا حال معہ اپنے احباب پٹنہ و دہلی و سہارنپور وغیرہ وغیرہ تحریر فرمایا ہے اوس سے اطمینان ہوا ہنوز وقت بہت باقی ہے۔ آئندہ ذریعہ عریضہ عرض کیا جاوے گا کہ جو احباب اور حضرات بزرگوار ان ہمراہ سامی تشریف لاویں گے اون کی اطلاع کم از کم قبل ۲۵ دسمبر ۱۸۸۸ء نیاز مند کو معہ اون کے نام نامی کے ملنی چاہیے خواہ ذریعہ خط خواہ ذریعہ تار برقی۔ یہ بھی واضح رائے عالی ہو کہ انجمن اسلامیہ کی طرف سے بخدمت اون جمیع ممبران محمڈن ایجوکیشنل کانگرس جو سال گذشتہ ممبر تھے خطوط روانہ کئے گئے ہیں علاوہ ممبران موصوف قریباً تین سو خط اس وقت تک آئے ملک پنجاب اور اور بعض بعض شہر ہندوستان میں روانہ کئے گئے ہیں

میں امید کرتا ہوں کہ جن ممبر صاحبان کے نام خطوط براہ راست بھیجے گئے ہیں ان کا جواب ضرور مجھکو ملے گا۔ جو صاحب تشریف لانے والے ہوں گے انشاء اللہ تعالیٰ اون کی مدارات از جانب انجمن بخوبی

عمل میں آوے گی۔ جو کوٹھی مہاراجہ کپورتھلہ بنا بر قیام آنحضرت تجویز کی گئی ہے اوس کے بارہ
کمرے ہیں اور سب سجائے گئے ہیں اوس کے قریب ایک کوٹھی کرایہ پر لی گئی ہے اوس میں بھی
آٹھ کمرے ہیں میں امید کرتا ہوں کہ ہمراہیان جناب اور دیگر معزز ممبران ممالک مغربی شمالی کا قیام
ہر دو کوٹھی میں ممکن ہوگا دیگر عمائد کے واسطے دیگر مکانات تجویز کئے گئے ہیں۔ ہنوز میرا خیال ہے
اگر ممکن ہوگا تو دوسری کوٹھی کے احاطہ میں جو ایک اچھا میدان محفوظ ہے اوس میں ڈیرہ خیمہ
لگا کر جلسہ عام بھی کیا جائے تاکہ آنحضرت کو کچھ تکلیف دور آنے جانے کی نہ ہو
مگر کراکلاں گورنمنٹ کا لیکچر کا فیصلہ قائم رکھنا بالفعل مصلحت وقت سمجھتا ہوں آج مبلغ پینتیس روپیہ چندہ
ممبری محمڈن ایجوکیشنل کانگرس تفصیل ذیل میرے پاس آگیا ہے ان صاحبان کے نام فہرست ممبران محمڈن
ایجوکیشنل کانگرس میں درج فرماویں۔ سید خدا بخش صاحب رئیس چھاؤنی ملتان صہ۔ منشی غلام نبی خاں صاحب
منصف ملتان۔ صہ۔ میر صفدر حسین صاحب سر دفتر درجہ دوم ملتان۔ بابو کرم الٰہی صاحب اسٹیشن ماسٹر ملتان۔
سید حسن بخش گردیزی رئیس ملتان۔ شیخ وزیر الدین صاحب ضلعدار ملتان۔ شیخ حسن بخش صاحب قریشی رئیس
سکرٹری انجمن اسلامیہ ملتان۔ علاوہ بریں منشی غلام نبی خاں صاحب سابق مشیر مال ریاست بہاولپور حال مقیم
ملتان و سید نادر علی خاں صاحب سیفی و محمد برکت علی خاں صاحب و ناظر حسن صاحب وکیل سہارنپور عبداللہ
خاں صاحب وکیل سہارنپور و میر ممتاز علی صاحب وکیل سہارنپور کا چندہ ممبری محمڈن ایجوکیشنل کانگرس میرے
پاس داخل ہوگیا ہے ان سب کے نام درج فہرست فرماویں۔

آپ کا تابعدار قدیم
محمد برکت علی
۱۲ر دسمبر ۹۶ء

خطوط سردار محمد حیات خاں[1]

(۱)

بھاگسو ضلع کانگڑہ
۸ر جولائی ۸۳ء

میرے پیارے سید صاحب بہادر
بعد از سلام مسنون گزارش خدمت ہے آپ کی کوشش بابت ترقی تعلیم و تہذیب اہل اسلام اس

---

[1] سردار کرم خاں پوپل زئی کے بیٹے سردار محمد حیات خاں قصبہ واہ ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے۔ پنجاب
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لائق ہیں کہ سب دینی بھائی آپ کا دل سے شکریہ ادا کریں۔ الا افسوس کہ ۔ بجائے شکریہ بعض نا مہربان
برادران اضلاع شرقی ۔ بہ جدوجہد تمام مخالفت میں سرگرم ہیں ۔ آفریں اور ہزار تحسین آپ کی اس
بے ریا کوشش اور ہمت مردانہ کو کہ آپ بدستور ۔ بہبودی خلائق اور خصوصاً برادران اسلام
میں مصروف ہیں اور کسی طعن اور ہجو ناز یبا سے اپنی اولوالعزمی میں ہرج نہیں ہونے دیا میں
نہایت خوشی سے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کی ان عمدہ تجاویز تعلیم اہل اسلام کے معاملہ میں آپ کے
مغربی بھائی ۔ صوبہ پنجاب کے عموماً متفق ہیں ۔ اور آپ کے مخالفوں کے اکثر نامعقول اعتراضوں کو
نہایت کراہیت اور افسوس کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ گذشتہ ہفتہ کے اخباروں سے آپ کی تقریر دلپذیر
جو صوبہ بہار میں آپ نے کی ہے پڑھ کر دل کو نہایت فرحت حاصل ہوئی
بلاریب آپ کی یہ عمدہ کوششیں خدا کے فضل سے کارگر ہوں گی میری یہ صلاح ہے کہ آپ ایک دفعہ
لاہور تک تشریف لاویں اور اوس وقت تاریخ معین سے مجھکو بھی اطلاع بخشیں کہ میں بھی لاہور
میں آجاؤں گا اور لاہور کے رئیسان اور علماء سب دل سے مدد دینے کو طیار ہیں اور رئیسان امرتسر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) میں علی گڑھ تحریک کو کامیاب اور مقبول بنانے میں جن لوگوں کا نام ہے ان میں سردار محمد حیات خاں
نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سرسید نے جیس ہمہ جہت تحریک کا آغاز کیا تھا سردار صاحب اس کے شروع سے حامی و مددگار رہے
ان کی بصیرت اور وسیع النظری نے اس انقلاب کو دیکھ لیا تھا جسے بہرحال آنا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا
اجلاس ہوا۔ اس کی صدارت سردار محمد حیات خاں نے کی اپنے خطبہ میں انھوں نے کہا

"سرسید نے اپنے نانا کی امت کے ڈہلیتے جہاز کو طوفان جہالت کے بھنور سے نکالنے میں وہ کام
کیا ہے جس کے شکر کے ادا کرنے میں میرے پاس کافی الفاظ نہیں ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس حکم میں
میں یا حاضرین جلسہ تنہا شامل نہیں ہیں ۔"

جنوری ۱۸۸۴ء میں جب سرسید زندہ دلوں کی سرزمین پنجاب گئے تو وہاں ان کا جگہ جگہ شاندار خیر مقدم
ہوا۔ گورداسپور میں ایک تقریر کے دوران سرسید نے کہا

" میں نہایت شکر گزار ہوں اپنے تمام دوستوں کا جنھوں نے پنجاب میں مجھ پر اس قدر
مہربانی کی ہے خصوصاً اپنے دوست (سردار محمد حیات خاں) کا اس قدر ممنون اور زیر بار احسان ہوں گا
ہوں کہ مجھے خوف ہے کہ جب واپس جاؤں تو اسٹیشن ماسٹر مجھ کو بہت زیادہ بوجھل دیکھ کر ریل کا دوگنا
محصول طلب کرے "

سے نے ایک مدرسہ اسلامیہ امرتسر میں تجویز کیا ہے میں چاہتا ہوں کہ ایک مدرسہ اسلامیہ اضلاع سرحدی مغربی پر اور مقرر کیا جاوے اور یہ سب مدرسہ اسلامیہ اس بڑے دار العلوم اہل اسلام کی شاخیں تصور ہوں گی جس کی بنا آپ نے قائم کی ۔

میں اور میرے بہت سے دیگر برادران اہل پنجاب چندہ دینے کو طیار ہیں ۔ الا سب سے بہتر یہ ہے کہ آپ کی زیارت آپ کے دوسرے برادران پنجاب کو بمقام لاہور حاصل ہو اور ایک بڑے مجمع میں چندہ پنجاب کا تجویز کیا جاوے ۔ خدا کا شکر ہے کہ گورنمنٹ بھی مہربانی سے ہمارے ان نیک ارادہ کی مددگار ہے ۔ زیادہ نیاز

آپ کا دلی دوست
محمد حیات خاں
لائف آنریری سکریٹری انجمن پنجاب

(۲)

ہاگو
۳۱ جولائی

پیارے حضرت
نوازش نامہ ۲۷ جولائی کا اس وقت پہونچا ۔ مجکو ترمیم مجوزہ سے اتفاق ہے ۔ اس ترمیم کی علت غائی جو یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کے مناسب وسائل مہیا کرتی ہے
جو سکوک بعض صاحبان اہل اسلام کو نسبت مدرستہ المسلمین میں ہیں وہ رفع ہوجاوے بہت مناسب ہے اور اس میں کوئی جائز اعتراض نہیں ہے ۔
مجکو یا ضلع کانگڑہ کی کمیٹی ماتحت مسلمانان کو (جہاں تک کہ مجکو علم ہے) اس ترمیم کی نسبت کوئی وجہ اعتراض کی نہیں ہے مقصد ہم سب مسلمانوں کا یہ ہے کہ کوئی وجہ ہو مگر برادران اسلام اس بات سے مطمئن ہوجاویں کہ سوائے بہبودی دینی و دنیوی اور کچھ مقصد بانیان یا خیر خواہان مدرستہ المسلمین کا نہیں ہے ۔
سو اس واقعہ مراد کے حصول کیواسطے جو ترمیم دفعہ ۳ ۔ ۴ ۔ ۵ ۔ میں تجویز ہوئی ہے وہ مناسب ہے ۔ زیادہ نیاز

آپ کا صادق تابعدار
محمد حیات

(۳)

بہاگسو ضلع کانگڑہ
۳۱ اگست ۱۸۷۳ء

معظم و مکرم مخدوم نیاز مندان جناب حضرت سید احمد خاں بہادر ستارۂ ہند سکریٹری کمیٹی خزنۃ البضاعۃ

بعد سلام مسنون۔ گذارش خدمت ہے۔

مجلس خزنۃ البضاعۃ نے جو اس خاکسار خلائق کو اپنی معزز کمیٹی کا ممبر مقرر فرمایا ہے اس کا میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جو عزت اور خوشی اس قومی معزز مجلس کے سند کے عطا ہونے سے مجکو حاصل ہوئی اوس کا میں فخر کرکے آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ براہ مہربانی میری طرف سے مجلس کی خدمت میں شکریہ بیان کیجئے۔

میری دلی آرزو یہ ہے کہ برادران قوم کی بھلائی کے واسطے جو خدمت مجھ سے ہو سکے اوس کو اپنی خوش قسمتی سمجھ کر بجالاؤں۔

گرچہ فی الحال میں ایک ایسے ضلع میں ہوں جہاں گنتی کے چند معدود گھر اہل اسلام کے ہیں تاہم میری خواہش ہے کہ بہت جلد ایک سب کمیٹی۔ واسطے انتظام چندہ کے مقرر کروں۔

اور جب مجکو موقع مغربی اضلاع سرحد پنجاب کی طرف جانے کا ہوگا تو میں بہت خوشی سے وہاں کے دوستوں کی مدد چندہ کے معاملہ میں لوں گا زیادہ نیاز شکریہ

خاکسار
محمد حیات

(۴)

بمقام پالم پور کیمپ
۱۶ جون ۱۸۷۴ء

جناب مخدوم و مکرم بندہ نیاز مندان حضرت سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی جج زاد لطفکم

نامہ ہمایوں مرقومہ ۱۰ جون آج اس وقت پہونچا۔ جس قدر ممبر میرے پاس اس وقت موجود تھے ان کو بھی سنایا گیا مجکو اور انجمن اسلامیہ کانگڑہ کو (جس قدر کہ اس کے ممبر موجود تھے) تجویز پیش کردہ مولانا ئے حاجی مولوی علی بخش خاں بہادر سے مجھے اتفاق ہے اور جو تجویز تعلیم مذہبی کی بابت مولوی صاحب موصوف نے اپنے

مرسلہ میں جو آپ کے نام نامی پر بھیجا گیا تحریر فرمایا کہ اوس میں مجکو اور اس انجمن کے ممبران کو کچھ بھی یہ
اعتراض نہیں معلوم ہوتی بلکہ طمانیت کی بنیاد ہے۔ واسطے مذہبی تعلیم کے عمدہ انتظام ہونے کی مجکو بلکہ
اہل اسلام کو جناب مولوی صاحب ممدوح کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس عمدہ تجویز کو پیش کیا
مجکو اس امر کے لکھنے کی اجازت دیجئے کہ جہاں تک مجکو علم ہے کمیٹی عزیزۃ البضاعۃ یا اس کے ماتحت مجلس
بھی وہم وگمان بھی اس امر کا نہیں تھا کہ مذہبی تعلیم صادق میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت کیا جاوے گا بلکہ یہ
خیال میں ہم لوگوں کو مدرسۃ المسلمین کے قائم کرنے کی بہت سی ضرورتوں میں سے ایک بڑی ضرورت جو سب سے
اہم تھی کہ ہمارے مکاتب اور متفرق خانگی تعلیم میں ہماری مذہبی تعلیم کے شامل ہونے سے یا کافی طور پر نہ
تعلیم نہ دینے سے علم الاخلاق اور ادب کے تکمیل میں اہل اسلام کے بچوں کے واسطے ایک ایسا نقص عظیم
رہا جاتا ہے کہ جن کا انتظام بہت ضروری ہے پس مولوی صاحب موصوف کی یہ تجویز ہماری اصلی منشاء کے
نہایت مؤید اور موثر ہوگی۔

آخیر پر میں نہایت ادب سے یہ بھی لکھنا چاہتا ہوں کہ تائید کل مدبران تعلیم مذہبی اہل سنت جماعت
ہونی چاہیئے۔ باقی سب امور میں مجکو آپ کی تحریک سے اتفاق کلی ہے۔

خداوند کریم آپ کے نیک ارادوں میں برکت دیوے اور اپنی قوم (اہل اسلام) کی ترقی دینے
میں کامیاب کرے۔ آمین۔

آپ کا تابعدار

محمد حیات

(۵)

سیالکوٹ

۱۹ر جنوری ۹۶ء

مائی ڈیر سید احمد

۹ر جنوری کا نوازش نامہ مجکو آج ملا۔ بعد انقضائے رخصت انبالہ سے سیالکوٹ تبدیل ہوا ہوں اور آج
ہی صبح یہاں پہونچا مجھے نہایت خوشی ہوئی کہ میرے دوست سید زین العابدین خاں بہادر (ہند کے [illegible]
یا یوں کہو کہ ہند کے نیک) کے فرزند ارجمند اور میرے مہربان نواب احمد اللہ خاں صاحب بہادر کے فرزند
کے ساتھ اسلم پڑھے گا۔

میں نے شاید اول یہ پرپوزل اسلم کی تعلیم کے وقت اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو آپ کو یہ دیا تھا کہ سپردم بتو الخ۔ سو میری طرف سے جناب کو حسب قول سید زین العابدین خاں بہادر کلی اختیار ہے جو چاہو سو کرو۔ اور فرماؤ کہ مجھے کیا بھیجنا چاہیئے آیا کیپٹل فنڈ کے سود سے ماہوار کیا آمدنی ہے اور کس قدر روپیہ اور کیپٹل فنڈ میں جمع کیا جاوے کہ جس میں اس عدد روپیہ کی آمدنی ہو جائے یا مجھے عدد ماہ بہ ماہ بھیجنے چاہیئے۔ جو صلاح مبارک ہو اوس سے اطلاع بخشئے کہ تعمیل کی جاوے۔ مجھے جناب کے اس دو تازہ تحریر سے بہت ہی اطمینان ہوتا جاتا ہے کہ اسلم پر امید ترقی ہے۔ اوس کی تحریروں سے پایا جاتا ہے کہ تھیمیٹک کی تعلیم کالج کو وہ بہت گھٹا ہوا سمجھتا ہے۔ اور یہاں تک (شاید) لکھا ہے کہ حساب میں) وہ بی اے کی جماعت تک برابر ہے سو نہیں معلوم یہ قول اوس کا کس خیال کی بنا پر ہے۔ انگریزی میں اوس سے زیادہ محنت شاید لینی مناسب ہو گی اور فارسی سے نہ بدلی جاوے جس کا کچھ نہ کچھ چرچا مغربی حصہ پنجاب میں ضرور عرصہ تک رہے گا۔ اسلم امتحان کی طیاری کر رہا ہوگا اور گو وہ تسلیم کرتا ہے کہ انگریزی کی پڑھائی میں اوس کے اور ہم جماعت دوسری دفعہ پڑھتے ہیں اور وہ پہلی دفعہ مگر وعدہ محنت کا کرتا ہے۔

یہ امر خدا کے شکر کے لائق ہے کہ وہ وہاں خوش ہے اور ہمیشہ اوس کے خط چیرفل آتے ہیں۔ اُمید ہے کہ جناب اور مولوی سمیع اللہ خاں بہادر اور اوس کی تعلیم اور تربیت کی طرف خاص توجہ فرماتے رہیں گے مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر کو میری طرف سے دلی مبارک باد اعزاز عطیہ قیصری براہ مہربانی کہدینا۔ نہایت ہی شکر ہے کہ ہند میں آرڈر آف سینٹ جان اور سینٹ میکل کے پہلے کمپینین ہماری قوم کے برگزیدہ اور ہر دلعزیز اکثر ہوئے۔ خدا مبارک کرے اور مجھے زندگی میں اسکوئر مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر لکھنے کا موقع ملے۔ آمین۔
یہ یک کرشمہ دو کار

آپ کا نیازمند
حیات

سیالکوٹ مجھے انبالہ سے پسند ہے کچھ ارادہ ہے کہ اپریل میں فرلو لوں۔

خطوط خلیفہ سید محمد حسین[1]

(۱)

جناب سیدنا و مخدومنا زاد تہ معالیکم ۔ تسلیم کے بعد ایک خط مولوی محمد حسین صاحب پروفیسر عربی کالج لاہور جو میرے نام تھا بجنس ارسال خدمت کرتا ہوں مجھے معلوم نہیں کہ ان سے آپ کا تعارف ہے یا نہیں یہ صاحب مولوی محمد باقر صاحب مرحوم دہلوی کے بیٹے ہیں۔ اول مدرسۃ العلوم کا جوش جس قدر اون کی طبیعت میں ہے وہ خود عبارت خط سے ظاہر ہو جاوے گا انھوں نے پہلے بھی کسی کسی اخبار میں مضامین تائیدی لکھے ہیں اب پھر کمربستہ ہیں خدا برکت دے ۔ سعادت علی خاں برکت علی خاں صاحب کے چچا زاد بھائی ہیں لاہور میں سررشتہ تعلیم کی ملازمت کے باعث سے رہتے ہیں مجھے اون سے ملاقات نہیں ہے مگر میں نے سنا ہوا ہے کہ اون کے خیالات مذہبی ہمیشہ سے متعصبانہ ہیں ہنٹر صاحب کی کتاب میرے پاس تھی میں نے مولوی محمد حسین صاحب کی خدمت میں بھجوائی۔ امداد الآفاق کے موجد غالباً امداد العلی صاحب کانپوری ہوں گے مجھے معلوم نہیں کہ وہ کاغذ کیسا ہے اور کہاں سے مل سکتا ہے اگر آپ کوئی ایسا بندوبست فرما سکیں کہ مولوی محمد حسین صاحب کے پاس اوس کا ایسا پرچہ جس میں مدرسۃ العلوم کی نسبت بحث ہوا کرے پہونچ جایا کرے تو خوب ہو ۔ میں نے گذشتہ چند ماہ میں مرض سے بڑی تکلیف پائی مقدمہ سل و دق تھا مگر خدا نے صحت دی اب اچھا ہوں اپنے کاروبار متعلقہ کرتا ہوں مگر اب بھی ضعف و نقاہت بہت کچھ باقی ہے ۔ خدائے عزوجل آپ کو اہل اسلام کی بھلائی کی تدبیر میں حسب دلخواہ کامیاب کرے اور دیر تک زندہ و سلامت رکھے ۔ جو جو ترمیمات تجویز تربیت و بود و باش اطفال مدرسۃ العلوم کی نسبت علاوہ آپ کی تدبیر کے کمیٹی میں بمقام بنارس ہوئی ہیں جناب بھائی صاحب نے اور بندہ نے انکو بہت خوشی کے ساتھ پڑھا ہم لوگ اپنا نفع نقصان کچھ نہیں سمجھتے میں ہیں کئے جاتے ہیں ۔ آجکل مسلمانوں کے دونوں فرقوں

---

[1] حکیم سید سعادت علی کے بیٹے خلیفہ سید محمد حسین وزیر اعظم ریاست پٹیالہ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے حکیم سید سعادت علی ریاست پٹیالہ کے شاہی طبیب تھے بعد میں ولی عہد نریندر سنگھ کے اتالیق مقرر ہوئے اس نسبت سے سید محمد حسین کا خاندان خلیفہ کے لقب سے مشہور ہوا ۔ خلیفہ سے مراد اتالیق کا بیٹا ہے ۔ خلیفہ سید محمد حسین نے مدرسۃ العلوم کی تاسیس میں سرسید کی بڑی مدد کی ۔ خلیفہ سید محمد حسین اُنکے بھائی خلیفہ سید محمد حسن کو اپنی قوم کی علمی ترقی اور فلاح و بہبود کا بڑا خیال تھا یہی وجہ تھی کہ دونوں بھائیوں نے ابتدا سے سرسید تحریک سے عملی دلچسپی لی اور سرسید کے دست و بازو بنے رہے ۔ مدرسۃ العلوم میں جب مسجد کی تعمیر کا فیصلہ ہوا تو یہ بحث پیش ہوئی کہ سنیوں اور شیعوں کے لیے علیحدہ علیحدہ مسجد تعمیر کی جانے لیکن خلیفہ سید محمد حسین جو مذہباً راسخ العقیدہ شیعہ تھے انھوں نے تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ دونوں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شیعہ و سنی کے مذہبی .... ۱؎ ایران اور قسطنطنیہ میں قایم اور موجود ہے اون کا لباس بھی فرنگیانہ ہے وہاں کے عالم و فاضل شیوخ و مجتہدین ہند کے کٹ ملاؤں سے بہر حال اعلم و افقہ ہیں وہاں کبھی کو ملحد بنایا جاتا ہے نہ دہ کافر خدا جانے ہم ہندوستانی کس مرض جنوں میں گرفتار ہیں ان دنوں میرزا افضل اللہ خاں صاحب کنسل جنرل ایران متعینہ بمبئی سیاحانہ ہمارے ہاں وارد ہیں قوم سے سید ہیں مذہب جیسا عموماً ایرانیوں کا شیعہ ہیں۔ شخص نماز گذار اور صالح ہیں مگر لباس وہی ہے جس کو آجکل ہم ہندوستانیوں کی اصطلاح میں کرسٹانوں کا لباس بھی کہا جاتا ہے شاہ ایران کی شبیہہ میرے پاس لندن سے بھی آئی اور میرزا افضل اللہ خاں صاحب نے بھی دی اون کا بھی یہی لباس ہے . . . .

. . . . ۲؎

یہ نیاز نامہ خلاف امید بہت طول طویل ہوگیا۔ دعائے صحت و عافیت پر ختم کرتا ہوں۔ والسلام۔ سید حامد خاں صاحب و سید محمود خاں صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔

خاکسار سید محمد حسین عفی عنہ — ۹ر اکتوبر ۱۸۸۲ء — پٹیالہ

(۲)

جناب مخدوم معظم تسلیم۔ مجھ اب عنایت نامہ عالی بکمال شکر گذاری عرض ہے کہ عنایت حسین اس دسمبر میں بسر و چشم خدمت والا میں حاضر ہوتا مگر امراض مختلفہ سے اوس کو نجات ہی نہیں ملتی۔ کچھ عرصہ سے اوسے حبس بول کی تکلیف ہو جایا کرتی ہے۔ اس وجہ سے وہ لاہور میں ڈاکٹر رحیم خاں صاحب کے پاس ٹھیرا ہوا ہے۔ میرا خود بھی اکثر ارادہ رہا کرتا ہے کہ کبھی علی گڈھ آؤں اور دو چار روز حاضر خدمت رہوں مدرسہ کو دیکھوں مگر خدا جانے کہ یہ ارادہ کب پورا ہو۔ جناب بھائی صاحب بفضل الٰہی خیریت سے ہیں۔ لارڈ ڈفرن صاحب بہادر کی اسپیچ جو بجواب ایڈریس مسلمانان بمبئی تھی ہمارے مدرسہ کے کاروبار میں ایک اچھی امید اون کی طرف سے قائم کرتی ہے۔ چونکہ اب تک ہم لوگوں

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے لئے مسجد ایک ہی تعمیر ہوگی۔ خلیفہ صاحب نے شیعہ و سنی کے اتحاد و اخوت کو قومی ترقی کا نصب العین سمجھ کر ہمیشہ دونوں میں سلوک و اتحاد کی تلقین کی۔ خلیفہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا ان کے اس شغف کی یادگار "اعیاد المفتریین" اور "ترجمہ سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر" ہیں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۱۸۹۳ء کی صدارت خلیفہ سید محمد حسین نے کی اور مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کے لئے معقول تجویزیں پیش کیں۔

۱؎ ناخوانا ۲؎ ناخوانا

میں وہ بات پیدا نہیں ہوئی جس کے باعث ہم حکام عالی مقام کی امداد کے خواہاں نہ رہیں اس وجہ سے بڑے بڑے حاکموں کا التفات فرماتے رہنا ہمارے کاموں کی ترقی کے لئے بالفعل ضروریات سے ہے۔ زیادہ دعا ہائے صحت و سلامتی ذات مبارک کیا عرض کروں

والسلام

۱۶ر دسمبر ۱۸۸۴ء از پٹیالہ
خاکسار سید محمد حسین

(۳)

۹ر دسمبر وقت شب از پٹیالہ

جناب مخدوم معظم۔ تسلیم۔ اس سے پہلے اون دنوں میں کہ جب آپ آگرہ گئے تھے ایک نیاز نامہ ارسال کیا تھا غالب ہے کہ پہونچ چکا ہو اگر نہ پہنچا ہو تو اوس میں صرف اتنی اطلاع تھی کہ میں بھی سٹرچی ہال کی تعمیر میں پانسو روپیہ چندہ دوں گا اور اوس ۲۰۰ روپیہ کو آپ اس پانسو کے اندر محسوب نہ فرمائیے اس کا مضائقہ نہیں کہ پانسو کے ساتھ اوس دوسو کی رقم کو ملا کر سات سو کر دیئے جائیں۔ غرضا یہ مضمون تو صرف احتیاطاً کہ خدا جانے وہ نیاز نامہ پہونچا یا نہ پہونچا ہو مکرر عرض کیا گیا ہے باعث خاص اس عریضہ کی تحریر کا یہ ہے کہ اس ہفتہ میں لیٹنر صاحب لاہور سے یہاں آئے تھے آج کل بہت شکستہ خاطر ہیں۔ آپ کو اخباروں سے غالباً معلوم ہوا ہوگا پنجاب یونیورسٹی کے فیلوؤں کی کثرت جو ان کے خلاف میں کھڑے ہو گئے ہیں مجبور ہو کر اون کو اوس کی رجسٹراری سے استعفا دینا پڑا علاوہ اس کے اور بھی باہمی ناچاقی ہے ڈاکٹر صاحب کہتے تھے میں مہینہ سوا مہینہ بعد رخصت لے کر ولایت کو جاتے ہوئے علی گڈھ جا کر مدرسۃ العلوم کو دیکھنا اور اوس کے نامور اور ذی قدر بانی سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کے خیالات تو سید صاحب سے اکثر مختلف ہیں۔ کہا نہیں میرا اون کا اس قدر اختلاف نہیں مسلمانوں کی دنیاوی بہتری کے لئے جس قدر اونھوں نے کوشش کی ہے میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ اون سے صرف اس امر میں اختلاف ہے کہ مسلمانوں کے قومی اور دینی خیالات قائم رہنے چاہئیں ایسا نہ ہونا چاہئے کہ جس طرح ٹرکی کے ترکوں کو فرنچ سویلزیشن نے خراب کر دیا اور گویا اوس سویلزیشن نے اون کی قومیت کو برباد کر دیا وہ حال اس ملک کے مسلمانوں کا نہ ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ خیر خواہ آپ کی رائے اور اونکے خیال کچھ ہی ہوں مگر یہ فرمائیے کہ کیا پھر آپ کا یہ منشاء ہے کہ میں سید صاحب کو آپ کے اس ارادہ سے مطلع کروں۔ کہا کہ ہاں [illegible] نے مکرر پوچھا کہ آپ کب تک علی گڈھ پونہچنے کی امید کرتے ہیں تو کہا [illegible] پانچ ہفتہ تک فقط جونہی

آپ کا خلق عمیم ہے مجھے یقین کامل ہے کہ اگر وہ وہاں پہونچیں گے تو آپ ان سے بمدارت و مہمان نوازی سے پیش آئیں گے اور اگر آپ اس کے جواب میں مجھے کچھ ارشاد فرمائیں گے تو میں اون کو مطلع کردوں گا بلکہ مجھے تو یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود بھی اون کو ایک چٹھی لکھ بھیجیں۔ میری اور اون کی یہ گفتگو ریلوے اسٹیشن پر نہایت قلیل الفرصتی میں ہوئی تھی اگر اس ملاقات سے کوئی اون کی غرض خاص ہو تو معلوم نہیں۔ شاید اگر علی گڈھ سے کوئی طالب علم لندن کو جائے تو اونکے مجوزہ ووکنگ انسٹیٹوٹ میں رہے۔ یا خدا جانے صرف مدرسۃ العلوم کو دیکھنا اور آپ سے ملنا ہی مقصود ہو۔ ڈاکٹر لیٹنر صاحب جب سے پنجاب میں آئے ہیں تقریباً تب سے ہی میری اون کی ملاقات ہے مگر میں اون کے مریدوں میں سے نہیں ہوں البتہ جہاں تک اون کی کوئی بات مجھے اپنے نزدیک اچھی معلوم ہوئی اوس کی تائید کرتا رہا ہوں اور امور اختلافی کو بڑی شدت و قوت سے ہمیشہ جتاتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں اس وقت یورپین ممبروں نے اون سے بہت نامناسب طور پر سلوک کیا ہے میری رائے میں وہ ایک شخص مجموعۂ اضداد ہیں۔ آخر کہاں تک سامعہ خراشی کروں دعائے صحت و سلامتی پر اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں

والسلام خاکسار
سید محمد حسین

(۴)

جناب مخدوم و مکرم بندہ دام مجدکم

تسلیم نیاز کے بعد التماس ہے کہ مہربانی نامہ مطبوعہ ۱۵ر نومبر ۱۸۸۹ء در باب حاضری مخلص بتاریخ ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۹ء برائے شرکت اجلاس کمیٹی جس میں قانون ٹرسٹیان نسبت اظہار مجارٹی یعنی کثرت رائے کا اظہار کیا جاوے گا موصول ہو کر باعث افتخار ہوا چونکہ آپ جانتے ہیں کہ کثرت کار کی وجہ سے مجھے بالکل فرصت نہیں ہے امید ہے کہ اس موقع پر مجھے حاضر ہونے سے آپ معذور تصور فرمائیں گے اور میں اپنی رائے جو اوس مسودہ کی منظوری کی تائید میں ہے بہت عرصہ ہوا خدمت گرامی میں بھیج چکا ہوں بعد اوس کے جو جرح و قدح اوس کی نسبت بعض مخالف الرائے صاحبوں نے کی ہے اور اکثر اون مخالف رایوں کو بھی میں نے پڑھا ہے مگر میری بھی وہی رائے ہے جو پہلے آپ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں۔ اختلاف نہ صرف فضول بلکہ اصلی مقصد کے لئے سخت مضر ہے خداوند تعالیٰ اہل مخالفت کو بھی اتفاق رائے کی توفیق نصیب کرے فقط

راقم بندہ
خلیفہ سید محمد حسین خاں
۱۶ر نومبر ۱۸۸۹ء از پٹیالہ

خطوط سید محمود[1]

جناب حضرت ابا جانی صاحب قبلہ وکعبہ من مدظلہٗ

امید ہے کہ آپ بخیریت بنارس پہونچ گئے۔

حسب الارشاد مولوی حیدر حسین اور مولوی فریدالدین صاحب سے نسبت نواب رام پور کے ذکر کیا گیا۔ کہ لی وہ دونوں بہ دل نواب صاحب موصوف کے پیٹرن بنانے جانے پر متفق ہیں لیکن میری رائے میں سند کے اوپر تمام ممبران کمیٹی کے دستخط ہونے چاہئیں۔

عریضہ

محمد محمود

الہ آباد ۶ مارچ سنہ ۱۸۷۴ء

(۲)

علی گڑھ ۴ مارچ ۱۸۷۴

جناب حضرت ابا جانی صاحب قبلہ کونین مدظلہٗ

---

[1] سید محمود ۲۴ مئی سنہ ۱۸۵۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بنارس سے میٹرک پاس کیا اور کیمبرج یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی۔ زمانہ قیام لندن میں سید محمود کے روابط لارڈ ٹینی سن اور مل جیسے لوگوں سے رہے۔ ہندوستان آنے کے بعد وہ کچھ دنوں حیدرآباد رہے اور بعد میں الہ آباد ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی جج مقرر ہوئے مدرستہ العلوم کی اسکیم سید محمود کی تیار کی ہوئی ہے جو ان کی وسعت نظر، ذہانت اور فطانت کی واضح اور روشن مثال ہے۔ انھیں اگر علی گڑھ تحریک کا دماغ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ "وہ شخص (سید محمود) ہم میں ایسا تھا جیسا کہ بونوں میں دیو" لائق باپ کے لائق بیٹے نے سرسید کی ہر مرحلے پر مدد کی جس کا اعتراف سرسید نے "مدرستہ العلوم کے تاریخانہ حالات" میں کیا ہے۔ مدرستہ العلوم کے سلسلے میں علاوہ قلمی امداد کے سید محمود نے مالی امداد بھی دی۔ مدرستہ العلوم میں یوروپین استادوں کی تقرری زیادہ تر سید محمود کی رائے سے ہوتی تھی۔ کالج اور حکومت کے مابین جو مراسلت ہوتی اسے بھی سید محمود انجام دیتے تھے۔ وہ مدرستہ العلوم کی مجلس منتظمہ کے سکریٹری، پرسیڈنٹ اور بعد میں کالج کے وزیٹر مقرر ہوئے ۸ مئی سنہ ۱۹۰۳ کو انتقال ہوا

شین صاحب کا پتہ یہ ہے

ARTHUR G. SHEEN ESQRE
REFRESHMENT ROOMS
LUCKNOW.

لیکن یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے مکان کی نہایت گراں قیمت مانگتا ہے اور اگر اوس کو ذرا بھی معلوم ہوا کہ آپ اوس کے خرید نے کے فکر میں ہیں تو وہ ساڑھے چار ہزار بلکہ پانچ ہزار روپیہ مانگے گا اسلئے میری رائے میں آپ ہرگز ہرگز اس کے خرید نے کا ارادہ نہ کیجئے گا اس مکان کے خرید نے کی کچھ مطلق حاجت نہیں ہے اور آپ اگر اس کو خریدیں گے تو محض ضائع کرنا روپیہ کا ہے ۔ اس کے خرید نے کی بالفعل کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ جب مدرسۃ العلوم کی عمارت تیار ہو جاوے گی اوس وقت البتہ خیال کیا جاوے گا لیکن بالفعل اوس کا خریدنا حماقت میری رائے میں ہے ۔ وہ اس امید میں کہ کمیٹی اس مکان کو خرید نے کو تڑپے جاتی ہے وہ دو گنی قیمت کر دے گا اور اس میں کمیٹی کا روپیہ مفت ضائع ہوگا ۔

میں کل یہاں سے الہ آباد واپس جاؤں گا ۔ بخیریت ہوں

عریضہ
محمد محمود

خطوط مہدی علی نواب محسن الملک[1]

(۱)

جناب من

تسلیم ۔ خط آپ کا مورخہ ۷ رجون معہ نقل خط جناب مولوی علی بخش خاں صاحب بہادر کے پہونچا افسوس ہے ہے کہ یہ ضروری خط بہت دیر کر کے پہونچا جو توقف ہوا اوس کا التزام میری طرف عائد نہ کیا جائے ۔

جناب مولوی علی بخش خاں صاحب کے خط پر جو رائے آپ نے دی ہے وہ آپ ہی کا کام ہے اور کوئی مسلمان عمر مجلس خزنۃ البضاعۃ کا تو آپ کی رائے سے غالباً اتفاق نہ کرے گا اس لئے کہ ہر لفظ سے مولوی صاحب موصوف کے نہ صرف آپ کے کفر و ارتداد پر اشارہ ہوتا ہے بلکہ تمام ممبران مجلس خزنۃ البضاعۃ اور معاونان مدرسۃ العلوم کی بددینی و بے ایمانی پر مکہ کے فتوے کی سند پیش کی جاتی ہے ۔

---

[1] مہدی علی، نواب محسن الملک ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام میر ضامن علی تھا ان کا سلسلہ نسب سادات بارہہ کے مشہور خاندان سے ملتا ہے ۔ محسن الملک سر سید کے عزیز دوستوں میں تھے ۔ سر سید انھیں

اور عام کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کا امور دینی میں خلل انداز ہونا ثابت کیا جاتا ہے ۔ میری غیرت اور حمیت اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ ایسی حالت میں اپنا کفر و ارتداد قبول کر کے اور تمام مسلمانوں کو جواب تک ہماری کمیٹی میں شریک ہوئے ہیں کافر و مرتد ٹھہرا کر ایک امید موہوم پر آپ کی رائے سے اتفاق کروں آپ مدرسۃ العلوم کے خیال میں قد شغفہا حبًا کے درجہ پر پہونچ گئے ہیں اور دین و دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں مگر میں ہنوز اس درجہ پر نہیں پہونچا جہاں تک میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی عمدہ نتیجہ اس بات سے حاصل نہ ہوگا ۔ یہ بات میں منظور کر سکتا تھا کہ مولوی علی بخش خاں صاحب اوس مجلس کے سکرٹری مقرر ہوں جو مذہبی تعلیم کے قواعد تجویز کرنے کے لئے مقرر ہو اس لئے کہ وہ اس کی لیاقت بھی رکھتے ہیں اور استحقاق بھی مگر یہ شرائط کہ آپ اور کمیٹی خزنۃ البضاعۃ مذہبی تعلیم میں مداخلت نہ کریں جس سے شاید یہ مراد ہوگی کہ اب اور کوئی ممبر کمیٹی خزانۃ البضاعۃ کا استحقاق شرکت مجلس تعلیم مذہبی کا بوجہ کفر اور ارتداد کے نہیں رکھتا مجھے منظور نہیں ہے ۔ والسلام

مہدی علی عفی عنہ

۶؍ جولائی ۱۸۷۳ء

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ایک خط میں لکھتے ہیں

"جس قدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی ہے بیان نہیں کر سکتا اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی ۔ جس محبت سے لکھا تھا وہ اثر ان الفاظ میں موجود تھا اور آنکھ سے برابر دل میں پہنچتا تھا ۔ جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے ان کو پڑھ کر میں ایسا محو محبت ہوا کہ گویا یہ سمجھتا تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں اور اس کیفیت سے وحدت وجود کے مسئلہ کا عقدہ حل ہوتا تھا ؎

.. میان احمد و مہدی نہ ہیچ ہست حجاب تو خود حجاب خودی احمد از میان برخیز "

ابتدا میں جب سرسید سے مہدی علی کا تعارف نہیں تھا انھوں نے سرسید کی چند مذہبیات سے متعلق تحریریں دیکھیں جس نے مہدی علی پر بہت ناخوشگوار اثر ڈالا انھوں نے سرسید کو بعض مسائل کی وضاحت کے لئے طویل خط لکھا اس زمانہ میں مہدی علی سمجھتے تھے کہ سرسید قبلہ رو ہو کر نماز بھی نہیں پڑھتے ۔ سرسید نے مہدی علی کے شبہات کے ازالہ کے لئے انھیں اپنے پاس بلایا اور اسی زمانہ سے مہدی علی بھی اُن کے حلقہ اثر میں آگئے اور سرسید کے بیشتر علمی و عملی کاموں میں دامے درمے قلمے تعاون کیا ۔ سرسید کی وفات کے بعد بھی بقول شبلی " لوگوں کو ڈر تھا کہ سرسید کے بعد ان کے

(۲)

جناب عالی! انتہائی والقواشل موجع الدوران والامائل دام اقبالہ تسلیم - میں آپ سے رخصت ہو کر مع الخیر پہونچا روئیداد جلسہ سب کمیٹی ضلع جالون خدمت میں علیحدہ روانہ کی ہیں
میں نے اپنے خیالات آزادانہ طور سے بیان کئے تھے یہ نہیں کہتا کہ ساری روئداد تہذیب الاخلاق میں طبع ہو جانی چاہئے لیکن اگر ہو اوس پرچہ کی پانچ چھ نقول اس غرض سے مجھے عنایت ہونی چاہئے کہ جہاں جہاں مقصود ہے مجھکو چندہ فراہم کرنے کی فکر کردں ورنہ فہرست چھاپی جاوے -
دوسرا امر قابل گذارش یہ ہے کہ علمائے لکھنؤ کے نام جو خطوط کے اجراء کا عزم مصمم فرمایا تھا وہ پورا ہوا! نہیں اگر ہو گیا اوس کے نتیجہ سے مجکو بھی اطلاع دی جاوے کہ مجکو کوشش بلیغ کرنے کا موقع ملے اور اپنے ارادہ کو پورا کرسکوں میں یہاں آکر تندرست نہیں رہا اطلاعاً عرض کیا -

رقیمہ
سید مہدی علی از اورئی جالون
۲۴ جنوری ۱۸۷۵ء

(۳)

جناب من
تسلیم عرض ہے - میرا ارادہ تھا کہ براہ میرٹھ معہ مبلغ پانچسو روپیہ کے جن کا میں نے وعدہ کیا تھا والا حضرت ... ہو کر ایفاء وعدہ کروں مگر ایک کام ضروری پیش آیا کہ پھر میرٹھ سے گلاؤٹی واپس چلا آیا اب یوں ارادہ کر لیا ہے کہ ہر روز سو روپیہ کا منی آرڈر آپ کی خدمت میں بھیجتا رہوں لیکن ایسی حالت میں چار روپیہ بابت محصول منی آرڈر کے خرچ ہوں گے خیر جو کچھ ہو - آج سو روپیہ کا منی آرڈر بھیج دیا ہے رسید عنایت ہو - ایک اور امر قابل گذارش ہے کہ الٰہی بخش مرحوم نقل کو رتے والہ نے باوجود چند مرتبہ کی ہدایت کے مدرستہ العلوم کی کچھ امداد نہیں کی اب خاکسار نے الٰہی بخش مرحوم کے برادر زادہ غلام محی الدین کو جس کو انھوں نے متبنیٰ کیا تھا آمادہ اس بات کے اوپر کیا ہے کہ ایک بورڈنگ ہوس تعمیر کرا دوے اس معاملہ میں غلام محی الدین کو کسی قدر میں نے رضامند کر لیا ہے مگر صرف ایک تاریخ کی کسر باقی رہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ اب کی مرتبہ میرٹھ کے جانے پر وہ کسر

بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ
منصور ہوگی کون انجام دے گا لیکن خدا نے انہیں کے ہم نشینوں میں سے ایسا شخص (محسن الملک) پیدا کر دیا جو اگرچہ سرسید کا ہمسر نہ تھا لیکن کالج کی ترقی وسعت اور مقبول بنانے میں سرسید سے کسی طرح کم نہ تھا۔

بھی نکل جاوے گی اور غلام محی الدین مسطور غالباً ممبران کمیٹی محمڈن ایسوسی ایشن میں شامل ہونا چاہتے ہیں شاید رمضان شریف میں میرا جانا میرٹھ ہوگا مگر بعد رمضان کے ان امور کی صفائی کروں گا اور اس مرحلہ کو طے کروں گا زیادہ نیاز دیں۔

آپ کا نیاز مند خاص
سید مہدی علی عفی عنہ از کلاوٹی
۲؍ جولائی ۱۸۹۴ء

(۴۸)

۷؍ مئی ۱۸۹۴ء

جناب عالی

اب میں اس قدر نقیہ ہوگیا ہوں کہ اپنے ہاتھ سے خط لکھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے اس لئے یہ عرض لکھواتا ہوں۔ میری طبیعت روز بروز بگڑتی جاتی ہے۔ کوئی صورت افاقہ کی بلکہ تخفیف کی معلوم نہیں۔ بخار رات دن صبح شام کسی دن نہیں اترتا۔ کھانسی بہت ہے۔ بلغم سے بیپ ملی ہوئی آتی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر مرض لاعلاج نہیں بتاتے مگر یہ انکی رائے ہے کہ شش میں آماس ہوگیا ہے اور تازہ خراش۔ اس کے لئے دوا ترکیب سے گلے میں اس طور پہ بخارہی اتارتے ہیں کہ قریب شش کے پہنچ جاتی ہے۔ سب اس میں دوا ڈالتے ہیں لیکن باایں ہمہ بخار میں کچھ کمی نہیں۔ آج قریب ۱۰۳ درجہ کے ہے۔ کھانا تو تین ہفتہ سے قطعاً چھوٹ گیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر نٹمنٹ سے طاقت قائم رکھنے کی کوشش رکھتے ہیں علاج جہاں تک ممکن ہے اعلیٰ درجہ کا ہو رہا ہے۔ دو ڈاکٹر معالج ہیں اور ڈاکٹر بھی اول درجہ کے۔ پلنگ پر سے اٹھ کر استنجے کو جانا بھی بے سہارے آدمی کے مشکل ہے۔ غرض کہ دس بارہ برس پہلے جو حالت بیماری کی تھی وہ اب ہوئی ہے۔ جناب مولوی شبلی صاحب کا خط آیا۔ یہی خط ان کو دکھا دیجئے گا جس سے ان کو میرے مزاج کی کیفیت معلوم ہو جائے

مہدی علی

آج بہ نسبت سب دنوں کے طبیعت زیادہ خراب رہی۔ دوپہر تک قریب غشی کے گذرا۔ دوسرے تیسرے اپنے حال سے اطلاع دیتا رہوں گا۔ آپ اپنے مزاج مبارک کی کیفیت ضرور لکھئے۔

(۵)

۴ ستمبر ۱۸۹۴ء   بمبئی پیڈر روڈ نمبر ۲

جناب عالی. تسلیمات کے بعد عرض یہ ہے ایک ہفتہ سے مرا مزاج کچھ خراب ہو گیا تھا اور بارش میں ایک دعوت میں جانے سے مجھ کو زیادہ بخار اور کھانسی ہو گئی جس کے سبب ابتک پلنگ سے نہ اٹھا مگر ڈاکٹر سڈنی اسمتھ کی رائے میں کوئی خطرناک اثر نہیں ہوا امید ہے کہ آرام ہو جائے۔

یہاں بعض معزز آدمیوں کی یہ رائے قرار پائی ہے کہ اس سال کانفرنس کو بمبئی میں مدعو کیا جائے اور چند روز میں وہ انجمن اسلام کا جلسہ کر کے باضابطہ درخواست آپ کی خدمت میں روانہ کریں گے۔ صرف تامل یہ ہے کہ آپ اس کو منظور فرمائیں یا نہیں۔ میری رائے میں تو کوئی وجہ منظوری کی سوائے اس کے نہیں، کہ آپ ایسی بیماری کی حالت میں اتنے دور کا سفر برداشت نہیں کر سکتے مگر یہ خود بڑی وجہ ہے

یہاں بمبئی میں بعض بہت روشن خیال اور اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں مگر اکثر آدمیوں کو تعلیم کا کچھ شوق نہیں۔ کانفرنس سے یہاں بہت فائدہ ہوگا۔ علاوہ اس کے دولت مند مسلمان یہاں اس قدر ہیں کہ آپ بالکل اندازہ نہیں کر سکتے مسٹر عبداللہ مہر علی دھرمسی بی اے ایل ایل بی پریسیڈنٹ بمبئی کارپوریشن اور بدر الدین طیب جی کے تمام خاندان والے (وہ خود نومبر میں ولایت سے واپس آئیں گے) یہاں کانفرنس کے ہونے سے بہت خوش ہوں گے۔ اور بہت سے تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور یہاں معزز ہیں اس بات کے خواہاں ہیں کہ آپ میرے جواب میں کوئی خط ایسا تحریر فرمائیں کہ ان لوگوں کو پڑھ کر سنا سکوں

محسن الملک

(۶)

جناب عالی

اگرچہ بخار کم ہو گیا اور خون بھی بند مگر ضعف بہت ہو گیا ہے اور کھانسی کی شدت اور بلغم کثرت سے نکلتا ہے ڈاکٹر نے بات کرنے اور لکھنے پڑھنے کی سخت مخالفت کی ہے اور یہ رائے دی ہے کہ میں دو تین مہینہ کے لئے سیلون جاؤں۔ اگر وہاں نہ جا سکوں تو بنگلور۔ اسلئے کہ ان کے نزدیک اس مسلسل اور متواتر بیماری نے میرے ششش بہت نقصان پہنچایا اور مرے دفع مرض کی قوت کو کمزور کر دیا۔ اگر کامل احتیاط نہ کی گئی اور چند روزہ افاقہ بھروسہ کر کے بے فکری اختیار کی تو کسی روز اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ مگر دونوں جگہوں میں سے کہیں میرا جانا مشکل ہے اور بڑی مشکل اخراجات کی ہے تنہا میں جا نہیں سکتا گھر کے لوگوں کا ساتھ رکھنا ضروری ہے

اس کے علاوہ ڈاکٹر اور سب نوکروں کا یہاں رہنا ہے گزارا مشکل ہے ان زائد اخراجات کا تحمل کیوں کر ہو سکتا ہے اس بیماری میں کم سے کم پانچ ہزار روپیہ خرچ ہوئے دو ہزار کے قریب صرف ڈاکٹروں کو ملیں دینے پڑی اور ابھی تک سلسلہ جاری ہے

بہر حال میں نہایت پس و پیش میں ہوں کہ کیا کروں صحت مقدم ہے اور اب میں دیکھتا ہوں کہ تھوڑی سی بیماری میں بہت زیادہ نقیہہ اور ضعیف ہو جاتا ہوں ایک ڈگری بخار تو ہمیشہ رہتا ہے اور کھانسی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سیلون یا بنگلور کا جانا مشکل ہے ابھی تک تو میرا ارادہ یہی ہے کہ اکتوبر میں علی گڈھ آپ کے پاس چلا آؤں اور جہاں تک ہو سکے وہیں احتیاط کرتا رہوں البتہ گرمی اور برسات میں وہاں رہنا مشکل ہے اس کے لئے پھر دیکھا جائے گا۔ لیکن اس عرصہ میں اگر ڈاکٹر نے نہایت ہی ضرورت سیلون یا بنگلور جانے کی بتائی تو مجبوری وہاں جانے کا کچھ بند و بست کروں گا مگر اس وقت تک مطلق میرا ارادہ نہیں۔ وہاں یعنی علی گڈھ میں آپ کی زیارت و صحبت در حقیقت روح کو تقویت پہنچاتی ہے اور مولانا حالی اور مولانا شبلی صاحب میرے لئے گیارہ ہزار طبیب ہیں محمود کے پاس جب تک بیٹھتا ہوں دین دنیا کو بھول جاتا ہوں اگر وہاں آکر بیمار ہوا تو پھر امید نہیں کہ اور کہیں اچھا ہو سکوں اس لئے میرا ارادہ ہے کہ چھ مہینے کے لئے ضرور وہاں آکر رہوں آپ نے مثنوی میں صدر جہاں کی حکایت ملاحظہ فرمائی ہوگی کہ اس سے کسی نے پوچھا کہ

پس کہ اے شہر تو آیا خوشتر است — گفت آں شہرے کہ در وے دلبر است

ہر کجا باشد شہ ما را بساط — ہست صحرا گر بود سم الخیاط

ہر کجا یوسف رخ باشد چو ماہ — جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

پس حضرت یہی حال میرا اور علی گڈھ کا ہے کہ نہ سیلون کی ہوا مجھے خوش کرے گی نہ بنگلور کی۔ روحانی خوشی جو کچھ ہوگی وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے اور آپ کی گالیاں سننے سے۔ میں نے سطر یہ خط خود لکھوایا ہے ضعف کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکا۔ راقم

مہدی علی

خطوط مولوی سمیع اللہ خاں [1]

(۱)

قبلہ و کعبہ

تسلیمات۔ والا صحیفہ کے جواب میں گذارش ہے کہ آج میں شب کو بلند شہر سے واپس آگیا۔ دن بھر وہاں رہا تھا۔ دن بھر وہاں رہا تھا سو ساٹھ روپیہ یا چند ہی میں وہاں لکھوا۔ جاتا ہے سو نہیں ہوا۔ آج میں نے نقشہ صاحب جج کو دکھایا تین مقام پر پنسل سے نشان دروازوں کا بنوایا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ دو درواتسمان میں سے وہی ہیں جن کے نسبت میری رائے تھی ایک دروازہ کے نشان کرنے میں دیر تک تامل ہوا آخر کو اوس کا بھی ایک نشان کردیا ہے قلعہ کے جانب سے جو سڑک آتی ہے اور جو سڑک کہ اوس کو بجانب صاحب باغ کے تقاطع کرتے ہوئے گذرتی ہے اوس سمت میں یہ تیسرا دروازہ ہوگا لیکن یہ تیسرا دروازہ بطور تجویز مختتم کے نہیں ہے آپ بھی اس پر غور فرمالیں۔ کالج کا جو نشان آپ نے نقشہ میں بنایا ہے وہ بہت وسیع ہے لارنس صاحب کی بھی رائے یہی ہے کہ یہ بہت بڑی عمارت ہوگی اتنی بڑی کی ضرورت نہیں ہے جو تجویز کہ موقع پر قرار پائی تھی معلوم نہیں کہ اوس سے اختلاف کی کیا وجہ ہوئی میری رائے بدستور وہی ہے جو پہلے تھی میں کبھی اس بات راضی نہیں ہوں کہ چار یا ساڑھے چار ہزار روپیہ اس وقت شین صاحب کی کوٹھی کا دیا جائے لارنس صاحب بھی اس قیمت کو سن کر اوسکی خریداری پر نہایت ناراض ہوتے ہیں اونکی مستحکم یہ رائے ہے کہ وہ بنگلہ بالکل نکما ہے اور اوس کو کوئی شخص بعد اسٹوتی صاحب کے جو اپریل میں اوس کو بیچ ڈالے گا۔ جب کالج کا بنانا رفتہ رفتہ منظور ہے اور غالباً اوس کے پوری تیار ہونے میں سالہا سال چاہیئے تو ایسی عجلت سے اوسکی خریداری پر اصرار کرنا یا اوس کی ضرورت کا عام طور سے اشتہار کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ صاحب باغ کی خریداری کا جب تک خیال تھا اور وقت تک بے انتہا قیمت اوس کی مانگی جاتی تھی

ہ مولوی سمیع اللہ خاں ۱۸۳۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عربی علوم کی تحصیل مولوی مملوک علی سے کی اور معقول کی کتابیں مفتی صدر الدین آزردہ سے پڑھیں آزردہ، مولوی سمیع کی ذہانت و فطانت پر ناز کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "میرا جانشین سمیع اللہ ہوگا " مولوی سمیع اللہ کی علمیت کا اعتراف کرتے ہوئے مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی لکھتے ہیں "سید احمد خانی جماعت میں صرف دو بزرگوار ایسے تھے جن پر صحیح معنوں میں لفظ عالم کا اطلاق ہوتا تھا اول مولوی سمیع اللہ خاں ثانیاً نواب سید مہدی علی خاں مرحوم " مولوی سمیع اللہ خاں ۱۸۸۹ء تک سرسید کے حامی و مددگار رہے اور انکے ہر کام میں بیش از بیش حصہ لیا انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کی نظامت کے فرائض انجام دیئے اور جب ۱۸۷۳ میں سید محمود نے مدرسۃ العلوم کی اسکیم پیش کی تو اسے عملی شکل دینے میں مولوی سمیع اللہ نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ سر ولیم میور نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا " مولوی سمیع اللہ خاں نے دل و جان سے اس مدرسہ کی ترقی کے لئے کوشش کی اور اسکی تمام پیشرفت انھیں کی مرہون منت ہے "۔ ۱۸۸۹ء میں ٹرسٹی بل کے مسئلہ پر سید اور مولوی سمیع اللہ کے مابین اختلاف پیدا ہوا اور انھوں نے مدرسۃ العلوم سے علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن ملک و قوم کی بہبودی کا جو جذبہ سرسید کے حلقۂ اثر میں آنے کے بعد پیدا ہوگیا تھا اس نے انھیں نچلا بیٹھنے نہ دیا اور الہ آباد میں انھوں نے مسلم بورڈنگ ہاوس قائم کیا۔ مولوی سمیع اللہ خاں کا خیال تھا کہ اس قسم کے ہاسٹل ملک کے مختلف شہروں میں قائم کئے جائیں گو یہ اسکیم بروئے کار نہ آسکی لیکن آج بھی اس منصوبہ کی اہمیت جوں کی توں قائم ہے۔

اب جب سے انکار کر دیا ہے متعدد چٹھیاں اور پیام اوس کے میرے پاس آ چکے ہیں اور کم پیچ دینے
وہ راضی ہے جو نقشہ مکان کا بنایا جاوے وہ اول میرے پاس بھیج دیجئے ماد نس صاحب بھی اوس کو
چاہتے ہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جلدی سے اوس کو گورنمنٹ میں بھیج دیں جو کچھ ردو قدح اوس پر ہوتی ہو وہ
پہلے ہو جانا چاہیے - سید محمود یہاں سے کل چلے گئے - میں خود مسٹر اسٹونی صاحب سے یہ تعمیل آپ کے ارشا
کے نام کوٹھی کے مالک کا پوچھوں گا اسکول اور بورڈنگ ہوس کے شاگرد پیشہ کے مکان اکثر منہدم
ہو گئے پرسوں سے دیواروں کی درستی اور چھپر وغیرہ کی شروع کراؤں گا ہولاسے مستری نے ایک
نقشہ آپ کے حکم کے موافق آپ کے پاس بھیجنے کو مجھے دیا ہے وہ میں بھیجتا ہوں مکانات منہدم
اور باقی ماندہ کا نشان نقشہ پر ملے گا بورڈنگ ہوس چند طالب علموں کے رہنے کے لئے ناکافی -
لیکن میرا خیال یہ ہے کہ زیادہ طالب علموں کے آنے کی امید ہے جن کے واسطے یہ بالکل ناکافی
ہے کم سے کم بالفعل میری رائے میں یہ کرنا چاہیے کہ جو مکان گورنر کے لئے بنانا تجویز ہوا ہے
اوسی کے متصل جو اس وقت ایک مکان نامناسب طور سے بنا ہوا ہے وہ بطور کمروں کے بنا دیا
جو چار لڑکوں کے لئے کافی ہو سکے - شیعہ مدرس اس وقت تک کوئی تجویز نہیں ہوا ہے میں نے ر
باقر علی خاں اور حکیم امجد علی خاں تحصیلدار متھرا اور مرزا عابد علی بیگ صاحب کو اس باب میں لکھا
کہ ایک ایک پرت روداد کا آپ بھی اون کے پاس بھیج دیں. عربی مدارس اہل سنت کے واسطے
سائے میں مولوی لطف اللہ صاحب مناسب ہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ نواب محمود علی خاں اپ
چندہ بھیجنے میں اس وجہ سے تامل کر رہے ہیں کہ وہ مولوی سراج الحق کو مقرر کرانا چاہتے ہیں
لیکن مجھ تک ابھی پیام نہیں آیا ہے - مولوی لطف اللہ تقرر پر راضی ہیں لیکن جو تنخواہ صہ میں
مقرر کرنی چاہتا ہوں اوسکی مقدار میں شاید اونکو عذر ہو گا - محمد یوسف چندہ کے مدرسہ سے پہلے او
کو صہ دیتے تھے اور مہینہ دو مہینہ سے للعہ کر دیئے ہیں اگرچہ میں نے مولوی لطف اللہ کو اس بات کی ترغیب
کر دی ہے کہ اس مدرسہ میں اون کی محنت پر اون کی تنخواہ کا اضافہ ہو سکے گا اور اگر وہ سلسلۃ التعلیم کی
کتابیں تالیف کر سکیں جس کا اون کو کافی موقع مل سکتا ہے تو اوس کے معاوضہ سے جو کمیٹی اون کے
واسطے تجویز کرے اونکو معتد بہ فائدہ ہو جاوے گا لیکن ابھی یہ معاملہ صاف نہیں ہوا دو تین روز میں
طے ہو جاوے گا - مدرس انگریزی منشی ذکاء اللہ صاحب نے بذریعہ اپنے خط کے میرے پاس بھیجا ہے ان
کا نام ابوالحسن ہے ایف اے کلاس تک بریلی کالج میں تعلیم پائی ہے - بی اے کی ڈگری کے واسطے میو
کالج میں کئی سال تک پڑھا - سید محمود و منشی محمد ذکاء اللہ دونوں اون کی نسبت یہ رائے دیتے ہیں

کہ اون کی لیاقت نہایت عمدہ ہے سید محمود یہ کہتے ہیں کہ منقولات میں سے ہے کہ ایسا آدمی اس مدرسہ کے واسطے دستیاب ہوگیا ۔ منشی ذکا اللہ اون کی ریاضی کی بالخصوص تعریف کرتے ہیں بی اے میں اون کا فیل ہو جانا صرف اون کی بدقسمتی خیال کی جا سکتی ہے میرے پاس یہ آئے اور تین چار روز رہے آدمی نیک بخت معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ جو اونکی حالت اس مدرسہ میں لائق پسندیدگی کے ہوگی وہ یہ ہے کہ نماز کے بڑے مستعد ہیں ۔ ص ماہوار پر یہ راضی ہو گئے ہیں ۔ سید محمود و منشی ذکاء اللہ کی یہ رائے ہے کہ بالفعل ہیڈ ماسٹری کا کام بھی یہی کریں اور مدرسہ میں انگریزی کی ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن میری رائے اس کے مخالف ہے یہ بات بھی میں قبول کرتا ہوں جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ بالفعل ایسے کلاس موجود نہیں ہونگے جس کو انگریزی تعلیم دے لیکن بلحاظ عام انتظام اور وقعت مدرسہ کے جو اول مدرسہ کے آغاز میں زیادہ تر قابل لحاظ ہے ایک انگریز ماسٹر کا ہونا ضروری ہے اور ص مکان کے بانا ہے وہ عمدہ آدمی ہے ۔ وہاں کا وقت قریب ہے میں اگرچہ جاتا ہوں وہاں سے واپس آکر اور امور لکھوں گا آپ ان امور پر غور فرما کر مجکو اپنی رائے سے مطلع فرمائیں ۔		محمد سمیع اللہ

۶ مارچ ۱۸۷۵ء

(۲)

جناب قبلہ و کعبہ

تسلیم ۔ کنکر والا آگرہ چلا گیا ہے شاید آج کل میں آوے گا اس لئے ٹھیکہ کا معاملہ ہوا ہے ۔ کمہاروں کو بلایا تھا چھ لاکھ اینٹیں شروع بیساکھ میں وہ دینے کا اقرار کرتے ہیں طول اون اینٹ کا دس انچہ اور عرض پانچ سے کچھ کم اور موٹائی سوا دو انچہ ہے ۔ نرخ معہ ڈھلائی سوا فی ہزار قرار پایا ہے ۔ آپ نے شاید اون سے آٹھ روپیہ ٹھہرائے تھے مگر اونھیں کمہاروں کا بیان ہے اب نو پر ٹھہر گئے ہیں اگر ہم اپنی تجویز کے موافق جیسا کہ آپ نے لکھا ہے اون سے اینٹیں بنوائیں تو زیادہ سو روپیہ فی لاکھ دینے کو کہتے ہیں لیکن برسات میں تیاری انکی ناممکن ہے کنواد میں پژاوہ چڑھانے کا وہ وعدہ کرتے ہیں ۔ اگر ہم اپنی نج کا بھٹہ خود لگانا چاہیں تو اینٹ پاتھنے والی اور بھٹہ لگانے والے اور اور سامان تیار ہو سکے گا لیکن نہایت مشکل ہوگی اور میری یہ رائے ہے کہ صرف بھی بہت پڑے بالفعل چھ لاکھ اینٹیں جس کا وہ وعدہ دینے کا کرتے ہیں لے لینی مناسب ہوں گی ۔ آپ کی سب باتوں کا جواب ہو چکا اب چند باتیں میں پوچھتا ہوں اون کے جواب سے مطلع فرمائیے

۱ ۔ مدرسہ ماتحت کے لئے کس قدر روپیہ ماہوار خرچ کو صدر کمیٹی دے سکتی ہے

۱- آمدنی صدر کمیٹی کی کس کس میعد سے کس کس قدر ہے اتنی تو میں جانتا ہوں نواب رام پور ماہ مارچ
آمدنی نوٹ خرید کردہ کیمیٹی بابت ... ماہ سے کر کم
کرایہ کوٹھی مارشل صاحب ۵
اس کے سوا کس قدر اور ہے سر سالار جنگ سے اس معاملہ میں کیا طے ہوا اس بات کو پہلے سوچ لینا چاہئے کہ مدرسہ ماتحت کے اخراجات کے سوا کچھ اور روپیہ بھی بچنا چاہئے جو تعمیر مدرسہ میں کام آوے اور کام تعمیر کا چلا جاوے۔ اگر ہیڈ ماسٹر بالفعل انگریز نہ بھی رکھا جاوے گا تاہم چار سو روپیہ ماہوار سے کسی طرح کم خرچ نہیں ہوسکتا۔
۵ کرایہ ماہ فروری مارشل صاحب نے میرے پاس بھیج دیئے ہیں رسید اون کو کمیٹی سے بھجوا دیجئے۔

محمد سمیع اللہ

۱۴ مارچ ۱۸۷۵ء

(۲)

قبلہ و کعبہ

تسلیم - کل کے خط میں جس قدر طالب علم میں نے لکھے ہیں اون کے سوا چار طالب علم اور داخلہ کے لئے تیار ہیں دو شاہجہاں پور سے آئے ہیں ایک دہلی کا آیا ہوا ہے ایک مولوی الطاف حسین کا لڑکا داخل ہونا چاہتا ہے لیکن جتنے اب آئے ہیں اون کا خیال یہ ہے کہ ہماری تنخواہ مقرر ہوجاوے مدرسہ نہیں ہے محتاج خانہ سمجھ لیا ہے اس وقت تک میری یہ رائے ہے کہ چوتھی کلاس تک اچھی طرح سے جو طالب علم پڑھ سکیں اونکو پانچ روپیہ کی اسکالرشپ دی جاوے بلکہ اگر آپ سے میں نہ ڈرتا تو یہ کہتا کہ تیسری کلاس میں دیا جاوے اور دوسری کلاس میں اور انتہا آٹھ تک کلاس میں سات روپے کی اسکالرشپ دی جاوے اور فرسٹ کلاس اور غایت الخلیق موافق آپ کے خیال کے سکنڈ کلاس میں جو لڑکا اچھا پڑھے اوس کو ... کی اسکالرشپ دی جاوے مہدی حسن ایک طالب علم بدایوں سے آیا ہے جس نے آپکو بھی لکھا تھا اور آپ نے اوس کو مجھ سے خط کتابت کی ہدایت کی تھی اوس کی تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ وہ تھرڈ یا فورتھ کلاس میں پڑھنے کے لائق ہے لیکن اب جو وہ آیا ہے تو وہ پانچویں کلاس میں ہماری ہاں داخل ہوا ہے میرا ارادہ ہے کہ اوس کو بھی اسکالرشپ نہ دوں مولوی الطاف حسین کا لڑکا بھی اسکالرشپ پانچ روپیہ کی مانگتا ہے اور فیس سے برارت چاہتا ہے اور منشی ذکاء اللہ صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چوتھی یا پانچویں جماعت انگریزی میں دہلی میں پڑھتا ہے جو ہماری ہاں کی چھٹی یا پانچویں ہوگی میں اوس کو

..یہی جواب دوں گا کہ ایسا نہیں ہو سکتا اگر اس وقت عموماً بلا تمیز کے بیس اسکالرشپ تقسیم کردی جاویں تو پھر اگر کوئی لایق آدمی دستیاب ہوگا تو اوس کے لئے کیا بندوبست ہوگا - آپ کو طالب علموں کے کمی کا خوف ہے لیکن مجھکو ذرا خوف نہیں ہے میرے کان میں ہر طرف سے یہی آواز آتی ہے کہ لڑکوں کو علی گڈھ اسکول میں بھیجو بالفرض اگر پانچ روپیہ کی اسکالرشپ کسی کو دی جاوے تو وہ بورڈنگ ہوس میں رہنا چاہتا ہے جس کے صرف کھانے کی مقدار پانچ روپیہ ہے فیس داخلہ بورڈنگ ہوس اور فیس مدرسکی اور کتابوں کی قیمت اور کپڑہ وغیرہ کا خرچ مزید برآں - اب میں نے اسی لحاظ سے کہ پانچ روپیہ فیس زیادہ ہے (گو آپ پندرہ روپیہ تجویز کرتے ہیں) یہ ارادہ مستحکم کرلیا ہے کہ رسل گنج میں ایک مکان بہ کرایہ لیا جاوے اور عام طالب علم جو خرچ کی کفایت چاہتے ہیں وہ اوس میں رہیں غالباً انکے کھانے کی مقدار فی کس تین روپیہ سے کچھ کم ہی ہوگی جو لڑکے معزز مالداروں کے آویں گے وہ بنگلہ میں رہیں گے اون سے خرچ زیادہ لیا جاوے گا۔ ضیاء الحسن اور فیض الحسن کے معاملہ میں میں کل کے خط میں لکھ چکا ہوں اس کا جواب جلد دیجئے اور ایسے بچوں کو اگر اسکالرشپ دی جاوے تو ہماری کمیٹی کے ممبروں میں برے خیالات پیدا کریں گے ۸ - ۷ طالب علم تین چار روز میں اور داخل ہو جاویں گے یکم جولائی تک چالیس بلکہ شاید اس سے بھی متجاوز طالب علم ہوں گے یہ ایک ایسا کام ہے جس میں بہت جلدی کرنی نہیں چاہئے رفتہ رفتہ ترقی مستحکم ہوتی ہے بہ نسبت اوس ترقی کے جو دفعتاً ہو -

اب ایک اور امر اہم پوچھتا ہوں ششماہی میں جو پڑھائی ہر ہر درجہ میں اس مدرسہ میں ہوگی وہ بلحاظ اس کے کہ جدید مدرسہ ہے اس قدر قابل بھروسہ کے نہ ہوگی کہ سرکاری ہائی اسکولوں کے ساتھ میں جنہوں نے سال بھر تک اپنی کلاسوں میں پڑھا ہو ہماری مساوی کلاس کے طالب علم امتحان میں اعلیٰ درجہ کے نکلیں پورا انتظام پڑھائی کا ۶ مہینہ میں ہوگا اس لئے کہ جدید طالب علموں کے روزانہ داخل ہونے سے ہر روز جماعتوں کا اولٹ پولٹ ہوتا ہے اس لئے میری رائے یہ ہے کہ ہمارے مدرسہ کا امتحان اس سال نہ لیا جائے بطور خود لینے کا مضائقہ نہیں لیکن سرکاری مدارس کے ساتھ نہ ہونا چاہئے وہاں ۱۸۷۶ء سے برابر امتحان لیا جاوے اس میں آپ کی کیا رائے ہے اگر آپکی رائے مجھ سے متفق ہو تو وقت مناسب پر کمیٹی میں اس بات کو پیش کرنا چاہئے -

حساب جو آپ نے بھیجا ہے اوس میں مجھ کو کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے فیاض علی خاں کی رقم پانچ سو روپیہ کی بجد وصول مندرج نہیں ہے جو رقمیں کہ متفرق دس دس پانچ پانچ روپیہ کے میرے پاس سے آپ خود لے گئے اوس کو بھی مرے ہی نام باقی نکال کر قائم کردیا ہے پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو کس قدر روپیہ سب کمیٹی کے چندہ سے وصول ہوا ہے اور کس قدر زر وصولی میں سے میرے پاس رہا ہے جب تک یہ بات معلوم نہ ہو حساب کی صحت نہیں ہو سکتی -

شیخ الٰہی بخش وثیقہ مجسٹریٹ نے پانچ روپیہ کا اسکالرشپ ایک سال کیلئے مقرر کیا ہے انگریزی کی تعلیم کے لئے مہینہ قریب ختم کے ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہوں کے بل کا ایک نقشہ چھپوا لیجئے جو بھر کر یہاں سے بھیج دیا جایا کرے گا سوائے اخراجات معینہ ماہوار کے متفرق اخراجات کس صیغہ سے دیئے جاویں گے متفرق اخراجات سے مراد اخراجات وقت پنکھا کشوں کی تنخواہ ہے جو اس وقت دو ہیں اور ہیڈ ماسٹر کے آنے کے بعد تین ہو جاویں گے پتھر کے ایک ڈھلائی ۹ پائی فی میل ہردوا گنج سے زمین مدرسہ تک اجرت قرار پائی ہے اس کی اجرت کس صیغہ سے دی جاوے آپ زر ڈھول یہاں کا تو مانگتے ہیں گرہ سے کچھ نہیں دیتے صاحب کو میں نے لکھ بھیجا ہے کہ کمشنر صاحب کا بنگلہ پچاس روپیہ ماہوار پر مل سکتا ہے اسٹوڈنٹ اسی بنگلہ کے ساٹھ روپیہ دیتے تھے اس وقت تک وہ بنگلہ خالی ہے ۳۰ جون کو امید ہے کہ مسٹر سڈن ہیڈ ماسٹر آجاویں گے بجائے سکنڈ ماسٹر کے واسطے میں نے اون کے افسر کو چٹھی لکھ بھیجی غالباً ایک دو روز میں جواب آجاوے گا بجائے اس نے خود بھی اسی افسر کو چٹھی لکھی ہے اور وہ بالکل یہاں آنے کو تیار ہے اب سکنڈ ماسٹر کی زیادہ ضرورت ہے طالب علم زیادہ ہو گئے ہیں ۔ والسلام

محمد سمیع اللہ

۲۲ جون ۱۸۷۵ء

خط حاجی محمد اسمٰعیل رئیس دتاولی[1]

(۱)

مڈلینڈ گرینڈ ہوٹل
لندن

۴ جنوری ۱۸۷۰ء

جناب مخدومی و معظمی

دو جھاڑ اور آٹھ دیوار کے لیمپ میں نے ڈائننگ روم یعنی سالانہ منزل کے واسطے خریدی ہیں اور اونکو مسرس ہنری ایس کنگ کے سپرد کر دیا ہے اور اونکو ہدایت کر دی ہے کہ وہ اون کو آپ کی خدمت میں روانہ کر دیں ۔

---

[1] سر سید کے مخلص دوستوں میں حاجی محمد اسمٰعیل ابن منیف احمد خاں رئیس دتاولی بھی شامل ہیں ۱۸۶۷ء میں

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

اگرچہ انکے تخمینہ کے مواقف تین پونڈ آگ بوٹ بیمہ وغیرہ کے خرچ کے واسطے بھی مسٹر ہنری ایس کنگ کے سپرد کردی ہیں لیکن اگر اس سے کچھ زیادہ راستہ کا خرچ پڑے تو آپ وید یں جس کو میں انشاء اللہ ادا کردوں گا - امید ہے کہ کمیٹی میری اس تذکر کو قبول کرے گی

اس سفر میں ایک بات نہایت افسوس کی ہوئی وہ کیا کہ آپ کا عنایت فرمودہ ترپوش رکھنے کا بکس آسٹریا میں کسی جگہ رہ گیا - یہ آپ کی نوازش کا یادگار میرے پاس تھا - جس کو میں نہایت باعث فخر جانتا تھا اور اوس کو بہت عزیز رکھتا تھا اور زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ ایسے زمانہ میں یہ گم ہوا جس زمانہ میں آپ نے بالکل مجھ کو یاد کرنا چھوڑ دیا ہے

آپ کا دل سے نیاز مند اور تابعدار
اسمٰعیل

خط سید زین العابدین [1]

(۱)

مراد آباد
۲۵ جنوری ۱۸۸۵ء

جناب من - تسلیم - مجھے نہ معلوم تھا کہ جس روز آپ نے جلسہ کا دن قرار دیا تھا وہ تعطیل کا دن ہوگا اس لئے میں نے آپ کو لکھ بھیجا تھا کہ میں نہیں آسکتا - مگر اس وقت نقشہ تعطیل

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) دتاؤلی میں پیدا ہوئے - بزم سرسید کا ہر فرد کسی نہ کسی حد تک سرسید کے خیالات کا ابلاغ کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن حاجی محمد اسمٰعیل کو سرسید کے سیاسی اور مذہبی افکار سے جو اتفاق تھا وہ شاید کسی اور کو نہ تھا مدرستہ العلوم میں سرسید میموریل فنڈ وغیرہ کا قیام انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا - اردو میں سرسید کی پہلی سوانح عمری حاجی اسمٰعیل کی تحریک پر مولوی سراج الدین احمد ایڈیٹر مور گزٹ نے لکھی - اپنے آخری ایام میں جب سرسید مدرستہ العلوم کے فنڈ میں غبن اینٹونی میکڈانلڈ اور ابنائے وطن کی اردو دشمنی اور سید محمود کے سوء مزاج کے باعث دل گرفتہ ہوئے تو حاجی محمد اسمٰعیل سرسید کو اپنے گھر لے گئے اور وہیں سرسید کا انتقال ہوا

[1] سید زین العابدین - مچھلی شہر ضلع جونپور میں ۱۴ جون ۱۸۳۲ء کو پیدا ہوئے - ان کے والد مولوی محمد حسین

دیکھنے سے وہ میرا خیال غلط ہو گیا اب میں ضرور حاضر ہوں گا اور عرصہ اپنے ہمراہ لاؤں گا اور شاید عزیزی محمد احسن بھی میرے ساتھ آویں۔

آپ کا نیازمند
زین العابدین

خط راجہ جے کشن داس[1]

(۱)

جناب مولوی صاحب مخدوم و مکرم و قدردان من سلامت

تسلیم۔ میں دلی شکرگزاری کے ساتھ آپ کے عنایت نامہ مورخہ ۳۱ جولائی کی رسید کا اقرار کرتا ہوں۔ اس بات سے سب کو پورا اتفاق ہے کہ ہندو مسلمانوں کا نفاق دونوں کو خصوصاً ہندوؤں کو ذلیل و خوار کرے گا

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) شہزادگان دہلی کے اتالیق تھے۔ زین العابدین کی تعلیم اس زمانہ کے رواج کے مطابق ہوئی ۱۸۵۵ء سے ملازمت کا آغاز ہوا اسی زمانہ میں سرسید سے ملاقات ہوئی اور جلد ہی وہ سرسید کے حلقۂ اثر میں آگئے سائنٹیفک سوسائٹی جو علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز ہے اس کے سکریٹری کچھ دنوں سید زین العابدین بھی رہے۔ انھوں نے اپنی بساط کے مطابق مدرسۃ العلوم کے چندہ اور دوسرے کاموں میں حصہ لیا۔ مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر اٹاوہ مولوی زین العابدین کے بارے میں لکھتے ہیں " مولوی زین العابدین کی ذات محبت و فداکاری کا پیکر جمیل تھی یہ گویا سرسید میں اس قدر کھو گئے تھے کہ من تو شدم تو من شدی کا نقشہ نظر آتا تھا سرسید بھی انھیں بے انتہا چاہتے تھے اور زینو کہہ کر پکارا کرتے تھے " زین العابدین کو سرسید ایک خط میں لکھتے ہیں " مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں کہ اسکو برا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی نہیں جس پر غصہ نکالوں، ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا ہے صبح کو اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو " کہا جاتا ہے کہ سرسید اور زین العابدین جب تک علی گڑھ میں رہتے صبح کی چائے ساتھ پیتے تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد بھی زین العابدین کا یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ صبح سرسید کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھنے آتے اور مقبرہ کے اندر جا کر بیٹھتے تھے۔ زین العابدین فطرتاً زندہ دل اور ظریف تھے جب بھی سرسید اپنی قوم کی فکر میں مغموم ہوتے زندہ دل زین العابدین اپنی زندہ دلی سے انکی فکر رفع کرتے اور ان میں نیا عزم و ارادہ پیدا کرتے

[1] راجہ جے کشن داس مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے انگریزی حکومت کی نمایاں خدمت انجام دی جس کے صلے میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جس سے مروجہ رسم ورواج وذات پات کے بکھیڑے نے ہر شخص کو نفاق کی صورت تیار کیا ہے اور ایک فرقہ والا دوسرے فرقہ کو چار سے بدتر خیال کرتا ہے۔ ارحم الراحمین اہل ہند پر رحم فرمائے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتحاد و انسانی ہمدردی کی توفیق عطا فرماوے۔ دو قطعہ نصف نوٹ تعدادی دو سو روپیہ منجملہ چندہ اسٹریچی ہال ارسال ہیں۔ براہ عنایت رسید لطف فرمائیں کہ نصف نوٹ بھی روانہ کئے جاویں۔ آپ سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے دیکھنا چاہئے کہ کب زیارت نصیب ہوتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اچھی طرح سے ہیں۔ زیادہ نیاز۔

خاکسار جیکشن داس

۳ ستمبر ۱۸۸۵ء

از بنارس

خطوط سید علی بلگرامی[۱]

(۱)

ہیمکنڈ

۷ار نومبر ۱۸۹۱ء

مخدومی و معظمی

میں نہایت سخت نادم ہوں کہ آپ کے بزرگانہ عنایت ناموں کا جواب اس وقت تک نہیں لکھ سکا۔ میں اس عرصہ میں برابر سفر میں رہا اور اطمینان سے بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

(بقیہ حاشیہ ملاحظہ کریں) انھیں میونٹی میڈل اور سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ راجہ جے کشن داس نے بھی سر سید کے اثر سے متعلق سماجی فلاح و بہبود کے کام انجام دیئے۔ سر سید اور راجہ جیکشن داس میں برادرانہ مراسم تھے۔ راجہ صاحب کے لئے سر سید نے اپنے مکان میں ایک علیحدہ باورچی خانہ بنوایا تھا اور جب وہ سر سید کے یہاں قیام کرتے تو اپنا کھانا خود تیار کرتے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں جب علی گڑھ سے سر سید کا تبادلہ بنارس ہوا تو سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری راجہ جے کشن داس مقرر ہوئے اور ۱۲ر فروری ۱۸۷۴ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں سوسائٹی کا لائف آنریری کو پریسیڈنٹ بنایا گیا۔

[۱] سید حسین بلگرامی کے چھوٹے بھائی مولوی سید علی بلگرامی ۱۰ر نومبر ۱۸۵۱ء کو پیدا ہوئے انھیں یورپ اور ہندوستان کی کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ۱۸۹۳ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر ہونے اور انڈیا آفس لائبریری کے عربی، فارسی مخطوطات کی فہرست تیار کی۔ سید علی بلگرامی کی تصانیف و تراجم میں ذیل کی کتابیں مشہور

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں آپ کی اس عنایت کا بدل مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے ٹرسٹی مدرسۃ العلوم بنانے کا ارادہ فرمایا ہے اور مجھے جلسہ کانفرنس میں بھی یاد فرمایا ہے۔ لیکن جلسہ کانفرنس میں شریک ہونا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے کیونکہ ۱۶ ر دسمبر سے ۱۰ ر جنوری تک مجھے مدراس یونیورسٹی کے امتحانوں میں مصروف رہنا پڑے گا۔ اس سال میں بھی میرے پاس دو ایم اے کے پرچے ہیں اور ایک انٹرنس کا۔ انٹرنس کے پرچہ کا دن ۱۶ ر دسمبر ہے لیکن مدراس پریسیڈنسی اس قدر وسیع ہے اور اوس کے چند مقامات ریل سے اس قدر دور ہیں کہ حیدر آباد تک پرچے پہنچنے میں کم سے کم بارہ روز لگتے ہیں یعنی گویا جلدی سے جلدی ۲۵ ر دسمبر تک کل پرچے میرے پاس پہنچیں گے۔ پس ۲۶ ر دسمبر سے پہلے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا۔ پار سال بھی میرے دیر میں الہ آباد پہنچنے کی یہی وجہ ہوئی ورنہ میں جلسہ کانفرنس میں شریک ہو سکتا۔

مضمون البتہ میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ ابھی تک میں نے سوچا نہیں کہ کون سے مضمون پر میری تحریر ہوگی۔ یہ چند مضمون خیال میں ہیں

(۱) کتاب کلیلہ و دمنہ یہ کہاں سے آئی اور اس کی سرگذشت اور ضمناً اور حکایات و قصص کا ذکر جن کو مسلمانوں نے دوسری اقوام سے لیا ہے۔

(۲) مسلمانوں نے کن کن علوم کی کتابوں کا کن کن زبانوں سے ترجمہ کیا

(۳) زبان فارسی۔ فارسی قدیم ژند پہلوی پاژند فارسی جدید ان کے تعلقات آپس میں اور سنسکرت کے ساتھ۔

(۴) فلسفہ ابن رشد ترجمہ کتاب رینان

انشاء اللہ میں ان میں سے کسی ایک پر لکھوں گا اور حتی الامکان خود بھی کانفرنس میں حاضر ہوں گا۔ لیکن حاضری کا وعدہ نہیں کرتا

کانفرنس سال گذشتہ نے جس فرمائش سے مجھے عزت بخشی ہے اوس کا جواب علیحدہ بھیجتا ہوں۔

عریضہ

سید علی بلگرامی

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) . ہیں - ۱- میڈیکل جورس پروڈنس۔ ۲۔ رسالہ در تحقیق تالیف کلیلہ و دمنہ۔ ۳- تمدن عرب - ۴- تمدن ہند وغیرہ۔

[illegible] میں جب سرسید حیدر آباد آئے تو سید علی بلگرامی نے انھیں اپنا کتب خانہ دکھایا اس میں دوسری کتابوں کے علاوہ ایک ایسی کتاب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

(۲)

ہمکنڈ
۵ ڈسمبر ۱۸۹۱ء

مکرمی و معظمی

والانامہ نے سرفراز کیا۔ قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دے سکوں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کانفرنس کا جلسہ کن تاریخوں میں ہوگا اور ٹرسٹیوں کا جلسہ کب ہوگا اور اڈریس کس تاریخ کو دیا جاوے گا۔

مضمون میں نے لکھنا شروع کر دیا ہے اگرچہ مہلت بہت کم ہے لیکن امید ہے کہ ختم ہو جاوے گا۔

سارٹیفکٹ جو آپ نے میر شاکر علی صاحب کو مرحمت فرمایا ہے اوس کا بدل تشکریہ ادا کرتا ہوں اگر آپ آخر دسمبر تک الہ آباد میں تشریف رکھیں تو شاید میری فیلوشپ یونیورسٹی کے واسطے بھی تحریک کرنے کا آپ کو موقع ملے گا۔ سید محمود صاحب تو وہاں پر ہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہنٹ صاحب اور جسٹس اسٹریٹ بھی مدد کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔ اور شاید اور انگریزی بھی جن سے میں الہ آباد میں ملا ہوں میری مخالفت نہیں کریں گے لیکن ان باتوں کو آپ خود جانتے ہیں۔

جناب سید محمود صاحب اور نواب وجیہہ الدین کو بہت بہت سلام پہنچے۔

سید علی بلگرامی

خطوط جسٹس محمد شاہ دین[1]

(۱)

لاہور۔ ۳ اپریل ۱۸۹۴ء

مخدومی جناب سید صاحب السلام علیکم

یہاں لاہور میں افواہ ہے کہ آپ کے مجوزہ ڈیپوٹیشن کے ساتھ جناب سید محمود صاحب تشریف نہیں لاویں گے۔ خدا کرے یہ افواہ سچ نہ ہو کیونکہ آپ کے ہمراہ انکا تشریف لانا نہایت ضروری ہے اور یہاں کے انگریزی داں

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) بھی تھی جس میں اندلس میں مسلمانوں کی بنوائی ہوئی عمارتوں کے نقشے اور اس سے متعلق بہت سی تصویریں تھیں۔ سر سید نے اس کتاب کی تعریف کی اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ مدرسۃ العلوم کے کتب خانہ میں رہے تاکہ مسلمان دیکھیں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

[1] یہ نمبر اگلے صفحہ پر دیکھئے)

نوجوان (ہندو اور مسلمان) انکے دیکھنے کے بہت مشتاق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر جناب سید محمود صاحب آپکے ساتھ تشریف لائے تو پنجاب پر اور خصوصاً لاہور کی تعلیم یافتہ پارٹی پر آپ کے ڈیپوٹیشن کا بہت بھاری اثر ہوگا اور اگر وہ تشریف نہ لائے تو بہت صاحبان مایوس ہوں گے۔ پس آپ انکو اپنے ہمراہ اگر ہو سکے تو ضرور لایئے۔ ان کی خدمت میں میری طرف سے بھی عرض کر دیجئے کہ ان کا پنجاب میں تشریف لانا ڈیپوٹیشن کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

باعث افسوس ہے کہ جناب نواب محسن الملک بہادر آپ کے ہمراہ نہیں آ سکتے۔ یہاں کے لوگ ان کے دیکھنے کے بہت شائق ہیں اور انکے آنے سے آپ کے ڈیپوٹیشن کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ اگر وہ بمبئی سے واپس آ سکیں تو انکو آپ ضرور ہمراہ لاویں

میرا ارادہ ہے کہ لاہور میں آپ کی تشریف آوری پر سٹریچی ہال کے لئے چندہ میں آپ کی نذر کروں۔ وہاں غالباً میرے نام کے لئے کوئی جگہ خالی ہوگی

خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب یہاں فراہمی چندہ کے لئے بہت کوشش کر رہے ہیں۔

ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں میرے بڑے بھائی محمد ظہور الدین صاحب پلیڈر کی سعی سے چندہ جمع ہو رہا ہے۔

نیاز مند

محمد شاہ دین

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) اور عبرت حاصل کریں۔ سید علی بلگرامی نے سرسید کی رائے سے اتفاق کیا اور چلتے وقت وہ کتاب سرسید کی گاڑی میں رکھدی۔

لے جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں، باغبانپورہ، لاہور میں ۲ اپریل ۱۸۶۸ء کو پیدا ہوئے۔ شاہ دین پنجاب کے پہلے مسلمان تھے جو تعلیم کی غرض سے انگلستان گئے اور ۱۸۹۰ء میں بیرسٹر ہو کر ہندوستان واپس ہوئے۔ شرع محمدی میں انھیں مہارت حاصل تھی چنانچہ اسی بنا پر انھیں پنجاب ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ سرسید تحریک کے حامیوں میں تھے۔ ۱۸۹۴ء میں جبکہ انکی عمر ۲۶ سال تھی سرسید نے انھیں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر بنایا۔ اہل پنجاب کی تعلیمی پیش رفت کے سلسلے میں شاہ دین نے نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انھیں خدمات کے اعتراف کے طور پر اقبال نے کہا تھا

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی

تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی

(۲)

لاہور - ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۲ء

مخدوم بندہ و مخز قوم جناب سید صاحب السلام علیکم

جناب کا عنایت نامہ شرف صدور لایا - جواب عرض کرنے میں اس وجہ سے دیر ہوئی کہ میں ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے بمقام چنیوٹ گیا ہوا تھا اور اس کے بعد بھی تین یوم کے لئے بمقام جالندھر جانا پڑا - محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پریزیڈنٹ ہونا ایک ایسی بڑی عزت ہے کہ میں اپنے تئیں کسی حالت میں اس کے لائق نہیں سمجھ سکتا لیکن بایں خیال کہ آپ کے بزرگانہ حکم کی تعمیل نہ کرنا داخل گستاخی ہے مجھے جرأت نہیں کہ میں اس عزت کو قبول کرنے سے انکار کروں بہتر ہوتا اگر پنجاب کا کوئی اور بزرگ اس کام کے سرانجام کرنے کا ذمہ دار ہوتا مگر جس حالت میں آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ میرے کمزور کندھوں پر یہ قوی بوجھ رکھا جائے تو میں بجز اس کے اور کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کرنے کو بسر و چشم تیار ہوں - میں ان بزرگوں کا بھی بہت ممنون ہوں جو کہ میرا پریزیڈنٹ ہونا پسند فرماتے ہیں -

نیاز مند
محمد شاہ دین

اگر میرا پریزیڈنٹ ہونا ممبران مینیجنگ کمیٹی منظور فرمادیں تو امید ہے جناب اس امر کی بھی جلدی اطلاع فرمادیں گے

(۳)

لاہور - ۱۰ فروری ۱۸۹۵ء

مخدومی مکرمی جناب سر سید احمد خاں صاحب بہادر

ایکے کانفرنس کے موقع پر مجھے اپنے چند احباب کے ساتھ آپ کے باغ متعلقہ بیت العلوم کے دیکھنے کا اتفاق ہوا میں نہایت خوش ہوا تھا کہ آپ کا باغ نہایت عمدہ حالت میں تھا اور خصوصاً بعض نہایت عمدہ قسم کے آموں کے درخت میں نے وہاں دیکھے ہیں - میرے عزیز میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا کے والد میاں دین محمد صاحب بھی اس وقت میرے ساتھ تھے جبکہ آپ کے باغ کی میں نے سیر کی تھی اور انہوں نے آپ کے آموں کا ذخیرہ ملاحظہ کیا تھا - چونکہ انکو آموں کے عمدہ درخت لگوانے کا نہایت شوق ہے

اور چونکہ آپ کے باغ میں لنگڑے کے چند پیڑ موجود تھے جو کہ آپ کے مالی کے قول کے موجب آپ بوقت ضرورت فروخت کر دیا کرتے ہیں اس لئے التماس ہے کہ اگر آپ لنگڑے کے کم از کم ۱۵ پیڑ فروخت کر سکیں تو میں نہایت ممنون ہوں گا۔ میرے عزیزوں کے ہاں چند باغ ہیں جن میں وہ اس قسم کے آموں کا ذخیرہ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہاں پنجاب میں لنگڑے کے پیڑ بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔
نہایت خوشی کا مقام ہے کہ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس پر نواب محسن الملک بہادر اور جناب والا کی قدمبوسی حاصل ہوگی
اس بات کے سننے سے نہایت افسوس ہوا ہے کہ جناب سید محمود صاحب آپ کے ہمراہ تشریف نہیں لا سکتے۔

نیازمند
محمد شاہ دین

(۴)

باغبانپورہ - لاہور
۲۷ر فروری ۱۸۹۵ء

مخدومی و مکرمی جناب سر سید احمد خاں صاحب بہادر
السلام علیکم - فرمائیے جناب کے مزاج اب کیسے ہیں امید ہے کہ جناب کی طبیعت اب بالکل درست ہوگی فرمائیے ریل کے سفر سے کچھ تکلیف تو نہ ہوئی تھی۔ یہاں آپ کے سب نیازمندوں کا خیال آپ کی فکر تھا تاکہ آپ بخیر و عافیت علیگڈھ تک پہنچ جاویں
جناب کو یاد ہوگا کہ میں نے تھوڑا عرصہ ہوا آپ کو ایک نیازنامہ آم کے درختوں کے متعلق لکھا تھا اور اس کے جواب میں آپنے فرمایا تھا کہ ان درختوں کے یہاں بھیجنے کی نسبت لاہور میں آکر فیصلہ کیا جاوے گا۔ یہاں چونکہ آپ کی طبیعت علیل ہوگئی تھی اس لئے اس امر کے متعلق میں نے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہیں خیال کیا تھا - اب پھر آپ کی خدمت میں یہ نیازنامہ تحریر کر کے یاد دلانے کی تکلیف دیتا ہوں -
یہاں ہمیں لنگڑے کے ۱۵ درختوں کی ضرورت ہے جنکی قیمت جناب فرماتے ہیں ایک روپیہ فی درخت ہوگی انکو یہاں ارسال کرنے کے متعلق یہ عرض ہے کہ جتنے درخت آپ ہمیں عنایت کرنا چاہیں انکو

ایک ایک درخت ایک گملہ میں لگوادیں تاکہ قریباً ۷ ۔ ۸ روز کے لئے وہ درخت گملوں میں رہیں اور جڑ پکڑ جاویں اس کے لئے اگر پندرہ درخت ہوں تو پانچ پانچ گملے ایک ٹوکرے میں رکھ کر ہر ایک گملہ کے درخت کو ایک لکڑی سے سہارا دیا جاوے تاکہ درخت جنبش کھا کر ٹوٹ نہ جائے یا اس کی جڑ کمزور نہ ہونے پائے اسی صورت میں پندرہ گملے تین ٹوکروں میں رکھے جاویں گے اور وہ ٹوکرے بذریعہ ریل بہ آسانی آسکیں گے۔ اسی طریقے سے آم کے درخت سہارنپور اور دیگر مقامات سے منگوائے گئے ہیں۔ آپ براہ مہربانی اپنے مالی کو فرمادیں کہ وہ سارے خرچ کا حساب تبلادے اور آپ کے نوازش نامہ کے آنے پر قیمت درخت معہ دیگر خرچ کے ارسال کی جاوے گی۔ ریل پر آپ ان درختوں کو میرے نام بیرنگ ارسال فرمادیں۔

نیاز مند

محمد شاہ دین

خطوط سید حسین بلگرامی [1]

(۱)

حیدرآباد دکن ۸ محرم الحرام ۱۳۰۶ھ

جناب مخدومی و مکرمی و مطاعی و معظمی

آپ کا مرحمت نامہ پہونچا۔ آپ نے اپنی فرط عنایت اور جوش محبت قومی سے میری نسبت اور میرے خط کی نسبت ایسے کلمات استعمال فرمائے ہیں کہ اگر میں اپنی ناچیز تحریر کی داد چاہتے ہیں انتہا سے زیادہ حریص

---

[1] سید حسین بلگرامی ابن سید زین الدین حسن اکتوبر ۱۸۴۲ء میں صاحب گنج ضلع گیا میں پیدا ہوئے ۱۸۶۶ء میں کلکتہ سے بی اے کی ڈگری لی اور لکھنؤ میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ انھیں دنوں وہ لکھنؤ ٹائمز کی ادارت کی۔ ۱۸۷۳ء میں سید حسین بلگرامی سالار جنگ کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے۔ یہاں عربی کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ دائرۃ المعارف قائم کیا۔ سرسید نے جب قوم کو نئی زندگی کے قبول کرنے کی دعوت دی تو سید حسین نے لبیک کہا۔ انھوں نے یہی نہیں کہ تعلیمی امور میں سرسید کے افکار و خیالات کی تبلیغ کی بلکہ سیاسی امور میں بھی وہ سرسید کے ہم خیال اور ہم مسلک تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی جیب سے مدرسۃ العلوم کی امداد کی بلکہ حکومت آصفیہ کو بار بار امداد کی ترغیب دی۔ وہ مدرسۃ العلوم کے ٹرسٹی، مسلم یونیورسٹی کے فیلو اور انڈیا کونسل کے ممبر تھے۔ ۳ جون ۱۹۲۶ء کو انتقال ہوا۔ امجد حیدرآبادی نے تاریخ وفات کہی

بلگرامی مولوی سید حسین
رفت در ظل حسین ابن علی

رحمت حق از لب امجد گفت
یا عماد الملک ادخل جنتی

ہوتا تو بھی اون سے میری غرض پوری ہو جاتی اور عالم کے تحسین سے مستغنی ہو جاتا۔

میرے خط سے جو کام لینا آپ مناسب تصور فرمائیں مجھ سے پوچھنے کی حاجت نہیں ہے۔ میں ایک تحریر اس باب میں اور بھی لکھنے والا ہوں انشاء اللہ آپ کی نظر سے گذرے گی مجھے امید توی ہے کہ اگر ہم سب لوگ باتفاق سعی و کوشش کریں تو یہ بلا ہمارے سر سے ٹل جائے گی۔ میرے نزدیک زیادہ تر ہندو رئیسوں کو اور عمائد کو ان میں شریک کرنا چاہیئے اور مسلمانوں کو اون سے علیحدہ نہیں کرنا چاہیئے۔ راجہ بھنگا کا رسالہ اس باب میں نہایت عمدہ ہے۔ مگر اشاعت کا محتاج ہے۔ میرا خط بھی جیسا چاہیئے شائع نہیں ہوا۔

اس بحث کو ہر وقت تازہ رکھنا مناسب ہے۔ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا چاہیئے۔ مولوی مہدی علی صاحب نے بھی اپنی رائے ظاہر کردی ہے اگرچہ بہت احتیاط کے ساتھ۔ اون سے بھی صاف صاف اس مقدمہ میں کلام کرانا چاہیئے ایسا ہو کوئی مصلحت خاص اون کو ساکت کردے۔ نواب سرسالار جنگ نے پونے کے مقام میں ایک اسپیچ میں اشارۃً اپنی رائے ظاہر کی ہے اون سے بھی مدد لینی چاہیئے۔ میں اون کو لکھتا ہوں۔

قواعد و ضوابط اسوسی ایشن کے پہنچے۔ بہت خوب ہیں۔ ۳ر اور ۴ر ستمبر کا بمبئی گزٹ اگر آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا ہے تو اون کو ملاحظہ فرمائیے۔ میرے نزدیک اوس کی رائے قابل غور کے ہے۔ فقط مخالفت کانگریس کافی نہیں ہے کچھ راستہ بھی بتانا چاہیئے۔ میں انشاء اللہ اپنی دوسری تحریر میں اس بابت کچھ لکھوں گا۔ راجہ امیر حسن خاں معلوم نہیں کس طرف ہیں۔ اون سے بھی مدد لینی چاہیئے۔ عجب یہ ہے کہ کانگریس والے کسی دلیل کا جواب نہیں دیتے۔ فقط گالیاں دیکر اپنے خصم کو ساکت کیا چاہتے ہیں۔ ہندو پیٹریٹ نے تو مذہبی تکرار چھیڑ دی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر کانگریس کو اپنے مقصوبات میں کامیابی حاصل ہوئی تو مسلمان برباد ہوجائیں گے میں عرض کرتا ہوں کہ گورنمنٹ برباد ہوجاویگی۔ معلوم نہیں گورنمنٹ کس خیال میں ہے۔ یہ میں نے مانا کہ بظاہر کوئی روک یا ممانعت نہیں کرسکتی مگر گورنمنٹ کے پاس بہت سے ذرائع اس قسم کے ہیں کہ جن سے یہ شورش فرو ہوسکتی ہے۔ جو کچھ ڈر ہے وہ خود انگلستان کے نادان ریڈیکل لوگوں سے ہے۔

بہرحال مجھ سے جو کچھ خدمت آپ لینا چاہیں میں حاضر ہوں۔ میرا قلم۔ میری زبان۔ میرا مال۔ میری جان تک حاضر ہے۔ زیادہ آداب و تسلیمات

سید حسین،

(۳)

حیدرآباد ۱۰ر اگست سنہ ۹۴ء

جناب مخدومی و مطاعی و معظمی دام مجدکم

محمد شاہ دین صاحب کا بہانہ بہت مبارک بہانہ تھا کہ اوس نے ایک مرحمت نامہ آپ کا مجھے پہونچایا۔ میں اسوقت چند کلمہ نہ فقط مرحمت نامہ کے شکریہ میں لکھتا ہوں بلکہ اس موقع کو ایک غرض شکایت میں صرف کرتا منظور ہے وہ یہ کہ آپ مجھ سے ایسے کلمات اور خطابوں سے یاد فرماتے ہیں کہ اون کا آپ کے قلم سے نکلنا مجھے محجوب کرتا ہے۔ آپ شاید نہیں جانتے ہیں کہ میں اپنے دل میں اور ایمان میں آپ کو کیا سمجھتا ہوں اور آپ کی نسبت کس قسم کے خیالا رکھتا ہوں۔ آپ کی وقعت اور عظمت میرے دل میں اوس سے زیادہ ہے کہ میں بیان کرسکوں۔ کوئی فرد بشر جو شاید آپ سے عقیدت درویشی رکھتا ہو وہ بھی آپ کو اس نظر سے نہ دیکھتا ہوگا اور یہ عقیدہ میرا اوس کام کا ماحصل ہے جو میرے نزدیک آپ نے ہماری قوم کے واسطے کیا ہے

پھر آپ خود انصاف فرمائیے کہ آپ کے اس قسم کے مخاطبت سے میں کیوں نہ محجوب ہوں۔

وظائف نظامیہ اس وقت تک جھگڑے میں پڑے ہیں لکھتے لکھتے تھک گیا مگر کچھ شنوائی نہیں ہوتی۔ اب کسی قدر امید ہے کہ یکسوئی ہوجائے

جہاں تک میں جانتا ہوں صاحب رزیڈنٹ بہادر باہر کے لوگوں کو مدد دینے کے مخالف ہیں۔

یہاں کا حال آپ پر روشن ہے۔ میں بھی سسک رہا ہوں معلوم نہیں اب کیا کایا پلٹتی ہے۔

سید محمود کو میری طرف سے پیار کیجئے اور گلے لگائیے اور فرمائیے کہ میں تحریر اپنی تمہارے پاس بھیجنے والا ہوں اپنی منتقدانہ رائے لکھنا۔ میں معمولی تعارف سے خوش نہ ہوں گا اور نہ خاموش رہوں گا۔

مولانا شبلی اور مولانا حالی اور مسٹر بک کو میرا بہت بہت سلام۔

آپ کا خادم دیرینہ

سید حسین

(۲۳)

حیدرآباد دکن ۲۵ اپریل ۱۸۹۵ء

جناب مخدوم مکرم و مطاع محترم دام مجدہ

مرحمت نامہ پہونچا۔ آپ کی تحریروں کو میں جس قدر زیادہ باعث فخر و مباہات سمجھتا ہوں شاید اوسکا اندازہ آپ نہیں فرماسکتے۔ ایک پرچہ بھی آپ کا لکھا ہوا مجھے عزت بخشتا ہے اور اوس کے شکریہ میں میری زبان قاصر ہے۔

نواب وقار الامراء بہادر نے میری ابتدائی تحریک پر حکم دیا تھا کہ بقایا وظائف نظامیہ ادا کردیا جائے

اور آئندہ کے واسطے مقدمہ تجویز و حکم کی غرض سے پیش ہو۔ چنانچہ میرے دفتر سے اس حکم کے بنا پر کئی مرتبہ رقم کے واسطے تحریک کی گئی اور ہزار خیراتی رقم بالا بالا آپ کی خدمت میں پہونچائی گئی۔

آئندہ کے بارے میں نواب صاحب کی رائے اچھی ہے۔ میں نے جناب کے تحریر کے موافق کیفیت ساری گوش گزار کر دی ہے اور نواب صاحب نے اقرار فرمایا ہے کہ میں وظائف بند نہ ہونے دوں گا۔ مگر جب تک کہ تحریری حکم نہ مل جائے اس کا اعتبار نہیں ہے یہاں بہت نا عاقبت اندیش اس قسم کے جمع ہیں جن کو علی گڈھ کی اعانت شاق ہے۔ بعضوں کو ذاتی خصومت آپ کے ساتھ ہے اور بعض باہر کے لوگوں کی اعانت کو فضول سمجھتے ہیں مگر خود نواب وقار الامرا بہادر کے خیالات روشن ہیں اور امید نہیں ہے کہ وہ اس معاملہ میں کسی طرح بخیل فرمائیں۔

واقعی فیس کی زیادتی مسلمان طلبہ کے حق میں نہایت مضر ہوگی۔ میں اپنے ذاتی تجربہ سے جانتا ہوں کہ طالب علمی کے زمانہ میں اگرچہ جناب والد مرحوم مجھے ساٹھ روپیہ ماہوار اخراجات کے واسطے عنایت فرماتے تھے مگر کالج کی فیس جو مجھے دینی پڑتی تھی وہ اس قدر گراں تھی کہ اگر مجھکو اول درجہ کا وظیفہ ہمیشہ نہ ملا ہوتا تو میرا کالج میں رہنا دشوار ہوتا۔ لا کلاس کی فیس ملا کر مجھے ۲۵ ماہانہ دینا پڑتا تھا مگر اول درجہ کا گورنمنٹ اسکالرشپ میٹرکولیشن کے بعد ۳۰ اور ایف اے کے بعد ۵۰ میں پاتا رہا اس وجہ سے مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ غریب مسلمان طلبہ ہرگز سنگین فیس ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور میں نہیں سمجھتا ہوں کہ موجودہ وظائف بھی آپ کے واسطے کافی ہوں گے۔ اگر ممکن ہو تو اس کے علاوہ بھی کوئی فکر کرنی چاہیئے انشاء اللہ اس بارہ میں جو کچھ میرے ذہن میں آتا ہے میں عرض کروں گا۔ افسوس ہے کہ اصل درد کی کوئی تشخیص نہیں کر سکتا۔ ہزار میں ایک مسلمان بھی نہیں سمجھتا کہ ہماری ضرورتیں کیا ہیں اور علی گڈھ کا مدرسہ کیا کر رہا ہے۔ میرا عقیدہ اپنی قوم کے ساتھ اس گئے گذرے پر بھی ایسا واثق ہے کہ میرے نزدیک اگر تمام قوم اصل واقعہ کو برائی العین دیکھ سکے اور سمجھ سکے تو آپ کے مدرسہ کا مال بے طلب چندہ کی رقموں سے بھر جائے

یہاں کے کالج کو اس سال بی اے میں بہت نمایاں کامیابی ہوئی۔ ایک مسلمان لڑکا اول درجہ میں کامیاب ہوا اور طبیعیات اور کیمیا میں تمام یونیورسٹی میں اول رہا۔ اوس کے سوا تین طلبہ پورے طور سے کامیاب ہوئے۔ اور باقی بعض مباحث میں کامیاب ہوئے۔ باقی مباحث میں اسی سال کے آخر میں امتحان دیں گے۔ رفتہ رفتہ ترقی ہوتی جاتی ہے۔ باقی پولیٹیکل حالت یہاں کی ناگفتہ بہ ہے۔ شاید آپ خارجاً سنتے ہوں گے۔ خدا اس ریاست کو آفات سے محفوظ رکھے۔

آپ کا خادم دیرینہ
سید حسین

(۴)

پانچگنی ۵ رجون ۱۸۹۵ء

جناب مخدوم مطاع معظم دام مجدکم

عنایت نامہ پہونچا۔ چونکہ میں حیدرآباد چھوڑ چکا تھا اس واسطے لفافہ وہاں سے بہ تبدیل نشان یہاں بھیجا گیا۔ آپ نے جو کچھ میری میری حقیر اعانت مدرسے کی نسبت تجویز فرمایا ہے دراصل اوس کی اور میری وقعت سے بہت زیادہ ہے مگر آپ کی تحریر اس قسم کی ہے کہ ہم کو بجز اطاعت کے اور کوئی چارہ نہیں ہے کالج کی طرف سے جو عرضداشت اضافہ فیس کی بابت لکھی گئی ہے اوس کا بھی ایک چھپا ہوا نسخہ مجھے ملا اور میں نے اوسے از اول تا آخر دیکھا۔

فی الواقع نہایت عمدہ اور مدلل لکھا گیا ہے اور مجھے تو امید ہوتی ہے کہ وہ کارگر ہوگا۔ اور اگر کارگر نہ ہوا تو میرے نزدیک آپ کو ایک اور حملہ خیرخواہان قوم کے جیبوں پر کرنا چاہئے۔ مجھے پوری امید ہے اگر زیادہ نہیں تو ایک متوسط اور معتدبہ حدود تک کامیابی ضرور ہوگی۔ ایسے لوگوں کی تعداد جنہوں نے اپنے خردسالی کا کوئی حصہ علی گڈھ کالج میں صرف کیا ہے اب بہت زیادہ ہے اور یہ لوگ یقیناً اپنے اپنے مقدور کے موافق مدد کریں گے۔ میرے دو لڑکے اگرچہ ابھی تک ملازم نہیں ہیں محض کارآموز ہیں مگر کسی قدر تنخواہ اونکو ملتی ہے۔ میں فیس کے مقدمہ کو اونکے سامنے پیش کروں گا۔ یقیناً وہ بھی کسی قدر مدد کریں گے۔ زیادہ نہیں تو سردست دس روپیہ ماہانہ تو میں اون سے دلوا سکتا ہوں۔ دیکھئے انشاءاللہ میں حیدرآباد واپس جانے کے بعد اس بادہ میں اور بھی کوشش کروں گا۔ فیس کا اضافہ معاف ہو یا نہ ہو کسی قدر کوشش ضرور ہونی چاہئے۔

میں آئندہ جمعہ کے روز یہاں سے سوار ہوں گا اور انشاءاللہ ہفتہ کی شام کو حیدرآباد پہونچونگا۔

اس عریضہ کا جواب اگر لائق جواب ہو تو حیدرآباد ہی کو روانہ فرمائیے۔

"علی گڈھ کالج میگزین" میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا۔ میرا بھی نام شریک فرمادیجئے اور ایک سال کی قیمت سے مطلع فرمائیے میں پیشگی بھیج دوں گا۔

فقط عریضہ نگار

سید حسین بلگرامی

(۵۱)

حیدرآباد ۱۹ دسمبر

جناب مخدومی مطاعی معظمی

نواب وقارالامرا اپنے بھانجے کو جن کی عمر سولہ برس کی ہے علی گڈھ بھیجنا چاہتے ہیں اور آپ سے دریافت فرماتے ہیں کہ آپ ان کو مدرسہ میں لے سکیں گے یا نہیں۔
یہ لڑکا مدرسہ عالیہ میں بورڈر تھا مگر بہت آوارہ اور نہایت خراب ہے۔ نواب صاحب نے مجبور ہو کر مدرسہ سے نکال لیا ہے اور اپنے پاس قید میں رکھا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ اوس کو لے لیویں تو وہ اوس کے ساتھ یہاں کا کوئی نوکر بھی نہ بھیجیں۔ آپ اپنی مرضی کے موافق وہاں نوکر یا محافظ ضرورت کے موافق رکھ سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کا جواب جلد عنایت فرمائیں گے

نواب صاحب نے حکم دے دیا ہے کہ اس مرتبہ بقایا وظائف نظامیہ ادا کر دیا جائے اور سال آئندہ کے واسطے غور کیا جائے کہ یہ قایم رہیں گے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت آپ کے ہاں سے ایک بل بقایات کی پیش ہو تو مناسب ہے اوس بل کی رقم بوثیقہ حکم نواب مدار المہام طلب کر لوں گا۔
آپ لوگوں نے رقم سہ ماہی پیشگی وصول کرنے کے بابت کیا فیصلہ فرمایا۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ عموماً لوگ دے سکیں گے لوگ علی العموم اس قدر احتیاط اور پیش بندی کے عادی نہیں ہیں۔ غریبوں اور امیروں کو یکساں بنانے کے بارے میں کیا تجویز قرار پائی۔

آپ کا خادم
سید حسین بلگرامی

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی بمبئی

صوبہ بمبئی کے قدیم اردو مطابع و مطبوعات

۱۸۵۷ء سے قبل

راقم الحروف جس زمانہ میں "اردو ٹیچرز" پر گورنمنٹ آف مہاراشٹرز ارکائیوز میں کام کر رہا تھا اُسے بہت سے خوشگوار حقائق اور تلخ تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔

میں نے خوشگوار کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ ہمارے ریسرچ اسکالرز کے بہت سے فرائض برٹش اسکالرز انجام دے چکے ہیں اور اب ہمیں اس سے زیادہ فرض انجام دینا نہیں پڑتا کہ ہم انہیں ایک مقالے کی صورت میں پیش کردیں۔

عنوان بالا دیکھنے میں جس قدر آسان معلوم ہوتا ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے کیونکہ عہدِ انگلشیہ میں اگر کسی زبان کی قدر و قیمت تھی تو صرف انگریزی کی۔ باقی زبانیں سیاسی بازی گری کا کرشمہ تھیں۔ ہر ایک کو دس دس ہزار کی گرانٹ دیدی اور بس۔

آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں کبھی اُردو زبان۔ اردو ادب۔ اردو پریس اور اُردو اخبارات و رسائل کی مکمل رپورٹ مرتب نہیں کی۔ سالانہ رپورٹوں میں سرسری ہے گا ہے جس قدر چھپ گیا وہی آج ہمارا سرمایہ ہے

اس بے سروسامانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ریسرچ اسکالرز کو ہر میدان میں اُن مقامی اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے جو مقامی لائبریریوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ آف مہاراشٹرز آرکائیوز میں مندرجہ ذیل روزناموں کے فائلس ملتے ہیں جو ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ہیں۔

۱۔ بمبے کوریر۔ ۱۷۹۶ء تا ۱۸۴۶ء۔

" اینڈ ٹائمس ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء۔

۲ - بمبئی گزٹ ۱۸۰۹ء تا ۱۹۱۴ء -

۳ - بمبئی کرانیکل ۱۸۲۹ء تا ۱۸۳۶ء، ۱۸۴۰ء -

ان کے علاوہ اور بھی تیرہ۱۳ اخبارات کے فائلس ہیں جو آرکائیوز میں موجود ہیں۔ پھر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا وسیع کتب خانہ ہے جس میں سات مقامی اخبارات کے مکمل فائلس ہیں۔ مزید برآں اس آرکائیوز میں مندرجہ ذیل سنوں کے کیلنڈرز بھی ہیں جو ہماری معلومات کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں۔

فہرست "بمبئی کیلنڈرز"

۱۸۰۲ء ۱۸۰۵ء ۱۸۰۷ء ۱۸۰۸ء ۱۸۰۹ء ۱۸۲۱ء
۱۸۲۲ء ۱۸۲۳ء ۱۸۲۴ء ۱۸۲۵ء ۱۸۲۶ء ۱۸۲۷ء
۱۸۲۸ء ۱۸۲۹ء ۱۸۳۰ء ۱۸۳۱ء ۱۸۳۲ء ۱۸۳۳ء
۱۸۳۴ء ۱۸۳۵ء مع اضافہ ۱۸۳۶ء ۱۸۳۷ء ۱۸۳۸ء ۱۸۳۹ء
۱۸۴۰ء ۱۸۴۱ء ۱۸۴۲ء ۱۸۴۳ء ۱۸۴۴ء ۱۸۴۵ء
۱۸۴۶ء ۱۸۴۷ء ۱۸۴۸ ۱۸۴۹ء

فہرست "بمبئی کیلنڈرز اینڈ بک آف ڈائرکشن"

۱۸۵۰ء ۱۸۵۱ء ۱۸۵۲ء ۱۸۵۳ء ۱۸۵۴ء ۱۸۵۵ء
۱۸۵۶ء ۱۸۵۷ء ۱۸۵۸ء ۱۸۵۹ ۱۸۶۰

"فہرست المنک اینڈ ڈائرکٹری"
۱۸۶۲ء

"فہرست "بمبئی کیلنڈر اینڈ ڈائرکٹری"
۱۸۶۳ء ۱۸۶۴ء ۱۸۶۵ء ۱۸۶۶ء ۱۸۶۶ ۱۸۶۸ء

"فہرست بمبئی ٹائمس، کیلنڈر اینڈ ڈائرکٹری"
۱۸۵۲ء -

ان ذرائع سے جو معلومات عنوان بالا کے تحت ہم تک پہنچی ہیں وہ بہت ہی اہم ہیں اور مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت فراہم کی گئی ہیں (۱) سلسلہ نمبر (۲) کتاب یا اخبار کا نام - (۳) مصنف یا مترجم کا نام (۴) ایڈیٹر کا نام (۵) موضوع کتاب (۶) پریس کا نام جس میں وہ زیورِ علم سے مرصع ہوئی (۷) مقام اشاعت (۸) تاریخ اشاعت (۹) سائز اور صفحات کی تعداد (۱۰) قیمت کتاب -

۱- مطابع

نمبر شمار	مقام	نام پریس	تاریخ اجراء	اقسام طباعت
۱	احمد آباد	احمد آباد یونائیٹیڈ	۱۸۶۳ء	لیتھو۔ گجراتی۔ سنسکرت
۲	"	باجی بھائی امی چند	۱۸۴۵ء	" " " "
۳	"	چھگن لال مگن لال	۱۸۵۶ء	" " " انگریزی
۴	"	گورنمنٹ پریس (متعلقہ محکمہ کلکٹری)	نامعلوم	" " انگریزی اور سنسکرت
۵	"	گجرات ورناکیولر سوسائٹی	۱۸۵۱ء	" " "
۶	"	ہری لال تلسی رام	نامعلوم	" "
۷	"	ہمت بہادر	"	" " "
۸	"	جے شنکر مایا شنکر	"	" "
۹	"	جیون لال امبارام	"	" " انگریزی اردو۔ سنسکرت
۱۰	"	جورڈن (ٹی۔ ایس)	"	" " انگریزی "
۱۱	"	للو بھائی امی چند	۱۸۶۹ء	" " "
۱۲	"	للو بھائی کرن چند	۱۸۵۷ء	" " ہندی
۱۳	"	للو سر چند	۱۸۶۲ء	" " " مرہٹی
۱۴	"	مول جی امبارام	نامعلوم	" "
۱۵	"	نرائن ہری رام	نامعلوم	" "
۱۶	"	پستک ودیدھی کرنار منڈلی	۱۸۴۵ء	" " سنسکرت
۱۷	"	سروپ چند ڈالی چند	۱۸۶۳ء	" انگریزی "
۱۸	"	امید چند ہرگوند	۱۸۵۵ء	"
۱۹	"	یونیورسل	۱۸۶۵ء	" " "
۲۰	"	ورتمان	نامعلوم	" "
۲۱	"	ودیا بہادر	"	" " "
۲۲	احمد نگر	ورتیادی بھاؤ	۱۸۶۱ء	" مرہٹی

۲۳	میرج	نیتی درپن	۱۸۶۵ء	لیتھو مرہٹی
۲۴	"	ستیا دھن پرکاش	۱۸۶۵ء	" اردو
۲۵	"	ورتمان	۱۸۶۱ء	" گجراتی
۲۶	بلگام	دیش بندھو	نامعلوم	" اور ٹائپ۔ انگریزی۔ مرہٹی۔ کنڑی
۲۷	"	سماچار	۱۸۶۴	" " انگریزی۔ مرہٹی۔ کنڑی
۲۸	"	سیودہی پرکاش	نامعلوم	"۔ کنڑی
۲۹	بمبئی شہر و جزیرہ	اخبار سوداگر	۱۸۵۲	گجراتی
۳۰	"	امریکن مشن	نامعلوم	" مرہٹی۔ انگریزی۔ سندھی
۳۱	"	آیختیار امپیرل	۱۸۵۴ء	گجراتی انگریزی
۳۲	"	باپو ہرسیٹھ دیولیکر	۱۸۴۳ء	لیتھو۔ گجراتی۔ ہندی۔ مرہٹی۔ سنسکرت
۳۳	"	باپو سداسیو	نامعلوم	سنسکرت اور مرہٹی
۳۴	"	چھاپک	۱۸۳۳	گجراتی اور انگلش
۳۵	"	کوریر	نامعلوم	" " مرہٹی اور سنسکرت
۳۶	"	دفتر آشکارا	۱۸۴۰	" " پہلوی۔ فارسی مرہٹی۔ سنسکرت
۳۷	"	ڈی سوزا (ایل۔ ایم)	نامعلوم	" " اور انگریزی
۳۸	"	دیان پرودھک	۱۸۶۳	" اور لیتھو
۳۹	"	دیان درپن	نامعلوم	"۔ گجراتی اور سنسکرت
۴۰	"	دیانن سندھو	"	" اور سنسکرت
۴۱	"	ڈوربین	"	" "
۴۲	"	ایجوکیشن سوسائٹی	۱۸۴۰	" " انگریزی۔ گجراتی۔ کنڑی
۴۳	"	گنپت کرشن جی	۱۸۳۱	اردو۔ فارسی۔ ہبرو۔ یونانی سنسکرت۔ مرہٹی۔ ہندی۔ فارسی گجراتی۔ انگلش اور ہبرو
۴۴	"	گورنمنٹ لیتھو گرافک	۱۸۳۱	گجراتی۔ انگلش۔ مرہٹی

نمبر	مقام	نام	سنہ	زبان
۴۵	بمبئی شہر و جزیرہ	گراہم (ٹی)	نامعلوم	گجراتی۔ انگلش۔ سنسکرت
۴۶	〃	اندو پرکاش	سنہ ۱۸۶۱	گجراتی۔ انگلش۔ سنسکرت۔ مرہٹی
۴۷	〃	جام جمشید	سنہ ۱۸۲۳	گجراتی
۴۸	〃	جوائنٹ اسٹاک	سنہ ۱۸۶۳	گجراتی۔ انگلش
۴۹	〃	خوشحال جی رستم جی	نامعلوم	گجراتی۔ مرہٹی
۵۰	〃	لکشمن وتھوجی	〃	مرہٹی اور سنسکرت
۵۱	〃	مادھو چند ربھا	〃	〃 〃 اور گجراتی
۵۲	〃	مارو باپوجی	〃	〃 〃
۵۳	〃	اورنٹیل	〃	〃 〃 ۔ گجراتی اور انگریزی
۵۴	〃	پربھاکر	〃	〃 〃 〃 اور کنڑی
۵۵	〃	پرتھوی پرکاش	〃	〃 〃
۵۶	〃	پستک پرسیدہ	〃	〃 〃 〃
۵۷	〃	رام جی گانوجی	〃	〃 اور سنسکرت
۵۸	〃	سماچار	سنہ ۱۸۶۳ء	انگریزی۔ فارسی۔ ژند اور گجراتی
۵۹	〃	سروسنگرہ	سنہ ۱۸۶۰ء	مرہٹی
۶۰	〃	سکشا منڈلی	نامعلوم	〃 اور سنسکرت
۶۱	〃	یونین	سنہ ۱۸۵۸ء	〃 انگریزی۔ گجراتی۔ فارسی ہیبرو اور گریک
۶۲		ورتمان	نامعلوم	انگریزی۔ سنسکرت۔ گجراتی مرہٹی اور ژند
۶۳	پونہ	آپاجی باپوجی ٹیرسے پورکر	سنہ ۱۸۶۳ء	تیلگو۔ سنسکرت۔ مرہٹی
۶۴	〃	بال کرشن رام چند ٹھاکر	سنہ ۱۸۵۶ء	〃 〃 〃
۶۵	〃	بدھی پرکاش	نامعلوم	〃 〃 〃
۶۶	〃	دیان کلپشو	سنہ ۱۹۶۱ء	سنسکرت۔ مرہٹی
۶۷		دیان پرکاش	سنہ ۱۸۴۹ء	تیلگو۔ سنسکرت۔ مرہٹی۔ ٹائپ

نمبر	مقام	مطبع	سنہ	زبان
۶۸	پونہ	گنگادھر گووند سابکر	سنہ ۱۸۴۲ء	لیتھو۔ سنسکرت۔ مرہٹی۔ ٹائپ
۶۹	"	نارو آپاجی گاڈبولے	سنہ ۱۸۶۰ء	" مرہٹی
۷۰	"	پاٹ شالہ	نامعلوم	مرہٹی
۷۱	"	پونہ کالج	"	سنسکرت۔ انگلش اور مرہٹی
۷۲	"	وٹھل سکھارام اگنی ہوتری	سنہ ۱۸۴۵ء	مرہٹی۔ سنسکرت
۷۳	"	ودیتھ پرکاش	سنہ ۱۸۶۳ء	" "
۷۴	حیدرآباد۔ سندھ	وڈیا ساگر	سنہ ۱۸۶۵ء	" سندھی
۷۵	دمن	کاوس جی	نامعلوم	گجراتی
۷۶	دھارواڑ	دیان بودھک	سنہ ۱۸۶۴ء	لیتھو۔ سنسکرت اور کنڑی
۷۷	"	دیان ساگر	نامعلوم	لیتھو اور کنڑی
۷۸	"	بن مارگدشنکر	"	" مراٹھی اور کنڑی
۷۹	راجکوٹ	دیان گراہک	"	گجراتی
۸۰	رتناگیری	جگن متر	سنہ ۱۸۵۴ء	سنسکرت۔ مرہٹی۔ انگریزی۔ اردو
۸۱	ستارہ	شبھ سوچک	سنہ ۱۸۵۶ء	لیتھو۔ سنسکرت اور مرہٹی
۸۲	سنوالار	دیان بودھک	نامعلوم	" اور کنڑی
۸۳	"	سوالوز	سنہ ۱۸۶۱ء	" " اور فارسی
۸۴	سورت	دیسی متر	سنہ ۱۸۶۰ء	" اور گجراتی
۸۵	"	دیان ساگر	سنہ ۱۸۵۹ء	گجراتی
۸۶	"	قادری لیتھو	سنہ ۱۸۶۰	لیتھو (اردو)
۸۷	"	منُودے	سنہ ۱۸۵۹	" اور گجراتی
۸۸	"	مشن	سنہ ۱۸۱۷	مرہٹی۔ گجراتی اور انگریزی
۸۹	"	نیتی درپن	نامعلوم	لیتھو اور گجراتی
۹۰	"	نیایر پرکاش	سنہ ۱۸۶۵	"
۹۱	"	سورت متر	سنہ ۱۸۶۱	انگلش اور گجراتی
۹۲	"	سورت متر سوداگر	سنہ ۱۸۶۰	" "

۹۳	سورت	سورت ورتمان درپن	نامعلوم	لیتھو اور گجراتی
۹۴	〃	سوادیشی چو	〃	گجراتی
۹۵	کراچی	آرڈیشیر رستم جی	〃	〃 ۔ انگلش۔ سندھی اور فارسی
۹۶	〃	گورنمنٹ ایجوکیشنل	۱۸۷۵ء	لیتھو اور سندھی
۹۷	〃	〃 پریس (متعلقہ دفتر کمشنری)	سنہ ۱۸۶۴ء	〃 اور ٹائپ۔ انگلش۔ سندھی۔ فارسی
۹۸	〃	مفرح القلوب	۱۸۶۵ء	لیتھو۔ سندھی اور فارسی
۹۹	〃	سندین	نامعلوم	انگلش۔ سندھی اور فارسی
۱۰۰	〃	سندھ قاصد	سنہ ۱۸۵۴ء	〃 ۔ گجراتی اور فارسی
۱۰۱	〃	ودیا ونود	سنہ ۱۸۶۰ء	〃 〃 〃 اور سندھی
۱۰۲	کولہاپور	ودیان پرکاشنا	نامعلوم	سنسکرت اور مرہٹی
۱۰۳	〃	ورتمان سنگرہ	〃	〃
۱۰۴	کیرا	کھیڑا نیتی پرکاش	سنہ ۱۸۵۶ء	لیتھو اور گجراتی
۱۰۵	〃	کھیڑا ورتمان	سنہ ۱۸۶۱ء	گجراتی
۱۰۶	ناسک	گورنمنٹ	نامعلوم	مراٹھی
۱۰۷	ہلار (کاٹھیاواڑ)	پولیٹیکل ایجنسی گزٹ	سنہ ۱۸۶۳ء	گجراتی اور انگلش
۱۰۸	〃	ودیان گرانیک	سنہ ۱۸۶۴ء	〃 اور لیتھو

۲۔ مطبوعات

بزبان اردو

سنہ ۱۸۳۴ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۴ (۲) راج نیتی (۳) بھیرو پرشاد (۴) × (۵) فرائض شاہی (۶) گنپت کرشن جی (۷) بمبئی (۸) تاریخ اشاعت سنہ ۱۸۳۴ء (۹) سائز ۱۶ ایم او۔ ص ۳۱۵ (۱۰) قیمت سوا روپیے۔

سنہ ۱۸۵۰ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۲۲ (۲) ۔۔ بیج گنت (۳) باپو دیو شاستری ٹوکیکر (۴) × (۵) الجبرا (۶) گنپت کرشن جی (۷) بمبئی (۸) تاریخ اشاعت سنہ ۱۸۵۰ء (۹) سائز ۲۵ × ۸ ص ۳۲۱

(۱۰) قیمت نامعلوم۔

۱۸۵۰ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۲۷ (۲) بیج گنت (۳) باپو شاستری پراج پے (۴) × (۵) الجبرا (۶) گنپت کرشن جی (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) تاریخ اشاعت ۱۸۵۰ء (۹) سائز ۷.۵×۴: ۳۳۱ ص (۱۰) قیمت تین روپئے۔

۱۸۵۴ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۳۸ (۲) پریم ساگر (۳) رستم جی (۴) × (۵) لَو اور کرشن کی داستان محبت (۶) وتھل سکھارام (پریس) (۷) مقام اشاعت پونہ (۸) تاریخ اشاعت ۱۸۵۴ء (۹) ۴۸ ص (۱۰) قیمت ایک روپیہ

۱۸۵۷ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۳۳ (۲) مولود (شریف (۳) مصنفہ مولوی محمد اسمٰعیل لُود ے (۴) × (۵) مذہبی معلومات (۶) جگن متر پریس (۷) رتناگیری (۸) تاریخ اشاعت ۱۸۵۷ء (۹) سائز اور تعداد صفحات نامعلوم (۱۰) قیمت سوا روپیہ۔

۱۸۵۹ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۳۲ (۲) کویتا پستک (۳) مصنفہ رام چندر۔ بی۔ انیس دالوری (۴) × (۵) فوجی اشارے (۶) جگن متر پریس (۷) مقام رتناگیری (۸) ۱۸۵۹ء (۹) سائز فلسکیپ ۷.۵×۴ (۱۰) قیمت دو روپے۔

۱۸۶۰ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۲۵ (۲) عجیب العائد (۳) مصنفہ لطف اللہ (۴) × (۵) طب یونانی (۶) قادری پریس (۷) مقام سورت (۸) ۱۸۶۰ء (۹) سائز ۷.۵×۱۲: ۹۹۲ ص (۱۰) قیمت دو روپئے۔

۱۸۶۰ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۳۶ (۲) بریگیڈ کی فوجی مشقیں (۳) مترجمہ رام چندر۔ بی۔ انیس دالوری (۴) × (۵) ملٹری ڈرل (۶) جگن متر پریس (۷) مقام اشاعت رتناگیری (۸) ۱۸۶۰ء (۹) سائز اور تعداد صفحات نامعلوم (۱۰) قیمت دو آنے

۱۸۶۰ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۳۷ (۲) پاکٹ ڈرل مینول (۳) مترجمہ رام چندر۔ بی۔ انیس دالوری۔ (۴) × (۵) ملٹری ڈریل (۶) جگن متر پریس (۷) مقام اشاعت رتناگیری (۸) ۱۸۶۰ء (۹) سائز اور تعداد صفحات نامعلوم (۱۰) قیمت دو آنے

۱۸۶۰ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۳۴ (۲) ناظم الاخبار (۳) مضمون نگار (۴) اڈیٹر غلام محمد علی حمایت اللہ (۵) ایک اخبار (۶) مطبوعہ قادری پریس (۷) مقام اشاعت سورت (۸) تاریخ ہائے اشاعت ۱۸۶۰ء-۱۸۶۳ء (۹) سائز۔ ورق (۱۰) قیمت ایک روپیہ۔

۱۸۶۳ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۲۹ (۲) اندر سبھا یا راجہ اندر کا دربار (۳) مولفہ دوسابھائی سوراب جی منشی (۴) × (۵) منظوم افسانہ (۶) مقام اشاعت دفتر آشکارا (۷) بمبئی (۸) سنہ ۱۸۶۳ء (۹) ڈیمی ۵۔۸x۵ صفحے ۷۹ (۱۰) قیمت بارہ آنے

۱۸۶۴ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۴۲ (۲) شسندرسری نگار اور سوا کرت ہیرا سری نگار (۳) مصنف کوی ہیرا چند کاہن جی (۴) × (۵) مجموعہ کلام شعر ارکرام (۶) مطبوعہ گنپت کرشن جی پریس (۷) مقام بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۴ء (۹) ۱۹۱ صفحے (۱۰) قیمت نامعلوم۔

مطبوعات صوبہ بمبئی بزبان اردو جن کی تاریخ اشاعت کا پتہ نہیں چل سکا اور وہ بہ اعتبار اندراج نمبر یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۶۲۴ (۱) سلسلہ نمبر (۲) یوسف کے قصے (۳) مترجم نامعلوم (۴) اڈیٹر نامعلوم (۵) موضوع۔ قصے (۶) مطبوعہ گنپت کرشن جی پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) تاریخ اشاعت نامعلوم (۹) سائز اور صفحات نامعلوم (۱۰) قیمت نامعلوم۔

۱۶۲۸ (۱) سلسلہ نمبر (۲) تصنیف چہار درویش (۳) مصنف۔ بیرامی (۴) اڈیٹر نامعلوم موضوع حکایت۔ قصہ (۶) مطبوعہ گنپت کرشن جی پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) تاریخ اشاعت نامعلوم (۹) سائز اور صفحات نامعلوم (۱۰) قیمت۔ نامعلوم۔

۱۶۳۰ (۱) سلسلہ نمبر (۲) تصنیف۔ دیوان گویا (۳) مصنف۔ نواب فقیر محمد (۴) اڈیٹر۔ نامعلوم (۵) موضوع۔ مجموعہ کلام (۶) مجموعہ مفرح القلب پریس (۷) مقام اشاعت کراچی (۸) تاریخ اشاعت نامعلوم (۹) سائز اور صفحات فرنچ 4To۔ ۲۲۶ صفحے (۱۰) قیمت دو روپے۔

۱۶۳۱ (۱) سلسلہ نمبر (۲) گل بکاؤلی (تصنیف) (۳) مصنف۔ نہال چند (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع۔ ایک ناول۔ افسانہ (۶) مطبوعہ گنپت کرشن جی پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) تاریخ اشاعت۔ نامعلوم (۹) سائز اور صفحات نامعلوم (۱۰) قیمت نامعلوم

۱۶۳۵ (۱) سلسلہ نمبر۔ (۲) تصنیف۔ نسخہ پران (۳) مصنف۔ نامعلوم (۴) اڈیٹر × (۵) موضوع۔ قصے (۶) مطبوعہ۔ باپو ہرسٹ دیولیکر پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) تاریخ اشاعت نامعلوم (۹) سائز اور صفحات۔ آبلانگ۔ ۸۸ صفحے (۱۰) قیمت آٹھ آنے۔

۱۶۳۹ (۱) سلسلہ نمبر (۲) تصنیف۔ قصیدہ حاتم (۳) مصنف۔ حیدری (۴) اڈیٹر × (۵) موضوع۔ سوانح (۶) مطبوعہ۔ گنپت کرشن جی پریس (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی۔

(۸) تاریخ اشاعت۔ نامعلوم (۹) سائز اور صفحات۔ نامعلوم (۱۰) قیمت۔ نامعلوم

۱۶۴۱ (۱) سلسلہ نمبر (۲) تصنیف۔ رابرٹسن کی پاکٹ ڈکشنری (۳) مصنف۔ مسٹر رابرٹسن (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع۔ انگریزی اور ہندوستانی ڈکشنری (۶) مطبوعہ۔ گنپت کرشن جی پریس (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) تاریخ اشاعت۔ نامعلوم (۹) سائز ۵-۷-۸۔ صفحات نامعلوم (۱۰) قیمت دو روپئے۔

مطبوعات صوبہ بمبئی بزبان اردو و مرہٹی بہ اعتبار تاریخ اشاعت۔

سنہ ۱۸۵۹ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۴۹ (۲) راج نیتی (۳) مصنف اوتم رام پرشوتم (۴) اڈیٹر × (۵) موضوع۔ سیاست (۶) مطبوعہ چھگن لال مگن لال پریس (۷) مقام اشاعت احمد آباد (۸) سنہ اشاعت ۱۸۵۹ء (۹) صفحات چھتیس (۱۰) قیمت بارہ آنے

سنہ ۱۸۶۰ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۴۸ (۲) منوہر پد۔ حصہ اول و دوم (۳) مصنف کوی منوہر بھاؤ نگری (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع۔ اخلاقی اور مذہبی گانے (۶) مطبوعہ ٹامس گراہم پریس (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت۔ ۱۸۶۰ء (۹) صفحات ایک سو بارہ (۱۰) قیمت دو روپیے۔

سنہ ۱۸۶۱ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۴۷ (۲) سوایا (۳) مصنف۔ سندر داس (۴) اڈیٹر × (۵) موضوع۔ نظم (۶) مطبوعہ۔ گنپت کرشن جی پریس (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت۔ ۱۸۶۱ء (۹) صفحات نامعلوم (۱۰) قیمت نامعلوم

مطبوعات صوبہ بمبئی بزبان اردو و گجراتی۔ بہ اعتبار تاریخ اشاعت

سنہ ۱۸۵۹ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۴۹ (۲) مصنف اوتم رام پرشوتم (۳) تصنیف راج نیتی (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع۔ سیاست (۶) مطبوعہ چھگن لال مگن لال پریس (۷) مقام اشاعت احمد آباد (۸) سنہ اشاعت ۱۸۵۹ء (۹) صفحات چھتیس (۱۰) قیمت بارہ آنے۔

سنہ ۱۸۶۰ء (۱) سلسلہ نمبر ۱۶۴۸ (۲) منوہر پد۔ حصہ اول و دوم (۳) مصنف کوی منوہر بھاؤ نگری (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع۔ اخلاقی اور مذہبی گانے (۶) مطبوعہ ٹامس گراہم پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۰ء (۹) صفحات ایک سو بائیس (۱۰) قیمت دو روپیے۔

مطبوعات صوبہ بمبئی بزبان اردو و فارسی بہ اعتبار اندراج رجسٹرار

۱۶۶۷ (۱) سلسلہ نمبر (۲) تصنیف۔ غزلستان (۳) مصنف پارسی نسروان جی (۴) اڈیٹر۔ (۵) موضوع ہندستانی اور فارسی غزلیں (۶) پریس۔ نامعلوم (۷) مقام اشاعت۔ نامعلوم (۸) سنہ اشاعت نامعلوم (۹) صفحات۔ نامعلوم (۱۰) قمت نامعلوم۔

مطبوعات صوبہ بمبئی بزبان اردو معہ تاریخ اشاعت

(۱) سلسلہ نمبر ۵۰۴ (۲) تصنیف۔ بارہ قصہ (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع نظم۔ (۶) مطبع۔ حیدری۔ (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت۔ ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحے ۱۳۲ (۱۰) قیمت ساتآنے۔

(۲) سلسلہ نمبر ۵۱۱ (۲) داستان امیرحمزہ (۳) مصنف۔ علی خاں (۴) اڈیٹر۔ × (۵) امیرحمزہ کا قصہ (۶) مطبع۔ حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحے ۲۱۶ (۱۰) قیمت ڈیڑھ روپئے۔

(۳) سلسلہ نمبر ۵۱۴ (۲) حاتم طائی (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر × (۵) ایک حکایت (۶) مطبع۔ حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to صفحے ۱۸۱ (۱۰) قیمت آٹھ آنے

(۴) سلسلہ نمبر ۵۱۶ (۲) اندرسبھا (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر۔ × (۵) ایک طویل نظم (۶) مطبع۔ حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحے ۵۶ (۱۰) قیمت دوآنے۔

(۵) سلسلہ نمبر ۵۱۷ (۲) جنگ نامہ فتح نامہ (۳) مصنف نامعلوم۔ (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع حسنین کی تعریف وتوصیف بصورت نظم (۶) مطبع۔ حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت۔ ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحے ۱۵۶ (۱۰) قیمت فی جلد آٹھ آنے

(۶) سلسلہ نمبر ۵۱۸ (۲) جوگی نامہ (۳) مصنف۔ ناظر (۴) اڈیٹر۔ عبدالقادر (۵) جوگیوں کے کارنامے (۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت۔ ۱۸۶۵ء (۹) سائز 8 vo۔ صفحے ۲۰ (۱۰) قیمت دوآنے

(۷) سلسلہ نمبر ۵۲۰ (۲) کشف الخلاصہ (۳) مصنف حافظ شجاع الدین (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع۔ مذہب (۶) مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحے ۲۴۵ (۱۰) قیمت دوآنے۔

۸۔ سلسلہ نمبر ۵۲۴۔ (۲) قصہ شیروان (۳) مصنف نامعلوم۔ (۴) اڈیٹر (۵) شیروان کی منظوم کہانی (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحات ۲۹ (۱۰) قیمت دو آنے۔

۹۔ سلسلہ نمبر ۵۲۵ (۲) قصہ پامل (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر۔ × (۵) پامل شاہ کی کہانی (۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت، بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 8×7.5 صفحات ۔ قیمت ایک آنہ۔

۱۰۔ سلسلہ نمبر ۵۲۶ (۲) لیلیٰ مجنوں (۳) مصنف کیفی (۴) اڈیٹر۔ × (۵) ایک قصہ (۶) مطبوعہ حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت۔ ۱۸۶۵ء (۹) سائز 8×7.5۔ صفحات ۲۰ (۱۰) قیمت ایک آنہ

۱۱۔ سلسلہ نمبر ۵۲۹ (۲) مجموعہ مدحیات (۳) مصنف۔ نامعلوم۔ (۴) اڈیٹر۔ × (۵) ثنائے محمد (۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحات ۵۶ (۱۰) قیمت تین آنے۔

۱۲۔ سلسلہ نمبر ۵۳۲۔ (۲) سیتا و لاس (۳) مصنف تلسی داس (۴) اڈیٹر۔ × (۵) عاشق و معشوق کی باتیں (۶) مطبوعہ۔ باپو ہرشٹ پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز۔ ڈیمی 8×7.5۔ صفحات ۱۰۰ (۱۰) قیمت ساڑھے تین آنے۔

۱۳۔ سلسلہ نمبر ۵۳۹ (۲) سوداگر بچہ (۳) مصنف۔ رحمٰن شاہ (۴) اڈیٹر۔ × (۵) ایک سوداگر کی کہانی (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 8×7.5۔ صفحات ۱۸ (۱۰) قیمت دو آنے۔

۱۴۔ سلسلہ نمبر ۵۴۰ (۲) صد حکایات (۳) مصنف سید ابوالفتاح (۴) اڈیٹر۔ × (۵) ایک قصہ (۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحات (۱۰) قیمت چار آنے

۱۵۔ سلسلہ نمبر ۵۴۱ (۲) تحفۃ العنوان (۳) مصنف محمد یوسف (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع۔ مذہب (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء (۹) سائز 4to۔ صفحات ۱۳۶ (۱۰) قیمت چھ آنے

۱۶۔ سلسلہ نمبر ۵۴۵ (۲) دنیا نے پتریکا (۳) مصنف تلسی داس (۴) اڈیٹر۔ × (۵) موضوع

اخلاقیات (۶) مطبوعہ ہاپوسنداشیو پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵.۷ - ۴ ص ۱۶۴ -
(۱۰) قیمت آٹھ آنے -

۱۷ - سلسلہ نمبر ۵۰۴ (۲) یوگ وشسٹ (۳) مصنف - نامعلوم (۴) اڈیٹر - ہیرا چند کاہن جی (۵) موضوع - مافوق الطبعیات (۶) مطبوعہ

۱۸۶۶ء (۱) نمبر ۵۰۳ (۲) عاشق کا جنازہ (۳) مصنفہ حیدر (۴) اڈیٹر × (۵) ایک سوشل قصہ
(۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت - بمبئی (۸) سنہ طباعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵.۷ - ۴ ص ۱۸
(۱۰) قیمت آٹھ آنے -

۲ - سلسلہ نمبر ۵۰۶ (۲) بھاشا بھوشن (۳) مصنفہ ہیرا چند کاہن جی (۴) اڈیٹر × (۵) دائرہ تقریر
(۶) مطبوعہ جوائنٹ اسٹاک پریس (۷) مقام اشاعت - بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵.۷ - ۴ ص ۱۲۳
(۱۰) قیمت چودہ آنے -

۳ - سلسلہ نمبر ۵۰۷ (۲) چہار درویش (۳) مصنفہ میر امیر علی (۴) اڈیٹر × (۵) درویشوں کے حالات زندگی (۶) طبع مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت - بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز 4to -
ص ۱۲۵ (۱۰) قیمت آٹھ آنے

۴ - سلسلہ نمبر ۵۰۸ (۲) چمن بینظیر (۳) موسیٰ (۴) اڈیٹر (۵) حکایات (۶) مطبع حیدری -
(۷) مقام اشاعت - بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز 4to - ص ۳۸۳ (۱۰) قیمت ایک روپیہ بارہ آنے -

۵ - سلسلہ نمبر ۵۱۰ (۲) دیان سمندر (۳) مصنفہ ہیرا چند کاہن جی (۴) اڈیٹر × ۵ مافوق الطبعیات (۶) ساتھی پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵۰ - ۴ء ۱ - ص ۹۶ (۱۰) قیمت دس آنے

۶ - سلسلہ نمبر ۵۱۲ (۲) کتاب القواعد (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر × (۵) موضوع - کتاب صرف و نحو (۶) مطبوعہ ایجوکیشن سوسائٹی پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز - رائل ۵ . ۷ ۱۲ - ص ۴۴ (۱۰) قیمت چار آنے -

۷ - سلسلہ نمبر ۵۱۳ (۲) گل بکاؤلی (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر × (۵) گل بکاؤلی کی مہم (۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت - بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز 4to - ص ۲۳۶
قیمت دس آنے -

۸ - سلسلہ نمبر ۵۱۵ (۲) ہندوستانی دوسری کتاب (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر × (۵) درسی اسباق (۶) مطبوعہ گنپت کرشن جی پریس (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۷×۵.۵ - ص ۳۰ (۱۰) قیمت نو آنے۔

۹ - سلسلہ نمبر ۵۱۹ (۲) جوگن نامہ (۳) مصنف۔ ناظر (۴) اڈیٹر۔ عبدالقادر (۵) جوگنوں کے افسانے (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۷×۵.۰ - ص ۲۴ (۱۰) قیمت دو آنے۔

۱۰ - سلسلہ نمبر ۵۲۱ (۲) قصص الانبیاء (۳) مصنف غلام نبی (۴) اڈیٹر × (۵) تاریخ نبوی بصورت حکایات (۶) مطبوعہ حیدری پریس (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۸×۴ - ص ؟ (۱۰) قیمت ڈہائی روپئے۔

۱۱ - سلسلہ نمبر ۵۲۴ (۲) قصۂ سکندر (۳) مصنف۔ جے۔ علاء الدین (۴) اڈیٹر × (۵) سکندر ذوالقرنین کا ایک قصہ (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۷×۵.۰ - ص ۲۰ (۱۰) قیمت دو آنے۔

۱۲ - سلسلہ نمبر ۵۲۶ (۲) قرآن (مجید) (۳) مصنف × (۴) اڈیٹر × (۵) موضوع۔ کلام الٰہی (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری - (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) ۱۸۶۶ء (۹) سائز ڈمی۔ ص ۴۴۴۔ (۱۰) ہدیہ۔ چار روپئے۔

۱۳ - سلسلہ نمبر ۵۲۸ (۲) مقصد تمہید (۳) مصنف۔ نامعلوم (۴) اڈیٹر × (۵) فلسفۂ ویدانت (۶) مطبع سداشیو پریس (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۷×۵۔ ص ۱۱۵ (۱۰) قیمت ایک آنہ۔

۱۴ - سلسلہ نمبر ۵۳۰ (۲) پریم ساگر (۳) مصنف لال پنڈت (۴) اڈیٹر × (۵) بھگوت پران کے چوتھے باب کا خلاصہ (۶) مطبوعہ باپو ہرشٹ پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۷×۵.۰ - ص ۱۴۶ (۱۰) قیمت پونے تین روپئے۔

۱۵ - سلسلہ نمبر ۵۳۲ (۲) روضۃ الیقار (۳) مصنف فقیہہ صاحب (۴) اڈیٹر × (۵) سوانح حسنین بصورت حکایت (۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۸×۴ - ص ۵۰۰ (۱۰) قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

۱۶ - سلسلہ نمبر ۵۳۴ (۲) سخاوت نامہ (۳) مصنف مسکین (۴) اڈیٹر × (۵) زکاۃ کی اہمیت

بصورت نظم (۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت. بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۸×۵۔
قیمت دو آنے۔

۱۷۔ سلسلہ نمبر ۵۳۵ (۲) سرمشق (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر۔ × (۵) حروف و الفاظ لکھنے کی مشق (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵×۴۔ ص ۱۲۰ (۱۰) قیمت ایک روپیہ۔

۱۸۔ سلسلہ نمبر ۵۳۶ (۲) شاہ نامہ (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر۔ × (۵) تاریخ شاہان سلف (بصورت نظم) (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۹) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۱۰) سائز ۸×۵۔ ص ۲۰۰ (۱۰) قیمت سوا روپیہ۔

۱۹۔ سلسلہ نمبر ۵۳۷ (۲) صبح کا ستارہ (۳) مصنفہ مولوی محمد (۴) اڈیٹر۔ × (۵) زائچہ حیات و ممات (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵×۴۔ ص ۶۰ (۱۰) قیمت تین آنے

۲۰۔ سلسلہ نمبر ۵۳۸ (۲) سپاہی بچہ (۳) مصنفہ خوش دل (۴) اڈیٹر۔ × (۵) ایک قصہ (۶) مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۸×۵۔ ص ۲۸ (۱۰) قیمت دو آنے۔

۲۱۔ سلسلہ نمبر ۵۴۲ (۲) تعلیم نامہ (جلد دوم) (۳) مصنفہ۔ داد حقیقہ (۴) مرتبہ قاضی ابراہیم (۵) حکایات مطبوعہ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵×۴ ص ۲۳۲ (۱۰) قیمت چھ آنے۔

۲۲۔ سلسلہ نمبر ۵۴۳ (۲) طوطی کہانی (۳) مصنف۔ نامعلوم (۴) ایڈیٹر۔ × (۵) ایک افسانہ (۶) مطبوعہ۔ مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵×۴۔ ص ۲۳۴ (۱۰) قیمت ایک روپیہ۔

۲۳ سلسلہ نمبر ۵۴۶ (۲) غصہ کے برے نتائج (۳) مصنف نامعلوم (۴) ایڈیٹر۔ × (۵) مذہب۔ (۶) مطبوعہ ایجوکیشن سوسائٹی پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۱۸۶۶ء (۹) سائز ۵×۱۴۱۱ ص (۱۰) قیمت۔ نامعلوم۔

۱۸۶۷ء۔ ۱۔ سلسلہ نمبر ۵۰۵ (۲) بھگت مالا (۳) مصنفہ نابھاجی (۴) اڈیٹر۔ × (۵) فقیروں اور درویشوں کے افسانے (۶) مطبوعہ۔ باپو سدا شیو پریس (۷) مقام اشاعت بمبئی۔

(۸) سنہ اشاعت سنہ ۱۸۶۱ء (۹) سائز 8 × 5 ۔ صفحات ۱۵۲ (۱۰) قیمت دو روپئے ۔

۲ ۔ سلسلہ نمبر ۵۰۹ (۲) دیوان حافظ (۳) مصنف۔ حافظ (شیرازی) (۴) اڈیٹر۔ × (۵) مجموعہ کلام ۔نظم (۶) مطبوعہ ۔مطبع حیدری (۷) مقام اشاعت ۔بمبئی (۸) سنہ اشاعت سنہ ۱۸۶۲ء (۹) سائز 4 × 6 ۔ صفحات ۳۴۴ (۱۰) قیمت ۔آٹھ آنے ۔

۳ ۔ سلسلہ نمبر ۵۲۲ (۲) کیمیائے سعادت (ترجمہ) (۳) مترجمہ محمد غوث خاں (۴) ایڈیٹر ×
(۵) مذہبی معلومات پر ایک پر مغز رسالہ (۶) مطبوعہ مطبع حیدری ۔ (۷) مقام اشاعت ۔بمبئی (۸) سنہ اشاعت ۔سنہ ۱۸۶۶ء (۹) سائز 4 × 5 ۔ صفحات ۵۲۶ (۱۰) قیمت ساڑھے تین روپئے ۔

۴ ۔ سلسلہ نمبر ۵۳۱ (۲) پہ اُمرِ (۳) مصنف نامعلوم (۴) اڈیٹر ۔ × (۵) درسی اسباق (۶) مطبوعہ ۔ ایجوکیشن سوسائٹی (۷) مقام اشاعت ۔ بمبئی (۸) سنہ اشاعت سنہ ۱۸۶۷ء (۹) سائز 5.0 × 12 ۔ صفحات ۵ (۱۰) قیمت نامعلوم ۔

۵ ۔ سلسلہ ۵۴۴ (۲) اُردو مجالس (۳) مصنفہ قاضی غلام حسین (۴) ایڈیٹر ۔ × (۵) تاریخ (۶) مطبوعہ ۔مطبع بہادری (۷) مقام اشاعت ۔بمبئی (۸) سنہ اشاعت سنہ ۱۸۶۷ء (۹) سائز 5 × 4 ۔ صفحات ۲۱۶ (۱۰) قیمت بارہ آنے ۔

۶ ۔ سلسلہ نمبر ا ۔ (۲) چمن بینظیر (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ ابراہیم شاہ موسلی (آف بمبئی) (۵) مجموعہ کلام (غزلیں) (۶) مقام اشاعت ۔ بمبئی (۷) مطبوعہ مطبع حیدری ۔پبلشر نورالدین جیوا خاں اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) سنہ اشاعت اگست سنہ ۱۸۶۷ء (۹) صفحات ۳۱۲ (۱۰) سائز ۔ رائل ۔ 5 × 7 (۱۱) اشاعت یار کر (تعداد) پانچ سو (۱۳) طباعت بذریعہ لتھو پریس (۱۴) قیمت ایک روپیہ ۔ (۱۵) نورالدین جیوا خاں ۔ پتہ ۔ ۵۸ بھنڈی بازار اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۴۰) کولسر محلہ (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) دلچسپ غزلیں ۔

۷ ۔ سلسلہ نمبر ۲ ۔ سورۂ آخرت (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ شیخ عبدالقادر بن شیخ محی الدین (۵) نعت رسول (۶) مقام اشاعت ۔ بمبئی (۷) مطبوعہ گلستان کشمیر پریس ۔پبلشر ۔قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) تاریخ طبع جولائی سنہ ۱۸۶۷ء (۹) صفحات دو سو (۱۰) سائز ۔ رائل 7.0 × 5 ۔
(۱۱) اشاعت بار دوم (۱۲) تعداد ڈیڑھ ہزار (۱۳) اشاعت بذریعہ لتھو پریس ۔ (۱۴) قیمت بارہ آنے (۱۵) قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد ۔ پتہ ۔ ۴۰ ۔ کولسر محلہ ۔ پائیدھونی ۔بمبئی (۱۶) رجسٹرڈ ۔ ریمارکس ۔ نعت رسول ۔

۱۸۶۳ء ۱ ۔ سلسلہ نمبر ۱ ۔ (۲) مثنوی بہار عشق (۳) بزبان اردو (۴) مصنف حکیم نواب مرزا ہے (۵) ایک عشقیہ نظم (۶) مقام اشاعت ۔ بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس ۔ پبلشر نور الدین جیوا خان اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) مطبوعہ ۔ فروری ۱۸۶۳ء (۹) صفحات ۲۴ (۱۰) سائز رائل ۸×۵ ۔ (۱۱) طباعت بار دگر (۱۲) تعداد ساڑھے سات سو (۱۳) مطبوعہ لیتھو پریس (۱۴) قیمت سوا آنہ ۔ (۱۵) ملنے کا پتہ ۔ نور الدین جیوا خاں ۔ ۵۰ ۔ بھنڈی بازار قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد ۔ ۶۵ ۔ کولسر محلہ بمبئی (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) عشقیہ نظم ۔

۲۔ سلسلہ نمبر ۲ ۔ (۲) کشف الاخبار نمبر (۳) بزبان اردو (۴) مصنف میر خداداد (۵) جادو ٹونے ۔ سفلی عملیات (۶) مقام اشاعت بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس پبلشر ۔ قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد ۔ (۸) تاریخ اشاعت ۔ مئی ۱۸۶۳ء (۹) صفحات ۱۲ (۱۰) سائز ۔ رائل 16 M.O. (۱۱) اشاعت بار دگر (۱۲) تعداد ڈیڑھ ہزار ۔ (۱۳) اشاعت بذریعہ لیتھو (۱۴) قیمت ڈھائی آنے (۱۵) نور الدین جیوا خاں ۔ ۵۰ ۔ بھنڈی بازار اور قاضی ابراہیم قاضی نور محمد ۔ ۶۵ ۔ کولسر محلہ بمبئی (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ریمارکس ۔ عملیات ۔

(۳) سلسلہ نمبر ۳ ۔ (۲) زین المجالس (۳) بزبان اردو (۴) مصنف قاضی محمد یوسف مرحوم ۔ (۵) موضوع ۔ درحالات پیر دستگیر (۶) مقام اشاعت بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس ۔ پبلشر ۔ قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) تاریخ اشاعت ۔ مئی ۱۸۶۳ء (۹) صفحات ۲۳۱ (۱۰) سائز ۔ رائل ۵ × ۷ (۱۱) اشاعت بار دگر (۱۲) تعداد ۔ ڈیڑھ ہزار (۱۳) اشاعت بذریعہ لیتھو ۔ (۱۴) قیمت ایک روپیہ سات آنے (۱۵) ملنے کا پتہ ۔ نور الدین جیوا خاں ۔ ۵۰ ۔ بھنڈی بازار بمبئی اور قاضی ابراہیم قاضی نور محمد ۔ ۶۵ ۔ کولسر محلہ (۱۵) رجسٹرڈ (۱۶) ریمارکس ۔ درحالات پیر دستگیر ۔

۴۔ سلسلہ نمبر ۴ ۔ (۲) اعجاز الرسول یا فالنامہ (۳) بزبان اردو (۴) مصنف میر داد خان (۵) رسول صلعم کی حیات مبارک کا ایک خاکہ (۶) مقام اشاعت ۔ بمبئی (۷) مطبوعہ ۔ حیدری پریس ۔ پبلشر ۔ نور الدین جیوا خاں اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) تاریخ اشاعت ۔ جون ۱۸۶۳ء (۹) صفحات ۹۶ (۱۰) سائز رائل O.M. 16 ۔ (۱۱) اشاعت بار دوم (۱۲) تعداد اشاعت ڈیڑھ ہزار (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو ۔ (۱۴) قیمت ڈھائی آنے ۔ (۱۵) ناشر نور الدین جیوا خاں ۔ ۵۰ ۔ بھنڈی بازار اور قاضی ابراہیم نور محمد ۶۵ کولسر محلہ ۔ (۱۶) رجسٹرڈ ۔ (۱۷) ریمارکس ۔

حیات مبارک رسول اکرم -

۵- سلسلہ نمبر ۵ - (۲) طب شہابی اور دبیر حکمت (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ میر خداداد (۵) علاج کے مختلف طریقے (۶) مقام اشاعت - بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس - پبلشرز - نورالدین جیوا خان اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) تاریخ اشاعت - جولائی ۱۸۶۵ء (۹) صفحات ۶۴ (۱۰) سائز رائل - ۷.۵۰ × ۵ (۱۱) بار دگرہ (۱۲) تعداد ڈیڑھ ہزار (۱۳) اشاعت بذریعہ لیتھو (۱۴) قیمت تین آنے (۱۵) نورالدین جیوا خان - پتہ - ۵۵ - بھنڈی بازار - اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد - ۶۵ - کولسہ محلہ - بمبئی (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ریمارکس - طب شہابی اور دبیر حکمت -

۶- سلسلہ نمبر ۶ - (۲) تحفۃ الاخوان (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ معلم ابراہیم خطیب (۵) طریقہ ہائے عبادت (۶) مقام اشاعت - بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس - پبلشر - نورالدین جیوا خان اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) تاریخ اشاعت نومبر ۱۸۶۶ء (۹) صفحات ۲۱۶ (۱۰) سائز رائل ۷.۵ × ۵ (۱۱) اشاعت - بار دوم (۱۲) تعداد ساڑھے سات سو (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو (۱۴) قیمت سات آنے (۱۵) ناشر - قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد - پتہ - ۶۵ - کولسہ محلہ - اور نورالدین جیوا خان - ۵۰ - بھنڈی بازار - بمبئی -

سنہ ۱۸۶۶ء جون (چھ) - ڈاکٹ نمبر ۵ (۲) لذت النساء (۳) بزبان اردو (۴) اشاعت بار دگر (۵) موضوع عورت اور محبت (۶) مقام اشاعت بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس (۸) تاریخ اشاعت ۲ جون ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ (۹) صفحات ۴۸ (۱۰) سائز ۷.۵۰ × ۵ (۱۱) اشاعت بار اول (۱۲) تعداد نامعلوم (۱۳) مطبوعہ لیتھو پریس (۱۴) قیمت نامعلوم (۱۵) پتہ ناشر نامعلوم (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ریمارکس - سنسکرت کی کتاب ANANGARANGA کا ترجمہ اور خلاصہ (بمبئی گورنمنٹ گزٹ - پارٹ سوم سپلیمنٹ - بہ اختتام سہ ماہی ۳۰ جون ۱۸۶۹ء) -

اکتوبر (چودہ) - ڈاکٹ نمبر نامعلوم (۲) طلسمات عجائب (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ میر خداداد (۵) جادو ٹونوں کی اہمیت (۶) مقام اشاعت بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس - پبلشرز نورالدین جیوا خان اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) تاریخ اشاعت - اکتوبر ۱۸۶۹ء (۹) صفحات ۱۲۰ (۱۰) سائز رائل ۷.۵ × ۵ (۱۱) اشاعت بار دگر (۱۲) تعداد اشاعت پانچ ہزار (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو (۱۴) قیمت چھ آنے (۱۵) ناشر - قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد - پتہ - کولسہ محلہ اور نورالدین جیوا خان - ۵۰ - بھنڈی بازار (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ریمارکس - عملیات اور اوراد

سنہ ۱۸۷۰ء (مارچ) (۲) حاتم طائی (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ حیدری دہلوی (۵) عنوان۔ حکایات (۶) مقام اشاعت۔ بمبئی (۷) مطبوعہ۔ حیدری پریس۔ پبلشر۔ نورالدین جیوا خان اور قاضی ابراہیم قاضی نور محمد (۸) مارچ سنہ ۱۸۷۰ء (۹) صفحہ ۱۱۱ (۱۰) سائز۔ رائل ۵۰۔۷ x ۵ (۱۱) اشاعت بار دگر (۱۲) تعداد تین ہزار (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو (۱۴) قیمت سات آنے (۱۵) ناشر نورالدین جیوا خان۔ ۵۸۔ بھنڈی بازار۔ بمبئی اور قاضی ابراہیم قاضی نور محمد۔ ۶۵۔ کولسہ محلہ (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ایک مشہور افسانہ۔

(مارچ) (۲) اندرسبھا (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ امانت دمداری لال (۵) موضوع۔ ایک طویل عشقیہ نظم (۶) مقام اشاعت۔ بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس۔ پبلشر۔ نورالدین جیوا خان تاریخ طباعت۔ مارچ سنہ ۱۸۷۰ء (۹) صفحہ ۶۴ (۱۰) سائز ۵۰۔۷ x ۵ (۱۱) اشاعت بار دگر (۱۲) تعداد ساڑھے سات سو (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو پریس (۱۴) قیمت تین آنے (۱۵) ناشر نورالدین جیوا خان۔ مقام۔ باباڈھبوا اسٹریٹ (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ایک مقبول عام نظم۔

(اپریل) (۲) گل مغفرت (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ حیدر بخش (۵) حالات شہدائے کربلا (۶) مقام طباعت۔ بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس۔ پبلشرز نورالدین جیوا خان اور قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد (۸) تاریخ اشاعت اپریل سنہ ۱۸۷۰ء (۹) صفحہ ۱۵۲ (۱۰) سائز۔ رائل ۸ x ۵ (۱۱) اشاعت بار دگر (۱۲) تعداد طباعت ڈیڑھ ہزار (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو (۱۴) قیمت سات آنے (۱۵) ناشر۔ قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد۔ پتہ۔ کولسہ محلہ۔ بمبئی اور نورالدین جیوا خان۔ ۵۸ بھنڈی بازار (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ریمارکس۔ سوانح حسنین۔

(جولائی) (۲) طوطا کہانی (۳) بزبان اردو۔ مصنفہ حیدر بخش (۵) قصہ (۶) مقام اشاعت بمبئی (۷) مطبوعہ۔ حیدری پریس۔ پبلشر نورالدین جیوا جی (۸) تاریخ اشاعت۔ جولائی سنہ ۱۸۷۰ء (۹) صفحہ ۱۰ (۱۰) سائز رائل ۵۰۔۷ x ۵ (۱۱) اشاعت۔ بار اول (۱۲) تعداد اشاعت ڈیڑھ ہزار۔ (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو (۱۴) قیمت سات آنے (۱۵) x (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ریمارکس x

(اگست) (۲) فریب عشق اور لذت عشق (۳) بزبان اردو (۴) مصنف نامعلوم (۵) حکایات حسن و عشق (۶) مقام اشاعت۔ بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس پبلشر۔ نورالدین جیوا خان (۸) تاریخ اشاعت۔ بمبئی (۹) صفحہ ۵۰ (۱۰) سائز ۵۰۔۷ x ۵ (۱۱) اشاعت بار دگر (۱۲) تعداد ڈیڑھ ہزار (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو (۱۴) قیمت دو آنے (۱۵) ناشر۔ نورالدین جیوا خان۔ ۵۸۔ بھنڈی بازار

بمبئی ۔ (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) حکایت حسن وعشق ۔
(اگست ۲) (۲) اخوان الصفا ، (۳) بزبان اردو (۴) مترجم ۔اکرام علی (۵) موضوع ۔ مباحث متعلقہ وجود کبریائی (۶) مقام اشاعت ۔ بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس ۔ پبلشر ۔ نورالدین جیوا خان (۸) تاریخ اشاعت ۔ اگست ۱۸۶۸ء (۹) صفحہ ۱۳۲ (۱۰) سائز ۔ رائل ۔ 8 ۔ ۷۔۵ (۱۱) اشاعت ۔ بار اول (۱۲) تعداد ساڑھے سات سو (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو پریس (۱۴) قیمت سات آنے (۱۵) × (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ۔ ×
ستمبر ۔ (۲) چشمۂ شیریں (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ شیخ عبدالواحد (۵) موضوع ۔ سوانح شیریں و فرہاد (۶) مقام اشاعت ۔ بمبئی (۷) مطبوعہ حیدری پریس ۔ پبلشر ۔ نورالدین جیوا خان (۸) تاریخ اشاعت ۔ ستمبر ۱۸۶۸ء (۹) صفحہ ۵۲ (۱۰) سائز ۔ رائل ۔ ۷۔۵ ۔ 8 (۱۱) اشاعت بار اول (۱۲) تعداد طباعت ساڑھے سات سو (۱۳) طباعت بذریعہ لیتھو پریس (۱۴) قیمت دو آنے (۱۵) × (۱۶) × (۱۷) ایک عشقیہ داستان ۔
نومبر ۔ (۲) خلاصہ علم جغرافیہ (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ سید ابوالفتاح مولوی (۵) موضوع جغرافیہ (۶) مقام طباعت ۔ بمبئی (۷) مطبوعہ مطبع حیدری پریس (۸) تاریخ اشاعت نومبر ۱۸۶۸ء (۹) صفحہ ۱۱۲ (۱۰) سائز 4 تا (۱۱) اشاعت بار اول (۱۲) تعداد ڈیڑھ ہزار (۱۳) مطبوعہ لیتھو پریس (۱۴) قیمت بارہ آنے (۱۵) ناشر ۔ سید ابوالفتاح مولوی (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ایک درسی کتاب ۔
دسمبر ۔ (۲) اشرف اللغات ۔ حصہ اول ۔ مصادر الافعال ۔ آمدنامہ (۳) بزبان اردو (۴) مصنفہ سید ابوالفتاح مولوی (۵) موضوع ۔ مصادر (۶) مقام اشاعت ۔ بمبئی (۷) مطبوعہ مطبع حیدری ۔ بمبئی (۸) تاریخ اشاعت دسمبر ۱۸۶۸ء (۹) صفحہ ۹۶ (۱۰) سائز ۔ 4 تا (۱۱) اشاعت بار اول (۱۲) تعداد اشاعت ڈیڑھ ہزار (۱۳) مطبوعہ لیتھو پریس (۱۴) قیمت دس آنے ۔ (۱۵) ناشر ۔ سید ابوالفتاح مولوی (۱۶) رجسٹرڈ (۱۷) ابتدائی درسی کتاب ۔

رحیم علی الہاشمی

میکبتھ

شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ کا منظوم ترجمہ

(بلینک ورس)

تعارف

کنگ لیئر کے تعارف میں میں نے لکھا تھا کہ جن مبصرین کے خیال میں شیکسپیئر کی بہترین ٹریجڈی کنگ لیئر ہے ان سے مجھے اتفاق ہے اور منجملہ دیگر وجوہ کے ایک وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ کنگ لیئر کا ڈرامہ مکمل ہے جس میں کہانی کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہ جاتا ہے۔ جن مبصرین کے خیال میں ہیملٹ شیکسپیئر کی بہترین ٹریجڈی ہے۔ اُن سے مجھے بالکل اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ اس کا ہیرو فلسفہ بگھارتا ہے اور عمل نہیں کرتا اور جب عمل کرتا ہے تو غلط عمل کرتا ہے۔ اس کی مثال کچھ مغل شاہنشاہ شاہجہاں کے لڑکے داراشکوہ کی سی ہے جو علم و فن کے اعتبار سے اپنے سب بھائیوں سے بڑھا ہوا ہے مگر عملی نہیں ہے اور جب عمل کرتا ہے تو غلط کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ مصائب برداشت کر کے قتل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اکبر اگرچہ پڑھا لکھا ہوا برائے نام تھا مگر عملی تھا جس کی وجہ سے اس کا دور حکومت ہندوستان کی تاریخ کا زریں باب شمار ہوتا ہے۔ ایک اور مثال اسپین کے بادشاہ الحکم کی ہے جس کے کتب خانہ میں کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ کتابیں تھیں اور ہر کتاب پر اس کے لکھے ہوئے حواشی تھے مگر عملی نہ ہونے کی وجہ سے اسپین کی اسلامی حکومت کا زوال اسی کے زمانہ سے شروع ہوا۔

جن مبصرین نے میکبتھ کو شیکسپیئر کی بہترین ٹریجڈی کہا ہے اُن کی رائے کا میں اس حد تک احترام کرتا ہوں کہ اسمیں ہیرو اور ویلین کے کردار کو ایک میں ملا کر بہت بڑے فنی کارنامے کا اظہار کیا گیا ہے اور ڈرامائی

ضرورت سے کاڈر کی بغاوت اور شاہ ناروے کے حملے کو مختلف اوقات میں ایک ساتھ دکھا کر اور میکبتھ کے سترہ سالہ دور حکومت کو حذف کر کے ایک وحدت پیدا کی گئی ہے لیکن اس میں بعض خامیاں ایسی ہیں جن کی وجہ سے میں اسے بہترین ٹریجڈی کا درجہ نہیں دے سکتا۔ مثلاً ڈنکن کے لڑکے ڈونل بین اور بینکو کے لڑکے فلی انس کی کہانیوں کو معلق چھوڑ دیا گیا ہے۔ تاہم ان مبصرین کیخا طرسے میں نے اس ڈرامے کو منظوم شکل میں پیش کر دیا ہے

شیکسپیر کی ڈرامہ نویسی کی زندگی ۱۵۸۶ء سے شروع ہوئی۔ اُس کے پہلے ڈرامے ٹائیٹس اینڈ رونیکس اور ہینری ششم حصہ اول دراصل پہلے کے لکھے ہوئے تھے جن کو شیکسپیر نے نظرثانی کر کے درست کیا۔ آخری ڈرامے ٹمپسٹ اور ونٹرس ٹیل ۱۶۱۰ء اور ۱۶۱۱ء میں لکھے گئے۔ میکبتھ کی تاریخ محققین نے داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر ۱۶۰۶ء معین کی ہے جس کے بعد اُس نے صرف چھ ڈرامے اور لکھے۔ کل ڈرامے جو اس نے لکھے اُن کی تعداد ۳۷ ہے اور نظمیں وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ اس لئے میکبتھ کی تصنیف کے وقت اُس کے فن میں کافی پختگی آگئی ہوگی اور ٹیکنیک کے لحاظ سے اس کا شمار اعلیٰ قسم کے ڈراموں میں کیا جا سکتا ہے۔ جس میں توازن، وحدت عمل، وحدت خیال اور وحدت ماحول کا لحاظ رکھا گیا ہے

میکبتھ میں ہیرو اور ویلین کے کردار کو جو ایک میں ملا یا گیا ہے اُس میں بھی ایک فنکاری کا کمال ہے۔ اوتھیلو میں آئگو ہیملٹ میں کلاڈیس اور کنگ لیئر میں گانرل اور ریگن کے ویلین کردار ڈرامے میں مرکزی حیثیت کے نہیں ہیں لیکن میکبتھ میں وہ پورے ڈرامے پر حاوی اور مرکزی حیثیت کا کردار ہے اور میکبتھ جس طرح ایک بہادر اور وفادار انسان سے بدل کر کس طرح ایک سفاک اور ظالم انسان بن جاتا ہے جس سے اُسکے ساتھ سراسر نفرت کی جگہ کچھ ہمدردی اور ترس کا بھی جذبہ پیدا ہوتا ہے پھر جب ہم اس انقلاب کے اسباب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ میکبتھ فطرتاً بد نہ تھا بلکہ صرف کمزور طبیعت کا تھا جو حالات کی رو میں بہتا چلا گیا اور اگرچہ حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اسمیں موجود تھی مگر اسے استعمال نہیں کیا اور حالات کی رو کو اس صلاحیت پر غالب ہونے دیا۔ نیز ساحراوں کی مبہم پیشگوئیوں اور لیڈی میکبتھ کی ہوس جاہ کا اس بگاڑ میں جو حصہ ہے وہ بھی قابل لحاظ ہے

آرٹ کا اصل مقصد تو جمالیاتی احساس کی تشفی ہوتا ہے اور ڈرامے کا آرٹ بھی ایسا ہی ہے لیکن ثانوی طور پر اُس سے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق بھی ملتا ہے جو اگر واضح طور پر دیا جائے تو آرٹ ایک اخلاقی وعظ بن جائے گا اور اور اپنے اصل مقصد سے دور ہٹ جائے گا۔ شیکسپیر کے ڈراموں میں بھی اور خصوصاً المیہ ڈراموں میں کوئی نہ کوئی سبق ضمناً ملتا ہے جو بڑی فنکاری سے کہانی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً ہیملٹ میں یہ تاثر ہے کہ ایک

تخیلی انسان پر اُس کے ماحول کا کیا ردعمل ہوتا ہے، کنگ لیئر میں یہ سبق ملتا ہے کہ کسی کردار کی غلط فہمی کا انجام کیا ہوتا ہے، اسی طرح میکبتھ میں یہ نتیجہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہوس کا مزاج شیطان کے ورغلانے سے کس طرح متاثر ہو جاتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

میکبتھ کے المیہ کی سنگینی اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خاص کردار ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار تھے۔ ڈنکن اور میکبتھ دونوں مالکم دوم کے نواسے تھے اور لیڈی میکبتھ بھی دور جا کر اسی خاندان میں مل جاتی تھی اور سیوارڈ انگریز جنرل جسے شاہ انگلستان نے مالکم کی مدد پر دس ہزار فوج کے ساتھ بھیجا تھا مالکم کا ماموں تھا۔ اور بینکو کے خاندان سے نو پشتوں کے بعد اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ جیمس اول اور پندرہ پشتوں کے بعد جیمس ششم ہے جو اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ دونوں کا بادشاہ تھا یعنی انگلینڈ کا جیمس اول میری کوئین آف اسکاٹس کا لڑکا۔

جادو ٹونے اور بھوت پریت پر اعتقاد آجکل بہت کم ہو گیا ہے لیکن شیکسپیر کے زمانے میں لوگوں کا ان پر کافی اعتقاد تھا اور میکبتھ میں شیکسپیر نے ان سے کافی کام لیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کے توہمات کو دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور ایسے کرداروں کی ثانوی حیثیت رکھی ہے اور ان کے تاثر کو مخصوص رکھا ہے جیسے بینکو کا بھوت صرف میکبتھ کو نظر آتا ہے کسی اور کو نہیں اور ساحرائیں بھی صرف میکبتھ پر اور کسی حد تک بینکو پر عمل کرتی ہیں۔ ڈرامے کے دوسرے افراد اس سے متاثر نظر نہیں آتے اور پھر میکبتھ پر ان کا جتنا قوی اثر ہوتا ہے اتنا بینکو پر نہیں ہوتا اس لئے کہ جب ساحرائیں غائب ہو جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ آیا یہ حقیقت تھی یا ہم گھاس کھا گئے ہیں جس سے ہماری عقل سلب ہو گئی ہے۔

میکبتھ پر کولبر کوچ، مولٹن، ولیم ہیزلٹ، الیزبتھ فرینوال، مسز جیمس، ڈاکٹر برمان، ڈگلیس، ایک فل، سر ہنری اروِنگ، ارتھر سائمنس، ہنٹر، فرائز بارن، کروسیگ، کولیرج، کننگھم اور ڈاروں کی جو تنقیدیں ہیں اُنھیں اصل میں پڑھنا چاہئے اس لئے کہ اقتباس سے ان کی اصل روح ختم ہو جائے گی۔

میکبتھ کے مختلف کرداروں کی خصوصیات اور ان پر ماحول کے ردعمل کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مگر یہاں ہم اس تعارف کو طوالت نہیں دینا چاہتے اور صرف متذکرہ صدر اشارات کافی سمجھتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے شیکسپیر کے متعلق تنقیدی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہئے جس کی انگریزی زبان میں بہتات ہے اور اردو میں بھی بقدر ضرورت مواد موجود ہے

۷ر نومبر ۱۹۶۹ء

رحیم علی الہاشمی
۶۲ شبلی روڈ۔ علی گڑھ، یو۔ پی

میکبتھ

پہلا ایکٹ

پہلا منظر۔ ایک جنگل

(گرج اور چمک تین ساحرائیں داخل ہوتی ہیں)

پہلی ساحرہ۔ ہم تینوں پھر کب ملیں گے؟ چمک گرج اور بارش میں

دوسری ساحرہ۔ جنگ کا غوغا جب کم ہوگا جیتے گا کوئی ہارے گا

تیسری ساحرہ۔ یہ تو شام سے پہلے ہوگا

پہلی ساحرہ۔ مگر کہاں پر ملنا ہوگا ؟

دوسری ساحرہ۔ جنگل میں یا جھاڑی میں

تیسری ساحرہ۔ وہاں ملیں گے میکبتھ سے

پہلی ساحرہ۔ آئی۔ آئی۔ بلون بی بی !

دوسری ساحرہ۔ مینڈک مجھے بلاتا ہے

تیسری ساحرہ۔ آئی، آئی۔ فوراً آئی۔

سب ملکر۔ اچھی چیز بری لگتی ہے اور بری ہے اچھی تم کو

گہرا ہو یا ہوا ہو گندی اوپر اوپر اُڑتے پھریں ہم

(جاتی ہیں)

دوسرا منظر۔ فاریس کے قریب ایک کیمپ

(اندر سے قرنا کی آواز۔ شاہ ڈنکن، مالکم، ڈونل بین، لینا کس ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)

ایک زخمی سارجنٹ ملتا ہے)

ڈنکن۔

یہ خون میں تھڑا ہوا ہے کون سپاہی | جو حال ہے اُس کا وہی کرتا ہے

کچھ تازہ خبر اس سے لڑائی کی ملیگی | تو جوں نے دبایا ہے بغاوت کو کہاں تک

مالکم

جہاں پناہ یہ سرجنٹ ہے وہی جس نے | مجھے بچالیا ہے حریفوں میں قید ہونے سے

خوش امید مرے مشفق جوان ہمت | جہاں پناہ کے آگے ذرا بیاں تو کر

جو حال جنگ کا دیکھا ہے آنکھوں سے تم نے | روانہ جنگ کے میدان سے ہوئے جب

سارجنٹ۔

عجیب حال تذبذب کا تھا حضور وہاں | کہ جیسے دو کوئی تیراک تھک کے ہوں بیحال

پھر ایک دوسرے سے اس طرح چمٹ جائیں | کہ جس سے دونوں ہی ہو جائیں کیطرح بے بس

وہ سنگدل تھا جو باغی تھا یعنی میکڈانولڈ | سرشت اسکی بغاوت کو راس آتی تھی

بھری ہوئی تھی شرارت دماغ میں اُس کے | اور اُسکے دل میں شرارت کا ایک تھا طوفان

اور اس کے ساتھ تھی جو فوج باغیوں کی　　سوار اور پیادوں کی اک مسلح فوج
مگر حقیر یہ ثابت ہوا سر و سامان　　اگرچہ پہلے مقدر نے اُس کا ساتھ دیا
کہ میکبتھ جو دلاور تھے اور نام آور　　انھوں نے کی نہ مقدر کی اک ذرا پروا
چلائی اپنی وہ تلوار ایسی خون آشام　　نگاہ مہر شجاعت کے دیوتا کی ہوئی
بنا کے رستہ وہ پہونچے غنیم کے سر پر　　نہ بات کی کوئی اُس سے نہ دی ذرا مہلت
بس ایک وار تھا سر سے جو تا بہ ناف آیا　　اور اُسکے سر کو فصیل قلعہ سے لٹکایا

ڈنکن ۔ میرے عزیز دلاور شریف کو شاباش

سارجنٹ ۔

شعاع شمس جہاں سے شروع ہوتی ہے　　وہیں سے آتا ہے طوفان اور غضب کی گرج
شکستہ ریخت جہازوں کی جیسے ہوتی ہے　　اسی طرح سے جہاں سوت ہے مسرت کی
وہیں سے اٹھتے ہیں بادل بھی حسرت و غم کے　　حضور شاہ ذرا غور سے سنیں یہ بات
کہ حق کی فتح سے دشمن ہٹے ہی تھے پامال　　اور اُسکی فوج مسلح نے لی فرار کی راہ
تو شاہ ناروے موقعہ کو دیکھ کر فوراً　　نئی سپاہ نئے اسلحہ سے آئے وہاں
کیا وہ حملہ کہ پھر معرکہ ہوا سرگرم　　بہادروں کے لہو سے زمین ہوگئی لال

ڈنکن ۔

ہماری فوج کے سردار کچھ ڈرے تو نہیں　　دلیر میکبتھ و بینکو ہوئے ہراساں کچھ؟

سارجنٹ ۔

حضور سچ تو ہے اُن کو ہوا ہراس ضرور　　مگر عقاب کو گنجشک سے ہو جیسے ہراس
ہراس شیر کو خرگوش سے ہو جیسے کبھی　　تو ان دلیروں نے کچھ اس طرح کیا حملہ
کہ جیسے توپ میں بارود ہو دوگونہ بھرا　　وہ زور شور سے دشمن پہ پھر کیا حملہ
وہ کشت و خون کا منظر کچھ اسطرح کا تھا　　کہ جیسے خون سے ہو جائے لالہ زار زمیں
عظیم گول گتھا جنگ کا نمونہ تھا　　وہ کشت و خون کا منظر حضور ایسا تھا
جہاں پناہ مگر اب نہیں ہے مجھ میں دم　　مرے جو زخم ہیں درکار اُن کو ہے مرہم

ڈنکن ۔

تمہارے زخم ہیں اعزاز کا پتہ دیتے　　تمہاری باتیں بھی لفظ ہیں شرافت کے
چلو لیں اب انھیں عزت کے ساتھ لیجاؤ　　لگا دو جلد ذرا مرہم انکے زخموں کو

(سارجنٹ کو ساتھ لیکر لوگ جاتے ہیں۔ راس داخل ہوتے ہیں)

یہ کون اب آیا ہے ؟

مالکم ۔

محترم باوقار راس کے تھین

ڈنکن

جھلکتی ہے آنکھوں میں عجلت کچھ انکی　　انوکھی کوئی بات جیسے کہیں گے

راس ۔

جہاں پناہ سلامت رہیں ہزار برس

ڈنکن ۔

کہاں سے آپ کا آنا ہوا معزز تھین ؟

راس ۔

جہاں پناہ ابھی آرہا ہوں فائف سے　　جہاں علم ہیں شہ ناروے کے لہراتے
فلک کو آنکھ دکھاتا ہے انکا لہرانا　　ہماری فوج کا جس سے ہوا ہے دل ٹھنڈا
وہ ناروے کے شہنشاہ ساتھ لائے ہیں　　وہ فوج جسکی کہ تعداد کا شمار نہیں
مدد پہ اُنکی وہ غدار تھین کاڈر ہے　　بڑے غضب کا اُنھوں نے کیا تھا گو حملہ
کہ میکبتھ جو ہے اک دیوتا لڑائی کا　　مقابلے کو بڑھا ہو کے اسلحہ سے لیس
لڑا وہ دست بدست اور جما جما کے قدم　　کہ جیسے لڑتے ہیں شیران کارزار بہم
کیا غنیم کے مغرور سر کو پس نیچا　　اڑایا فتح و ظفر کا پھر آخرش جھنڈا

ڈنکن ۔ بہت بڑی ہے یہ خوشی

راس ۔

بس اب وہ شاہ سوینو جو ناروے کا ہے　　امان ہم سے بعد عجز ہے طلب کرتا
مگر ہم اُسکو اجازت نہ دینگے اب ہرگز　　کہ اپنے جنگ کے مقتول کو کرے وہ دفن
نہ جب تلک کہ ہمیں دس ہزار ڈالر دے　　ہماری فوج کرے خرچ جسطرح چاہے

ڈنکن

نکالو دل کو مرے جو تھا اس سے غم بھرا | تو بس ابھی کرو اعلان اُسکے مرنے کا
خطاب اور حقوق اسکے جسقدر بھی تھے | دلیر میکبتھ اُن سب سے سرفراز ہوا

راس۔ ضرور حکم کی تعمیل ہوگی عالی جاہ

تیسرا منظر۔ فارلیس کے قریب ایک جنگل

(گرج۔ تین ساحرائیں داخل ہوتی ہیں)

پہلی ساحرہ۔ بہن کہاں گئی تھیں تم؟

دوسری ساحرہ۔ سوروں کو گئی تھی مارنے میں

تیسری ساحرہ۔ بہن کہاں گئی تھیں تم؟

پہلی ساحرہ۔۔

ملاح کی ایک تھی جو بیوی | لے کر وہ گود میں تھی بیٹھی
چپ چپ دانتوں میں تھے کٹکٹے | دانے تھے بلوط کے جو پھل کے
آواز کچھ ایسی آرہی تھی | کتا کھاتا ہو جیسے ہڈی
میں نے کہا مجھکو دے ذرا سے | بولی آنکھوں میں غیظ بھر کے
چل دور ہو او غلیظ بڑھیا | حرافہ ہے ساحرہ سراپا
شوہر اُس کا حلب گیا ہے | ٹائگر کا وہ ماسٹر ہوا ہے
پہونچوں گی ابھی وہیں میں چلنی | چھلنی کو بنا کے اپنی کشتی
چوہا بے دُم کا میں بنونگی | ٹائگر میں چھید میں کرونگی
کرنا ہے مجھے ضرور ایسا | میں نے یہ کیا تو مجھکو کہنا

دوسری ساحرہ۔ میں دونگی تمھیں ہوا ابھی اچھی

پہلی ساحرہ۔ یہ تو ہے بڑی ہی مہربانی

تیسری ساحرہ۔ مجھ سے بھی یہ دوسری ہوا لو

پہلی ساحرہ۔

باقی میری ہیں سب ہوائیں | ہر سو سے چلیں گی جب ہوائیں
ہر رُخ پہ قطب نما کی سوئی | میری ایما ہی پر چلے گی
اس طرح سکھاؤں گی میں اسکو | بھوسے جیسے سبھی سکھائیں
آنکھوں سے نیند ہوگی غائب | دن رات سہے گا وہ مصائب
جادو کے اثر سے وہ رہے گا | حاصل نو سات کے ضرب کا
خستہ ماندہ رہے گا ہر دم | گھلتا جائے گا جسم پیہم
ڈوبے گا نہیں جہاز اُس کا | لیکن طوفان میں رہے گا

دیکھو مرے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟

دوسری ساحرہ۔

دکھلاؤ مجھے دکھاؤ

پہلی ساحرہ۔

یہ میرے پاس انگوٹھا جہاز راں کا ہے | کہ واپسی میں جہاز اُسکا بس ڈوبا

تیسری ساحرہ۔

یہ نقارہ نقارہ | وہ دیکھو میکبتھ آیا (اندر سے نقارے کی آواز)

سب مل کر۔

ملا دو ہاتھ سے ہاتھ آؤ ساحرہ بہنو | نہیں جو بند میں خشکی ہو یا کہ پانی
دکھا دو ناچ ذرا باندھ کر کے اک حلقہ | چلو چلو یونہیں پھیرو تم دے کے اک
مرے ہوں تین تمہارے بھی تین تین اور | کہ پورے نو سے بنے گا ہمارا یہ منتر
مگر خموش بس اب ناچ ہوگیا پورا | کہ اپنے سحر کا حلقہ بھی اب ہوا پورا

(میکبتھ اور بینکو داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ۔

عجیب بات ہے اچھا ہے اور پھر بھی برا | یہ دن تو ایسا ہے جیسا کبھی نہیں دیکھا

بینکو

یہاں سے فاصلہ فارس کا اور کتنا ہے | کسی سے آپ نے رستہ وہاں کا پوچھا ہے
مگر یہ کون ہے خلقت عجیب ہے ڈھنگی | کہ انکے جسم میں سوکھے لباس مجنونی
یہ اس زمین کی مخلوق ہو نہیں سکتی | اگرچہ دیکھ رہا ہوں اسی زمیں پہ انھیں

بتاؤ زندہ ہو تم یا کوئی ہیولیٰ ہو | وجود پر جیسے انسان کو یقین نہ ہو
جو خشک انگلیاں سوکھے لبوں پہ رکھتی ہو | تو گویا بات جو کہتا ہوں وہ سمجھتی ہو
اگرچہ جسم سے عورت کی تم سراپا ہو | مگر یہ ڈاڑھی ہے کیسی بتاؤ تو کیا ہو

میکبتھ۔ زبان ہے منہ میں تو بولو ذرا کہ تم کیا ہو ؟

پہلی ساحرہ۔
سلام تم کو سلام میکبتھ | کہ تم گلامس کے تھین بھی ہو

دوسری ساحرہ۔
سلام تمکو سلام میکبتھ | کہ تھین کاؤڈر کے بھی تھین ہو

تیسری ساحرہ۔
سلام تمکو سلام میکبتھ | کہ آگے چل کر کے شاہ ہوگے

بینکو
جناب حیران کس لئے ہیں | سنی ہیں باتیں جو ایسی اچھی
بتائیے ذرا تو مجھکو | خیال میں ہو گئے ہیں کیا گم
کہ یہ دکھاوے کی بات یہ ہیں | یہ میرے ہیں محترم جو ساتھی
جو انکا اعزاز ہے ابھی تک | سلام اُس پر کیا ہے تم نے
مزید عزت کی پیش گوئی | پھر اُس پہ شاہی کی ہیں امیدیں
ہوا ہے اُنکا دماغ مختل | مگر ذرا مجھکو بھی بتا دے
جو آگے کی کچھ خبر تمھیں ہو | کہ زندگی میں مرے کیا کیا
نہ ہوگا کیا اور ہوگا کیا کچھ | بتاؤ مجھکو بھی تم ذرا کچھ
اگرچہ تم سے نہ لوں گا عزت | کرم کرو مجھ پہ یا کہ نفرت

پہلی ساحرہ۔ سلام
دوسری ساحرہ۔ سلام
تیسری ساحرہ۔ سلام

پہلی ساحرہ۔
جو کم ہے میکبتھ سے اور برتر

دوسری ساحرہ۔
نہ اتنا اچھا نصیب ہوگا | مگر وہ پھر بھی ہے بخت اچھا
تمہاری اولاد شاہ ہوگی | اگرچہ تم خود نہ شاہ ہوگے
سلام میکبتھ سلام بینکو سلام سبکو

پہلی ساحرہ۔
سلام میکبتھ سلام بینکو | سلام سبکو

میکبتھ۔
ٹھہر کے ذرا بات تو پوری کردو | ادھوری سی باتیں ہیں ساری تمہاری
گلامس کا ہوں تھین یہ جانتا ہوں | سنیل کا ہوا جانشیں بعد اُس کے
مگر تھین کاؤڈر کا کیسے ہوا میں | کہ ابتک وہ زندہ ہے کاؤڈر کا تھین
شریف اور خوشحال بھی ہے بہت | مگر میں کہاں بادشاہی کہاں
یقین اس کا مجھکو تو آتا نہیں | نہ کاؤڈر نہ شاہی کا ہے کچھ گماں
کہاں سے عجب یہ خبر پا گئیں | یہ رستے میں روکا ہمیں کس لئے
سنانے کو آگے کی باتیں ہمیں | تمہیں حکم دیتا ہوں بتلاؤ تو

(ساحرائیں غائب ہوجاتی ہیں)

بینکو۔
جیسے پانی میں بلبلے ہوں | ویسے ہونگے زمیں پر بھی
یہ بھی گویا کہ ایسی ہی تھیں | لیکن غائب ہوئیں کہاں وہ

میکبتھ۔
ہوا میں ہو گئیں غائب | مجسم وہ نظر آئیں
ہوا میں مل گئیں لیکن | ٹھہرتیں وہ تو اچھا تھا

بینکو۔
یہ منظر کیا حقیقی تھا جو دیکھا | کہ ہم نے گھاس کھائی تھی نشے میں
کہ جس سے ہوش ہو جائیں معطل | سمجھ ہو جائے اپنی عقل مختل

میکبتھ۔ تمہاری اولاد شاہ ہوگی

بینکو۔ ملے گی تم کو بھی بادشاہی

میکبتھ۔

کاڈر کا بھی تھین میں بنوں گا ایسا ہی کہا نہ تھا انھوں نے

بینکو۔

بالکل ایسا ہی تو کہا تھا لیکن یہ کون اب ہے آیا

(راس اور انگس داخل ہوتے ہیں)

راس۔

جہاں پناہ بہت خوش ہوئے خبر سنکر جو کامیاب ہوئے آپ حضرت میکبتھ
وہ باغیوں سے لڑائی میں شوق آپکا نام تحیر اور مسرت سے کی بہت تعریف
کریں وہ آپ کی تعریف یا کریں حیرت اس انتشار میں خاموش ہوگئے بالکل
اُسی دن آپ لڑے ناروے کی فوجوں سے تو ہی غنیم کو جرأت سے کر دیا پامال
ڈرے نہ موت سے کشتوں سے بھر دیا میداں پیامبر جو مسلسل خبر تھے لے آئے
وہ سارے شاہ سے تعریف آپکی کرتے جو کام آپ کا تھا ملک کو بچانے میں

انگس۔

ہم آئے شاہ کا پیغام تہنیت دینے اگرچہ آپکو انعام شاہ خود دیں گے
مگر سپرد ہمارے ہوئی ہے یہ خدمت حضور شاہ میں ہمراہ آپکے جائیں

راس۔

مزید مہر و عنایت کا یہ کیا اظہار کہ مجھکو حکم یہ ہے آپ کو سلام کروں
کہ آپ تھین ہیں کاڈر کے ماسوا اب سے ملا ہوا ہے جو پہلے سے آپ کو اعزاز
سر نیاز سے کرتا ہوں آپکو میں سلام نیا یہ آپ کا اعزاز آپ کا حق ہے

بینکو (الگ ہٹ کر) یہ کیا کہ بات ہو شیطان کی زبان کی سچ

میکبتھ۔

ابھی تو تھین جو کاڈر کا ہے وہ زندہ ہے تو دوسرے کا جو اعزاز ہے مجھے کیوں دیں

انگس۔

یہ سچ ہے تھین جو کاڈر کا تھا وہ زندہ ہے مگر یہ فیصلہ اُسکے خلاف ہے سنگین

کہ اسکو جان سے اپنی حساب دینا ہے ملا ہوا تھا ناروے سے یہ باغی
کہ اس نے دونوں کو امداد دی رعایا کی شریک سازش خفیہ ہوا وہ دشمن سے
تباہ کرنے کو اپنے وطن کے درپے تھا اگرچہ اصل حقیقت مجھے نہیں معلوم
مگر قصور بغاوت کا اُس پہ ثابت ہے کیا ہے جرم کا اپنے خود اُس نے بھی اقرار
کہ جو خطاب تھا اُسکا وہ چھن گیا اُس سے اور اپنی ساری ریاست سے ہوگیا محروم

میکبتھ (الگ ہٹ کر)

گلامس بھی اور تھین کاڈر کے بھی اور اس سے بھی اونچا آگے کو بھی

(راس اور انگس سے)

یہ زحمت آپکی میرے لئے ہے شکر کا باعث

(بینکو سے)

کیا آپکو امید نہیں آپکی اولاد ہو جائے گی شاہی سے سرافراز یقیناً
کاڈر کا بنایا ہے مجھے جن غیبوں نے انکا ہی تو ہے آپ سے وعدہ بھی کچھ ایسا

بینکو۔

یقین آپکو ہے اس قدر اگر اس پر تو آپ تھین جو کاڈر کے ہوگئے یکسر
تو خواب تاج کے پھر آپ کیوں نہ دیکھیں گے مگر عجیب ہے یہ بات ہوتی ہے اکثر
برائیوں کے جو ہیں کارکن وہ کہتے ہیں کچھ ایسی باتیں سچائی کی ہوں جو معمول
کہ ہمکو کھینچ کے لیجائیں وہ زیاں کی طرف اور انکے جو ہوں نتائج وہ ہوں بہت سنگین
مرے عزیز مجھے ایک بات کہنا ہے

میکبتھ (الگ ہٹ کر)

دو باتیں کہی گئی ہیں سچی اچھی تمہید میں بڑی کی
یعنی شاہی کی بات جو ہے حضرات ہوا بہت ہی ممنون

(الگ ہٹ کر)

جو بات ہے ماورائے فطرت اُس میں ہوگی نہ کچھ برائی
ممکن ہے یہ بات ہو نہ اچھی لیکن یہ اگر ہوئی ہے کیوں شاد
تمہید ہوئی مگر خوشی کی سچ سے اسکی ہوئی شروعات

کاڈر کو تعین ہو گیا ہیں اچھا ہے اگر تو کیوں میں سوچوں
وہ ہول کی بات جس ہو نکلے استادہ بدن کے رونگٹے بھی
بڑھتی جس ہو ہے دل کی دھڑکن فطرت کے خلاف جو عمل ہو
اسوقت جو خوف ہے وہ کم ہے تخئیل سے ہولناکیوں کے
ہے قتل کا جو خیال دھندلا لرزہ اُس سے ہی آرہا ہے
تخئیل میں گم عمل ہوا ہے ہر چیز ہوئی ہے بے حقیقت

بینکو ۔ مرا رفیق خیالات میں ہوا ہے محو

میکبتھ ۔ (الگ ہٹ کر)

جو اتفاق سے بننا ہے بادشاہ مجھے تو اتفاق مرے سر پہ تاج رکھے گا
نہ اس کے واسطے کوشش کی ہے ضرورت کچھ

بینکو ۔

نیا نیا انھیں حاصل ہوا ہے جو اعزاز ابھی ہوا نہیں مانوس کچھ دماغ اس سے
نیا لباس پہننے میں کچھ کھٹکتا ہے مزا ولے مگر اُس سے ربط ہوتا ہے

میکبتھ (الگ ہٹ کر)

ہوتا جو کچھ ہے ہو رہے گا رفتار ہے وقت کی بہت تیز
گذرے گا کٹھن ہو خواہ کتنا مقدور جو ہے وقت آجائیگا

بینکو ۔

ہم انتظار میں عالی وقار بیٹھے ہیں حضور شاہ میں چلنے کی ہو گی کب فرصت

میکبتھ ۔

مجھے معاف کریں اے امیر اور سردار کہ میرا ذہن معطل ہوا ہے کچھ ایسا
جو یاد کرتا ہوں کوشش سے بھولی باتوں کو جو آپکی ہیں عنایات وہ ہیں یاد مجھے
اُنھیں میں ذہن میں لاتا ہوں روز صبح و شام تو اب حضور میں چلیں گے ہم فوراً

(بینکو سے)

جو حال گذر رہا ہے اُسپر کرینگے غور ضرور کبھی ملے جو ہمیں کوئی وقت فرصت کا
اور اس زمانے میں ادھیڑیں گے ذہن میں اسکو کریں گے بات پھر اُسوقت اک ہم دونوں

بینکو ۔ بڑی خوشی سے خوں گا میں آپ سے باتیں

میکبتھ ۔

تو پھر زباں سے کچھ بھی کہیں نہ ہم تب تک اب آئیے مرے احباب ہم روانہ ہوں

چوتھا منظر ۔ فارِیس ۔ محل کا ایک کمرہ

(قرنا بجتا ہے ۔ ڈنکن مالکم ڈونل بین لینا کس ہمراہیوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)

ڈنکن

خبر ہے آپکو کاڈر کو ہو گئی پھانسی سپرد کام تھا جنکے وہ آگئے کہ نہیں

مالکم ۔

جہاں پناہ وہ ابتک نہیں ہوئے واپس مگر ملا تھا مجھے ایک آدمی ایسا
خود اپنی آنکھ سے دیکھی ہے جس نے موت اُسکی تو اُس سے مجھکو ہوئی سرگذشت سب معلوم
کہ اُس نے قصہ بغاوت کا کر لیا اقبال حضور شاہ سے تھا خواستگار معافی کا
پھر اُس نے دل سے ندامت کا بھی کیا اظہار شرافت ایسی دکھائی جو موت پر اُسنے
وہ زندگی میں نہ اُسکے نصیب میں تھی کہ جیسے مشق سی کرلی تھی اُس نے مرنے کی بہت
جو سب سے بیش بہا چیز جان تھی اُسکی حقیر شے کی طرح اُسکو تج دیا فوراً

ڈنکن ۔

کوئی ہنر نہیں چہرے سے جان لینے کا کسی دماغ میں کیسے خیال ہوتے ہیں
وہ تھا شریف کہ جس پر مجھے بھروسا تھا بہت ہی زیادہ مرا اعتماد تھا اُسپر

(میکبتھ، راس اور انگس داخل ہوتے ہیں)

دماغ پر مرے حاوی ابھی ندامت ہے بہت سوا ہیں صلے سے جناب کی خدمات
کسی طرح کا صلہ بھی ہے نہیں کافی یہ چاہتا تھا کہ آپ اتنے مستحق ہوتے
کہ جو صلہ مرا ہوتا وہ اُس سے بڑھ جاتا بس اب کہونگا یہ کچھ اور ما سوا اسکے
کہ حق ہے جتا بنتا تھا بڑا کہ اُسکا صلہ بڑے سے بھی جو بڑا ہو تو ہو نہیں سکتا

میکبتھ ۔

جو خدمت اور وفاداری مجھ پہ واجب ہے　　تو اسکا دینا ہی انجام ہے صلہ اُس کا
حضور کیلئے بس حق اسے قبول کریں　　جو تخت و تاج کے خاطر مرے فرائض ہیں
وہ بس کہ خادم و اولاد کی طرح سے ہیں　　کہ والدین کی خاطر کریں وہ ایسا کام
حفاظت انکی ہو مقصود جس بہر صورت　　اور اس سے الفت و اعزاز کا بھی ہو اظہار

ڈنکن۔

خوش آمدید کہ میں نے تمہیں شجر کی طرح　　جما دیا ہے زمیں پر تو میرا فرض بھی ہے
کہ میری ہو یہی کوشش کہ تم پھلو پھولو　　مگر معزز و عالی وقار بینکو بھی
کچھ اس سے کم نہیں حقدار جاہ و منصب کے　　کچھ اس سے کم نہیں خدمات آپکی بھی ذرا
تو آئیں آپ سے میں اس طرح گلے مل لوں　　کہ میرے دل کے برابر ہو آپکا دل بھی

بینکو۔

جہاں پناہ کے دل پر اگر پھلوں گا میں　　حضور ہی کا وہ سب ہوگا ماحصل میرا

ڈنکن۔

مجھے ہے اتنی مسرت کہ حد نہیں اسکی　　کہ اشک آنکھوں میں آکر دبا رہے ہیں اُسے
مرے عزیز مرے بچو اور رئیس و امیر　　وہ سب جنہیں بھی حاصل ہے مجھ سے قرب کا
کہ مالکم جو بڑا سب سے ہے مرا لڑکا　　اُسے بناؤنگا میں تخت و تاج کا وارث
زمین آج سے کہلائیگا وہ کمبرلینڈ　　مگر نہیں یہ فقط شاہزادے کا اعزاز
ملینگے اور انکو بھی عز و جاہ کے تمغے　　کہ مستحق جو ہیں انکے تو انکے سر پہ بھی
چمک ستاروں کی اور جیسے ماہ کی ہوگی　　بس اب یہاں سے کریں کوچ سوئے انورنس
مزید لطف و مراعات کا کریں اظہار　　کہ اور رشتہ ہمارا ہو آپ سے مضبوط

میکبتھ۔

جہاں پناہ کی خدمت میں جو گھڑی ہو صرف　　وہ بس کہ کوشش لاحاصل اور بے مصرف
حضور شاہ کی تشریف آوری کی خبر　　پیام بر کی طرح خود ہی لیکے جاؤنگا
سرور جس سے بہت ہوگا میری بیگم کو　　تو اب حضور اجازت مجھکو رخصت کی

(الگ ہٹ کر)

یہ کمبرلینڈ شہزادہ　　ہے میری راہ میں حائل
مجھے اب اسکے اوپر سے　　گذرنا یا پٹخنا ہے
کہ حائل راہ میں یہ ہے　　ستارو بس کہ چھپ جاؤ
کہ میری خواہشیں دل کی　　جو تاریک اور گہری ہیں
نہ اُن پر روشنی کچھ ہو　　مری آنکھیں نہ دیکھیں وہ
جو میرے ہاتھ کر گزریں　　مگر ہو کر رہے گا یہ
کہ جب انجام پا جائے　　تو منظر اُس کا ہو ایسا
کہ ہیبت چھائے آنکھوں پر　　اس عبرتناک منظر سے

ڈنکن۔

معزز بینکو یہ سچ کہا تم نے　　یقیناً وہ جری ہے اور بہادر ہے
خوشی ہوتی ہے تعریف اُسکی سنکر　　یہ میرے واسطے ہے اک ضیافت
چلیں ہم سب بھی اسکے پیچھے پیچھے　　کہ اسکو میری آسائش کی ہے فکر
گیا ہے آگے آگے وہ ہمارے　　کہ دل سے خیر مقدم ہو ہمارا
کرے گا اہتمام اسکا وہاں پر　　ہمارا کوئی رشتہ دار ایسا
نہیں ہے جو کہ ہو اس کے برابر　　کہ اسکی ہمسری کچھ کر سکے وہ

پانچواں منظر۔ انورنس۔ میکبتھ کا قلعہ

(لیڈی میکبتھ ایک خط پڑھتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

لیڈی میکبتھ۔

جب کیا باغیوں کو میں نے زیر　　کامیابی کا تھا وہ میرا دن
وہ ملیں مجھکو اور میں سمجھا　　اطلاعات سے جو مجھکو ملیں
بیش انسان سے ہے علم اُن کا　　تھی مجھے جب شدید یہ خواہش
کہ مزید اُن سے کچھ سوال کروں　　تو ہوا میں وہ ہو گئیں غائب
جبکہ حیرت زدہ کھڑا تھا میں　　شاہ کا لوگ لے کے آئے پیام
سب نے مجھکو کیا ادب سے سلام　　اور کہا مجھکو تھین کاڈر کا
یعنی جیسا کہ ساحروں نے　　مجھکو پہلے لقب دیا تھا ہی

اور کہا تھا کہ وقت آنے پر — تخت شاہی پہ ہو گے جلوہ گر
مجھکو دینا تھی یہ خبر تم کو — کہ مجھے جب ملی گی یہ عظمت
تم مری ہو گی اس میں شریک عزیز — تاکہ تم بے خبر نہ رہ جاؤ
اُس مسرت سے جو تمہیں ہوگی — سُن کے مقسوم اپنی عظمت کا
غور اس پر ذرا کرو دلمیں — اور رخصت بس اب خدا حافظ
تم گلامس ہو اور کاڈر بھی — اور وہ ہو گے جس کا وعدہ ہے
ہاں مگر ڈر مجھے ضرور یہ ہے — کہ طبیعت میں ہے تمہاری بہت
نرمیت اور مہر کی بہتات — کہ نہ لے پاؤ گے قریب کی راہ
چاہتے ہو ضرور عظمت کو — تو صلے سے نہیں ہو تم خالی
لیکن اس کا حصول چاہتے ہو — ایسے جسمیں نہ ہو بری کوئی بات
پاکبازی سے چاہتے ہو وہ بات — جسکی خواہش بھی ہے قوی دلمیں
کوئی بد کام خود کرو گے نہیں — ہاں جو شر سے ہو کوئی شے حاصل
اُس سے خوش ہو کے کام تم لوگے — اے گلامس تمہیں جو خواہش ہے
مفلتوں کی تو وہ پکارتی ہیں — تم کو کرنا ہے جو لینا ہے
جس کے کرنے سے تو ہے ڈر تجکو — میٹ دو اُسکو دوسرا جو کرے
جلد اب تم یہاں پہونچ جاؤ — کہ بھر دوں کان میں تمھائے میں
مجھ میں جتنی ہے جرأت و ہمت — اور اپنی زباں سے دور کر دوں
ساری باتیں جو روکتی ہیں تمہیں — تاج زریں حصول کرنے سے
جس کو سر پر تمہارے رکھتا ہے — ہاتھ قدرت کا جسمیں ظاہر ہے
اور وہ فطرتیں جو ہوتی ہیں — ماورائے قوائے انسانی

(ایک پیامبر داخل ہوتا ہے)

لے کے آیا ہے تو خبر کیسی ؟

پیامبر۔

آج شب کو ہے شاہ کی آمد

لیڈی میکبتھ۔

کچھ خرابی دماغ میں تو ہے تیرے — تیرے آقا تو ساتھ شاہ کے ہیں
بات ایسی اگر کوئی ہوتی — مجھکو کرتے وہ اطلاع ضرور
مجھکو کرنا تھی اسکی تیاری — کہ مناسب ہو شہ کا استقبال

پیامبر۔

ہے بجا آپ کا یہ فرمانا — حضرت تھین آ رہے ہیں خود
دوڑ کر میرا اک رفیق آیا — تھین سے پہلے وہ یہاں پہونچا
اب وہ بے حال ہو گیا آتا — کہ یہ مشکل خبر کو پہونچا پایا

لیڈی میکبتھ۔

تو احتیاط سے اُسکی کرو خبرگیری — کہ لیکے آیا ہے اتنی بڑی اہم وہ خبر

(پیامبر جاتا ہے)

ہے نحوست کا کوے کا بول ہے گویا — خبر جو دیتا ہے ڈنکن کی آمد آمد کی
وہ آرہا ہے ہمارے حصار کے اندر — جو شریک ہوتی ہیں ارواح اب وہ آجائیں
جو قاتلانہ خیالوں کے ساتھ رہتی ہیں — مری سرشت سے نسوانیت کو دور کریں
مجھے بنائیں مرے سر سے پاؤں تک ایسا — شقاوت اتنی مرے جسم میں سما جائے
تو ہار ہے نہ ندامت کی اسمیں گنجائش — کہ خوفناک ارادے سے اپنے باز آؤں
نہ ہو ارادہ وہ جسکے میں کوئی شے حائل — کہ جب تلک اُسے انجام تک نہ پہونچاؤں
جہاں بھی تم ہو ہلاکت کے کار پرداز — وہ ہستیاں جو بدی کی چھپی ہیں نظروں سے
آؤ اور مرا سینہ تلخ کر ڈالو — نہ کوئی چیز بھی شیریں یہاں رہے باقی
وہ آئیں رات کی تیرہ ظلمتیں ساری — اور اُن پہ چھائے سیہ تر دھواں جہنم کا
کہ آسکے نہ نظر گھاؤ میرے خنجر کا — نہ آسماں بھی تاریکیوں میں جھانک سکے
کہ وہ پکار کے مجھ سے کہے ٹھہر جاؤ

(میکبتھ داخل ہوتا ہے)

خوش آمدید گلامس عظیم اور کاڈر — اور اس سے بیش وہ عظمت ہے جو ملنے والی
تمہارے خط سے مسرت مجھے ہوئی اتنی — کہ مجھکو حال سے پہونچا دیا بہت آگے
ابھی نظر سے ہے پوشیدہ جو کہ مستقبل — وہ آرہا ہے نظر صاف حال میں مجھکو

میکبتھ۔

عزیز تم ہو مری جان بہت پیارے کہ آج رات کو ڈنکن بھی آ رہے یہاں

لیڈی میکبتھ۔

اور انکا کب ہے ارادہ یہاں سے جانے کا؟

میکبتھ

وہ کل ہی جائینگے واپس ارادہ ہو ایسا

لیڈی میکبتھ

طلوع دیکھ سکیں گے کبھی نہ وہ کل کا مگر یہ تعین مکہ آپ کی ہے حالت کیا

انوکھی باتیں ہیں جیسے یہ آپکے لکھی گذارنے کے لئے وقت وقت کی ہو بنا

نظر میں، ہاتھ میں، باتوں میں خوشی ظاہر جو آ رہا ہے وہ خاطر میں سکے ہو نہ کمی

بڑا ہو رات کا ہے کام مجھ پہ وہ چھوڑ دو کہ جس سے اگلے شب و روز شاد کام کریں

ہمارے ہاتھ میں شاہی بھی اور حکومت ہو

میکبتھ۔

کریں گے بعد کو اس بات پر تو ہم غور

لیڈی میکبتھ۔

جو رنگ چہرے کا بدلا تو خوف ہوگا عیاں جو اور کام ہیں وہ چھوڑ دو مجھ پہ سب

چھٹا منظر۔ بدستور قلعہ کے سامنے

(نفیری اور مشعلیں۔ ڈنکن مالکم ڈونل بین، لینا کس، میکڈف، راس، اینگس ہمراہیوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)

ڈنکن۔

ہے بہت خوب یہ اس قلعہ کی جگہ اور اس کی ہوا بہت ٹھنڈی

اس سے ہم کو ملا سکون بہت حاصل احساس کو قرار ہوا

بینکو۔

یہ طائر موسم گرما کا مہمان بتاتا آشیاں ہے مندر و محل میں

جو اس منزل میں ہے اُس کا نشیمن تو اس کے آشیاں سے ہے یہ"

کہ وہ اس کی سماوی ہوا کو مقدس جان کر رکھتا ہے محبوب

کہ گوشہ کا نس طاق و ستون تک نہیں خالی جہاں اس کا نہ گھر

جو آویزاں ہے یا صدر خوشنمائی اسی گہوارے میں اسکے ہیں بچے

یہیں پلتے ہیں وہ اور بڑھ کے اُڑتے مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے

کہ جو ہوتا ہے اس طائر کا رہنا ہوا ہوتی ہے وہاں دلکش خوش آ

(لیڈی میکبتھ داخل ہوتی ہے)

ڈنکن

معزز میزبان دیکھو یہ آئیں محبت سے کبھی ہوتی ہے زحمت

مگر پھر بھی ہے یہ بس ایک رحمت تو اس سے یہ سبق ملتا ہے بیشک

دعائیں آپ ہم کو اس لئے دیں کہ ہم نے آپ کو جو دی ہے زحمت

ہمارا شکریہ پھر بھی ہے واجب کہ زحمت آپ کو ہم سے ہوئی یہ

لیڈی میکبتھ۔

ہماری خدمتیں ساری اگر ہوں سہ گز ہوں کہ اس بھی سوا ہو پھر بھی ڈر سب میں بہت ہو

مقابل میں عنایات فراواں شاہی کے ہمارے خانوادے پر جو ارزانی رہی ہر دم

پرانے جو تھے اعزاز اور منصب نئے حاصل ہمیشہ ہم دعا گو شاہ کے انکے لئے ہونگے

ڈنکن۔

کہاں ہیں تھین کا ڈر کے چلے تھے اُن سے پہلے ہم

پہنچے اُن سے پہلے ہی مگر وہ ہیں سوار اچھے

پھر اُس پر ہم سے الفت ہے ہوئی مہمیز وہ ان کی

کہ پہنچے ہم سے پہلے ہی معزز میزبان میری

رہیں گے آج شب بھر ہم کہ مہمان آپ کے ہونگے

لیڈی میکبتھ۔

جو خادم شاہ کے ہیں انکا جو کچھ ہے وہ خود بھی اور جو املاک ہے انکی

وہ سبھی شاہ دالا جاہ کی ہیں ہمارا کام جو ہے وہ فقط ہے انکی نگرانی

کہ جب شاہ کی مرضی وہ لیں جیسے حساب انکا بلا عذر انکا جو حق ہے وہ واپس کریں ہم ان کو

ڈنکن۔

پڑھاؤ ہاتھ اپنا اور مجھکو لیچلو اب تم — معزز میزبان کے پاس جن سے ہمکو الفت ہے
ہمیشہ کے لئے ان پر ہماری نظر شفقت ہے۔ ہماری میزبان کی اب اجازت ہمکو حاصل ہے

ساتواں منظر ۔ میکبتھ کا قلعہ

(ایک خانساماں اور مختلف ملازمین پلیٹیں اور کھانے لئے ہوئے اسٹیج پر آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ پھر میکبتھ داخل ہوتا ہے)

میکبتھ ۔

اگر یہ کام ہوتا ہے تو عجلت کیجئے ضرور — کہ انجام اسکے ہونے سے مقصد ٹھہرایا
اگر اس قتل کے انجام بد سے بچ کے ہم نکلیں — اسی کامیابی ابھی ہو جائے بس حاصل
یہی اک ضرب ہو گر ابتدا اور انتہا اسکی — تو ہم جو زندگی کے بحر میں ہیں اچھلے ساحل تک
مسرت زندگی کی پھر نہیں حاصل ہونے کی — مگر جو کام ایسے ہیں یہیں انکی سزا بھی ہے
سکھاتے ہیں ہم اوروں کو یہی خونریزیاں — اذیت اسکی پھر استاد کو ہلکان کرتی ہے
یہ وہ انصاف ہے جسمیں رعایت کچھ نہیں ہوتی — کسی کو زہر دینے کو جو ہم تیار ہوتے ہیں
پیالہ زہر کا اکثر ہمارے منہ لگتا ہے — ہمارے قصر میں ہیں شاہ تو انکی حفاظت کا
دوگانہ ہے ہمارا فرض اسمیں شک نہیں کوئی — عزیز انکا ہوں میں اور پھر ہوں انکی رعایا بھی
مخالف ہیں یہ دونوں حق اسیر کار مہلک کے — مگر مہمان نوازی کا فریضہ اس سے بڑھ کر ہے
کہ قاتل کوئی آ پائے نہ انکے پاس تک ہرگز — بڑی جرأت ہے گر میں جاؤں قاتل انکا میں خود ہی
پھر اسپر یہ کہ ڈنکن اسقدر نیک اور حلیم دل ہے — صفائی سے برتتا ہے اس نے اختیار اپنا
رہا ہر اسکی شاہی اس طرح سے عیب سے خالی — کہ بیرحمی سے اسکے قتل کا انجام یہ ہوگا
کہ اسکی نیکیاں بنکر فرشتہ یہ پکاریں گی — کہ قاتل کی شقاوت ہے نہایت قابل نفرت
ہوا پہ رحم نو مولود بچے کی طرح چڑھ کر — فضا کے غیر مرئی دوش پر چڑھ کر فرشتے بھی
شقاوت کی خبر ہر ایک کو جا کر سنائیں گے — پھڑک اٹھے گا پہلے انکے دل میں غیظ یہ سنکر
کہ بجھے سو پھر اس آگ کو وہ اپنے اشکوں سے — نہیں مجھکو شکایت اس سے جو اسپر کیے مائل
بجز اپنی ہوس کے جو کہ ہے اپنی سواری — کہ چڑھتے وقت جس نے اختیار اپنے نہ کچھ کر لی
گریگی دوسری جانب وہ بے قابو سی ہو کر — کہ اس کا مدعا جو کچھ ہے گم ہو جائیگا خود ہی

کہو کیا بات ہے اور کیا خبر ہے شاہ والا کی

(لیڈی میکبتھ داخل ہوتی ہے)

لیڈی میکبتھ ۔

قریب الختم ہے کھانا اب انکا — مگر یہ آپ کیوں آئے ہال سے

میکبتھ ۔ شہ والا نے کیا پوچھا تھا مجھکو؟

لیڈی میکبتھ ۔

کیا آپ کو معلوم نہیں شاہ نے پوچھا

میکبتھ ۔

کروں گا نہیں میں اب اس کام کو — ابھی مجھکو اعزاز اُن سے ملا
سب لوگ کرتے ہیں عزت مری — زیادہ اس کا کرنا مجھے ہے ضرور
مناسب نہیں انکو ٹھکراؤں میں — ابھی تو نیا ہی یہ اعزاز ہے

لیڈی میکبتھ ۔

تو کیا اسوقت تم پر کچھ نشہ تھا — جو کی تھی تم نے خواہش تاج زر کی
اب آیا ہوش تو ڈر کر ہوئے زرد — یہ ہمت نہیں تمہاری ہے تلون
تو سمجھی ہوگی تجھ کو کیا محبت — جسے زیور ہو سمجھے زندگی کا
تو کیا اسکو کرو گے یونہی حاصل — کہ اپنی ہی نظر میں تم ہو بزدل
کہ جو کرنا ہے اس میں تامل — عمل کی کچھ رہے باقی نہ جرأت
تو اسکی تو مثال ایسی ہے جیسے — وہ بلی تیرنا جو چاہتی تھی
مگر سر اپنے تر کرنا نہ چاہا — مثل ہے آج تک مشہور اسکی

میکبتھ ۔

نہ اب زیادہ کہو مجھ میں ہمت — کسی انسان کو لازم ہے جتنی
کسی میں ہو جو مجھ سے بیش جرأت — تو ایسا کوئی انسان بھی نہیں،

لیڈی میکبتھ ۔

تو پھر کیا جانور تھا وہ کہ جسنے — تمہارا قصد کہلایا تھا مجھ سے

کہ انسان تم تھے بہت کم جس وقت   مگر اس پر عمل کے وقت گویا
تم انسان سے زیادہ ہوگئے کچھ اور   جب اس کا قصد تم نے کر لیا تھا
مناسب وقت یا موقعہ نہ تھا کچھ   مگر دونوں کو کرنا تھا فراہم
اب اس دم سامنے موقعہ ہے اور وقت   سہولت ہوگئی تیار از خود
تو پھر باقی رہی تم سے وہ ہمت   مجھے معلوم ہے ماں کی محبت
جو بچے سے ہو پیتا دودھ جو ہو   مگر میں نے قسم کھائی جو ہوتی
کہ جیسی تھی تمہاری سخت سوگند   تو میں بچے کو سینے سے ہٹاتی
زمیں پر اسطرح اسکو پٹختی   کہ ہوتا سر سے باہر اسکا بھیجا

میکبتھ

اگر سوچو تو ناکامی ہوئی گر

لیڈی میکبتھ ۔

نہیں ہے خوف ناکامی کا ہمکو   اگر تم پختگی سے باندھو ہمت
تو کیا ممکن کہ ناکامی ہمیں ہو   تھکاوٹ میں سفر کی ہوگا ڈنکن
بہت جلدی وہ سو جائیگا غافل   جو نگراں اس کے کمرے کے ہیں انکو
شراب اتنی پلادونگی میں بھر کر   کہ انکی یاد کھو جائیگی ان سے
جو حافظہ ذہن کی اور عقل کی ہے   تو جب سو جائینگے سوروں کی مانند
نشے میں ہوش ان کے ہونگے غائب   تو ڈنکن کا محافظ کون ہوگا
کریں گے حال اسکا ہم جو چاہیں   تو پھر ہمیں نہ ہوگی کچھ بھی مشکل
کہ ان مبہوت لوگوں کو بتائیں   کہ قاتل شاہ والا کے یہی ہیں

میکبتھ

نرینہ ہی ہو پیدا تم سے اولاد   کہ تم میں جو ہے اس درجہ جسارت
تو اس سے ہونگے نرینہ بچے پیدا   محافظ وہ ہیں جو کمرے کے اندر
ملیں گے ان کے منہ پر خون تازہ   کریں گے قتل انکے خنجروں سے
تو بیشک انکو سب سمجھیں گے قاتل   کسی پر اور شبہ بھی نہ ہوگا

لیڈی میکبتھ ۔

کرے گا کون شبہ پھر کسی پر   کہ جب شور و فغاں کے ساتھ پیہم
کریں گے شاہ کے مرنے پہ ماتم

میکبتھ

تہیہ کر لیا میں نے بس اب تیار ہوں بالکل   قوی اب جسم کے سارے اسی پر ہیں لگے
بنا کر شاد و خرم اپنا چہرہ سب کو دھوکہ دو   فریبی دل میں جو ہوتا ہے وہ چہرہ چھپاتا ہے

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر۔ انورنس۔ میکبتھ کے قلعہ کا صحن

(بینکو اور فلی انس مشعل لئے داخل ہوتے ہیں)

بینکو ۔

مرے بیٹے بتا وقت کیا ہے

فلی انس ۔

سنا گھنٹہ نہیں میں نے   مگر اب چاند ڈوبا ہے

بینکو ۔

غروب چاند جو ہوتا ہے بارہ بجتے ہیں ۔

فلی انس

مرے خیال میں اس سے بھی کچھ زیادہ ہے

بینکو ۔

ذرا ٹھہرو مری تلوار لے لو   کفایت روشنی کی ہے فضا میں
وہاں کی ساری شمعیں بجھ گئی ہیں   اسے بھی لو ذرا تم ہی سنبھالو
اگرچہ نیند غالب آنکھ پر ہے   مگر سونا نہیں میں چاہتا ہوں
سمائی قوتیں برتر سنو تم   تخیل بد مرے سر سے نکالو
جو سوتے میں مرے دل پر ہوں طاری   مری تلوار مجھکو دیدو بیٹے

مگر یہ کون ہے جو آ رہا ہے   (میکبتھ مشعل لئے ہوئے
داخل ہوتا ہے)

میکبتھ ۔

ایک دوست ہوں آیا ہوں

بینکو ۔

جناب کیا ہو کہ سوئے نہیں ہیں آپ اب تک   حضورِ شاہ تو آرام کر رہے ہیں اب
بہت ہی خرم و شاداں حضورِ عالی ہیں   ملازموں کو دیا ہے بہت بڑا انعام
سلام آپکی بیگم کو بھی انھوں نے کہا   بطور تحفہ کے بھیجا ہے انگوٹھی یہ ہیرا
بہت شریف انھیں میزباں کہتے ہیں   بڑے سکون سے آرام کر رہے ہیں اب

میکبتھ ۔

ہم اہتمام مکمل نہ کر سکے ان کا   بہت سی خامیاں آخر کو رہ گئیں ایسی
کہ ہم جو پہلے سے تیار ہو گئے ہوتے   تو اور شان سے کرتے ہم ان کا استقبال

بینکو

جو کچھ ہوا ہے بہت ہے نہ اسکی فکر کریں   وہ ساحرائیں مجھے خواب میں نظر آئیں
بہت کچھ آپ کو جو کچھ کہا ہوا پورا

میکبتھ ۔

مجھے نہیں ہے کچھ اس وقت اسکی فکر ذرا   مگر ملے گا گھڑی بھر جو وقت فرصت کا
کریں گے آپ سے ہم بات اسکے بارے میں   جو اسکے واسطے کچھ وقت آپ دیدینگے

بینکو ۔

بڑی خوشی سے ہوں تیار آپ جب چاہیں

میکبتھ ۔

ملے گی آپ کو عزت جو میرے ساتھ ہیں   ہمیشہ آپ چلیں گے جو میری مرضی پر

بینکو ۔

مجھے ملی ہے جو عزت وہ گر نہ کھو جائے   اسے بڑھانے کی کوشش کا ہو نہ یہ انجام
وفاشعاری پہ میری نہ حرف آئے کچھ   مرا ضمیر بھی رہ جائے صاف اور بیباک

تو میں ضرور کرونگا جو آپ کہتے ہیں   کرونگا آپ مجھے رائے دیں گے جو کچھ بھی

میکبتھ ۔

کریں اب آپ بھی آرام خوب نیند آئے

بینکو ۔

یہی دعا ہے مری بھی بہت ہی شکریہ

(بینکو اور فلی انس جاتے ہیں)

میکبتھ ۔

بس اب تو جاؤ یہ کہہ دو ہماری بیگم سے   بجائیں گھنٹی جو مشروب ہو گیا تیار
چلو بس اب کرو آرام اپنے بستر پہ

(خادم جاتا ہے)

یہ دیکھتا ہوں کہ جو سامنے ہے یہ خنجر   مری ہی سمت ہے قبضہ کہ اس کا رخ بالکل
تو آ تجھے میں پکڑ لونگا مگر یہ کیسا ہے   کہ ہاتھ میں مرے آیا نہیں ترا قبضہ
اگرچہ دیکھ رہا ہوں میں ہو بہو تجھکو   تو کیا کوئی جھلک سا ہے تصور تو
ہوئی دماغ کی گرمی سے جسکی تشکیل   کہ جسکو ہو نہ حقیقت سے واسطہ کوئی
مگر میں اب بھی مجسم تجھے ہوں دیکھ رہا   اسی طرح سے کہ جیسا یہ میرا خنجر ہے
جدھر کو جانا ہے مجھکو دکھاتا ہو وہ راہ   کہ میرے حربہ مجھے جس سے کام لینا ہے
مری نگاہ نے احساس کو دیا دھوکہ   کہ بس نگاہ حقیقت ہے اور حس ہے غلط
میں اب بھی دیکھ رہا ہوں تجھے مگر اب تو   یہ تیرے قبضہ و پھل پر ہیں خون کے دھبے
اگرچہ پہلے نہیں کچھ نشان تھا انکا   مگر یہ کچھ بھی نہیں ہے مرا تخیل ہے
جو میرے سامنے لاتا ہے ایسی صورت بھی   وہ قتل کا جو ارادہ ہے دماغ میں ہے
یہ وقت ہو کہ زمانہ ہو نصف خواب میں گم   جو آدمی کی بھی آنکھ کا ہے اک پردہ
برے ہیں خواب ستاتے ہیں سونے والوں کو   وہ ساحرائیں بھی ہوتی ہیں جبکہ سب آ کے
کہ اپنی دیوی ہیکیٹ کو دیں وہ قربانی   جھکا ہوا سا جو قاتل ہے جاگ جاتا ہے
جو بھیڑیا ہے محافظ اسے جگاتا ہے   گونج ہے جسکی گزرتی گھڑی کو جانیں سب
دبے دبے سے قدم چل کے بس آتا وہ ہے   کہ قاتلانہ جو مقصد ہے وہ کرے پورا

کہ جیسے تارکوین جانے کو لیکے یہاں | کہ اُسکی عصمت و عزت کو روند کے بیباک
زمین سخت نہ سن لیجیے پاؤں کی آہٹ | کہ اُن کا رُخ ہے کدھر کس طرف کو جاتے ہیں
بتا نہ بیٹھے مری حرکت کو سخت پتھر بھی | کہ جیسے خوف کا جو یہ سماں ہے ختم نہ ہو
شدید جرم کا میرا جو ہے ارادہ آج | تو اس کے واسطے ہے سازگار ایسی فضا
یہ دھمکیاں اُسے دیتا ہوں جو کہ زندہ ہے | بہت سی باتوں سے مجھکو سکون ملتا ہے
بھڑک رہے ہیں وہ جذبات میرے سینے میں | تو اب میں جاؤنگا اور کام ہوگا ختم ابھی
مجھے بلا رہی گھنٹی بھی اب تو بجتی ہے | تو کیا صدا نہیں ڈنکن کے کان میں جاتی
کہ یہ تو گھنٹی ہے سب اُسکی موت کی گھنٹی۔ | بلاتی ہے جو اُسے جنت میں یا کہ دوزخ میں

دوسرا منظر - وہی مقام

(لیڈی میکبتھ داخل ہوتی ہے)

لیڈی میکبتھ -

دی شراب کہ جس سے وہ ہوگئے مدہوش | اُسی سے آئی ہے مجھ میں حیا و جرأت
دبی ہے جس چیز سے وہ ہوگئے مغلوب | مگر اُسی نے مرے دل میں روح پھونکی ہے
ملو سنو کہ یہ آواز آئی اُلو کی | پرند نحس جو لاتا ہے موت کا پیغام
وہ اب تو کام میں مشغول ہوگئے ہونگے | کھلے ہیں در تو محافظ پڑے ہیں اُنکے کمرے کے
اُنھیں کھلا کے بہت مست کر دیا میں نے | کہ اسطرح سے وہ لیتے ہیں اب تو خراٹے
کہ موت و زیست کی اک کشمکش ہے دونوں پر

میکبتھ (اندر سے)

یہ آواز کس کی ہے باہر ہے کون؟

لیڈی میکبتھ -

ہزار حیف مجھے خوف ہے وہ جاگ گئے | ہوا نہیں ہے ابھی کام جو کہ ہونا تھا
تباہ ہو رہے گے جو کوشش نہ کامیاب ہوئی | سنو کہ میں نے تو خنجر کو پاس رکھا تھا
کہ اس کے لینے میں دقت ذرا نہیں ہوتی | جو نیند میں وہ مشابہ نہ باپ کے ہوتا
تو اسکو ہاتھ سے خود اپنے قتل کر دیتی | وہ آ گئے میرے عالی وقار شوہر بھی

(میکبتھ داخل ہوتا ہے)

میکبتھ -
کر دیا میں نے کام کو پورا | کیا کچھ آواز بھی سنی تم نے؟

لیڈی میکبتھ -
بس اُلو کی آواز جھینگروں کے بول | مگر آپ بولے نہیں تھے ابھی

میکبتھ - کب ؟

لیڈی میکبتھ - ابھی

میکبتھ - جب اترا تھا زینے کے نیچے کو میں ؟

لیڈی میکبتھ - جبھی -

میکبتھ - سنو کمرے میں ہے وہ کون لیٹا ؟

لیڈی میکبتھ - ڈونلبین

میکبتھ - بہت ہی بد نما ہے اُنکی صورت

(اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر)

لیڈی میکبتھ - حماقت ہے یہ کہنا بدنما ہیں

میکبتھ -
ہنسا تھا ایک سوتے میں | تو بولا دوسرا قاتل!
وہ دونوں جاگ اُٹھے پھر | کھڑا میں اُنکو سنتا تھا
دعا دونوں نے لی لیکن | مگر پھر سو گئے دونوں

لیڈی میکبتھ - وہاں وہ ساتھ لیٹے ہیں -

میکبتھ -
خدا محفوظ رکھے ایک بولا | کہا آمین فوراً دوسرے نے
مرے ہاتھوں کو دیکھا تھا انہوں نے | کہ جن پر خون کے دھبے پڑے تھے
سنی جو ڈر کی اُنکی یہ آواز | نکل پایا نہ آمین منہ سے میرے
خدا محفوظ رکھے جب وہ بولے

لیڈی میکبتھ - پریشاں ہوں نہ ان باتوں سے بالکل۔

میکبتھ ۔
تو پھر میں کیوں نہ آمین کہہ سکا تھا   حفاظت کی تو مجھکو بھی ضرورت
اٹک کر رہ گیا آمین گلے میں

لیڈی میکبتھ ۔
نہ ان باتوں کو سوچو اس طرح سے   وگرنہ ہم تو ہو جائینگے پاگل

میکبتھ
یہ سمجھا میں کہ اک آواز آئی   نہیں اچھا ہے سونا اب تو بھائی
کہ میکبتھ نیند کو ہے قتل کرتا   وہ سونا جو کہ ہے بے عیب معصوم
جو الجھن فکر کی ہے دور کرتا   جو دن کی زندگی کی موت بھی ہے
تھکن محنت کی دھو دیتا ہے بالکل   دکھے ذہنوں کو دیتا ہے تسلی
موثر ہے یہ فطرت کی دوا بھی   اسی سے زیست کی نشو و نما ہے

لیڈی میکبتھ ۔
یہ کیا باتیں ہیں بے معنی تمہاری

میکبتھ ۔
یہی کہتا ہے وہ گھر بھر سے اب بھی   مناسب اب نہیں بالکل ہے سونا
گلامس نیند کو ہے قتل کرتا   تو کاڈر اب نہ سو پائیگا بالکل
نہ سو پائے گا اب میکبتھ کبھی بھی

لیڈی میکبتھ ۔
کہو تھی بات یہ جس نے وہ تھا کون؟   معزز تھین میکن بات کیا ہے؟
کہ ہیٹی کرے ہے ہو اپنی قوت   بری باتیں جو ایسی سوچتے ہو
چلو ہاتھوں کو اب پانی سے دھو لو   یہ دھبہ جو کہ شاید جرم کا ہے
یہ کیوں خنجر لئے آئے وہاں سے   اسے کمرے میں رہنا تھا ضروری
تو جاؤ اسکو رکھ آؤ وہیں پر   محافظ ان کے جو واں سو رہے ہیں
بس ان کے منہ پہ بھی کچھ خون مل دو

میکبتھ ۔
نہیں اب تو نہ جاؤنگا وہاں پر   مجھے یہ سوچ کر ہوتی ہے وحشت
کہ میں نے کام جو ایسا کیا ہے   اسے دیکھوں نہیں مجھ میں یہ ہمت

لیڈی میکبتھ ۔
ارادے کے بہت ہی تم ہو کمزور   مجھے دو اسکو رکھ آؤں وہیں پر
کہ سونا اور مردہ بس ہے تصویر   یہ بچپن ہے جو کوئی خوف کھائے
اگر دیکھے کہیں شیطان کی تصویر   اگر کچھ خون ہے ڈنکن کے نکلا
تو پہرے داروں کے منہ پر ملونگی   کہ یہ ہو جرم کی انکی شہادت
(جاتی ہے ۔ اندر سے دستک پیٹنے کی آواز)

میکبتھ ۔
یہ دستک کون دیتا ہے کہاں سے   مجھے کیا ہو گیا ڈرتا ہوں اب میں
کہیں سے کوئی آتی ہے جو آواز   مگر یہ ہاتھ کیسے بڑھ رہے ہیں
نکالیں گے یہ جیسے میری آنکھیں   نہ ہوگا خون میرے ہاتھ سے صاف
سمندر کے بھی پانی سے جو دھوئیں   تو ہو جائے مرے ہاتھوں سے پر خوں
سمندر کا ہرا پانی جو ہو گا   وہ سارا سرخ ہو جائیگا اس سے
(لیڈی میکبتھ پھر داخل ہوتی ہے)

لیڈی میکبتھ
مرے ہاتھوں کی رنگت بھی وہی ہے   مگر دل میرا بودا تو نہیں ہے
(اندر سے دستک کی آواز)
جنوبی در پہ ہے دستک کی آواز   بس اب کمرے میں چلکر سو رہیں ہم
اسے دھو ڈالے گا تھوڑا سا پانی   تو پھر یہ کس قدر آسان تھا کام
تمہارے تو خطا کرتے ہیں اوسان
(اندر سے دستک کی آواز)
سنو وہ پھر ہوئی دستک کی آواز
پہن لو رات کے کپڑے بھی اب تم   کہ ہم موقعہ پہ باہر آئیں جس دم
تو شبہ یہ نہ ہو سوئے نہ تھے ہم   خیالوں میں نہ گم ہو جاؤ ایسے

میکبتھ۔

جو یاد آتا ہے کیسا یہ کیا کام   تو کہتا ہوں کہ خود کو بھول جاتا

(اندر سے دستک کی آواز)

یہ دستک سے ڈنکن کو بیدار کر دو   جو بیدار کرنے کی طاقت ہو تم میں

(جاتے ہیں)

تیسرا منظر۔ وہی جگہ

(ایک دربان داخل ہوتا ہے)

(اندر سے دستک کی آواز)

دربان۔

یقیناً یہ دستک کی آواز ہے   جو دوزخ کا دربان ہوتا کوئی

تو اُسکے لئے بھی یہ آسان تھا   کہ کنجی لگا کر وہ در کھولتا

(اندر سے دستک کی آواز)

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا   قسم تجھکو شیطان کی کون ہے

یہ بیچارہ اک مزارع جسے حرص تھی   کہ غلے کی ہو فصل اچھی بہت

کہ پھانسی لگا لی اس امید میں   پہلے وقت سے آ گئے تم یہاں

گھبرائے ہو کیا بہت رومال   یہاں تم کو کرنا ہے محنت بہت

پسینے سے ہو جائنگے تر بتر

(اندر سے دستک کی آواز)

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا   یہ اب کون آیا ہے شیطان کے نام

یہ وہ ہے کہ کرتا ہے باتیں جو گول   قسم کھائیگا وہ تو دونوں طرف

خدا کو دئے اس نے دھوکے بہت   نہ کی گول باتوں نے لیکن مدد

نہ جنت میں اُس کو جگہ مل سکی   تو آ بات کرتا ہے جو گول مول

(اندر سے دستک کی آواز)

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا   یہ اب کون آیا ہے جلدی بتا

یہ ہے ایک انگریز درزی کہ جو   چراتا ہے ترچھوں سے کپڑا بہت

تو آ چور درزی چلا آ یہاں   تری استری کو بہت آگ ہے

(اندر سے دستک کی آواز)

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا   کبھی چپ نہ ہوگا یہ اب کون ہے؟

یہ ٹھنڈی جگہ ہے نہیں اتنی گرم   جہنم کے قابل جو یہ ہو سکے

رہونگا نہ دوزخ کا دربان اب   یہ سوچا تھا سب کو بلا لونگا میں

ہر اک پیشہ والے کو دیدونگا راہ   سہولت سے جائینگے جہنم میں وہ

(اندر سے دستک کی آواز)

بہت خوب لیکن یہ ہے التجا   فراموش دربان کو کرنا نہیں

(میکڈف اور لیناکس داخل ہوتے ہیں)

میکڈف۔

کیا میرے دوست الٹ سوئے ہیں   کہ ابھی تک ہوئی نہ پوری نیند

دربان۔

ہاں بجا ہے جناب والا یہ   صبح تک ہم شراب پیتے رہے

میکڈف

کیا ترے آقا ہو گئے بیدار؟

(میکبتھ داخل ہوتا ہے)

دربان۔

جاگ اٹھے یہ ہماری دستک سے   لو وہ آتے ہیں ہو سکے اب تیار

لیناکس۔   معزز دوست کو آداب ہے عرض

میکبتھ۔   آپ دونوں کو میرا بھی آداب

میکڈف۔   حضور شاہ اٹھے کیا مرے معزز ہیں؟

میکبتھ۔   جہاں پناہ ابھی خواب سے نہیں اٹھے

میکڈف۔

مجھے تو حکم دیا تھا جگانے کا بر وقت   مگر مجھے نہ رہا کچھ خیال وقت کا بھی

میکبتھ ۔ تو میں جناب کو پہونچاؤں شاہ والا تک

میکڈف ۔
یہ جانتا ہوں کہ زحمت سے آپ خوش ہونگے
مگر یہ پھر بھی ہے زحمت جو آپ کو ہوگی

میکبتھ
جو خوشگوار ہو زحمت وہ خود مسرت ہے
یہ آگیا شہ والا کی خوابگاہ کا در

میکڈف ۔
حضور شاہ کو آواز دونگا میں جاکر
اگرچہ ہے یہ جسارت مگر ہے فرض مرا

(جاتا ہے)

لیناکس ۔ روانگی شہ والا کی آج ہی تو ہے ؟

میکبتھ ۔ ضرور مجھکو دیا ہے حضور نے یہ حکم

لیناکس ۔
بڑی خراب تھی یہ رات ایک طوفاں تھا
کہ چمنیاں مرے گھر کی الٹ گئیں ساری
یہ لوگ کہتے ہیں آواز آئی ماتم کی
فضا میں موت کا اک شور سا ہوا برپا
دپیش بینی تھی کہ اک ہولناک تعطل تھی
مزید ہول ہے اور انتشار آگے بھی
بھی غضب کا برا وقت آنیوالا ہے
پرندہ وہ جو ہے منحوس رات بھر چیخا
سنا ہے ایسا کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں
زمین ہلتی تھی اور زلزلہ سا آیا تھا

میکبتھ ۔ یہ ٹھیک ہے کہ بڑی ہولناک تھی یہ رات

لیناکس ۔ نہ ایسی رات کبھی دیکھی میں نے بچپن سے

(میکڈف پھر داخل ہوتا ہے)

میکڈف ۔
غضب ہوا غضب ہوا
بڑا ہی خوفناک ہے
زبان پر نہ آ سکے
نہ ذہن میں سما سکے

میکبتھ اور لیناکس ۔ یہ کیا ہوا یہ کیا ہوا ؟

میکڈف ۔
خرابیوں کی یہ صورت کبھی نہیں دیکھی
کہ شاہ کے سر اقدس پہ زخم ہے کاری
کہ اس سے روح بھی پرواز کرگئی انکی
قلعہ سے جان جو انکی تھی ہوگئی وہ گم

میکبتھ ۔
یہ کیا کہا جناب نے ؟
یہ کس کی جان کا ہے ذکر

لیناکس ۔ جہاں پناہ کا ہے ذکر کیا ؟

میکڈف ۔
ذرا کمرے میں جاؤ تو
بصارت ہوگی بس غائب
وہ منظر سامنے ہوگا
بنا دے گا تمہیں پتھر
نہ مجھ سے اور کچھ پوچھو
خود اپنی آنکھ سے دیکھو

(میکبتھ اور لیناکس جاتے ہیں)

اٹھو جاگو اٹھو جاگو
بجاؤ خوف کی گھنٹی
یہ قتل اور ایسی غداری
اٹھو بنیکو اٹھو مالکم
خبر لو اٹھ کے ڈونل بین
کرو دور اپنی آنکھوں سے
یہ غفلت موت جیسی ہے
تو اب خود موت کو دیکھو
اٹھو اٹھو ذرا دیکھو
قیامت کا جو منظر ہے
اٹھو مالکم اٹھو بینکو
نکل کر اپنی قبروں سے
اب آؤ روح بن بن کر
یہ منظر ہول کا دیکھو
بجاؤ خوف کی گھنٹی

(گھنٹی بجتی ہے)

(لیڈی میکبتھ داخل ہوتی ہے)

لیڈی میکبتھ ۔
یہ کیا افتاد آئی ہے
بلایا ایسی عجلت سے
بجا کر خوف کی گھنٹی
جگایا نیند سے سب کو
کہو بولو یہ سب کیا ہے ؟

میکڈف ۔
نہیں یہ آپ کے سننے کی ہے بات
معزز نیک دل ہیں آپ خاتون

کہ حرکت دل کی رک جائے نہ کیونکر   جو دوہراؤں خبر وحشت اثر میں

(بینکو داخل ہوتا ہے)

اے بینکو اے بینکو سنو تو   ہمارے شاہ آقا ہو گئے قتل

لیڈی میکبتھ ۔

اسے وائے ہیہات ایسا ستم   ہمارے ہی گھر میں ہو برپا ستم

بینکو

کہیں بھی یہ ہوتا ستم ہے بڑا   مگر ہائے وقت میں کیونکر کہا ہی

کریں آپ تردید اس بات کی   کہیں جو کہا ہے وہ سب ہے غلط

(میکبتھ اور لیناکس پھر داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ ۔

کاش مرتا میں اک گھڑی پہلے   زندگی میری خود سنور جاتی

کیونکہ بعد اس کے رنگیا ہی کیا   ہو گیا زندگی میں ایک خلا

موت کی رہ گئی نہ اصلیت   خاک میں شہرت و عزت ملا

زندگی کا نشہ ہوا سب ختم   آسمان کے تلے رہا سرماں

(مالکم اور ڈونل بین داخل ہوتے ہیں۔)

یہ ہنگامہ کس بات کا ہے بپا

میکبتھ ۔

نہیں تم کو معلوم زندہ ہو تم   جگر کا تمہارے ہوا خون خشک

فنا چشمۂ زندگی ہو گیا   کہ باقی نہیں اس کا سوتا رہا

میکڈف ۔ ہوئے ہیں قتل شاہ نامدار آپکے باپ

مالکم ۔ کیا قتل کس نے ؟

لیناکس ۔

بظاہر یہ ہے پہرے والوں کا کام   کہ چہروں پہ اُنکے بھرا ہے لہو

بھرے خون سے اُنکے خنجر بھی ہیں   جو ویسے ہی تکیوں پہ اُنکے دھرے

وہ وحشت زدہ اور مخبوط تھے   کوئی جان اُن سے سلامت نہیں

میکبتھ ۔

مگر اب مجھے اس کا افسوس ہے   کہ غصے میں میں نے کیا انکو قتل

میکڈف ۔ غضب آپ نے کس لئے یہ کیا ؟

میکبتھ ۔

وہ ہے کون غصہ کی حالت میں جو   رہے معتدل اور معقول بھی

وفادار ہو اور ہلائے نہ ہاتھ   جب آجائے ایسا ہی موقعہ کوئی

مرے سامنے شاہ ڈنکن پڑے   وہ چاندی سا جسم انکا سب لال لال

کھلا تھا وہ خنجر کا اس طرح زخم   کہ داخل ہوں قدرت کی بربادیاں

وہیں اُنکے قاتل بھی موجود تھے   شرارت کی اپنی شہادت لئے

وہ خنجر کہ جس سے لگایا تھا زخم   وہیں پر وہ تھا پاس اُنکے دھرا

تو ایسا کوئی ہے جسے چاہ ہو   اور اظہار کی اسکے قدرت بھی ہو

کہ روکے رہے اپنے جذبات کو   نہ ظاہر ہو ان کی محبت ذرا

لیڈی میکبتھ ۔ سہارے سے لیجائے مجھکو کوئی

میکڈف ۔ خبر لیجئے آپ خاتون کی

مالکم ۔ (الگ ہٹ کر ڈونل بین سے)

ہم اپنی زبان کس لئے بند رکھیں۔ کہ اس کا تعلق ہمیں سے ہے زیادہ

ڈونل بین (الگ ہٹ کر مالکم سے)

یہاں بات کرنے کا موقعہ نہیں   جہاں اپنا مقسوم ہے تاک میں

کہ ہم پر وہ کس وقت حملہ کرے   تو ہو جائیں اب ہم یہاں سے فرار

ابھی اشک آنکھوں میں آئے نہیں   نہ قابو ہے صدمے کی برداشت کا

بینکو ۔ خبر لیجئے آپ خاتون کی

(لیڈی میکبتھ کو لوگ باہر لیجاتے ہیں)

یہ بھیگے سے کپڑے بدل لیں گے جب   نکل آئے سردی سے بچنے کی راہ

تو ہم مل کے باہم کریں مشورہ   کریں غور پھر بیٹھ کر اس پہ ہم

کہ کچھ اور حالات معلوم ہوں   ابھی لرزہ ہے خوف و دہشت کا

خدا ہی کے ہاتھوں میں ہم سب ہیں اب — کروں گا میں تحقیق اس بات کی
غدار و اشرار ہیں کون لوگ — پھر اُن سازشوں سے لڑنا مجھے

میکڈف۔ یہی قصد میرا بھی ہے بالیقیں

سب مل کر۔ سبھی کا ہے اس بات پر اتفاق

میکبتھ۔
پہن لیں ذرا ٹھیک سے ہم لباس — ملیں ہال میں جمع ہو کر کے سب

(مالکم اور ڈونل بین کے علاوہ سب جاتے ہیں)

مالکم۔
تمہارا ارادہ بتاؤ ہے کیسا؟ — ہمیں اُنکی سازش میں ملنا نہیں
جسے غم نہ ہو اور وہ ظاہر کرے — یہ آسان ہے غدار کے واسطے
تو انگلینڈ کی سمت جاتا ہوں میں

ڈونل بین۔
میں آئرلینڈ کی سمت جاؤنگا پھر — جو اک دوسرے سے الگ ہونگے ہم
ہمیں حفاظت رہے گی بہت — یہاں مسکراہٹ میں خنجر چھپے
جسے رشتے میں جتنا قریبی کوئی — وہ اتنا ہی بے رحم و خونخوار ہے

مالکم۔
جو قاتل کی تلوار نکلی ہے یہ — تو زد اُسکی پوری نہیں ہے پڑی
ہماری حفاظت اسی میں ہے اب — کہ ہو جائیں دور اسکی زد سے ابھی
چلو بس ابھی اپنے گھوڑوں کو لیں — نہیں اسکی حاجت کہ رخصت بھی لیں
بس اب جلد ہوں ہم یہاں سے فرار — بہانہ بھی چپکے سے جانے کا ہے
اس گھر میں باقی نہیں اب ذرا — کوئی رحم و رأفت کا رشتہ جو ہو

چوتھا منظر۔ میکبتھ کے قصر کے باہر

(راس اور ایک بوڑھا آدمی داخل ہوتے ہیں)

بوڑھا۔
مجھے یاد ستر برس کی ہے بات — کہ اس دور میں میں نے دیکھی نہیں
جو گھڑیاں ہوں ایسی مہیب و عجب — بھیانک ہے یہ رات کچھ اس طرح
کہ میں نے کبھی ایسی دیکھی نہیں

راس۔
بھلے اچھے ابا یہ ہیں دیکھتے — کہ ہے آسمانوں میں اک اضطراب
وہ خائف ہیں انسان کے اعمال سے — ڈراتے ہیں خونیں زمانہ سے وہ
اگرچہ ہے دن وقت کا یہ ضرور — مگر رات جیسی ہے ظلمت گھری
کہ جس نے چھپایا ہے سورج کو بھی — تو کیا رات دن سے ہے زیادہ قوی
کہ دن چھپ گیا شرم سے شام سے — کہ انسان کی حرکات دیکھے تو وہ
اسی سے زمین پر ہے ظلمت گھری — اگرچہ ضروری ہے اس کا یہ کام
کہ دنیا کو روشن کرے اس طرح — کہ ہر شے میں ہو زندگی کی نمود

بوڑھا۔
یہ جو کام انجام پایا ہے اب — اسی طرح فطرت کے ہے برخلاف
ہوا واقعہ پچھلے منگل کو یہ — ہوا پر عقاب ایک اُڑتا جو تھا
غرور اُس کو تھا اپنی پرواز پر — تو اُلّو نے اُس کا تعاقب کیا
وہی جو کہ چوہوں کو کرتا شکار — عقاب اُس نے مارا یہ کیسا شکار

راس۔
یہ کتنی عجیب اور یقینی ہے بات — کہ ڈنکن کے گھوڑے جو تھے خوشنما
سبک رو بھی تھے تیز رفتار بھی — کہ تھے نسل میں سب سے بہتر یہی
تو وہ ہو گئے ایک دم بے کو اک — اگاڑی پچھاڑی کو توڑ لو ہیں
کسی کے نہ روکے رکے زینہار — وہ بپھرے ہوئے تھے کچھ اس طور سے
کہ جیسے لڑیں گے وہ انسان سے

بوڑھا۔
یہ کہتے ہیں اک دوسرے کو وہ سب — وہیں کھا گئے جیسے چارہ وہ ہوں

راس۔

بجا میں نے دیکھا یہ خود آنکھ سے اگرچہ ہوئی مجھکو حیرت بہت
یہ لو اچھے میکڈف بھی آب آگئے

(میکڈف داخل ہوتا ہے)

زمانہ کدھر جا رہا ہے جناب ؟

میکڈف ۔ تو کیا آپ کو خود نہیں ہے پتہ ؟

راس ۔

ہوا کچھ یہ معلوم کس کا ہے کام یہ خونخوار سے بیشرم حرکت جو کی ؟

میکڈف ۔ وہی کر دیا جن کو میکبتھ نے قتل

راس ۔ برا وقت ہے انکو کیا مل گیا ؟

میکڈف ۔

کرائے کے تھے آدمی وہ ضرور ڈونلبین و مالکم وہ شہزادے بھی
پر اگر جو بھاگے تو شبہ یہ ہے کہ ہوگی انہیں کی یہ حرکت ضرور

راس ۔

یہ اُس سے بھی زیادہ ہے فطرت سے دور حماقت کلی ہے حوصلہ جو کرے
خود اپنے وسیلے کو برباد یوں تو اسکو یقینی یہی بات ہے
کہ میکبتھ کو ملجائے گا تخت و تاج

میکڈف ۔

وہی ہو چکے نامزد اس لئے گئے تاج پوشی کو اسکون وہ

راس ۔ کہاں ہے لاش ڈنکن کی ؟

میکڈف ۔

اُسے کوہکل لے گئے ہیں جہاں سب اجداد اُنکے ہوئے دفن ہیں
وہیں اُنکے جسموں کے ہیں اب مزار

راس ۔ تو کیا آپ جائینگے اسکون کو

میکڈف ۔

نہیں بھائی فائف کو جاؤنگا میں

راس ۔

مگر میں تو اسکون ہی جاؤنگا

میکڈف ۔

وہاں دیکھنا ٹھیک ہے انتظام کہ ایسا نہ ہو یہ ہمارا لباس
نیا یہ پرانے سے بد تر نہ ہو

راس ۔

خدا حافظ اے میرے بابا بڑے

بوڑھا ۔

خدا کا کرم آپ کے ساتھ ہو اور اُن سب پہ جنکی ہو فطرت میں یہ
برائی سے لیں نیکیاں وہ نکال بنائیں جو دشمن کو بھی اپنا دوست

تیسرا ایکٹ

پہلا منظر ۔ فارس کا محل

(بینکو داخل ہوتا ہے)

بینکو ۔

تمہیں تو ملی کل ساری بھلائی گلامس اور کاڈر اور شاہی
بشارت ساحراؤں نے جو دی تھی مگر مجھکو تو شبہ ہے کچھ ایسا
کہ تم نے اسمیں کی ہے کچھ برائی مگر اسکی بھی تو تھی پیش گوئی
تمہاری نسل تو وارث نہ ہوگی میری اولاد میں ہونگے کئی شاہ
سچائی اُنکی باتوں میں اگر تھی تمہارے سر پہ میکبتھ ہیں درخشاں
وہ باتیں جو زباں سے اُنکی نکلیں تو میرے واسطے بھی ہونگی وہ سچ
توقع مجھکو بھی اسکی رہے گی مگر خاموش یہ باتیں نہ ہوں اب

(قرنا بجتا ہے ۔ میکبتھ اور لیڈی میکبتھ بادشاہ و ملکہ کے لباس میں)

(لینکس، راس، امرا و خواتین ہمراہیوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ ۔ معزز مہمان دیکھو یہی ہیں

لیڈی میکبتھ ۔

فراموش انکو ہم کرتے تو دعوت میں خلا رہتا — مناسب بھی کسی صورت نہ تھی یہ بات گر ہوتی

میکبتھ

جناب اس رات کو ہم کر رہے ہیں اک بڑی دعوت — تو میں درخواست کرتا ہوں کہ اسمیں آپ بھی آئیں

بینکو

سر آنکھوں پہ ہے حضرت عالی جو فرمائیں — کہ میرا فرض عالی جاہ سے وابستہ ہے ایسا

ہمیشہ کیلئے جو بند ہو گیا اور ایسا مستحکم — نہ ٹوٹیگا کبھی اسمیں نہ کوئی فرق آئیگا

میکبتھ ۔ سواری کا ہے قصد کیا سہ پہر کو؟؟

بینکو ۔ جہاں پناہ ارادہ ضرور ہے ایسا

میکبتھ ۔

دگرنہ ہمیں مشورہ کچھ تھا کرنا — ہمیشہ رہی آپکی رائے صائب

جو دن بھر کی مجلس میں دی آپ نے — تو اب ملتوی ہوگی وہ کل تلک

مگر آپ جائیں گے کیا دور تک

بینکو ۔

بہت دور جانا نہیں ہے مجھے — بس اتنا کہ آجائے کھانے کا وقت

اگر تیز دوڑے نہ گھوڑے مرے — گھڑی دو گھڑی رات ہو جائیگی

میکبتھ ۔ نہ دعوت ہماری ہو ناغہ کہیں

بینکو ۔ اسے تو نہ ناغہ کرونگا حضور

میکبتھ ۔

سنا ہے ہمارے وہ دونوں عزیز — ہیں انگلینڈ میں اور آئرلینڈ میں

قبولا نہیں باپ کے قتل کو — سناتے ہیں گھڑ گھڑ کے قصے عجیب

تو کل بات اس پر بھی ہو جائیگی — مسائل ریاست کے بھی اور ہیں

ضروری ہے اسمیں مدد آپکی — خدا حافظ اب آپ ہو لیں سوار

خدا حافظ اسوقت تک جبکہ آپ — ضیافت کے موقعہ پہ آجائیں گے

فلی انس بھی آپ کے ساتھ ہیں ؟

بینکو ۔

فلی انس بھی ساتھ ہوگا مرے — اجازت کہ اب دیر ہوگی حضور

میکبتھ ۔

سبک تیز رفتار گھوڑے ہیں سب — سپرد آپ کو انکے کرتا ہوں میں

خدا حافظ اک بار پھر آپکو

(بینکو جاتا ہے)

بس اب اپنا اپنا کریں آپ کام

کہ جبتک نہ گھنٹہ بجے سات کا — ضیافت ہماری ہو تا خوشگوار

رہوں گا میں خلوت میں اسوقت تک — تو اب آپ سب پر خدا کی نظر

(میکبتھ اور ایک خادم کے سوا سب جاتے ہیں)

(خادم سے)

ادھر کو آ مجھے اک بات تجھ سے کہنا ہے — وہ لوگ جنکو بلایا تھا کیا وہ حاضر ہیں؟

خادم ۔ حضور عالی وہ باہر کھڑے ہیں حکم جو ہو

میکبتھ ۔ تو جاؤ انکو بلا لاؤ میرے پاس ابھی

(خادم جاتا ہے)

عروج یہ جو ملا ہے تو بے حقیقت ہے

نہ جب تلک اسے مل جائے کچھ حفاظت بھی — مجھے تو خوف ہے ہر لحظہ ایک بینکو سے

ہے اس کی فطرت شاہانہ اسقدر عالی — کہ اس سے خوف جو آئے تو کیا تعجب ہے

جری بہت ہے وہ جرأت کے ساتھ عاقل بھی — کہ ہوشیاری سے کرتا ہے کام جرأت کا

نہیں ہے کوئی سوا اسکے خوف ہو جسکا — مری جو عقل ہو وہ ہیچ اسکے آگے ہے

کہ جیسے پایا نے قیصر کے انطونی کا تھا — جھڑک دیا تھا وہاں ساحروں کو اس نے

انھوں نے شاہ سے مجھکو کیا مخاطب جب — پھر انکو حکم دیا یہ کہ بات مجھ سے کرو

تو اُسکو بھی یہ سنائی خبر مسرت کی — کہ بادشاہ کئی ہونگے اُسکی نسل سے بھی
تو میرے سر پہ بس اک تاج بے ثمر رکھا — عصا بھی ہاتھ میں اک خشک سے رکھا
کہ چھین کر مرے ہاتھوں سے دوسروں کو ملے — نہ میری نسل میں شاہی کسی کو حاصل ہو
مجھے یہی تو کیا میں نے اپنے دل کو خراب — کہ بینکو کی ہو اولاد اس سے بہرہ مند
انہی کیواسطے اپنے سکون کو کھویا — انھیں کیواسطے ڈنکن کو میں نے قتل کیا
وہ بادشاہ جو رحم و کرم مجسم تھا — اور اپنی روح کو شیطان کے سپرد کیا
کہ وہ بسر و انکو ملے تخت و تاج شاہانہ — جو بادشاہ ہوں بینکو کی نسل سے وہ ہوں
کہ پھر اکھاڑے میں آئے مرا مقدر بھی — کہ زیست و موت کی کُھل جائے آج اک پیکار
یہ کون آیا : جو ہے سامنے وہ آ جائے

(خادم دو قاتلوں کو لے کر پھر داخل ہوتا ہے)

بس اب یہ کمرہ کا دروازہ بند کر دو تم
نکل کے ٹھیرو وہ جب تک کہ میں بلاؤں پھر

(خادم جاتا ہے)

(قاتل سے) تمہیں وہ یاد ہے کل میں نے بات کی تھی جو؟

پہلا قاتل۔ بجا ہے بات ہوئی تھی جہاں پناہ کل

میکبتھ۔

کہا جو میں نے بخوبی اُس پہ کر لیا تم نے — کہ یہ وہی تھا کہ جس نے تمہیں ذلیل کیا
اگرچہ میرا ذرا بھی قصور اس میں نہ تھا — مگر تمہاری نظر میں قصور میرا تھا
تو کل اک بات میں یہ صاف کہہ گیا میں نے — ثبوت اور دلائل سبھی دیے اس کے
فریب تم کو دیا خاک میں ملی امید — بتائی چال بھی اور کارکن جو تھے اسکے
کہ بیوقوف سے بیوقوف جو ہوتا — یہی وہ کہتا کہ بینکو کا کام تھا یہ سب

پہلا قاتل۔ حضور نے یہ صفائی سے کہہ دیا تھا سب

میکبتھ۔

یہ کل کہا تھا اشارہ کیا تھا اور بھی کچھ — تو آج بات اسی کی کروں گا میں تم سے
تمہارے ضبط میں آنا قوی طبیعت میں — کہ ایسی بات پہ بیٹھے رہو گے صبر کئے
تمہیں سکھاتا ہے مذہب کیا یہاں تک بھی — کہ جس نے قبر میں تمکو جھکا کے ہو بھلایا
تمہیں سدا کیلئے کر دیا غریب و ذلیل — تو تم دعائیں دو اسکو بھی اسکو اور انکو

پہلا قاتل۔ جہاں پناہ ہمارا ہے قلب انسان کا

میکبتھ

یہ ٹھیک ہے تمہیں انسان لوگ کہتے ہیں — کہ جیسے کتوں کی قسمیں بہت سی ہیں لیکن
وہ شیر ہوں کہ بلڈ ہانڈ کہ گریہنڈ ہی ہوں — وہ چھوٹے ہوں کہ بڑے تیز رو کہ کاہل ہوں
سبھی وہ نام سے کتے کے ہوتے ہیں مشہور — مگر شناخت تو ہوتی ہے انکی فطرت سے
یہ چھپا دیا ہے جو قدرت کے فیض نے ان میں — اسیطرح کلبۂ انسان کا حال بھی بالکل
تو تم اگر نہیں انسان سب سے نیچے ہو — مرا جو کام ہے دل پر تمہارے نقش کر دو
ملے نجات تمہیں اک طرف تو دشمن سے — تو اس طرف سے مرے دل میں تمہاری الفت ہو
کہ زندگی مری بیمار جیسی ناقص ہے — اور اسکی موت سے ہو جائیگی مکمل وہ

دوسرا قاتل۔

حضور مجھکو لگی ہیں زمانہ کی چوٹیں — دماغ جس سے ہوا اسقدر مرا مختل
کہ اب مجھے نہیں پروا کچھ ذرا اسکی — کہ انتقام زمانہ سے کس طرح لیلوں

پہلا قاتل۔

مجھے بھی اتنا مصائب نے کر دیا بیزار — اور اتنی کھائی ہیں قسمت کی ٹھوکریں میں نے
کہ جو ملے مجھے موقع عزیز ہے مجھکو — کہ اس کی کچھ ہو تلافی وگرنہ جائے جان

میکبتھ۔

تو اب تمہیں دونوں کو ہو گیا معلوم — کہ جو تمہارا ہے دشمن وہی ہے بینکو

دونوں قاتل۔

سمجھ گئے ہیں بخوبی حضور ہم دونوں

میکبتھ۔

تو بس وہ اتنا ہی سنگین میرا دشمن ہے — وجود اسکا ہر اک لحظہ ایک خنجر سی
کہ جیسے صاف کرے قلب پر ہوا اسکی زد — اگرچہ چاہوں تو کام اس کا خود تمام کروں
کہوں کہ بس یہ میری مصلحت تھی اور مرضی — مگر نہیں ہے مناسب مرے لئے یہ کچھ

کہ اسکے حقیقت میں کچھ دشت میں جو میرے بھی   دیا ہے جسے مجھے اسکی دوستی کو بھی
کہ اسکو مار سکے تم بھی خود کر دوں اُسکا   بس اسلئے ہو تمہاری مدد کا خواہاں میں
کہ باپ اسکی ڈھکی اور چھپی رہے بالکل   بہت سا اور بھی سنگین ہیں مصلحت اسمیں

دوسرا قاتل ۔
دیا ہے حکم جو ہم کو حضورِ عالی نے   کریں گے اسکی بجا آوری اگر جان جائے
اگر یہ جان ہماری .....

میکبتھ ۔
تمہاری آنکھوں سے روشن تمہارا جذبہ ہے   تو ایک گھنٹے کے اندر بتا دونگا تمکو
کہاں پہ تاک میں تم چھپ کے منتظر ہو گے   بتا دونگا تمہیں جو ٹھیک وقت اسکا ہو
یہ کام ہونا ہے انجام آج ہی کی رات   مگر محل سے ذرا دور جا کے کرنا ہے
کہ مجھپہ اسکا ذرا بھی نہ ہو سکے شبہ   پھر اسلئے کہ کمی کام میں نہ رہ جائے
پسر وہ اُس کا فلی انس ساتھ ہو اسکے   کہ جس کا خاتمہ میرے لئے ضروری ہے
اہم ہے باپ کے مانند اس کا بھی انجام   تو اپنی اپنی جگہ اس پہ غور کر لو تم
ابھی میں آؤنگا پھر جلد ہی تمہارے پاس

دوسرا قاتل ۔
حضور ہم نے تہیہ کیا ہے اب پختہ

میکبتھ ۔
نہیں اب ٹھہرو ذرا دیر کو تم اندر ہی   میں یہ جلد ہی آکر ملوں گا کام ہے میں
(قاتل جاتے ہیں)
یہ بات طے ہوئی بینکو تمہاری روح اگر   بہشت جائیگی تو آج رات جائیگی

دوسرا منظر ۔ وہی مقام ۔ دوسرا کمرہ

(لیڈی میکبتھ اور ایک خادم داخل ہوتے ہیں)

لیڈی میکبتھ ۔
وہ بینکو گئے کیا وہ دربار سے ؟

خادم ۔
گئے وہ حضور اور آئیں گے رات

لیڈی میکبتھ ۔
حضور شاہ سے بولو جب انکو فرصت ہو   کہ مجھکو اُن سے ضروری ہے بات کچھ کہنی

خادم ۔ بجا حضور کہوں گا میں اُن سے جا کے ابھی

(خادم جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ ۔
نہ حاصل کچھ ہوا سب کچھ ہوا خرچ   جو خواہش کو نہ حاصل ہو فراغت
خوشی مبہم جو ہو تو موت بہتر   جو حاصل دوسروں کو مار کر ہو

(میکبتھ داخل ہوتا ہے)

حضور اب آپکی یہ کیا ہے حالت   کہ خلوت میں الگ رہتے ہیں سب سے
بُرے افکار رہتے ذہن میں ہیں   کہ جن کو ختم ہونا تھا اُسی وقت
ہوا جب ختم وہ پر سوچ جس کا   نہ ہو جس شے کا چارہ سوچنا کیا
کہ جو کچھ ہو گیا بس ہو گیا وہ

میکبتھ ۔
ہوا ہے سانپ زخمی دم ہے باقی   وہ اچھا ہوکے پھر ویسا ہی ہوگا
جو کی ہلکی سی کوشش مارنے کی   تو اسکی اصل قوت سے ہے خطرہ
مگر دنیا یہ سب ہو جائے برباد   جہاں میں ہر طرف ہو جائے ہلچل
یہ دنیا اور وہ دنیا سبھی ختم   ہمارے کھانے اور سوتے سمئے
غذا ہو گر ہماری بیکلی سے   بُرے افکار ہوتے میں ستائیں
تو انکے ساتھ مر جانا ہے بہتر   جنہیں اپنے سکون کے واسطے ہم
ہمیشہ کے لئے ان کو سکوں دیں   دماغی کوفت سے جینا ہی ہے کیا
کہ ہر دم ہو اذیت اور الجھن   ہیں اپنی قبر میں ڈنکن سکون سے
بہت آرام کی ہے نیند اُن کی   الگ ہے زندگی کے خرخشوں سے
جو غداری کو کرنا تھا کیا وہ   مگر انکو دکوئی چھو سکے گا ۔

وہ خنجر ہو عداوت یا کہ ہو زہر فساد اندر کا ہو باہر کا یا کچھ
مزر انکو نہ پہنچے گا کسی سے

لیڈی میکبتھ

ادھر آئیے میرے آقا ذرا کریں دور چہرے سے افکار کو
خوشی اور مسرت سے مہمانوں کو کہیں مرحبا دعوت شب میں آج

میکبتھ ۔

مری پیاری ملکہ کرونگا یہی مگر تم سے بھی التجا ہے مری
کہ بینکو کی خاطر کرو آج خوب نظر سے زباں سے کرو احترام
ابھی ہم کو حاصل نہیں ہے سکون کہ جو ہم کو عزت ملی ہے نئی
خوشامد کے پانی سے دھوئیں وہ سب جو ہیں بد نما داغ اس پہ لگے
بنائے یہ چہرے ہوں دل کے حجاب چھپا وہ لے اسکے اندر جو ہے

لیڈی میکبتھ ۔ بس اب چھوڑ دو یہ پریشاں خیال

میکبتھ

مرے ذہن میں تو ہیں بچھو بھرے مری پیاری ملکہ میں مجبور ہوں
تمہیں تو یہ معلوم ہے خوب ہی فلی انس و بینکو ہیں زندہ ابھی

لیڈی میکبتھ ۔

ہمیشہ تو وہ بھی جئیں گے نہیں

میکبتھ ۔

اسی سے تو ہے ایک گونہ سکون کہ حملے سے محفوظ وہ بھی نہیں
تو ہو جاؤ خوش میری پیاری ذرا کہ جس وقت خفاش گھر سے اڑے
وہ کالی ہیکیٹی اسکے کہنے سے جب وہ بھونرے کی آواز سے جس گھڑی
زمانہ اٹھے آنکھ ملتا ہوا تو اس سے ہی پہلے یہ ہو جائیگا
وہ ایک کام جو ہے بڑا ہولناک اسے تم سنوگی مسرت کے ساتھ

لیڈی میکبتھ ۔

بتاؤ تو وہ کام آخر ہے کیا ؟

میکبتھ ۔

مری پیاری ملکہ نہ اسکو سنو نہ جب تک کہ خود تم سے تعریف
اب آجائے رات اندھاریک چھپالے جو دن کی ترحم
پیچھے ہاتھ اسکے جو خونخوار ہیں کریں پارہ پارہ وہ اس
کہ جس سے ہے چہرے پہ زردی مرے ہوئی روشنی دن کی مدھم
وہ کوا اڑا اسنو جنگل کی سمت بنائے گا اپنا وہاں آشیاں
جو مخلوق دن بھر تھی مصروف کار وہ سر کو جھکائے ہے محو
جو تاریک مخلوق ہے رات کی وہ اب گھات کرتی ہے اپنا
تعجب ہے تمکو مری باتوں پر ابھی تم کرو صبر تھوڑا ذرا
بدی سے جو آغاز ہو کوئی کام تو مضبوط ہوگا برائی سے

تو اب میری پیاری چلو میرے ساتھ

(دونوں جاتے ہیں)

تیسرا منظر۔ محل کے پاس ایک پارک

(تین قاتل داخل ہوتے ہیں)

پہلا قاتل ۔

یہ تو آگیا کس لئے میرے ساتھ

تیسرا قاتل ۔

یہی حکم میکبتھ نے مجھکو دیا

دوسرا قاتل ۔

مناسب نہ تھا ہم یہ شبہ انہیں کہ سونپا تھا ہم کو انھوں نے یہ
جسے دیں گے انجام ہم اسطرح کہ جیسے ملی ہے ہدایت ہمیں

پہلا قاتل ۔

تو آکر کھڑے ہو ہمارے ہی ساتھ ابھی کچھ ہے مغرب کی جانب چمک
یہ دن کی شعاعوں کی ہے اک جھلک مسافر جو پیچھے تھا بڑھتا ہے وہ

کہ بروقت منزل پہ جائے پہنچ — وہ آتا ہے جس کی ہمیں تاک ہے

تیسرا قاتل ۔ سنو میں نے گھوڑوں کی آہٹ سنی

بینکو (اندر سے) سنو تو ذرا روشنی دو مجھے

دوسرا قاتل ۔

یہی ہے کہ باقی جو مدعو ہیں لوگ — محل میں وہ آ جا کے پہونچے ہیں سب

پہلا قاتل ۔ وہ گھوڑوں والے نے لی اُس کے چکر کی راہ

تیسرا قاتل

محل رہ گیا بس اب اک میل دور — عموماً وہ چلتا ہے پیدل یہاں

کہ سب لوگ پھاٹک تلک قصر کے — یہاں سے چلے جاتے ہیں پاؤں پاؤں

(بینکو اور فلی انس ایک مشعل لئے داخل ہوتے ہیں)

دوسرا قاتل ۔ وہ دیکھو وہ دیکھو وہ ہے روشنی

تیسرا قاتل ۔ یہی ہے وہ بیشک

پہلا قاتل ۔ بس اب ہوشیار

بینکو ۔ یہ بارش کے آثار ہیں رات کو

پہلا قاتل ۔ پڑے ہاتھ جلدی

بینکو ۔

ارے دھوکہ! فلی انس بھاگ جلدی سے — تجھے لینا ہے بدلہ بھی! ارے ظالم!

(مر جاتا ہے فلی انس بچ کر بھاگتا ہے)

تیسرا قاتل ۔ یہ کس نے روشنی گل کی ؟

پہلا قاتل مناسب کیا نہ تھا ایسا ؟

تیسرا قاتل

مرا ہے ایک ہی گر کر — پسر بچ کر نکل بھاگا

دوسرا قاتل ۔

جو بہتر کام تھا آدھا — وہی بس رہ گیا باقی

پہلا قاتل ۔

چلو بس اب روانہ ہوں — بتائیں ہو سکا جتنا

(جاتے ہیں)

چوتھا منظر ۔ محل کا ایک ہال

(ضیافت تیار ہے ۔ میکبتھ، لیڈی میکبتھ، راس، لینا کس امرا اور رہبر ابھی داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ ۔

پتہ ہے آپکو ترتیب سب مراتب کی — تو اپنی اپنی جگہ آپ بیٹھ جائیں سب

خوش آمدید میں کہتا ہوں آپکو دل سے — خوشی ہمیں ہی بہت ابتدا سے آخر تک

امرا ۔ جہاں پناہ ہمارا ہو شکریہ مقبول

میکبتھ ۔

برابر آپ کے بیٹھیں گے مل کے ہم سب سے — کریں گے عجز سے انجام میزبانی ہم

جو میزبان ہیں ہماری وہ اُن کو بیٹھیں — خوش آمدید کہیں گی وہ وقت پر سب کو

لیڈی میکبتھ

جناب میری طرف سے بھی سب کو کہہ دیں — یہاں پہ سب کے وہ احباب جو کہ ہیں موجود

خوش آمدید بھی کہے ہے دل سے مرے

(پہلا قاتل دروازے پر نظر آتا ہے)

میکبتھ ۔

یہ دیکھیں آپ کہ سب آپ کا شکریہ کرتے ہیں — تو دونوں سمت کا پلہ ہوا برابر اب

ہم آج آپ ہی کے درمیاں بیٹھیں گے — خوشی منائیں ابھی جوش ہو گا جام صحت

ہر ایک کیلئے جو میز پر ہیں حلقے میں

(دروازے کے پاس جا کر)

تمہارے چہرے پہ دھبے ہیں خون کے سارے

قاتل ۔ تو اے جناب جو ہے خون یہ ہے بینکو کا

میکبتھ ۔

جو بچا نا وہ کہیں اندر تو اس سے بہتر ہے کہ تم یہاں پہ ہو موجود ہاں کے باہر
تو اب بتاؤ کہ وہ قتل بھی ہوا کہ نہیں ؟

قاتل۔ حضور کٹ گیا اُس کا گلا ہوا یہ کام

میکبتھ۔
تمہیں ہو سب گلا کاٹنے کے ماہر مگر وہ جس نے فلی انس کا گلا کاٹا
بہت بھلا اچھا ہو تم نے اگر کیا یہ کام تو پھر نہیں کوئی ہمسر تمہارا دنیا میں

قاتل جہاں پناہ فلی انس بچ کے بھاگ گیا

میکبتھ (الگ ہٹ کر)
تو پھر ہوا مجھے دورہ وگرنہ کامل تھا کہ جیسے سنگ ہو یا ہو چٹان یا ہو پہاڑ
مگر بس اب تو ہوں محدود اور مقید ہوں بندھا ہوا ہوں شکوک اور کٹ سے
مگر وہ بینکو بھی پوری طرح ہوا مقتول ؟

قاتل
حضور عالی پڑا ہوا وہ ایک گڑھے میں کہ بیس زخم شدید اُس کے سر پہ آئے ہیں
ہر ایک زخم جو مہلک تھا اور قاتل تھا

میکبتھ تو پھر بہت ہی تمہارا ہوا ہوں میں ممنون
(الگ ہٹ کر)
بڑا جو سانپ تھا وہ مر چکا مگر بچہ ابھی تو بھاگ گیا ہے مگر بنے گا زہر
ابھی مگر نہیں دانت اُس کے نکلے ہیں بس اب تو جاؤ یہاں سے کہ کل ملاقات
(قاتل جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ۔
جہاں پناہ حضور آپ ہیں محزون وہ محفل ہے ضیافت کہ میزبان جس کا
ذرا بھی مہمان کو وقت کھانے کے تو اس سے اچھا گھر پہ کوئی کھانا کھائے
الگ جو گھر سے ہو لذت اسی میں ہوتی ہے کہ رسم و راہ ضیافت ادا کئے جائیں
بغیر اُس کے نہیں اجتماع میں کچھ لطف

میکبتھ۔
مری حسین ملکہ تم نے خوب جتلایا اب آپ کھائیں مزے سے جو ہضم
اور اس سے آپ کو حاصل ہو پائیدار صحت

لیناکس۔
حضور عالی کرم کر کے ہوں فروکش آپ
(بینکو کا بھوت داخل ہوتا ہے اور میکبتھ کی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے)

میکبتھ۔
جو بینکو کی بھی ذی شان شخصیت ہوتی تو سارے ملک کا اعزاز مجتمع ہوتا
یہاں نہیں ہیں جو وہ تو یہی کہونگا میں اگرچہ حادثہ بھی اُن کو پیش آیا
کہ بے مروتی سے خالی ہے یہ عمل اُن کا

راس۔
حضور وہ جو نہیں آئے اپنے وعدے پر تو ایک داغ ہے اُن پر کہ اُنکا وعدہ تھا
مگر حضور فروکش ہوں سرفراز کریں

میکبتھ جگہ کہاں ہے یہاں تو کوئی فروکش ہے

لیناکس۔ حضور آپ کی خاطر ہے یہ جگہ محفوظ

میکبتھ کہاں کہاں ؟

لیناکس۔
یہاں حضور معلی نشست آپکی ہے مگر حضور ہیں کیوں اس طرح سے گھبرائے

میکبتھ۔ یہ کس نے تم میں سے کی ہے خراب سی حرکت

امرا۔ حضور کونسی حرکت کا یہ اشارہ ہے

میکبتھ۔
مرا یہ فعل نہیں تم تو کہہ نہیں سکتا نہ میرے سامنے لہرا یہ بال خون بھرے

راس۔ اٹھیں سب آپ کہ ذیجاہ ہو گئے بیمار

لیڈی میکبتھ
بیٹھے رہو دوستو حضور ہمیشہ سے ... ہمیشہ سے میرے آقا کا یہی حال ہے ایسا

یہ ایک دورہ ہے جو ختم ہوگا دم بھر میں — پھر اپنے آپ میں آجائینگے وہ آپ سے آپ
جو آپ چھیڑیں گے انکو تو ہونگے وہ نا راض — بڑھیگی اور بھی مدت بھی انکے دورے کی
تو آپ کھائیں ذرا بھی کریں نہ شان کا خیال — عجیب آدمی ہو تم یہ کیا ہوا استاد

میکبتھ -

میں آدمی ہوں بہادر بھی ہوں لگے ہے گو — کہ جس میں آنی ہو جرأت کہ دیکھے ایسی چیز
کہ جس کو دیکھ کے شیطان بھی تو ڈر جائے۔

لیڈی میکبتھ -

فضول بات ہے بس خوف ہے تخیل کا — یہی ہوائی وہ خنجر بھی تم نے دیکھا تھا
دکھا رہا تھا جو ڈنکن کا راستہ تم کو — یہ اسطرح سے بھڑکنا ہے حرکت ایک ناسمجھ
کہانیوں میں بڑی بوڑھیاں جو کہتی ہیں — سنا کے موسم سرما کی شب میں بچوں کو
ذرا تو شرم کرو کیوں بناتے ہو چہرہ — جو ہونا تھا وہ ہوا آپ یہاں نہیں کچھ بھی

میکبتھ -

خدا کے واسطے دیکھو ادھر ادھر دیکھو — یہ دیکھو اب تو کہو یہ وبال ہے کیسا
مجھے ذرا نہیں پروا ترے ہیولے سے — جو سر ہلاتا ہے تو بول کیوں نہیں سکتا
اگر جلانے لگے اسے اور اپنی قبروں سے — نکل کے آنے لگیں دفن جنکو ہم کردیں
ہماری قبر تو چیلوں کے پیٹ میں ہوگی

(بھوت غائب ہو جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ - یہ کیا حمق ہے کہ انسانیت بھی گم کردی

میکبتھ -

اگر یہ سچ ہے کہ زندہ ہوں اور کھڑا ہوں میں — تو یہ بھی سچ ہے کہ میں نے اسی کو دیکھا ہے

لیڈی میکبتھ - تفو تفو تمہیں آتی نہیں ذرا بھی شرم

میکبتھ -

ہوئی ہیں پہلے بھی خونریزیاں زمانہ میں — گزشتہ دور میں قانون جبکہ ایسا تھا
کہ انسانوں نے بنایا ہوا اس کو نرم ذرا — وہ ہولناک بھی ایسی تھیں سن سکیں نہ جنہیں
تماشہ تھا کہ نکلا جو مغز انسان کا — تو مر کے ختم وہ ہوتا نہ کچھ پتہ رہتا

وہ اب تو اٹھ کے چلے آتے ہیں کچھ اس صورت — کہ بیس زخم کھلے انکے سر پہ ہوں موجود
ہمیں نشست سے اپنی اٹھا بھی دیتے ہیں — یہ ایسے قتل سے زیادہ ہے کچھ عجیب ذرا یہ

لیڈی میکبتھ

جہاں پناہ گئے آقا اور گئے سرتاج — یہ دوست آپکے بے آپکے ہیں رنجیدہ

میکبتھ

مجھے یہ بھول گیا اے مرے معزز دوست — نہ اس پہ آپ کریں کچھ ذرا بھی حیرت
یہ کچھ نہیں کہ جو واقف ہیں وہ سمجھتے ہیں — کہ یہ عجیب سی بیماری ہے ایک مگر ورنہ
ہو نوش جام محبت سبکی بہبود و الفت کا — میں جام پیتا ہوں ان سبکا ہو کہ خدا
عزیز بینکو کا بھی کہ جو نہیں موجود — ہر ایک کے لئے کرتا ہوں میں دعائے خیر

امرا -

حضور کے لئے قدا ہیں ہماری سب — وفا شعاری کا ہم جام نوش کرتے ہیں

(بھوت پھر داخل ہوتا ہے)

میکبتھ -

چلا جا بھاگ مرے سامنے سے ہٹ فوراً — کہ قبر ہے تری ہڈی میں اور نہ خون گرم
نہ روشنی ہے ان آنکھوں میں اصل آنکھوں کی

لیڈی میکبتھ

امیر صاحب اعزاز اسکو یہ سمجھو — کہ انکی ایسی ہی عادت ہے اور کچھ بھی نہیں
اگرچہ اس سے ضیافت میں ہوگئی گڑبڑ

میکبتھ -

کسی بشر میں جو ہمت وہ ہو مجھ میں بھی — جو ایسا آئے کوئی جیسے روس کا بگھیلا
کہ سینگ والا وہ ارنا ہو یا کہ برکن شیر — کوئی بھی شکل کرے اختیار اس کے سوا
ذرا بھی رعشہ نہ اعضا میں مرے ہوگا — وہ یا کہ پھر سے ہو زندہ مقابلہ پر آئے
کرے مقابلہ جنگل میں لیکے وہ تلوار — ذرا مجھے جو ہو لغزش تو میرا نام نہیں
مجھے کہیں کسی لڑکی کا ایک بچہ ہوں — یہاں سے بھاگ تو اے خوفناک سایہ
خیال کا ہے ہیولی یہاں سے دور ہو اب

(بھوت غائب ہو جاتا ہے)
چلا گیا وہ تو وہ پھر میرا خوف ختم ہوا

سکون سے بیٹھے اب آپ میہماں میرے

لیڈی میکبتھ ۔
عجیب تم نے یہ ہنگامہ کر دیا برپا   کہ لطف خاک میں سارا ملا ضیافت کا

میکبتھ ۔
کہیں زمانہ میں ہوتی ہیں ایسی بھی چیزیں   جو گرمیوں میں چلی آئیں ابر کی صورت
اور اس سے ہمکو تعجب ہو ذرا سا بھی   مجھے بناتے ہو تم اس سرشت سے بالکل الگ
کہ جیسی مجھکو ملی ہے نظام فطرت سے   جو سوچتا ہوں کہ تم دیکھ لیتے منظر کو
اور اسپہ چہرے کی سرخی میں کمی نہ آئے کبھی   اگرچہ خوف سے چہرہ مرا ہوا ہے زرد

راس ۔ وہ کس طرح کا ہے منظر حضور عالی جاہ ؟

لیڈی میکبتھ
یہ التجا ہے مری آپ کچھ کہیں نہ انہیں   سوال کرنے سے آتا ہے اور بھی غصہ
سلام کرتی ہوں میں تاپ سب کو اے حضرات   سلام کریں کہ بس اب آپ چلے جائیں
نہ آگے پیچھے کی ترتیب کا خیال کریں   بس آپ جلد ہی رخصت یہاں سے ہو جائیں

لینا کس ۔
سلام کہتے ہیں ہم شب بخیر کہہ کے حضور   بہت ہی جلد شفا پائیں اس علالت سے

لیڈی میکبتھ ۔ سلام شوق ہماری طرف سے بھی سب کو

(میکبتھ اور لیڈی میکبتھ کے علاوہ سب جاتے ہیں)

میکبتھ ۔
یہ خون خون کا طالب ہے خون لیگا ضرور   سنا ہے سنگ بھی ہٹ کر نکال دیتا ہے
جو اس کے نیچے کوئی لاش دفن ہوتی ہے   درخت سنتے ہیں قاتل کو کہتے ہیں معتوب
جو فال لیتے ہیں کیڑوں سے اور کووں سے   چھپا کے خون کرے کوئی وہ بھی کھل جائے
مگر یہ رات کا ہے وقت کیا بتاؤ تو   قریب ختم کے ہے رات صبح ہونے کو ہے   پتہ نہیں کہ یہ ہے صبح یا کہ رات

لیڈی میکبتھ ۔

میکبتھ ۔
خیال کیا ہے تمہارا کہ آج میکڈف بھی   ہمارے حکم پہ حاضر نہیں ہوا

لیڈی میکبتھ ۔ جناب آپ نے انکو طلب کیا تھا کیا ؟

میکبتھ
سنا تھا اور کسی سے مگر بلاؤں گا   ہر اک امیر کے گھر پر ہے اک مرا
جسے میں دیتا ہوں تنخواہ اور ملازم ہے   ذرا میں جاؤں گا اٹھ کر سویرے ہی
جو ساحرائیں ہیں ان سے ملونگا میں جاکر   کہ اور حال بھی بتلائیں کچھ وہ آئندہ
مرا یہ قصد مصمم ہے جیسے ہو ممکن   برا ہو یا کہ بھلا حال سب کرو دریافت
کہ اپنے مفاد میں حائل جو ہو وہ ہٹ جائے   بڑھا ہوں اتنا جرائم میں قتل و غارت
کہ پیچھے ہٹنا ہے دشوار جیسے بڑھنا ہے   عجیب ہیں خیالات ذہن میں میرے
کہ ان پہ غور سے پہلے عمل ہی کرنا ہے

لیڈی میکبتھ ۔
ہیں آپ نیند سے محروم جو ضروری ہے   کہ زندگی کی بقا منحصر اسی پہ ہے

میکبتھ
چلو تو کمرے میں جاکے ہم کریں آرام   مرے عجیب خیالات وہم کے جو ہیں
جو ہمکو خوف دلاتے ہیں اور علامت بھی   تو انمیں اور تجربے سے پختگی ہوگی
ابھی تو جرم میں بس ابتدا ہماری ہے

پانچواں منظر ۔ ایک جنگل

(گرج ۔ تین ساحرائیں داخل ہوتی ہیں اور ہیکیٹی سے ملتی ہیں)

پہلی ساحرہ ۔ یہ بات کیا ہے ہیکیٹی کہ تم خفا سی ہو

ہیکیٹی ۔
نہ کیوں خفا ہوں کہ بڑھیا چڑیلیں ہو تم لوگ   اور اسپہ شوخ بھی گستاخ بھی بہت زیادہ
یہ میکبتھ سے کیا تم نے کس طرح سودا   معاملات جو ہیں اسکی زندگی کے لئے

تمہارے سحر کی استاد ہوں اگر چہ میں   ہنر دکھا بھی چکے میرے ہاتھ کے وہ کرتب ہیں
مگر مجھے نہ خبر کی کہ اسمیں لوں حصہ   تمہیں دکھاتی کہ میرے ہنر کی شان ہے کیا
پھر اس پہ یہ کہ کیا تم نے کام بھی جتنا   وہ ایک ضدی سے انسان کے لئے سب تھا
جو کینہ جو بھی ہے غصہ دماغ میں ہے بھرا   محبت اس کی ہے اپنی غرض سے تم سے وفا
مگر اب اسکی تلافی کرو چلو یاں سے   صبح کو مجھ سے ملو غار میں ایکرن کے
تمہارے پاس وہ آئے گا تم سے پوچھیگا   کہ آگے اس کے مقدر میں کیا ہے کیا
کڑاہ بھی سب تمہارا وہاں پہ اور وہ سب   جو لازمی ہے کہ منتر کا سحر ہو گا جب
میں آسمان کی طرف جاتی ہوں سہارے سے   کہ رات خوف و ہلاکت کے کام میں گذرے
کہ دوپہر سے ادھر اک مہیب کام بھی ہے   لٹک رہا ہے جو اک قطرہ چاند کے نیچے
غبار سا ہے اگرچہ اُسے میں پکڑونگی   زمین پہ اُسکے گرنے نہ میں کبھی دوں گی
پھر اس کو سحر کی اشیا میں جوش دوں گی جب   بنی ہوئی سی وہ روحیں اٹھیں گی اس سے
تو وہ دکھائیں گی اپنی فریب کی قوت   تو میکبتھ کو دکھا دیں گی آخری علت
نہ موت سے وہ ڈرے گا نہ اپنی قسمت سے   بلند سمجھے گا خواہش کو عقل و عزت سے
تمہیں ہے علم کہ ہو اعتماد اگر جھوٹا   تو آدمی کا وہ دشمن بہت بڑا ہو گا

(اندر سے موسیقی اور گیت کی آواز اور آجاؤ آجاؤ وغیرہ وغیرہ کی آوازیں)

وہ دیکھو میرا بلاوا ہے میری چھوٹی سی روح   چھپی غبار کے بادل میں بیٹھی ہے موجود

پہلی ساحرہ ۔

اب آؤ جلد روانہ یہاں سے ہو جائیں   کہ جلد ہی وہ ابھی آئیگی یہاں واپس

چھٹا منظر ۔ فارس کا محل

(لینا کس اور ایک امیر داخل ہوتے ہیں)

لینا کس ۔

جو میں نے آپ کی تھی وہ گفتگو پہلے   وہ آپ کے کچھ خیالات سے ملتی جلتی ہوئی
نکال سکتے ہیں اب آپ اس سے مطلب اور   یہی کہوں گا کہ حالات کا عجب رخ ہے
وہ مہربان جو ڈنکن تھا اسکے مرنے پہ   کیا تھا غم کا بھی اظہار میکبتھ نے

تو وہ تو مر گئے جنکو جو خود بہادر تھا   اُسے جو ہو گئی آنے میں کچھ ذرا سی دیر
تو آپ چاہیں کہیں یہ کہ اسکو قتل کیا   فلی انس اس کے پسر نے جو ہو گیا مفرور
جو جائے سیر کو کوئی تو دیر وہ نہ کرے   یہ بات کتنی ہے فطرت کے عقل کے بھی خلاف
کہ مالکم و ڈونل بیں اپنے ہاتھوں سے   جو مہربان تھا اک باپ قتل کر دیں اُسے
ذلیل و قابل نفرت یہ بات ہے کتنی   بہت ہی غم کا تو میکبتھ نے تھا کیا اظہار
کہ ایک غصے میں وہ ملزموں کو مار دیا   نشہ میں جو تھے بہت نیند اُن پہ طاری تھی
یہ کام تھا نہ بہت ہی بڑی شرافت کا ؟   دیا نہیں اسکو سر انجام ہوشیاری سے
کہ اس پہ آتا ہر اک شخص کو بڑا غصہ   انھوں نے قتل سے انکار جو کیا ہوتا
تو میرا کہنا ہے حضرت کہ یہ ہوا سب ٹھیک   کہے یہ کون کہ اسمیں نہیں شرافت تھی
مرا خیال تو یہ ہے کہ ڈنکن کے   جو اس کے ہاتھ میں آئے خدا کرے یہ نہ ہو
پدر کے قتل کا ہوتا انہیں مزہ معلوم   اسی طرح ہے فلی انس کا بھی ہوتا حال
مگر سنو کہ جو میکڈف نے سخت لفظ کہے   وہ آیا بھی نہیں ظالم کی اس ضیافت میں
تو شاہ اس سے خفا ہیں مگر کہاں ہے وہ ؟

امیر ۔

پسر جو شاہ کے تھے تخت و تاج کے مالک   تو انکے حق کو جو ظالم نے کر لیا ہے غصب
تو وہ چلے گئے انگریز شاہ کے دربار   بڑے تپاک سے خاطر وہاں ہوئی انکی
نہ ان کی شومی قسمت سے کم ہوئی عزت   تو میکڈف بھی گئے ہیں اُسی ارادے سے
کہ نیک شاہ سے امداد کی کریں خواہش   امیر نار تھمبرلین کو وہ بھیجیں یہاں
سیوارڈ جو کہ شجاعت میں نام ہیں بہت   کہ انکی فوجوں کی تعداد اور خدا کا کرم
ملے سکون سے کھانا بھی ہمکو اور سونا   نہ کھانے اور ضیافت میں ڈر رہے خنجر کا
وفا شعاری دکھائیں بہر طرح اعزاز   جو صاف ہو کہ ہم اسکے لئے ترستے ہیں
تو اس خبر نے کیا شاہ کو خفا اتنا   کہ جنگ کیلئے تیار ہو رہے ہیں وہ

لینا کس ۔ تو کیا بلایا تھا میکڈف کو بھی ضیافت میں

امیر ۔

بلایا تو مگر انکار صاف انھوں نے کیا   کہا کہ میں تو نہیں آؤنگا یہ اب مت

پیامبر نے بنایا کچھ اس طرح چہرہ اور اس پہ بھی میکڈف پھر لیے
کہ جیسے کہتا ہو افسوس تمکو ہوگا بہت جواب ایسا جو گستاخ تمنے مجھکو دیا
لینا کس۔

تو اس کے بعد انھیں ہوشیار رہنا ہے وہ دور رہیں جسقدر کہ ممکن ہو
کوئی فرشتہ بھی اڑ کر وہاں پہونچ جائے کہ دیا جائے وہ انگریز شاہ کا پیغام
وہ میکڈف بھی پہلے وہاں پہونچ جائے ہمارے ملک کو حاصل فراغ جلدی ہو
جو ایک لئیم کے ہاتھوں میں ہے اذیت سے

امیر۔ تو اسکے ساتھ مری بھی دعائیں جائینگی

چوتھا ایکٹ

پہلا منظر۔ ایک غار۔ بیچ میں ایک ابلتا ہوا کڑاہ

(گرج۔ ساحرائیں داخل ہوتی ہیں)

پہلی ساحرا۔ چتلی بلی نے میاؤں کی ہیں تین
دوسری ساحرا۔ چار آوازیں خارپشت نے دیں
تیسری ساحرا۔ ہارپیر بولی وقت وقت ہے اب
پہلی ساحرا۔ گرد گھومو کڑاہ کے اب سب
زہر سے جانور مرا جو ہو
اس کی آنتیں کڑاہ میں ڈالو
سرد پتھر کے نیچے مینڈھک کے
ایسے اکتیس رات دن گذرے
کہ پسینے سے زہر رستا رہا
اور سوتے میں اسکو جا پکڑا
سحر کے اس کڑاہ میں ڈالو
جوش پھر سب کو خوب اسمیں دو

سب ملکر۔
دوہرے دوہرے دکھ کی مشقت میکبتھ کو دینا ہے مصیبت
آگ کے شعلے اٹھیں دھڑ دھڑ جوش کڑاہ میں آئے بھڑ بھڑ

دوسری ساحرہ۔
دلدل میں جو سانپ ہے رہتا اس کا حصہ کاٹ کے تھوڑا
جوش کڑاہ میں دیدو اس کو گرگٹ کی اک آنکھ بھی ڈالو
مینڈھک کی ایک انگلی بھی چمگادڑ کے بال کی روئی
کتے کی بس والی زبان سانپ کی چمٹے جیسی زبان
ڈنک بھی اندھے کیڑے کا پیر بھی گرگٹ کا لینا
پر بھی لینا الو کے سحر بنے دکھ بڑا جو دے
گاڑھا حلوا بن جائے اتنا جوش اسمیں آئے

سب مل کر۔
دوہرے دوہرے دکھ کی مشقت میکبتھ کو دینا ہے مصیبت
آگ کے شعلے اٹھیں دھڑ دھڑ جوش کڑاہ میں آئے بھڑ بھڑ

دوسری ساحرا۔
ٹھنڈا خون سے بندر کے ہو پکا اور اچھا ہو جادو

(ہیکیٹی داخل ہو کر تینوں ساحراؤں سے ملتی ہے)

ہیکیٹی۔
بہت خوب مجھکو پسند آگیا ہر اک کو ملے گا نفع میں سے حصہ
تو گاؤ لگا کر کڑاہی کا چکر وہ بونوں کا پریوں کا حلقہ بنا کر
کہو ڈال جو تمنے پڑھو اس پہ منتر

(گانا اور گیت "کالی روحیں" وغیرہ ہیکیٹی جاتی ہے)

دوسری ساحرہ۔
انگوٹھے میں میرے اٹھی ایک ٹیس ادھر سے کوئی آرہی بدی

(دستک)

کھولو تالا کیسی ہے دستک

(میکبتھ داخل ہوتا ہے)

میکبتھ۔

کہو اے ساحرہ کالی چڑیلیں آدھی راتوں کی

یہ کیا تم کرتی ہو آخر؟

سب ساحرائیں۔ وہ کام نہیں ہے نام جس کا

میکبتھ۔

قسم دیتا ہوں میں اُس کی تمہارا دیوتا جو ہے

یہ تم نے کس طرح جانا مجھے اب دو جواب اسکا

اگر تم آندھیاں لاؤ جو گرجا سے لڑیں جاکر

اگرچہ جھاگ کی لہریں جہازوں کو نگل جائیں

الٹ دیں کشتیوں کو بھی گریں بالیں بھی غلے کی

اُکھڑ جائیں شجر جڑ سے سروں پر پہرہ داروں کے

قلعے بھی گر پڑیں آکر وہ اہرام اور محل بھی سب

جھکیں بنیاد پر اپنی وہ جو ٹوٹے کبھی فطرت کے

جو ہستی کے سہارے ہیں تباہی سب پہ آجائے

کہ تھک جائے تباہی بھی کہ جو کچھ پوچھتا ہوں میں

جواب اس کا مجھے دیدو

پہلی ساحرہ۔ کہو

دوسری ساحرہ۔ پوچھو

تیسری ساحرہ۔ تو دیں گے ہم جواب اُس کا

پہلی ساحرہ۔

مگر ہم سے سنو گے کیا؟ کہ آقاؤں سے ہم سب کے

میکبتھ۔ بلاؤ اپنے آقا کو کہ دیکھوں وہ بھی ہیں کیسے

پہلی ساحرہ۔

سورنی کا لہو ڈالو جو نو حبول اپنے کھا گئے ہوں

وہ چکنائی جو نکلی ہو کسی قاتل کی سولی سے

پسینے میں جو ٹپکی ہو انھیں شعلوں میں سب ڈالو

سب مل کر۔

اعلے آؤ ادنےٰ آؤ عہدہ اپنا اپنا دکھاؤ

(گرج پہلی روح۔ ایک مسلح سر)

میکبتھ۔

کون ہو تم انجانی قوت؟

پہلی ساحرہ

تمہارا خیال اسکو معلوم ہے سنو اُسکی بات اور نہ بولو ذرا

پہلی روح۔

میکبتھ میکبتھ میکبتھ سن ہوشیار رہ میکڈف سے

تھین سے فائف کے ہشیار بس رخصت یہ کافی ہے

(نیچے چلی جاتی ہے)

میکبتھ۔

تو جو کبھی ہو اس خوبی تنبیہ کا میں ممنون ہوں بالکل ہے مجھے خوف اسی کا

لیکن مجھے اک بات ذرا اور بھی بتلا

پہلی ساحرہ۔

حکم اسکو نہ دو لو یہ اب ایک اٹھ آیا پہلے سے زیادہ جو قوی اور جری ہے

(دوسری روح اور ایک خون آلود لڑکا)

دوسری روح۔۔ میکبتھ میکبتھ میکبتھ سن

میکبتھ۔

کان میرے جو تین بھی ہوتے بات تیری ضرور سن لیتا

دوسری روح۔

خونخوار جری، دل کا قوی بن انساں کی قوت سے نہ کر خوف ذرا بھی

عورت سے جو پیدا ہوا انسان ہو کوئی   پہونچا نہ سکے گا وہ ضرر کوئی بھی مجھکو

میکبتھ ۔

پھر مجھے دنیا سے میکڈف کی   خوف کچھ بھی نہیں رہا باقی
ہاں مگر اور پختگی کے لئے   اپنے مقسوم کی ضمانت کو
تجھکو زندہ نہ رہنے دونگا میں   خوف بیجا سے کہدوں یہ ہے غلط
نیند آرام کی گرجنے میں بھی ہو

(تیسری روح ۔ ایک تاج پوش لڑکا جس کے ہاتھ میں ایک درخت ہے)

یہ کیا ہے جو ابھرا ہے وارث کی طرح   کہ بچوں کا سر اور اسپر ہے تاج
علامت ہے فرمانروائی کی جو ایک

سب مل کر۔ سنو اور بولو نہیں تم ذرا

تیسری روح ۔

شیر دل بن کے سر کو اونچا رکھ   شور و غوغا سے سازشوں سے نہ ڈر
میکبتھ کو نہ ہوگی ہار کبھی   آئے جبتک نہ ڈنسینان تلک
وہ جو برنام کا ہے جنگل ایک   اور کرے وہ مقابلہ اس کا

میکبتھ ۔

یہ تو ممکن نہیں قیامت تک   کس کا اتنا اثر ہے جنگل پر
کہ زمیں میں گڑی درخت کی جڑ   اکھڑ آئے یہاں تلک پہونچے
پیش گوئی بہت ہی خوش کن ہے   جا ہے اٹھیں بغاوتیں کتنی
وہ جو برنام کا ہے اک جنگل   آنہ جائے اکھڑ کے وہاں تک
بے خطر زندگی ہے میکبتھ کی   قدرتی طور سے مرے گا وہ
جیسا دستور ہے زمانے میں   مگر اپنے ہنر سے بتلاؤ
کیا کبھی خاندان بینکو کا   حکمراں اس زمیں پر ہو گا؟

سب مل کر ۔

اور کوئی سوال اب نہ کرو

میکبتھ ۔

تم کو کرنا ہے مطمئن مجھکو   ورنہ تم پر ہمیشہ لعنت ہو
مجھکو بتلاؤ بات کیا ہے وہ   ڈوبتا جاتا ہے کڑاہ یہ کیوں
اور یہ شور کس طرح کا ہے؟
(نفیری کی آواز)

پہلی ساحرہ ۔ دکھاؤ ۔
دوسری ساحرہ ۔ دکھاؤ ۔
تیسری ساحرہ ۔ دکھاؤ
سب مل کر ۔

دکھاؤ اس کی آنکھوں کو   کرو مغموم دل اس کا
اب آؤ مثل سایوں کے   اسی صورت چلے جاؤ

(آٹھ بادشاہوں کی روحیں ۔ آخری کے ہاتھ میں ایک شیشہ ہے)

(پیچھے بینکو کی روح ہے)

میکبتھ

تری صورت ہے بینکو کی   اتر کر غرق ہو تجھے
جو لگا تاج ہے سر پہ   تو میری آنکھ جلتی ہے
ارے یہ بال تیرے ہیں   مگر یہ شاہ ہے دیگر
کہ سر پہ تاج زریں ہو   یہ آیا تیسرا ویسا
یہ گندے شاہ ہیں بالکل   مجھے یہ کیوں دکھاتی ہو
یہ جو نتھا آگیا اب تو   مری آنکھیں جلی جاتی ہیں
یہ آخر سلسلہ کیا ہے   قیامت تک چلے گا کیا؟
یہ پھر اک اور اب آیا   ارے یہ ساتواں ابھرا
بس اب آگے نہ دیکھونگا   مگر یہ آٹھواں آیا
لئے ہے ہاتھ میں شیشہ   نظر آتے ہیں اور اس میں

کسی کے ہاتھ دو گیندیں   لئے تیسرا عصا بھی ہے
بڑا پُر ہول ہے منظر   نظر آتا ہے اب یہ سچ
کہ جیسے بینکو بھی ہنسے   اگرچہ خون سے تر ہے
مگر مجھ پر ہے خندہ زن   اشارہ کر رہا ہے یہ
کہ یہ اولاد ہیں اُسکی   یہ کیا ایسا ہی ہو سکتا؟

(روحیں غائب ہو جاتی ہیں۔

پہلی ساحرہ ۔

یہ سب سچ ہے حضورِ اعلیٰ   مگر میکبتھ ہے کیوں ششدر
چلو بہنو کریں اب خوش   اور اس کا جوش بھڑکائیں
خوشی بھرپور ظاہر ہو   ہوا پہ سحر کر دوں گی
کہ اُس سے راگ ہو پیدا   بس اب حلقے سے ناچو تم
کہ یہ ہے شاہ باعظمت   کہے یہ مہرباں ہو کر
ہوا یہ فرض بھی پورا   خوشی سے خیر مقدم کا

(گانا۔ ساحرائیں ناچتی ہیں اور پھر
غائب ہو جاتی ہیں)

میکبتھ

کہاں یہ سب ہوئیں غائب   یہ دن اس سال کا بدتر
ہمیشہ اُس پہ لعنت ہو   مگر یہ کون ہے باہر
چلا آئے جو ہو اندر

(لیناکس داخل ہوتا ہے)

لیناکس ۔ حضورِ عالی کا حکم کیا ہے؟
میکبتھ ۔ یہ ساحراؤں کو تم نے دیکھا؟
لیناکس ۔ نہیں مجھے تو نظر نہ آئیں
میکبتھ ۔ وہ پاس گذریں نہیں تمہارے؟
لیناکس ۔ نہیں ادھر تو نہیں وہ آئیں

میکبتھ ۔
ہوا جس پہ اُڑتی ہیں لعنت ہو اُس پر   جو مانے انھیں وہ بھی ملعون ہو
سنی میں نے کچھ چاپ گھوڑوں کی ابھی   ادھر سے جو گذرا وہ تھا شخص کون؟

لیناکس ۔
یہ دو تین ہیں جو خبر لائے   کہ میکڈف گیا بھاگ انگلینڈ کو

میکبتھ ۔ گیا بھاگ انگلینڈ کو کیا کہا؟
لیناکس   حقیقت یہی ہے مرے محترم
میکبتھ (الگ ہٹ کر)

بہت تیز مجھ سے ہے رفتارِ وقت   کہ میں کر سکا ظلم کا وہ نہ کام
کہ جب تک کہ فوراً عمل ہم کریں   ضروری وہ لمحہ گذر جائے گا
تو اب دل میں پہلی جو بات آئیگی   عمل اُس پہ اول ہی ہوگا ضرور
اب اسوقت جو ہے ارادہ مرا   اسی وقت اُس پر کروں گا عمل
اچانک پہونچ قصر میکڈف پہ میں   کروں گا میں قائم یہ قبضہ وہیں
تو بیوی کو بچوں کو اور سب کو بھی   ذرا نسل کا جس سے ہو سلسلہ
کروں گا تہ تیغ سب کو وہیں   حماقت کا غرہ نہیں یہ ذرا
ارادے میں نرمی نہ آپائیگی   کہ ہوجائیگی اُس کی تعمیل بھی
بس اب اور روحیں دیکھوں گا میں   کہاں ہیں جو لے کر پیام آئے ہیں؟
مجھے لے چلو جلد اب اُنکے پاس

دوسرا منظر ۔ فائف ۔ میکڈف کا قصر

(لیڈی میکڈف، اُس کا لڑکا اور راس داخل ہوتے ہیں)

لیڈی میکڈف ۔
انھوں نے کیا کام وہ کون سا   بدر ملک سے اُنکو ہونا پڑا
راس ۔ ذرا صبر سے کام لیں اے جناب
لیڈی میکڈف۔

اُنھیں تو ذرا صبر آیا نہیں فرار اُن کا تھا ایک پاگل بنا
اگرچہ بغاوت عمل کی نہ ہو بتانے گا خوف اُن کو باغی ضرور

راس۔
نہیں آپ کو علم اس کا مگر کہ یہ ہوشیاری تھی یا خوف تھا

لیڈی میکڈف۔
یہ کیا عقل ہے بیوی بچے مکان زمین اور اعزاز سب چھوڑ کر
چلے جائیں ہر اک سے منہ موڑ کر ہماری محبت جنہیں ہے مگر
کمی دل میں اُنکے ہے اس کی ضرور کہ چڑیا بھی چھوٹی سی ہوتی ہے جو
بچاتی ہے اُلو سے بچوں کو وہ نشیمن کی کرتی ہے وہ دیکھ بھال
یہ سب خوف ہے کچھ محبت نہیں فراری تو کچھ عقلمندی نہیں
ہر اک عقل کے ضابطے کے خلاف

راس۔
مری سب سے پیاری عزیزہ سنو کہ دل اپنا قابو میں رکھو ذرا
تمہارے جو ہیں شوہر نامدار شریف اور عاقل ہیں ہوشیار ہیں
سمجھتے ہیں موقعہ کی جو بات وہ مگر وقت ہے آجکل کا بُرا
کہ غدار ہم ہو گئے ہیں سبھی اگرچہ ہمیں علم اس کا نہیں
ہر افواہ سنتے ہیں ہم خوف کی پتہ یہ نہیں خوف کا ہے کا ہے
ہر اک سمت ہے شک کا سمندر محیط جھکولے تلاطم میں کھاتے ہیں ہم
اجازت مجھے آپ جانے کی دیں بہت جلد آؤنگا میں پھر یہاں
یہ منحوس دن ختم ہوں گے ضرور وگرنہ یہ اوپر چلے جائیں گے
وہی وقت پہلے کا آجائے گا خوشی اور مسرت کے جیسے تھے دن
خدا آپ پر مہربانی کرے مری خوبصورت عزیزہ بہن

لیڈی میکڈف۔
اگرچہ ہے باپ اسکے زندہ ابھی مگر ہو گیا ہے یہ بے باپ کا

راس۔
یہاں اور ٹھہرا تو اچھا نہیں حماقت کروں گا جو ایسا کیا
کہ اسمیں مری ہوگی تو لت بہت مصیبت بھی بڑھ جائیگی آپکی
بس اب جاؤنگا میں یہاں سے ابھی خدا ناصر و مہربان آپ کا
(جاتا ہے)

لیڈی میکڈف۔
ترا باپ تو مر گیا اے پسر تو تیری گذر ہوگی اب کسطرح

لڑکا۔ رہوں گا میں چڑیوں کی مانند ماں

لیڈی میکڈف۔ تو کیڑے مکوڑوں پہ ہوگی بسر

لڑکا۔
مرا یہ ہے مطلب ملیگا جو کچھ کہ چڑیاں گذر کرتی ہیں جسطرح

لیڈی میکڈف۔
مری پیاری چڑیا ڈرے گا نہیں نہ لاسے سے یا جال سے خار سے

لڑکا۔
ڈروں کیوں شکاری تو کوئی نہیں کرے جو کہ ننھی سی چڑیاں شکار
مگر باپ میرے مرے تو نہیں کہیں آپ جو کچھ نہیں مانتا

لیڈی میکڈف
یہ سچ ہے ترا باپ تو مر گیا کہاں سے ملے گا تجھے باپ اب

لڑکا۔ تو شوہر ملے گا کہاں آپ کو ؟

لیڈی میکڈف۔
مجھے بیس شوہر بھی مل جائیں گے کہیں جا کے بازار سے لاؤنگی

لڑکا۔ تو بیچیں گی بھی آپ لے کر انھیں

لیڈی میکڈف۔
بہت سوجھ کی بات کرتا ہے تو سمجھ ہے تری عمر سے بھی سوا

لڑکا۔ مرے باپ غدار تھے کیا ممی ؟
بلاشک ترا باپ غدار تھا

لڑکا۔ کیسے لوگ کہتے ہیں غدار ماں ؟

لیڈی میکڈف۔ قسم کھائے جو اور جھوٹا بھی ہو

لڑکا۔

تو جھوٹا ہو جو اور قسم کھائے وہ وہی شخص غدار کہلائیگا

لیڈی میکڈف۔

ہر اک وہ جو ایسا ہو غدار ہے چڑھائیں گے سولی پہ اس کو ضرور

لڑکا۔

تو وہ جو قسم کھائیں جھوٹے بھی ہوں سبھی کو چڑھائیں گے سولی پہ لوگ

لیڈی میکڈف۔ سبھی سولی پائیں گے ایسے جو ہیں

لڑکا۔ تو سولی پہ انکو چڑھائیگا کون

لیڈی میکڈف۔ وہی لوگ جو ہوں گے ایماندار

لڑکا۔

تو احمق ہیں جھوٹے قسم کھائیں جو کہ تعداد انکی ہے اتنی بہت

ہرا دیں انھیں جو ہیں ایماندار پھر انکو ہی سولی پہ لٹکائیں وہ

لیڈی میکڈف۔

میرے پیارے بندر خدا کی مدد مگر باپ تجھکو ملیگا کہاں

لڑکا۔

جو سچ مچ مرے ہوتے ابا کہیں تو اس وقت تم ہوتیں روتی ہوئی

جو روتیں نہیں تم تو ہوگا یہی مجھے دوسرا باپ مل جائے گا

لیڈی میکڈف۔ مرے ننھے تو تے چہکتا ہے خوب

(ایک پیامبر داخل ہوتا ہے)

پیامبر۔

مری اچھی بیگم سلامت رہیں اگرچہ نہیں مجھ سے واقف ہیں آپ

مگر آپ کا ہے جو عز و شرف بہت خوب واقف ہوں اس سے حضور

مجھے ڈر ہے یہ آپ کے واسطے بہت جلد خطرہ اک آئیگا پیش

تو نا چیز کی مانئے یہ صلاح کہ بچوں کو لے کر چلی جائیے

اگرچہ بہت ہے اداب کے خلاف کہ میں آکے ایسے ڈراؤں جناب

مگر یہ نہ کرتا تو ہوتا قصور بڑے ظلم کی بات تھی یہ ضرور

کہ خطرہ بہت جلد در پیش ہے خدا آپ کا ہو محافظ حضور

ٹھہرنے کی اب مجھ میں جرأت نہیں اجازت ہو رخصت کی حاصل مجھے

(جاتا ہے)

لیڈی میکڈف۔

کہاں جاؤں کہاں بھاگوں میں آخر کہ میں نے کیا بگاڑا ہے کسی کا

مگر ہاں یاد آیا یہ ہے دنیا ضرر پہونچانا ہے تعریف کی بات

مگر نیکی حماقت ہے خطرناک صفائی دوں میں عورت کیطرح کیوں

کہ میں نے کیا بگاڑا ہے کسی کا مگر یہ کون ہیں خونخوار چہرے

(قاتل داخل ہوتے ہیں)

قاتل۔ ترا شوہر کہاں ہے ؟

لیڈی میکڈف۔

وہ ہوگا جس جگہ ایسی نہ ہوگی تمہارے جیسے گندے اس کو پائیں

قاتل۔ تمہارا جو شوہر ہے غدار ہے

لڑکا۔ اے جھبرے گندے نہ جھوٹ اتنا بول

پہلا قاتل۔ ابے مرغی کے انڈے۔

(خنجر بھونک دیتا ہے)

لڑکا۔

ارے ظالم نے مجھکو مار ڈالا مری اماں یہاں سے جلد بھاگو

(مر جاتا ہے)

(لیڈی میکڈف قتل قتل پکارتے بھاگتی ہے۔ قاتل پیچھا کرتے ہیں)

تیسرا منظر۔ انگلینڈ۔ قصر شاہی کے سامنے

(مالکم اور میکڈف داخل ہوتے ہیں)

مالکم۔

اکیلے سے سائے میں بیٹھیں چلو   وہاں رو کے دل کی نکالیں بھڑاس

میکڈف۔

نہیں بلکہ خونریز تلوار لیں   جواں مرد بنکر حفاظت کریں

وطن کی جو ہے ظلم سے پس رہا   یہ پیدائشی حق ہے ہر شخص کا

ہر اک صبح کو یہ نظارہ ہے واں   کہ بیوائیں ہوتی ہیں نوحہ کناں

یتیموں کی چیخوں سے دل چاک ہو   نئے غم ہلاتے ہیں افلاک کو

فلک سے بھی آتی ہے ایسی صدا   کہ اُس کو بھی جیسے ہو غم ملک کا

مالکم۔

یقین مجھکو جو ہے تو اُسپر ہے غم   جو معلوم ہے اُسپہ مغموم ہوں

کرونگا جو کچھ ہو سکے گا ضرور   مناسب مگر وقت جب آئیگا

کہا آپ نے جو وہ شاید ہو سچ   یہ ظالم کہ نام اُس کا لے لیں اگر

تو فوراً ہی چھالے زباں پر پڑیں   کبھی سب سمجھتے تھے ایماندار

محبت بھی اُس سے بہت آپ کو   ابھی کچھ ضرر اُس سے پہونچا نہیں

مگر عمر میری تو ہے کم بہت   پھر اُسپر ہوں ناچیز بے اصل

تو ممکن ہے کچھ فائدہ اس سے ہو   مرے واسطے سے ملے آپ کو

یہ معصوم بکرا کریں آپ پیش   کہ جس سے ہو آقا کا غصہ فرو

میکڈف۔ نہیں اس طرح کا ہوں میں دھوکے باز

مالکم۔

مگر دھوکے بازی ہے ممکن میں تو   اگر نیک اور پاک فطرت بھی ہو

تو فرمان شاہی پہ جھک جائیگی   مگر آپ سے معذرت خواہ ہوں

کہ جو کچھ بھی ہو آپ کی حیثیت   مرے فہم میں کس طرح آئیگی

فرشتے تو ابتک ہیں روشن ضمیر   مگر سب سے بہتر جو تھا گر گیا

وہ بدیاں جو ساری زمانہ میں ہیں   پہن لیں اگر نیکیوں کا لباس

تو نیکی کی فطرت رہے گی وہی   تغیر نہ اُسمیں ذرا آئے گا

میکڈف۔ مجھے تھی جو امید جاتی رہی

مالکم۔

مجھے شک بھی شاید اسی سے ہوا   کہ کیوں جلد بازی میں چھوڑ آئے آپ

عزیز اپنی بیوی کو بچوں کو بھی   نہ رخصت ہوے اپنے پیاروں سے آپ

مگر میں کروں گا یہی التجا   کہ میں نے جو شبہات ظاہر کئے

اسے اپنی تحقیر سمجھیں نہ آپ   کہ اپنے تحفظ کی خاطر یہ تھا

مرا ظن جو ہے وہ ہو شاید غلط   مگر آپ ہوں نیک ایماندار

میکڈف۔

غریب ملک بہے جائے یوں ہی خوں ترا   عظیم ظلم و جفا کا بنا رہے اڈا

کہ اُسکے روک کی جرأت نہیں ہے کسی میں   مظالم اپنے سہے جا کہ مستحق ہے تو

سلام لیجئے آقا ہماری رخصت کا   کہ بدمعاش نہیں ہم جو آپ سمجھے ہیں

وسیع ملک جو ظالم کی دسترس میں ہے   مزید اُسپہ وہ زردار ملک مشرق کا

یہ سب بھی ہاتھ میں میرے اگر دے جائیں   شریر مجھکو بنا پائیں گے نہ اُسپر بھی

مالکم۔

نہ ہوں میری باتوں سے ناراض آپ   نہ مقصود شبہ تھا کچھ آپ پر

خبر ہے مرا ملک ہے پس رہا   لہو اُس کا بہتا ہے اور اشک بھی

نیا زخم لگتا ہے ہر روز اُسے   مجھے اپنے حق کا بھی احساس ہے

کہ اُٹھیں گے میری مدد کو بہت   یہاں نیک دل شاہ انگلینڈ سے

ملیں گی ہزاروں کی فوجیں مجھے   مگر باوجود اسکے مجھکو ہے خوف

کہ پیروں تلے میرے ظالم کا سر   جو تلوار کی نوک پر آئے گا

تو حاصل جو ہوگا مرے ملک کو   وہ بدیاں جو پہلے سے بھی بیش ہوں

وہ اُس سے دکھی ہوگا پہلے سے بیش   جو میکبتھ کی لے گا جگہ تخت پر

میکڈف ۔ اشارہ ہے یہ آپ کا کس طرف ؟

مالکم ۔

اشارہ تھا اپنی ہی جانب مرا   طبیعت میں میری ہیں بدنامیاں بہت
کہ جسوقت آئیں گی وہ سامنے   سیہ کار میکبتھ نظر آئے گا
کہ ہے برف کے مثل شفاف وصاف   غریب اور مظلوم ہے مملکت
تو معصوم پھر اسکو سمجھیں گے سب   کہ مجھ میں برائی ہیں بے حد حساب

میکڈف ۔

نہیں ہے جہنم کے لاکھوں میں بھی   کوئی ایسا شیطان جو اتنا ہو بد
کہ میکبتھ سے لے جائے بازی کبھی

مالکم ۔

یہ میں مانتا ہوں وہ خونخوار ہے   غلط کار جھوٹا دغاباز ہے
غضبناک ہے کینہ پرور بھی ہے   غرضکہ جہاں میں ہیں جتنی بدی
نہیں کوئی ایسی جو اسمیں نہیں   مگر میری بدکاریاں بے شمار
حکومت یہ ایسا اگر شخص ہو   تو اس سے تو میکبتھ ہی اچھا ہے

میکڈف ۔

جو قابو نہ ہو اپنے جذبات پر   تو یہ ظلم ہے اور اسکے سوا
نہ عقل وخرد اسمیں رہ جائیگی   اسی سے ہوا عزل شاہوں کو بھی
مگر پھر بھی اس کا کریں کچھ نہ غم   کہ حق آپ کا جو ہے اسکو لیں
فراغت سے جی بھر تعیش کریں   مگر پھر بھی رکھیں مزاج اپنا نیک
زمانہ کہے نیک اطوار ہیں

مالکم ۔

مگر حرص میری طبیعت میں ہے   حریصانہ فطرت ہے اتنی بہت
کہ مجھکو اگر بادشاہی ملے   رئیسوں کی املاک ہیلونگا میں
کسی کی زمیں اور کسی کا مکاں   نہ زیور نہ دولت بچے گی کوئی
پھر اسپر بھی قانع رہونگا نہیں   ملے جسقدر حرص ہوگی سوا
کہ اچھے وفادار امیروں سے میں   بلا وجہ جھگڑوں گا بس اسلئے
کروں اُن کو دولت کی خاطر تباہ

میکڈف ۔

اگر چہ تعیش سے بدتر ہے حرص   کہ وقتی اثر عیش کوشی کا ہے
مگر حرص کی تیغ ہے اسطرح   کہ جس سے کئی شاہ گھایل ہوے
مگر پھر بھی اس کی کریں کچھ نہ فکر   کہ دولت ہے اسکاٹلینڈ میں بہت
جو کچھ آپ چاہیں گے مل جائیگا   یہ سب خامیاں قابل انگیز ہیں
اگر خوبیاں بھی ہوں کچھ انکے ساتھ

مالکم ۔

مگر مجھ میں خوبی تو کوئی نہیں   جو موزوں ہو اک شاہ کیواسطے
سچائی کرم گستری عفو وحلم   شجاعت تدبر فروتنی بیکسی
تحمل کرم ضبط درباد لی   یہ کوئی بھی خوبی تو مجھ میں نہیں
مگر اس کے برعکس فطرت مری   ہر اک جرم کرنے میں بیباک ہے
ہر اک جرم کی جتنی قسمیں بھی ہیں   وہ سب ہیں بافراط مجھ میں بھری
بس اتنا نہیں بلکہ قوت جو ہو   تو دنیا سے میں امن اور اتحاد
جہنم میں لیجا کے جھونکوں ابھی   کروں امن عالم میں اتنا فساد
مٹے میل وملت کا نام ونشاں

میکڈف ۔

ارے ہائے ہائے اپنا اسکاٹلینڈ !

مالکم ۔

جہاں انساں ایسا ہو موزوں اگر   حکومت کے لائق تو فرمائیے
بس اب میں تو ایسا ہوں جیسا کہا

میکڈف ۔

حکومت کے قابل! حکومت کہاں   نہیں زندہ رہنے کے قابل یہ شخص
ارے قوم قسمت تری پھوٹ گئی   کہ بے حق کا ظالم حکومت یہ ہے

لہو سے عصا جس کا ہے تر بتر   بھلے دن تجھے ہونگے کب تک نصیب
کہ اصلی جو حقدار ہے تخت کا   خود اپنے کو کہتا ہے مجرم عیب
شرافت پہ اپنی لگاتا ہے داغ   پدر آپ کے شاہ والا جو تھے
بڑے نیک طینت تھے صوفی منش   بٹھاتی تھی زانو پہ ماں آپکی
نہ رکھا کبھی پیر پر آپ کو   اُنھیں تھا سدا آخرت کا خیال
خدا سو نگہباں نیں اب آپکا   جرائم جو اپنے کیے آپ نے
انھیں نے مجھے گھر سے بے گھر کیا   کلیجہ مرا ہو گیا اب تو شق
ہوئیں خاک ساری امیدیں مری

مالکم ۔

شرافت کا یہ جوش ہے صدق کا   جو تاریک شبہے تھے زائل ہوئے
سچائی شرافت ہے جو ہے آپکی   مرا ذہن قایل اب اس کا ہوا
جو شیطان میکبتھ یہ کرتا ہے وہ   تدابیر ہر روز اس طرح کی
کہ مجھکو کرے اپنے قابو میں وہ   مری عقل ناقص کا ہے انتباہ
کہ عجلت میں کرلوں نہ میں اعتبار   کوئی شخص جو بات مجھ سے کہے
خدا کو بنا کر اب اپنا گواہ   چلوں گا بس اب آپکی رائے پر
وہ اپنے لئے میں نے جو کچھ کہا   ہر اک بات کو آپ سمجھیں غلط
کہ یہ سب ہے فطرت کے میری خلاف   ابھی تک نہ عورت سے واقف ہوں میں
کبھی بات جو اُس پہ قائم رہا   جو پاس اپنے ہے اُسکی وقعت نہیں
تو اوروں کی دولت کا ہے کیا سوال   کبھی میں نے وعدے کو توڑا نہیں
نہ شیطان سے بھی دغا کی کبھی   صداقت دل و جان سے مجھکو عزیز
یہ پہلی دفعہ آج بولا ہوں جھوٹ   کہ اپنے لئے میں نے جو کچھ کہا
حقیقت میں خوبی جو کچھ مجھ میں ہے   وہ صدقے ہے سب آپ پر ملک پر
ابھی قبل اسکے کہ آئے ہیں آپ   وہ سیوارڈ جو ہیں ہمارے بزرگ
سپاہی مسلح لئے دس ہزار   اُسی سمت چلنے کو تیار ہیں
تو ہم آپ دونوں چلیں اُنکے ساتھ   خدا کی مدد بھی ہو ہمراہ میں
کہ مقصد ہمارا ہے انصاف پر   اسی سے ملیگی ہمیں فتح ۔
مگر آپ خاموش کیوں ہو گئے ؟

میکڈف ۔

خوشی ناخوشی کی یک وقت بات   نہ آسان ہے ہضم کرنا اُسے ۔
(ایک ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

مالکم ۔

بہت خوب پھر بات ہو گی ابھی   شہنشاہ کیا آج ہے میں خیال

ڈاکٹر ۔

ابھی شاہ والا ادھر آئیں گے   بہت سے دکھی اور بیمار ہیں
شفا کے لئے شاہ کے منتظر   مرض انکا ہے اسطرح کا عجیب
معالج کا فن جس میں لاچار ہے   خدا نے مگر شاہ کے ہاتھ
عطا کی ہے برکت کچھ اس قسم کی   کہ چھوتے ہی بیمار کو ہو شفا

مالکم ۔ بہت شکریہ ڈاکٹر آپ کا

میکڈف ۔ یہ کیسا مرض ہے کہ جس کا ہے ذکر

مالکم ۔

مرض شاہ کا اس کو کہتے ہیں لوگ   یہ اعجاز ہے شاہ کے ہاتھ
کہ جب سے میں انگلینڈ میں ہوں مقیم   کئی بار دیکھا ہے میں نے اسے
خدا ہی کو ہے علم کیا ہے دعا   انوکھے مرض لیکے آتے ہیں لوگ
بدن جن کے آماس پھوڑے بھی ہیں   جنہیں دیکھ کر ترس آتا ہے
معالج سبھی ان سے مایوس ہیں   مگر شاہ دیتے ہیں اُنکو شفا
گلے میں سنہری سی ایک مہر ڈال   دعائیں وہ پڑھتے ہیں آہستہ ۔
یہ کہتے ہیں وہ ہے شفا کی دعا   سکھا جائینگے اپنی اولاد کو
پھر ایسی عجائب صفت کے سوا   اُنھیں پیش گوئی کا ملکہ بھی ہے
صفات اور بھی تخت کے ساتھ ہیں   کہ وہ ہو گئے ہیں سراپا ...

میکڈف ۔ یہ کون آگیا ہے ذرا دیکھئے

(راس داخل ہوتا ہے)

مالکم ۔ یہ ہیں ہم وطن اور میں واقف نہیں

میکڈف مرے اچھے بھائی تمہیں مرحبا

مالکم ۔

بس اب کر لیا میں نے انکو شناخت وسائل خدا وہ کرے دور جلد

جو اک دوسرے کو کریں اجنبی

راس ۔ میں آمین کہتا ہوں اس پہ حضور

میکڈف ۔ کہو ملک میرا ہے اپنی جگہ

راس ۔

صد افسوس بیحد دکھی ملک ہے خود اپنے سے ہے خوف آتا اُسے

ہم اپنا وطن اُس کو کیسے کہیں کہ وہ بن گیا ہے ہماری لحد

کسی شے میں اب واں تبسم نہیں مگر وہ جو بالکل ہی واقف نہیں

فضا میں ہیں آہیں کراہیں کہ چیخ بس اب رنج و غم ہی کی تفریح ہے

جو میت پہ گھڑیاں سنتے ہیں تو تو یہ کون پوچھے کہ کس کے لئے

جو اچھے ہیں مرتے ہیں وہ اس طرح نہ مرجھائیں پھول اُنکی ٹوپی بھی

میکڈف ۔ یہ بالکل ہے سچ اور واضح بیان

مالکم ۔ مصیبت نئی اور تازی ہے کون ؟

راس ۔

خبر ہے گھڑی بھر کے پہلے کی بھی کہے گا جو کوئی بنے گا بُرا

ہر اک لمحہ ہے اک مصیبت نئی ۔

میکڈف ۔ مری اچھی بیوی تو ہیں خیر سے ؟

راس ۔ بہت خوب ہیں ۔

میکڈف ۔ میرے سارے بچے بھی ہیں خیر سے ۔

راس ۔ بہت خوب وہ بھی ؟

میکڈف نہیں اُن کو ظالم نے کچھ دُکھ دیا ؟

راس ۔

نہیں جب وہاں سے روانہ ہوا تو سب امن سے تھے بڑے مطمئن

میکڈف ۔

اشاروں میں باتیں نہ کیجئے ذرا بتائیں کہ دراصل صورت ہے کیا؟

راس ۔

یہاں وہ خبر دینے آیا تھا میں جو ایسی ہے جس سے دہل جائے دل

تو میں نے سنی تھی کچھ افواہ یہ بغاوت امیروں نے کردی ہے اب

بڑے لوگ اس میں ہوئے ہیں شریک تو پھر آگیا مجھکو اس پہ یقین

جو دیکھا کہ ظالم کی فوجیں چلیں شتابی سے ہیں نقل و حرکت میں وہ

مدد کا یہی وقت ہے اے حضور کہ ہے چشم بر راہ اسکاٹلینڈ

جمع ہونگی فوجیں نظر پہ حضور لڑیں گی ہماری خواتین بھی

کہ اُن کے مصائب یہ ہوں دور ۔ اب

مالکم ۔

تسلی کیں اب اُنکو ہو جائیگی وہاں جلد ہم خود پہنچ جائینگے

بڑی مہربانی ہے انگلینڈ کی کہ سیوارڈ کے ساتھ ہیں دس ہزار

جو ہم کو عنایت کئے ہیں سپاہ بہادر ہیں پختہ تجربے کے ہیں

مسیحی ممالک میں کوئی نہیں شجاعت میں ان سے ذرا بڑھ کر

راس ۔

مرے پاس بھی کاش ہوتی کوئی خوشی یا تسلی کی ایسی خبر

مگر بات میری تو بس ایسی ہے کہ صحرا میں جا کر سنائیں جیسے

جہاں کوئی بھی سننے والا نہ ہو

میکڈف ۔

عوامی مسائل کی ہے بات کیا کہ ایسی کہ جس کا تعلق ہو خاص

راس ۔

کوئی شخص بھی جس سے ایماندار شریک ایسے غم میں نہ ہو گا ضرور

اگرچہ حقیقت کی یہ بات ہے		کہ اس کا تعلق ہے صرف آپ سے

میکڈف

میری بابت تو بتائیں مجھے		چھپائیں نہ جلدی سنائیں مجھے

راس۔

زباں سے سدا میری نفرت نہ ہو		سنیں آپ مجھ سے جب ایسی خبر
بھرا جس میں ہے اسقدر رنج و غم		کہ ایسا نہ پہلے سنا ہو کبھی

میکڈف۔

سمجھ میں مرے بات کچھ آ گئی

راس۔

ہوئی تاخت بس آپ کے قصر پر		کیا ذبح بیوی کو بچوں کو بھی
بیان اس کی تفصیل اگر میں کروں		تو بس موت کا تم کو پیغام دوں

مالکم

خدا کی پناہ ہاں مگر آپ بھی		چھپائیں نہ چہرے کو رومال سے
کریں غم کا اظہار الفاظ میں		اگر غم نہ الفاظ میں ہو ادا
تو دل جو کہ پہلے سے بھرپور ہے		یہ اندیشہ ہے پھٹ جائے کہیں

میکڈف۔ میرے پیارے بچے بھی مار دئے گئے ؟

راس۔

سبھی بیوی بچے ملازم تلک		وہاں جو بھی موجود پایا گیا

میکڈف

عبث میں وہاں پر نہ موجود تھا		میری بیوی بھی مار ڈالی گئی

راس۔ یہی سب تو پہلے ہی میں کہہ چکا

مالکم

بجز صبر کے اور چارہ ہے کیا		دوا اس کی ہے ایک سخت انتقام
یہی اس بڑے غم کا ہے بس علاج

میکڈف۔

یہ کیا جانیں انکے تو لڑکے نہیں		تو سب وہ مرے پیارے بچے۔
کہا تم نے کیا ہو گئے ذبح سب		اسے او جہنم کے کندے سبھی
مرے پیارے بچے اور انکی ماں		سبھی ایک ہلے میں مارے

مالکم۔ جواں مرد بنکر کرو سامنا۔

میکڈف۔

کروں گا یہی میں مگر کس طرح		نہ احساس ہو مثل انسان کے
کبھی بھول سکتا ہوں میں بھی تھے		یہ پیارے جو مجھکو تھے بیحد عزیز
گنہگار میکڈف یہ تیرے سبب		ہوئے قتل معصوم سارے جو تھے
خطاوار میں تھا یہ تھے بےقصور		کہ ان پر جو نازل ہوا یہ عذاب
خدا ان کی روحوں کو تسکین دے

مالکم۔

اسی سے کرو اپنی تلوار تیز		بدل جائے غصہ میں جو رنج ہے
کہ پژمردہ اس سے نہ دل ہو کہیں		سراسر بھرے اسمیں غیض و غضب

میکڈف۔

مری آنکھ میں ہو گی نسوانیت		زباں سے مگر آگ برساؤں گا
خدا سے دعا ہے کہ ایسا کرے		کہ اٹھ جائیں پردے جو ہیں سامنے
یہ شیطان آئے مرے سامنے		جو زد میں ہو یہ میری تلوار کے
تو بچ کر نکل جائے مجھ سے اگر		تو اسکو بھی کر دے خدا وند معاف

مالکم۔

یہ لہجہ ہے اب مرد انسان کا		چلو اب چلیں شاہ کے پاس ہم
ہماری جو فوجیں ہیں تیار ہیں		اجازت کی رخصت کی بس دیر ہے
بس اب میکبتھ کا بھی وقت آ گیا۔		سزا پائے وہ اپنے اعمال کی
خدا نے وسائل مہیا کیے		بس اب آپکے دل بھی مسرور ہوں
کوئی رات اتنی بڑی بھی نہیں
کہ بعد اس کے ہوتا سویرا نہ ہو

پانچواں ایکٹ

پہلا منظر۔ ڈنسینان۔ محل کا اگلا کمرہ

(ایک معالج ڈاکٹر اور ایک مصاحبہ داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر۔

تمہارے ساتھ دو راتوں سے دیکھا خبر تم نے جو دی تھی وہ غلط تھی
مگر کب سے آخر وہ چلی تھیں؟

خاتون۔

لڑائی پر گئے ہیں شاہ جب سے تو میں ہر روز ایسا دیکھتی ہوں
کہ بستر سے اُٹھیں اور گاؤن پہنی پھر الماری کو کھولا لیکے کاغذ
اُسے موڑا لکھا اور پھر پڑھا بھی۔ لگائی مہر پھر بند اسکو کر کے
پھر اس کے بعد بستر پر گئیں وہ یہ سب ہوتا ہے گہری نیند ہی میں

ڈاکٹر۔

یہ سونا اور حرکت جاگنے کی بڑے ذہنی خلل کی ہے یہ صورت
مگر دورے پہ کچھ ایسا بھی دیکھا کہ چلنے کے سوا کہتی بھی ہیں کچھ

خاتون۔

وہ باتیں ایسی ہیں جو انکے پیچھے نہیں کہہ سکتی میں اپنی زباں سے

ڈاکٹر۔

مگر مجھ سے تو کہنا ہے ضروری

خاتون۔

نہ تم سے یا کسی سے کہہ سکونگی کہ شاہد دوسرا کوئی نہیں ہے
مگر وہ دیکھئے خود آ رہی ہیں

(لیڈی میکبتھ شمع لئے ہوئے داخل ہوتی ہے)

یہی ہر روز ہے اُن کا وتیرہ
مگر واللہ بالکل سو رہی ہیں قریب آ کر بخوبی اسکو دیکھیں

ڈاکٹر۔

کہاں سے شمع یہ پائی انھوں نے

خاتون۔

یہ ہر دم پاس ہی رہتی ہے اُنکے بڑی تاکید سے ہے حکم اُن کا

ڈاکٹر۔

یہ دیکھو آنکھ اُن کی تو کھلی ہے

خاتون۔

مگر اسمیں بصارت کچھ نہیں ہے

ڈاکٹر۔

مگر یہ کیا ہے جو اب کر رہی ہیں رگڑتی کس طرح ہیں ہاتھ اپنا

خاتون۔

یہی ہے اُنکی روزانہ کی عادت کہ جیسے ہاتھ اپنے دھو رہی ہوں
مجھے معلوم ہے کرتی ہیں ایسا بلا وقفہ کے بس چوتھائی گھنٹے

لیڈی میکبتھ۔ مگر اب بھی یہاں باقی ہے دھبہ

ڈاکٹر۔

ذرا دیکھو وہ اب کچھ کہہ رہی ہیں لکھے لیتا ہوں میں جو کچھ کہیں گی
کہ شاید میں زبانی بھول جاؤں

لیڈی میکبتھ۔

ارے کمبخت دھبے دور ہو جا تجھی سے کہہ رہی ہوں!) دور ہو جا
بجے گھڑیال میں ہیں ایک دو تین یہی تو وقت ہے بس کام کر لو
ارے تف تیرے آقا تف تم پر سپاہی ہو بہادر خوف کیا ہے
کسے معلوم آخر ڈر کی کیا بات ہمارے حکم سے ہے کون باہر
خبر کیا تھی کہ اس بوڑھے کے اندر بھرا ہے خون اتنا بھی زیادہ

ڈاکٹر۔ ذرا تم سن رہی ہو یہ؟

لیڈی میکبتھ۔

فائیف کے تھین کی تھی بیوی / لیکن اب وہ کہاں گئی ہے؟
کیا ہاتھ کبھی نہ صاف ہونگے / بس اب نہ کریں یہ میرے آقا
بس کیجئے اب تو بس بس / دعوت کا لطف کھو رہے ہیں
اس طرح سے بیقرار ہوکر

ڈاکٹر۔

جاؤ جاؤ یہاں سے جاؤ / سن لی جو بات تھی نہ سننی

خاتون۔

وہ کہہ گئیں جو نہیں تھا کہنا / ہے مجھکو یقین اس کا بالکل
کتنی باتیں ہیں ان کو معلوم / بس اسکو خدا ہی جانتا ہے

لیڈی میکبتھ

دھوؤ اپنے ہاتھ آپ اپنے / اور گون کو بھی ذرا پہنئے
چہرہ نہ بنائیں زرد اتنا / میں کہتی ہوں آپ سے یہ پھر
بینکو تو دفن ہو گیا ہے / مُردے اُٹھتے نہیں لحد سے

ڈاکٹر۔ اچھا ایسا بھی کیا ہوا ہے؟

لیڈی میکبتھ۔

بستر بستر پہ اب چلو تم / دروازے پہ ہو رہی ہے دستک
آؤ آؤ ادھر کو آؤ / ہاتھ اپنا ذرا مجھے دو
ہونا جو کچھ تھا ہو چکا وہ / اب کون مٹا سکے گا اسکو
بستر بستر پہ اب چلیں ہم

ڈاکٹر۔ بستر پہ وہ اپنے جائیں گی کیا؟

خاتون۔ ہاں ہاں بس ابتو فوراً

ڈاکٹر۔

افواہیں بری سی اڑ رہی ہیں / فطرت کے خلاف کام جو ہیں
لائیں گے خلاف فطرت آلام / جس ذہن کو لگ گیا ہے آزار
بے حس تکیے سے وہ کہیں گے / جو راز چھپے ہوئے وہاں ہیں
بے بس ہے بس طبیب اسمیں / بس اسمیں دعا کی ہے ضرورت
ہم سب کے گناہ کرے خدا معاف / ان کی رکھو خبر بہت خوب
جس بات سے انکو آئے غصہ / وہ پاس کبھی نہ آنے پائے
پھر بھی ان پر نگاہ رکھنا / اچھا قبلہ خدا ہی حافظ
اب میرا دماغ ہے پریشان / آنکھوں میں سما گئی ہے حیرت
گو سوچ میں ہے دماغ میرا / لیکن بس مہر ہے زباں پر

خاتون۔ ہاں آپکی بھی بخیر شب ہو (جاتے ہیں)

دوسرا منظر۔ ڈنسینان کے قریب کا علاقہ

(نقارہ اور علم بینٹیتھ، کیتھینس، انگس لیناکس اور سپاہی داخل ہوتے ہیں)

بینٹیتھ۔

پہونچ گئی ہے قریب ابتو فوج انگریزی / ہیں افسروں میں اک شاہزادہ مالکم
اور ان کے ماموں سیوارڈ اور میکڈف بھی / لئے ہوئے ہیں دلوں میں وہ انتقام کا علم
کہ جس سے قبر کے مُردے بھی جاگ جائینگے / کرینگے گرم وہ بازار قتل و خونریزی

انگس۔

برنام کا جنگل ہے پاس اسکے ملیں گے / جس سمت آتے ہیں وہ رستہ تو یہی ہے

کیتھنس۔

کیا تھا ڈونلبین بھی بھائی کے اپنے / معلوم کسی کو ہو تو بتلائے ہمیں بھی

لیناکس۔

بالکل وہ نہیں ہیں اُنکے ہمراہ / فہرست ہے سب کی پاس میرے
لڑکے سیوارڈ کے ہیں ہمراہ / اور ایسے بہت سے نوجوان ہیں
پہلے ہی پہل جو آگئے ہیں / اپنی قوت کو آزمانے

منٹیتھ۔ ظالم میکبتھ کا حال کیا ہے؟

کیتھنس ۔

وہ ڈنسینان کا اسکا بڑا قلعہ جو ہے   بنا رہا ہے اسی کو وہ خوب مستحکم
یہ لوگ کہتے ہیں کچھ اس کا ہے دماغ خراب   مگر جنہیں نہیں نفرت ہے اس سے کچھ زیادہ
وہ کہتے ہیں کہ یہ غصہ بہادری کا ہے   مگر جو بات یقینی ہے وہ تو اتنی ہے
کہ مطمئن جو نہیں اس کے ساتھ والے بھی   تو ان پہ ضبط کا کا قانون چل نہیں سکتا

انگس ۔

یہ محسوس اس کو ہوا ہوگا اب   کہ اس نے جو خفیہ کئے قتل ہیں
ہوئے ہیں وہ سب اس کے سر پر سوار   گھڑی ہر گھڑی ہے بغاوت نئی
ملامت وہ اب کر رہی ہیں اسے   کہ آقا سے اپنے ہوا بے وفا
جو تعمیل کرتے ہیں احکام کی   ضوابط کی تعمیل کرتے ہیں وہ
کسی کو نہیں ہے محبت ذرا   اسے ہو رہا ہوگا محسوس اب
کہ پہنا ہے جو دیو کا یہ لباس   وہ بونے سے قد پر نہیں زیب دے

مینٹیتھ ۔

تو پھر کیا تعجب جو اس کے حواس   پریشان و مختل ستائیں اسے
و دماغ اس کا پلٹے کہ دورے پڑیں   کہ ہر چیز اس کی جو ہے جسم میں
ہے بیزار اس سے کہ کیوں ہے وہاں   ملامت خود اپنے پہ کرتی ہے وہ

کیتھنس ۔

چلو اب چلیں باندھ کر ہم صفیں   کہ جس کی اطاعت ہے واجب ہمیں
اسی کو اطاعت کریں اپنی پیش   مرض کی دوا ملک کی اس سے لیں
چلیں اس کے پیچھے بہائیں وہیں   وطن کی رہائی کو ہر قطرہ خون

لینا کس ۔

نہ سب ہو تو جتنا اسے چاہئے   کہ سرسبز شاہی کا ہو جائے پھول
جو بیکار ہے گھاس وہ ختم ہو   چلیں اب تو برنام کی سمت ہم

(مارچ کرتے ہوئے جاتے ہیں)

تیسرا منظر ۔ ڈنسینان ۔ قلعہ کے اندر کا ایک کمرہ

(میکبتھ، ڈاکٹر اور ایک خادم داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ ۔

بس اب لاؤ خبریں نہ کچھ میرے پاس   چلے جائیں وہ سب تو پروا نہیں
کہ جب تک نہ جنگل وہ برنام کا   اکھڑ کر نہ ڈنسینان تک آئیگا
ذرا بھی مجھے خوف ہوگا نہیں   یہ لڑکا جو مالکم ہے ہستی ہے کیا
یہ عورت سے پیدا ہوا یا نہیں   وہ روحیں جو واقف ہیں اسرار سے
انھوں نے یہ بتلا دیا ہے مجھے   کہ ڈر تا نہ میکبتھ کہ تو ہے امر
جو عورت سے پیدا ہوا ہے کوئی   وہ تجھ پر نہ قابو کبھی پائے گا
چلے جائیں جو بے وفا تھیں ہیں   ملیں جا کے خوش باش انگریز سے
مرے پاس ایسا ہے دل اور دماغ   جسے خوف و شبہ کی عادت نہیں

(ایک ملازم داخل ہوتا ہے)

یہ الو کا چہرہ بنایا ہے کیوں   ترا خون تو خشک ہے بیوقوف

ملازم ۔   حضور ان کی تعداد ہے دس ہزار

میکبتھ ۔   یہ بطخیں، ابے بے ادب بدمعاش

ملازم ۔   نہیں شاہ والا سپاہی پیادہ

میکبتھ ۔

چلا جا ذرا اپنے چہرے کو مل   کہ آجائے کچھ خون کی بھی جھلک
چھپالے جو چہرے پہ ڈر ہے ترے   ابے بچ دلے بزدلے دور ہو
کہاں کے سپاہی ارے بیوقوف   تری جان نکلی ترے جسم سے
یہ اترا سا چہرہ پتہ دیتا ہے   کہ تجھ پر بہت خوف طاری ہے
کہاں کے سپاہی ارے بزدلے

ملازم ۔ یہ ہے فوج انگریز کی اے حضور

میکبتھ ۔   میرے سامنے سے چلا جا ابھی

(ملازم جاتا ہے)

اے سیٹن اے سیٹن مرا دل ہے دکھی بے حد — ارے سیٹن سنو میری کہ میں اب دیکھتا ہوں
کہ یہ شورش ہمیشہ کے لئے مسرور کر دیگی — وگرنہ پھینک دیگی یہ گرا کر تخت سے مجھ کو
میں زندہ رہ چکا کافی اب آئے ہیں خزاں کے دن — کہ میری قابلیت جو کبھی تھی بوڑھی ہو گئی وہ اب
خزاں کی پتیاں جیسے زرد ہوں وہ گرتی جاتی ہیں — اسی طرح حضور صلاحیت بھی میری گرتی جاتی ہے
بڑھاپے میں جو ہونا چاہئے عزت محبت اور اطاعت بھی — سپاہ اور فوج اور احباب مجھکو اب نہیں ملتے
مگر انکی جگہ ہونگی بیاں جو ہیں دو منہ لب پہ خاموشی — خوشامد ظاہری باتیں نہیں لگتی ہیں جو دلکو
رذالت کا خوشامد کرنیوالا جو بھی چاہتا ہے کہنا زباں — گر مجبور ہو کر ہی وہ کرتا ہے خوشامد بھی

ارے سیٹن !

(سیٹن داخل ہوتا ہے)

سیٹن ۔ فرمائیے حضور نے ارشاد کیا کیا ؟
میکبتھ ۔ بتلاؤ تو اور ہے خبر کیا ؟
سیٹن ۔ مرے آقا سنا تھا آپ نے جو کچھ وہ سب سچ ہے
میکبتھ ۔
لڑونگا میں جبتک مجھ سے یوں گوشت گر جائے — بس اب آؤ مرے اسلحہ تیار ہوں بالکل
سیٹن ۔ ابھی اس کی نہیں حاجت مرے آقا ۔
میکبتھ ۔
لباس جنگ پہنوں گا — ابھی بھیجو سواروں کو
کریں وہ ملک کا دورہ — کرے جو خوف کی باتیں
اسے سولی پہ لٹکا دو — مرے اب اسلحہ لاؤ
بتاؤ ڈاکٹر حالت — مریضہ کی ہے کیسی اب
ڈاکٹر ۔
حضور اگرچہ نہیں ہیں مریض وہ ایسی — مگر دماغ خیالات سے پریشاں ہے
کہ انکو چین میسر ذرا نہیں ہوتا
میکبتھ ۔
تو پھر علاج سے اس کا کرو مداوا تم — مرض دماغ سے کیا دور کر نہیں سکتے
نکال پھینکو جو غم ہے دماغ میں انکو — لکھی ہوئی ہیں جو تکلیف ذہن پر
کسی دوا سے سکون دے کے بس بنا دو تمہیں — جو مادہ ہے برا دل میں اسکو صاف کرو
کہ جس سے بوجھ ہے دل پر جو ہے ہلاک
ڈاکٹر ۔ مریض خود ہی کرے گا حضور علاج اس کا
میکبتھ ۔
تو اس علاج کے فن کو لگا دو آگ ابھی — مجھے ذرا نہیں کام اس سے ۔ آؤ ادھر
پہناؤ جنگ کا مجھکو لباس لاؤ عصا — دو ادھر اور کرو آدمی ذرا سیٹن
یہ تھین بھاگتے ہیں مجھ سے ڈاکٹر دیکھو — بس آؤ جلد بہت جلد آؤ اے سیٹن
مرض جو ملک کا تشخیص ڈاکٹر کر دو — علاج کر کے اسے پہلی سی صحت دو
تو میں تمہاری کرونگا یہاں تلک تعریف — کہ باز گشت سے جسکی آئے بار بار صدا
مرا یہ حکم ہے لے آؤ اسلحہ میرے — کوئی سنا ہو کہ ریوند چینی یا کچھ اور
کوئی علاج جو انگریزوں کو کرے خارج — سنا ہے تم نے بھی حال ان کا ڈاکٹر
ڈاکٹر ۔
سنا ہے میں نے حضور سے آپکی یہ تیاری — بتا رہی ہے کہ دشمن کا سامنا ہے ضرور
میکبتھ ۔
مرے اسلحہ ساتھ لاؤ مرے — تباہی کا یا موت کا ڈر نہیں
کہ جبتک نہ جنگل وہ برنام کا — اکھڑ کر نہ یاں ڈنسینان آئیگا
ڈاکٹر ۔ (الگ ہٹ کر)
یہاں ڈنسینان سے چلا جاؤں گر — کبھی پھر نہ آؤں نفع کے لئے
(جاتے ہیں)

چوتھا منظر ۔ برنام جنگل کے پاس کا علاقہ

(نقارہ اور علم ۔ مالکم، بزرگ سیوارڈ اور اس کے لڑکے، میکڈف، منٹیتھ، کیتھنس، اینگس، لینا کس، راس اور سپاہی)

مارچ کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

مالکم۔
قریب آگئے دن مجھے ہے یقین کہ گھر کے مکانوں کے محفوظ ہوں
نہ ہو قتل کا کوئی خطرہ وہاں

مینٹیتھ۔ ذرا بھی تو اسمیں ہمیں شک نہیں

سیوارڈ۔ ہمارے سامنے جنگل یہ کیا ہے ؟

مینٹیتھ۔ یہ جنگل ہے برنام کا اے جناب

مالکم۔
سپاہی ہر اک شاخ اک توڑ لے اسے سامنے رکھ کے آگے بڑھے
کہ دشمن کو اندازہ بھی کچھ نہ ہو کہ فوجوں کی اپنی ہے تعداد کیا

سپاہی۔ ضرور اس کی تعمیل ہوگی حضور

سیوارڈ۔
ہمیں اور کچھ تو نہیں علم ہے بس اتنا کہ ظالم کو ہے اعتماد
قلعہ میں ہے وہ ڈنسینان کے جا کہ ہم اُس پہ آگے سے حملہ کریں

مالکم۔
اسی پہ ہے سارا بھروسہ اُسے کہ چھوٹے بڑے جس کو موقعہ ملا
وہ سب چھوڑ کر اسکو بھاگ آئے ہیں نہیں اُس کی خدمت میں کوئی رہا
مگر جو کہ جبراً ہیں رو کے ہوئے نہیں کام کرتا ہے دل سے کوئی

میکڈف۔
کوئی رائے قطعی نہ ظاہر کریں کہ جبتک نتیجہ نہ معلوم ہو
بس اب مستعد ہو کے تیار ہوں جو حق ہے سپاہی کا انجام دیں

سیوارڈ۔
بس اب آگیا وقت اس کا قریب کہ ہم سب کو معلوم ہو جائیگا
ملا کیا ہمیں اور کھویا ہے کیا ابھی سے ہے بیکار کرنا قیاس
مگر جب چلائینگے تلوار ہم نتیجہ اُسی وقت ہوگا عیاں
قدم اب بڑھیں گے اُسی کے لئے

(مارچ کرتے ہوئے جاتے ہیں)

پانچواں منظر۔ ڈنسینان قلعہ کے اندر

(نقارہ اور علم کے ساتھ میکبتھ، سیٹن اور سپاہی داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ۔
پڑھا دو باہری دیوار پر اب تم علم اپنے کہ اک شور ہوتا ہے وہ آتے ہیں وہ آتے ہیں
ہمارا یہ قلعہ ہے اسقدر مضبوط و مستحکم کریں وہ جبتک محصور اندر آ نہیں سکتے
پڑا رہنے دو اُنکو جبتک قحط اور بیماری اُنھیں بیکار کر کے ختم بالکل ہی نہ کر ڈالے
جو ہمکو چھوڑ کر بھاگے ہیں وہ بھی ساتھ گر ہوتے تو ہم سینہ بہ سینہ اُن سے جم کر دو بدو لڑتے
پھر اُنکو اُنکے گھر تک لا کر ہم جا کے پہونچاتے

(اندر سے رونے کی آواز)

یہ کیسا شور ہے دیکھو

سیٹن کوئی عورت ہے روتی میرے آقا

(جاتا ہے)

میکبتھ۔
مجھے اب خوف کا احساس بالکل ہی نہیں ہوتا کبھی وہ وقت تھا سنتا اگر میں رات کی چیخیں
تو لرزہ مجھکو آجاتا رونگٹے کھڑے ہوتے کہانی خوف کی مجھکو اگر کوئی سنا دیتا
مری ہر رگ اُچھلتی جیسے اس میں زندگی ہی ہے مگر اب ہولناکی بن گئی ہے زندگی میری
کسی بھی ہول کے مجھ میں ذرا حرکت نہیں ہوتی

(سیٹن پھر داخل ہوتا ہے)

مگر کیسی تھی یہ آواز رونے کی جو آئی تھی

سیٹن۔ حضور ملکۂ عالم کی ہوگئی ہے وفات

میکبتھ۔

جو مرنا تھا تو مرتیں وہ کبھی اور — مناسب وقت ہوتا اس خبر کا
گذرتے دن پہ دن ہیں اور ہم بھی — چلے جاتے ہیں اُس لمحے کی جانب
جو قسمت نے مقرر کر دیا ہے — جو گذرے دن ہیں وہ ہم احمقوں کو
دکھاتے ہیں لحد کا صاف رستہ — تو بجھ جائے یہ شمع مختصر بھی
ہماری مختصر سی زندگی کی — کہ چلتا ایک دھوکہ زندگی ہے
ہے انسان ایک بے چارہ سا ایکٹر — جو اکھلاتا ہے جبتک کام پر ہے
پھر اُس کا نام تک ہے بھول جاتا — حیات انسان کی ہے بس اک کہانی
جسے بس ایک احمق نے سنائی — کہ ہے آواز جس میں اور جذبہ
مگر جس کی حقیقت کچھ نہیں ہے

(ایک پیامبر داخل ہوتا ہے)

زبان اپنی چلانے آ گیا تو — سنا دے جلد اپنی بھی کہانی

پیامبر۔
مرے دیجاہ آقا کیا بتاؤں — کہوں گا وہ جو ان آنکھوں سے دیکھا
مگر اب عقل ہے حیران میری — کہ کن الفاظ سے اس کو سناؤں

میکبتھ۔ تو کہدے بات جو کہنا ہے تجھکو

پیامبر۔
اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو غصہ آپکا برحق — مگر خود آپ دیکھیں تین ہی میلوں کی دوری پر
چلا آتا ہے جیسے باغ کوئی خود سے چلتا ہو

میکبتھ
اگر تو جھوٹ کہتا ہے تو لٹکا دونگا میں تجھکو — یہی جو پیڑ اُگا ہے کہ فاقوں سے تو مر جائے
ارادے میں مرے لغزش ہے شک کرنے لگا ہوں میں — کہ مبہم بات شیطاں کی ہے جھوٹ اسکا ہے سچ جیسا
کہا اُس نے کہ ڈر مت تو نہ جبتک ڈنسینان آئے — اُکھڑ کر اور چل کر آپ سے برنام کا جنگل
اب آتا ہے وہ جنگل ڈنسینان کی سمت میں چلکر — مسلح ہو مسلح ہو چلو اب مل کے سب لڑنے
اگر سچ ہے خبر جو اُس نے دی ہے پھر نہیں چارہ — برابر ہے کہ ٹھہریں یا لڑیں باہر نکل کر ہم
بس اب سورج سے بیزاری ہوئی اور یہ چاہتا ہوں میں — کہ ہو جائے یہ دنیا سب کی سب برباد و ویرانہ

بجاؤ زور سے گھنٹہ کہ آئے زور کی آندھی — تباہی آ جائے ہاں مگر لوگوں میں ہو چرچا
کہ ہم نے مستعد اور چست ہو کر جان دی اپنی

(جاتے ہیں)

چھٹا منظر۔ ڈنسینان۔ قلعہ کے باہر ایک میدان

(نقارہ اور علم۔ مالکم، بزرگ سیوارڈ، میکڈف وغیرہ فوج کے ساتھ شاخیں لئے آتے ہیں)

مالکم۔
بس اب کافی ہے شاخیں اپنی پھینکیں اب — دکھائیں دشمنوں کو اپنی حالت جسطرح کی ہے
معزز میرے ماموں آپکے لڑکے مرے شریف بھائی — لڑیں وہ آگے چلکر اور ہم میکڈف
جو باقی کام ہے سارا وہ ہم انجام دے لیں گے — جو منصوبہ بنایا ہے اُسی پر کام سارا ہو

سیوارڈ۔
خدا حافظ اگر ظالم کی فوجیں سامنے آئیں — اسی شب انکو ماریں ہم وگرنہ خود ہی پٹ جائیں

میکڈف۔
بجاؤ سب نقارے خبر دشمن کو ہو جائے — کہ آئے یہ پیامی کشت و خون و قتل و غارت کے

(سب جاتے ہیں نقارہ برابر بجتا ہے)

ساتواں منظر۔ میدان جنگ کا دوسرا حصہ

(نقارے کے ساتھ میکبتھ داخل ہوتا ہے)

میکبتھ
مقید کر دیا ہر سو سے ہم کو — کہ رستہ بھاگنے کا بھی نہیں ہے
مگر میں بھی لڑوں گا شیر جیسا — نکالوں گا میں اپنی راہ لڑ کر
کوئی ہے جو نہ عورت سے ہو پیدا — اُسی سے میں ڈروں گا بس اُسی سے

(چھوٹے سیوارڈ داخل ہوتے ہیں)

چھوٹے سیوارڈ۔ بتا کیا نام ہے تیرا؟

میکبتھ

لرز جائے گا تو سنکر

چھوٹے سیوارڈ۔

نہیں ڈرتا میں چاہے نام تیرا — جہنم سے بھی زیادہ شعلہ ور ہو

میکبتھ۔

تو میرا نام میکبتھ ہے

چھوٹے سیوارڈ۔

اگر شیطان بھی لیتا کوئی نام — تو ایسا قابل نفریں نہ ہوتا

میکبتھ۔

نہ اتنا خوف کے قابل

چھوٹے سیوارڈ۔

یہ بالکل جھوٹ ہے بدذات ظالم — مری تلوار یہ ثابت کرے گی

سراسر جھوٹ ہے تیرا یہ کہنا

(دونوں لڑتے ہیں اور نوجوان سیوارڈ قتل ہوجاتا ہے)

میکبتھ۔

ہوا تھا تو بھی اک عورت سے پیدا — جو عورت سے کوئی پیدا ہوا ہو

تو اس کے اسلحہ ہیں سب اکارت — حقارت سے نظر ڈالوں گا اُن پر

(جاتا ہے)

(نقارہ - میکڈف داخل ہوتا ہے)

میکڈف۔

ادھر ہی شور زیادہ ہے — ارے ظالم نظر آ جا

اگر تو مر گیا یوں ہی — کیا میں نے نہ ہو زخمی

تو روحیں بیوی بچوں کی — ستائیں گی مجھے ہر دم

بچارے فوجیوں کو میں نہ ماروں — کرائے کے سپاہی یہ ہیں سارے

مری تلوار میکبتھ کی ہے خواہاں — وگرنہ میان میں یونہی رہے گی

ادھر سے آرہی ہے تیز آواز — جو اعلیٰ شخصیت کی ہے نشانی

یقیناً وہ اسی جانب کو ہوگا — مری تقدیر سے مل جائے مجھکو

تمنا اور کچھ مجھکو نہیں ہے

(جاتا ہے)

(مالکم اور بزرگ سیوارڈ داخل ہوتے ہیں)

بزرگ سیوارڈ۔

ادھر آئیں مرے آقا — قلعہ تو لے لیا ہم نے

نہیں اسمیں ہوئی دقت — کہ اُس کے آدمی جو ہیں

دو طرفہ لڑ رہے ہیں وہ — ہمارے ساتھ کے امرا

لڑے ہیں خوب جرأت سے — فتح ہے آپ کی اس دن

بس اب تو کام ہے تھوڑا — کہ جو ہے رہ گیا باقی

مالکم۔

ملے ہیں ہم کو وہ دشمن — لڑے ہیں ساتھ ساتھ اپنے

سیوارڈ۔ قلعے میں اب ہوں داخل مرے آقا

آٹھواں منظر۔ میدان جنگ کا دوسرا حصہ

(میکبتھ داخل ہوتا ہے)

میکبتھ۔

بنوں میں رومی احمق کیوں — مروں تلوار سے اپنی

کہ میرے سامنے وہ ہیں — مناسب زخم جن کو ہے

(میکڈف داخل ہوتا ہے)

میکڈف۔ ادھر آ جہنم کے کتے ادھر آ

میکبتھ

تجھی سے بچ رہا تھا میں — مگر اب تو الگ ہٹ جا

کہ پہلے ہی مرے سر ہے — لہو بے حد ترے گھر کا

میکڈف ۔

مجھے باتیں نہیں آتیں زبان تلوار ہے میری
بڑا بدکار خونی ہے نہیں الفاظ وہ پیدا
کہ تیرا شر کریں ظاہر

(دونوں لڑتے ہیں)

میکبتھ ۔

نہ کر برباد قوت بے سبب اپنی اس طرح تری تلوار مجھکو کر نہیں سکتی ذرا زخمی
ہوا کو بھی اگر تلوار تیری کاٹ سکتی ہو تو اس پر بھی مجھے اس سے ضرر کوئی نہ پہنچیگا
چلا تلوار اپنی ان سروں پر زخم جو کھائیں مری تو زندگی ہے سحر سے محفوظ کچھ ایسی
کہ جو پیدا نہ ہو عورت سے قابو اس کو حاصل ہو

میکڈف ۔

تو اپنے سحر سے دھو ہاتھ اور شیطان کہ جسکی تو عبادت کر رہا ہے اس سے تو جا کہہ کے یہ کہدے
کہ میکڈف اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا تھا پہلے ہی عموماً وقت پیدائش کا ہوتا ہے مقرر جو

میکبتھ ۔

جہنم میں زباں جائے کہا تھا مجھ سے جس نے کہ اب تو جس قدر جرأت تھی میری گھٹ گئی وہ کم
بھروسا اب کسی پہ کوئی نہ شیطانوں کی باتوں پر جو کرتے شعبدے ہیں اور مبہم بات کہتے ہیں
صدا امید کی اک سنائی دیتی ہے کانوں میں مگر جب وقت آتا ہے تو ہو جاتی ہے مایوسی
لڑونگا میں نہ تجھ سے اب اٹھا لیتا ہوں ہاتھ اپنا

میکڈف ۔

تو پھر تلوار رکھدے ہٹ لے اور رہ زندگی کو کہ ہم اس کو نمائش کیلئے دکھلائیں دنیا کو
ہو تو اور جیسی ہستیاں کیا ہوتی ہیں کہ لٹکا کر تجھے ہم بانس پر نیچے یہ لکھیں
ذرا لوگو اسکو دیکھو جو سراپا ظلم ہستی تھی

میکبتھ ۔

نہیں تلوار میں ہرگز نہ رکھونگا کہ بوسہ دوں زمیں کا میں پسر کے آگے جو لڑکے مالکم کے ہوں
پھر اسیر گالیاں کھاؤں عوام الناس کی ہر دم اگرچہ ڈنسینان میں آگیا برنام کا جنگل

مقابل میں بھی ہو وہ جو کہ عورت سے نہیں پیدا لڑونگا میں تو آخر تک سپر کو سامنے رکھ کر
تو اپنا وار کر میکڈف جو بس کہدے اُسے لعنت

(لڑتے ہوئے جاتے ہیں)

(پسپائی ۔ نقارہ ۔ مالکم، سیوارڈ ۔ راس، امرا اور سپاہی علم لئے
پھر داخل ہوتے ہیں)

مالکم ۔

ہمارے دوست جو غائب ہیں زندہ کاش آ جاتے

سیوارڈ ۔

کچھ کو تو کام آ ہی جانا تھا دیکھتے ہیں مگر جو سامنے ہم
فتح اتنی بڑی ہوئی جو ہمیں تو زیادہ نہیں ہے کچھ نقصان

مالکم ۔

ماموں سیوارڈ کے جو ہیں فرزند ؟

راس ۔

میرے آقا آپ کے فرزند نے جان دی ہے اک سپاہی کی طرح
وہ رہے زندہ جوانمردی کے ساتھ دیدیا جب اپنی طاقت کا ثبوت
بے جھجک اپنی جگہ لڑتے رہے پھر سپاہی کی طرح دی اپنی جان

سیوارڈ ۔

آہ کیا وہ مر گیا ؟

راس ۔

ہاں مرا وہ لاش اُسکی آ گئی قدر کے قابل وہ اتنا تھا بہت
غم اگر اُس کا کریں اُسکے حساب ختم پھر تو وہ کبھی ہوگا نہیں

سیوارڈ ۔

زخم اُس کے تھے مگر سینے پہ کیا ؟

راس ۔

ہاں سبھی ۔ تھے زخم اُس کے سامنے

سیوارڈ ۔

پھر سپاہی وہ خدا کا ہوگیا گرچہ ہوتے میرے لڑکے اسقدر
بال یہ ہیں جسقدر سر پر مرے اس سے بہتر موت کی پھر بھی مجھے
اُنکی خاطر میں نہ ہرگز چاہتا پھر تو اُس کی رسم میت ہو چکی

مالکم ۔

مستحق تھے وہ بہت ہی رنج کے میں کروں گا اب یہ اُنکے واسطے

سیوارڈ ۔

بس اور غم کی ضرورت نہیں ہے اس کیلئے وہ کہتے ہیں کہ ہوئی موت اُسکی بہتر ہی
اور اُسنے ایک سپاہی کا حق کیا پورا تو اُس پہ اب ہو خدا ہی کا سایہ رحمت
مگر یہ اور تسلی کی بات آتی ہے ۔

(میکڈف میکبتھ کا سر لئے داخل ہوتا ہے)

میکڈف ۔

زندہ باد بادشاہ بادشاہ اب ہیں آپ
دیکھئے یہ سر ہے وہ غاصب و لئیم کا
روشنی اب آگئی مل گئی ہمیں نجات
ملک کے جواہرات سب ہیں ساتھ آپ کے
دل سے کرتے ہیں سلام ہاں مگر بلند ہو
میرے ساتھ مل کے اب شاہ کو سلام ہو
زندہ باد بادشاہ

سب مل کر ۔

زندہ باد بادشاہ بادشاہ ملک کا

(نقارہ بجتا ہے)

مالکم ۔

محبت آپ سبکی قابل تعریف ہے بیحد صلہ دینے میں اُسکے کچھ تامل ہو نہیں سکتا
تو وہ جو تھین ہیں میرے عزیز اب ارل کہلائیں یہ ہے اعزاز جو اس ملک میں پہلے پہل ہوگا
جو کچھ ہے اور کرنا اور مناسب ہے زمانہ میں بلانا دوستوں کا ملک سے باہر گئے ہیں جو
کہ اس ظالم کے پنجے سے بچائیں اپنی جان کو سزا دینا جو اُس مردود کے تھے کارکن چیلے
اور اُس شیطان ملکہ کے مری جو اپنے ہاتھوں سے یہ سب بھی اور جو کچھ ہے ضروری وقت پر ہوگا
مناسب وقت جب آئیگا موقع اور محل ہوگا بس اب ہر ایک کا دل سے ادا کرتا ہوں شکریہ
سبھوں کے واسطے دعوت دل سے میں دیتا ہوں
ہماری تاجپوشی دیکھنے اسکون میں آئیں

(نقارہ بجتا ہے۔ سب جاتے ہیں)

ختم شد

انجمن کی چند مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	یادگار نظر	جگر بریلوی	۱ر۵۰
۲	تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	[illegible]ر۰۰
۳	خواب شیریں	جے کرشن چودھری	[illegible]ر۰۰
۴	کچھ زر کی بابت	ابو سالم	[illegible]ر۵۰
۵	کلام سودا	خورشید الاسلام	۹ر۰۰
۶	گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	[illegible]ر۰۰
۷	گاندھی اور نہرو کی راہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۵ر۰۰
۸	مذہب اور دھرم	مہاتما گاندھی	۴ر۰۰
۹	مشترکہ زبان	"	۴ر۰۰
۱۰	مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	۶ر۰۰
۱۱	نسیم مغرب	اے۔ سی بہار	۲ر۵۰
۱۲	اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	۱۷ر۰۰
۱۳	سخن مختصر (دیا مجموعہ کلام)	معین احسن جذبی	۲ر۰۰
۱۴	سیر افلاک	حکیم احمد	۵ر۰۰
۱۵	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵ر۰۰
۱۶	صحیفۂ خوش نویسان	مولوی احترام الدین شاغل	۴ر۰۰
۱۷	فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۳ر۰۰
۱۸	باد دید	نصیب الرحمٰن	۳ر۵۰
۱۹	اردو صرف و نحو (جدید ایڈیشن)	مولوی عبد الحق	۱ر۲۵
۲۰	خطوط غالب	مالک رام	۷ر۵۰

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

ذکاء الدین شایاں

یادوں کی برات

(مصنفہ جوش ملیح آبادی)

(تبصرہ)

ادب میں سوانح نگاری انتہائی نازک فن ہے۔ اس میں دو شخصیتوں کا عمل ہوتا ہے ——— یعنی ایک سوانح نگار اور دوسرا وہ شخص جس کی سوانح مرتب کی جائے۔ معروضیت کے باوجود ادیب و فن کار اپنی شخصیت کے حصار سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اور شخصیت نگاری کا مسئلہ اتنا ٹیڑھا ہے کہ سوانح نگار کو اس کے نشیب و فراز، تانے بانے اور اندھیرے اجالے میں گم ہو کر ہر قدم پر بہک جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ واقعات کی ترتیب و تنظیم اور ان کا مناسب انتخاب، متعلقہ شخص کا کردار اور سوانح نگار کے ذاتی تاثرات وغیرہ ایسے سنجیدہ مراحل ہیں جن سے گذرنا آسان نہیں۔ خود نوشت سوانح (آٹوبائیگرافی) میں یہ پیچیدگیاں مزید شدت اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ اس میں سوانح اور سوانح نگار کی دوئی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر جانسن نے اپنے عہد کے شاعروں۔ شیکسپیئر، ملٹن وغیرہ کی سوانح مرتب کر کے انگریزی ادب میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اور شعر و فن کی طرح اس کے کچھ اصول وضع کئے۔ مثلاً سوانح نگار کو غیر جانبدار اور ایماندار ہونا چاہئے۔ واقعات کے انتخاب میں احتیاط اور سلیقہ کی ضرورت ہے، متعلقہ ادیب و شاعر کی زندگی اور اس کے ادبی کارناموں پر گہری نظر لازم ہے اور اسی کے ساتھ سوانح نگار کو اپنے مشاہدات اور احساسات کی روشنی میں سوانح کا اسلوب بھی پیدا کرنا ضروری ہے۔ جانسن بنیادی طور پر معلم اخلاق تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مذہب اور سماج کے شعبوں کی مانند ادب میں بھی اخلاق کی اہمیت تھی۔ اور اس کے تحت سوانح نگار کسی شخص کی زندگی کے صرف وہی پہلو پیش کرتا تھا جو "صالح" اور روشن ہوں۔ کیونکہ صالح پہلو ہی سوانح میں شامل کرنے اور منظر عام پر لانے کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ جانسن نے بھی سوانح نگاری میں اسی عنصر پر زور دیا۔ اور کسی شخص کی ذاتی زندگی کے تاریک، غیر مہذب، بے تکلف اور پرائیویٹ حصوں کو قطعی نظر انداز کر دیا۔ اس وقت تک نفسیات کا علم عام نہیں ہوا تھا اور شخصیت کی تشکیل اور اس کی دھوپ چھاؤں میں صالح عناصر کے علاوہ دیگر بھی حالات و واقعات کتنے اہم ہوتے ہیں، اس کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی سوانح نگاری میں شخصیت کی بلندی "دیوتاؤں" کی سیرت سے وابستہ تھی۔ اور انسان کی فطرت میں چھپے ہوئے شیطان کو پردے ہی میں رکھا جاتا تھا۔ حالی بھی معلم اخلاق تھے۔ "حیاتِ جاوید" میں سرسید اور ان کی زندگی کے کارناموں کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس میں سوانح نگاری کے تقریباً وہی اصول ہیں جو جانسن کے عہد میں تھے۔ لیکن بیسویں صدی میں شعر و ادب کی طرح سوانح نگاری کے آئین، ضوابط اور تقاضے بھی یکسر بدل چکے ہیں۔ نفسیات نے فرد کی زندگی اور شخصیت میں گناہ، ثواب، نیکی، بدی،

حسن، قبح، تاریکی اور روشنی ۔۔ سب کی دھوپ چھاؤں کو شامل کر لیا ہے۔ ابلیس کے بغیر آدم کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ انسان میں نور اور نار دونوں عناصر موجود ہیں ۔۔ آج سوانح نگار کے پیش نظر یہ تمام چیزیں ہیں۔ اور ہمیں کسی سوانح کو اسی انداز سے دیکھنا ہے۔

"یادوں کی برات" جوش ملیح آبادی کی خود سوانحی تصنیف ہے۔ یہ کتاب جوش اکیڈمی کراچی سے ۱۹۷۰ میں شائع ہوئی جس کی ضخامت تقریباً ساڑھے سات سو صفحات ہے۔ اپنی اس سوانح کو مصنف نے اپنے محسن اور دوست روشن علی بھیم جی کی ذات گرامی سے منسوب کیا ہے۔ یہ کتاب حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) چند ابتدائی باتیں (۲) میرا خاندان (۳) میرے چند قابل ذکر احباب (۴) میرے دور کی چند عجیب ہستیاں (۵) میرے معاشقے۔

"چند ابتدائی باتیں" ۔۔ اس باب میں جوش نے اپنی زندگی کی ابتداء سے لے کر پاکستان جانے تک کے تمام علمی، تعلیمی، سماجی، ادبی، صحافتی، فلمی اور گھریلو حالات قلمبند کئے ہیں۔

"میرا خاندان" کے تحت مصنف نے اپنے دادا، پردادا، باپ، ماں، چچا، بیوی، بیٹا اور بیٹی کا ذکر کیا ہے۔

"میرے چند قابل ذکر احباب" ۔۔ اس حصہ میں جن شخصیتوں کا تذکرہ شامل ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی۔ مختار احمد خاں۔ قاضی خورشید احمد۔ حکیم صاحب عالم۔ رفیع احمد خاں۔ پرنس میرزا عالم گیر قدر۔ مولانا سُہا بھوپالی۔ ڈاکٹر ایس۔ کے سنہا۔ مانی جائسی۔ منشی میرزا اشہد لکھنوی۔ شاہ دستگیر اکبرآبادی۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ حکیم آزاد انصاری۔ فانی بدایونی۔ آغا شاعر قزلباش۔ سردار رویندر سنگھ۔ وصل بلگرامی۔ ڈاکٹر کرنل اشرف الحق۔ کنور مہندر سنگھ بیدی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ سروجنی نائیڈو۔ میاں محمد صادق۔ علامہ حیرت۔ سردار دیوان سنگھ مفتون۔ مولانا عبدالسلام۔ مولانا عبداللہ عمادی۔ فراق گورکھپوری۔ وحید الدین سلیم۔ سیٹھ غالب دہلوی۔ روشن علی بھیم جی۔ آغا حسن عابدی۔ مصطفیٰ زیدی۔ مجاز۔

"میرے دور کی چند عجیب ہستیاں" ۔۔ اس باب میں درج ذیل اصحاب کا ذکر ہے۔

میر سجادت حسین۔ ناظم الدین حسن۔ علی گڈھ کے ایک گمنام پٹھان شاعر۔ بنی شیر خاں۔ محمد شیر خاں۔ کنکو خاں۔ امیر احمد خاں۔ ہدایت اللہ خاں۔ محبوب شاہ مجذوب۔ الویرو مشیر۔ احمد خاں رامپوری۔ مولوی احمد حسین۔ نواب زادہ مصطفیٰ علی خاں۔ نیاز علی خاں۔ میر بارق لکھنوی۔ منشی واجد علی ابرقدردانی۔ حکیم دانش لکھنوی۔ نواب رستم علی خاں مہر۔ چند وخان۔

"میرے معاشقے" ۔۔ اس حصے میں آٹھ معاشقوں کی تفصیل ہے جس میں چھ عورتیں اور دو مرد

ہیں۔ ان کے ناموں کے صرف پہلے حروف دیئے گئے ہیں ــ چند نام مکمل ہیں ۔
س، ح ــ ع، ج ــ مس میری رومالڈ ۔ مس گلیسی ۔ م بیگم ۔ ر، کماری ۔
ط، ج ۔ ج، ب ۔ ع، خ ۔

"یادوں کی برات" میں سوانح نگاری کے معیار اور اصول کے اعتبار سے بہت خامیاں ہیں۔ اس میں مزاح بے تکلفی کے حدود سے تجاوز کر کے پھکڑپن کی سرحد میں داخل ہو گیا ہے۔ ضمنی شخصیتوں کی خاکہ نویسی میں مصنف نے اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو اہمیت دی ہے جس کی وجہ سے بیشتر شخصیات اور معاصرین کے کردار مجروح ہوئے ہیں۔ فحش اور غیر مہذب کلمات بے تکلف دوستوں کی صحبتوں میں عام ہوتے ہیں لیکن ان کلمات کو بجنسہٖ سوانح میں شامل کرنا مناسب نہیں۔ اس کتاب میں اکثر مقامات پر ناشائستہ فقرے قاری کے ذہن کو پراگندہ کرتے ہیں۔ جہاں مصنف نے مذہب، سیاست، سماج اور دوسرے اداروں پر طنز کیا ہے تو وہاں اپنے نظریات کے بیان میں بے جا تفاخر و مباہات کا اظہار بھی کیا ہے۔ لیکن ان تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ ایک ایسے شاعر اور فنکار کی خود نوشت سوانح ہے جس نے اپنی طویل زندگی شعر و فن کے سائے میں بسر کی۔ جو نظریات و اوہام، تشکیک و یقین، بت شکنی اور آذری کے نشیب و فراز سے نبرد آزما رہا۔ اور جس کو "بزرگوں کے دین" سے آسودگی نہ ملی ۔ علماء اور صوفیا کی رہنمائی جس کے کام نہ آئی۔ علم کی تشنگی کے باوصف جسے علم کا یقین و سرور میسر نہ آسکا اور جس کے اندر کے شیطان نے اُسے ہمیشہ باغی بنائے رکھا۔ "یادوں کی برات" ایک فنکار کی داستانِ حیات ہے جس کو مصنف نے اپنے ذاتی محسوسات، مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں مرتب کیا ہے ۔ "حیات سعدی" اور "حیات جاوید" جیسی مقدس سوانح کے معیار سے اس کتاب پر کوئی فیصلہ دینا انصاف سے دور ہوگا ۔

ساڑھے سات سو صفحات کی اس سوانح میں جوشؔ کا ایک نثری اسلوب بھی ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ہر چند کہ یہ اسلوب جوشؔ کی شاعری کی طرح لغات اور طوالت و خطابت کے عناصر سے پوری طرح آزاد نہیں ہے، پھر بھی اس میں ہر قدم پر فنکار کے دل دھڑکن اور تجربات و احساسات کے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ پچھتر سال کی زندگی پر جوشؔ نے ایک شاعر کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے۔ واقعات کے انتخاب اور بیان کے طریق میں مصنف سے سہو کا ہو جانا غیر فطری نہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جہاں تک محسوسات کو ادبی پیرائے میں قلمبند کرنے کا سوال ہے جوشؔ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں موضوع اور تاثر کے تحت مصنف نے ہر جگہ اپنے قلم کی روش کو بدل دیا ہے۔ ادبی سوانح، تصویر کشی، رپورٹ یا محض بیان نہیں ہوتی مصنف اپنی زندگی کے دائرے میں دوسروں کے اعمال و افعال اور کردار کا جیب تجزیہ کرتا ہے تو اسے دروں بینی، داخلیت، وجدانی نظر اور "تیسری آنکھ" سے کام لینا ہی پڑتا ہے ۔ ہم

سوانح نگار کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ کسی شخصیت کی خاکہ نویسی میں انھیں باتوں اور پہلوؤں کا ذکر کرے جنھیں لوگ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں ۔

قطع و برید کے بعد اور کئی مسودوں کو رد کر کے "یادوں کی برات" کو شائع کیا گیا ہے ۔ اس کے ابتدا مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اس کے معیار و صحت سے اب بھی مطمئن نہیں ہے ۔

میں نے اپنے حالات زندگی قلمبند کرتے کے سلسلے میں کامل چھ برس تک ، زیادہ تر مسلسل اور گاہ گاہ غیر مسلسل عرق ریزی کی ہے ۔ ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا ، اُسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا ۔ پھر ڈیڑھ برس میں دوسرا مسودہ مکمل کیا ، اس پر بھی تنسیخ کا خط کھینچ دیا ۔ پھر ڈیڑھ پورے دو سال صرف کر کے تیسرا مسودہ تحریر کیا اور تین ہزار میں اس کی کتابت مکمل کرائی مگر جب اس پر غائر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ اس مسودے کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے جو صبح کو بیدار ہو کر رات کے خواب کو ، اس خوف سے جلدی جلدی الٹا سیدھا لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے ——— اور بعد از تعدد کر کے یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جا رہا ہے ۔ اور ——— میں چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم نہیں رہا ہے کہ دو برس مزید عرق ریزی کر کے پانچواں مسودہ لکھوں ——— " (صفحہ ۲۴)

جوش نے اپنی زندگی کے چار میلانات بتائے ہیں ——— شعر گوئی ۔ عشق بازی ۔ علم طلبی اور انسان

شاعری جوش کی زندگی میں اسی طرح داخل رہی جیسے جسم میں سانس اور خون ——— انھوں نے بالقصد نہیں کیا ۔ عشق بازی میں حسن پرستی کا جذبہ کارفرما رہا ۔ انھوں نے عشق میں ایک طرف اگر بہت کچھ گنوایا تو دوسرا طرف ذہنی اور جمالیاتی سرمایہ بھی اکٹھا کیا ——— عشق کی طرح علم حاصل کرنے کا شوق بھی انھیں زندگی بھر رہا ۔ اور جہاں تک انسان دوستی کا مسئلہ ہے یہ جذبہ سب سے بالاتر ہے ۔ جوش اس کا یقین رکھتے ہیں ۔

"یادوں کی برات" کا پہلا باب بعنوان "چند ابتدائی باتیں" جوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس میں مصنف کی ابتدائی زندگی کے نقوش ، تاثرات اور ماحول سے لے کر آج تک کے تمام وہ آگئے ہیں جنھوں نے اس کے مزاج اور فن کی تشکیل میں حصہ لیا ہے ۔

جوش کی شاعری میں حسن ، مناظرت ، جنس ، عورت اور رومانیانہ جذبات کے عناصر کی نوعیت ہو جاتی ہے جب آپ بیتی کا یہ ابتدائی حصہ سامنے آتا ہے ۔ اُن کا آبائی وطن ملیح آباد تھا جس کی بابت لکھتے ہیں ———

"آم کے باغوں کی رومانی اور گھنیری چھاؤں میں جھومتا، بور کی بوئے مستانہ سے مہکتا، کوئلوں کی کوکو اور پپیہوں کی پی ہو پی ہو سے چہکتا، ملیح آباد ہندوستان کی جنت یعنی لکھنؤ سے فقط تیرہ میل کی مسافت پر ہے۔"

اس ماحول میں جوش نے آنکھ کھولی۔ ایک طرف تو یہ فضا اور دوسری طرف اُن کے اجداد کا گرم "آفریدی خون" چنانچہ بقول خود ان کے "ہم لوگ ایک عجیب گنگا جمنی قوم بن گئے۔ ہمارے خون میں درہ خیبر کی شعلہ باد دوڑ مچلتی رہی اور ہمارے سروں پر اودھ کی سلوتی شام گل باریاں کرنے لگی ۔۔"

جوش کی شخصیت میں بچپن ہی سے اپنی متضاد عناصر کی حکومت رہی۔ جس کا انہوں نے اعتراف کیا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بچپن میں تھا کیا؟ شعلہ تھا کہ شبنم، حدید تھا کہ حریر ۔۔۔۔"

صبح کی رنگینی و رعنائی کا اثر جوش کی شاعری میں واضح ہے۔ حالانکہ انہوں نے لکھا ہے کہ ۔۔" ہمارے گھر کے اندر لطیفوں، نقلوں اور کہانیوں کی بنا پر دن رہتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے تک، اور رات رہتی تھی دن کے بارہ ایک بجے تک ۔۔۔ اس لئے اس غیر فطری ماحول میں پلا ہوا بچہ واقف ہی کیوں ہوسکتا تھا۔ صبح کی رنگینیوں سے ۔۔" جوش نے صبح کی پہلی بھرپور جھلک سے جو پہلا حیا لیا آئی تاثر لیا اس کے سلسلے میں لکھتے ہیں ۔

"کیونکر مالا مال ہوا میں اس دولت بیدار سے اور کیونکر یہ قرآن اترا میری آنکھوں پر اس کی روداد بھی سن لیجئے۔"

اس کے بعد جوش نے پہلی مرتبہ اپنے گاؤں جاکر مناظر فطرت، دیہی فضا اور صبح کی رنگا رنگ کیفیتیں جو مشاہدہ کیا تھا ان کو الفاظ کے پیمانوں میں بند کرنے کی کوشش کی ہے ۔

"نگاہ اُٹھائی تو بڑی حیرت کے ساتھ جب یہ دیکھا کہ دھندلے سنگ مرمر کی تراشیدہ اور دھوپ چھاؤں کی پروردہ، نیم پیدا اور نیم پنہاں، گنگا جمنی پریاں نقابوں کے سہروں کو چٹکیوں میں تولے بھساتے آسمان سے کسمساتی زمین کی طرف اڑی چلی آرہی ہیں تو میرے دل نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ دن ہے نہ رات۔ اندھیرے میں اُجالا اُجالے میں اندھیرا۔ صباحت میں ملاحت، ملاحت میں صباحت ۔۔"

"شلنگیں بھرتا نیم کے نیچے گیا۔ شاخ پہ چہچہاتی چڑیاں بھر امار کر اڑ گئیں۔ ہاتھ پھیلا کر نیم کی ڈالی کو جھکا لیا اور چھاتی سے لگا لیا اس کی پتیوں کو چوم لیا۔ مرغانِ سحری کی بانگ نے خون گرما دیا۔"

"دیوانہ وار مردانے میں پہنچا۔ دیکھا میانہ صحن میں رکھا ہوا ہے۔ میانہ محمل نظر آیا۔ کہار چلمیں پی پی کر کھانس رہے ہیں۔ ان کی کھانسی بھی اچھی لگی۔ سپاہی "لا الہ الا اللہ" کہہ کر منہ دھو رہے ہیں ان کے چھپکوں کی آواز نے دل موہ لیا — پھاٹک کے قریب گھوڑے دم ہلا رہے ہیں۔ ہتھنی جھوم رہی ہے۔ الاؤ کی اچھلتی آگ میں زہرا کی کمر لچک رہی ہے۔"

"اللہ اللہ تا حدِ نظر جھومتے لہلہاتے اور گنگناتے کھیت۔ کھیتوں میں دھرتی ماتا کی اگی ہوئی تمنائیں — اور مستجاب دعائیں۔ بیچ بیچ میں مانندِ زلفِ بتاں پیچ و خم کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں سنہری اور ملائم کرنوں سے، کچے کچے لپے پتے مکانوں کے چھپر — دور کھیتوں سے، اونچے اونچے کھلیان۔ نکائی کرنے والی جوان جوان عورتیں۔ اور لدر لدر چھو کریاں۔ اُدھر طوفان۔ اِدھر اُٹھان۔ ان کے لال پیلے لہنگے اور اودی اودی چندریاں۔ گٹھے گٹھے چکنے بدن۔ ایسے بدن کہ پوری طرح کسمسا کر انگڑائی آئے تو جلد مسک کر رہ جائے۔ اور دیکھنے والے کے دل میں یہ آرزو دھومیں مچائے کہ انھیں چھو کر بھی دیکھ لیا جائے کہ یہ بنی کن عناصر سے ہیں — یہ سماں دیکھ کر میرے سینے کی تمام کھڑکیاں کھل گئیں — اور میرے جسم کے اندر لو پھٹنے لگی۔ سویرا ہو گیا!"

موسموں کے تغیرات اور اُن کی دلفریب کیفیات کو بھی جوش نے اپنی ابتدائی عمر سے اپنے طور پر محسوس کیا تھا۔ مثلاً انھیں موسم سرما اور برشگال سے جتنا ذہنی لگاؤ تھا، موسم گرما سے اتنی ہی شدید نفرت تھی۔ کیونکہ یہ موسم شیاطین کا "آنکھ تارا، الاؤ کا گہوارہ اور — شعلوں کا فوارہ۔ خونی ریچھ، لاگو بھیڑیا اور ببر بیلا سود" ہے —

"نفرت ہے مجھکو اس محرور المزاج، مغضوب، مبغوض، معتوب اور مردود شہدے سے —
اس کی صبحیں بھی چنگاریاں" اس کی شامیں بھی کٹاریاں —"

جوش موسم سرما کے دلدادہ ہیں۔ یہ موسم "کندن سی دمکتی ہوئی انگیٹھیوں کا گلزار۔ لچکے پٹھے کی رعنائیوں

متذکرہ بالا اقتباس میں موجود ہے۔ باغی اور "آفریدی" مزاج رکھنے کے باوجود جوش نے علم و فضل کے سلسلے میں ڈینگیں نہیں ماری ہیں۔ شاعری اور علم کو انھوں نے اپنا حاکم سمجھا ہے اور خود کو محکوم ـــــ یہ شاعر جوش کا کردار ہے۔ لیکن کبھی کبھی شبیر حسن خاں شاعر پر غالب ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس وقت ان کے ذہن اور قلم و زبان کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے

حسن کی جانب والہانہ جھکاؤ اور ہر اُس شے سے باغیانہ نفرت جو خواہ مذہب و اخلاق کی ظاہر داری میں ہو خواہ سیاستِ فرنگ کی شکل میں، جوش کی پیدائشی نطرت تھی ـــــ جوش نے لکھا ہے کہ جب ان کے گھر میں کسی تقریب کا انعقاد ہوتا تھا تو عموماً مجرے وغیرہ ہوا کرتے تھے اور اُن کو بچپن ہی سے طوائف کے رقص اور اُس کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے مواقع ملتے تھے۔

"کوئی چودہ برس کی پانچویں طوائف آئی مجرے کے لئے۔ العظمتہ للہ اس کا چمپئی مکھڑا گویا سرکوہسار آغازِ بہار کی صبح طالع ہو رہی ہے۔"

اوائل عمری میں جوش اپنے والد کے ہمراہ جب تاج محل دیکھنے گئے تو اُس کے حسن کے جادو نے انہیں اس حد تک متاثر کیا تھا کہ وہ رقص کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے

"خدا کی قسم، بے ساختہ جی میں آیا کہ پھاڑ ڈالوں اپنا گریبان اور ناچنے لگوں تھرک تھرک ـــــ لیکن جب کن انکھیوں سے باپ کی طرف دیکھا، ڈر کے مارے کلیجہ مسوس کے رہ گیا کہ اگر ناچوں گا تو باپ عاق کر دیں گے ـــــ"

اس کے بعد جوش لکھتے ہیں کہ جب انھوں نے دوسرے لوگوں کو دیکھا جو تاج محل کا مشاہدہ کر رہے تھے اور جن کے جسم و جان میں رقص کی کوئی علامت نظر نہ آتی تھی، جو عقل کو چھوڑ کر کیفیت کے دائرے میں نہیں تھے، تو انھیں سخت تعجب ہوا تھا کہ پتھر کے بنے ہوئے ایسے انسان بھی ہو سکتے ہیں!

"اپنے ولولۂ رقص کا گلا گھونٹ کر جب میں نے تاج کے دوسرے تماشائیوں کی طرف نگاہ اُٹھائی تو یہ دیکھ کر حیرت میں غرق ہو گیا کہ وہ لوگ بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ بہ ثباتِ عقل و ہوش، تاج کا نظارہ کر رہے ہیں اور ان میں سے ایک فرد بھی ناچ نہیں رہا ہے میں سوچنے لگا کہ یہ سب کے سب پتھر کے بنے ہوئے ہیں یا یہ تمام لوگ بھی اپنے پٹھان باپوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔"

انگریزوں سے نفرت کے اولین احساس کو جوش نے ایک واقعہ میں بیان کیا ہے کہ جب وہ لکھنؤ میں تھے تو انہوں نے سڑک پر ایک انگریز کو دیکھا جو برابر گھوڑے کو چابک مار رہا تھا اور جس کو دیکھ کر جوش کی کھلائی "بڑی بی" جان عالم پیا کے اس عہد کو یاد کر کے رونے لگی تھیں جب گھوڑوں کو رئیسوں کی آبرو سمجھا

ہوا تھا۔ چنانچہ جوش کہتے ہیں

"بڑی بی کی یہ بات (ہائے ہمارے جانِ عالم پیا اب کبھی نہیں پلٹیں گے) سنگریں بلبلا گیا اور فرنگی سے نفرت ہو گئی — اور وہی لڑکپن کی نفرت آگے چل کر میری سیاسی نظموں کے روپ میں شعلہ افشانی کرنے لگی —"

جوش کو ابتدا ہی سے علم کا شوق تھا گھر پر انہوں نے گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ اور دیوان حافظ وغیرہ تمام کتابیں پڑھ لی تھیں۔ مزید تعلیم کے لئے وہ باہر جانا چاہتے تھے لیکن ان کے والد اس سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا باہر لکھنؤ کے رنگین ماحول میں لڑکا بگڑ جائے گا۔ جوش حاشیہ میں لکھتے ہیں —

"میاں والد کو کب معلوم تھا کہ وہ جس شبیر کو مرد صالح بنانا اور بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں وہ بگڑے بغیر رہنے کا ہی نہیں اس کو بسم اللہ کے گنبد میں بند کر کے اس کے پاؤں میں "اخلاق جلالی" کی گراں زنجیریں بھی ڈال دی جائیں تو یہ شبیر ان زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر حریم بتاں اور بارگاہ مغاں میں پہنچ جائے گا۔"

لیکن جوش کی پھوپھی زاد بھائی صفدر حسین جو تعلیم کے شیدائی تھے اور جنہیں جوش "مسدس حالی" کی نسل سے سمجھتے تھے، اس سلسلہ میں کام آئے۔ انھوں نے والد سے سفارش کر کے جوش کو سیتاپور، لکھنؤ اور بعد کو علی گڈھ بغرض حصولِ تعلیم بھجوانے کا انتظام کیا۔ اسی زمانہ میں جوش کی شادی بھی ہو گئی۔

جوش نے نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے والد کے ڈر سے وہ پرزوں پر اشعار لکھ لکھ کر ایک صندوقچی میں جمع کرتے جاتے تھے۔ ایک دن اُن کے والد کو اس کا علم ہو گیا۔ انہوں نے تنبیہ کی "خبردار اگر تم نے شاعری کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا —" اور یہ کہہ کر زنانے اور مردانے میں تمام لوگوں کو اس بات پر مامور کر دیا کہ اگر وہ جوش کو شاعری کرتے ہوئے پائیں تو فوراً مطلع کریں۔ لیکن جوش کا یہ حال تھا —

"مشیت کا یہ فرمان کہ شاعری کر، شریعت کا یہ حکم کہ خبردار شاعری کے قریب بھی نہ پھٹک — میں اس کشمکش میں پڑ گیا کہ اپنی فطرت کا حکم مانوں کہ اپنے باپ کا خارجی فرمان قبول کروں —"

حاشیہ کا حسب ذیل اقتباس بھی بہت اہم ہے کہ انھیں وراثت اور ماحول میں شاعری ملی تھی۔ وہ اس سے یوں کر الگ رہ سکتے تھے۔

ذرا سوچئے وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو، دادا بھی شاعر ہو، دو سوتیلے چچا بھی شاعر ہوں۔ بڑی پھوپھی، بڑی بہن اور بڑا بھائی بھی شاعر ہو — جس کی دادی مرزا غالب کی قرابت دار اور اردو فارسی کے اشعار برمحل سناتی رہتی ہو۔ جس کی انّا خالص لکھنوی ہو اور رات کے وقت

"کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد" کی لوری دے دے کر اس کو سلاتی ہو۔ جس کے گھر میں آئے دن لکھنؤ کے شاعرآ تے جاتے اور ہر تیسرے اور چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعرا کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو، وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا۔"

جوش کے شاعرانہ ذوق کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ان کے والد نے انھیں نہ صرف یہ کہ شعرگوئی کی اجازت دیدی بلکہ اپنے ساتھ مشاعروں میں بھی لے جانے لگے۔ ۱۹۱۱ء کے ایک مشاعرہ کی جھلک جوش نے پیش کی ہے جس میں وہ پہلی مرتبہ اپنے والد کے ہمراہ شریک ہوئے تھے اور شرم کی وجہ سے غزل نہ پڑھنے پر مرزا محمد ہادی رسوا، نے ان کی پیٹھ ٹھو کتے ہوئے ہمت بندھائی تھی۔

"شفاف چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ چاندنی پر قالین ہیں۔ گاؤ تکیئے دیواروں سے لگے ہوئے ہیں — ادھر ادھر صاف ستھرے اگالدان، نیچوں میں ہار لپٹے حقے۔ شال باف سے منڈھی ہوئی کوری ہانڈیاں۔ ہانڈیوں میں چاندی کے ورق کی معطر گلوریاں — شعرا، زیادہ تر انگرکھے اور کم تر شیروانیاں پہنے اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے دوزانو بیٹھے ہیں۔ سب کے سروں پر ٹوپیاں ہیں۔ سامعین میں سے کوئی بھی ننگے سر نہیں ہے۔ جو شاعر، مشاعرے کے فرش پر قدم رکھتا ہے وہ حاضرین کو جھک جھک کر غیر ملفوظ سلام کرتا ہے —"

۱۹۱۲ء میں جوش ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڈھ میں (ممتاز ہاؤس کمرہ نمبر ۲۴) داخل ہوئے۔ یہ علی گڈھ کا وہ دور تھا جب مسلمان طالب علم ایک جماعت کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ان میں صوبائی تعصب نام کی کوئی چیز نہیں تھی "اس زمانہ کے طالب علموں میں کوئی اودھی تھا، نہ پنجابی، نہ بنگالی تھا، نہ بہاری، صوبوں کے تعصب کی کسی کو خبر ہی نہیں تھی اور جتنے بچے تھے وہ سارے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے بچے اور آپس میں شیر و شکر تھے۔"

جوش کی جماعت کے خاص معلم واحد علی شیدا اور قاضی عبدالجلیل مرادآبادی تھے۔ ان کے ایک قول سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس عہد کے لوگ اردو سے کتنی محبت کرتے تھے کہ انگریزی جیسی زبان کے الفاظ بھی اردو ہی سے مستعار سمجھے جاتے تھے۔ ہر چند کہ یہ بات برنبائے ظرافت تھی لیکن اس کی تہہ میں تھا وہی اردو پرستی کا جذبہ — !

"قاضی صاحب بلا کے ظریف اللسان تھے اور ان کا مزاحیہ دعویٰ تھا کہ انگریزی زبان اردو کے بطن سے پیدا ہوئی ہے — وہ کہتے تھے یہ ڈاٹر، فادر، مدر، سسٹر اور

جاتا تھا۔ چنانچہ جوش کہتے ہیں

"بڑی بی کی یہ بات (ہائے ہمارے ٹیان عالم پیا اب کبھی نہیں پلٹیں گے) سنکو میں بلبلا گیا اور فرنگی سے نفرت ہوگئی — اور وہی فرنگین کی نفرت آگے چل کر میری سیاسی نظموں کے روپ میں شعلہ افشانی کرنے لگی —"

جوش کو ابتدا ہی سے علم کا شوق تھا مگر پر انہوں نے گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ اور دیوان حافظ وغیرہ تمام کتابیں پڑھ لی تھیں۔ مزید تعلیم کے لئے وہ باہر جانا چاہتے تھے لیکن ان کے والد اس سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا باہر لکھنؤ کے رنگین ماحول میں لڑکا بگڑ جائے گا۔ جوش حاشیہ میں لکھتے ہیں —

"میاں والد کو کب معلوم تھا کہ وہ جس خمیر کو مود صالح بنانا اور بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں وہ بگڑے بغیر مانے گا ہی نہیں اس کو بسم اللہ کے گنبد میں بند کرکے اس کے پاؤں میں "اخلاق جلالی کی گز بھری بھی ڈال دی جائیں تو یہ طلسماتی زنجیروں کو توڑ مروڑ کر حریم بتاں اور بارگاہ مغاں میں پہنچ جائے گا۔"

لیکن جوش کی پھوپھی زاد بھائی صفدر حسین جو تعلیم کے شیدائی تھے اور جنہیں جوش "مسدس حالی" کی نسل سے سمجھتے تھے، اس سلسلہ میں کام آئے۔ انھوں نے والد سے سفارش کر کے جوش کو سیتاپور، لکھنؤ اور بعد کو علی گڈھ بغرض حصول تعلیم بھجوانے کا انتظام کیا۔ اسی زمانہ میں جوش کی شادی بھی ہو گئی۔

جوش نے ۹ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے والد کے ڈر سے وہ پرزوں پر اشعار لکھ لکھ کر ایک صندوقچی میں جمع کرتے جاتے تھے۔ ایک دن اُن کے والد کو اس کا علم ہوگیا۔ انہوں نے تنبیہہ کی "خبردار اگر تم نے شاعری کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا —" اور یہ کہہ کر زنانے اور مردانے میں تمام لوگوں کو اس بات پر مامور کر دیا کہ اگر وہ جوش کو شاعری کرتے ہوئے پائیں تو فوراً مطلع کریں۔ لیکن جوش کا یہ حال تھا —

"مشیت کا یہ فرمان کہ شاعری کر، شریعت کا یہ حکم کہ خبردار شاعری کے قریب بھی نہ پھٹک — میں اس کشمکش میں پڑ گیا کہ اپنی فطرت کا حکم مانوں کہ اپنے باپ کا قاہری فرمان قبول کروں —"

حاشیہ کا حسب ذیل اقتباس بھی بہت اہم ہے کہ انھیں وراثت اور ماحول میں شاعری ملی تھی۔ وہ اس سے دور کر الگ رہ سکتے تھے۔

ذرا سوچئے وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو، دادا بھی شاعر ہو، دو سوتیلے چچا بھی شاعر ہوں۔ بڑی پھوپھی، بڑی بہن اور بڑا بھائی بھی شاعر ہو — جس کی دادی مرزا غالب کی قرابت دار اور اردو فارسی کے اشعار برمحل سناتی رہتی ہو۔ جس کی انا خالص لکھنوی ہو اور رات کے وقت

"کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد" کی لوری دے دے کر اس کو سلاتی ہو۔ جس کے گھر میں آئے دن لکھنؤ کے شاعر آتے جاتے اور ہر تیسرے اور چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعرا کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو، وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا۔"

جوش کے شاعرانہ ذوق کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ان کے والد نے انھیں نہ صرف یہ کہ شعر گوئی کی اجازت دیدی بلکہ اپنے ساتھ مشاعروں میں بھی لے جانے لگے۔ ۱۹۱۱ء کے ایک مشاعرہ کی جھلک جوش نے پیش کی ہے جس میں وہ پہلی مرتبہ اپنے والد کے ہمراہ شریک ہوئے تھے اور شرم کی وجہ سے غزل نہ پڑھنے پر مرزا محمد ہادی رسوا نے ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے ہمت بندھائی تھی۔

"شفاف چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ چاندنی پر قالین ہیں۔ گاؤتکیے دیواروں سے لگے ہوئے ہیں — ادھر ادھر صاف ستھرے اگالدان، نیچوں میں ہار لپٹے حقے۔ شال باف سے منڈھی ہوئی کوری ہانڈیاں۔ ہانڈیوں میں چاندی کے ورق کی معطر گلوریاں — شعرا، زیادہ تر انگرکھے اور کم تر شیروانیاں پہنے اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے دوزانو بیٹھے ہیں۔ سب کے سروں پر ٹوپیاں ہیں۔ سامعین میں سے کوئی بھی ننگے سر نہیں ہے۔ جو شاعر، مشاعرے کے فرش پر قدم رکھتا ہے وہ حاضرین کو جھک جھک کر غیر ملفوظ سلام کرتا ہے —"

۱۹۱۲ء میں جوش ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڈھ میں (ممتاز ہاؤس کمرہ نمبر ۲۴) داخل ہوئے۔ یہ علی گڈھ کا وہ دور تھا جب مسلمان طالب علم ایک جماعت کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ان میں صوبائی تعصب نام کی کوئی چیز نہیں تھی "اس زمانہ کے طالب علموں میں کوئی اودھی تھا، نہ پنجابی، نہ بنگالی تھا، نہ بہاری، صوبوں کے تعصب کی کسی کو خبر ہی نہیں تھی اور جتنے بچے تھے وہ سارے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے بچے اور آپس میں شیر و شکر تھے۔"

جوش کی جماعت کے خاص معلم واجد علی شیدا اور قاضی عبدالجلیل مراد آبادی تھے۔ ان کے ایک قول سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے لوگ اردو سے کتنی محبت کرتے تھے کہ انگریزی جیسی زبان کے الفاظ بھی اردو ہی سے مستعار سمجھے جاتے تھے۔ ہر چند کہ یہ بات برنبائے ظرافت تھی لیکن اس کی تہہ میں تھا وہی اردو پرستی کا جذبہ —!

"قاضی صاحب بلا کے ظریف السان تھے اور ان کا یہ ازاحیہ دعویٰ تھا کہ انگریزی زبان اردو کے بطن سے پیدا ہوئی ہے — وہ کہتے تھے یہ ڈاٹر، فادر، مدر، سرنڈر اور

ڈیکوریشن" کے الفاظ دراصل دختر، پدر، "سراندر" اور دیکھو رے شان سے بنائے گئے ہیں۔ جن کا تلفظ بگڑ گیا ہے۔ اور انگریزی میں طوائف کے لئے جو "پراسٹی ٹیوٹ" کا لفظ ہے۔ وہ ہماری اردو کے "برائے واسطے" کی کا بگڑا ہوا ہے"

ایک نوجوان کھلنڈرے طالب علم کی طرح جوش نے علیگڑھ میں مختلف تفریحات، مشاغل اور مذاق و شرارت میں حصہ لیا۔ ان کے گروہ کی چند شخصیتیں قابل ذکر ہیں۔ پٹنے کے سید عباس علی۔ رام پور کے سید مبارک علی۔ جواد علی گڑھ کے محسن اللہ خاں اور عبد الجلیل خاں۔ جوش کا بیان ہے کہ ہماری جماعت کو علی گڑھ سے اس شرارت پر نکالا گیا تھا کہ فرسٹ ایر کے ایک حسین طالب علم فضل الہی کے غرور کو توڑنے کیلئے ہمارے گروہ کے ایک (جہاں گیر قدر) کو نوشہ بنا کر باجے اور ڈھول کے ساتھ برات کی شکل میں دلہن کے گھر یعنی فضل الہی کے کمرہ میں لا اتارا تھا۔

علی گڑھ سے جوش پھر لکھنؤ آگئے۔ اور یہاں انھیں سید ناصر حسین اور پیارے صاحب رشید کی صحبت ہی نہیں ملی بلکہ انھوں نے مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی سے باقاعدہ عربی اور فارسی پڑھنا شروع کردی اور عطا حسین تر لیاش کی تربیت میں وہ مکمل تبرائی شیعہ بن گئے۔ جوش کی شخصیت میں لکھنؤ کے ماحول اور فضا کا اثر نمایاں ہے اور مذکورہ شخصیات نے ان کی علمی اور مذہبی رجحانات کی ہے۔

"مجھے عربی تو نہ آسکی لیکن فارسی میں کسی قدر نظر پیدا ہوگئی اور اسی کے ساتھ ساتھ میری اردو بھی خوب منجھ گئی"

"عطا حسین کی صحبت میں میری دادی نے شیعیت کے جو نقوش میرے دل پر بنائے تھے وہ اور بھی ابھر گئے۔ اور میری "رافضیت" مسلّم ہوگئی۔ اور جب میں تبرے سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوا تو میرے باپ نے وصیت نامے کی رو سے، مجھکو جائیداد سے محروم فرماکر فقط سو روپیہ کا گزارہ مقرر کر دیا۔"

یہاں سے جوش کی شخصیت ایک دوسرا موڑ اختیار کرتی ہے (جو بڑی حد تک غیر فطری اور عارضی تھی) جب شاعرانہ مزاج، حسن پرستی، علم کی طلب اور بغاوت کے جذبے نے جو زمین تیار کی تھی اس پر مذہب کے قدم پڑنے لگے اسی کے ساتھ جوش کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور لندن جانے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کی تکمیل کے لئے انہوں نے سینٹ پیٹرز کالج آگرہ میں داخلہ لے لیا۔ تاکہ سینئر کیمبرج پاس کرنے کے بعد ولایت جانے کا راستہ ہموار ہوجائے گا۔ اس مقام پر پہنچ کر جوش کی شخصیت دوہری ہوگئی۔ اور شاعر اور مذہب پرست میں جنگ ہونے لگی۔ جیت مذہب کی ہوئی۔

"اس دور کی ایک بات پر مجھ کو آج تک حیرت ہے اور وہ عجیب بات یہ ہے کہ مجھ پر اس

زمانہ میں وہ چیز طاری ہوگئی تھی جس کو دینی اصطلاح میں "نیک چلنی" اور شاعرانہ اصطلاح میں بدچلنی کہا جاتا ہے ۔ اور تو اور سینما تک سے مجتنب ہوگیا ۔"

یہ مذہبی نے اتنی بڑھی کہ جوش نے ایک انگریز لڑکی کے التفات کو بھی ٹھکرا دیا ۔ جب وہ قریب آتی یہ کترا کے نکل جاتے ۔

"میں اتنا پارسا ہوچکا تھا کہ اس کی جانب ملتفت ہی نہیں ہوتا تھا اور جب وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر سر جھکا لیا کرتی تھی تو ـــــ وہ زاہد خبیث جس نے میرے دل پہ قبضہ کرکے میرے شاعر جمال پرست کو کان پکڑ کر باہر نکال دیا تھا میری پیٹھ ٹھونکنے لگتا تھا

روزہ نماز ، خلوت ، اعتکاف ، ڈاڑھی اور پرہیزگاری ـــ غرضکہ جوش نے مذہب کے تمام لوازم اختیار کرلئے۔ قیمتی لباس ترک کرکے موٹا جھوٹا پہننا شروع کر دیا ، گوشت کھانا چھوڑ دیا اور چارپائی کے عوض سونے کے لئے تخت استعمال ہونے لگا ۔ یعنی جوش کی اپنی زبان میں وہ "مولوی خدا بخش" بن گئے ۔ اسی کے ساتھ کاکوری کے سجادہ نشین حضرت حبیب حیدر شاہ کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی۔

اس میں شک نہیں کہ جوش کا یہ مذہبی جنون قطعی عارضی اور وقتی تھا جو اُن کے شاعرانہ مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا ۔ لیکن اس تھوڑے سے وقفے میں بھی تصوف اور مابعد الطبیعات کی جانب مڑکر اُن کی شاعری نے جو حیثیت وضع کی ، وہ اہم ہے ۔ جوش کی کتاب " روح ادب " اسی عہد کی پیداوار ہے ۔ جب وہ ٹیگور ، حافظ اور خیام سے متاثر ہو رہے تھے ۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ اقبال اپنی قومی ، ملی اور فکری شاعری سے اذہان و افکار کو عمل و بیداری کی دولت عطا کر رہے تھے ۔ جوش نے بڑے ادب و احترام سے " اپنے محترم بزرگ " اقبال کا ذکر کیا ہے جنہوں نے جوش کی شاعری کو سراہا تھا اور نصیحت کی تھی کہ تصوف اور مابعد الطبیعات کی بھول بھلیوں سے نکل کر انھیں فکر و عمل کی شاعری کی طرف آجانا چاہئے ۔ اقبال نے ایک خط میں جوش کو لکھا تھا جس کو جوش اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

"ہر چند میرے (جوش کے) ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ انھیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن ان میں شراب بھری ہوئی ہے وہی پرانی ـــ اس لئے مجھ کو (جوش کو) چاہئے کہ میں حافظ و ٹیگور کی پیروی ترک کرکے فکری شاعری کی طرف آجاؤں اور (حافظ و خیام کی طرح تھپک تھپک کر سلانے کے عوض انسان کو جگانے کی جانب مائل ہو جاؤں ۔"

مذہب اور تصوف کی راہ پر جوش زیادہ دن نہ چل سکے اور اس سے بیزار ہوکر سیاست کی وادی میں آ گئے ـــــ اور پھر سیاست ترک کرکے تجسس اور تشکیک کے خار زاروں میں بھٹکنے لگے ۔ اردو کے

ناقدین نے جوش اور اقبال کی شاعری الگ الگ خانوں میں رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ اول تو جوش اور اقبال کا موازنہ و مقابلہ ہی بیکار ہے ۔ کیونکہ دونوں کے مزاج کا بُعد مختلف راہیں متعین کرتا ہے ۔ مناظر فطرت کی عکاسی حسن پرستی عقلیت ، قومی اور وطنی درد وغیرہ عناصر کے پیش نظر دونوں کی شاعری اپنا علاحدہ مقام رکھتی ہے ۔ تصوف اور تغزل ما بعد الطبیعات اور نظریات و عقائد کی دنیا میں اقبال کی شاعری نے جن بلندیوں اور نزاکتوں کو چھولیا ہے جوش ان سے کوسوں دور ہیں ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جوش کی شاعری بے حیثیت ہے ۔ وہ اپنے میدان میں مکمل شاعر ہیں ۔ اقبال کی شاعری کے معیار سے جوش کی شعری صلاحیت کا جائزہ لینا انصاف نہیں ۔ اپنی سوانح میں جوش اقبال کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے اور اپنی شعری روش کے تقابل میں لکھتے ہیں ۔

"یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ جس تصوّف اور ما بعد الطبیعات سے انہوں نے مجھے روکا تھا اس پر حرکی کا لیبل لگا کر وہ خود اسی طرف چلے گئے اور عقل کو "بولہب" اور عشق کو "مصطفیٰ" کا خطاب دینے لگے ۔"

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فلسفہ اور علم کی بنیادوں پر اپنی شاعری کا ایک نظریہ وضع کرلیا ۔ اور عقل پرستی کو چھوڑ کر "عشق کی اہمیت کو واضح کرنے لگے ۔"

"چونکہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے اور بلا کے ذہین انسان تھے ۔ اس لیے شروع شروع میں انہوں نے مغرب اور مشرق کے مابین مصالحت کی بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی ۔ لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تو انہوں نے نطشے کے "مافوق البشر" کو مشرف باسلام کرکے "شاہین بچہ" بنادیا ۔ قرآن کے مردود لفظ "عشق" کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام شرف و مجد کا مرکز تسلیم کیا ۔ اور قرآن کے محبوب "عقل" کو خاک میں ملا کر اس کو تمام مفاسد کا سرچشمہ ٹھہرا دیا اور میں چیخ اٹھا ـــــ چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما ـــــ"

تعصبات سے قطع نظر ، مندرجہ بالا اقتباسات میں جوش نے اپنی اور اقبال کی شاعری پر جو رائے ظاہر کی ہے وہ انتہائی معنی خیز ہے ۔ جوش کے خیال کے مطابق ابتدا میں اقبال "عقل" کے طرفدار تھے جبکہ جوش عقل سے الگ ہوکر عشق ، جذبے اور وجدان کی پرستش میں مصروف تھے ۔ جوش آج بھی اسی راہ پر گامزن ہیں ۔ لیکن اقبال عقل اور فکر مجرّد کی قیود سے آزاد ہوکر بعد "عشق" کی جانب آئے ۔ اور "عقل کو بولہب" اور عشق کو "مصطفیٰ" کا درجہ دیا ۔ اقبال نے عمل و حرکت اور زندگی کا حق بڑھا کر ما بعد تصوف اور ما بعد الطبیعات کو انسان کی مادی ، ذہنی اور روحانی کامرانیوں کا ذریعہ بنا دیا ۔ اور عقل کو تمام خرابیوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے "عشق" کو انسانیت کی معراج تصور کیا ـــــ اس قول سے شاید جوش یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عشق کے مقام کو اقبال نے ان کے مقابلہ میں بہت بعد کو محسوس کیا ۔ لیکن جیسا کہ ظاہر ہے اس نظریے میں جوش کا تعصب بھی کام کر رہا ہے ۔ جوش کا عشق اقبال کے عشق سے مختلف ہے ۔ جوش عشق کی کیفیات کو جنس ، مادی حسن اور واردات قلب سے آگے نہیں لے جاسکے لیکن اقبال نے عشق کو جنس اور

سطحی جذبات سے دور، پوری معنوی بلاغت اور بلندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یا

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اس قسم کے اشعار میں "عشق" کے جس تصور کو اقبال عام کرنا چاہتے ہیں اس کی وضاحت کے لئے اگر انہوں نے "مردِ مومن" یا "انسانِ کامل" کے علائم سے کام لیا، تو بے جا نہیں ہے۔ جوش کی شاعری عشق کی اس معنویت سے قطعی عاری ہے۔

جوش کا زہد و تقوی ان کے رندانہ مزاج کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکا چنانچہ اس میں رخنہ اندازی شروع ہو گئی۔ اور اندر چھپا ہوا باغی، حسن پرست اور دنیاوی لذائذ سے لطف اندوز ہونے والا شاعر سر اٹھانے لگا۔ یہ مراجعت فطری تھی۔ اگر کوئی شخص اس کو جوش کی مصلحت اندیشی سمجھے تو یہ غلطی ہے۔ مذہب کی جانب آنے کے بعد اس سے بیزار ہو جانا، جوش کی اس ذہنیت کا اشارہ ہے جو عقل و فکر کو بنیاد قرار دیتا ہے اور جیسے روایت اور "بزرگوں کے دین" پر آنکھ بند کر کے چلنا زیب نہیں دیتا۔ جوش لکھتے ہیں۔

"میں نے تقشف سے روگردانی کیوں کی؟ اگر آپ یہ ماجرا ایک کٹھ ملا کی طرح سنیں گے تو مجھ پر ہزاروں صلواتیں بھیجنے لگیں گے۔ اور اگر ایک انسان دوست کی طرح سنیں گے تو مجھے امید ہے کہ کم سے کم میرے دل کی گداختگی کی داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اس سلسلے میں جوش نے اپنا واقعہ بیان کیا ہے جس کے نتیجے میں وہ مذہب سے منحرف ہوئے اور تذبذب و تشکک کی اس راہ پر آ گئے جہاں بڑے بڑے فلسفیوں اور اہلِ بصیرت کو آنا پڑا تھا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ — ایک انتہائی سرد شام کو جوش نے ایک ضعیفہ کو سڑک پر دیکھا جو لکڑی کے سہارے کانپتی چلی جا رہی تھی۔ ترس کھا کر انہوں نے کچھ روپیوں سے اس کی مدد کرنی چاہی مگر اس خود دار بوڑھی، اپاہج عورت نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ بھیا گھر میں اس کی چھوٹی بہن رہتی ہے جو آم سے سات روپیہ دیتی ہے اور یہ روپیہ اس کے خرچ کے لئے کافی ہیں۔ جوش کو حیران اور ششدر چھوڑ کر بڑھیا چلی گئی۔ جوش کہتے ہیں "جب وہ کانپتے ہاتھوں سے دعائیں دے کر چلی گئی تو میرے ایمان کی پنڈلیاں کانپنے لگیں — میری سانس گلے میں الجھنے لگی اور اسی دردانگیز لمحے میں میری نظر دوڑ گئی اللہ کے کروڑوں بندوں تک جو در در کی ٹھوکریں کھاتے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں —"

مذہب اور عقائد کے روایتی رشتوں میں جکڑا ہوا جوش کا دل جب سسکتی تڑپتی انسانیت کو دیکھتا ہے اور یہ محسوس

کرتا ہے کہ خدا کے سامنے اس کی مخلوق ظلم و ستم کا شکار ہو رہی ہے تو وہ خدا کے وجود اور اس کے قوانین سے منہ پھیر لیتا ہے۔

"اور پھر یہ خیال آ کر میرا سر چکرانے لگا کہ قدرت نے طاقت کو یہ لائسنس دے رکھا ہے کہ وہ ناطاقتی کو کچل ڈالے ۔ میرے چشم تصور نے یکایک یہ تماشا دیکھنا شروع کر دیا کہ یزید، شمر، نادر، تیمور، چنگیز، ہلاکو، مسولینی اور ہٹلر خون انسانی کے دریاؤں میں اپنی رنگینیوں کے جہاز چلا رہے ہیں۔ فاتح اپنے مفتوحوں کی لاشوں پر قالین بچھا بچھا کر فتح کے جشن منا رہے ہیں۔ جواں مرد احتیاط سے تنگ آ کر بزدلوں کے روبرو جھک رہے ہیں۔ اور بڑے بڑے اکابر کودن سلاطین کے درباروں میں پٹیاں باندھے کھڑے ہوئے ہیں اور جاہلوں کے دروازوں پر بڑے بڑے علما کھڑے بھیک مانگ رہے ہیں۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا جا رہا ہے ــــ مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا گیا ہے ــــ محمد کے دانت شہید ہو جانے کے بعد خون بہہ رہا ہے۔ اور محمد کے نواسے حسین کو ان کے بچوں اور ساتھیوں سمیت تپتی زمین پر لٹا کر پیاسا ذبح کیا جا رہا ہے ــــ اور یہ سارے تماشے ہو رہے ہیں اس خدائے بزرگ و برتر کی آنکھوں کے سامنے ــــ جو عادل ہے، حکیم ہے، رحیم ہے، رزاق ہے ــــ اور اس کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوتا ــ ؟ ؟ ــــ اور ان تمام باتوں پر ایک سانس میں غور کرنے کے بعد زندگی میں وہ پہلا دن تھا کہ خدا کے عادل و حکیم اور رب و رزاق ہونے سے میرے دل میں شدید بدگمانی پیدا ہو گئی ــــ "

مذہبی رہنماؤں اور ٹھیکیداروں کے فتوے اور کفر و الحاد کے لیبل اس انداز کے منکرین پر ہمیشہ لگائے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت میں نگاہوں کے سامنے خدا اور اس کے وجود کے مسائل سے زیادہ انسانی معاملات کے مراحل رہے ہیں ــ وہ اشتراکی نظام فکر ہو یا سوشلزم اور لامذہبیت، انسانیت کا خون انھیں کے ہاتھوں ہوا ہے۔ اخلاق اور مذہب کا لائحہ عمل تو پیشتر ہی انسان کی بے لگام جبلت اور سرشت کے آگے بند و باندھے ہمیں ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا ــ اب موجودہ دور میں بے یقینی، تشکیک، موت کے خوف اور زیست کی تباہ کاری نے خدا کے وجود کو تقریباً بے معنی کر دیا ہے۔ متذکرہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا اور مذہب کی زد پر آئے ہوئے انسان سے جوش کو یہ تقاضائے بشریت ہمدردی ہے۔ ایک شاعر اور فنکار کا دل عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ خدا کے ہوتے ظالم کا غالب ہونا، مظلوم کا اس کے شکنجوں میں تڑپنا، طاقت کی سربلندی اور کمزوروں کی تباہی جوش کی برداشت سے باہر ہے۔ ایسے حالات میں اور اس فکر و احساس کے ساتھ جوش کو ملحد، کافر، مرتد، بے دین اور گمراہ کے نام سے یاد کرنا، مناسب نہیں۔

"بندوں کی درماندگی اور اللہ کی بے مہری کا تصور قوی سے قوی تر ہوتا چلا گیا اور اسی تناسب سے

میری نمازیں بے لطف ، بے خضوع اور کھوکھلی ہوتی چلی گئیں ۔"

مذہب اور زہد و پرہیز گاری کا لبادہ اتار دینے کے بعد جوش کتنی تیزی سے اپنی شخصیت کے اصل مرکز جانب پلٹتے ہیں ، اس کی تفصیل کو انہوں نے بڑے ڈرامائی ڈھنگ سے اپنی سوانح میں پیش کیا ہے ۔

"ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ خیال آیا — ایسی نمازیں جن میں لب پر آیتیں ہوں اور دل میں شکایتیں ، کس مرض کی دوا ہو سکتی ہیں ۔ یہ خیال آتے ہی ایک توپ سی چلی میرے دل میں — میری عقل میرے سر سے نکل پڑی اور میرے سامنے کھڑی ہو کر مجھ کو تیوریاں دکھانے لگی — اور میں نے چپکے نماز توڑ ڈالی ۔ حجرۂ نماز سے دیوانہ وار باہر آیا ۔ حجام کو فوراً بلایا ۔ داڑھی منڈا ڈالی ۔ موٹے جھوٹے کپڑے اتار کر پھینک دئے ۔ اچھا لباس پہن لیا ۔ خُم منگائی ۔ آدھ گھنٹے میں لکھنؤ پہنچ گیا ۔ لکھنؤ پہنچتے ہی دن دہاڑ ایک نازنین کے کمرے پر چڑھ گیا اور گانا سننے لگا ۔ گانا سن کر کھانا کھایا ۔ تنڈرے کبابی کے کباب نوش فرمائے ۔ وہیں پڑ کر سو گیا ۔ شام کے قریب حمام کیا ۔ گویا عقل کا غسل صحت ہو گیا — "لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم —" اور رات کے گیارہ بجے جب اس نازنین کی گدگدی مسہری پر لیٹا تو وہ کچّو داڑھی کا لبیس تر شا ملّا جو میرے محلے دل میں آ کر بس گیا تھا اپنا مصلّے اور اپنا وضو کا بدھنا بغل میں داب کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے "خدا کی مار ہے مردود" کہتا ہو چلا گیا اور اس ملّا کے جاتے ہی میری خوابگاہ میں گم کردہ شاعر "پس از مدت گذر افتاد بر ما کاروانے را" کے مانند ہنستا ہوا در آیا ۔ آتے ہی دوڑ کر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور گانے لگا —

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید   کہ ز انفاس خوشش ، بوئے کسے می آید ۔"

شراب نوشی کا فلسفہ جوش کے نظریہ کے مطابق یہ تھا کہ صرف خواص کو شراب پینے کی اجازت دی جائے کیونکہ شراب کا سا جوہر نایاب عوام کے لئے زہر (اور خواص) ، اور وہ بھی دیوتا قسم کے خواص کے واسطے آب حیات ہے ۔" وہی شخص آب خوری کا مجاز رکھ سکتا ہے جو شراب کے بار کو برداشت کر سکے اور جس کی صحت اثر انداز نہ ہو ، جس میں اخلاقی و جسمی حالت کی استواری ، اپنی خانگی زندگی کی خوش گواری ، اپنے ذہن کی سالمیت کی بیداری ، اپنے حقوق نفس حقوق عباد کی آبیاری اور اپنے معاشرے کی پُرسکون ہمواری کو باحسن الوجوہ قائم رکھنے کی صلاحیت ہو ۔"

اپنی شراب نوشی کے ضمن میں جوش نے سوانح میں جو واقعہ درج کیا ہے اس سے ان کی شخصیت اور عورت کے حسن ف بے ساختہ کھنچ جانے کا رجحان واضح ہو جاتا ہے — ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے کہ جوش اپنے دوست مہابیر سنگھ کی دعوت پر ان کے مکان پہنچے ۔ سردار جی نے اپنے دوستوں کی محفل میں شراب کے دور کا آغاز کیا اور جوش کو بھی اس میں شریک مجبور کیا ۔ اس وقت جوش ، شراب کی لذت سے ناآشنا تھے ۔ انہوں نے سختی سے انکار کر دیا اور جب مہابیر کے انتہائی

اصرار پر بھی جوش نے شراب پینا قبول نہ کیا تو سرداری نے دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی ایک نو عمر طوائف کو سکھا پڑھا کر جوش کی طرف بھیج دیا۔
جوش لکھتے ہیں —

"وہ سولہ سترہ برس کا سن کسمساتا بدن، سرخ انگھڑیوں سے وہ اٹھتی ہوئی رنگین گھٹائیں، لانبی نکیلی پلکوں میں وہ کچری کے کلیجے والی اسانسوں کی موجوں میں وہ کوکتی جوانی بکھری زلفوں میں وہ جھولتی ہوئی بندرابن کی برکھا راتیں امیت انگیا کی کٹوریوں میں وہ زیر تعمیر تاج محل کی جھنکار— اس کو دیکھ کر زلزلہ آ گیا میرے دیار وجود میں — بھاپ سی اٹھنے لگی میرے مسامات سے اور سر پر آواز منڈلانے لگی "اُڑ بھنبیری ساون آیا۔" ——— پتلی پتلی لانبی انگلیوں سے اس نے ساغر اٹھایا، پیالے سے منہ لگا کر دو چار گھونٹ پئے —— کن انکھیوں سے مجھ کو تاکا اور پیمانہ اٹھا کر بڑھنے لگی میری طرف — سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے گانا بھی شروع کر دیا۔ "اری میں توٹ گئی بیچ بجار، توکوا نے لوٹ لیا —" اس کے گاتے ہی تار اجرن نے ستار چھیڑ دیا۔ تالوں میں پیرتی ہوئی وہ بالکل میرے سر پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کی کچی عمر کی مہکتی ہوئی سانس میرے سینے میں چبھنے لگی۔ میرے دل سے آواز آئی، ہوشیار دشمن آپہنچا — میرے ہاتھ پیر سنسانے لگے۔ چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ کہ یکایک وہ ظالم چھم سے میرے زانو پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی جھوٹی شراب کے ساغر کو میرے لبوں سے پیوست کر دیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لے کر چوما اور پھر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اور اپنے لب میرے لب سے چسپاں کر کے اس طرح الٹی سانسیں لینے لگی گویا وہ میرے تمام وجود کو پی جائے گی۔

بالا بلند، سرو قدے، سرو نازِ من کوتاہ کرد قصۂ زہدِ درازِ من —"

اس فضا اور ماحول میں گوشت پوست رکھنے والا کوئی انسان، اپنے زہد و اتقا کے تمام تکلفات سے بیس ہو گئے اور دامن بچا کر چلا جائے تو وہ دیوتا تو ہو سکتا ہے لیکن خدا کا وہ بندہ نہیں ہو سکتا جس کو مٹی سے بنایا گیا تھا اور فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اسے سجدہ کریں —— جوش تو پھر کمزور اعصاب کے انسان تھے —!

سوانح کے ابتدائی اوراق میں "میرے عنفوانِ شباب تک کا ہندوستان" کے عنوان سے جوش نے اپنے عہدِ جوانی کے ہندوستان کی جھلکیاں تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں جن سے اس وقت کے ہندوستان کی معاشرت، لباس و وضع قطع، نظریات و عقائد، سیاست اور عوام و خواص کے اعمال کا ایک خاکہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

اس زمانہ میں مغربیت اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ ہندوستان کی قدیم مشرقی روایات پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ سماج "خالص مشرقی" "نیم مشرقی" اور "مغربی" گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر طبقہ کا معیارِ زندگی جدا تھا۔ عبا، قبا، داڑھی اور انگرکھے مشرقی طبقے میں رائج تھے۔ نیم مشرقی گروہ کے افراد داڑھی منڈواتے، شیروانیاں اور چست پاجامے پہنتے تھے۔ مغرب زدہ گروہ کے لوگ داڑھی اور مونچھ منڈواتے تھے، اور سوٹ پہنتے تھے۔ "سوٹ پہننے والوں کو پٹیل صاحب کہا جاتا تھا"

۱۹۲۰ء کے آس پاس قومی اور ملکی سطح پر ہندوستان ایک طرف تو مغربی زبان و تہذیب سے متاثر ہو رہا تھا اور دوسری طرف مصالحت وقت کے پیش نظر انگریزوں سے سمجھوتہ کر کے جدید علوم کی برکتوں سے ہندوستانی ذہن اور فضا کو روشناس کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ جوش مشرقی ماحول کے پروردہ تھے وہ ابتدا ہی سے انگریزی اقتدار کے خلاف تھے اور کسی صورت میں بھی مصلحت کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد جب جوش کو معاش کی فکر تھی تو یو۔پی کے گورنر سر ہار کورٹ بٹلر نے انھیں سرکاری نوکری دلانا چاہی۔ لیکن جوش نے یہ کہتے ہوئے ان کی پیش کش کو رد کر دیا ۔۔

"آپ کی حکومت غاصبانہ ہے۔ اس لئے میں آپ کی نوکری کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں۔ میرا یہ فقرہ سن کر بٹلر کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔۔ کمرے سے نکل کر وہ مجھے لان پر لے گئے اور انگلی اٹھا کر کہا ۔۔ "دیکھئے یہ یونین جیک جو چھت پر لہرا رہا ہے، جب اس پھریرے کے اوپر سے خون کا دھارا گذر جائے گا، اس وقت ہندوستان آزاد ہونے کا خواب دیکھ سکے گا۔" میں نے کہا "ہندوستان کی رگوں میں اس قدر خون ہے کہ فقط ایک ضلع کا خون اس پھریرے کو آسانی کے ساتھ غرق کر کے رکھ دے گا۔"

یہ اقتباس جوش کی شخصیت میں آزادی کی تڑپ اور انگریزی دشمنی کو پوری طرح ظاہر کر دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ سرسید جیسے قوم پرست شخص سے صرف اس لئے متنفق نہ ہو سکے کہ وہ انگریزوں کو دوست سمجھتے تھے۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے باب میں لکھتے ہیں ۔

"اس کالج کے بانی سرسید احمد نے (جن کے کاسۂ سر میں 'سر' کے خطاب کا ہندوستان شکار عقاب اپنا آشیاں بنا چکا تھا) محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج، مسلمانوں کو غیر اسلامی خطاب دینے والا غلامانہ نام، اپنی ذہنیت کے اس تیشۂ زبوں سے تراشا تھا۔ جس سے حبّ وطن کے پہاڑ کاٹے جاتے، اور " عشرت کدۂ پرویز " کی جانب جوئے شیر لائی جاتی ہے۔ اور یہ خدا بخشے انھیں خویش دشمن و بیگانہ دوست ہر رگ کا موروثی اثر ہے۔ اور جو آج تک ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور جس کے باعث ہم آزاد ہو جانے کے باوجود آج بھی اپنے سرکاری محکموں، تہذیبی اداروں اور اپنے شہر کے محلوں کو ۔۔ پی، آئی، ڈی سی۔ رانٹرز گلڈ اور پی اای این ایچ سوسائٹی کے انگریزی نام عطا فرما کر فخر محسوس کرتے ہیں اور یہاں تک کہ اپنے ناموں کے سروں پر ٹی۔پی عبد اللہ۔ اے۔ ڈی اظہر۔ وائی۔ ایف مجیب اور ڈبلو، ڈبلو رحمٰن کے گندے ٹوکرے لاد لاد اس آرزو میں مرے جا رہے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ہم غلطوں کو فرنگی یا کم سے کم کرسٹان ہی سمجھ لے۔"

جوش کے لہجے کی یہ تلخی سنجیدہ حضرات کو یہ سوچنے کی ترغیب دے سکتی ہے کہ جوش، سرسید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے۔ وہ اپنی مشرقیت کے زعم میں سرسید کی ان تمام قومی، ملی، تعلیمی اور ادبی خدمات کو بھول گئے جو انگریزیت کو اپنا کر غیر انجام تک نہیں پہنچ سکتی تھیں ۔۔ لیکن یہاں ایک پہلو پر نظر ضروری ہے۔ وہ یہ کہ سرسید کی انگریز دوستی سے نفرت

کرنے والے دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک تو وہ قدامت پرست، کٹھ ملا اور مشرق کی جامد روایات کے دلدادہ، جو عموماً جہالت کی بنا پر جدید تعلیم و تہذیب کو شجرِ ممنوعہ سمجھتے تھے۔ اور انگریزی علم کا حصول جن کے لئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر کافر بن جانے کے مترادف تھا۔ دوسرے وہ مہذب، تعلیم یافتہ حضرات تھے جنہوں نے مشرق اور مغرب کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انگریزی تہذیب اور جدید علوم کی خوبیوں کو اسی حد تک اپنانا چاہیے جس حد تک وہ ہمارے مذہب اور مشرقی معاشرے کی روح کو مجروح نہ کریں۔ اس دوسرے نظریے کے حامیوں میں شبلی جیسے عالم مورخ اور شاعر بھی تھے۔ جوش کو بھی اسی صف میں شامل کرنا مناسب ہے۔ وہ انگریزی تعلیم اور اس سے پیدا ہونے والی ان خرابیوں سے نالاں تھے جو ہماری مشرقی تہذیب کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں، اور جس کا تحفظ ضروری تھا۔ سرسید کی خدمات سے جوش منکر نہیں ہیں وہ چونکہ مزاجاً مشرقیت کے پرستار ہیں اس لئے سرسید کی انگریز دوستی کی مصلحت کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتے۔ وہ اپنی مشرقی روایات سے اس کا موازنہ کرتے ہیں اور انگریزوں کی سیاست و حکمت کو نظر میں رکھے ہوئے ہوئے ایک باغی کی طرح انگریزوں کے ساتھ ساتھ سرسید کو بھی ہدفِ ملامت بنا لیتے ہیں۔ سرسید کے سلسلے میں جوش کے قلم سے ایسے الفاظ بھی نکل جاتے ہیں، جو موزوں نہیں۔

> "فرنگیوں کے نقیب پنڈت موہن مالویہ اور سرسید احمد خاں اپنے اپنے چیلی چاپڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کی سعی کر رہے تھے لیکن اس وقت مشرقیت اتنی چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہر چند ابھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر تو می مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئی تھی۔"

ہندوستان پر انگریزوں کے مکمل تسلط کے باوجود ہندوستانیوں کے ذہنوں میں آزادی کا جذبہ جاگ اٹھا تھا اور اہلِ فرنگ کو اس طرف سے خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگے تھے کہ "ہم نے مسلمانوں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے، ہندوؤں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور پھر بہ حیثیت مجموعی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دینے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا، وہ بیکار گیا ۔۔۔ " انگریزوں کو سب سے زیادہ خوف یہ تھا کہ تلک، گوکھلے اور مہاتما گاندھی کی آواز پر تمام ہندوستان آزاد ہونے کے لئے تول رہا ہے۔

> " مہاتما گاندھی جس وقت لنگوٹا باندھ کر میدان میں کود پڑے تو توپ پھٹ گئی ۔۔۔ اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ تخت یا تختہ ۔۔۔ آزادی یا موت ۔۔۔ یا ایوانِ فرنگی مسمار، یا تختۂ دار۔"

(باقی آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

میں لپٹا ہوا دلدار، دھندلکے کا راگ، جھٹپٹے کا سہاگ۔ زلیخا کا خواب اور یوسف کا شباب" ہے۔ اس موسم
کہانیاں سنانے والی اپنی کہانیوں سے وہ فضا پیدا کرتی ہیں جو ذہن و روح کی تازگی کا سامان ہوتا ہے۔ جوش
نے اُن پُراسرار کہانیوں میں آنے والے شعری مزاج کی تشکیل کی ہے۔ انگیٹھی اور آتش دان کے گرد قصہ
طلب زدہ کیفیت، بوڑھیوں کا منہ بنا بنا کر کہانی کہنا اور کنیزوں کا پیچھے کھڑے ہو کر محو داستان رہنا وغیرہ
نے اس طرح واضح کیا ہے

"دوسرے تخت پر وہ رضائی اوڑھے ہوئے کہانی کہنے والیاں — ان کے پیچھے اونچے اونچے
موبافوں کی مامائیں، اصیلیں اور لونڈیاں باندیاں۔ پشت پراگردان۔ بیچوں بیچ انگیٹھی۔ انگیٹھی میں
چٹخنے کوئلوں کی چٹکار — اور سنہری آنچ کا راگ —"

برسات کے سلسلے میں تو جوش نے اپنی ذاتی اور ذہنی وابستگی کا اظہار شدت کے ساتھ کیا ہے۔ " وہ گھا
وہ چڑھتے دریا۔ وہ گرجتے بادل۔ وہ تھرکتے ولولے۔ وہ کوکتی ترنگیں۔ وہ ابلتی امنگیں۔ وہ چہکتے رنگ —
برسات ہے۔

موسموں کے ساتھ تہواروں کی چہل پہل اور گہما گہمی سے بھی جوش ابتدا ہی سے متاثر رہے ہیں۔ دیوالی کا جشن
ہولی میں تعصب کے غبار سے دور، ہندو اور مسلمانوں کا رنگ کی خوش فعلیوں میں شریک ہونا۔ شب برات میں آتش
شغل۔ رمضان میں افطار کے اہتمام۔ عید الفطر کی خوشیاں — ان سب کے نقوش جوش کے یہاں موجود
لیکن ان تہواروں کے ضمن میں جب بقر عید کا ذکر آتا ہے تو جوش کے بچپن کا دل " چلتی چھریوں، تڑپتے جانور
اور بہتے ہوئے خون میں ڈوبے ہوئے" اس تہوار سے متفق نہیں — وہ اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں

" میں لڑکپن میں سوچا کرتا تھا کہ یہ سارا ظلم اللہ میاں کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے
اور پھر بھی وہ ان ظالموں کو سزا نہیں دے رہے ہیں — ایک دن ڈرتے ڈرتے میں
نے اپنے باپ سے پوچھا تھا میاں ہمارے گھر میں یہ بقر عید کے دن کیا ہونے لگتا ہے ؟
میاں نے آنکھیں نکال کر ارشاد فرمایا تھا خاموش رہو یہ اللہ کا حکم ہے۔ اور میں سوچنے
لگا تھا کہ میرا اللہ ایسے حکم بھی دیتا ہے —"

مذہب کے اصول فرمان برداری سے قطع نظر، جوش کا یہ استفہام ان کے باغی ذہن کی پہلی کڑی
جس نے آگے چل انھیں مذہب کے جامد آئین اور علماء، اور صوفیا اور مولویوں کی عیارانہ ظاہرداری
متنفر کیا۔

ماہ عزا یا محرم کے زمانے میں جوش کے گھرانے کا ہر فرد ماتم اور سوگ میں شریک ہوتا تھا۔ جوش

عصمت الاکرام

شہر سے دور چلیں

دیوانو! آؤ جانبِ صحرا چلیں کہ آج
یہ شہر چاہتا ہے دل و روح سے خراج
زلفِ حیات کتنی پریشاں ہے شہر میں!
انساں ہے اور کشاکشِ پنہاں ہے شہر میں
سینوں کی آگ نذرِ چراغاں ہے شہر میں
تاریکیوں کے فرق پہ ہے روشنی کا تاج

صحرا، جہاں سکوت کو طرزِ ادا ملے
ہم گفتگو کریں تو فضا ہم نوا ملے
کانٹوں میں اور نکھرے گی بیداریٔ جنوں
سرشار ہو کے نبضوں میں مچلے گا اور خوں
صحرا کی خامشی میں ملے گا مجھے سکوں
صحرا کی خامشی ہے مرے درد کا علاج

کٹ جائے شب روپہلے نظاروں کی چھاؤں میں
چھیڑیں ربابِ فکر ستاروں کی چھاؤں میں
مدہوشیوں کو خودنگری کا سرور دیں
ماحول کو گدازِ دلِ ناصبور دیں
صبح آئے تو اسے نفسِ جاں کا نور دیں
اہلِ ریا کی بزم میں رکھ لیں جنوں کی لاج

رکھ لیں جنوں کی لاج کہ دنیا میں جی سکیں
اتنا تو ہو کہ ہنستے ہوئے زہر پی سکیں

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

اڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

اس قدر تجھکو نہیں پروائے نان　　جس قدر تو آن پر دیتی ہے جان

مولانا کے سامنے سرمایہ دار طبقہ بھی ہے ان کا فلسفہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ منعم میں فیاضی کی صفت بذاتِ خود موجود نہیں بلکہ اصلاً "حیا" انھیں جود وسخا پر مائل کرتی ہے۔ فرماتے ہیں :

اغنیا کے دل کو گرماتی ہے تو　　بخل اور خست سے شرماتی ہے تو
تو سکھادیتی ہے ان کو بذلِ مال　　زخم خنجر ہے تجھے ردِّ سوال !

مولانا اسماعیل کی اخلاقی نظموں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے کردار و عمل کے ذریعہ اخلاق کی اصلاح کا کام کیا ہے کہیں بے جان چیزوں کی تمثیل کا سہارا لیا ہے کہیں جانوروں کے عادات و اوصاف کے ذریعہ انسان کو متوجہ کیا ہے۔ کبھی حکائی رنگ آمیزی سے انسان کو متاثر کیا ہے انھوں نے ایسی نظمیں کہی ہیں جن میں بعض خیر و شر کے کردار اپنے عمل کے لحاظ سے زندگی کو شاداب یا ویران بناتے ہیں۔ بعض نظموں میں ہمارے ارد گرد کی زندگی کی یاد دہانی کرائی ہے اور نظیروں کے ذریعہ ہمارے عمل میں حرکت اور زندگی کا عنصر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً۔ "چھوٹے کام کا بڑا نتیجہ" ایک معنی خیز نظم ہے۔ ایک بچہ کھیل کی خاطر ایک تالاب میں کنکر پھینک دیتا ہے۔ یہ دلچسپی کا کھیل اس کے ذہن میں تحیر پیدا کر دیتا ہے لہر اٹھتی ہے اور دائرہ بنا دیتی ہے۔ دائرہ سطح آب پر پھیل کر پورے تالاب کے پانی پر محیط ہو جاتا ہے پھر وہ اس تحیر زا نظارہ میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں تجسس پیدا ہوتا ہے اور تشفی بخش جواب کے لئے اپنی ماں سے استفسار کرتا ہے یہ بچہ کی زندگی کا پہلا اور نیا تجربہ ہے۔

جو نہ دیکھی، نہ سُنی کبھی اب سے پہلے　　شاید آئی ہے نظر مجھ کو ہی سب سے پہلے
اک ذرا سی حرکت اور یہ تاثیر عجیب　　دائرہ بڑھ کے پہنچتا ہے کنارے کے قریب
بسکہ جی جان سے اس شعبدہ پر تھا شیدا　　وسعتِ دائرہ کی اپنے عمل سے پیدا

اس حیرت اور بچے کے نئے تجربے سے ماں نے تعلیم کا کام لیا اور جواب دیا کہا :

یونہی ہر کام کا سوچا ہے انجام بڑا　　گو کہ آغاز میں ہوتا نہیں وہ کام بڑا
کبھی ادنیٰ حرکت زلزلہ بن جاتی ہے　　کبھی ناچیز سی اک بات غضب ڈھاتی ہے

یہ ہی انداز نکو کاری و بدکاری ہے
اولاً خاص تھی اب عام میں وہ جاری ہے

ہماری کہانیوں اور نظموں میں جانوروں کے اوصاف سے یا جانوروں کی زبان سے انسان کو

کے بعد' اور' کا باقاعدہ انتظار ہونے لگتا ہے اس لئے کہ اور کے بعد حرکت میں "اور تیزی" آئے گی۔ اس طرح ہلکا suspence پیدا کر کے قاری کو متوجہ کر لینا۔ کہانی یا واقعہ سنانے کا بہترین گر سمجھا جاتا ہے۔ سرسید نے بروقت ضرورت اسے بھی اپنایا۔ مگر واضح رہا کہ مقصد اصلاح تھا۔ لیکن یہ انداز قصہ گوئی لطف ادب اس مقصد کو درجہ ادب دیتے ہیں۔

سرسید کی تقریروں کے راہ سے بھی دلوں میں اترنے۔ اُن کے اندر جو درد، جوش اور ولولہ تھا وہ مکر گفتار کی صورت اختیار کر لیتا تھا اور سامعین پر سکتے کا عالم طاری ہوتا تھا۔ اُن کی تقریروں میں بھی اُن کی ادبی تحریروں کی تمام خصوصیات ہیں۔

سرسید کے خطوط میں بھی سادگی اور بات کو وضاحت اور صفائی سے کہہ دینے کا انداز ہے" القاب وہ غالب کی طرح مختصر لکھتے ہیں، لیکن غالب کا جو منفرد اسلوب ہے وہ اُن کی شخصیت کا عکس ہے سرسید کے خطوط، چاہے خطوط بہت دلچسپ نہ ہوں مگر وہ سادی نثر کی اچھی خوبیاں رکھتے ہیں۔ سرسید کے خطوط میں بھی اُن کا یہ مقصد حاوی رہتا ہے لیکن کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں اُن کی ظرافت اور خلوص نمایاں ہے۔ مثلاً خان بہادر مولوی سید زین العابدین کو لکھتے ہیں۔

مکرمی زینو۔

۔۔۔۔۔ مگر تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو بُرا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں، ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی نہیں جس کو ماروں، حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان نہیں دل سونا ہو گیا۔"

القاب کی اپنائیت سے لے کر آخری جملے تک ایک دوستانہ کسک کا پُر اثر اظہار ہے گو اس میں کوئی تشبیہہ، استعارہ اور شاعری نہیں لیکن دوستی کا رنگ اپنا اثر پیدا کر رہا ہے

اگر سرسید کی نثر صرف اقلیدس کی طرح معلوماتی ہوتی تو وہ ادبی نثر نہ ہوتی لیکن سرسید سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع کے لئے طریقہ کار ادبی نثر کا رکھتے ہیں۔ "سویلزیشن" میں مجموعی انداز بیان معلوماتی ہے لیکن پیغام دینے میں ایک تاثر پیدا کر دینا۔ ادبی انداز ہے۔ اس مضمون میں استعارہ بھی مگر شاعرانہ سعی سے نہیں بلکہ بے ساختہ آگیا ہے۔ مثلاً "دارو ئے بیہوشی" "آنکھوں کو پتھرا دیا" وغیرہ، ان استعاروں نے نفس مضمون کی وضاحت کی ہے نہ کہ اپنے "حسن ادبی" سے توجہ دوسری طرف مبذول کی ہو۔ کہیں انداز سوالیہ ہے۔ جیسے کیا؟ پھر خود ہی جواب

ابتدائیہ

میرے خیال میں یہ ایک اچھی بات ہے کہ وہ اہم ملفوظات جو مصنف اتفاقاً کبھی ظاہر نہیں ہوتے انہیں طاقِ نسیاں
میں رکھنے کے بجائے بیان کر دینا چاہئے یہ ممکن ہے کہ کوئی انہیں پڑھے اور اسے کچھ پسند آ جائے یا کسی کو ایک
سرسری نظر ڈالتے ہی مسرت حاصل ہو جائے سپلنی کے بقول کوئی کتاب خواہ کتنی بھی خراب کیوں نہ ہو، یہ نہیں ہو سکتا
اس میں کوئی نہ کوئی خوبی نہ ہو۔ یہ بات اس لئے اور بھی درست ہے کہ ایک شخص کے لئے جو نعمت ہو وہ دوسرے
کے لئے زہر ہو سکتی ہے۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ میرے خیال میں کسی چیز کو اس وقت تک پھینکنا یا پوری طرح
نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ وہ حقیقتاً مکروہ نہ ہو۔ میرے خیال میں ہر ایک کو اسے پڑھنے کا موقع ملنا چاہئے خاص طور پہ
اس صورت میں کہ وہ بے ضرر ہو اور اس سے کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ہمیں بہت کم ایسے مصنف
ملیں گے جو صرف اپنی ذات کے لئے لکھنے پر آمادہ ہو جائیں۔ آخر کتاب لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور جو لوگ یہ
محنت اٹھاتے ہیں وہ اس کا انعام بھی چاہتے ہیں — مالی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ یوں بھی کہ ان کی کتابیں بکتی میں
اور پڑھی جاتی ہیں اور اگر قابلِ تعریف ہوں تو انہیں سراہا بھی جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سیسرو نے کہا ہے کہ "قدر و منزلت
سے فن کی بہت افزائی ہوتی ہے۔" کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جو سپاہی سب سے پہلے کمند پر چڑھتا ہے وہ زندگی سے سب
سے زیادہ نفرت کرتا ہے؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ تو تعریف کی تمنا ہوتی ہے جو اسے جان جوکھم میں ڈالنے پر
آمادہ کرتی ہے۔ فنون لطیفہ اور ادب میں بھی یہی ہوتا ہے۔ ایک نیا واعظ بڑی اچھی طرح وعظ کہتا ہے اور اس کا منشا
اپنے سامعین کی عرفانی روح کی مدد کرنا ہوتا ہے لیکن ذرا ان حضرت سے پوچھ کر تو دیکھئے کہ کیا انہیں لوگوں کی یہ بات ناگوار گزرتی ہے
کہ "محترمی آپ نے کتنا عمدہ خطبہ دیا!" ایک صاحب تیر سے بازی میں پسندی رہ گئے تھے لیکن انہوں نے ملک عزیز کو
بادشاہ بھی جھنڈا بخش دیا تھا کیونکہ اس نے ان کے نیزہ پھینکنے کی تعریف کی تھی۔ اگر یہ تعریف سچی ہوتی تو وہ نہ جانے کیا کر ڈالتے؟
ہر چیز میں یہی صورت ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس چھوٹی سی بچکانہ کہانی میں میری حالت میرے ہمسائے
سے بہتر نہیں ہے اور مجھے اس کی بھی پروا نہیں ہے کہ کوئی میری داستان پڑھ کر مزا لے گا حالانکہ یہ بڑے بھونڈے
انداز میں لکھی گئی ہے۔ میرے خیال میں لوگوں کے لئے اس بات سے واقف ہونا مفید ہو گا کہ ایک ایسا آدمی بھی زندہ
رہا ہوا ہے جو اتنی مصیبت، خطرے اور بدنصیبی سے دوچار ہو چکا ہے

میں جنابِ والا سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مصنف کا یہ تحفہ قبول کر لیں۔ اگر اس کی آرزو اور مہارت
میں مطابقت ہو جاتی تو اس نے اسے اور خوبی سے لکھا ہوتا۔ جناب والا نے مجھے خود کو اپنی آپ بیتی مفصل پیش کرنے
کے لئے لکھا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں درمیان کے بجائے ابتدا سے شروع کرنا بہتر ہو گا تاکہ آپ کو میرے

کھاؤں گا، میں نے خود دیا ہے، یہ چیز میری یج کی ہے وغیرہ

فایدہ ۷ - لفظ اپس[1] دلالت کرتا ہے مشارکت پر خواہ ضمیر متکلم کے ساتھ یا مخاطب یا غائب کے جیسا ہم اپس میں سمجھتے ہیں، تم اپس میں جھگڑتے ہو، وے اپس میں لڑتے ہیں

فایدہ ۸ - ہندی محاورہ میں ضمیر متکلم کی جگہ فروتنی کے واسطے بحسب مراتب لفظ بندہ و غلام و نیازمند، خاکسار و احقر و مخلص و فدوی اور ضمیر مخاطب و غائب کے مقام میں ادباً و تعظیماً موافق مراتب لفظ خود بدولت خداوند و پیر و مرشد و صاحب و قبلہ و ملازمان استعمال کرتے ہیں

نوع[2] چہارم - اسماء موصول کے دو لفظ ہیں

جو و جون اور یہ دونوں (کذا) حالت فاعلی میں مشترک ہیں درمیان تذکیر و تانیث و وحدت[3] و جمع کے مثلاً جو مرد آیا تھا، جو رنڈی آئی تھی بیائے معروف[4]، جو رنڈیاں آئیں تھیں[5]۔ اما تبدیل اُن کی بواسطہ حروف معنی یا اسماء ظروف حالت وحدت[6] میں ساتھ حرف سین کے جیسا جسکو، جسکا، جسے، جس[7] پاس وغیرہ اور حالت جمعیت میں ساتھ حرف نون و تہہ کے مثلاً جنکو، جنھوں کے، جنھو نے (کذا) وغیرہ

اسماء موصول متضمن ہے معنی شرط کو پس اُسکی جزا میں آتے ہیں لفظ سو و توں مثلاً جو آدمی کل آیا تھا سو آج آیا ہے

فایدہ ۔ اسم موصول کبھی خود بہ سبب حروف کے مبدل ہوکر اپنے ماقبل کے اسم کو تبدیل سے باز رکھتا ہے جیسا وہ لڑکا جس نے تجھ کو مارا تھا، پس بہ سبب لفظ نے لفظ لڑکا مبدل نہ ہوا بلکہ لفظ جو خود مبدل ہوا۔

لفظ جون[8] کی تبدیل موافق ہے لفظ جو کی تبدیل کے

فایدہ ۹- لفظ کون و کیا استفہام پر دلالت کرتے ہیں مثلاً قول سودا

؎ گر تو ہے یاد وفا تو جفا کار کون ہے ، دلدار تو ہوا تو دلآزار کون ہے

---

[1] جدید اردو میں لفظ "اپس" (الف مفتوح، بائے فارسی مضموم) کا تلفظ "آپس" (الف ممدودہ بائے فارسی مفتوح) ہے۔ بعض لوگوں کی زبانی مکسور الاوسط بھی سننے میں آیا ہے [2] اصل "نوعہ"
[3] اصل "مجہول" لیکن یہ بدیہی طور پر سہو کاتب۔ [4] جدید اردو میں "آئی تھیں" ہوگا [5] اصل "وحدہ"
[6] اصل "جسپاس" [7] اصل "نون" لیکن بحث سابق کے پیش نظر تصحیح کی گئی